حیات دبیر حصہ دوم

دبیر

اسم تاریخی سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ

یعنی

خلاق معانی فرزدق ثانی ہمسر وہم عصر قاآنی ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ جامع کمالات حضرت میرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم مشہور مرثیہ گو کی مفصل سوانح عمری اور اُن کے زمانے میں گلزار لکھنؤ کا علم وفضل کی آبیاری سے سرسبز ہونا اُن کا فطری شاعر اور جمیع اصناف سخن پر قادر وکامل ہونا اُن کی غیر معمولی طباعی وحافظہ واخلاقی فضائل کے حالات اور ہندوستان کے [illegible] علما و شعرا و اہل کمال کی محققانہ رایوں کا اقتباس اور عرب وفارس وہند کے بعض مستند ومشہور شعرا کے کلام سے اُن کے کلام کا مقابلہ اور ایک محققانہ علمی مضمون عالیجناب مسٹر حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ کا جس میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کے طرز کلام سے مرزا صاحب کے رنگ کلام کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اُن کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام سے مختلف اقسام کے نمونے اور اُنکی قلمی تحریر کا عکس اور اُن کے صدہا تلامذہ کے مختصر حالات ومختصر نمونہ کلام اور بعض اہل کمال کے (کتاب پر) ریویوز (تقریظیں) اور تاریخیں

مؤلفہ

جناب سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اہل کار دربار کوٹہ (راجپوتانہ)

جس کو

مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب لاہور لوہاری منڈی نے فاضل مؤلف کی اجازت سے پہلی مرتبہ

مطبع سیوک سٹیم پریس لاہور میں باہتمام ماسٹر آتمارام مالک چھپوا کر شایع کیا

قیمت فی جلد ... کاغذ ... سید ...

فہرست مـ

۳۰

سوانح

نمبر شمار	نمبر صفحہ	
۱	۱۷	یہ کتاب کیوں لکھی۔ ظہیر مرحوم۔ مؤلف
۲	۱۸	بعض اساتذہ وشعرائے اہلبیتؑ
۳	۱۹	مؤلف اور ریاست کوٹہ۔ غزل
۴	۲۰	جناب منشی امیر مینائیؒ۔ آب حیات وجناب آزاد مرحوم
۵	۲۱	تنقید آب حیات۔ تذکرہ مرثیہ گویاں
۶	۲۲ و ۲۳	شمس الضحیٰ اور شکریہ اُن احباب کا جنھوں نے تالیف میں مدد دی
۷	۲۴	تلامذہ حضرت دبیرؒ
۸	۲۷ و ۲۸	طبع کتاب۔ زمانے کی رفتار۔ حاشیہ پر خان بہادر جناب میر علی محمد صاحب شاد کے خط کے چند فقرے
۹	۲۹	لطیفہ۔ مرزا صاحب کی مقبولیت
۱۰	۳۰	قومی۔ مقامی۔ خیالی تعصب
۱۱	۳۳ تا ۳۶	حکایت۔ قلزم شاعری میں طوفان۔ ڈرامہ وبھاشا وسنسکرت
۱۲	۳۷	بلینک ورس۔ مرثیہ طرز جدید وجناب آغا
۱۳	۳۹	خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد و شاگردی دبیر باعث فخر
۱۴	۴۰	مطابقت روایت و دیگر مضامین مرثیہ
۱۵	۴۱	شاعرانہ مبالغہ۔ مرثیہ۔ مضامین والفاظ۔ بہار۔ ساقی نامہ۔ اخلاقی مضامین و عامیانہ مضامین
۱۶	۴۲	عشق حقیقی۔ اس لائف کی نسبت مختلف خیالات و شکریہ احباب
۱۷	۴۳	موازنہ مولوی شبلی صاحب
۱۸	۴۴	اعتراف کمالات جناب میر انیس مغفور
۱۹	۴۷	مختصر فہرست حالات اُن بزرگواروں کے جن کے نام اکثر مرثیوں میں آتے ہیں

״	۳	۵ و ۷	اسناد و خطوط متعلق بزرگان مرزا صاحب
״	۴	۸	مرزا غلام حسین (پدر دبیر مرحوم) کی لکھنؤ میں حالت
״	۵	۱۰ تا ۱۱	نسب بعض لوگوں کے حملے اور حیثیت کا تذکرہ
״	۶	۱۲	مرزا صاحب کے بعض بزرگ نوابین شاہان اودھ کے بزرگوں کے محسن تھے۔
״	۷	۱۵ تا ۱۸	سید انشا خسر مرزا صاحب کے مختصر حالات
۲	۱	۱۹	مرزا دبیر کے ابتدائی حالات۔
״	۲	۲۰	تاریخ و مقام ولادت۔
״	۳	۲۱ تا ۲۳	نام و تخلص۔ پہلی تصنیف۔ حاشیہ پر لطیفہ
״	۴	۲۴	حلیہ۔
״	۵	۲۵ ۲۶	لباس، غذا، استعداد علمی و اساتذہ مذہب - استاد فن شعر۔
۳	۱	۲۷	شہرت و ترقی۔
״	۲	۲۸	اسباب ترقی۔
	۳	۲۹	(اوّل) شاہ اودھ نے مرزا صاحب کو

		۳۱	کی شہرت ہو جانا فسانہ عجائب سے ثابت
״	۵	۳۲ تا ۳۴	میر ضمیر صاحب (استاد) سے کس طرح لوگوں نے بگڑوا دیا۔
״	۶	۳۵ و ۳۶	زمانہ کا پلٹا کھانا اور مرزا صاحب کا عروج کمال۔
״	۷	۳۷	اُستاد سے صفائی کی نوبت آئی
״	۸	۳۹	تنقید بعض مضامین آب حیات حکایت بے اصل۔
״	۹	۴۱ تا ۴۳	حکایت صحیح۔ شیخ ناسخ کی انصاف پسندی۔
״	۱۰	۴۳ تا ۴۴	حکایت بے اصل آتش۔ آتش مرحوم کی قدردانی کی حکایات۔
״	۱۱	۴۵	متفرق مضامین آب حیات کی تنقید و تصحیح۔
״	۱۲	۴۸	عکس خط مرزا صاحب۔

حکایت۔	۵۴ و		
مرزا صاحب کے مرثیہ پڑھنے کا انداز۔	۵۵	۵	؍؍
تین حکایات پڑھنے کی نسبت۔	۵۶/۶۰		؍؍
قوت حافظ اور اسکی تین حکایات۔	۶۱/۶۲	۶	؍؍
پابندی اوقات۔	۶۳/۶۴	۷	؍؍
مہماں نوازی۔	۶۵	۸	؍؍
سخاوت اور اس کی حکایت۔	۶۵/۶۶	۹	؍؍
بندگان خدا کی مطلب برآری اور اُس کی چار حکایتیں۔	۶۷ تا ۷۰	۱۰	؍؍
متانت۔ خودداری۔ وضعداری۔ حاضر جوابی۔ حاشیہ پر حاضر جوابی کی حکایت	۷۱	۱۱	؍؍
برکت شاگردی اور اس کے متعلق حکایت۔	۷۲	۱۲	؍؍
دوسرے کو احمق بنانیکی عادت اور حسد سے نفرت۔	۷۳ و ۷۴	؍؍	؍؍
ایفائے وعدہ۔ دلجوئی۔ خوش اخلاقی کی وجہ۔ لطیفہ۔ ایک سید صاحب کی حکایت	۷۴ تا ۷۸	۱۳	؍؍

[illegible] مرزا صاحب مرثیے [illegible] میں زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ میر احمد احمد علی خاں۔ میر زکی۔ میر علی حسن۔ میر بندہ حسین۔ محمد مرزا خاں۔ میر علی محمد حسین (سوز خوانوں کے مختصر حالات) منجھو صاحب۔ نواب اچھے صاحب۔ میر سجاد حسین صاحب۔ نواب نادر صاحب۔	۸۴		
غزل اور مرزا صاحب۔ اس کے متعلق حکایت۔	۸۵ تا ۸۷	۱	۵
لکھنؤ میں مرزا صاحب (اور میر صاحب) کے پڑھنے کی بڑی بڑی مشہور مجلسیں۔	۸۸ تا ۹۴	۲	؍؍
مرزا صاحب کا بادشاہ اودھ کو خداوند نہ کہنا۔	۹۵ و ۹۶	۳	؍؍
خوشامد کرنیوالوں کی مذمت۔	۹۷	؍؍	؍؍
خود شاہ اودھ کا مرزا صاحب کے سر پہ چتر لگانا۔	۹۸	۴	؍؍

〃	نمبر	صفحہ	مضمون
〃	۶	۱۰۰ تا ۱۰۱	جب تک سلطنت اودھ قائم رہی۔ مرزا صاحب باہر نہ گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب کا استقلال اور مٹیابرج جانا اور ایک فقیرنی بڑھیا کے یہاں پڑھنا۔ اور بعد غدر لکھنؤ واپس آنا
〃	۷	۱۰۲	۱۸۵۸ء میں نواب دولھا صاحب رئیس کی طلب پر کانپور جانا اور پھر مرزا صاحب اور میر صاحب وغیرہ کا پٹنہ جانا۔
〃	〃	۱۰۳	رباعیاں اس مضمون میں کہ سفر اہل کمال کے لئے مفید ہے۔
〃	۸	۱۰۴ و ۱۰۵	پٹنے میں مرزا صاحب کی قدردانی کے وجوہ۔ اور اہل عظیم آباد کی مدح و اخلاق حسنہ میں اُن کی رباعی۔
〃	۳	۱۰۸ تا ۱۱۰، ۱۱۲	قطعہ تاریخ وفات [illegible] کا قاعدہ۔ اشارہ صاف و دفع دخل۔ اس موقع پر بعض امیلیوں کا اعتراض مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی کا تائید مرزا صاحب میں رسالہ لکھنا۔
〃	۴	۱۱۲، ۱۱۴	بعض مضامین و واقعات انیس کی تنقید ملک کشور کی مجلس میں میر صاحب کا پڑھنا مرزا صاحب کا نہ پڑھنا۔
〃	〃	۱۱۵ و ۱۱۶	نظام دکن و وزیر دکن کی مدح بیر صاحب کی زبانی۔ غیر کی مدح سے کیا مراد ہے۔
〃	۵	۱۱۶	مسدس مرثیہ پہلے پہل کس نے اردو میں کہا۔ سکندر و سودا۔ مقبولیت مرثیہ سکندر۔
〃	۶	۱۱۸	آستینیوں کو مذمینوں کو۔ اسلام پر دبیریوں اور انیسیوں میں جھگڑا۔

			میر باقر تاجر حکیم بندہ مہدی مرحوم متولی نجف کا شاگرد حضرت اوج ہونا۔
″	″	۱۲۱	مرزا اوج کی وضعداری۔
″	″	۱۲۲	وثیقہ حسین آباد (لکھنؤ) و مرزا اوج صاحب
″	۸	۱۲۳	واقعہ واقعی۔ وقف حسینیہ میر باقر تاجر کی اصلیت حکیم مرزا محمد علی۔ میر باقر تاجر۔ حکیم میر علی و مرزا دبیرؒ۔
″	۹	۱۲۴	مرزا صاحب اور تقلید۔
″	″	۱۲۵	جناب میر انیس مرحوم کی شہرت کا زمانہ۔ اور رعایت لفظی کی گرم بازاری۔
″	″	۱۲۶	جناب غالبؔ حضرت انیسؒ کے شاگرد تھے یا معترض۔
″	″	۱۲۷	وجہ تنقید واقعات انیسؒ و تعلق بزرگان میر احسن صاحب مرزا صاحب سے۔ سید آغا حسن ازل مرحوم۔
″	۱۰	۱۲۸	انتقال دبیرؒ نویں محرم سنہ ۱۲۹۲ھ کی آخری

		تا ۱۳۲	... تاریخ انتقال دبیرؒ قطعہ تاریخ مصنفہ حضرت اوج و رباعی عشق مرحوم و تاریخ حضرت فرقانی و ریحانی و روحانی (میر کرار حسین صاحب) و مؤلف حقیر۔
۵	۱۱	۱۳۳	مقبرۂ دبیرؒ کیوں شاندار و وسیع نہ بنا۔
″	۶	۱۳۴	نواب سید عباس صاحب سعید رئیس عظیم آباد کی قدردانی۔
″	″	۱۳۵	یادگار انیسؒ و دبیرؒ۔
۷	۱	۱۳۶	رنگا رنگ کلام دبیرؒ۔ ترقی سخن کی مثالیں۔
″	۲	۱۳۷ تا ۱۳۹	مرثئے کے مختلف مقامات۔ تعریف۔ مطلع[۱]۔ چہرہ۔ مطلع میں براعت استہلال۔ رخصت[۲]۔ سراپا[۳]۔ آمد[۴]۔ رجز[۵]۔
″	″	۱۴۰	لڑائی[۶]۔ مثال رزخاص دبیرؒ۔
″	۳	۱۴۱ تا ۱۴۳	شہادت[۷] و بین۔ تمسیہ بین کے متعلق۔ ملا مقبل کا مقبول شعر۔ مرزا دبیر کے مرثئے کا ایک بند مع شرح۔

باب نمبر	فصل نمبر	صفحہ نمبر	خلاصۂ مضمون
۷	۷	۱۸۱ تا ۱۸۳	حاشیہ پر مبالغہ کا فائدہ۔ بائبل کی مشہور آیت کا حوالہ۔ تین بند مرزا صاحب کے صنعت مبالغہ میں۔ مذہب کلامی کلام مرزا صاحب
″	۸	۱۸۳ تا ۱۸۵	حسن تعلیل اور اسکی تعریف اور اسمیں بہت کلام مرزا کا ہونا۔ عبرت۔ فروتنی۔ مروت۔ حاشیہ پر شرح علم معشوقانہ وضع تیغ کی مدح۔ ندرہ حضرت حر۔ فوارہ گرمی و فوارہ۔ گرمی اور دھوپ۔ شب عقد جناب امیرؑ۔
″	″	۱۸۶ و ۱۸۷	تاکید المدح بما یشبہ الذم۔ کلام مرزا صاحب سے اسکی چھ نظیریں۔ استتباع اور اس کی نظیریں۔
″	″	۱۸۸	ادماج تعجب اور کلام دبیر مرحوم۔
″	۹	۱۸۹ تا ۱۹۱	صنائع لفظی۔ بے نقط مرثیہ۔ مرزا مرحوم کی مدح زبانی جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنان۔ تجنیس در آیہ کریمہ "زاری" تین معنی پر "بار" چار معنی پر۔ تجنیس خطی در آیہ کریمہ۔
″	″	۱۹۲	اس صنعت میں کلام دبیر مرحوم۔ اشتقاق و شبہ اشتقاق و ذو قافیتین۔
۷	۹	۱۹۳	… شبہ اشتقاق … مقلوب مقلو … مقلوب مستوی میں … شعر اور دبیر مرحوم … مصرع اردو۔ اور حاشیہ پر مصرع اردو۔ مقلوب کل اوّل۔
″	″	۱۹۶ و ۱۹۷	رد العجز علی الصدر کی تعریف۔ اور تین نظیریں کلام مرزا صاحب سے۔ لزوم ما لا یلزم۔
″	″	۱۹۸ و ۱۹۹	مقید قافیے غیر منقوط اور اسکی چند نظیریں کلام دبیر سے۔ حاشیہ پر نظم و نثر مندرجہ تذکرۃ البلاغہ۔ موصل لمشاری۔
″	″	۲۰۰	بند صنعت منقوط میں۔
″	۱۰	۲۰۰	سجع کی تعریف۔ ترصیع کی تعریف۔ دو بند سجع میں۔ پانچ شعر ترصیع میں کلام مرزا مرحوم سے۔
″	″	۲۰۲	ذو القافیتین کی تعریف۔ اور کلام دبیر مرحوم۔ تلمیح کی تعریف و نظم دبیر مرحوم۔

	خلاصۂ مضمون	جلد نمبر	مرثیہ نمبر	صفحہ نمبر	خلاصۂ مضمون
	فصیح وسلیس کلام دبیر دو۔ نمبر ۱	۸	۲	۲۲۷	نمبر ۱۷ تا ۴۵۔ حضرت عباسؑ
	تا ۱۶۔ تلوار کے ہاتھ صفائی کے			تا	کی تلوار کے وار۔ عون و محمدؑ کی
۲۲۶	ساتھ۔ دو پہلوانوں سے لڑائی			۲۴۸	بہادرانہ موت کی تصویر۔ شمر و علم
	ہیبت و اضطراب۔ جناب سیدہؑ				لیکر عون و محمد کے بہکانے کو آتا ہے
	کا حضور صلعم کے سوگ میں جو				زعفر جن۔ لاشہ امام حسینؑ امام
	حال تھا اُس کا مرقع۔ کمال غم کی				حسینؑ کا پیدا ہونا۔ حضور صلعم کا
	تصویریں۔ جگر خراش بین۔ امام				زبان چسانا۔ امام حسینؑ گھوڑے
	حسین کا ہتیار باندھنا۔ تصویر قہر				سے زمین پر تشریف لاتے ہیں علیؑ اکبرؑ
	تا ع۔ حضرت عباسؑ علم لے کر				کے بعد گھر کی پریشانی بین۔ جنگ
	خیمے سے نکلتے ہیں۔ قتل پسران				اسمیں خبر قتل حضور صلعم مدینہ میں
	مسلمؑ۔ بدحواسی لشکر کی تصویر۔				ہونا۔ دعبل مداح کا انجام بخیر۔
	عمر سعد کا جاسوس سے حال امام				یزید کا جاہلانہ فخر۔ خدا کی شان۔
	حسینؑ پوچھنا۔ دس سوالوں کا جواب				امام حسینؑ کے ساتھ ایک ۴ سالہ
	ایک مصرع میں۔ فوج یزید کی لڑائی				لڑکی خیمے سے نکلی۔ امام حسینؑ کا
	جنگ لشکر امام حسینؑ کا رن پر چڑھنا				جوان فرزند کی لاش اٹھانے کو
	علی اکبرؑ کی مرگ شباب۔ علی اصغرؑ جھولے				جانا۔ نثر سے زیادہ سلیس نظم
	میں بے ہوش۔ ننھے بچوں کی پیاری				نئی شان کا سراپا۔ مناجات
	عادتیں۔ ماں کی مامتا اور وہم۔				امام حسینؑ۔ مصائب پنجتن پاک
	رخصت علی اصغرؑ۔ علی اصغرؑ کی				ماں قیدخانہ میں علی اصغرؑ کو یاد کرتی
	شہادت کی تصویر۔				ہیں حسنینؑ کے پاس پوشاک نہیں۔

نمبر باب	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۸	۳	۲۴۸ تا ۲۵۷	نمبر ۴۶ تا ۵۰ - تنہائی میں امام حسینؑ کا بیٹے اور بھائی کو یاد فرمانا گرمی - دھوپ - سایہ - مضامین عالی و نازک خیالی - گھوڑے سے باتیں - دربار یزید میں علیؑ اصغر کا بیان - عشق خدا کا بار - نئے غیر تقسیمی مرثیے کے بند - شہادت کا مآل - مصائب کی فہرست بالاجمال - امام حسینؑ کی کارگذاری -
۹	۱	۲۵۸ تا ۲۶۲	ایجادات دبیرؒ - زمانہ شہرت کے اساتذہ - نمبر ۱ تا ۴ - مرثیہ میں حمد و نعت - ۱۴ معصومینؑ کے حال میں مرثیے - مرثیہ میں حال ولادت و شادی
〃	۲	۲۶۲ تا ۲۶۴	مناظرہ - واقعہ قتل عام کربلا میں مرثیہ بطور حالات تاریخی - حضرت زینبؑ کی زبانی امام حسینؑ کی کہانی - روایات کثیرہ
〃	۳	۲۶۶	مناظرہ یا مکالمہ گ - حال مختار منتقم خون امام حسینؑ - سراپاے حضرت حرؑ - حال حبیب ابن مظاہر -
۹	۴	۲۶۸ تا ۲۷۰	چار بحور مرثیہ - مختلف بحور مرثیہ - مسدس اور سکندر و سودا - مربع مرثیہ اور ضمیر - احکام ذبیحہ -
۱۰	۱	۲۷۱ تا ۲۷۳	تعداد کلام - ہزار دس مرثیے مشہور ہونیکی وجوہ - ۶۲ برس زمانہ تصنیف رات بھر میں ایک مرثیہ کہنا -
〃	۲	۲۷۳ تا ۲۷۶	مرثیہ کہکر دوسرے کا تخلص ڈالدیا - دفتر پریشان - ایک مرثیے میں پانچ چھ مطلع -
〃	۳	۲۷۷ تا ۲۸۰	تعداد مراثی دفتر ماتم - رباعیات نوحے - قطعات وغیرہ - مرثیے جو زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کہے ہیں -
〃	۴	۲۸۱ تا ۲۸۶	مرثیے جو ابتک نہیں چھپے - مرزا صاحب کے مرثیے میر صاحب سے بہت زیادہ ہیں - انتخاب کلام جناب غالب و تبصرہ نقل پرگوئی جناب مصحفی -
۱۱	۱	۲۸۷	دبیر کے قدر شناس اہل کمال -
〃	۲	۲۸۹ تا ۲۹۷	جناب مفتی میر عباس صاحب شوستری لکھنوی - اور اُن کا فیصلہ بحث افضلیت دبیرؒ و انیسؒ میں -

نمبر باب	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۱	۳	۲۹۸	سید المتکلمین مولانا السید حامد حسین صاحب مصنف عبقات الانوار۔
″	۴	۲۹۹	مولوی سید علی حسن صاحب شمس طاب ثراہ۔
″	۵	۳۰۰ تا ۳۰۳	علامہ کنتوری (سید غلام حسنین صاحب قبلہ مدظلہ العالی)۔ مدرسہ ایمانیہ۔ دبیر و انیس۔
″	۶	۳۰۴	مولوی صدیق حسن خاں صاحب محدث عالم جید فرقہ غیر مقلدین۔
″	۷	۳۰۴	مولوی عبد الحی صاحب (فرنگی محلی) عالم کامل حنفی۔
″	۸	۳۰۵	مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی عالم کامل حنفی۔
″	۹	۳۰۶ تا ۳۲۰	حضرت غالب مرحوم۔ جلوہ خضر۔ مرثیہ مصنفہ غالب۔
″	۱۰	۳۲۱	حضرت فرقانی۔
″	۱۱	۳۲۲ تا ۳۲۵	جناب امیر مرحوم۔ حضرت امیر کے دو مرثیے۔
″	۱۲	۳۲۶	جناب منشی امیر مینائی۔
″	۱۳	۳۲۶	جناب منشی منیر مرحوم۔
	۱۴	۳۲۷	جناب حامد سلمہ اللہ والبقاہ۔
۱۲	۱	۳۲۷ تا ۳۳۰	متنبی شاعر مشہور عرب کے بعض کلام سے دبیر کے بعض کلام کا مقابلہ۔ متنبی و دبیر میں فرق۔
″	۲	۳۳۰ تا ۳۳۴	اجتماع النقیضین۔ سخاوت۔ مقابلہ سخی و سحاب۔ شجاعت
″	۳	۳۳۴	موت۔ کثرت لشکر۔ سخاوت
″	۴	۳۳۷	دبیر پر شجاعت اور موت اور تلوار۔
″	۵	۳۴۲	رعب و دہشت۔
″	۶	۳۴۷	برآمدگی ممدوح و جلال۔
″	۷	۳۵۰	عبرت عالم۔ بہادر کا رعب۔
″	۸	۳۵۳	مقابلہ شرک و توحید و ایمان و کفر۔
″	۹	۳۵۸ تا ۳۶۲	ممدوح عالی شان کو دشمن اسیر نہیں کرسکتا۔ دنیا و دین۔ لباس حسن۔ منظر عالم مثل خواب ہے۔
۱۳	۱	۳۶۳	مقابلہ کلام شعرائے ایران و کلام مرزا مرحوم۔ فردوسی۔ نقشہ واقعات۔
″	۲	۳۷۰	منوچہری۔ باغ۔ حکیم سنائی۔
″	۳	۳۷۳	عمر خیام۔ شکایت فلک۔
″	۴	۳۷۵	میر معزی و انوری۔
″	۵	۳۷۷	سلمان ساوجی مرحوم۔ خواجو۔

نمبر باب	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۳	۶	۳۸۱	ملا محتشم۔ آفتاب کا طلوع۔
۱۴	۱	۳۸۳	مقابلہ کلام بعض شعراء اردو۔ وکلام دبیر۔ میر و نسیم لکھنوی۔
″	۲	۳۸۸ تا ۳۹۶	دبیر و غالب میں مناسبتیں۔ دو بڑے شہروں سے نسبت۔ عمر و تاریخ ولادت و وفات۔ مزاج۔ ڈپٹی عباس بیگ مرحوم۔ دقیق و سلیس کلام۔ خریدار سخن۔ کلام خلد جناب امیرؑ۔ خاصان خدا کی شان عالی۔ صلہ کی طلب نہیں۔ مضمون نہج البلاغہ۔
″	۳	۳۹۶	کلام دبیر و انیس کا مقابلہ۔ عام طرز کلام میں فرق۔ چست کلام میر انیس کا انتخاب۔
″	۴	۳۹۸	(رباعیات) مناجات و استغنا۔ آخری وقت۔ لکھنؤ کی شاندار مجلسیں دُنیا بے حقیقت۔ حضرت حر۔ موت و مابعد موت وغیرہ۔
″	۵	۴۰۹	(مرثیوں کے بند) طلوع شمس۔ رکب و مرکب۔ غرور۔ جنگی پہلوان۔

نمبر باب	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۴	۶	۴۱۳	ممدوح سے گذارش۔ زلف و رخ۔
″	۷	۴۱۶	حق و باطل کا مقابلہ۔ شیریں کنیز امام حسینؑ۔
۱۵	۱	۴۲۸	طرز کلام دبیر کا مقابلہ کلام ملٹن شاعر انگلستان سے۔ خط جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ۔ مضمون نگار کا حال۔ قیام لندن و شیکسپیر و ملٹن۔ پروفیسر رل۔ نفیس مرحوم انیس مغفور کا پڑھنا۔ حکایات میر نفیس۔ تاریخ انتقال نفیس۔
″	۲	۴۳۵	شعر۔ اچھا کلام۔ اچھا شعر۔ مقولہ جناب حالی۔ ملٹن۔ رابرٹسن۔ تخئیل۔ کیمبل۔ رچرڈ۔ اسٹرلنگ کولرج۔ شیلی۔ شیکسپیر۔ جانسن۔ بیلی۔ ڈرائیڈن وغیرہ۔
″	۳	۴۴۴	خصوصیات ملٹن۔ خصوصیات دبیر۔ کلام ادق۔ کلام سلیس۔ اہل حرم کے خیالات۔ اتمام حجت۔ شان امامت کا لحاظ۔

نمبر شمار	نمبر باب	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۵	۴	۴۵۸	ملٹن و دبیر کی مشترک خصوصیتیں۔ مضامین عالی۔ علم۔
〃	۵	۴۶۳ تا ۴۸۰	مرثیہ کا چہرہ۔ دبدبہ آمد۔ نعت۔ منقبت دلگداز۔ دبیر و فیسر آزاد۔ مقبولیت مرثیت دبیر۔ الفاظ مستعملۂ دبیر۔ ایک واقعہ کربلا ہزارہا طرح سے باندھا۔ شان معرکہ کربلا۔ خواجہ حالی و معرکہ کربلا۔ بحور مرثیہ دبیر بلحاظ اکثریت اثر شہادت۔
〃	〃	۴۸۱ تا ۴۸۹	وہ کام فوق طاقت البشری تھے۔ کلام دقیق۔ مناقب میں جوش طبیعت۔ ظرافت۔ مرثیہ و تسلسل۔ حاشیہ پریشان مرثیہ عربی (دعبل) و فارسی (محتشم) و اُردو (میر و سودا)۔ مرثیہ میں مثنوی اور قصہ کا سا تسلسل لازمی نہیں ہے۔ سلاست و عام فہم الفاظ۔ فسانۂ عجائب۔ مرزا صاحب نے خاص جگہ پیدا کر لی۔
۱۶	۱	۴۹۰ تا ۵۱۰	جوابات اعتراضات مولوی شبلی صاحب مندرجہ موازنہ۔ آفتاب میں داغ۔ نافہمی یا نادرفہمی کا داغ۔ اعتراض[۱] میرانیس و ایطائے شعر حماں کا مفہوم۔ مطبعوں کی غلطیاں۔ مراثی دبیر مطبوعہ مطبع اودھ اخبار و دفتر ماتم۔ المامون علا مام رضا۔ امام ہشتم کو امام ہفتم کہنا۔[۲] لا تحد و دکا قافیہ صحیح ہے۔ سند میں آیہ قرآن۔[۳] دبیر اور برابر کا جواب۔ تقدم شہرت دبیر۔ حضرات امانت و عشق۔ اختر و اسیر۔ شہرت مرحومین۔ خود جناب انیس مرحوم کا قول تقدم شہرت دبیر مرحوم میں۔ سراپا سخن و شاگرد شاگرد دبیر۔ اوّل مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی۔ مرزا صاحب کا دعوے ایجاد و تعریض سرقہ وغیرہ۔

نمبر مضمون	نمبر فصل	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۶	۲	۵۱۰ تا ۵۲۱	مقابلہ کلام - ۵ اعتراض تشبیہ گلدستہ وتسبیح لفظ آبدار - ۶ تحکم مولوی شبلی صاحب و برق وباراں - ۷ ایضاً تشبیہ زلزلہ - بھون اور بھونچال - ۸ اعتراض ایک مصرع سے حسن قبح عام طور پر نہیں معلوم ہوتا - ۹ اعتراض پانی - ۱۰ ڈھال - آسمان - آفتاب - شبلی صاحب اور محاورہ کی غلطی -
″	۳	۵۲۲ تا ۵۳۶	۱۱ اعتراض نیزہ کی چمک درعشنہ ۱۲ جلاجل - تشریح جلاجل - رعایت لفظی و میر صاحب و حسن کلام - ۱۳ رضار رخدار ۱۴ اعتراضوں کا طوفان -
″	۴	۵۳۷	دوسرا داغ - زبان دانی کی غلطیاں - ۱ اعتراض میر صاحب پر - ۲ مرزا صاحب پر - ۳ میر صاحب پر - ۴ مرزا صاحب پر - علیٰ ہذا ۵ اعتراض آٹھواں میر صاحب پر "حصول"۔
۱۶	۵	۵۴۹	تیسرا اتہام کا داغ - ۱ اتہام مرزا صاحب پر - ۲ اتہام ع فرمایا جی حسین علیہ السلام ہوں - ۳ اتہام تلوار کی معشوقانہ وضع - ۴ اتہام ہوشیاری
″	۶	۵۶۳ تا ۵۷۳	ہوشیاری چوتھا داغ - ۱ مبالغہ - بھاشا و سنسکرت - مبالغہ کی ضرورت وخوشنمائی - ۲ اعتراض پہلوان کوہ - ۳ اعتراض عکس و تبدیل - ۴ اعتراض فصیح وثقیل - ۵ اعتراض استعارہ وصنائع وغیرہ -
″	۷	۵۷۴ تا ۵۸۸	سخت کلامی اور چندرانے اور بنانے کا پانچواں داغ - ۱ اعتراض ۵ نمبر سے مرکب یعنی شہرہ فگن - حذف - جناب غالب خواجہ حالی - حقیقت حال - شہرہ اور گھر پوچھنا - حضرت آتش - ۲ تین باتیں - ثقیل وغریب الفاظ - تاریخی پہلو - ناول وقصہ کا پہلو تہذیب الاخلاق - الفاظ عربی و فارسی - لطیفہ وغیرہ -

نمبر حصہ	نمبر داغ	نمبر صفحہ	خلاصۂ مضمون
۱۶	۸	۵۸۹ تا ۵۹۶	چھٹا داغ سرقہ - مرزا دبیر خطو وحدانی ہیں - ضمیر دانہیں - یوسف زلیخا ئے فردوسی و ... - جدت طرز بیان - مسئلہ ... - عادت توارد و سرقہ - شعرائے سابق کے کلام سے واقفی - توارد ترجمہ مطلع کا ترجمہ مطلع میں استنباط - تشفی نہ ہونا - ظہوری و حزین - اِدھر اُدھر کی باتیں -
״	۹	۵۹۷	ساتواں داغ - چھوٹے چھوٹے دھبّے - ع۱ اعتراض دختر شاہ حلب - رواج عرب - پاس ہندوستان - ع۲ زمین آسمان کے قلابے - اصل بات نیچر - ع۳ رعایت لفظی - ع۴ مضامین عالی - ع۵ ہوائی طلسم - ع۶ واقعیت معرکہ کربلا - موہوم خیال بندی و لفاظی وغیرہ - ع۷ قادر الکلام شعرا -
۱۷	۹	۶۰۸ تا ۶۳۲	ع۸ انصاف طلب - بے ربطی - قصیدہ - ع۹ خلاف عقل - ع۱۰ سفیہانہ و عامیانہ - ع۱۱ تعظیم خورد "علیہ السلام" تعظیم جناب فاطمہؑ - مرثیہ مڈ رامہ - ع۱۲ شرم مستورات ہند - خوش فہمی - رواج عرب - حکایت واقعی - ع۱۳ سوقیانہ - ع۱۴ مبالغہ - ع۱۵ میر انیس اور بہکنا - ع۱۶ مرزا صاحب اور تشبیہیں اور پھبتیاں - ع۱۷ مرزا دبیر و رنگ تاثیر - بند مقابل (امیر صاحب کا) ع۱۸ "میں" کا لفظ - ع۱۹ بے تعلق ع۲۰ حقیقت موازنہ - ع۲۱ کتابت کی غلطی اور زیر "نہیں" جواب صوب - موازنہ کی غلطیاں معذرت نہیں استدلال

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ ربّ العٰلمین - والصّلوٰۃ والسّلام علی محمد خاتم النبیّین وتمام عدّۃ المرسلین وعلی آلہ الطیّبین الطّاہرین - واصحابہ المنتجبین[۱] +

ناظرینِ حیاتِ دبیرؔ! (۱) دبیر کون بزرگوار تھے؟ (۲) اور کتاب حیاتِ دبیر کیا چیز ہے؟

یہ کتاب کیوں لکھی

ان دونوں سوالوں کا جواب شافی تو یہ کتاب (خود زبان حال سے) دیگی - مَیں آپ سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ مَیں نے یہ کتاب کیوں اور کیونکر لکھی - اسی کے ضمن میں شاید سوالات نمبر ۱ و ۲ کا بھی کچھ جواب مل جائے +

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا - کہ شعر و سخن سے میری طبیعت کو ابتدا ہی سے لگاؤ تھا[۲] - اور اُس کے ساتھ ہی بچپن ہی سے مرثیہ پڑھنے کا شوق ہُوا - اکثر حکیم کا بیٹا حکیم اور عالم کا لختِ جگر عالم اور کاریگر کا فرزند کاریگر ہوتا ہے - مَیں نے آنکھ کھول کر اپنے نانا میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی مرحوم کو مرثیہ پڑھتے ہُوئے دیکھا - مَیں اِدھر مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں مولوی میر صفدر شاہ صاحب مرحوم سے اردو فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا - اُدھر فرصت کے وقت نانا مرحوم مجھ کو مرثیہ پڑھنا سکھاتے تھے - مَیں جب عروض تو خاک نہیں جانتا تھا - مگر جو مصرع ناموزون ہوتا تھا - وہ خود بخود دل پر کھٹک جاتا تھا - البتہ عین یا ہ ایسے حروف گرنے کی مجھے خبر نہ ہوتی تھی +

موزون

نانا مرحوم مرزا دبیرؔ مغفور کے شاگردِ رشید تھے - بارہ[۱۲] تیرہ[۱۳] برس کی عمر سے اُن کے شاگرد ہُوئے -

---

[۱] یہ کلمات تبرکاً دعائے صحیفۂ کاملہ (یوم الثلثاء) سے اخذ کئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

[۲] ۱۵ رجب ۱۲۷۸ ہجری روز جمعہ کی میری پیدائش ہے - نظیرِ حسن تاریخی نام ہے - عروض و قافیہ سے بھی میرا سالِ ولادت نکلتا ہے - یہ قدرتی شعر و سخن کے تعلقِ طبعی کا شاعرانہ استدلال و ثبوت ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

اور ہمیشہ ہر بڑی مجلس اور ہر معرکے میں اُن کے ساتھ رہے۔ وہ گویا مرزا صاحب کی زندہ تاریخ تھے۔ اور مرزا صاحب کے گویا مددگار تھے۔ اسی مناسبت سے مرزا صاحب نے اُن کا تخلص ظہیر (مددگار) رکھا تھا +

اگرچہ اُن کے والد ماجد میر فتح علی مرحوم زمانہ شاہی (لکھنؤ) میں رسالہ دار اور وہ خود نائب رسالہ دار تھے۔ مگر مرثیہ پڑھنے کا اُن کو ایسا شوق تھا۔ کہ عمر بھر گویا یہی کام کیا کئے +

مجھے اُنہوں نے دس برس کی عمر میں ہی جب مَیں غلط سلط اردو لکھ اور پڑھ لیتا تھا۔ مرثیہ پڑھنا سکھایا اُنہوں نے میر ضمیر مرحوم (جو مرثیہ میں اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کے بھی موجد تھے اور جن کو اُنہوں نے برسوں خوب سُنا تھا) کے طرز مرثیہ خوانی میں کچھ جدتیں کر کے ایک طرز خاص بتانے کا ایجاد کیا تھا۔ اگرچہ وہ سلام اکثر اور مرثیہ کمتر کہتے بھی تھے۔ مگر خاص کر مرثیہ پڑھنے پر (اُنہوں نے) سخت محنت کی تھی۔ اکثر خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے ساتھ کے پڑھنے والوں میں فقط ایک میر شرف الدین مرحوم تھے۔ جو محض بین ۱۵ یا ۲۰ بند مجلس میں پڑھتے تھے۔ اور بین لاجواب پڑھتے تھے۔ سراپا۔ لڑائی وغیرہ وہ نہیں پڑھتے تھے۔ اور مَیں ان سب مقامات (مرثیہ) کو پڑھتا تھا۔ میرے بعد کے (مرزا صاحب کے) شاگردوں میں میرزا مُغل مرحوم اچھے پڑھنے والے تھے۔ جنہوں نے میرے طرز کی پیروی کی۔ اور خوب خوب پڑھے۔ خود مرزا صاحب کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ اِس لئے اِس خاندان میں جو کوئی شاگرد ہوتا تھا۔ وہ انہیں کے پاس مرثیہ پڑھنے کو آتا تھا۔ اور وہ سکھاتے تھے۔ خود ہر روز تنہائی میں ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ بعض مصرع کو بیس بیس مرتبہ مختلف طرز۔ اُتار۔ چڑھاؤ سے پڑھتے تھے۔ جب جا کر اُن کو اطمینان ہوتا تھا۔ اور شاگردوں کو سامنے بٹھلا کر سکھاتے تھے +

المختصر چند روز مشق کے بعد اُن کی پیش خوانی میں (مجالس عزا میں) مَیں نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر اُسی مجلس میں جاتا تھا۔ جو میرے درس کے وقت نہ ہوتی تھی۔ نانا مرحوم کے ہمرکاب اُن مجلسوں میں بھی اکثر جاتا تھا۔ جن میں جناب مرزا صاحب یا جناب میر صاحب یا میر مونس مرحوم یا میر انس مغفور یا آغا عشق مبرور یا اور کوئی اعلےٰ درجہ کا ذاکر پڑھتا تھا۔ کہ نانا مرحوم اور ان سب صاحب کمالوں سے بھی راہ و رسم و محبت تھی۔ اثنائے مرثیہ خوانی میں یہ سب صاحب اُن کی طرف (خاص طور پر) متوجہ اور اُن سے

طالب داد ہوتے تھے ۔ اس سبب سے ہر کامل کو سننے کا مجھے اچھا موقع ملتا تھا ۔ (میں نے علاوہ مدرسہ ایمانیہ کے (بعد کو) بعض علمائے فرنگی محل (مولوی امان الحق صاحب و مولوی لسان الحق صاحب) اور مولوی آقا محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد و محدث لکھنؤ اور مولوی سید علی نقی صاحب داعی پوری مرحوم مدرس کیننگ کالج سے بھی کچھ پڑھا) یہاں تک کہ سنہ ۱۲۹۱ھ و سنہ ۱۲۹۲ھ میں میر و مرزا نے (تین چار مہینے کے اندر اندر) انتقال فرمایا۔ میری عمر اس وقت چودہ برس کی تھی۔ اب اُدھر میر نفیس مرحوم اِدھر جناب مرزا اوج مدظلہ کے پڑھنے کی دھوم دھام کی مجلسیں شروع ہوئیں۔ کبھی کبھی جناب میر انس و میر مونس و میر عشق مرحومین بھی پڑھتے تھے۔ کربلائے معلےٰ سے جناب تعشق مغفور نے بھی آکر پڑھنا شروع کیا۔ اُن کو بھی سنا۔ جناب میر وحید (مرحوم) نے بھی خوب خوب مرثیے کہے اور پڑھے ۔

اِدھر ٹکسال (لکھنؤ) میں میر محمد صاحب سلیس مرحوم نے کچھ مجلسوں میں میر انیس صاحب کے بعض محفوظ وغیر تقسیمی مرثیے پڑھنا شروع کئے۔ ان کے پڑھنے میں بصورت میں۔ آواز میں میر صاحب کی مشابہت تامّ تھی۔ اور خوب پڑھتے تھے ۔

بہر حال اِن تمام اہل کمال کو میں سنتا تھا۔ اور اِن رنگا رنگ خوشبو دار پھولوں کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوا جاتا تھا۔ اور موت گویا زبان حال سے کہ رہی تھی۔ (المؤلف) ؎

بہت رنگ و بو پر نہ اتراؤ پھولو — نہیں دیر لگتی خزاں آتے آتے

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سر سبز گلزار لکھنؤ میں یکایک پت جھڑ شروع ہوئی۔ اور بجز حضرت اوج مدظلہ کے آگے پیچھے یہ سب بزرگوار باغ جنت میں جا بسے۔ خدا جناب ممدوح کو سلامت رکھے۔ کہ اب ان کا دم بہت غنیمت ہے ۔

مؤلف اور ریاست کوٹہ

میں سنہ ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ سے بھرت پور میں پہنچا۔ یہاں سے محسن اہل علم عالم علوم مشرقی و مغربی حاجی ڈپٹی سید جعفر حسین صاحب جعفری بہرسری (لندنی) دام مجدہ و اقبالہ کے ہمرکاب کوٹہ آیا۔ اور جناب ممدوح کی وجہ سے ریاست میں نوکر ہوا۔ جس سلسلہ کا اب تک پابند ہوں ۔ سنہ ۱۸۸۹ء سے

جنابِ منشی امیر مینائی

جناب منشی امیر مینائی کی خدمت عالی میں بھیجوا دیتا تھا۔ بعض ابتدائی غزلیں اُن کی نظر سے گذریں اور اصلاح کے بعد چھپیں۔ ادھر جو سلام وغیرہ کہے۔ وہ جناب مرزا اوج مدظلہ کو دکھائے۔ عروض میں اپنے طور پر کتابیں دیکھ دیکھ کر کچھ مہارت پیدا کی۔ اور پھر جب (۱۸۹۳ء میں) عتبات عالیات (کربلا و نجف وغیرہ) کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تو اُن پاک زمینوں کے اثر سے سلسل مرثیے کہنا شروع کئے۔ الحمدللہ کہ اب ایک معقول ذخیرہ مرثیوں کا ہوگیا ہے۔ جس کی ایک جلد چھپ سکتی ہے۔ اسی کو میں توشۂ آخرت سمجھتا ہوں۔ ابتدا میں جب میں غزل و سلام کہتا تھا اور مرثیہ پڑھتا تھا۔ اور غور کرتا تھا۔ تو غزل سے مرثیہ گوئی کو بہت زیادہ مشکل پاتا تھا۔ دل میں سوچتا تھا۔ کہ یا اللہ یہ مرثیہ گویوں نے کیا قصور کیا ہے۔ جو تذکرہ لکھنے والے ان کے حالات و کلام یا تو لکھتے ہی نہیں۔ یا لکھتے ہیں تو برائے نام۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا ہے۔ جو کوئی کہہ سکے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے"۔ آخر بروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات دیکھا۔ سبحان اللہ۔ آزاد کی نثر۔ اور اُس کا حسن بیان۔ اور پھر دہلی کی ٹکسالی زبان دل نے مزے اُٹھائے۔ (المؤلف) ؎

آبِ حیات و جناب آزاد مرحوم

حق یہ ہے نثر لکھنے میں آزاد فرد تھا　　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت آزاد نے خیر اور مرثیہ گویوں ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر وغیرہم کا ذکر خیر تو بالاجمال کیا تھا۔ لیکن دبیرؔ و انیسؔ کے حالات ذرا شرح و بسط سے لکھے تھے۔ مگر آب حیات میں حالات میرزا صاحب کو جو دیکھا۔ تو اکثر خلاف واقع پایا۔ گو بعض اہل دہلی مقیم کوٹہ (میر محبوب علی مرحوم سابق سررشتہ دار مجسٹریٹی آلوہ وغیرہ) کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء اپنے گھر کی مجلسوں میں جناب آزاد مرحوم جناب میر صاحب ہی کے مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ مگر آزاد ایسے آزاد خیال بزرگ سے ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی تھی۔ کہ وہ جان بوجھ کر میر صاحب کے طرفدار ہونے کے سبب سے مرزا صاحب کے حالات بھی غلط لکھیں۔ آخر اہل علم ہیں۔ دل میں سوچا۔ کہ اس میں کوئی لم ہے۔ حضرت آزاد (مرحوم) کو میں نے کوٹہ سے خط لکھ کر آگاہ کیا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے جو حالات میں نے بزرگوں (اہل لکھنؤ) سے سُنے ہیں (کہ جن میں سے بعض حضرات ابتک زندہ ہیں)۔ اکثر یہ حالات مندرجہ آب حیات اُن کے بالکل برخلاف۔ اور اس لئے

غلط ہیں۔ اُن مرحوم نے مجھے جواب دیا کہ جن صاحب سے حالات دبیرؔ کو خط لکھ کر میں نے پُوچھا۔ اُنہوں نے (اہل لکھنؤ وغیرہ میں سے) کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ خیر غزل گو شعرا کے تو کچھ حالات ملک سے ملے بھی مگر مرثیہ گویوں کا تو کوئی حال ہی نہیں بتاتا۔ مَیں نے جو کچھ سُنا۔ لکھ دیا۔ مگر مجھے اس کی صحت پر نہ بھروسہ ہے نہ اصرار۔ تم صحیح حالات لکھ بھیجو۔ مَیں شکریہ کے ساتھ آئندہ (ایڈیشن میں) چھپنے پر وہ حالات لکھ دونگا۔ اب مَیں اس فکر میں تھا۔ کہ رخصت لیکر لکھنؤ جاؤں۔ تو معمّر آدمیوں سے مزید صحت کر کے صحیح حالات جناب آزاد کو لکھ بھیجوں۔ اُس زمانے میں کوٹہ سے ریل سو میل سے زیادہ دور تھی۔ برسوں کے بعد جانا ہوتا تھا۔ کئی برس کے بعد جو مَیں لکھنؤ گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت آزاد اب آزاد نہیں رہے۔ پابند جنون ہو گئے۔ ادھر خود جناب نانا صاحب (مرحوم) نے ایک مختصر رسالہ (تنقید آب حیات) چھپوا کر ملک میں مشتہر کر دیا تھا۔ مَیں نے دل میں سوچا۔ کہ یہ کام تو خیر ہو گیا۔ مگر آزاد مرحوم نے آب حیات میں تمام مرثیہ گویوں کے حالات نہیں لکھے۔ اور میر و مرزا کے معاصرین اور بعد کے شعراء اہل بیت کا تو گویا نام ہی نہیں ہے۔ لاؤ تم ایک تذکرہ مرثیہ گویوں کا لکھ ڈالو۔ لکھنؤ میں کچھ لوگوں کے حالات بزرگوں سے دریافت کر کے لکھ بھی لئے۔ اور جو مرثیہ گو زندہ تھے۔ اُن سے حالات ملنے کی کوشش کی۔ بعض اخباروں میں خطوط بھی بھیجے۔ اکثر نے تو اس کو صدائے بے ہنگام سمجھ کر جواب ہی نہ دیا (چھاپنا تو درکنار)۔ بعض نے اُس کو اشتہارات کے ذیل میں قرار دیکر دام مانگے۔ بعض نے چھپوا بھی دیا۔ مگر پھر بھی کسی نے حالات یا منتخب کلام کسی کا (بجز دو تین صاحبوں کے) نہیں بھیجا۔ مَیں بھی "عرفت ربّی بفسخ العزائم"* پڑھ کر چپ ہو گیا۔ جو مصالح اُس وقت فراہم کیا تھا۔ وہ یُونہی پڑا رہا۔ مگر جب کبھی کوئی اس قسم کی کتاب (جس میں مرثیہ گویوں کا کچھ تذکرہ ہوتا تھا) یا کسی شاعر کی لائف دیکھتا تھا۔ دل میں جوش سا اُٹھتا تھا۔ کہ مرثیہ گو شاعروں کے کمال سے ملک کو آگاہ کیا جائے۔ پھر سوڈا واٹر کی طرح وہ جوش فرو ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شمس العلما جناب مولوی شبلی صاحب کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا مَیں نے نام سُنا۔ دل میں کہا۔ نام تو بہت موزون ہے۔ غالباً کتاب بھی ایسی ہی ہو گی۔ کچھ عرصہ کے

---

*مَیں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ یہ ارشاد جناب امیرؑ کا ہے۔ پُورا جملہ نہج البلاغہ میں یُوں ہے عرفت ربّی بفسخ العزائم وحلّ العقود۔ مَیں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے اور عقدوں کے کھلنے سے پہچان لیا ۱۲ مؤلف حقیر۔

بعد کتاب جو دیکھی۔ تو حیران رہ گیا۔ بہت افسوس ہوا۔ کہ ایسے مشہور بزرگ اور ایسی ایسی غلط سلط باتیں لکھیں اب دل نے کہا۔ کہ تھوڑا تھوڑا اسی کتاب کا جواب بطور ریویو (تقریظ) لکھو۔ اور کچھ لکھا بھی۔ مگر پھر لکھنؤ کے بعض خطوط سے معلوم ہوا۔ کہ لکھنؤ میں ہی اور بعض شعرا موازنہ کی رد لکھ رہے ہیں۔ میں یہ شعر پڑھ کر چپ ہو گیا۔

چو کائے بے فضول من برآید ۔ مرا در وے سخن گفتن نشاید

اُسی دوران میں بعض احباب نے اصرار فرمایا۔ کہ جناب مرزا صاحب مرحوم کی تو سوانح عمری (لائف) لکھو۔ میر صاحب کے حالات میں تو خیر "حیات انیس" "واقعات انیس" کچھ لکھی بھی گئیں۔ لیکن ادھر بالکل صفر ہے۔ تب میں نے حامی بھرلی۔ کہ دل چاہا۔ ہاتھا شمس الضحیٰ (فارسی) مرزا صاحب کے حالات میں ایک پرانی کتاب شاہی زمانے کی مولوی میر صفدر حسین صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی مطبوعہ میرے پاس تھی۔ مگر وہ کوئی دوست نما رہزن ایسے لے گئے تھے۔ کہ رسید بھی نہ دی تھی۔ پھر شمس الضحیٰ دوبارہ لکھنؤ سے منگوائی۔ اور جو حالات تذکرہ مرثیہ گویاں کی شروع ترتیب کے وقت لکھ رہے تھے۔ اُن کو نکالا۔ ادھر جو جو کتابیں ردّ الموازنہ میر افضل علی صاحب ضو سلمہ اللہ و تردید موازنہ مؤلفہ جناب شیخ محمد جان صاحب عروج فیض آبادی و حیات انیس و واقعات انیس در ردِّ واقعات انیس اور بعض اخبار اور پرچے نکلتے گئے۔ وہ سب منگائے۔ بہت سی کتابیں منگائیں (کہ یہاں کوٹہ میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں) تین مرتبہ رخصت لے کر لکھنؤ گیا۔ وہاں لوگوں سے حالات پوچھے۔ سیکڑوں اصحاب و احباب کو خطوط لکھے۔ اخباروں کو جدا خط لکھے۔ اور یہ سب اِس لئے کیا۔ کہ مرزا صاحب کی عکسی یا قلمی تصویر اور زیادہ حال اور اُن کے شاگردوں کے کچھ حالات و کلام ملے۔ مگر اکثر اخبار کے اڈیٹروں نے تو جواب ہی نہ دیا۔ بعض نے اُس کو تجارتی اشتہار قرار دیکر اُجرت مانگی۔ ہاں اڈیٹر صاحب اثنا عشری نے اس کو پبلک (خلائق) کا کام سمجھ کر چھپوا دیا۔ جن کا مَیں شکرگذار ہوں۔ پھر مَیں اس فکر میں ہوا۔ کہ کوئی صاحب وجاہت (بزرگ قوم) اخباروں میں خطوط چھپوائیں۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ اہل علم و کمال کے دلی خیر خواہ بلکہ ہمدرد مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ نے ایک مجلس لکھنؤ میں یہ کلمہ فرمایا۔ کہ میری سب تمنائیں پوری ہو گئیں۔ مگر ایک حسرت یہ رہی جاتی ہے۔ کہ جناب مرزا صاحب کی لائف میری زندگی میں نہیں

شمس الضحیٰ

لکھی گئی۔ میں نے کوٹہ سے اُن کی خدمت عالی میں عریضہ بھیجا۔ کہ میں آپ سے فقط اتنی مدد چاہتا ہوں۔ کہ آپ مرزا صاحب کی تصویر لکھنؤ اور پٹنہ عظیم آباد و کلکتہ وغیرہ میں تلاش فرمائیں۔ قیمت میں دونگا۔ اور اس کی کوشش فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم کے کچھ اور حالات اور اُن کے شاگردوں کا کچھ کلام و حال مل جائے۔ جناب ممدوح نے اس مقصد کے واسطے کوشش بلیغ فرمائی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مشہور اردو اخباروں کو خطوط چھپنے کے واسطے بھیجے۔ اور اپنے پاس سے اُن صاحب کو پچاس روپے دینے کا اشتہار دیا۔ جو مرزا صاحب کی تصویر لائیں۔ یہ خط ہندوستان کے قریباً تمام مشہور اردو اخباروں نے چھاپا۔ مگر اثر بہت تھوڑا ہوا۔ تصویر کو میں نے خطوط لکھ کر بھی جابجا تلاش کیا۔ مگر نہ ملی۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر تصویر نہیں ملتی۔ تو خیر۔ اُن کے خط کا فوٹو ہی پیش کردوں۔ چنانچہ اُن کا ایک قلمی ورق جناب مرزا اوج مدظلہ سے منگوایا (جو بہت تلاش سے جناب مرحوم کی تصنیفات میں ملا)۔ اور اُس کا عکس (فوٹو) اس کتاب میں ملاحظہ ناظرین کے واسطے پیش کردیا ہے۔

بعض حضرات نے مرزا صاحب کے حالات اخلاق حسنہ وغیرہ اور بعض بزرگواروں نے اُن کے شاگردوں کے حالات لکھ لکھ کر مع مختصر کلام کے خود بھیجے یا دوسروں سے تاکید فرماکر بھجوائے۔ جن کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سب سے زیادہ جن صاحبوں نے یہ کرم فرمایا۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) میر الطاف حسین صاحب عرف نواب ننّے صاحب رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد۔

(۲) مولوی سید محمد عسکری صاحب مینیجر رسالہ شیعہ بازار بندی ضلع سارن۔

(۳) مولوی فاضل سید علی حیدر صاحب اڈیٹر اصلاح۔

(۴) مولوی سید احمد رضا صاحب جائسی (ضلع رائے بریلی) جنہوں نے قبلہ و کعبہ مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی سے سُن سُن کر حالات صحیح لکھ کر بھیجے۔

(۵) میر کرار حسین صاحب روحانی جنرل سپرنٹنڈنٹ صاحب گورکھپور رئیس میرٹھ خلف الصدق حضرت فرقانی طاب ثراہ۔

جب محرم ۱۳۳۰ھ میں یہ کتاب ایک مرتبہ لکھ گئی۔ تو میں اس کو لیکر ڈھائی مہینے کے واسطے لکھنؤ گیا۔

دہاں بعض اہلِ علم اور راد رآدمیوں اور شاعروں کو اس کے اکثر مقامات سُنائے۔ اور بعض حالات کی تصحیح کی۔ بعض اور حالات بہم پہنچائے۔ اور جناب اُستادی حضرت اوج مدظلہ نے بعض ایسے بند اور اشعار جناب مرحوم کے لئے جو اب تک محفوظ ہیں۔ اور جناب ممدوح نے کرم فرما کر وہ لعل بے بہا عنایت فرمائے۔ جس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قلم تو کیا میری زبان بھی قاصر ہے۔ اس جانفشانی سے یہ کتاب اور بعض تلامذہ دبیر مرحوم کا تذکرہ مرتب ہو گیا۔ اور جو خیال مدت سے دل کو بار بار بے چین کرتا تھا (کہ مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ لکھا جائے)۔ وہ جزوی طور پر معرض ظہور میں آیا۔ جلد اوّل میں مرزا صاحب کے ہر قسم کے کلام کے نمونے ہیں۔ اور جلد ثانی میں علاوہ رباعیوں۔ سلاموں۔ تضمینوں وغیرہ کے مسلسل حالات کے مرثیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جناب امام حسینؑ کا مدینہ منوّرہ سے سفر۔ پھر مکہ معظمہ میں چند روزہ قیام۔ پھر ورود کربلاء معلّیٰ۔ پھر اُن کے اُن رفیقوں اور عزیزوں کے حالات و شہادت (جن کے حال میں مرزا مرحوم کے مرثئے ملے)۔ پھر خود امام حسینؑ کے حالات و شہادت۔ پھر اہلبیتؑ اطہار کا کوفہ پھر شام تشریف لے جانا۔ اور وہاں کے حالات۔ پھر واپس کربلا ہوتے ہوئے مدینہ منوّرہ میں آنا۔ اگر اس کو آپ ایک پویم نظم (مسلسل واقعات منظومہ) کہ سکتے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ اردو کی شاعری پر جو اعتراض چلا آتا تھا۔ کہ ایک پویم سے خالی ہے۔ وہ اُٹھ گیا یا ہلکا ہو گیا۔ یہ مرثئے مجالس عزا میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی دیکھ کر ناظرین حظ و لطف سخن اُٹھا سکتے ہیں۔ ہم خرما ہم ثواب +

ناظرین!! آپ کہتے ہونگے۔ حضرت دبیر کی لائف میں شاگردوں کے حالات و کلام کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کی وجہ عرض کردوں۔ اوّل تو اس گروہ (شعرائے اہلبیتؑ) کی حق تلفی (گویا) ہو رہی ہے*۔ کہ عام تذکرہ نویس

تلامذۂ حضرت دبیرؒ

---

*۔ ایک اور حق تلفی بھی ہو رہی ہے۔ جس کا حال چند آدمیوں کے سوا شاید تمام اہلِ لکھنؤ کو بھی معلوم نہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ان شاگردوں کے بعض مرثئے یا سلام یا بند اس زمانے کے بعض مرثیہ گو شعرا اپنے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ پھر اُس پر سر منبر فخر فرماتے ہیں کہ دیکھیے یہ مضمون آج تک کسی نے نہیں باندھا تھا۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کہ کسی پر حملہ منظور نہیں ہے۔ بقول شاعر ؎ حسینوں میں ابھی چوری گیا دل۔ میں کس کا نام لوں اپنی زباں سے۔ اس واسطے مؤلف حقیر کا یہ بھی ارادہ ہے کہ تلامذہ حضرت دبیر کے مرثیوں کی جلدیں بھی اس حیات دبیر کے طبع ہونے کے بعد چھپوا دے۔ اور خود مرزا مرحوم کے صحیح و منتخب کلام کی بھی ایک یا دو جلدیں چھپوائیں۔ یہ کام ذرا مشکل ہے مگر خدا مددگار ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ان کا تذکرہ نہیں کرتے۔ میری کتاب میں درج ہو جانے کے بعد ممکن ہے۔ کہ کوئی تذکرہ نویس ان کے ذکر خیر سے بھی اپنی کتاب کو رونق بخشے۔ اور میرے بعد جو صاحب اور کسی مرثیہ گو شاعر کی لائف لکھیں۔ وہ اُس خاندان کے شاگردوں کو لکھدیں[1]۔ اس طرح ممکن ہے۔ کہ شعرائے اہلبیتؑ کے حالات ملک میں شائع ہوں۔ اور یہ کمی جو عام تذکروں میں ہے یوں پوری ہو جائے۔ دُوسرے ہر اُستاد (شاعر) کی نسبت یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ ملک کو اُس سے کتنا فیض پہنچا۔ اُس کے شاگرد کیسے کیسے ہُوئے۔ مثلاً جب آپ شیخ مصحفی اور میر انشا کا کلام و بیان (تذکروں میں) دیکھتے ہونگے۔ تو آپکو ضرور یہ خیال ہوتا ہوگا۔ کہ گو میر انشا کی سی روانی اور شوخی بڈھے مصحفی کے عام کلام میں نہیں ہے۔ مگر مصحفی سے ملک کو فیض زیادہ پہنچا۔ جس شاخ کا مَیں ذکر کر رہا ہُوں۔ اِس چمن کے باغبان جناب مصحفی ہی تو ہیں۔ دیکھئے اُن کے شاگردوں میں ضمیرؔ۔ خلیقؔ۔ آتشؔ۔ اسیرؔ۔ شہیدیؔ کیسے کیسے کامل ہُوئے۔ ضمیر و خلیق کے یادگار شاگرد (روشِ ضمیر و خلیق) مرزا دبیر و میر انیس ہیں۔ جو ایک ایک شاعر ہزاروں کے برابر ہے۔ اور امیر مرحوم کے فیض یافتہ بھی بڑے بڑے کامل شاعر ہُوئے۔ جن میں سے جناب منشی امیرؔ مینائی مشہور عالم ہیں۔ کیا دبیرؒ کا یہ فیض قابل یاد و تعریف نہیں ہے۔ کہ منشی سیّد اسمٰعیل حسین صاحب منیرؔ مرحوم سے اکمل شعرا دبیر مرحوم کے خوشہ چیں ہیں۔ یعنی مرثیہ میں شاگرد ہونے کا فخر بار بار اپنے دیوان اور لاجواب مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں۔ اسی طرح حکیم قدیر الدولہ قدیرؔ۔ مشیرؔ مرحوم۔ حاجی حکیم عظیم مغفور۔ مولوی ظفر مہدی صاحب مہدی۔ منشی فرزند احمد صاحب صفیرؔ بلگرامی خان بہادر۔ میر علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی دام ظلہ و جانشین حضرت دبیر جناب مرزا اوجؔ صاحب قبلہ مدظلہ العالی بلاواسطہ شاگرد[2] ہیں اور جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے مرزا تخلص۔ اور جناب نواب بنے صاحب مشتاقؔ مرحوم اور نواب مظفر علی خاں صاحب کوثرؔ رئیس جانسٹھ و

[2] تاج العلما سید علی محمد صاحب مجتہد طاب ثراہ و مولوی میر سید علی صاحب محدث مقبول صاحب مجالس علویہ بھی مرزا مرحوم کے شاگردوں میں قابل ذکر و فخر ہیں۔ انکی نظمیں بہت کم ہیں مگر نثر میں ان جناب نے دریا بہائے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ تاج العلما (طاب ثراہ) نے عموماً اردو میں لاجواب کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان کی لاجواب کتاب چودھویں رات کا چاند، درنجف، داؤدی ان کے کمال پر شاہد عدل ہیں۔ ان کو زبان اردو کا سرپرست و مربی کہنا بالکل درست ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[1] مثلاً مداح آل محمد مرزا کاظم حسین صاحب محشر جناب نفیس مرحوم کی لائف لکھ رہے ہیں۔ پس وہ خاندان جناب میر صاحب کے تمام

میر امیر حسین صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن و میر فراست حسین صاحب فراست و میر یونس حسین صاحب یونس زیدپوری و میر طالب حسین صاحب طالب بالواسطہ شاگردوں میں کیسے کیسے کامل ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے۔ کہ دبیر مرحوم سے اور کچھ فیض و فائدہ ملک کو نہیں پہنچا (حالانکہ ایسا ماننا فرض محال ہے)۔ تو ایک یہی فیض تلمذ کیا کم ہے۔ اگر یہ اعتراض ہے۔ کہ کسی لائف لکھنے والے نے ایسے شاگردوں کے حالات نہیں لکھے تھے۔ تو مجھے آپ اس کا موجد مان لیں +

المختصر یہ مطول کتاب پانچ برس کی ایسی محنت کے بعد خدا کی مدد سے طیار ہوئی۔ کہ میں اکثر دن میں تو سات آٹھ گھنٹے تک کچہری کا کام کرتا تھا۔ پھر گھر پر اکثر ضروری و غیر ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس کتاب کی ترتیب و تحریر میں مشغول رہتا تھا۔ اس درمیان میں بعض راتیں مجھ پر ایسی گذریں۔ کہ گویا پلک سے پلک نہیں جھپکی۔ میں تھا اور حیاتِ دبیرؔ۔ چنانچہ یہ میرے دو شعر گویا میری اُس حالت کی تصویر ہیں۔ ؎

دلسوز ایک شمع ہے اور اک خدا کی ذات	خلوت میں دیکھتا ہوں تجلّی کائنات
میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ نہیں اس کا دھیان بھی	سنّاٹے میں زمین بھی ہے۔ آسمان بھی

اس کی ترتیب و تالیف سے پہلے ہر سال ایک مرثیہ دو ڈھائی سو بند کا میں کہ لیتا تھا۔ اِس پانچ برس کے پانچ مرثیے بھی پنجتن پاک کے مقبول مدّاح (حضرت دبیرؔ) کی لائف کے نذر کئے +

یہ سب محنت میں نے اس واسطے کی۔ کہ میں اس کام کو ایک فرض انسانی سمجھتا تھا۔ ملک یا قوم یا کسی فرقے پر میں نے احسان نہیں کیا۔ اس لئے صاف صاف عرض کرتا ہوں۔ کہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا۔ ؎

مجھ کو شکریہ کی خواہش نہ جزا کی خواہش	شکر صد شکر نہیں دل میں عطا کی خواہش

جلد اوّل بہت طولانی ہو گئی تھی۔ اس لئے شاگردوں کے حالات اور نمونہ کلام کو جلد ثانی میں شامل کر دیا ہے +

یہ کتاب **عالی جناب** مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کی مدد سے مرتب ہوئی ہے۔ اور جناب ممدوح نے صدہا اپنا قیمتی وقت اس کے فراہمی مضامین و درستی اور خط و طاد مضمون لکھنے میں صرف فرمایا ہے۔ جس کے شکریہ سے میں قاصر ہوں۔ میرے آقا جناب

امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اَلثَّنَاءُ بِاَکْثَرَ مِنَ الْاِسْتِحْقَاقِ مَلَقٌ وَالتَّقْصِیْرُ عَنِ الْاِسْتِحْقَاقِ عِیٌّ وَ حَسَدٌ۔ کسی کی مدح وثنا اُس کے حق سے زیادہ کرنا چاپلوسی ہے اور کمی کرنا عجز وحسد ہے۔

پس مَیں جناب موصوف کی مدح میں تقصیر کا معترف ہُوں۔ مگر یہ کمی محض میری عاجزی کی وجہ سے ہے۔ حسد سے نہیں ہے۔ مَیں نے اِس ادائے شکریہ میں اس کتاب کو جناب ممدوح کے نام نامی پر معنون کیا۔

طبع کتاب۔ اب چھپوانیکی فکر ہُوئی۔ اس زمانے میں جس طرح مفلس آدمی علم نہیں پڑھ سکتا (کہ اسکول و کالج کے مصارف بہت ہیں)۔ اُسی طرح کتاب بھی شائع نہیں کرسکتا۔ اُنہیں (علم دوست) جناب ممدوح نے یہ سخاوت وتحریک فرمائی۔ کہ چند رئیس مل کر اس کتاب کو چھپوادیں۔ اور خود وہ چھ سو روپیہ اپنے پاس سے لگانے پر بھی آمادہ ہُوئے۔ اور جناب نواب مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالنسھڑ نے اپنی دریادلی سے دو سو روپیہ اور جناب سید امیر حسن صاحب فروغ وکیل ہائی کورٹ ریاست حیدرآباد دکن نے سَو روپیہ سے کم رقم شریک کرنا چاہی۔ مگر مَیں نے سوچا۔ کہ کتاب بڑی ہے۔ اس طرح تین چار سو جلدیں چھپ کر نذر احباب ہوجائینگی۔ ملک میں کمالات دبیر سے عام وخاص کو آگاہ کرنے کی جو ضرورت ہے۔ وہ پُوری نہ ہوگی۔ کسی تاجر کے ذریعہ سے چھپواؤں۔ اُدھر لاہور میں جناب مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب نے مجھے خط لکھ کر خواہش ظاہر کی۔ اور اس کے عمدہ وصحیح چھپوانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ارزاں (کہیں ارزاں بعلت نہ سمجھئیگا) بیچنے کا وعدہ فرمایا۔ اِس لئے یہ کتاب ایک مرتبہ چھپوانے کے لئے چند شرائط پر اُن کو دی گئی +

زمانہ کی رفتار

یہ بات بھی کہنا شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ جناب مرزا دبیر مرحوم اپنے زمانے میں یکتا اور تمام شعراء معاصرین سے اعلےٰ (شاعر ومرثیہ گو) ملک میں مانے جاتے تھے۔ اور اس کے ماننے والے عوام الناس ہی نہ تھے۔ بلکہ اکثر اہل کمال کا اس پر اتفاق تھا۔ غالب دہلوی ایسے کامل کا قول تذکرہ جلوہ خضر وسرور ریاض سے مَیں اسی کتاب میں نقل کرچکا ہُوں۔ کہ "مرثیہ کہنا دبیر کا حق ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا"۔ واقعات انیس صفحہ ۶ سے بھی ایسا ہی خیال

اُس زمانے کے اہلِ علم کا پایا جاتا ہے۔ اور جو تقریظ دکن ریویو کے پرچہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں ایک صاحب نے مرزا مرحوم کے ایک مرثیے پر چھپوائی ہے۔ اُس میں بھی وہ صاف لکھتے ہیں۔ کہ "اپنے زمانے میں جناب مرزا صاحب سب سے بہترین شاعر تصوّر کئے گئے۔ اور بڑے بڑوں نے اُس وقت اُن کے کلام کے آگے سر ڈال دیا" باایں ہمہ اب زمانے کی رفتار کو دیکھئے۔ کہ یہی مقرّظ صاحب خیال فرماتے ہیں۔ کہ گویا مرزا صاحب مرحوم مرثیہ کہنا ہی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اسی ریویو (تقریظ) میں (جا بجا اظہار نقائص (جو اکثر غلطی کتابت طبع کے ہیں) فرمانے کے بعد) یہ مصرع اُن مرحوم کا ع "تائیدِ غیب کے ہیں نمونے یہ مرثئے" لکھکر لکھتے ہیں۔ کہ "مرثیہ کی جگہ مسدس فرماتے۔ تو کسی کو (کلام و) عذر نہ ہوتا" اور پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ "یہ اُسی فیّاض گھر (اہلِ بیت پیغمبر خدا صلعم) کا صدقہ ہے[1]۔ کہ اِس وقت بھی اُنکی نظم کے متعلق ایک طرف تو یہ فرمایا جاتا ہے۔ کہ "میر (انیس) صاحب کو سب سے بہتر شاعر مان لینے پر بھی اگر کوئی مرثیہ گو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ تو وہ مرزا دبیر ہی ہو سکتے ہیں" اور دُوسری طرف باوجود اس کے کہ ہم نہ اُن کی شاعری کو تسلیم کرتے (ہیں) نہ اُن کے مسدسوں کو مرثیہ کا اعلےٰ خطاب دے سکتے ہیں[2]۔ مگر پھر بھی اُن کا بہت کچھ ادب و لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے (ہیں) اور ایک نیک دل شریف النفس

[1] مَیں کہتا ہوں کہ بیشک سب ہی دونوں فیاض گھر کا ہے مگر اہلبیتِ اطہار جس طرح فیاض ہیں اُسی طرح عادل بھی ہیں۔ مرزا مرحوم نے جس پایہ کی منکی تھی ویسا ہی اُن حضرات نے صدقہ عطا فرمایا۔ کہ بڑے بڑے کاملوں نے اُنکی تیغ زبان کا لوہا مانا۔ اور بقول مقرظ صاحب "سر ڈال دیا" باقی اُور مداحوں کو اُتنا صلہ ملا جتنی اُن کی محنت تھی۔ کہ فیّاض عادل کے در سے کوئی محروم نہیں جاتا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس موقع پر مخدومی خان بہادر سیّد علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کے خط تحریر ۱۰ ستمبر ۱۹۱۱ء کے چند فقرے لکھنا بےمحل نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) "بلاشبہ یہ کام آپنے بہت اچھا کیا۔ کہ جنت مکان جناب مرزا دبیر مغفور کی سوانح عمری لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا مجھکو یقین ہے کہ آپ خوب لکھینگے اور تحقیق سے لکھینگے" (۲) "مَیں جناب مرزا دبیر مغفور کی خدمت میں حاضر رہا ہُوں۔ لکھنؤ میں جناب مرحوم کا مہمان رہا ہُوں۔ بیشک مَیں نے ۱۲۷۶ ہجری میں جناب مرزا صاحب سے ایک مرثیہ اور ایک فارسی مثنوی پر اصلاح لی ہے۔ اور مَیں اُن کو اپنا اور اس فن کا اُستاد جانتا ہُوں" (۳) "خود جناب مرزا صاحب جانتے تھے کہ مَیں میر انیس کا طرز پسند کرتا ہُوں لیکن باوجود اس کے علاوہ شاگردی و اُستادی کے مرزا صاحب پر اعتبار کر کے میرے بزرگ اور کامل الفن صاحب خلاق سعید اور مومن کامل

انسان ماننے کے ساتھ اُن کی پُرگوئی کے معترف بھی ہیں۔ والسّلام۔" اب مَیں کہتا ہُوں۔ اور بقول مشیر مرحوم ع "ڈنکے کی چوٹ کہتا ہُوں کچھ مجھکو ڈر نہیں" کہ اگر مرزا دبیر ہی مرثیہ گو نہ تھے۔ تو پھر ہندوستان بھر میں اُن کے زمانے میں کوئی صاحب مرثیہ گو نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اصل مرثیت (بزم) میں اور بزرگوار مرزا مرحوم کو نہیں پہنچتے۔ اور جناب معترض اسی (مرثیت) میں اُن کو ناقص خیال فرماتے ہیں۔ اس موقع پر ایک لطیفہ و واقعہ شیخ الرئیس بو علی سینا (حکیم کامل) کا یاد آگیا۔ شیخ کو کسی شخص نے کہ دیا تھا۔ کہ وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔ اُس کے جواب میں شیخ نے یہ رباعی کہی۔ ؎

لطیفہ

کفر چو من گزاف آساں نبود | محکم تر از ایمان من ایماں نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر | پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

مرزا صاحب کی مقبولیت کے باب میں مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا یہ قول بھی مَیں لکھنا چاہتا ہُوں (کہ جو اُنہوں نے اپنے مقدمہ دیوان کے صفحہ ۲ پر زیب قلم فرمایا ہے)۔ "(لارڈ بائرن کی طرح) لکھنؤ میں میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی تقریباً ایسی ہی قبولیت حاصل کی تھی۔ جو لوگ میر انیس کو پسند کرتے تھے۔ وہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جہاں تک ہو سکتا تھا میر انیس کی تقلید کرتے تھے۔ اور جو فریق مرزا دبیر کا طرفدار تھا۔ وہ ہر ایک بات میں اُن کی پیروی کرتا تھا۔ مگر لارڈ بائرن اور اُن دونوں صاحبوں کی قبولیت میں اتنا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) تھے میں اُنکی مخالفت کیونکر کرتا اور کس منہ سے کر سکتا ہُوں ہاں ۳۵ برس ہوئے کہ جناب مرزا صاحب کے بعض اوصاف و ممدوح نے مجھے کچھ ایسا پریشان کر دیا کہ جوش جوانی میں مَیں از خود رفتہ ہوگیا۔ تو وطن میں بعض یار کہ میرے قلم سے ایسے نکلے کہ مَیں شرمندہ ہُوں اور انکی روح پر فتوح سے معافی کا خواستگار۔ اُس کے بعد آج تک جانتا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایۃً خواہ صراحتاً نکلا ہو۔ خدا جانے مرزا اوج صاحب کو کس نے کہدیا کہ دکن ریویو میں میرا ایسا تحریر نکلی ہے۔ چنانچہ مجھ سے خود اُنہوں نے پُوچھا اور اُنکی تسکین کر دی۔ اور حق یوں ہے۔ کہ مَیں کچھ بھی واقف نہیں کہ یہ تحریر کس کی اور کب چھپیں"۔ (م) "مولوی شبلی (صاحب) کے موازنہ میں بھی علمی غلطیاں اور مرزا صاحب کی شان میں سخت زبانیاں بے انتہا ہیں۔ مَیں نے خود مولوی شبلی (صاحب) کے روبرو انکو متنبہ کیا لیکن میرا کہنا انکو سمجھنا ہے۔ یہ ہے حقیقت حال جسکو مَیں نے بلا کم و کاست آپکی خدمت میں عرض کر دیا۔" یہ چند فقرے اس غرض سے مَیں نے لکھ دئے ہیں۔ کہ بعض مرزا صاحب مرحوم کے مقلد جناب شاد مدظلہ کے اشارے سے ایسی آنتر لنطیں لکھنا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ اُن کا دامن کمال ایسے دھبوں سے پاک ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

فرق ہے۔ کہ لارڈ بائرن کی عظمت اہل انگلستان کے دل میں صرف اس وجہ سے تھی۔ کہ وہ اُس کو اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے اُس کو یکساں عزیز رکھتے تھے۔ بخلاف انیس و دبیر کے کہ اُن کی عظمت محض ایک مذہبی شاعر ہونیکی وجہ سے تھی۔ اور اسی لئے اُن کی بڑائی اور بزرگی جیسی کہ عموماً ایک فرقے کے دل میں تھی۔ ویسی عام طور پر دوسرے فرقے کے دل میں نہ تھی۔ یہ امتیاز یعنی قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے"۔ یہ ارشاد جناب حالی کا ایک حد تک درست ہے۔ مگر میں اس میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ابتداً میں حضرت مرزا دبیر کی اور پھر جب جناب میر انیس کی شہرت ہوئی۔ تو اُن کی بھی عظمت تمام اہل علم کے دل میں تھی (خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں)۔ لکھنؤ میں اُن کی عظمت سُنی۔ اور ہندو اہل علم بھی اسی طرح کرتے تھے جیسے شیعہ۔ اور محض مذہبی شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اخلاق حسنہ کا معلم بھی اُن کو جانتے تھے۔ میرے علم و خیال میں پہلے تعصب کا اتنا زور کبھی نہ تھا (جتنا اب ہے)۔ چنانچہ مرزا صاحب کے شاگردوں میں بھی بعض روشن خیال سنت و جماعت و صوفی حضرات اور بعض ذی علم کائستھ کشمیری پنڈت۔ کھتری وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ارشاد جناب ممدوح کا کہ "یہ امتیاز قومی و مذہبی حیثیت کا ہمارے اور اہل یورپ کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے" صحیح ہے۔ اور میں کہتا ہوں۔ کہ جوں جوں نئی روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کے آپس کے میل جول میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ تعصب بڑھتا جاتا ہے۔ تجربہ اس کا شاہد ہے۔ مگر علوم جدیدہ کا اس میں قصور نہیں ہے۔ ہمارا ہی قصور ہے۔ علم کا قصور ہوتا۔ تو یورپ میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ ہمارا مٹانے والا ایک مذہبی تعصب ہی نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی اُس کے کئی سگے سوتیلے (زبردست) بھائی ہیں۔ جن کے نام قومی تعصب۔ مقامی تعصب۔ خیالی تعصب وغیرہ وغیرہ ہیں +

قومی۔ مقامی
خیالی تعصب

ایک صاحب علم مسلمان جن کو سخن فہمی کا دعوےٰ ہے۔ گلزار نسیم ایسی شاداب و سرسبز مثنوی کی اس لئے تعریف نہیں فرماتے۔ کہ وہ ایک ہندو کی تصنیف ہے٭۔ یا ایک دہلی کا باشندہ یا مقلد اُن

٭ اس باب میں جو رائے عالی جناب مسٹر ہیرا لال صاحب شیدا اکبر آبادی دام اقبالہ کی اُن کی تقریظ میں ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیے + مؤلف حقیر

میں اس لئے عیب نکالتا ہے۔ کہ وہ ایک لکھنؤ والے کی مثنوی ہے۔ یا ایک دہلی کے طرز تغزّل کا دلدادہ عالم و شاعر جہاں عاشقانہ رنگ غزل کی پسندیدگی بیان کرتا ہے۔ وہاں شعرائے دہلی کے ساتھ ایک بھی لکھنوی شاعر کا۔ یہاں تک کہ حضرت آتش مرحوم کا (جن کے کلام میں بقول حضرت غالب مرحوم بیشتر یہ تیز نیشتر ہیں) جناب مومن دہلوی و جناب غالب کے ساتھ نام نہیں لیتا۔ اسی طرح ایک عالم شاعر اشعار کی خوبیاں بیان فرما کے چھانٹ چھانٹ کر دہلی والوں کے اشعار نظیر میں تحریر فرماتے ہیں۔ اور اگر ڈھونڈ کر کوئی شعر کسی لکھنؤ کے شاعر کا بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب شعر کی برائیاں بیان کر کے (برے اشعار) نظیر میں پیش کرتے ہیں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکثر اشعار شعرائے لکھنؤ کے زیب قلم فرماتے ہیں۔ اور ایک دو شعر کسی دہلوی شاعر کے بھی مصلحتًا ملا دیتے ہیں جس شخص کو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ یا اس کے بزرگ دہلی کے تھے۔ اُسکو اپنا باعث فخر سمجھ کر طرح طرح سے بڑھاتے ہیں۔ اور جسکو غیر سمجھتے ہیں اُسکو گھٹانے کی کوشش فرماتے ہیں۔

اسی طرح ایک لکھنؤ والا دہلی والوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ ایک شیعہ سخن سنج ایک سُنّی شاعر کی (کمال کی) اس لئے تردید کرتا ہے۔ اور اُس کے کمال کو مٹانا چاہتا ہے کہ وہ سُنّی ہے۔ اسی طرح ایک سُنّی سخن فہم شیعہ شاعر کی تنقیص (شیعہ ہونے کی وجہ سے) کرتا ہے۔

ایک شخص نے جو ایک شاعر کو اکمل سمجھ لیا ہے۔ تو اب وہ اُس کے مدّمقابل و معاصر شاعر کے کلام کو دیکھتا ہی نہیں۔ حالانکہ جس رنگ خاص کی وجہ سے شاعر اول الذکر کو اُس نے پسند کیا ہے۔ اُس رنگ کے اشعار بھی اُس کے مدّمقابل کے یہاں موجود ہیں[1]۔

---

[1] اس زمانے کے بعض اہل علم ایک کم علم شاعر کو ذی علم شاعر پر کھلا ترجیح دیتے ہیں۔ اُنکی دلیل یہ ہے کہ بڑے بڑے شاعر اکثر کم علم ہوئے ہیں شاعری فطری شے ہے علم کی محتاج نہیں۔ ثبوت میں شکسپیر کو پیش کرتے ہیں۔ مگر انکو شاید یہ علم نہیں کہ جو ڈراما اور ناول شکسپیر سے منسوب ہیں اُنکی نسبت خود اعلےٰ طبقۂ اہل یورپ کی یہ رائے ہے کہ وہ شکسپیر کے نہیں ہیں۔ بلکہ لارڈ بیکن کے ہیں۔ جو اُنھوں نے شکسپیر کے نام سے شائع کئے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ لارڈ بیکن کو جن کے علم و فضل کی ایک عالم میں دھوم تھی۔ اطمینان کُلّی نہ تھا۔ کہ پبلک اُن ڈراموں کے انداز کو پسند کریگی اور اُس اعلےٰ نظر سے دیکھیگی۔ کہ جو ایک عالم جیّد کی تصنیف کیلئے

مختصر یہ کہ آج کل اردو شاعری کے سمندر میں عجب طوفان برپا ہے۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے کلام کی بھی بعض بعض بزرگ اب ایسے ایسے خیالات و وجوہ سے قدر نہیں کرتے[۲] اور اُن کے حالات و کلام سے بھی اکثر ناواقف ہیں۔ تماشا یہ ہے۔ کہ ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں۔ کہ جن کے بزرگ مرزا صاحب کے فدائی یا شاگرد تھے۔ اب یہ مرزا کے مٹانے یا گھٹانے یا کم سے کم منبر کمال پر ایک زینہ نیچے بٹھانے کی کوشش میں ہیں +

اگر بلا تعصب کسی شخص کی یہ رائے ہے۔ کہ وہ اس اس بات میں اپنے کسی معاصر سے کم تھے۔ تو مضائقہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اصناف سخن میں ایک شاعر کا کمزور رہنا اور بعض میں دوسرے کا ممکن ہے۔ جناب امیرؑ سے کسی نے سوال کیا۔ کہ سب سے بڑھا ہوا شاعر کون ہے۔ فرمایا[۳] چوگان بازی کے گھوڑوں کی ایک ہی دستہ کی طرح جماعت شعرا نہیں چلتی ہے۔ تاکہ چوگان لے جانے کے وقت ان کا اعلےٰ درجہ پہچان لیا جائے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵ نمبر ۱) ضروری ہے۔ لارڈ بیکن نے اپنے ایک خط میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام اصناف سخن میں میرا کلام ہے۔ وہ صاحب جن کو علمی تحقیقات کا شوق ہے۔ اس مناظرے کے متعلق لٹریچر کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایسے اہل علم خیال نہیں فرماتے۔ کہ جب شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ اور قدرت جب ایک ایسے شخص کو یہ نعمت بخشے۔ جو بڑا ہو کر عالم بھی ہو۔ تو کیا قدرت وہ نعمت اُس شخص سے اس جرم میں چھین لیگی۔ کہ تو عالم ہے۔ جو لوگ فطرتی شاعر ہیں اور فاضل جید بھی۔ تو انکی شاعری پر علم سے صیقل ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ جن کو قدرت شاعر پیدا کرتی ہے۔ وہ بے علمی کی وجہ سے دُنیا کو اپنے خداداد فیض سے بہرہ مند نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ کے مشہور شاعر گرے نے ایک دیہاتی قبرستان کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے۔ کہ اس میں بہت ایسے کامل گڑے ہوئے ہیں۔ جن کو موقع ملتا۔ تو ملٹن اور کرامل کی طرح مشہور ہوتے۔ ایسے اصحاب ملک الشعرا انگلینڈ لارڈ ٹینیسن اور ملٹن او رکالی داس (شاعر و حکیم ہند) کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ جو فطری شاعر اور عالم متبحر تھے۔ یہی حال مرزا دبیر مرحوم کا بھی ہے۔ کہ وہ فطری شاعر اور عالم علوم معقول و منقول تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۲؎ علم و فضل جو آدمی کیواسطے باعث فخر ہے وہ دبیر کیلئے ایسے جہالت پرستوں نے عیب قرار دیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

۳؎ اصل عبارت نہج البلاغہ صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ مصر۔ سُئِلَ مَنْ اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ فَقَالَ ع۔ اِنَّ الْقَوْمَ لَمْ یَجْرُوْا فِیْ حَلْبَۃٍ تُعْرَفُ الْغَایَۃُ عِنْدَ قَصَبَتِہَا۔ فَاِنْ کَانَ وَلَا بُدَّ فَالْمَلِکُ الضِّلِّیْلُ۔ یُرِیْدُ امْرَءَ الْقَیْسِ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مختصر یہ کہ آج کل اردو شاعری کے سمندر میں عجب طوفان برپا ہے۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے کلام کی بھی بعض بعض بزرگ اب ایسے ایسے خیالات و وجوہ سے قدر نہیں کرتے[2] اور اُن کے حالات و کلام سے بھی اکثر ناواقف ہیں۔ تماشا یہ ہے۔ کہ ان میں وہ بزرگ بھی شامل ہیں۔ کہ جن کے بزرگ مرزا صاحب کے فدائی یا شاگرد تھے۔ اب یہ مرزا کے مٹانے یا گھٹانے یا کم سے کم منبر کمال پر ایک زینہ نیچے بٹھانے کی کوشش میں ہیں +

اگر بلا تعصب کسی شخص کی یہ رائے ہے۔ کہ وہ اس اس بات میں اپنے کسی معاصر سے کم تھے۔ تو مضائقہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اصناف سخن میں ایک شاعر کا کمزور ہونا اور بعض میں دوسرے کا ممکن ہے۔ جناب امیرؑ سے کسی نے سوال کیا۔ کہ سب سے بڑھا ہوا شاعر کون ہے۔ فرمایا[3]۔ چوگان بازی کے گھوڑوں کی ایک ہی دستہ کی طرح جماعت شعرا نہیں چلتی ہے۔ تاکہ چوگان لے جانے کے وقت ان کا اعلےٰ درجہ پہچان لیا جائے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵ نمبر ۱) ضروری ہے۔ لارڈ بیکن نے اپنے ایک خط میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام اصناف سخن میں سر الکلام ہے۔ وہ صاحب جن کو علمی تحقیقات کا شوق ہے۔ اس مناظرے کے متعلق لٹریچر کو ملاحظ فرمائیں۔ ایسے اہل علم خیال نہیں فرماتے۔ کہ جب شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ اور قدرت جب ایک ایسے شخص کو نعمت بخشے۔ جو پڑھا ہو کر عالم بھی ہو۔ تو کیا قدرت وہ نعمت اُس شخص سے اس جرم میں چھین لیگی۔ کہ تو عالم ہے۔ جو لوگ فطرتی شاعر ہیں اور فاضل جیّد بھی۔ تو انکی شاعری پر علم سے صیقل ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ جن کو قدرت شاعر پیدا کرتی ہے۔ وہ بے علمی کی وجہ سے دُنیا کو اپنے خداداد فیض سے بہرہ مند نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ کے مشہور شاعر گرے نے ایک دیہاتی قبرستان کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے۔ کہ اِس میں بہت ایسے کامل گڑے ہُوئے ہیں۔ جن کو موقع ملتا۔ تو ملٹن اور کرامل کی طرح مشہور ہوتے۔ ایسے اصحاب ملک الشعرا انگلینڈ لارڈ ٹینیسن اور ملٹن اور کالی داس (شاعر و حکیم ہند) کو کیوں بھول جاتے ہیں جو فطری شاعر اور عالم متبحر تھے۔ یہی حال مرزا دبیر مرحوم کا بھی ہے۔ کہ وہ فطری شاعر اور عالم علوم معقول و منقول تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] علم و فضل جو آدمی کیواسطے باعث فخر ہے وہ دبیر کیلئے ایسے جہالت پرستوں نے عیب قرار دیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] اصل عبارت نہج البلاغہ صفحہ ۲۵۵ مطبوعہ مصر۔ سُئِلَ عَنْ اَشْعَرِ الشُّعَرَاءِ فَقَالَ عَ۔ اِنَّ الْقَوْمَ لَمْ یَجْرُوْا فِیْ حَلْبَۃٍ تُعْرَفُ الْغَایَۃُ عِنْدَ قَصَبَتِہَا۔ فَاِنْ کَانَ وَلَابُدَّ فَالْمَلِکُ الضِّلِّیْلُ۔ یُرِیْدُ امْرَءَ الْقَیْسِ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

تھے - آغائی صاحب مرزا مرحوم کے فدائی اور اُن کے کلام کے دل سے شیدا تھے - اُن رئیس نے باتوں باتوں
میں جہاں میر صاحب مرحوم کے کلام کی اور تعریف کی - وہیں یہ بھی فرمایا - کہ میر صاحب کا ہر شعر دُوسروں سے ممتاز
ہے - ویسا فصیح و سلیس کلام دُوسرا کوئی شاعر کہہ ہی نہیں سکتا - یہ ایسے بیش بہا جواہر ہیں - جو تمام دُنیا کے
جواہرات سے اعلےٰ اور الگ نظر آتے ہیں - اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آغائی صاحب کسی ضرورت سے اندر
کے درجہ میں اُٹھ کر گئے - مجھے آنکھ کا اشارہ کیا - مَیں بھی وہیں پہنچا - تنہائی میں فرمایا - کہ یہ بزرگوار بڑی شیخی بگھارتے
ہیں - کہ مَیں میر صاحب کے کلام کو پرکھتا ہُوں - مَیں ابھی تم سے فرمائش کرونگا - کہ میر صاحب کا کچھ کلام پڑھو - تم کسی
مرزا صاحب کے مرثئے کے سلیس و فصیح و عام فہم چند بند پڑھ دینا - دیکھوں ان کا دعوے کہاں تک قابل قبول ہے -
مَیں نے کہا بہت بہتر - پھر وہ بھی آکر مجمع مذکورہ میں بیٹھ گئے - اور چند منٹ کے بعد مَیں بھی آبیٹھا - اِدھر اُدھر کی باتوں
کے بعد ناظم صاحب بولے - جناب نواب صاحب! مَیں آپکی کچھ دعوت کرنا چاہتا ہُوں - فرمایا - کیا؟ میری طرف
اشارہ کرکے فرمایا - یہ صاحب جناب میر صاحب کا کلام پڑھتے ہیں - اُن کے اکثر چھوٹی کے بند انکو زبانی یاد ہیں -
کہئے تو کچھ اُن کا کلام فصیح و لطیف سنواؤں - فرمایا - بسم اللہ ضرور پڑھوائیے نیکی اور پُوچھ پُوچھ - مَیں نے چند سلیس و
فصیح بند پڑھے - وہ وجد کرنے لگے - بار بار فرماتے تھے - دیکھئے جناب ناظم صاحب! مَیں نہ کہتا تھا - یہ فصاحت
یہ شیرینی کسی دُوسرے شاعر کے کلام میں کب ہے - اور خطا معاف - جناب مرزا صاحب گو مضمون آفرین ہیں -
مگر یہ بات اُن میں کہاں - یہ بندش کی صفائی - یہ زبان کی لطافت - یہ حسن بیان انہیں کا حصہ ہے - ناظم صاحب
بڑی دیر تک اُنکی لن ترانیاں چُپ چاپ سُنا کئے - آخر الامر جب وہ بہت تعریف فرما چکے - تو (آغائی صاحب)
بولے - جناب نواب صاحب - دبیر جامع اصناف سخن ہے - اُس کے یہاں جہاں بلاغت و مضمون آفرینی
کے ڈھیر لگے ہُوئے ہیں - وہیں ان باتوں کی بھی کمی نہیں ہے - وہ ہر رنگ میں کہتا ہے - فرمایا - اچھا اب اُن کے
بھی چند بند ایسے فصیح و سلیس سنوا دیجئے - تو مَیں مان لُونگا - آغائی صاحب ہنسے - اور فرمایا - کہ جناب یہ دبیر ہی کا
فصیح و سلیس کلام تھا - آپ تو اُسکا کلام نہ دیکھتے ہیں نہ سُننا چاہتے ہیں - وہ بزرگوار چُپ ہو گئے - پھر اور کچھ
باتیں شروع ہو گئیں - خود مجھ کو بھی بعض ایسے سخن فہموں سے کام پڑا ہے - مَیں نے دبیرؔ و انیسؔ کے مرثیوں سے
بند چھانٹ چھانٹ کے ایک مرثیہ مرتب کر لیا ہے - جس میں دو چار بند میر صاحب کے پھر دو ایک بند مرزا صاحب کے

لکھے ہیں۔کہیں چار مصرع میر صاحب کے اور ٹیپ مرزا صاحب کی ہے۔جب ایسے کوئی صاحب مل جاتے ہیں۔ اور ایک کے کلام سے رغبت اور دُوسرے سے نفرت ظاہر فرماتے ہیں۔اور یہ دعوٰے کرتے ہیں۔کہ میں کسی ایک کے کلام کو خوب پرکھتا ہُوں۔تو میں وہ مرثیہ پیش کر کے عرض کرتا ہُوں۔بتائیے۔یہ کس کا کلام ہے۔اوّل تو اسی میں اُن سے غلطی ہو جاتی ہے۔کہ کسی ایک کا کلام (تمام مرثئے کو) بتا دیتے ہیں۔پھر جب میں صاف کہہ دیتا ہُوں۔کہ اس میں دونوں بزرگوں کے بند مخلوط ہیں۔اب بتائیے۔کونسا بند میر صاحب کا اور کونسا مرزا صاحب کا ہے۔تو ایک کے بند کو دُوسرے کا بتا دیتے ہیں۔بڑے بڑے مدّعیان سخن شناسی کی قلعی ایسے موقع پر کھل جاتی ہے +

اس لکھنے سے میری یہ غرض نہیں ہے۔کہ میر و مرزا کے کلام میں ما بہ الامتیاز الفاظ اور بندشیں نہیں ہیں۔ہیں مگر خاص خاص۔ایک مرثیہ کو شرُوع سے اخیر تک دیکھ کر سخن شناس ضرور غور و فکر کے بعد پہچان لیگا۔کہ یہ مرزا کا مرثیہ ہے یا میر کا۔یا اور کسی کا۔مگر نہ ہر ایک کا یہ کام ہے۔نہ ہر بند و ہر بیت کی پہچان آسان ہے +

بعض دبیر و انیس کے ایسے فدائی بھی دیکھے گئے۔کہ جبتک وہ مرثیہ سُنکر یہ سمجھتے رہے۔کہ یہ ہمارے ممدوح (دبیر یا انیس) یا اُن کے خاندان کی تصنیف ہے۔مجلس میں تعریف کرتے رہے۔اور جب کسی کے کہنے یا کسی قرینے سے یہ ثابت ہُوا۔کہ دُوسرے خاندان کا یا دُوسرے بزرگوار کا کلام ہے۔ایسے چُپ ہو گئے۔کہ گویا تعصّب نے گلا گھونٹ دیا۔ہر شخص کو خدا ایسے تعصّب سے بچائے۔عجب رنگ چھایا ہُوا ہے۔(المؤلف) ؎

ہر ایک رنگ کو ہم بار بار دیکھتے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ خزاں میں بھی تری شیدا بہار دیکھتے ہیں

اس موقع پر یہ لکھنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔کہ بعض انگریزی خوانوں کے خیالات ملک میں پھیلنے کی وجہ سے قلزم شاعری اردو میں اور بھی کئی طوفان آج کل اُٹھ رہے ہیں۔جو غالباً موسم کی طرح شاعری کے رنگ کو کچھ نہ کچھ ضرور بدل دینگے۔بعض حضرات تشبیہات و استعارات کو ہی مخرب شاعری فرماتے ہیں۔بعض (مبالغہ کے ساتھ) مبالغہ مقبول کی بھی مذمت کرتے ہیں۔کچھ اہل علم ایسے بھی ہیں۔جو تمام صنائع و بدائع کو (چاہے وہ کتنی ہی بیساختہ نظم ہوں) شاعری کے چہرے پر بدنما داغ دبتے سمجھتے ہیں۔بعض اس کو بدعت شاعری قرار دیتے ہیں۔ان لوگوں کی رائے ہے۔کہ اردو کی شاعری ہو ڈرامہ سے آج خالی نظر آتی ہے۔اُس کے اسباب یہی

تشبیہات وصنائع وبدائع وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ حضرات یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں۔ کہ بھاشا میں ڈراما علےٰ درجہ کا ہے۔ مَیں عرض کرتا ہُوں۔ کہ اگر ڈرامہ نویسی کو ان چیزوں سے (اردو میں) رونکا۔ تو بھاشا یا کیوں نہیں یہ سنگ راہ ہُوئیں۔ کیونکہ جس طرح اردو نے فارسی وعربی کا دودھ پی کر ہوش سنبھالا ہے۔ بھاشا سنسکرت کی گود میں پلی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ سنسکرت میں جس کثرت سے تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع ومبالغے ہیں۔ شاید کسی دُوسری زبان میں ہوں۔ مَیں نے اِس کتاب میں جا بجا یہی ثابت کیا ہے۔ کہ ان صنائع وبدائع ومبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جنکو کروڑوں آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں مثلاً بائبل شریف اور قرآن مجید اور وید۔ اور صنائع وبدائع کے باب میں جو جو آیت جس جس صنعت میں تھی۔ وہ بھی (اُس صنعت کی تعریف کے ساتھ) مختصر المعانی وغیرہ کتب معانی وبیان سے لکھتا چلا گیا ہُوں۔ اگر بالفرض آج یہ چیزیں یورپ میں بری سمجھی جاتی ہیں۔ تو کچھ پروا نہیں۔ ذرا صبر کیجئے۔ سنسکرت۔ عربی۔ فارسی وغیرہ کی کتابیں وہاں جب زیادہ ترجمہ ہوجائینگی۔ تو ممکن نہیں۔ کہ یورپ کو اپنے رنگ پر کچھ نہ کچھ نہ لے آئیں۔ پھر آئندہ وہاں بھی صنائع وبدائع وغیرہ کے مینہ برسینگے۔ یہ بھی عرض کردوں۔ کہ شاعر کا کام محض ڈرامہ لکھنا ہی نہیں ہے۔ اقسام سخن میں سے (ڈرامہ) بھی ایک قسم لطیف ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ اردو کی شاعری (ڈرامہ نویسی سے) زیادہ تر قافیہ وردیف ودیگر قیود نظم کے سبب سے محروم رہے۔ تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔ بیشک بڑی بڑی ردیفیں اور مشکل قافئے کبھی کبھی بڑے بڑے شاعروں کا قافیہ تنگ کردیتے ہیں۔ اردو کے شاعروں نے قافیہ کو وہ وسعت بھی نہ دی۔ جو ایرانیوں تک نے بخشی تھی۔ مثلاً قریب المخرج حروف کا قافیہ یا ایسا قافیہ جیسا کہ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ ؎

کہ اے شاہ آفاق گستر بعدل　　　اگر من نماندم تو مانی بفضل

عدل فضل کا قافیہ اگر کوئی اردو کا شاعر باندھ دے (حالانکہ حرف روی لام ہے)۔ تو ہر شخص گردن دبانے کو موجود ہے۔ اگر ردیف نہ لائیں۔ تو سامعین اُس شعر کو لنڈورا کہتے ہیں۔ حالانکہ ردیف جب تک بے تکلف نہ آجائے۔ شاعر کو میری رائے میں ہرگز نہ لانا چاہئے۔ اس باب میں براہ راست عرب کی تقلید کرنا چاہئے۔ جہاں ردیف شعر میں نہیں ہوتی۔ اُونٹ پر دو برابر برابر بیٹھنے والوں کو (عرب) ردیف کہتے ہیں۔ مولوی خواجہ حالی مدظلہ العالی کے دیوان میں مجاز۔ نماز کے قافیوں میں شاد کا قافیہ دیکھ کر مَیں اس قدر خوش ہُوا۔ کہ

آزاد کر دیا جس نظم کو بلینک ورس کہتے ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ اردو کا مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز نہیں ہے۔
جو ہم مرثیہ گو شاعر کو ڈرامہ کی قیود سے باہر ہوتا ہُوا دیکھ کر یہ الزام دیں۔ کہ وہ ملک کی بدمذاقی یا اور کسی سبب سے
بہک گیا۔ مرثیہ اردو تمام اصنافِ سخن کا جامع ہے۔ ایک ایسا خوشنما باغ ہے۔ جس میں گلاب۔ بیوتی۔ کیوڑہ۔
جوہی۔ چنبیلی۔ بیلا۔ چاندنی۔ نیلوفر۔ لالہ وغیرہ وغیرہ کے بیشمار خوشبودار خوش رنگ پھول نظر آتے ہیں۔ اور
خوش ذائقہ و خوشبودار پھل بھی موجود ہیں۔ مرثیہ میں کہیں غزل کی شان ہے۔ کہیں قصیدے کی آن بان ہے۔
کہیں مثنوی کا تسلسل۔ کہیں ترکیب بند و ترجیع بند کی ایسی ترکیب ہے۔ کہیں کہیں ڈرامہ کا بھی لطف کسی واقعہ
کے بیان میں آجاتا ہے۔ اتنی ردیف۔ قافیہ وغیرہ وغیرہ کی قیدوں پر یہ شعراء اہلبیتؑ کمال کرتے ہیں۔ کہ بعض
جگہ ایسا سماں دکھا دیتے ہیں۔ کہ آنکھوں کو نہیں دل کو حیرت ہو جاتی ہے (جیسا کہ مَیں اُوپر مفصل عرض کر چکا
ہُوں) + مرزا مرحوم کا کلام ہر رنگ میں ہے۔ اس لئے ایسے دلکش پھولوں کی بھی (اُن کے باغ نظم میں)
کمی نہیں ہے۔ اُن کا کلام ڈرامٹک خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ آپ کو اس کے کچھ نمونے تو جلد اوّل
حیات دبیر میں ملینگے۔ باقی اکثر جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیگا۔ جو لکھی ہوئی رکھی ہے۔ فقط چھپنے کی دیر ہے۔
مَیں نے مرزا صاحب کا دقیق سے دقیق اور سلیس سے سلیس کلام اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ بعض صاحب
جو یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا تمام کلام دقیق ہوتا ہے۔ یہ خیال اُنہیں لوگوں کا ہے۔ جنھوں نے سب کلام
اُن کا نہیں دیکھا۔ بلاغت۔ فصاحت۔ سلاست۔ متانت سب مرزا مرحوم کے کلام میں اپنے اپنے مقام پر موجود
ہیں۔ جب وہ سلیس نظم کہنے پر آتے ہیں۔ تو پھر ایسا بے تکلف اور بیساختہ کلام موزوں فرماتے ہیں۔ کہ جس کو
دیکھ کر دُوسرے شاعر تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔ یہ تو اُس مرثئے کی شان تھی۔ جس کے موجد جناب میر ضمیر
مرحوم اور مقلد اور اُس کو معراج کمال پر پہنچانے والے دبیرؔ و انیسؔ تھے۔ مگر فی زمانہ جہاں اور
چیزوں میں تغیر ہُوا۔ مرثیہ گوئی نے بھی کچھ پلٹا کھایا ہے۔ کچھ تو علمائے اعلام کی ہدایتوں کا اثر ہُوا۔ کہ جنہوں
نے زیادہ مضامین خیالی اور بے اصل روایتوں کے بیان کرنے کی سخت ممانعت فرمائی۔ کچھ علوم جدیدہ نے خلاف
عقل و عادت مبالغوں کو روکا۔ اور اب بجائے اُس رعایت لفظی کے جو بھری ہوئی ہو مضامین عالی کی طرف

مرثیہ طرز جدید

زیادہ توجہ ہوئی۔ صنائع و بدائع بھی اب وہی زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ جو بے تکلف ہوں۔ اور بے تکلف صنائع و بدائع نظم کرنا ہر شاعر کا کام بھی نہیں ہے۔ اس لئے اب یہ چیز یں مرثیہ طرز جدید میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ حقیر بھی اپنی تصنیف (مرثئے) میں ان اکثر باتوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ گو میں کیا اور میرا کلام کیا۔

اِس موقع پر یہ بھی عرض کردوں۔ کہ حضرت دبیر کا ایک فیض تلمذ یہ بھی ہے۔ کہ فی زمانناجن شعرا اہلبیت نے مرثیہ کو خلعت تجدید بخشا۔ وہ بھی میرے علم میں مرزا صاحب کے شاگرد ہی ہیں۔ اور وہ بزرگوار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے مرثیوں میں اصل روایات و واقعات نظم فرمائے۔ اور بجائے رعایت لفظی کے مؤثر الفاظ لانے کو مقدم سمجھا۔ جناب موصوف کے مرثیوں میں فلسفیانہ مضامین کے ساتھ عرب کی شاعری کی وہ شان نظر آتی ہے۔ جس کے خوشہ چین آج اہل یورپ بھی ہیں۔ اخلاق حسنہ کی نئی شان سے (مرثیوں میں) مرح دشنا اور بد اخلاقیوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ اہلبیت اطہار کے درجات عالیہ کا ہر مقام پر (اپنے والد ماجد مرحوم کی طرح) لحاظ رکھا ہے۔ بیجا مبالغوں سے کلام کو بہت بچایا ہے۔ اس طرف کے اکثر مرثیوں میں احادیث و سیر کے مضامین بعینہٖ اردو میں بلا تکلف نظم فرمائے ہیں۔ یہ زبان اردو پر انتہائی قدرت کا ثبوت ہے۔ ایک مرثیہ میں جہاں حضرت مسلم بن عقیل کے سفر کی تصویر کھینچی ہے۔ وہاں بالکل عرب کا وہ جنگل دکھا دیا ہے۔ جسمیں کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں نظر آ رہے ہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو یہ نیچرل نظم ہے (یہ نہیں کہ باغ تو عرب کا دکھانا مقصود ہے۔ مگر [illegible] کے دکھا سکتے ہیں جس کا اُس سر زمین پر نام بھی نہیں ہے)۔ اسی طرح سیکڑوں حقیقتیں فرمائی ہیں۔ جو اُن کے مرثیوں کے مُنفرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کمال یہ ہے۔ کہ ایسی ایسی پابندیوں کے ساتھ دُنیا بھر کی اعلےٰ درجہ کی شاعری موجود ہے + (۲) جناب حکیم مولوی فقیر حسین صاحب عظیم مرحوم کے مرثیوں میں پابندی روایت کی اعلےٰ شان نظر آتی ہے + (۳) خان بہادر جناب مولوی سید علی محمد صاحب شاد (عظیم آبادی) مدظلہ نے (جن کو جناب مرزا صاحب مرحوم کی شاگردی پر فخر ہے۔ اور جنھوں نے باوصف کئی انقلابوں اور کئی دوستوں کی تحریک و ترغیب کے کسی دوسرے (صاحب کمال) کی شاگردی نہیں قبول کی۔ اور جو اِس حقیر کو ایک سرفراز نامہ حال میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "مجھ کو میرا کانشنس بالکل اجازت نہیں دیتا۔ کہ میں ذرا بھی (مرزا صاحب کی) شاگردی کی حد سے تجاوز کروں۔ آپ سے لئے تکلف یہ لکھ دیں۔ کہ مجھکو

... فرماتے ہیں۔ کہ میں اب واقعی یہ
چاہتا ہوں۔ کہ جناب مرزا صاحب مغفور کا خاک پا ہو کر کتاب میں جگہ پاؤں"۔ اپنے مرثیوں
میں امور مذکورہ وغیرہ کی رعایت فرمائی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اس موقع پر کچھ اُن کی نظم و نثر
لکھ دوں۔ جو حقیر کے اصرار بلیغ پر اُنھوں نے عنایت فرمائی ہے (مفصل حال اور مفصل کلام جناب ممدوح
کا آپ دُوسری جلد حیات دبیر میں ملاحظہ فرمائینگے۔ انشاء اللہ) +

ماخوذ سرفراز نامہ جناب شاد مدظلہ مورخہ ۲۱ رجنوری ۱۹۱۳ء سے

میں ہرگز اس کا مدعی نہیں ہوں۔ کہ میرے مقابلہ میں کوئی نہیں ہے۔ لاحول ولا قوۃ الخ۔ بات یہ ہے کہ
جو طرز مرثیہ گوئی کی میر ضمیر مغفور نے نکالی تھی۔ اُس کو مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ اوج کمال پر پہنچا گئے۔ غیر ممکن
ہے۔ کہ کوئی اُس حد تک پہنچ سکے۔ بجز اس کے کہ وہی باتیں اندک تغیر کے ساتھ پھر نظم کی جائیں جن کو
سُنتے سُنتے پُرانے لوگ تو اُکتا گئے۔ اور نئے لوگ اصلیت کے جویا اور یورپ کا انداز شاعری پسند کرنیوالے
کثرت سے پیدا ہونے لگے۔ اب وہ چبائے ہُوئے اور اُگلے ہُوئے نوالے کب پسند ہوتے ہیں۔
علاوہ اس کے اب آنکھیں اور ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ صحیح روایتوں سے تجاوز نہ ہو۔ اور کربلا کے واقعہ
کی اخلاقی حالت میں ذرا بھی فرق نہ آئے" +

(۲) یہ جدّت نہایت ہی مشکل ہے۔ برسوں چاہئے۔ کہ فلسفہ کی مختلف کتابوں اور یورپ والوں کے
انداز بیان پر غور کرے۔ مختلف مذاہب کی کتابوں پر نظر ہو۔ اور کیا کیا عرض کروں۔ کہ کتنی معلومات
اور کتنے ذرائع ہیں۔ ان پر عبور پیدا کر لینا آسان تھوڑا ہی ہے۔ باوجود ان سب کے یہ دیکھنا۔ کہ یہ
فلسفیانہ و اخلاقی مضامین اس طریقے سے ادا ہوں۔ کہ اردو زبان کی شاعری کا مذاق قائم رہے +

(۳) غالباً شروع شروع لوگ نئے طریقے کو دیکھ کر سخت بھیانک ہونگے۔ مگر پٹنہ کے سمجھدار تو شائد
ہی پرانے انداز کو پسند کریں +

(۴) بہر حال میرا تو اب زمانہ آخر ہو چکا۔ اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ کوتاہی نہیں کی۔ اب قوم جانے
اور قوم کے با فہم جانیں۔ ع یاد آئیگی تمہیں میری وفا میرے بعد +

(۵) مَیں نے ایک مرثئے میں عدو و مرثیہ کو تمہید میں نظم کرکے پڑھا جس کے بعض بند آپ کے سننے اور کتاب میں داخل کرنیکے قابل ہیں۔ دُوسرے کاغذ پر لکھ کر حاضر کرتا ہُوں +

(۶) حسبِ عادت تین بجے شب کو اُٹھا جلد جلد سب کاموں سے فارغ ہوکر صرف نمازِ صبح پر کفایت کی اور یہ سب بند اور یہ خط آپکو لکھا غنیمت ہے کہ مزاج درست ہے +

(۷) شائقین دُور و نزدیک سے خدا جانے کس قدر اصرار کرتے ہیں مگر بخدا مَیں ایک مصرع بھی کسی کو نہیں لکھتا۔ خدا جانے آپنے کیا اعجاز کیا۔ کہ مَیں اِس محنت پر قادر ہو رہا ہُوں * +

(۸) جلد اوّل حیات دبیرؔ میں جہاں آپ نئے طریقے کی مرثیہ گوئی کو تحریر فرمائیں ان کو ضرور داخل کریں ممکن ہے۔ کہ مرثیہ گویوں کو فائدہ پہنچے +

نظم جناب شادؔ مدظلہ

اے خضرِ شوق راہ حقیقت بتا مجھے ۔ منزل پہ جو پہنچ گئے اُن سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بُو سے وہ ساغر پلا مجھے ۔ جویا ہے جس کی رُوح وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقّع صدق و صفا کہیں ۔ وہ مرثیہ سُنا۔ جسے سب مرثیا کہیں

باتیں ہوں اِس طرح کی تجھے اے زباں پسند ۔ سُن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سُنا کئے ہیں جسے وہ کہاں ۔ پسند ۔ اب اہلِ بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوقِ سخن میں ذائقۂ طبع کھو نہ جائے ۔ اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے

یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام ۔ جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیتِ کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معانی کا انتظام ۔ نظروں میں ہوں تُلے ہُوئے سب موقع و مقام
تصنیفِ شعر کے لئے لازم شعور ہے ۔ تقلیدِ بے محل سے کنارا ضرور ہے

لطافت
روایت

* یہ سب جنابِ شادؔ مدظلہ کی محبّت و عنایت ہے۔ ورنہ مَیں کیا میرا عرض کرنا کیا۔ اِس پیرانہ سالی میں یہ تکلیف شاقہ گوارا فرماکر کلام و حالات دیگر کتاب کی عزّت بڑھائی ہے۔ جلد ثانی میں جناب ممدوح کے حالات و کلام پڑھ کر ناظرین بہت شاد ہو جائیں گے

شاعرانہ مبالغہ

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر | اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی ہنر | آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو | مطلب وہ کیا۔ کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

تشبیب

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام | آسان سمجھ لیا ہے زمانے نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنعت میں داخل ہے لاکلام | لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام
مدنگاہ درد و غم جاں گزا رہے | گلدستۂ سخن نہ بنے۔ مرثیا۔ رہے

مضامین والفاظ

مضموں نہ ہوں رکیک نہ الفاظ ہوں دقیق | تا ہو نہ جائے سنتے ہی سنتے دلوں کو ضیق
اعلیٰ ہو فکر شعر۔ خیالات ہوں عمیق | لفظیں ہوں پُراثر کہ دلوں کو کریں رقیق
مضموں وہ چست ہو کہ مزہ صبح و شام دے | خلوت میں اک لئیق مصاحب کا کام دے

بہار

جب دشت ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار | مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار
بے آب خشک ہو گیا زہرا کا لالہ زار | بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار
باقی نہ جان تھی نہ لہو جسمِ زار میں | کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں*

ساقی نامہ

ہے یہ بیان واقعہ شاہ خاص و عام | جانے نہ پائے ہاتھ سے سر رشتۂ کلام
اس ضمن میں شراب ولا کا گر آئے نام | بے جا کبھی نہ جام کے اوپر لنڈھائے جام
قطرے سے جو اس شراب کے ہوں خوں ناب ہوں | ساغر تو آنکھ میں ہو یہ آنکھیں پُر آب ہوں

اخلاقی مضامین

ہے جن امور کا فن اخلاق میں جواز | ہے مرثیوں میں اُن صفتوں کا فقط مجاز
لازم ہے عامیانہ مضامین سے احتراز | سننے کے ساتھ تاکہ ہوں سامع کے دل گداز
افسانہ مصائب شاہ زماں ہے یہ | اتنا رہے لحاظ کہ کس کا بیاں ہے یہ

عامیانہ مضامین

* حقیر کے خیال میں اگر خالی بہاریہ مرثیہ میں نظم ہو۔ تو بیشک محل اعتراض ہے۔ اور اگر اسکے ساتھ ساتھ مرثیت کے گوشے اور غم والم کے کنائے اشارے بھی ہوں تو پھر وہ بہار بہار مرثیت ہے۔ ہم نے جو اہل سخن کی رائے ہو (حقیر نے جس مرثیہ میں بہار کہی ہے مرثیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا) اور غور دیکھئے۔ تو خود اس بند حضرت شاد مدظلہ میں مرثیت کی بہار ہے۔ عجب موثر بند ہے ۱۲ مولف حقیر۔

اِس طرح سے ہو حال شہ کربلا رقم	ماخوذ ہو صحیح روایت سے یک قلم
رکھے بہت سنبھال کے اس راہ میں قدم	عاقل پُل صراط سے سمجھے اسے نہ کم
تابع رہے خیال عقیدت نیوشس کے	آئے فریب میں نہ طبیعت کے جوش کے
ظاہر ہر ایک شے کا ہے ایک۔ ایک ہی بطوں	حاوی رہیں ہر اک پہ خیالات ذوفنوں
سمجھے کہ ہم ہیں کوئی صداقت ہیں رہنموں	لفّاظیوں سے باطن شے کا کرے نہ خوں
جان آتی ہے کلام میں معنی لغز سے	کس کام کا وہ پوست جو خالی ہو مغز سے
مضموں نہ آئیں وہ جو ہیں اخلاق سے بعید	ہر طرح جن کی منع ہیں تاکید ہے شدید
یہ شاعری خزینۂ باطن کی ہے کلید	لازم ہیں اس کی حفظ میں بھی کوششیں مزید
حقّا یہ کام اہل ریاضت کا کام ہے	نا اہل کو تو ہاتھ لگانا حرام ہے
شاعر کے دل میں عشق کا جب تک نہ ہو گذر	ہے مثل سرو نخل ریاض اُس کا بے ثمر
اے عشق جلوہ گاہ ہے تیری بتا کدھر	آنکھیں کہاں سے لاؤں جو آ جائے تو نظر
حاصل جو سر میں کیف۔ تو دل کو سرور ہو	تو روشنی دکھا۔ تو اندھیرا یہ دور ہو

عشق حقیقی

یہ تو مرزا صاحب کی مقبولیت اور مرثیہ سابق وحال کی بحث تھی۔ اب اس لائف (سوانح عمری) کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بعض بزرگوار ایسے بھی ملے۔ جو سوانح عمری لکھنا بے سود فرماتے ہیں۔ لکھنؤ میں مجھ سے ایک میرے دوست (شیعہ اور دبیریئے) نے فرمایا۔ کہ تم نے پانچ برس تک ناحق حیات دبیر لکھنے میں اپنا وقت ضائع کیا۔ کیا مرزا صاحب کے کمال سے کوئی انکار کرسکتا ہے۔ خود اُن کا کلام اُن کی لائف اور اُن کے کمالات کا مظہر و کاشف ہے۔ مَیں نے بجا و درست کہکر ٹال دیا۔ اسی طرح اور بھی چند شیعوں اور دبیریوں کو مَیں نے اپنی رائے کا مخالف پایا۔ مگر کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کی۔ اور یہی سمجھ لیا۔ کہ یہ بزرگ ابھی تک لائف کی ضرورت و نتائج سے بیخبر ہیں۔ اور اِسی سبب سے اِس کتاب میں مجھے ایسے روشن خیالوں سے بہت کم مدد ملی۔ مگر جہاں لکھنؤ میں ایسے ایسے حضرات (ضرورت زمانہ سے بیخبر) تھے۔ وہاں بعض ایسے علم دوست

بھی سے جنہوں نے میری محنت کی قدر کی۔ حالات بتانے میں مدد دی۔ کلمات تحسین و آفرین سے میرا دل بڑھایا۔ اور علاوہ شیعوں کے مجھے
اکثر اہل سنت و جماعت اور اہل ہنود نے (حامیان علم و کمال) نے بھی مدد دی جن میں سے مسٹر ہیرالال صاحب سود بی۔ اے سب جج
کوٹہ و منشی ہیرالال صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی جوڈیشل سکرٹری محکمہ عالیہ خاص ریاست کوٹہ خاص طور پر قابل بیان و ادائے
شکریہ ہیں۔ بعض میرے احباب نے میرے واسطے ایسی کتابیں مہیا فرمائیں جن کی اس کتاب کی تالیف میں بہت ضرورت
تھی۔ ایسے قدردانوں میں جناب میر محمود حسن صاحب ثاقب دہلوی مقیم و وکیل درجہ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ
خاص طور پر قابل مدح ہیں جن کے کتب خانہ سے بھی مجھے مدد ملی۔ اور جنہوں نے محض حیات دبیر کی تالیف کے واسطے بہت سی کتابیں خود خرید
فرما کے مجھے دیں۔ اُن کے بعد قابل ذکر جناب حکیم سید احمد حسن صاحب مقیم کوٹہ منیجر مطابق الشفا و طبیب ریاست سرمور ناہن و حکیم مولوی
مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ اور مولوی سید نظیر حسن صاحب سخا دہلوی مشنری اسلام و فوٹوگرافر مقیم
ریاست جے پور ہیں۔ میں ان تمام صاحبوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں +

یہ بات بھی افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں۔ کہ جہاں ایسے ایسے صاحبوں نے مدد دی۔ وہیں بعض اہل علم نے میرے
متواتر خطوں کا جواب ہی نہیں دیا۔ اور محض اظہار رائے سے بھی دریغ فرمایا۔ بعض صاحبوں نے جو حالات انکو زمانہ شاہی اودھ
کے (مرزا صاحب کے متعلق) معلوم تھے۔ باوصف پوچھنے اور درخواست کرنے کے نہ بتائے۔ بعض صاحبوں نے شاگرد حضرت دبیر ہو کر
اپنے حالات سُننے سے بھی بُخل فرمایا۔ اور جو نظر عنایت پہلے فرماتے تھے۔ اُس میں بھی کمی کی +

بعض ہمارے ہم مشرب جو اس لائف کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ انکو یہ نعمت (کلام دبیر) مجالس عزا
میں اکثر حاصل ہوتی رہتی ہے۔ غالباً اس بنا پر وہ ایسی کتاب کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے بعض (اہل علم)
سُنّی اور ہنود جو اس کے مشتاق و قدرشناس زیادہ ہیں۔ اُسکی وجہ شاید یہ صحیح ہو۔ کہ وہ ضرورت زمانہ سے واقف ہیں۔ اور
اہل علم ہیں علم و کمال کی قدر فرماتے ہیں۔ اور ایسے کلام سُننے کا کم اتفاق ہوتا ہے + یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ شمس العلما مولوی
شبلی صاحب کے بیجا اعتراضوں اور الزاموں کے جواب بھی میں نے مہذب و مؤدب الفاظ میں دئے۔ اور انکی سخت کلامی کا جواب بھی
سخت الفاظ میں حتے الامکان میں نے نہیں دیا۔ میں مولوی صاحب کی کتاب کی اور بعض مقامات کی بھی تردید کرتا۔ مگر مجھے معلوم
ہو گیا۔ کہ دو مستقل کتابیں اور بھی انکی تردید میں اسی زمانے میں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک تو میرے اُستاد بھائی جناب چودھری
سید نظیر الحسن صاحب رئیس جہابن کی (المیزان) ہے۔ جو علی گڈھ میں چھپ رہی ہے۔ دوسری جناب سید

مولانا مولوی شبلی صاحب

قند الحقائق حسین خاں صاحب جونپوری کی کتاب ہے۔ کہ وہ بھی شاید عنقریب چھپے[ف]۔ پس میں نے سوچا۔ کہ ضروری ضروری جوابات مولوی صاحب کو میں نے دے دئے ہیں۔ جو صاحب اس سے زیادہ مشرح اور سب لزامات کے جوابات دیکھنا چاہینگے۔ وہ اُن کتابوں میں ملاحظہ فرمالینگے۔ اور ان دونوں صاحبوں کو مجھ سے زیادہ فرصت بھی ہے۔ اور لیاقت بھی ہے[۵۲]

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب کو میں نے اُن بیجا اعتراضوں کے بھی جواب دئے ہیں۔ جو انہوں نے میر صاحب پر فرماکر اُن کے کمالات کو (جس کے وہ زبان سے معترف ہیں) مٹانا چاہا ہے۔ کیونکہ میں کمالات میر صاحب مرحوم کا بھی دل سے معترف ہوں۔ اور ہرگز اُن کی تنقیص بیجا کا روادار نہیں۔ البتہ عبدالغفور صاحب نساخ بنگالی کی کتاب انتخاب نقص کے اعتراضوں کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اور اس وجہ سے بے ضرورت سمجھا۔ کہ اس کا جواب شافی تطہیر الاوساخ جناب مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم لکھنوی نے وقت پڑے کر سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں مطبع شعلہ طور کانپور میں چھپوادیا ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اب میں اُن سے بہتر جواب نہیں لکھ سکتا۔

اور جن غلط مرثیوں مصنفہ مرزا صاحب (مطبوعہ مطبع منشی نولکشور صاحب) کی بنا پر وہ اعتراضات تھے۔ وہ مرثئے بھی اب دفتر ماتم میں کچھ صحیح چھپ چکے ہیں۔ لہذا اُن کی تردید بیجا اصل اور طول اللاطائل سمجھی گئی۔

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ میں ایک انسان ہوں (جس کا لازمہ سہو و نسیان مشہور ہے)۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بہت ہی کم استعداد ہوں۔ اور جو حالات میں نے سُنے یا شمس الضحےٰ وغیرہ میں دیکھے۔ وہی لکھ دئے۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ مجھ سے غلطی نہ ہو۔ جو صاحب میری کتاب کی کسی غلطی پر مطلع ہوں۔ براہ کرم مجھے آگاہ فرمائیں۔ اگر اعتراض صحیح ہوگا تو شکریہ کے ساتھ صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کرونگا۔ اور انشاءاللہ زندہ رہا۔ تو دوسری مرتبہ کتاب چھپنے پر درستی کردونگا۔ اور (ایراد) بے بیجا و محض غلط ہوگا۔ تو جواب دونگا۔

ف علاوہ ان کے میری کتاب ملاحظہ کرنے کے بعد جناب حکیم احمد حسن صاحب سابق اڈیٹر الشفا مقیم کوٹلے نے بھی ایک مبسوط و بکار آمد مضمون اگست سنہ ۱۹۱۲ء کے روزانہ پیسہ اخبار کے دو پرچوں میں (موازنہ مولوی شبلی صاحب کے خلاف) چھپوادیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۲ سُنا ہے کہ جناب صدر الافاضل (افتخار الافاضل) مولوی سید سبط حسین صاحب قبلہ دیب و محدث مقبول نے بھی موازنہ کا لاجواب جواب تحریر فرمایا ہے۔ مگر میں اب تک اُس کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور ناقابل ہوگا۔ تو بجز سکوت اختیار کرونگا۔ اور آیۂ کریمہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا* پڑھکر
معترض کو دُور سے ہی سلام کرلونگا۔ اِس موقع پر جناب سید انشا مرحوم کا شعر یاد آگیا۔ ؎

جو پُوچھے تو بڑا آج کام مَیں نے کیا — جب اُن نے گالی دی جھک کر سلام مَیں نے کیا

یہ بھی عرض کردوں۔ کہ اِس کتاب میں بعض بعض واقعے کئی مقامات پر لکھ دئے ہیں ممکن تھا کہ
دُوسری جگہ صرف حوالہ دے دیا جاتا۔ مگر مَیں نے اِس خیال سے کہ بڑی کتاب ہے (اور زمانے کی رفتار
یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ کتاب کو اخباروں کی طرح ایسی سرسری نگاہ سے لوگ دیکھتے ہیں۔ کہ واقعات
مابعد دیکھتے دیکھتے اکثر واقعہ اوّل الذکر خیال سے اُتر جاتا ہے) دوبارہ یا سہ بارہ ایک
واقعہ کو لکھ کر ناظرین کو ورق لوٹنے اور ڈھونڈنے کی تکلیف سے بچایا ہے +

یہ بات بھی عام انشا پردازی زمانہ حال کے خلاف ہے۔ کہ اکثر اہلِ کمال کے نام یا تخلّص کے ساتھ
مَیں نے جا بجا الفاظ جناب۔ صاحب۔ مرحوم۔ مغفور۔ قبلہ۔ بارک اللہ رسہ۔ طاب ثراہ وغیرہ وغیرہ
لکھے ہیں۔ مگر یہ میری طرز تحریر ہے (مَیں نے اہلِ کمال کا نام اپنی عادت کے موافق ادب سے لیا ہے) ناظرین
کی نگاہ کو جو ایسے الفاظ کے پڑھنے میں کچھ تکلیف ہو۔ تو معاف فرمائیں +

اِس کتاب کے بعض مقامات پر یہ اعتراض بھی شاید بعض ناظرین فرمائیں۔ کہ بہت سی باتیں ایسی لکھ دی
ہیں۔ جن کا براہ راست حیات دبیر سے تعلق نہیں ہے۔ مگر مَیں نے اسکی ضرورت سمجھی۔ کہ جو بعض شعرا اِس زمانے
میں بغیر اصلاح اُستاد نیچرل یا قومی نظمیں کہتے ہیں۔ اُن کو وہ رموز و نکات شاعری بتادوں۔ جو مجھے معلوم ہیں۔
اور حیات دبیر کی بدولت یہ فائدہ وفیض اُن لوگوں کو پہنچے۔ جو اس سے پہلے اُن باتوں سے واقف نہ ہوں +

اچھا اب ایک اور بات بھی سُن لیجئے۔ ؎

مجھے ڈر ہے خود بیں نہ ہو جائے ثابت — بہت اپنے عیب و ہنر دیکھنا ہے

(یہ بھی کہدوں۔ کہ) جس شان سے مَیں نے صاف صاف کمالات دبیر مرحوم کا اس کتاب میں اظہار کیا ہے۔
اُسی طرح اُن کے نقصوں اور کمزوریوں کا بیان نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں کسی کمزوری کو باریک پیرایہ میں قبول کیا

* جب اُن سے جاہلوں نے خطاب کیا۔ تو اُنھوں نے کہدیا۔ سلام + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ ایک آزاد طبیعت کتاب دیکھ کر یہ کہ سکتا ہے۔ کہ ایک رُخ تصویر کا اچھا ہے دُوسرا ایسا نہیں مگر اس کی وجہ بھی عرض کر دوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب مَیں مرزا مرحوم کی کمزوریاں صاف صاف لکھتا۔ تو زمانے کی رفتار کے موافق اُن کے تمام معاصرین شعرا کی کمزوریاں بھی دکھاتا۔ تاکہ معلوم ہو جاتا کہ مرزا مرحوم کی کمزوریاں دُوسروں سے کم ہیں یا زیادہ۔ اِس صورت میں اُن تمام شعرا کی جو اُن اُستادوں کے شاگرد یا مقلد یا فدائی ہیں دلشکنی ہوتی۔ اور ملک بھر میں شعر و سخن کی ایک جنگ چھڑ جاتی[1]۔ میرے نزدیک ابھی ہمارا ملک اِس قسم کے نقائص اہل کمال سُننے کے لئے طیار نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں۔ پس یہ کام آئندہ نسلوں کے واسطے چھوڑ دیا ہے + اب رہی حسن اخلاق کی کمزوری۔ اِس باب میں مَیں نے سخت کوشش کی۔ اور اکثر جناب میر انیس مرحوم کے فدائیوں سے بھی حالات پُوچھے۔ مگر کسی نے بجز اوصاف حمیدہ کے مرزا صاحب کی بُرائی نہیں بیان کی[2] +

اِس کتاب کا نام **حیات دبیر** اور تاریخی نام **سوانح عمری دبیر نور اللہ مقبرہ** ہے۔ جس سے عدد سال تالیف کتاب سنہ ۱۳۳۰ھ (پُورے پُورے) نکلتے ہیں +

اچھا ناظرین! خدا حافظ۔ اب کتاب کی سیر اور نارسیاہ ثابت کو دعائے خیر سے یاد فرمائیے +

۲۹ ذیحجہ سنہ ۱۳۳۰ھ کو یہ دیباچہ لکھا تھا۔ مگر پھر اس میں کچھ کمی بیشی کی گئی۔ اور آج ۷ صفر سنہ ۱۳۳۱ھ کو اِس کام سے حقیر فارغ ہُوا۔ اللہ بس باقی ہوس + خاکسار بے بضاعت افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی سررشتہ دار عدالت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ + و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین +

---

[1] مرزا مرحوم کے مختلف قلمی مرثیوں میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔ ایک قلمی مرثیہ کو دیکھ کر کسی مصرع یا الفاظ پر کوئی اعتراض ہوتا ہے مگر جب دوسرے شخص کا لکھا ہُوا وہی مرثیہ دیکھا جاتا ہے تو وہ مصرع یا الفاظ ہی تبدیل نظر آتے ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ کاتبوں نے بہت کچھ تصرف کیا۔ اپنی عقل سے مجبوری کام لیا ہے۔ پس یہ سب خرابیاں دور ہو جائینگی یا کم ہو جائینگی۔ جب مستند [illegible] صحیح کلام مرزا مرحوم کا چھپ جائیگا جس کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ۔ اور شاید اُس وقت جو واقعی عیوب شاعر کے کلام ہیں معلوم ہو جائیں گے۔ ان کا ظاہر کرنا مناسب ہو گا + ۱۲ مولف

[2] ایسی صورت میں مَیں مجبور تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ بد اخلاقیوں کے قصے اپنے دل سے گھڑ کر اُن کی طرف منسوب کر دیتا۔ مگر مَیں اس کو خلاف ایمان سمجھتا ہوں [illegible] ایسا نہیں کر سکتا۔ اب چاہے کوئی صاحب فرمائیں کہ مرزا صاحب کو فرشتہ بنا دیا ہے۔ چاہے کتاب کا ایک رُخ خراب سمجھیں + ۱۲ مولف حقیر

ایک مختصر سی فہرست اسما بھی اس موقع پر لکھنا چاہتا ہوں جس سے اُن صاحبوں کو اس کتاب کی نظم (مرثیہ وغیرہ) پڑھنے میں مدد ملے ۔ جو ان حالات سے ناواقف ہوں ۔ کہ مرثیوں میں بار بار یہ نام آتے ہیں +

نمبر	نام	کیفیت
۱	اصغرؑ یا علی اصغرؑ	امام حسینؑ کے اُن دودھ پیتے چھوٹے بچے کا نام ہے جسکو ایک لشکری فوج یزید حرملہ ابن کاہل اسدی نے امام حسینؑ کی گود میں تیر مارکر قتل کیا +
۲	اکبرؑ یا علی اکبرؑ	اُن شاہزادہ کا اسم قدسی ہے جو امام حسینؑ کے سب سے بڑے یا منجھلے فرزند اور سر سے پاؤں تک جناب محمد مصطفےٰ صلعم سے صورت اور عادات و خلاق و گفتگو میں مشابہ تھے ۔ انکی عمر کم سے کم ۱۸ برس زیادہ سے زیادہ پچیس سال راویوں نے لکھی ہے +
۳	بانوؑ یا شہر بانوؑ	جہاں کہیں مرثیہ میں شہر بانو یا بانو آتا ہے زوجہ جناب امام حسینؑ سے مراد ہوتی ہے ۔ یہ شاہزادی نوشیروان عادل کی نسل سے تھیں اگرچہ اس میں اختلاف ہے ۔ کہ یہ معرکہ کربلا تک موجود بھی تھیں یا اس سے پہلے انتقال فرما گئی تھیں مرثیہ گویوں نے اور ازواج امام حسینؑ جناب رباب مادر علی اصغرؑ و سکینہ و لیلےٰ مادر علی اکبرؑ کا بھی جہاں بیان کیا ہے وہاں انکو بھی (اکثر) لفظ بانو سے تعبیر کیا ہے ۔ گویا بانو کے اصلی معنی لئے ہیں ۔ کہ امیر قوم کی زوجہ کو بانو کہتے ہیں +
۴	باقرؑ	امام حسینؑ کے پوتے جو معرکہ کربلا میں پانچ برس کے تھے +
۵	حُرؑ	حُر کے لفظی معنی آزاد کے ہیں یہ ایک جوانمرد (کوفی) لشکر یزید میں تھا اور ایک ہزار یا پانچ ہزار آدمیوں کا افسر تھا ۔ مگر اس سب جاہ و حشمت کو چھوڑ کر اکیلا (یا اپنے بیٹے اور بھائی اور غلام سمیت) امام حسینؑ کے پاس چلا آیا پھر حضرتؑ کی طرف سے لشکر یزید سے داد جوانمردی دیکر اور بہت سے دشمن قتل کرکے شہید ہوگیا حر ابن یزید ریاحی ان بزرگوار حر کا نام نامی ہے +
۶	حبیبؓ یا حبیب ابن مظاہرؓ	یہ ایک مرد ضعیف اصحاب حق آگاہ جناب سرور کائنات صلعم سے (۷۳ سال عمر کے) معرکہ کربلا میں تھے ۔ امام حسینؑ کی مدد کی ۔ اور بہتیروں کو قتل کرکے شہید ہو گئے +
۷	جناب زینبؑ	امام حسینؑ کی حقیقی بہن ہیں جو معرکہ کربلا میں موجود تھیں ان کے شوہر عبداللہ ابن جعفر طیارؓ تھے +
۸	حضرت عباسؑ	یہ امیر المومنینؑ کے فرزند ارجمند ہیں جنہوں نے امام حسینؑ سے ایسی محبت کا برتاؤ کیا جس کا نظیر تاریخ عالم میں نظر نہیں آتا ۔ یہ لشکر امام حسینؑ کے علمدار تھے اور شجاعت میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے +
۹	عونؑ و محمدؑ	جناب عبداللہ ابن جعفر طیار کے فرزند ہیں جناب زینبؑ کے بھی فرزند مشہور ہیں ۔ اکثر مرثیہ گویوں نے پسران زینبؑ انکو نظم کیا ہے +

نمبر	نام	کیفیت
۱۰	عونؓ و جعفر	جناب امیرؑ کے فرزند حضرت عباسؑ کے ماںجائے بھائی ہیں ۔
۱۱	عثمانؓ	یہ بھی جناب امیرؑ کے فرزند ہیں۔ معرکہ کربلا میں شہید ہوئے تھے ہیں ۔
۱۲	عبدُاللہ	۔ " ۔ " ۔ " ۔ "
۱۳	حضرت سکینہؑ	صحیح لفظ سُکَینَہ بضم اول و فتح ثانی ہے۔ مگر تمام شعراء اردو نے بفتح اول و کسر ثانی مرثیے کے وزن قافیہ پر استعمال فرمایا ہے۔ یہ جناب امام حسینؑ کی ایک صاحبزادی تھیں۔ اور جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال فرمایا انکا نام قابل اطمینان تحقیق نہ ہوسکا بعض علماء عظام کے نزدیک انکا نام زینبؑ ہے اور شام میں جو روضہ جناب زینبؑ مشہور ہے وہ یہی زینبؑ بنت الحسینؑ ہیں۔ بہر حال شعرائے اہلبیت (اردو) نے اُن صاحبزادی کا بھی جہاں کہیں ذکر فرمایا ہے انکا نام بھی سکینہ لکھا ہے
۱۴	شیریںؓ	گو روایت بہت ضعیف ہے مگر مشہور ہے (اور اسی کو تمام مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہے) کہ یہ جناب شہربانو مادر امام زین العابدینؑ کی کنیز تھیں اور انکو جناب شہربانوؑ نے امام حسینؑ کے اشارے سے آزاد فرما دیا تھا۔ انہوں نے راہ شام میں ایک مقام پر سکونت اختیار کی تھی جب اہلبیت اطہار شام کو مع سرہائے شہدا و امام زین العابدینؑ جا رہے تھے۔ تو انہوں نے اپنی شاہزادیوں کی خدمت میں آکر زیارت و خدمت کی تھی۔ اور انکے گھر میں سر امام حسینؑ رہا تھا ۔
۱۵	جناب سیدِ سجادؑ یا حضرت عابدؑ	امام زین العابدینؑ چوتھے امام ہیں۔ جو بروایت مشہور امام حسینؑ کے فرزند اکبر تھے۔ معرکہ کربلا میں بیمار تھے۔ یہ اسیر ہو کر شام کو تشریف لے گئے تھے ۔
۱۶	صغرےٰ یا فاطمہ صغرےٰ	یہ بھی امام حسینؑ کی صاحبزادی مشہور ہیں۔ اور گو یہ روایت ضعیف و غریب ہے۔ مگر مشہور ہے۔ کہ ان کو علالت کی وجہ سے امام حسینؑ نے مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا۔ تمام مرثیہ گویوں نے اسی روایت کو یوں ہی نظم کیا ہے ۔
۱۷	جناب کلثومؑ	یہ بھی جناب امام حسینؑ کی حقیقی (جناب زینبؑ سے چھوٹی) بہن تھیں۔ یہ عبید اللہ ابن جعفر طیارؓ کی زوجہ اور معرکہ کربلا میں اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھیں ۔

باسمہٖ سُبحانہٗ

ولہ الحمدُ والرّجوعُ الیہ

والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ محمدؐ وآلہ الطاہرینؑ

باب اوّل شجرۂ خاندان و حالات بزرگان حضرت دبیر

شجرۂ خاندان

ملا ہاشم شیرازی نثار برادر عینی ملا اہلی شیرازی صاحبِ مثنوی سحر حلال

مرزا محمد رفیع متخلص بہ رفیع

مرزا غلام محمد

مرزا غلام حسین المتولد ۱۱۹۰ھ گیارہ سو نوّے ہجری بمقام شہر دہلی

(۱) دختر جو میر ببر علی بجنوری کو منسوب ہوئیں متولدہ دہلی

- (۱) دختر زوجہ میر حسن علی مرحوم
- (۲) دختر زوجہ مرزا علی حسن مرحوم متخلص بہ جگش
- (۳) میر بسم اللہ
- (۴) میر فضل حسین
  - میر محمد صولت
  - دختر زوجہ حکیم آغا حسین سلمہ اللہ

(۲) دختر جنکی ولادت بھی شہر دہلی کی ہے حکیم میر محمد حسین عزیز تخلص کو منسوب ہوئیں۔ لاولد رہیں

(۳) مرزا غلام محمد نظیر۔ ولادت دہلی۔ وفات ۱۲۹۱ھ

- مرزا محمد عباس سفیر مرحوم
- (۲) محمد تقی
- (۳) محمد کاظم
- (۴) و یک دختر
  - میر حیدر حسین

(۴) **مرزا سلامت علی دبیر مرحوم**

المتولد ۱۱ رجمادی الاول ۱۲۱۸ھ بارہ سو اٹھارہ ہجری

بمقام دہلی۔ محلہ بلّی ماراں

المتوفی ۳۰ رمحرم ۱۲۹۲ھ بارہ سو بانوے ہجری

مدفن شہر لکھنؤ۔ محلہ سنحاس جدید اپنے مکان میں دفن

ہیں۔ اب یہ گلی کوچۂ دبیر کہلاتی ہے ◆

مرزا سلامت علی دبیر رحمہ اللہ

۱

دختر

جو میر بادشاہ علی مرحوم بقا پسر میر وزیر علی صبا مغفور کو منسوب ہوئیں

۱

مرزا محمد طاہر رفیع سلمہ

ملازم دربار رامپور

مرزا محمد ذاکر عرف آغن صاحب متخلص ذاکر۔ جن کی والدہ دختر عطارد مرحوم ہیں

۲

مرزا محمد جعفر صاحب اوج مدظلہ

المتولد ۷ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ

۲

دختر جو نواب حسن علی خاں عرف اچھے صاحب سلمہ کو منسوب ہیں یہ نسل مالک اشتر اور خاندان بہو بیگم صاحبہ و نواب حیدر بیگ خاں مرحوم سے ہیں۔ سوز خوانی میں میر بندہ حسین صاحب مرحوم کے شاگرد اور کامل ہیں

نواب مرزا محمد مہدی علی خاں عرف کجن صاحب المتولد شب نیمہ شعبان

۳

مرزا محمد ہادی حسین عطارد مرحوم

المتولد ۵ شعبان ۱۲۷۲ھ

المتوفی ۲۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ

۱

مرزا عبد الحسین شفیع عرف ابو صاحب ملازم دربار رامپور

۲

دختر جو مرزا محمد طاہر کو منسوب ہیں (والدہ آغن صاحب سلمہ)

حالات بزرگانِ مرزا صاحب

شجرۂ خاندان میں اُوپر لکھ چکا ہوں۔ اُس کے ملاحظہ سے واضح ہوگا۔ کہ مرزا صاحب کے جدّ اعلےٰ مُلّا ہاشم شیرازی ہیں۔ جو مُلّا اہلی کے حقیقی بھائی تھے۔ جس طرح مُلّا اہلی نظم میں یکتائے زماں تھے۔ مُلّا ہاشم نثر میں وحیدِ دوراں تھے۔ مُلّا اہلی کے حالات کتاب مستطاب مجالس المومنین مصنفۂ قاضی سید نوراللہ شوستری شہید ثالث علیہ الرحمہ سے (جن کا مزار مقدس اکبر آباد آگرہ میں زیارت گاہ مومنین ہے) معلوم ہو سکتے ہیں شہید ثالث رحؒ نے ملا اہلی کا ذکر اُن شعرائے کاملین میں کیا ہے۔ جو ائمہ اطہارؑ کے مشہور مداح ہیں۔ مَیں بہت مختصر ان کے حالات لکھتا ہوں۔ کہ میری کتاب طولانی نہ ہو جائے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مُلّا اہلی شعرا و فضلا میں مشہور اور فقر و مسکنت اور بے التفاتی اہل دنیا میں معروف ہیں۔ اکثر شاعروں سے مہارت فن شعر کے سبب سے امتیاز رکھتے تھے۔ ہر وقت شعر کہتے تھے۔ ایسی مثنوی سحرِ حلال کہی ہے۔ کہ ہر شعر میں دو قافیہ ہیں۔ اور ہر شعر دو بحروں میں پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کی عقل حیران ہے۔ سلمان ساوجی کے مشہور قصیدۂ صنعتی کے جواب میں ایک قصیدہ میر علی شیر کے نام پر کہا۔ اُس میں چند صنعتیں قصیدۂ سلمان سے بھی زیادہ ہیں۔ خود میر علی شیر نے دادِ انصاف دے کر کہا۔ کہ سلمان سے بہتر کہا ہے۔ اہلی کا دیوان غزل مسلّم ارباب نظر ہے۔ شعر سعدی کی چاشنی اُن کے کلام میں ہے۔ اس کے بعد چند مشہور قصائد اہلی کے مطلع لکھ کر تحریر فرمایا ہے۔ کہ ان سے ولایت شاہ ولایت اور خلوص نیّت ملا اہلی علیہ الرحمہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک انکی یہ رباعی بھی ان کے حسن عقیدت پر دلیل ہے۔

(رباعی اہلی)

یارب سگ کوئے مقبلی ساز مرا ✣ آئینہ زعشق منجلی ساز مرا

فصل اوّل
ملا اہلی رحمہ کا حال۔

اقبال جہاں مرا جوئے نیست قبول + مقبول محمدؐ و علیؑ ساز مرا

تیسرے مصرع سے یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ طبیعت میں مال دُنیا سے کس قدر تنفر تھا۔ ملا اہلی نے بڑھاپے میں بمقام شیراز سنہ نوسو بیالیس ۹۴۲ ہجری میں وفات پائی۔ مُلّا میرک نے جو اُن کی تاریخ وفات کہی ہے۔ وہ یہ ہے:۔

قطعۂ تاریخ وفات اہلی رحمہ اللہ علیہ

درمیان شعراؤ فضلا + پیر با صدق و صفا بود اہلی

رفت با مہر علیؑ از عالم + پیرو آل عبؑا بود اہلی

سال فوتش زخرد جستم و گفت + بادشاہ شعرا بود اہلی

اور تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی مدح لکھ کر اتنا زیادہ لکھا ہے۔ کہ اُن کا مرقد شیراز میں خواجہ شمس الدین حافظ شیراز کے پہلو میں ہے۔ حقیر (ثابت) نے اس موقع پر عرض کیا ہے

طبع حافظ سے نہ کم تھی طبع اہلی شعر میں + مر کے بھی پہلو نشیں ہیں حافظ شیراز کے

اور مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں لکھا[+] ہے۔ کہ وہ خواجہ حافظ و مرزا نظام دست غیب کے پاس ایک ہی مقبرہ میں دفن ہیں۔ اور سنگ مزار پر یہ غزل کندہ ہے

جانم بروز واقعہ پہلوے او کنید + او قبلۂ من ست زخم سوے او کنید

مؤلف حقیر کہتا ہے۔ کہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے۔ کہ جس طرح مُلّا اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال ایرانیوں میں لاجواب مانی جاتی ہے۔ اور صنائع و بدائع و بلاغت کی جان ہے۔ اُسی طرح صفائی بندش و حسن بیان و لطف زبان میں میر حسن مرحوم کی مثنوی ہندوستانیوں میں بےمثیل مانی جاتی ہے۔ یہ اور عجیب و غریب حسن اتفاق ہے۔ کہ اس

+ سوا اس تذکرہ میں بھی اہلی کی بہت کچھ مدح و ثنا لکھی ہے۔ مگر میں نے طول کے خوف سے زیادہ لکھنا غیر ضروری سمجھا ۱۲ ثابت

فصل ۸ سحر حلال مثنوی کے ہیرو کا بیان

مثنوی اردو کا نام بھی اُس سے ملتا جلتا ہوا سحر البیان ہے۔ ان دو سحر بیان (اہلیٔ وحسنؑ) کی اولاد میں دو ایسے بزرگوار پیدا ہوئے جن کو ملک نے اعجاز بیان مانا ہے۔ ایک مرزا دبیر ہیں جن کے یہاں تمام صنائع و بدائع اور بلاغت کے نکات موجود ہیں۔ دوسرے میر انیس ہیں جن کا کلام فصاحت و سلاست میں آپ اپنی مثال ہے +

اسناد و خطوط

فصل سوم اسناد و خطوط

کتاب شمس[1] الضحےٰ میں اور اُس کے بعد تنقید آب حیات[2] میں چند فرمان شاہان دہلی کے اور چند خطوط امرائے دہلی کے درج ہیں۔ اور ایک استشہاد بھی چھپا ہے جن سے مرزا صاحب کے بزرگوں کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے میں انہی فرمانوں اور خطوط وغیرہ سے حالات لکھتا ہوں +

یہ استشہاد اُس زمانہ میں مرتب ہوا تھا۔ کہ جب مرزا غلام حسین (پدر مرزا صاحب) دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اور لکھنؤ میں شادی کرنا چاہا۔ بزرگوں کی پوچھ پاچھ ہوئی۔ اور مرزا غلام حسین دہلی و آگرہ گئے۔ اور وہاں سے شہادت نامہ لکھوا کر لکھنؤ میں لائے۔ یہاں بھی جو لوگ اُن کے خاندان سے واقف تھے اُنہوں نے شہادت ثبت کی۔ یہ تیرھویں صدی کے شروع کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ اس شہادت نامہ سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) مرزا صاحب کے آباؤ اجداد شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر سرفراز و ممتاز رہے۔ پھر زمانہ کی ناموافقت کے سبب سے دہلی و اکبر آباد (آگرہ) میں وارد ہوئے +

(۲) مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں حقیقی نانا مرزا غلام حسین کے ناظم صوبہ کشمیر

---

[1] شمس الضحےٰ مرزا دبیر صاحب کے حالات میں مولوی میر صفدر حسین صاحب کی تصنیف عمدہ شاہی کی مطبع حسینی میر عابد علی صاحب میں اب سے عرصہ پہلے چھپ چکی ہے +

[2] تنقید آب حیات مؤلف کے نانا میر محمد رضا ظہیر مرحوم کی ایک مختصر کتاب ہے۔ مدت ہوئی کہ چھپ چکی ہے۔ آب حیات میں جو مرزا صاحب کے حالات غلط درج تھے۔ اُن کی تصحیح فرمائی ہے +

کے تھے۔ اور مرزا غلام حسین کے ماموں مرزا شہامت علی خاں شہزادگان دہلی کے اُستاد اور خط نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے +

(۳) جد امجد مرزا محمد رفیع عہدہ منشی (میر منشی شہنشاہ دہلی) پر سرافراز تھے۔ اور والد ماجد (مرزا غلام محمد مرحوم) بھی صاحب اقتدار تھے +

(۴) جب شہر دہلی متواتر تاراج و غارت ہونیکے سبب سے قابل قیام نہ رہا۔ تو مرزا غلام حسین مرزا افضل علی خاں ابن مرزا فتح علی خاں کے ہمراہ [جنھوں نے مرزا غلام محمد (پدر مرزا غلام حسین) کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھا تھا] لکھنؤ تشریف لائے +

اس شہادت نامہ کی پیشانی پر شاہ عالم بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت ہے۔ مُہر سے اُوپر جو عبارت شہادت مرقوم ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے "درحقیقت ان کے بزرگ شرفائے شیراز سے تھے۔ اور ما بدولت کی سرکار میں عہدہ ہائے جلیلہ پر سرافراز و مُمتاز تھے" اس کے بعد حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب مجتہد اول لکھنؤ اور مرزا کاظم علی[۲] صاحب محدث اور حسن رضا خاں صاحب نائب صوبہ اودھ اور نواب ضیاء الدولہ آفتاب جنگ محمد نور اللہ خاں کی شہادت اور مہریں ہیں۔ ان سب بزرگوں نے مرزا غلام حسین کو خلف مرزا غلام محمد ابن مرزا محمد رفیع ابن ملا ہاشم شیرازی لکھ کر صاحبان عزت و شرافت سے لکھا ہے۔ نواب آفتاب جنگ نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا غلام حسین کی والدہ کی نانی اور میری نانی حقیقی بہنیں تھیں۔ اس کے بعد سید فرزند علی اور مرزا رحمت علی خاں اور امجد علی خاں اور نواب مسیح اللہ خاں

سلہ[۱] مخدومی مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنوی اور محسنی حاجی ڈپٹی سید جعفر حسین صاحب جعفری بیرسٹری سابق ممبر کونسل کوٹہ و جے پور کے ارشاد کے موافق اصل شہادت نامہ و فرمان شاہی کی نقلیں بھی اس کتاب میں چھپوائے دیتا ہوں جو اس سے پہلے شمس الضحٰے و تنقید آب حیات میں بھی چھپ چکی ہیں۔ کہ یہ چیزیں بطور یادگار زمانہ سابق ہیں + مؤلف حقیر۔

سلہ[۲] مرزا کاظم علی ایک مشہور عالم اخباری شیعہ تھے۔ مرزا دبیر نے ان سے بھی پڑھا ہے جیساکہ آئندہ مذکور ہوگا فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق مصاحب شاہ اودھ انہیں کے فرزند ارجمند تھے۔ جو ناسخ مرحوم کے ارشد تلامذہ سے تھے + ۱۲ ثابت

شارح اعجاز خسروی اور نواب[1] مختار خاں (برادر زادۂ نعمت خاں عالی) کی گواہیاں اور مہریں ہیں بعد ازاں فضل علی خاں[11] عرف آغا خاں ابن فتح علی خاں کی مہر ہے جس میں یہ مصرع سجع ہے ع امید شفاعت ز فضل علی ست۔ اور علی مراد خاں[12] داروغہ دیوان خانہ شاہ عالم اور امین الدین[13] علی اور مرزا محمد باقر[14] اور سید احسن اللہ خاں[15] کی شہادت اور مُہریں ہیں۔ یہ تو استشہاد کی کیفیت تھی اب مَیں جو مضامین فرمانوں سے مستنبط ہوتے ہیں اُنکا خلاصہ (ذیل میں) اُردو میں لکھتا ہوں :۔

۱۔ پہلا فرمان شاہ دہلی (شاہ عالم) کا مورخہ سوم رجب ۱۱۷۵ھ مطابق سنہ ۳ جلوس سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں :۔

(۱) مرزا غلام محمد (مرزا دبیر مرحوم کے دادا) کو بادشاہ نے "فضیلت و شریعت مآب تقویٰ وصلاح دستگاہ" تحریر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کے دل میں اُن کی کس قدر عظمت تھی۔ اور اُن کے والد ماجد کا نام مُلا محمد رفیع اور دادا کا نام مُلا محمد ہاشم شیرازی درج فرمان شاہی ہے *

(۲) تعریف دیانت میں لکھا ہے۔ کہ خود را بانتہاے تدیّن رسانیدہ[4] *

(۳) یہ لکھا ہے کہ خدا کی عبادت کے شوق میں مناصب جلیلہ کو ترک کر دیا *

(۴) یہ کہ ان کے نانا عنایت اللہ خاں ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر کے اور ان کے

---

[1] نواب مختار خاں نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ میں نے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ صیدا خوت پڑھا ہے *

[2] انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا غلام حسین نے میرے والد ماجد کی مہمانداری چند روز کے عوض مجھ پر بہت احسان کئے ہیں۔ ایک اُن میں سے یہ ہے۔ کہ آج کل مَیں انہیں کے مکان میں رہتا ہوں۔ دیکھئے اُس زمانے کے لوگ احسان کا بدلہ کس عمدگی سے ادا کرتے تھے اور اُسکا اقرار کس صفائی سے فرماتے تھے ہمارے زمانہ میں حسان کا شکریہ ادا کرنا گویا بدخلاقی سمجھا جاتا ہے۔ افسوس کیا انقلاب زمانہ ہوا *

[3] معلوم نہیں کہ مرزا محمد باقر مولوی محمد حسین آزاد صاحب آب حیات کے والد ماجد ہیں یا دُوسرے بزرگوار ہیں *

[4] اس سے بڑھ کر ایک دیانت دار میر منشی کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُنکی دیانت معراج کمال پر بادشاہ کی نظر میں پہنچی ہوئی تھی جس سے بڑھ کر دیانت نہیں ہوسکتی * ۲ آ تا بت

ماموں شہامت علی خاں شاہزادوں کے اُستاد۔ اور جدامجد مُلا محمد ہاشم منشی سلطنت ہندوستان کے تھے +

(۵) اسی سند میں لکھا ہے کہ چار لاکھ اٹھاسی ہزار ایک سو بیس دام جو چار ہزار سات سو اکتیس روپیہ کے برابر ہوتے ہیں ان کو (بطور پنشن) ملتا ہے۔ ہر سال نئی سند نہ طلب کیجائے +[1]

۲۔ دوسرا فرمان بھی شاہ عالم بادشاہ دہلی کا ہفتم ماہ رمضان سنہ ۱۱۹۱ھ (گیارہ سو نوے) کا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مُلا غلام محمد (نواده ملا ہاشم شیرازی) کے یہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ غلام حسین (پدر مرزا دبیر مرحوم) نام رکھا گیا مصارف دایہ کے واسطے سو روپیہ ماہوار (پُرانے سکہ کے) مقرر فرمائے گئے +[2]

فصل ۴ مرزا غلام حسین کی لکھنؤ میں حالت

مرزا غلام حسین کی لکھنؤ میں حالت عسرت یا ثروت

اس موقع پر شاید ناظرین کتاب کو یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب پریشانی کے عالم میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے ضرور مبتلائے عسرت ہونگے۔ ہر چند عسرت اور افلاس شرفا اور اہل کمال کی بے عزتی کا سبب نہیں ہوسکتے۔ مگر ازبسکہ میرا فرض واقعات کا لکھنا ہے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں۔ کہ مرزا غلام حسین باوصف عسرت۔ کے صاحب ثروت تھے۔ ناظرین آپ تعجب کرینگے۔ کہ یہ تو اجتماع نقیضین معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور و تامل سے سُنئے عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے۔ کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں مرزا غلام حسین

---

[1] ان ملا محمد المتخلص رفیع کا ایک قصیدہ نعت و منقبت میں کتاب روضۂ رضوان مطبوعہ بستان مرتضوی میں چھپا ہے۔ جو کتاب سنہ ۱۳۱۰ ہجری کی مطبوعہ ہے۔ سید محمد اصغر صاحب شبس اناؤ نے یہ ملک پر احسان کیا ہے۔ کہ تمام شعرائے ایران و ہندوستان کے قصاید نعت و منقبت میں سے اکثر اعلےٰ درجہ کے قصیدے ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ رفیع مرحوم کا قصیدہ صفحہ ۸ میں ہے اُس کا مطلع یہ ہے۔ اے شہنشاہ دینے مالک وتد تے کشور + والضحےٰ روے و قمر طلعت و والنجم افسر +

[2] اس فرمان سے ولادت مرزا غلام حسین کی سنہ ۱۱۹۱ ہجری کی پائی جاتی ہے +

نقل فرمان شہنشاہی مندرجہ حیات دبیر صفحہ ۶

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہ

اللہ
ہو
لعالی

۱۱۷۳
شاہ عالم بادشاہ غازی
ابوالمظفر جلال الدین محمد

ابن عالمگیر بادشاہ
ابن جہاندار شاہ
ابن شاہ عالم بادشاہ
ابن عالمگیر بادشاہ
ابن شاہجہان بادشاہ
ابن جہانگیر بادشاہ
ابن اکبر بادشاہ
ابن ہمایون بادشاہ
ابن بابر بادشاہ
ابن عمر شیخ شاہ
ابن ابوسعید
ابن سلطان محمد
ابن میران شاہ
ابن امیر تیمور صاحبقران

فرمان ابو مظفر جلال الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی

چوں بعرض مقدس و معلیٰ رسید کہ
فضیلت و شریعت مآب تقویٰ و صلاح دستگاہ
غلام محمد ابن ملا محمد رفیع ولد ملا محمد ہاشم شیرازی
مناسب جلیلہ سرکار انجیال تا آل اُخرے
رضینہ برضائے جناب باری عز اسمہ
و مایہ دولت و اقبال بانتہائے تدین بکمال
رسانیدہ باکراہ فانی از ترک مناسب متعلقہ و
تعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الوجود
اعتکاف ساختہ۔ لہذا بصوابدید قدامت عنایت اللہ خاں
ابن ابوظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر جد مادری معز الیہ و شہامت علی خاں خال استاد شاہزادہ ہائے ہمایوں و ملا
محمد ہاشم مرحوم جد پدری شان کہ منشی سرکار ابد قرار بودہ و ہم باثبات حقوق خدمت گذاری ہائے

بنظم مراتب صد رچهار لک و ہشتاد و ہشت ہزار یک صد و بست دام بتعداد چہار ہزار ہفتصد و سی و یک روپیہ از پرگنہ حویلی دار الخلافت شاہ جہان آباد در وجہ مدد معاش متعلقان مشارٌالیہ با فرزندان بطریق التمغا از نصف خریف پارس ئیل حسب الضمن مقرر باشد۔ باید کہ فرزندان کامگار و الا تبار و امرای عالیمقدار و متصدیان مہمات و جاگیرداران و کروڑیان حال و استقبال وجہ مذکور نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن بتصرف فرزندان و متعلقان مشارٌالیہ بازگذارند و از جمیع وجوہ عوارض مرفوع القلم شمارند دریں باب ہر سال مجددہ طلبند۔

سیوم شہر رجب المرجب سنہ ۱۱۷۵ ہجری مطابق سنہ ۳ جلوس و التحریر یافت۔

۱۱۷۴
شاہ عالم بادشاہ غازی
کمترین بندگان سنہ ۲
منیر الامرا

۱۱۶۷ عالمگیری
فدوی بادشاہ غازی
بہادر جنگ سجاع الدولہ
جلال الدین حیدر خان

برسالہ شرافت و نجابت مرتبت امارت و ایالت منزلت فرازندہ لوای شوکت و حشمت طرازندہ بساط ابہت و عظمت بعتضاد خلافت و فرمانروای اعتماد سلطنت و کشورکشائی معرکہ آرای جہانبانی عیش آرای محافل کامرانی جوہر مرات حقیقت و فا فروغ شمع یکرنگی و صفا ہمدم انکشافی مجلس خاص محرم خلوت سرای صدق و اخلاص کارفرمای سیف و القلم مدبر امور عالم زبدۂ فدویان خوانین بلندمکان عمدۂ امرای عظیم الشان وزیر صائب تدبیر ممالک مدار میر روشن ضمیر عالیمقدار لازم اختصاص و الاعزاز واجب الاحترام و الامتیاز رکن السلطنت بادشاہ سلیمان اقتدار وزیر الممالک جملۃ الملک مدار المہام اعتماد الدولہ آصف جاہ برہان الملک ابو المنصور خان صفدر جنگ

معلقہ ۳ جلوس والا
واقیہ سلخ ہجری
صح شہر شوال المکرم

۳ جلوس والا
فی التاریخ
۲۱ رجب المرجب

شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خان بہادر بہادر جنگ سپہ سالار ستم ہند

شاہ عالم ۱۱۷۵

فدوی بادشاہ غازی ۳

خانہ زاد خان بہادر

وے السلطان ۳ جلوس معلی مطابق ۱۱۷۵ ہجری

بست و چہارم شہر رمضان المبارک

نقل خط الانور آنکہ

یادداشت شرح دستخط نائب وزیر الممالک حسام الملک

مدار المہام مطابق صاد خاص فرمان والاشان بنویسند

شرح ضمن وقائع رغبت طاعت حضرت

واجب الوجود لعزلت نسبت فضیلت وشریعت مآب

تقوے وصلاح دستگاہ غلام محمد ابن ملا محمد رفیع ولد

ملا محمد ہاشم شیرازی بترک مناصب سرکار قدسی وتعلقات حادث

مطمح البصار کرامت عاکفان سریر خلافت گشتہ بتجاسہ سلاطین از

مزید مرحمت خاقانی بتعیین چہار لک وہشتاد وہشت ہزار و

یکصد وبست دام بقیمہ چہار ہزار وہفت صد وسی ویک

روپیہ از پرگنہ دار الخلافت شاہجہان آباد در وجہ معاش

متعلقان ملا مذکور باز ازدیاد بطریق التمغا ابتدا

نصف خریف بارش نیل ۱۱۷۶ فصلی بلا قید سامی وقیمت هر بن

لبشادہ خاص بدفتر رسید متعہد بان دار الانشا موجب دستخط خاص کرامت

اختصاص بلا عرض ثانی فرمان والاشان قلمی نمایند +

نقل فرمان شہنشاہ دہلی محولہ حیات دبیر صفحہ ۶

باسمہ سبحانہ تعالیٰ شانہ

ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی

فرمان بادشاہ عالی

اللہ

ہو

۱۱۷۳

شاہ عالم بادشاہ غازی

ابو المظفر جلال الدین محمد

صاحب قران ابن امیر تیمور — شاہ ابن میران — شاہ ابن سلطان محمد — شاہ ابن ابو سعید — شاہ ابن عمر شیخ — شاہ ابن بابر باد — بادشاہ ابن ہمایون — بادشاہ ابن اکبر باد — شاہ ابن جہانگیر باد — شاہ ابن شاہ جہان باد — شاہ ابن عالمگیر باد — شاہ ابن شاہ عالم باد — شاہ ابن جہاندار — شاہ ابن عالمگیر باد

دریں وقت میمنت اقتران ازو قالع مولود فرزند ملا غلام محمد نواده ملا ہاشم شیرازی بنام نہاد بمسمی غلام حسین بمسامع ہمایوں رسیده حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازن خزانہ عامرہ سلطانی بارشاد ماموری یکصد و پیسکہ کُس ہا نہ مصارف مرضعہ و غیرہم شرف صدور بموده حابیان دفتر دیوانی سرکار معلے سوائے ماہانہ ملا غلام محمد محسوبہ سنین پیشین ماہانہ ہذا المصارف مرضعہ ہا و غیرہم غلام حسین مولود حال بخازن خزانہ خاقانی بمجرائے مجدد مجرا داده قبض مہری غلام حسین بہ دفتر داشتہ باشند۔ دریں باب ہر سال سند مجدّد نہ طلبند۔

ہفتم شہر رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ ہجری مطابق ۱ از جلوس والا تحریر یافتہ۔

مانند و والد مغفور نیز صاحب اقتدار بودند لاکن چوں والدۂ ماجدۂ
مستشہد از دار فانی بعالم بقا انتقال نمودہ۔ والد مرحوم عقد دیگر
ساختند حقیر کہ دراں ایام نہ سالہ بود و در مکتب خانہ تحصیل علم مینمود و
والد مرحوم حسب الارشاد شاہی اکثر بسفر میماندند مادر نامہربان بوجہ
مغائرت بطن بانواع و اقسام ایذا میرسانید۔ چنانچہ روزے زہر ہم
در طعام دادہ معلم حقیر ازیں دشمنی آگاہ گشتہ حقیر را از
اکبرآباد بشاہجہان آباد بخانہ مرزا فتح علی خاں ابن مرزا
افضل علی خاں کہ با پدر حقیر صبغۂ اخوت در روابط قدیم میداشتند
آورد و حال مہربانی مادر نامہربان حالی ساختہ جناب
خانصاحب موصوف متاسف گشتند مثل بزرگان سلف کہ
فرزند اشرار فرزند خود میدانستند حقیر را بخانۂ خود با ہزار
شفقت و محبت نگاہ داشتند چوں والد مرحوم از کار سرکار الفراغ
یافتہ مراجعت نمودند جویائے حقیر گشتند مادر نامہربان نسبت
آوارگی و بدفعالی باین مقصود نمودہ لاکن باینہمہ والد مغفور بسبب
مہر پدری بیتاب گشتہ برائے تلاش حقیر بشاہجہان آباد آمدند و بخانۂ
خانصاحب ممدوح سراغ یافتہ حقیر را در بر کشیدند و چند روز مہمان خانصاحب
ماندہ حقیر را ہمراہ خود بردند ہر چند کہ خانصاحب ممدوح نام بندہ گرفتہ
بوالد ماجدم تفہیم نمودند کہ ایشاں را در خانۂ بندہ بگذارید کہ خانہ خانۂ
شماست و در خانۂ شما یقین ہلاکت ایشان است کہ مادر جدید
نامہربان است۔ والد بندہ باقتضائے حمیت عذر نمودند
و مفارقت این جانب گوارا نساختند چند سال باز بنا مہر
بایں ہائے مادر نامہربان بسر بردم۔ چوں والد ماجدم
بسن سیزدہ سالگی حقیر از دنیا رخت سفر آخرت
بستند و اقربائے مادر نامہربان مال و اسباب و جمیع

گواہ محضر ہٰذا مسیح است
صحیح است وصحیح است وصحیح است
صاحب شرح اعجاز خسروی متخلص بمسیح عفی عنہ

بخدا کہ عالی نسبی و والی حسبی مستشہد
اظہر من الشمس و آمین من الامس
بہادر ۱۱۹۰ امجد علیخان

لاریب فیہ کہ قرہ باصرہ شرافت و غیرہ ناصیہ شرافت
جناب مستشہد محمد درح نجیب الطرفین است
براد رزادۂ نعمت خاں عالی کہ با والد مستشہد
صبغۂ اخوت میدارد والسلام

واللہ باللہ کہ آنچہ در متن ا
حرفاً حرفاً و لفظاً لفظاً
والد مرحوم بارہا شنید
ساکن اکبرآباد

حقیر کہ محض بے دست و پا بود - چار و ناچار بخانہ فتح علی خاں باز آمدہ بسکونت ورزید در آں ایام خاں صاحب ممدوح ہم مبتلائے عسرت بودند - لاکن مہمان داری حقیر از اول زیادہ تر نمودند - آنانچہ کہ شہر مذکور بسبب تاراج و غارت متواتر قابل ماندن نماندہ عزیمت لکھنؤ فرمودند - بندہ نیز ہمراہ معظم الیہ وارد لکھنؤ گردیدہ حقیقت حال اینست کہ بقید رقم آوردہ ہر کس کہ دریں شہر از آبا و اجداد بندہ آگاہی کماہی داشتہ باشد حسبۃً للہ مہر و گواہی زیب تحریر نماید و چوں استشہاد نامہ ہذا در اکبر آباد و شاہ جہان آباد بنظر رؤسائے شہرین مذکورین بگذرد مترقب کہ قربۃً الی اللہ از روے یقین کالشمس فی النہار طالعاً مواہیر شہادت خود ثبت نمایند - کہ عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور خواہد بود +

تحریر فی التاریخ ہفتم رجب المرجب ۱۲۱۵ سنہ ہجری النبوی صلعم

شہد بما فیہ المتن

واللہ ثم باللہ کہ جناب مستشہد بعوض احسان مہمانداری چندروزہ کہ والد مغفور معظم الیہ نمودہ اند احسانات فراواں بر من فرمودہ و میفرمایند چنانچہ دریں ایام در مکان مکرم الیہ سکونت میدارم

(مہر: علیشان عت امید شفا از فضل)

عرف آقا جان ابن فتح علی خان

الامر کذلک

(مہر: ۱۲۰۹ علی مراد خان بہادر)

داروغہ دیوانخانہ حضرت شاہ عالم دعالیان خلد اللہ ملکہ

فی الواقع کہ جناب مستشہد ممدوح از خاندان جلیل وارد و و مان نجیب و اصیل است

(مہر: محمد ۱۱۹۴ مرزا باقر)

دریں دار الخلافت خاندان مستشہد جلیل الشرافت از آفتاب روشن تر است

(مہر: ۱۲۰۹ علی امین الدین)

حقیر مستند عزیز راد رس حادہ است

(مہر: ۱۲ حسن اللہ سید)

مسافر گویا مفلس تھے۔ کہ کوئی آمدنی نہ تھی۔ پُرانی کھرچن (بزرگوں کی بچی ہوئی پونجی) اور اپنا اسباب خانہ داری بیچ بیچ کر کھاتے تھے۔ مگر اس زمانے کے مالدار معزز اہلکاروں پر خیال کیا جائے۔ تو بہت مرفہ الحال تھے۔ دولت تلف ہونے کے بعد بھی اس قدر تھی۔ کہ سیکڑوں روپیہ خیرات (خمس و زکوٰۃ) میں دیتے تھے۔ اس کی تصدیق آپ کو دو خطوں سے ہوگی۔ جو شمس الضحےٰ میں چھپے ہیں۔ اور جن کا خلاصہ میں ذیل میں نمبر بہ نمبر لکھتا ہوں :۔

۱۔ پہلا خط غفرآن مآب حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب قبلہ (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) کا مورخہ ۱۲۱۶ھ ہے۔ جس کو میں لفظ بلفظ مع ترجمہ تبرکاً لکھتا ہوں۔ کہ ہندوستانیوں میں یہ سب سے پہلے مجتہد ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کے تمام شیعوں میں دینداری پھیلی ہے۔ اکثر اہل علم شیعوں کے خاندان انہیں کے خانوادہ کے تعلیم یافتہ اور شاگرد ہیں۔ انکی تحریر کو شیعہ آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

اصل عبارت خط	خلاصہ اردو میں
جناب مرزا صاحب کرم فرمائے دوستان مستجمع الطاف واحسان عالی مراتب والا مناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہ۔ بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائے شریف باد۔ کہ مبلغ پانصد روپیہ منجملہ زکوٰۃ وخمس کہ بدست مسمی غلام حیدر فرستادند۔ رسید انشاءاللہ تعالےٰ بمستحقین مومنین تقسیم کردہ خواہد شد۔ زیادہ والسلام۔ مرقومہ چہارم شہر رمضان ۱۲۱۶ھ ہجری نبوی	آپ کا بھیجا ہوا پانچ سو روپیہ خمس و زکوٰۃ کا غلام حیدر کے ہاتھ پہنچا۔ حقدار مومنوں کو انشاءاللہ تقسیم کر دیا جائیگا۔ ۴ ماہ رمضان ۱۲۱۶ھ

سید دلدار علی
۱۲۱۰

۲۔ دُوسرا خط نواب مختار خاں رئیس دہلی برادر زادۂ نعمت خاں عالیؔ کا ہے۔ اس میں تاریخ درج نہیں ہے۔ مگر مہر میں ۱۲۱۲ھ کندہ ہے۔ اس لئے (سنہ بارہ سو بارہ)

سنہ ۱۲۱۲ھ کے قریب قریب زمانہ کا یہ خط سمجھنا چاہئے۔ اس خط فارسی کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ تین سو پچھتر ۳۷۵ روپیہ زکواۃ کا جو نامدار خاں کے ہاتھ آپ نے بھیجا تھا (تقسیم مومنین کو) میرے پاس امانت رکھا ہوا ہے۔ اب چند صاحبوں کی زبانی سنا گیا ہے۔ کہ آقا شاہ حسین اصفہانی حج اور زیارات عتبات عالیات سے فائض ہو کر چند روز سے اس شہر میں وارد اور عسرت شدید میں مبتلا ہیں اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ لہذا جناب کی خدمت میں تکلیف دیتا ہوں۔ کہ اگر آپ کو دل سے منظور ہو۔ تو بعوض حصہ چند مومنین کے آقا صاحب موصوف کی خدمت میں منت و مساجت سے وہ رقم پیش کر کے اُن کو اُن کے وطن اصفہان کو بھجوا دوں ۔

مرزا صاحب کے نسب پر بعض لوگوں کے حملے

فصل ۵ نسب پر بعض لوگوں کے حملے

اب میں یہ بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ایسے عالی نسب کے نسب پر ناواقفی یا اور کسی (کدورت باطنی وغیرہ کے) اسباب سے بعض لوگوں نے کیا کیا حملے کئے ہیں۔ اُن حملہ آوروں میں سے :۔

(۱) پہلے بزرگ صاحب تذکرہ سراپا سخن میر محسن علی صاحب اپنے تذکرہ کے صفحہ ۸۰ پر تحریر فرماتے ہیں "مرثیہ گوئی میں طاق صف آرائی اور مضمون خیزی میں شہرۂ آفاق مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے باشندۂ لکھنؤ ارشد تلامذہ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو۔" پھر صفحہ ۲۱۵ پر یہی بزرگ لکھتے ہیں "مرزا سلامت علی دبیر

معہ اُس زمانے کے مصنفوں اور مؤلفوں کا یہ عمل عام طور پر نظر آتا ہے۔ کہ جس سے کچھ رنجش ہوتی تھی اُس کی تعریف کے الفاظ لکھ کر ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے تھے۔ کہ منقصت ثابت ہو۔ مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں یہ عادت عام مصنفوں و مؤلفوں کی لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی اختلاف مذہب شیعہ و سنی اس تحریک کا باعث ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو منشی صاحب موصوف کی تاریخ میں اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر ۱۲ ۔ ۲ آثابت

ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش باشندۂ لکھنؤ شاگرد میر مظفر حسین ضمیرؔ"۔

صفحہ ۸۰ اپر تو متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ مرزا غلام حسین کے عزیزوں میں کوئی صاحب کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔ جن کا نام آغا جان تھا جس کی تاویل یہ ہو سکتی تھی۔ کہ آغا جان تاجر کاغذ کوئی مشہور شخص تھے۔ مرزا غلام حسین کو اُن کے ذریعہ سے ناظرین تذکرہ سے واقف کرایا۔ مگر آگے بڑھ کر جب کہ صفحوں کی گنتی بجائے ایک سو کئی کے دو سو کئی ہو گئی۔ تو خود مرزا غلام حسین ہی کو کاغذ فروش لکھ دیا۔ غالباً مصنف موصوف اگر کہیں تیسری جگہ سو دو سو صفحہ کے بعد پھر مرزا دبیر مرحوم کا ذکر فرماتے۔ تو خود مرزا صاحب ہی کو کاغذ فروش بلکہ کاغذ ساز لکھ دیتے۔ مگر ہم اس کا جواب با صواب اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ کہ "دروغ گو را حافظ نباشد"۔

اصلیت کاغذ فروشی کی بد

ناظرین کتاب! آپ کو یاد ہو گا۔ کہ مرزا غلام حسین صاحب کے استشہاد پر مہر کرنیوالوں میں سے ایک صاحب فضل علی خاں عرف آغا جان بھی ہیں جن کے نام پر میں نمبر ۱۱ لکھ چکا ہوں۔ اور جنہوں نے مرزا صاحب کے مکان میں اپنا رہنا لکھا ہے۔ میں نے لکھنؤ کے بعض معمر آدمیوں سے سنا ہے۔ کہ وہ آغا جان اور مرزا غلام حسین۔ یہ دونوں صاحب بزرگوں کے وقت کا اسباب خانہ داری۔ دوشالہ۔ ہتیار۔ ظروف نقرہ و طلا وغیرہ وغیرہ جو بہت کچھ تھا بیچ بیچ کر کھایا کئے۔ اُس زمانہ میں کاغذ بھی بہت قیمتی ہوتا تھا۔ خصوصاً ایرانی و کشمیری کاغذ بہت ہی قیمت پاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان صاحبوں کے ساتھ کچھ کاغذ بھی ہو۔ اور وہ بیکار سمجھ کر بیچ دیا ہو ع یاروں کو شگوفہ ہات آیا اور کاغذ فروش لکھ دیا۔ حالانکہ کاغذ فروشوں کا (مثل کاغذ سازوں کے) کوئی فرقہ یا قوم نہ شاہی زمانہ میں تھا نہ آج ہندوستان بھر میں کہیں ہے۔ بلکہ پہلے بھی مختلف قوموں کے شریف آدمی کاغذ بیچتے تھے اور آج بھی۔ میں اس پر اتنا اور لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر واقعی بھی یہ بزرگوار کاغذ فروش ہوتے۔ جب بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ فخر

اسلام کو حاصل ہے۔ کہ پیشۂ تجارت سے کوئی شخص ذلیل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ بفحوائے الکاسب حبیب اللہ[1] شرافت بڑھ جاتی ہے۔ اور زمانہ موجودہ نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ تجارت و حرفت و صنعت ہی ترقی اقوام کا باعث ہے۔ اور اسی پر عمل نہ کرنے سے مسلمان مفلس اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لکھنا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ کہ مرزا غلام حسین مرحوم نے لکھنؤ میں بزرگوں کے اسباب کو بیچ بیچ کر لبسر کی۔ اور شادی کی۔ اور مکانات خریدے۔ جو آج تک لکھنؤ نخاس میں موجود ہیں[2]۔ اور نواب اودھ یا کسی اور رئیس کی نوکری نہیں کی۔ اور پھر لکھنؤ سے دہلی (شاید اپنی جائداد غیر منقولہ دہلی کی حفاظت یا فروخت کے لئے) چلے گئے۔ مرزا صاحب سے بڑی دو بہنیں اور مرزا صاحب کے بڑے بھائی (نظیر مرحوم) اور خود مرزا دبیر مرحوم یہ سب دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور پھر دوبارہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ واقعات بتلاتے ہیں۔ کہ مرزا غلام حسین کے پاس کافی سرمایہ تھا۔ ورنہ اُن کو نواب اودھ کی نوکری مل جانا خصوصاً اُس زمانہ میں کہ جو آصف الدولہ کا زمانہ معلوم ہوتا ہے شاید بہت آسان ہوگا۔ اس لئے کہ دہلی میں میر منشی اور اُستاد بادشاہ دہلی یہ خاندان رہ چکا تھا۔ نواب اودھ کو ان سے سیکڑوں مرتبہ کام پڑا ہوگا۔ اس میرے خیال کی تائید نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نور اللہ خاں آفتاب جنگ کے ایک خط سے ہوتی ہے جس کی نقل شمس الضحیٰ میں چھپی ہے[3] جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آپ (مرزا غلام حسین صاحب) صوبہ اودھ کے

فصل ۴ مرزا صاحب [illegible]

---

[1] الکاسب حبیب اللہ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ محنت کر کے روٹی (اکل حلال) پیدا کرنیوالا خدا کا دوست ہے مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث ہے۔ مگر حقیر کی نظر سے ابھی تک یہ حدیث نہیں گذری۔ ورنہ ماخذ لکھ دیتا۔

[2] یہ گلی آج کل کوچہ دبیر کہلاتی ہے۔

[3] اس خط میں یا تاریخ تحریر درج نہیں یا ناقل نے چھوڑ دی۔ کہ جس نے شمس الضحیٰ میں نقل کیا۔ مگر مُہر میں ۱۱۹۰ھ کندہ ہے جس سے ۱۱۹۰ھ کے بعد کا زمانہ سمجھا جاتا ہے جو آصف الدولہ ایک سخی نواب اودھ کا عہد ہے۔ کہ جس زمانہ میں دہلی کے ایک رئیس زادہ کو لکھنؤ میں معزز نوکری مل جانا بہت آسان تھا۔ ۱۲ ثابت

پاس جائیے۔ کہ آپکے دادا ملا محمد رفیع کے ساتھ برہان الملک (محمد امین سعادت خاں بزرگ خاندان نوابان وشاہان اودھ) نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا۔ بلکہ صوبۂ اودھ کے بزرگ آپکے بزرگوں کے زیر بار احسان ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ صفدر جنگ صوبہ دار اودھ زمانہ وزارت ابوالنصر مجاہد الدین احمد شاہ میں محسود عالم ہو گئے تھے (یعنی سب لوگ اُن سے جلتے تھے)۔ بلکہ جن خاندانوں میں پہلے وزارت رہ چکی تھی۔ وہ اُس بیچارہ (صفدر جنگ) کے درپے آبروریزی تھے۔ مگر آپ کے آباؤ اجداد عنایت اللہ خاں صوبہ دار کشمیر اور ملا غلام محمد صاحب شیرازی اُن کے مددگار تھے جس سے کسی کی دشمنی نہ چل سکی۔ انہیں دونوں صاحبوں کی بدولت ذلت۔ رسوائی و قید سے وہ محفوظ رہے۔ اور صوبہ دار کشمیر نے صفدر جنگ کو لکھنؤ کی طرف روانہ کرا دیا۔ مگر مرزا غلام حسین عجب مستغنی المزاج اور دولتمند شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کہ جنھوں نے ایسے نواب اودھ سے مطلق رجوع نہ کی جن پر اُن کے بزرگوں کا احسان تھا۔ اور صیغۂ اخوت کے مقدس رشتہ سے گویا نواب اودھ کے واجب الاحترام ایمانی بھائی ہوتے تھے*

معنف آب حیات کی تحریر نسبت نسب

۲۔ دوسرے تذکرہ نویس مرزا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مرحوم ہیں جنھوں نے آب حیات میں یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:۔

"تذکرہ سراپا سخن میں لکھا ہے۔ کہ ان کے (مرزا دبیر کے) والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔ پھر ایک جگہ اُسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش سے ہیں مصنف موصوف کو شوق ہے۔ کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں۔ اس لئے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک"

* اُس زمانہ کے اُمرا و شرفا اپنے محسنوں کی اولاد سے حسن سلوک کرنا لازم و واجب جانتے تھے خصوصاً آصف الدولہ مرحوم بڑے بامروت و سخی تھے۔ جو لکھنؤ کے حاتم سمجھے جاتے ہیں۔ اور اکثر سودا بیچنے والے آج بھی یا آصف الدولہ کہکر صبح کو سودا بیچنا شروع کرتے ہیں سچ کہا ہے ؎ کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے * کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے * ۱۲ ثابت

اس عبارت میں مولانا آزاد مرحوم نے صاحب سراپا سخن کی تردید و تکذیب فرمائی ہے۔
البتہ اتنا سہو اُن سے بھی ہؤا۔ کہ اس عبارت میں سراپا سخن کے حوالہ سے مرزا دبیر مرحوم کے
والد ماجد کا نام آغا جان لکھ گئے ہیں۔ مگر خدا مغفرت کرے آزاد مرحوم بہت نیک نیّت۔
پاک طینت تھے۔ جب اوّل اوّل مَیں نے اُن کی کتاب آب حیات دیکھی۔ اور اس میں مرزا صاحب
کے حالات میں کئی واقعہ غلط اور کئی حکائتیں ناسخ و آتش و ضمیر کی خلاف واقع نظر آئیں۔ تو
مَیں نے اُن کی خدمت میں ایک کارڈ بھیجا۔ کہ آپنے ناسخ و آتش و ضمیر کی حکائتیں اور
کئی واقعات دبیر مرحوم کے باب میں غلط درج فرمائے ہیں۔ آب حیات میں اور ایسا شور
پانی ملا ہے۔ افسوس ہے۔ اُس کے جواب میں اُن مرحوم نے صاف لفظوں میں اس
غلطی کا اعتراف فرمایا تھا۔ اور لکھا تھا۔ کہ مجھ سے جس طرح لوگوں نے کہا۔ مَیں نے لکھ دیا۔
اب تم صحیح صحیح حالات لکھو۔ مَیں آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی کر دونگا۔ مگر افسوس قضا و
قدر میں کیا چارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت آزاد آزاد نہ رہے۔ اُن کی حیات آب جنون کے
شورچھینٹوں سے تلخ ہوگئی[1] ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند +

۳-۴- تیسرا اور چوتھا نمبر مجموعہ سخن اور سخن شعرا کا ہے۔ یہ دونوں تذکرہ سراپا سخن
کے بعد لکھے گئے۔ ایک نے ایک مقام کی عبارت اور دُوسرے نے دُوسرے مقام سراپا سخن کی
گویا نقل کردی۔ تحقیق کون کرے۔ اور شمس الضحےٰ کون دیکھے[2]۔ ہائے غفلت تیرا منہ کالا۔
آفتاب نکلا ہؤا ہے پھر بھی لوگ رات رات پکارے جاتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر
جو اس نئی روشنی میں اندھیر ہؤا ہے اُس کو نمبر ۵ میں بچشم غور دیکھئے +

---

[1] اُس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مغل ہیں۔ مَیں نے میر محمد حسین صاحب لکھ دیا تھا جس پر مجھے تحریر فرمایا تھا۔ کہ بندہ
آزاد سیّد نہیں ہے۔ بلکہ سیدوں کا غلام یعنی مغل ہے۔ اللہ اللہ کیسے خلیق و منکسر شخص تھے۔ خدا مغفرت کرے برسوں مجنوں رہنے
کے بعد ابھی دو سال ہوئے کہ انتقال فرمایا ہے۔ ثابت (۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ) +

[2] حالانکہ شمس الضحےٰ سنہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع اثنا عشری لکھنؤ میں چھپ کر مشتہر ہو چکی ہے۔ مگر افسوس تمام ہندوستان میں تحقیق و تنقید کا مادہ ہی بہت کم ہے۔ ۱۲ ثابت

۵۔ پانچواں نمبر امراؤ مرزا صاحب حیرت (مالک کرزن گزٹ دہلی) کا ہے جنکو بعض لوگ چودھویں صدی کا مجدد (محقق) سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مرزا صاحب کو کالیستھ نومسلم ہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو ارمغان یا چراغ دہلی مصنفہ مرزا حیرت صاحب[1]۔ مگر اس کا جواب باصواب نواب سید مظفر علی خاں صاحب کوثر رئیس جالنسٹھ (میرے معزز کرم فرما اور استاد بھائی) کی طرف سے وقت پر پیسہ اخبار میں چھپ گیا۔ اور مرزا حیرت صاحب کی تردید ہو گئی جس کو سن کر یا دیکھ کر مرزا حیرت پی گئے[2]۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس لئے اور نیز اس خیال سے کہ مرزا حیرت صاحب خود شہادت جناب امام حسین ؑ کے منکر ہیں۔ مرزا دبیر تو اُن جناب کے ادنےٰ مداح ہیں[3]۔ مَیں مرزا حیرت کی اس تحریر پر اب نہ حیرت کرتا ہوں نہ اس سے زیادہ تردید ضروری سمجھتا ہوں +

خیر مَیں اب ذات کی بحث کو زیادہ طول دینا فضول سمجھ کر اس شعر مولانا عرفی پر ختم کرنا چاہتا ہوں ؎

المنة للہ کہ نیازم بہ نسب نیست + اینک بشہادت طلبم لوح و قلم را

مگر قبل اس کے کہ اور کچھ حالات لکھوں۔ اتنا اور لکھنا ضروری و مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ سید انشا جن کی شرافت نسب و نجابت و سیادت پر تمام تذکرے متفق ہیں۔ اور باوصفیکہ مصحفی سے اور اُن سے کیا کیا چوٹیں چلیں۔ اور کیسی کیسی ہجو کی نوبت آئی بلکہ نوبت بجی۔ اور مصحفی کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا ہوا پڑا تھا۔ پھر بھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ کہ آفتاب

فصل ۳ سید انشاء خسر مرزا دبیر مرحوم کے مفصل حالات

---

[1] مدت ہوئی جب میری نظر سے یہ کتاب گزری تھی۔ اب نام بھی یاد نہیں رہا۔ اگر چراغ دہلی نام ہے تو یہ مثل اس موقع پر صادق آتی ہے کہ چراغ کے تلے اندھیرا کیونکہ مرزا صاحب مرحوم دہلوی ہیں لہذا یک خاندانی رئیس ہیں۔ انکی نسبت مرزا حیرت دہلوی ہو کر ایسی ہمسر کہانیں مقام حیرت ہے ع حیرتی حیرتی کل العجاب ثم یعجب +

[2] پی گئے خاص روزمرہ ہے جس کا لطف اہل زبان یا زباندان اصحاب کو حاصل ہو سکتا ہے چنانچہ میرے استاد مکرم جناب منشی امیر مینائی مرحوم نے ایک موقع مناسب پر اس روزمرہ کو نظم فرمایا ہے وہ یہ ہے ؎ ہجو مے کر رہا تھا منبر پہ ۔ ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ +

[3] مرزا دبیر کو جناب امام حسین علیہ السلام کا ادنےٰ مداح میں یوں کہتا ہوں کہ اُن جناب کے اعلےٰ مداح خود پروردگار عالم اور رسول مختار صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمۂ اطہار علیہم السلام ہیں + ۔ ثابت

پر خاک ڈالے۔ اور سید انشاؔ کے نسب و سیادت میں کلام کرے (یہ ایسے عالی نسب سید ہیں)۔ انکی حقیقی
نواسی سید معصوم علی مرحوم کی بیٹی مرزا دبیر مرحوم کی زوجہ تھیں۔ جن کے لخت جگر میرے اُستاذ مکرم جناب
مرزا محمد جعفر صاحب اوجؔ مدظلہ (بقول مصنف خم خانۂ جاوید تاریخ مرثیہ گویان حال) ہیں۔ جو فخریہ ایک
مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎ نانا ہیں مرے سید عالی نسب انشا * عاجز ہے خرد اُن کے فضائل
ہوں کب انشا * یہ رشتہ بھی مرزا صاحب مرحوم کی عالی نسبی پر ایک برہان قاطع ہے *

مختصر حالات سید انشا

از بسکہ سید انشاء اللہ خاں مرحوم کا نام آگیا ہے۔ میں اس مقام پر ناظرین کی اطلاع کیواسطے
دو باتیں لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے انکا حال
آب حیات میں لکھکر ان کے کمالات کی خوب داد دی ہے۔ اور پروفیسر آزاد مرحوم کے الفاظ سے
ٹپکتا ہے۔ کہ سید انشا کے کمالات کی وجہ سے ان کو بدرجہ کمال محبت تھی۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر
کوئی بات سید انشا کے حال میں غلط نہ لکھتے۔ مگر دو باتیں مندرجہ آب حیات خلاف واقع ہیں (جو
قابل تنقید و تصحیح ہیں) جو غالباً پروفیسر آزاد مرحوم تک نہیں پہنچیں *

۱- آب حیات دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سعادت علی خاں نواب اودھ نے
ان کی آخر عمر میں تنخواہ بند کردی تھی۔ اور یہ محتاج و مجنون ہوگئے تھے۔ لکھنؤ کے بڈھے بڈھے آدمی
عموماً اور ان کے نواسے جناب مرزا اوج مدظلہ خصوصاً مجھ سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ بس بات
اسی قدر تھی۔ کہ نواب اودھ (سعادت علی خاں) نے یہ حکم دیدیا تھا۔ کہ سید انشا اپنے مکان پر
ہر وقت رہا کریں۔ جب ہمارا چوبدار جائے وہ آجائیں۔ اسی (حبس بیجا) کی طرف وہ اپنے اُن
اشعار میں اشارہ فرماتے ہیں۔ جو حاجب علی شیرازی کو لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر یہ ہے ؎

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا * چساں کنم حرکت نوکریست یا بازی

اس حکم کا اُن کے دل پر ایک صدمہ ضرور تھا۔ مرزا دبیر مرحوم نے ایک رباعی میں ایسا مضمون
بیان فرمایا ہے۔ جو گویا سید انشا کے حسب حال بلکہ اُن کی زبان سے (گویا) ہے ؎

اس ہند میں طوطیٔ قفس کی مانند ❊ خوبی سے زباں کی زندہ ورگور ہوں میں

ورنہ وہ محتاج یا مجنون مرتے مرتے نہیں ہوئے تھے ❊

۲۔ دوسری بات قابل اظہار یہ ہے۔ کہ آب حیات کے دیکھنے سے لکھنؤ میں میرانشا کا آنا اور دربار نواب اودھ میں باریاب ہونا فقط ایک بار پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی سعادت علی خاں کے عہد میں حالانکہ یہ اُن کا دوسری مرتبہ ادھیڑ عمر میں آنا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں آئے۔ جیسا کہ مولوی احمد علی صاحب سندیلوی نے اپنی کتاب مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔ اور مولوی احمد علی صاحب کا لکھنا یوں قابل قبول ہے۔ کہ وہ سید انشا کے زمانہ کے آدمی ہیں[1] ❊

مولوی احمد علی صاحب نے جو لکھا ہے۔ اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ سید انشا نے صغر سن میں تمام کتب صرف و نحو و منطق و حکمت صدرا تک پڑھیں۔ سولہ برس کی عمر میں نواب شجاع الدولہ (صوبہ دار اودھ) کے دربار میں حاضر ہو کر جلیسوں میں شامل ہوئے۔ اُس وقت تمام دیوان ہندی (اردو) نئے طرز پر بغیر کسی اُستاد کی اصلاح کے تصنیف کر چکے تھے۔ اور کچھ فارسی و عربی اشعار بھی کہ چکے تھے۔ مَیں (حقیر ثابت) جب کبھی میرانشا کا دیوان دیکھتا تھا۔ دل میں خیال کرتا تھا۔ دیوان کیا ہے۔ جوانوں کی اُمنگوں کا فوٹو۔ جوانی کے ارمانوں کا مرقع۔ ولولوں کا خاکہ ہے۔ کیا میرانشا ہمیشہ جوان ہی رہے ہے۔ بڈھے کبھی نہیں ہوئے[2]۔ یہ

مولوی احمد علی معاصر انشا کی زبانی حال سید انشا کا

---

[1] مخزن الغرائب فارسی میں ہے۔ اس موقع کی عبارت کی نقل شمس الضحےٰ میں چھپی ہے جس سے مؤلف تذکرہ ایک ذی علم باخبر شخص معلوم ہوتے ہیں۔ مَیں نے یہ خلاصہ شمس الضحےٰ سے لکھا ہے۔ مخزن الغرائب باوصف تجسّس کے مجھے ابتک نہیں ملی۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کے یہاں اس کی ایک نقل تھی۔ مگر پھر کوئی صاحب لیگئے واپس نہ دی۔ ۱۲۔ مؤلف حقیر ❊

[2] بجز ایک مشہور غزل کے جس کا مطلع یہ ہے ؎ کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں ❊ بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں ❊ یا اور کوئی ایک آدھ غزل ایسی ہو۔ ورنہ تمام دیوان تغزل کے عاشقانہ رنگ سے رنگین ہے ❊ ۱۲ مؤلف حقیر

معما اس تذکرہ مخزن الغرائب سے حل ہؤا۔ کہ درحقیقت وہ دیوان عنفوان شباب کی تصنیف ہے +

پھر صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں نہایت حسین و وجیہ اور ایسے خوش تقریر تھے۔ کہ تمام دربار میں کوئی ایسا مقرب نہ تھا۔ آخر کو اکثر اہل دربار اُن سے حسد کرنے لگے۔ اور شجاع الدولہ کے مرنیکے بعد عہد آصف الدولہ میں میر انشا لکھنؤ سے چلے گئے۔ کچھ روز نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے لشکر میں اور کچھ عرصہ تک بُندیل کھنڈ میں رہکر پھر اپنے والد مرحوم حکیم میر ماشاء اللہ کی طرح دہلی محمد بیگ خاں ہمدانی کے پاس معزز رہے۔ (اس سے پہلے مولوی احمد علی صاحب اپنی کتاب میں میر ماشاء اللہ کے اعزاز کا یہ حال درج کر آئے ہیں۔ کہ جب وہ اپنے بگڑے ہوئے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس آئے ہیں جب بھی انیس[19] ہاتھی اُن کے ہمراہ تھے) پھر دوبارہ (میر انشا) عالم پیری میں دہلی سے لکھنؤ آکر اوّل سلیمان شکوہ اور پھر الماس علی خاں (خواجہ سرائے شاہی) کے اور سب سے آخر میں نواب سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کے مصاحب خاص ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اردو چاروں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور بہادر اور خوش مزاج ہیں۔ مجھے بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی صحبت میں عجیب و غریب باتیں اور نقلیں سن کر روتا ہؤا آدمی ہنس دیتا ہے۔ کبھی کبھی رستہ چلتے ہوئے آدمی سے دل لگی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ چپ ہو گیا تو خیر۔ ورنہ وہ گالیاں دے رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوئے ہنس رہے ہیں۔ یہ تو مزاج کی کیفیت ہے۔ اور یوں ہفت ہزاری کی مجال نہیں۔ کہ کوئی لفظ اُن کی شان کے خلاف کہدے۔ جے نگر میں باتوں باتوں میں مرزا اسمٰعیل بیگ خاں برادر زادہ محمد بیگ خاں ہمدانی سے لڑائی ہو پڑی۔ کٹار کھینچ کر (سید انشا) اُس کی طرف دوڑے۔ اور جو کچھ زبان پر آیا۔

موشجاع الدولہ کا سال وفات پروفیسر آزاد مرحوم نے صفحہ ۱۵۴ پر آب حیات میں ۱۱۸۸ھ لکھا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ آئندہ ایک دلچسپ بحث تقابل و تتبع انشاء و نظیر کی میں لکھنا چاہتا ہوں + ۱۲ مولف حقیر۔

جاؤ بے جا لکھا۔ یہی معاملہ مرزا قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ کے ساتھ لکھنؤ میں سجاد علی خاں کے روبرو پیش آیا تھا۔ کہ ایک شعر کی بحث میں سید انشا نے اُن کو ذلیل کیا۔ خیر اب میں سید انشا کو دربار اودھ میں چھوڑتا ہوں۔ مگر قبل اس کے کہ مرزا صاحب کے حالات لکھوں۔ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے معزز معاصر۔ پروفیسر عبد الغفور صاحب شہباز مؤلف زندگانی بےنظیر نے (جنہوں نے واقعی نظیر اکبر آبادی کی بے نظیر سوانح عمری لکھی ہے) جو انشا و نظیر کا بعض مقامات پر طرز کلام ملتا جلتا دیکھ کر یہ خیال و فیصلہ فرمایا ہے۔ کہ انشا نظیر کا متبع ہے۔ یہ میرے نزدیک بالکل معکوس ہے۔ کیونکہ خود پروفیسر شہباز صاحب کی تحقیق سے نظیر مرحوم کی موجودگی سنہ ۱۲۳۱ ہجری میں پائی جاتی ہے۔ کہ اُس سنہ کے ایک تذکرہ نویس دہلوی نے نظیر کا ذکر خیر لکھا ہے۔ اور سید انشا سنہ ۱۱۸۰ ہجری (سال وفات شجاع الدولہ) سے پہلے پہلے دیوان طیار کر چکے ہیں۔ کہ جب نظیر یا پیدا نہ ہوئے ہونگے یا پیدا ہو چکے ہونگے تو بچہ ہونگے +

پس حق یہ ہے۔ کہ نظیر مرحوم انشا کے مقلد و متبع ہیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ ذی علم و انصاف پسند پروفیسر شہباز صاحب اس پر نظر غور فرمائینگے۔ اور اگر میری تحقیق و رائے اُن کے نزدیک صحیح و قابل قبول ہوگی۔ تو زندگانی بے نظیر کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی درستی فرما دینگے۔ کہ آئندہ نسلیں غلطی سے بچیں +

مرزا صاحب کے ابتدائی حالات فصل اول

باب دوم۔ مرزا صاحب کے حالات ابتدائی

شجرۂ خاندان اور بزرگوں کے حالات دیکھنے سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ علم و تہذیب اس خاندان عالی شان میں گویا ہمیشہ سے ہے۔ اور شاعری و مداحی اہلبیت بھی تھی۔ ہر چند یہ سلسلہ مداحی مسلسل قائم نہ رہا ہو۔ کیونکہ مرزا غلام حسین کی نسبت کسی تحریر سے مداح یا شاعر ہونا ابتک ثابت نہیں ہوا۔ مگر یہ بات بھی مرزا دبیر صاحب کے واسطے باعث فخر ہے۔ کہ آباؤ اجداد مسلسل شاعر یا مرثیہ گو نہ تھے۔ اس پر بھی اس صفت کو اُس معراج کمال پر پہنچایا۔

جس سے بڑھکر خلاق کا نام ہے۔ چنانچہ خود وہ جناب فرماتے ہیں ؎

ہم فن مرے ثنا کی جو شہ ہوں رُوئے زمیں پر • پہنچادوں سخن کو میں ابھی عرش بریں پر

تاریخ ولادت

گیارھویں جمادی اول ۱۲۱۸ھ (بارہ سو اٹھارہ ہجری) کو مرزا صاحب پیدا ہوئے[۲]•

مقام ولادت

شہر دار السلطنت دہلی - محلہ بلّی ماراں متصل لال ڈگی مقام ولادت ہے۔ میرے خیال میں دہلی کی پیدائش صرف دو شاعر ایسے ہیں۔ جن کے حالات و خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اور جو اپنے اپنے فن میں بلکہ شاعری و مرثیہ گوئی کے فن میں یکتا مانے جاتے ہیں۔ اور دونوں اتفاق سے مغل ہیں۔ ایک تو مرزا رفیع سودا مرحوم دُوسرے مرزا سلامت علی دبیر مغفور ہیں[۳]۔ یہ دونوں شاعر دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ ان دونوں صاحبوں کی

سلہ پروفیسر آزاد مرحوم بھی آب حیات کے صفحہ ۵۵۵ و ۵۴۰ میں فرماتے ہیں۔ کہ مرثیہ گوئی کو مرزا دبیر نے اس حد تک پہنچا دیا۔ جس سے آگے ترقی کا رستہ مسدود ہوگیا۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ اب ایسا زمانہ آئیگا۔ نہ ویسے صاحب کمال پیدا ہونگے۔ یہ تو مرثیہ گوئی کی نسبت رائے تھی۔ شاعری کی نسبت پروفیسر آزاد کی یہ آزادانہ رائے ہے۔ کہ میر انیس و مرزا دبیر خاتم شعرائے اردو ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۴۳ آب حیات • ۱۲ ثابت۔

سلہ یہ تاریخ ولادت مجھے میر سید حسین عرف سید حسین جان صاحب شاگرد مرزا دبیر صاحب سے معلوم ہوئی کہ جی کے والد ماجد سید حسن عرف حسن جان صاحب مرزا صاحب کے ابتدائی شاگردوں میں اور ہم عمر تھے۔ یہ تاریخ اُن کے پاس ایک کتاب میں لکھی ہوئی نکل آئی جس کتاب میں اُن کے اور بزرگوں کی بھی تواریخ ولادت و وفات درج ہیں۔ انہوں نے مجھے بتائی میں اُنکی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں • ۱۲ مولف

سلہ میر تقی میر مرحوم جنکے باب میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ متفق ہیں کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ معہ میر مرزا سودا کو پورا شاعر اور درد کو آدھا اور سوز کو پون (شاعر) مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو آب حیات اور میر و سودا کے حالات سلہ اور مرزا دبیر کو اُن کے تمام معاصرین کیا تمام زمانہ پورا شاعر مانتا ہے۔ اور اُن کا کلام سنوا کر چھوڑتا ہے۔ بشرطیکہ منصف مزاج سامع و ناظر ہو • ۱۲ شولف

تاریخ ولادت

مقام ولادت

وجہ سے خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کو فخر ہے۔ ایسی مناسبت کسی تیسرے مشہور شاعر کو دہلی و لکھنؤ سے نہیں ہے۔ مثلاً میر تقی میر مرحوم اور مرزا اسداللہ خاں غالب مغفور آگرہ کی پیدائش ہیں۔ درد۔ ذوق و مومن دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر لکھنؤ نہیں گئے۔ ناسخ و آتش و انیس مرحومین کی فیض آباد کی پیدائش ہے۔ میر انشا مرحوم کی مرشد آباد کی۔ مُصحفی مغفور کی امروہہ کی ولادت ہے۔ شاہ نصیر دہلی کے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہے ہے۔ وہاں دفن نہیں ہوئے۔ میر سوز اور جرأت اور میر حسن ضرور ایسے شاعر ہیں۔ جو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں پیوند زمیں ہو گئے۔ مگر یہ بزرگوار مثل سودا مرحوم کے ہر فنی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ صرف شاعر ہیں۔ مرثیہ گو نہیں ہیں۔ اور ناظرین کی یہی مرضی ہے۔ تو خیر میں ان کو بھی اس زمرہ میں لیکر پانچ کا مبارک عدد (بلحاظ پنجتن پاک) پورا کرنے کو طیار ہوں۔ یہ سب کامل ہیں۔ خصوصاً میر حسن کی میں بڑی وقعت کرتا ہوں۔ کہ جن کے پوتے جناب میر انیس مرحوم ہیں[1] باقی اپنے اپنے مقام پر سوز و جرأت بھی قابل تعریف ہیں۔ الحاصل مرزا دبیر کی وجہ سے اہل دہلی و لکھنؤ جتنا فخر کریں۔ تھوڑا ہے[2]۔

نام و تخلص

نام و تخلص

نام تو ناظرین کو اوپر (سلامت علی) معلوم ہو چکا۔ جو مرزا صاحب کی سلامت روی کی گویا خبر دے رہا ہے۔ تخلص دبیر نام سے زیادہ مشہور ہے۔ مگر میں تخلص کی تاریخ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ کس بزرگ کا عطیہ ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب اپنے

[1] اور میر حسن مرحوم کی مثنوی سحر البیان اردو کی جان فصاحت کی کان ہے جس کا جواب آج تک کسی سے نہ ہو سکا ۱۲ مولف

[2] بلکہ دہلی کے احاطہ پنجاب میں ہونیکی وجہ سے اہل پنجاب کو بھی فخر و مباہات کا موقع حاصل ہے۔ اہل پنجاب جلدی جلوہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ دہلی پنجاب سے تخت گاہ ہونیکے سبب سے نکل جائے۔ اور تم یہ موقع فخر ہاتھ سے کھو دو ۱۲ ثابت۔

والد ماجد (اور تمام کنبہ) کے ساتھ پانچ سات برس کی عمر میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ میں ان کے والد ماجد نے پڑھوانا شروع کیا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فرما چکے تھے۔ کہ رجحان طبعی دیکھ کر ان کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے۔ (یہ ۱۲۲۹ یا ۱۲۳۰ ہجری کا ذکر ہے) اور میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے کہا۔ کہ یہ بندہ زادہ ہے۔ اس کو مداحی اہلبیت کا شوق ہے۔ میر ضمیر صاحب نے (صاحبزادہ سے) مخاطب ہو کر پوچھا صاحبزادے۔ نام آپ کا۔ عرض کی۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ پوچھا۔ کیا پڑھتے ہو۔ جو کچھ پڑھتے تھے بتلایا۔ جب میر ضمیر صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا۔ کہ ذی استعداد و ذہین لڑکا ہے۔ دل میں بہت خوش ہوئے۔ فرمایا جو کچھ کہا ہو مجھے سناؤ۔ مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے ✤ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ✤ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے[۱]

یہ سُن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین پھڑک گئے۔ کوئی صاحب بول اُٹھے۔ صاحبزادے ماشاء اللہ۔ چشم بد دُور۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ لمؤلفہ ع یہ بچپنے کی ہیں باتیں شباب کیا ہوگا۔ میر ضمیر صاحب نے پھر پوچھا۔ تخلص کیا کرتے ہو۔ عرض کیا تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرما دیں۔ فرمایا دبیر[۲]۔ اور پھر کہا "بر دبیراں روشن ضمیر مخفی و محتجب نماند"۔ اور مسکرا کر بولے۔ صاحبزادے۔ میں نے اپنے نفس و نام پہلے کو مقدم کر دیا۔ کہ اس

[۱] بعض حضرات اس کو رباعی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اُن کی عروض سے ناواقفی ہے۔ رباعی کے لئے بحر ہزج خاص ہے۔ اور یہ نظم اُس بحر میں نہیں ہے۔ اس لئے قطعہ ہے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ یہاں پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ شاید ۱۸۸۲ء میں مجھ سے بمقام آگرہ شاہ گنج وزیر صاحب مرحوم مشیاز و خلف الصدق جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسہ فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب کے روبرو ایک انیسیے اور ایک دبیریئے جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے ممدوح کے کلام کو پڑھ کر اُس کی خوبیاں بیان کر کے دوسرے پر ترجیح دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ دبیریئے بولے۔ اور باتیں تو در کنار ایک تخلص ہی کو دیکھئے کس قدر عظمت اور برکت نمایاں ہے۔ اُس کے وزن پر کس کثرت

مرزا دبیر کی پہلی تصنیف

(لطیفہ)

مشہور جملہ ہیں دبیر اوّل ضمیر بعد کو ہے۔ میں تمکو بتاؤنگا ضرور کا کرو۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کی زبان فال ہوا کرتی ہے۔ جو کچھ میر ضمیر (روشن ضمیر) نے فرمایا تھا وہی ہوا۔ کہ آج مرزا دبیر میر ضمیر پر تمام ملک کے نزدیک گویا مقدّم ہیں۔ اپنے اُستاد سے بڑھکر شہرت اور عزّت پائی۔ زیادہ شاگرد پائے۔ اور اس فن مرثیہ گوئی (رزم و بزم) کو جس کے موجد میر ضمیر ہیں ترقّی دی۔ اس موقع پر دبیر تخلص کا ذکر ہے۔ اِس لئے میں ایک عجیب و غریب بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ میں نے بہت سے تذکرے دیکھے۔ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر نظر آئے۔ مگر دبیر تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا مجھے نظر نہیں آیا[1]۔

منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم گویا اسی موقع کے لئے فرما گئے ہیں۔

شاعراں حال کیا مضمون تو باندھیں اسیر ✤ ڈھونڈھتے ہیں یہ تخلص بھی نیا ملتا نہیں

مرزا صاحب مرحوم نے جابجا اپنے مرثیوں میں شاعرانہ دعوے فرمایا ہے۔

کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے ✤ مضمون بھی ہمارا نہیں لڑتا ہے کسی سے

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

وہ تازہ مضامین کا رن آج پڑیگا ✤ مصرع تو کہاں ذہن کسی کا نہ لڑیگا

تیسرے مرثیہ میں کہتے ہیں۔

ماتم کی انجمن ہے یہاں رن نہ پڑنے پائے ✤ صابر کا مرثیہ ہے نہ مضمون بھی لڑنے پائے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) سے تخلص ہیں اور کثرت سے مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔ مشیر۔ منیر۔ مطیر۔ نظیر۔ قدیر۔ ظہیر۔ فقیر۔ اسیر۔ وزیر۔ خبیر۔ نصیر۔ صفیر۔ سفیر۔ حقیر۔ صغیر۔ کبیر وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کیا ہے ڈھاک کے تین پات انیس۔ نفیس۔ سلیس آگے بڑھتے تو جلیس۔ مفتی صاحب نے فرمایا تخلص تو اُدھر بھی بہت ہو سکتے ہیں۔ پوچھا کیا۔ فرمایا۔ اُنیس۔ بیس۔ اکیس۔ بائیس۔ تیئیس۔ اڑتالیس تک۔ حاضرین یہ لطیفہ سن کر بے اختیار ہنسے۔ اور فضول جھگڑہ کا خاتمہ ہوگیا ✤ ۱۲ مؤلف۔

[1] ناظرین کتاب میں سے اگر کوئی صاحب یہ تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا دیکھ چکے ہوں۔ تو کرم فرما کر مجھے آگاہ فرمائیں۔ کہ انشاء اللہ دوسری مرتبہ چھپوانے پر اپنے خیال کی تردید اور اُن کا شکریہ درج کتاب کرونگا ✤ ۱۲ ثابت بے بضاعت

مرزا صاحب زندہ ہوتے۔ تو میں اُن سے عرض کرتا۔ اب اُن کی رُوح سے گزارش کرتا ہوں کہ مضمون اور مصرع لڑنا تو درکنار حضور کا تخلص بھی کسی سے نہیں لڑا۔ درحقیقت آپ امام صابرؑ کے دل سے مداح تھے ممکن ہے کہ یہ بھی اُسی کا اثر ہو*

مرزا صاحب کا حلیہ فصل ۳

حلیہ لکھنے سے پہلے اتنا عرض کرتا ہوں۔ کہ میں نے کوشش بلیغ کی۔ کہ لکھنؤ میں یا اور کہیں مرزا صاحب مرحوم کی قلمی یا عکسی تصویر مل جائے۔ مگر ناکام رہا[1]۔ دریافت پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور بعض معمر اصحاب کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ فوٹو کا مسئلہ علمائے اسلام میں مختلف ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب نے اپنی تصویر نہیں کھچوائی۔ حالانکہ شاہی فوٹوگرافر مشکور اللہ مرحوم مرزا صاحب مرحوم کے فدائی شاگرد نے بہت چاہا۔ مگر مرزا صاحب تصویر کھچوانے پر راضی نہ ہوئے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ کسی نے کلکتہ۔ پٹنہ۔ بنارس۔ آرہ۔ کھجوہ وغیرہ میں اُنکی بغیر اجازت فوٹو لے لیا ہو۔ کہ ان مقامات پر مرزا صاحب بعد غدر ۱۸۵۷ء گئے ہیں۔ خیر اب حلیہ ملاحظہ فرمایئے

حلیہ

پکا سانولا رنگ۔ کسی قدر کشیدہ قامت۔ ماتھا بڑا۔ کثرت سجود سے ماتھے پر سجدہ کا نشان جو نہایت خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی جو ایرانی الاصل ہونیکا پتہ دیتی تھیں۔ گول دُہرا ڈیل[2]۔ دوانگشتی ڈاڑھی۔ بڑی اور پاٹ دار دلگداز آواز۔ واعظ و ذاکر کے واسطے بڑی اور دلگداز آواز ہونا بھی ایک خداداد نعمت ہے۔ مگر حسد بُری بلا ہے۔

---

[1] قدردان علم و ہنر مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے قریباً تمام ہندوستان کے سربرآوردہ اردو اخباروں میں بطور اشتہار خطوط شائع فرمائے۔ اور اپنی جیب خاص سے ۵۰ تصویر لانیوالے صاحب کو دینا چاہے مگر تصویر دستیاب نہ ہوئی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ اب سے تیس سال پہلے ایک یورپ کا علم دوست سیاح مرزا صاحب کے حالات و کلام لیگیا۔ مگر تصویر اُس کو بھی نہ ملی۔ حالانکہ اُس نے لکھنؤ میں بہت تلاش کی تھی۔ اور اُس زمانہ میں مرزا صاحب کے انتقال کو بھی تھوڑا عرصہ گذرا تھا۔ ۱۲ مولف۔

[2] جس سے خیال ہوتا تھا۔ کہ ضرور ورزش جوانی میں کی ہوگی بلکہ ہر روز تخلیہ میں کثرت کرتے ہوں۔ تو کیا عجب ہے۔ ۱۲ مولف بے بضاعت

معلوم ہوتا ہے۔ کہ کچھ لوگ اس بڑی آواز کو بھی نام رکھتے تھے چنانچہ خود ایک رباعی میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں۔ رباعی ؎

جب شاہ نجف معین و ناصر ہوئے * کیوں سب میں نہ ممتاز یہ ذاکر ہوئے

آواز ہے بھاری تو ہو۔ پر بات یہ ہے * مجلس میں سخن نہ بار خاطر ہوئے

لباس۔ سر پر گول پچ گوشیہ ٹوپی۔ جسم میں اندر شلوکہ۔ اوپر ڈھیلا کرتہ جو گھٹنوں سے نیچا ہوتا تھا۔ اُس کے نیچے ڈھیلا پائجامہ۔ اور پائجامے کے نیچے ایک جانگیہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے۔ پاؤں میں گھیتلا جوتہ +

غذا۔ صرف ایک وقت دن میں نو دس بجے غذا نوش فرماتے تھے۔ رات میں صرف چائے پیتے تھے۔ اور جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے تھے۔ اُن کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے۔ اور تپ محرقہ میں سات روز تک بیہوش رہے۔ تو اچھے ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت غذا کر دی گئی تھی۔ مگر چند روز کے بعد جو دیکھا۔ تو پھر رات کی غذا ندارد تھی۔ جناب استاذی اوج مدظلہ[1] نے پوچھا۔ تو فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے رات کی غذا ترک کر دی +

استعداد علمی۔ یہ بات لکھنؤ میں خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً مشہور ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھیں۔ جملہ علوم معقول و منقول میں تبحر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ صرف و نحو و منطق و ادب و حکمت وغیرہ مولوی غلام ضامن[2] صاحب (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) سے اور کتب دینیہ حدیث و

لباس

غذا

فصل ۵ استعداد علمی

---

[1] ان اکثر حالات کو مختلف اصحاب نے بیان فرمایا ہے۔ اور بعض امور کی صحت خود حضرت اوج مدظلہ سے حقیر نے کر لی ہے۔ حقیر نے خود بھی جناب میرزا صاحب کی زیارت کی ہے اور انکو پڑھتے بھی سنا ہے۔ در دولت پر بھی بار یاب ہوا جب جناب مرحوم کا انتقال ہوا ہے اور آخر سال کی تھی بعض حالات اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) سے سنے۔ کچھ شمس الضحٰے سے لئے۔ اس طرح یہ معجون مرکب طیار ہوئی + ۱۲ مؤلف حقیر

[2] مولوی غلام ضامن مرحوم اُس زمانہ کے ایک فاضل متبحر تھے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی مرزا فاخر مکین کے حالات میں

تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی صاحب[1] (طاب ثراہ) سے پڑھی تھیں علاوہ ان کے ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی اور مولوی فدا علی صاحب اخباری (رحمہا اللہ) سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا تھا۔ مولوی فدا علی صاحب اخباری کے ایک شاگرد رشید مولوی گلشن علی صاحب اخباری جون پوری نے ایک مجلس میں مرزا صاحب سے فخریہ کہا تھا۔ کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک اُستاد کے شاگرد ہیں اس لئے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ بیشک آپکا اور میرا فخر ہے۔ کہ آپ نے اور مَیں نے ایسے محدث کامل سے پڑھا ہے۔ اور آپ میرے اُستاد بھائی ہیں +

مذہب۔ ازبسکہ مرزا صاحب مرحوم کے کئی اُستاد اخباری تھے بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے۔ مگر تحقیق یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب ایک مُحتاط اصولی شیعہ تھے +

مذہب

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) آب حیات کے صفحہ ۲۷ کو ان کے ذکرِ خیر سے آبروئے تازہ بخشی ہے اور یہ نقل لکھی ہے۔ کہ "مولوی غلام ضامن صاحب رتبے کے فاضل تھے۔ ایک دن غزل لیکر (مرزا فاخر مکین کشمیری کے پاس) گئے۔ کہ مجھے شاگرد کیجئے۔ اور اسے اصلاح فرمائیے مرزا فاخر نے ٹال دیا مولوی صاحب نے پھر کہا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ اور کچھ خلقی کرنے لگے۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے سب مولوی صاحب نے ادا کئے۔ ایک قبول نہ ہوا۔ ناچار یہ شعر پڑھکر اُٹھ کھڑے ہوئے ؎ "مرزا مکیں ما نشود چوں بکیں + کین است جزو اعظم مرزا مکیں"+" اس سے مولوی غلام ضامن صاحب کی طبیعت حاضر کی روانی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ کیسا فی البدیہہ برجستہ لاجواب شعر فرمایا ہے + ۱۲ مؤلف۔

[1] مرزا کاظم علی صاحب کا ذکرِ خیر کچھ اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علم و فضل کی تمام لکھنؤ میں دھاک تھی۔ اور زہد و ورع کا شہرہ تھا۔ انہیں کے اخلاق حمیدہ کی نسبت مرزا جعفر علی صاحب فصیح مرحوم مثنوی نان و نمک میں فرماتے ہیں ؎ عام عامل فقیہ لوذعی　ہادی کامل امام یلمعی + ابر رحمت آفتاب مکرمت + کوکب دُرّی سحاب مکرمت + مالک اقلیم زہد و اتقا + حکمران کشور حلم و حیا + حامی دین ماحی کفر و ضلال + سر گروہ عالمان باکمال + گلبن شاداب گلزار علی + طالب حق میرزا کاظم علی + جناب شیخ ناسخ نے بھی ان کی تاریخ وفات بہت عمدہ کہی ہے۔ اور نسبت مدح اخلاق حمیدہ فرمائی ہے + ۱۲ مؤلف۔

فن شعر میں وہ میر مظفر حسین صاحب ضمیر مغفور کے شاگرد تھے۔ مگر تمام اساتذہ کو نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید حسن صاحب لطافت مرحوم (خلف الصدق امانت مغفور) نے مرزا صاحب سے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔ کہ کیا آپ کو دلگیر مرحوم سے بھی تلمذ تھا۔ فرمایا اگر تلمذ ہوتا۔ تو میرا فخر تھا لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا*

حقیر عرض کرتا ہے۔ کہ درحقیقت فن شعر میں تو اُن کے اُستاد صرف ایک میر ضمیر مغفور ہی تھے۔ مگر ان اساتذہ اربعہ میں بھی سب کے سب ادیب یا شاعر بلکہ شاعر گر تھے۔ اس لئے بہت سے رموز شاعری ان کو علماء حمد وصین سے حاصل ہوئے تھے۔ یہ حضرت ملّا مہدی مازندرانی طاب ثراہ کا فیض تلمذ و صحبت خدمت ہے۔ کہ مرزا صاحب کی فارسی کی نظم بھی اعلےٰ درجہ کی ہے۔ خصوصاً ہفت بند ملا کاشی کا مخمس قابل دید ہے۔ کہ ہر بند کے پانچوں مصرع ایک ہی شخص کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک زباندان کے لئے کمال کی بات یہ ہے۔ کہ وہ اپنا کلام اہل زبان کے کلام سے ملا دے*

باب سوم۔ مرزا صاحب کی شہرت اور ترقی
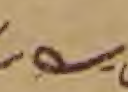
مرزا صاحب کی شاعری۔ مرثیہ گوئی۔ تحصیل علم۔ عمر عناصر اربع کی طرح ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں۔ ذہین و ذکی حد درجہ کے تھے۔ اٹھارہ اُنیس سال میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ اسی درمیان میں مرثیہ گوئی کو بھی خوب شہرت ہوگئی۔ اب تک لکھنؤ میں چار مرثیہ گو مستند مانے جاتے تھے۔ ضمیر۔ خلیق۔ دلگیر۔ فصیح۔ اب مع دبیر پانچ مانے جانے لگے۔ گویا مرثیہ گوئی کی ٹوپی اب تک چوگوشیہ تھی۔ اب پنج گوشیہ ہوگئی۔ مرزا صاحب کی شاعری کو خداداد طبیعت و ذہن نے (کہ وہ قدرتی شاعر تھے) اور ذہن کو علم نے اور علم کو حلم نے اور حلم کو تقوے و پرہیزگاری نے چمکایا۔ ان تمام اوصاف حمیدہ کی سرتاج

اُستاد فن شعر

باب ۳ شہرت و ترقی فصل اول

سخاوت و مہمان نوازی تھی۔ جو خدا نے مرزا صاحب کی سرشت و خمیر میں رکھی تھی۔ ابھی تک بزرگوں کے وقت کا اسباب بیچ بیچ کر مرزا صاحب کے والد ماجد کھاتے تھے مرزا صاحب کا دل جس مہمان نوازی اور سخاوت کو چاہتا تھا۔ اُس کے وہ جوہر نہیں دکھلا سکتے تھے* مگر ؎ بہر کائے کہ ہمت بستہ گردد۔ اگر خارے بود گلدستہ گردد۔ اب اُس کا عجیب و غریب موقع آیا +

اسباب ترقی ـ فصل ۲

اسباب ترقی قدرتی پیدا ہو گئے۔ جہاں جہاں بڑی بڑی مجلسوں میں میر ضمیر صاحب سے مجلس میں پڑھنے کا وعدہ لیا جاتا تھا۔ وہاں وہاں مرزا صاحب سے بھی لوگ وعدہ لینے لگے۔ اور اُن مجلسوں کے علاوہ بھی مرزا صاحب کو لوگ پڑھوانے لگے۔ لکھنؤ کی ریاست ایسی جلدی جلدی ترقی کر رہی تھی۔ کہ گویا عنقریب یہ سلطنت بن جائیگی۔ دہلی۔ آگرہ کے خصوصاً اور ہندوستان کے اور شہروں اور قصبوں اور دیہات کے عموماً اہل کمال سمٹ کر لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ بادشاہ سے لیکر امراء بلکہ غربا فقرا ایسے سب بھی یا شیعہ تھا یا صوفی یا ایسے سُنی کہ جو عزائے شہدائے کربلا کو اپنا فرض اعتقادی سمجھتے تھے۔ مرثیہ گویوں اور ذاکروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ نہایت عزت و احترام اور ادب و عاجزی کے ساتھ ذاکر کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں اہل ہنود بھی مجلسیں کرتے تھے۔ اور اکثر لوگ مرزا صاحب کو پڑھواتے تھے۔ اور ان کے کلام کے مشتاق رہتے تھے۔ شاعروں کا فروغ بادشاہوں یا امیروں کی دستگیری سے ہوا کرتا ہے۔ مگر دبیر کا فروغ ائمہ اطہار و شہدائے کربلا کی بدولت

* ہوا اپنے نفس کے واسطے تو شاید ہی مرزا صاحب دولت و ثروت کے طالب ہوں۔ اس لئے کہ جہاں تک میں نے سُنا۔ اور اُن کے کلام میں غور و تامل کیا۔ وہ مفلسی اور بے زری کو مالداری پر ترجیح دینے والے آدمی تھے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎ سر کو سرگشتۂ بہر ساماں نہ کیا۔ دل کو پے جمع زر۔ پریشاں نہ کیا۔ ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں + احساں کیا جو ہم پہ احساں نہ کیا + ۱۲ مؤلف حقیر

ہُوا۔ اِس مضمون کو وہ خود ایک مرثیہ میں یُوں فرماتے ہیں:-

خاقانی و فردوسی و سعدی و نظامی + شاہوں کی مدد سے ہُوئے آفاق میں نامی
عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی + دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے حقِ غلامی

ہیں دو ہی دبیر اس میں نہیں ایک کو شک ہے
منبر مری جاگیر۔ مقام اُس کا فلک ہے

جہاں تک میرا حافظہ اور یادداشت تحریری[1] مدد دیتی ہے۔ اور مَیں نے سُنا ہے۔ پہلے پہل مرزا صاحب کو پہلے بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر مرحوم نے شہرۂ کلام و کمال سُن کر اپنے عزاخانہ خاص میں پڑھنے کو چوبدار بھیج کر بُلوایا۔ مرزا صاحب پنِس میں سوار ہو کر اپنے معمولی لباس میں (جو مَیں اُوپر لکھ آیا ہُوں) پہنچے۔ راہ میں ایک بند کہ لیا تھا۔ عزاخانہ میں بادشاہ سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعد سلام لینے کے مرثیہ پڑھنے کا اشارہ فرمایا۔ تو مرزا صاحب نے منبر پر جا کر حمد و نعت و منقبت میں ایک ایک رباعی پڑھ کر وہی بند پڑھا۔ وہ بند یہ ہے:-

فصل ۲ شاہ اودھ نے مرزا صاحب کو بُلا کر سُنا

واجب ہے حمد و شکر جنابِ الٰہ میں + فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں + چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں

ذرے پہ چشمِ مہر ہے مہرِ منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو[2]

---

[1] یہ واقعہ اور یہ بند میں نے اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کی زبانی غالباً اب سے ۳۰ سال پہلے سنا تھا۔ از بسکہ اب سے ۲۰ سال پہلے میں نے ایک مفصل تذکرہ ابجیات کے رنگ پر محض مرثیہ گویوں کا لکھنا چاہا تھا۔ اُس زمانے کے بعض اخباروں میں اشتہار بھی دئے تھے اور لکھنؤ میں جو حالات معمر آدمیوں سے سنے تھے وہ بعض لکھ لئے تھے بعض اب تک یاد ہیں۔ مگر پورے پورے حالات نہ ملنے پر وہ عزم تو فسخ کر دیا۔ وہ یادداشتیں اور حالات اس کتاب کی ترتیب کے وقت بہت کام آئے۔ سچ ہے خدا کسی کی محنت برباد نہیں کرتا ۱۲ مؤلف حقیر

[2] اس بند کے مضمون پر ذرا خیال کیجئے۔ بادشاہ کی مدح بھی کی۔ تو کس نئے انداز سے۔ کہ اُس میں بھی خدا کی تعریف ہے۔

پھر یہ مرثیہ جو اُسی زمانے میں کہا تھا۔ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

داغ غم حسینؑ میں کیا آب و تاب[1] ہے

جب مرثیہ پڑھتے پڑھتے اُس موقع پر پہنچے۔ کہ جناب سکینہ (دختر چار سالہ امام حسینؑ) نے یزید کو بادشاہ سمجھ کر اُس کے رُوبرو فریاد کی ہے۔ اور اُس کے لشکریوں کے ظلم کی داد چاہی ہے۔ تو بادشاہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بند یہ ہے (جناب سکینہ یزید سے کہ رہی ہیں)

جب روز کبریا کی عدالت کا آئیگا ✤ جبار بادشاہوں کو پہلے بلائیگا

انصاف و عدل اُن سے بہت پوچھا جائیگا ✤ تو آج داد دینے کی کل داد پائیگا

گُل کر دیا ہے دونوں جہاں کے چراغ کو

لُوٹا ہے تیرے عہد میں زہراؑ کے باغ کو

بادشاہ نے خواجہ سرا کو اشارہ کیا۔ کہ پھر پڑھواؤ۔ خواجہ سرا نے مرزا صاحب سے کہکر یہ بند دوبارہ پڑھوایا۔ بادشاہ کو اپنا خیال آگیا۔ یہ بند گویا تازیانہ عبرت ہوگیا۔ مرزا صاحب تو مرثیہ پڑھ کر چلے آئے۔ بادشاہ کو رات بھر خوف خدا سے نیند نہ آئی۔ بار بار کہتے تھے۔ کہ خدا نے مجھے بھی بادشاہ کیا ہے۔ مجھ سے بھی سخت بازپرس ہوگی۔ دیکھئے میری غفلت مجھے کیا دکھاتی ہے۔ سویرے معتمد الدولہ آغا میر وزیر کو انصاف و عدالت کے باب میں بہت تاکید فرمائی[2] ✤

یہ بات بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ کہ فسانۂ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور نے عہد غازی الدین حیدر میں لکھنا شروع کیا۔ اور زمانہ نصیر الدین حیدر میں تمام کیا۔ اسی

فصل ۳ عہد غازی الدین حیدر میں مرزا صاحب کی شہرت ہو جانی فسانہ عجائب سے ثابت

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اور یہ بھی شکر کے قابل جگہ ہے۔ اور شکر خدا عقلاً و نقلاً واجب ہے۔ اور کتنی سچی بات کہی ہے۔ واقعی بہت میں جب لوگوں نے یہ سُنا ہوگا۔ کہ آج جہاں پناہ نے مرزا دبیر کو مرثیہ پڑھنے کو بلوایا ہے۔ تو ضرور چرچا کیا ہوگا۔ فوراً لکھنؤ بھر میں شور مچ گیا ہوگا ✤ ۱۲ مولف

[1] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے ✤ ۱۲ ثابت۔

[2] کچھ میں نے نہیں سُنا کہ بادشاہ ممدوح نے مرزا صاحب کو نذرانہ کیا دیا۔ مگر عقل چاہتی ہے کہ ہزار دو ہزار روپیہ ملا ہوگا ۱۲ مولف

وجہ سے وہ کہتے ہیں ؎ یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ۔ پس عہد غازی الدین
حیدر میں جن مرثیہ گویوں کی شہرت تھی۔ اور جو موجود تھے یا گذر چکے تھے۔ اُن کے نام سرور
اس تلمیح سے لیتے ہیں۔ اصل مدح تو دلگیر مرحوم کی کرتے ہیں جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ
دلگیر سے سرور کو زیادہ محبت و عقیدت تھی[1]۔

"مرثیہ گوے بے‌نظیر۔ میاں دلگیر۔ صاف باطن۔ نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین
مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر
طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان
کثیر فرمایا"۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔ اس دو تین سطر کی عبارت میں سرور نے کمال کیا ہے۔
کہ دلگیر۔ ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مسکین۔ افسردہ۔ دبیر۔ سکندر۔ گدا۔ احسان۔ دس
مرثیہ گویوں کے جو اس زمانہ تک گذر چکے تھے یا موجود تھے تخلص لکھ دئے ہیں۔ المختصر
غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہوں کے زمانہ میں مرزا صاحب کو بہت
شہرت ہوگئی۔ اور یہ اُستاد مان لئے گئے۔ اور غربا و امرا سے لیکر شاہزادیاں اور
بیگمیں تک ان کی شاگرد ہوگئیں۔ جن میں سے حسب ذیل نام آب زر سے لکھنے
کے قابل ہیں۔ (۱) ملکہ زمانی مرحومہ محل نصیر الدین حیدر بادشاہ۔ (۲) سلطان
عالیہ دختر ملکہ زمانی۔ (۳) حاجی بیگم صاحبہ دختر نصیر الدولہ۔ جو بادشاہ ہو کر محمد علی
شاہ کہلائے۔ (۴) نواب ممتاز الدولہ شوہر داماد شاہ اودھ۔ ان سرکاروں سے
مرزا صاحب کے سفارشی رقعوں پر اہل حاجت کو سالانہ لاکھوں روپیہ[2] ملا کرتا تھا۔ اور یہ

---

[1] سنا ہے کہ دلگیر مرحوم سے اُس زمانہ کے تمام اہل کمال محبت رکھتے تھے۔ وہ ایسے ہی وسیع الاخلاق نیک نہاد بزرگ تھے۔ شیخ ناسخ سے کامل اُستاد لکھنؤ سے جب الٰہ آباد گئے ہیں۔ تو دلگیر کو اس شعر میں یاد فرماتے ہیں ؎ متحد ایسے زمانے میں کہاں ہوتے ہیں ✦ آپ دلگیر ہیں ناسخ جو ہے دلگیر جدا۔ واقعی نیکی طبیعت عجب جوہر ہے۔ جو کمال پر صیقل کرتا رہتا ہے ۱۲ مولف حقیر۔

[2] اس موقع پر لاکھوں روپیہ کے لفظ میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ واقعی یہی حال تھا ۱۲ مولف حقیر۔

شاہزادیاں ع۲ و ۳ مرزا صاحب کی شاگرد بھی تھیں۔ مرزا صاحب کو آبا جان کہتی تھیں۔
حالانکہ مرزا صاحب نوجوان تھے۔ مگر ان کی عفت اور نیک چلنی بھی ضرب المثل تھی۔
بڑے بڑے شاہزادے اور حکام در دولت پر[1] حاضر ہوتے تھے۔ جس قدر مرزا صاحب
کی شہرت و نیکنامی بڑھتی جاتی تھی۔ حاسدوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی جاتی
تھی۔ اور یہاں بمصداق المرء یقیس علی نفسہ[2] مرزا صاحب کسی کو اپنا دشمن ہی نہ
سمجھتے تھے۔ اُن کے صاف دل کی تصویر اس انہیں کے آئینہ شعر میں نظر آرہی ہے ع
حاسد کو ہے پیچ و تاب کیوں موج کی شکل + یاں مثل حباب کچھ نہیں ہے دل میں
لوگ گھات میں لگے ہوئے تھے۔ خصوصاً وہ بعض شاگردان میر ضمیر صاحب جو مرزا صاحب
سے پہلے کے شاگرد تھے۔ اور اب پیچھے رہ گئے تھے۔ حسد کا تازیانہ لگا کر اپنے فرس
فراست و شہرت کو آگے نکالنا چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں نے سوچا۔ کہ شاگرد اور
اُستاد میں بگڑوا دو۔ تاکہ مرزا صاحب بے اصلاحی کلام پڑھیں۔ قلعی کُھلے۔ ہم کو اعتراض
کا موقع ہاتھ آئے۔ کیونکہ یہ لوگ مرزا صاحب کے کلام کی تمام خوبیاں میر ضمیر صاحب کی
اصلاح کی بدولت سمجھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک دریا دل۔ امیر کبیر
افتخار الدولہ مرحوم نے (جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ آخر الامر کربلائے معلےٰ میں
جا کر روضۂ اقدس کے کلید بردار ہو کر وہیں سے سیدھے راہی جنت ہوئے) جن کے
یہاں شبوں کی مجلسوں میں (جو ۱۹-۲۰-۲۱ ماہ رمضان کو ہوتی تھیں) اول مرزا دبیر
بعد میر ضمیر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صاحبوں سے انیسویں کو اصرار بلیغ کیا کہ اکیسویں

میر ضمیر صاحب سے کس طرح لوگوں نے بگڑوا دی

---

[1] اس فقرہ کی تائید میں تاریخ بہارستان اودھ دیکھئے + ۱۲ ثابت۔

[2] یعنی ہر شخص اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے۔ ایک سلام میں حقیر نے اس مضمون کو عرض کیا ہے بیت جو نیک
ہیں وہ سمجھتے ہیں نیک اوروں کو + خیال جیسا ہے ویسا ہی خواب دیکھتے ہیں۔ یہی تو وجہ تھی۔ کہ حضرت آدمؑ ایسے
کامل العقل ہو کر اپنی زوجہ کے کہنے میں آگئے۔ گیہوں کھا گئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کو آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہکر پڑھیں۔ دونوں صاحبوں نے جواب میں "انشاءاللہ" اور "بشرط فرصت" کے معمولی الفاظ کہکر وعدہ کرلیا۔ مرزا صاحب کی مشق سخن اُن کے شباب کی طرح زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے۔

س ؎ ذرّہ ہے آفتاب در بوتراب کا۔ بیسویں کو حسب معمول علے الصباح میر ضمیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا۔ حضور نے کچھ فکر فرمائی۔ فرمایا۔ مجھ کو اتنی فرصت کہاں۔ ایک مرثیہ پہلے کا کہا ہوا ہے۔ اُسی میں مطلع اور چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں۔ وہی پڑھ دونگا۔ مرزا صاحب نے اپنا نیا مرثیہ پیش کیا۔ اس کی زبان سلیس۔ بندش چُست۔ بیان دلکش۔ شوکت الفاظ مؤثر وغیرہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور تعریف کی۔ مرزا صاحب نے عرض کی۔ یہ سب حضور ہی کا فیض اور تصدّق ہے۔ اسے آپ پڑھیں۔ مَیں کچھ عذر کردونگا۔ میر ضمیر صاحب نے انکار کیا۔ میر عابد علی صاحب بشیر (شاگرد میر ضمیر صاحب یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کے حاسدوں میں تھے) بولے۔ مَیں مرزا صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے شک یہ بات نامناسب ہے۔ کہ شاگرد نیا مرثیہ پڑھے اور اُستاد پُرانا۔ میر ضمیر صاحب بولے او میرا صاحب[1] ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ خیر تم کہتے ہو تو یونہی سہی۔ پھر ایک مرتبہ وہ مرثیہ دیکھ کر کہا۔ کہ اچھا اُوپر کا ٹکڑا جس میں فضائل ہیں تم پڑھو۔ اور وہاں پر نشان بھی کردیا۔ اخیر کا حصّہ جس میں مصائب ہیں مَیں پڑھونگا۔ مرزا صاحب بولے بہت خوب۔ جہاں تک اُستاد نے حکم دیا تھا۔ وہ ورق پھاڑ لئے۔ باقی مرثیہ وہیں چھوڑ آئے۔ اکیسویں[21] کو دونوں صاحب مجلس موصوف میں شریک ہوئے۔ افتخار الدولہ نے اوّل مرزا صاحب سے کہا۔ اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا[2] نیا مرثیہ پڑھئے۔ اُنہوں نے کہا۔

---

[1] ؎ او میرا صاحب یہ میر ضمیر صاحب کا گویا سخن تکیہ تھا۔ یہ روایت مَیں اپنے نانا مرحوم (میر محمد ناظر) کی زبانی لکھتا ہوں جو ان تمام معرکوں میں شریک تھے۔ خود بھی اُنہوں نے تنقید بجا میں واقعہ ابے ۲۲ سال پہلے ۱۳۰۰ھ میں لکھا ہے جو کتاب اُسی نام سے مطبع حسینی لکھنؤ میں چھپ چکی ہے ۱۲ مؤلف

[2] ؎ یعنی کریم جب وعدہ کرتا ہے۔ تو وفا بھی کرتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب اُستاد قبلہ مدظلہ کا نو تصنیف مرثیہ ہے۔ نصف میں پڑھونگا۔ نصف جناب اُستاد پڑھیں گے۔ یہ کہکر منبر پر گئے۔ حسب معمول دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے۔ ادھر میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر صاحب سے سرگوشی کی۔ اور کہا اول کا ٹکڑہ بہت چُست اخیر کا سُست ہے۔ مَیں مرزا صاحب کو منع کئے دیتا ہوں۔ کہ یہ مرثیہ نہ پڑھیں اور کوئی مرثیہ پڑھ دیں میر صاحب نے فرمایا۔ اب یہ مناسب نہیں۔ مگر یہ کب مانتے تھے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی آنکھ سے اشارہ کر چکے تھے کہ ذرا ٹھیر یئے۔ وہ ممبر پر چُپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجلس تصویرِ حیرت بنی ہُوئی ہے۔ سناٹے کا عالم ہے۔ کہ میر بشیر نے قریب منبر پہنچ کر مرزا صاحب کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جاکر آہستہ آہستہ کہا۔ کہ اُستاد فرماتے ہیں۔ تم کوئی اور مرثیہ پڑھ دو۔ مرزا صاحب نے کہا۔ مَیں اور کوئی مرثیہ نہیں لایا۔ بااین ہمہ اگر اُستاد کی یہی مرضی ہے۔ تو وہ خود مجھے آنکھ سے اشارہ فرمادیں۔ مَیں رباعیاں پڑھ کر ممبر سے اُتر آؤنگا۔ تمہارے کہنے کا مجھے اعتبار نہیں۔ اُنہوں نے میر ضمیر صاحب کے کان میں آکر کہا۔ سلامت علی کہتے ہیں۔ آج ہی تو مجھ کو اُستاد کا امتحان منظور ہے۔ دیکھوں میرے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب یہ سُن کر آگ بگولا ہو گئے۔ ادھر مرزا دبیر ناکردہ گناہ بار بار اُستاد کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ وہاں اشارہ کیسا۔ برافروختگی کے سبب سے سر زانو پر ہے۔ ناچار مرزا صاحب نے کچھ دیر کے بعد چند رباعیاں پڑھ کر وہی نیا مرثیہ شروع کیا۔ سامعین نے تعریفوں کے پھول نثار کئے۔ سبحان اللہ۔ واہ وا۔ صلِّ علٰی۔ ماشاءاللہ کے نعروں سے تمام مجلس گونج اُٹھی۔ جہاں تک اُستاد کا حکم تھا پڑھے۔ آگے نہ بڑھے۔ منبر سے اُترے۔ میر ضمیر صاحب تشریف لیگئے۔ فاتحہ پڑھ کر یہ فرماکر کہ یہ مرثیہ انہیں کا ہے۔ کسی پُرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اُتر آئے۔

مجلس کے بعد دو خلعت آئے۔ میر ضمیر صاحب کا غصّہ اُس وقت تک نہ اُترا تھا۔ اپنے خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا۔ اُٹھالے جاؤ۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب نے

یہ کہکر کہ جو اُستاد کے فائدے پر اپنے فائدے کو مُقدّم رکھے وہ ملعون ہے۔ اپنا خلعت بھی پھیر دیا۔ دُوسرے دن صبح کو حسب معمول اُستاد کی خدمت میں پہنچے۔ کہ حقیقت حال معلوم ہو۔ اُنھوں نے کم التفاتی فرمائی۔ پھر شب کو میر ضمیر صاحب کے یہاں شریک ہوئے۔ تو وہاں میر عابد علی بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے آوازے پھینکنا شروع کئے۔ مگر مرزا صاحب نے صبر و تحمل کو کام فرمایا۔ بعد ختم مجلس مع اپنے شاگرد میر ظہیر کے (جو اس کے راوی ہیں) اپنے گھر چلے۔ راستہ میں میر ظہیر سے کہا بھئی تم نے ان کی باتیں سنیں۔ ظہیر بولے۔ جناب اگر آپ تھوڑی دیر اور بیٹھے رہتے۔ تو مجھ سے کسی نہ کسی سے تلوار چل جاتی۔ دانتوں کے تلے اُنگلی دباکر فرمایا۔ ہا۔ توبہ کرو۔ اُستاد کے گھر میں ایسی جسارت تمکو اتنی سی بات پر غُصّہ آگیا +

مرزا صاحب کا عروج کمال

فصل ۶ زمانہ کا پلٹا کھانا اور مرزا دبیر کا عروج کمال ۲

اب زمانے نے دُوسرا پلٹا کھایا۔ مرزا صاحب نے (بمصداق اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ[۱]) خدا کا نام لیکر بے اصلاحی مرثئے پڑھنا شروع کردئے ہر مہینہ میں اپنے گھر کی گیارھویں کی مجلس[۲] میں ضرور نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ اُسی زمانے کے ایک سلام کا مقطع ہے۔ جس میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں:-

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر مہ + دبیر اس کو سمجھو مہینہ ہمارا

اُدھر اکثر لوگوں کی صلاح سے ہر مہینہ کی تیرھویں کو ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں

---

[۱] ظاہر الفاظ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ خدا کو میں نے اپنا کام سونپ دیا۔ وہ بندوں کے حال کو خوب دیکھتا ہے +

[۲] دیکھئے مرزا صاحب کیا خوش نصیب خوش عقیدت تھے۔ زندگی میں اُن کی ولادت کے دن مجلس ہوتی تھی۔ مرنے کے بعد روز وفات قبر پر مجلس ہوتی ہے۔ مگر ازبسکہ روز وفات تیسویں[۳۰] ہے۔ اور چاند کبھی انتیس[۲۹] کا بھی ہو جاتا ہے۔ تو یا تیسویں یا پہلی کو مجلس ہوتی ہے یعنی چاند اگر ۳۰ کا ہے تو تیسویں کو ورنہ پہلی کو مجلس ہوتی ہے + ۱۲ مولف جعفر

میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد شہرت تخلص نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں میر ضمیر صاحب خود لکھکر شہرت کو مرثیہ دیتے تھے۔ مگر (ع قبول خاطر و لطف سخن خداداد است شہرت ہونا بخت و اتفاق سے متعلق ہے) میاں شہرت کو شہرت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد مرزا صاحب کے یہاں مجلس میں جانے سے لوگوں کو منع کرتے تھے۔ مگر مثل مشہور ہے۔ الانسان حریص علی ما منع۔ لوگ زیادہ سُننے کو آتے تھے۔ مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار اُن کے مخالفوں سے کہتے تھے۔ کہئے صاحب اب تو کوئی یہ نہیں کہ سکتا۔ کہ اُستاد نے اصلاح دے کر سُست کلام کو چُست کر دیا۔ اس درمیان میں اور بھی کئی شاہزادے اور شاہزادیاں اور نواب زادے اور امیر و غریب ہر طبقہ کے اہل علم و اہل کمال میں سے اکثر مرزا صاحب کے شاگرد اور طرفدار ہو گئے۔ میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نثر و نظم میں حملے کرتے تھے۔ کوئی صاحب مرثیہ میں فرماتے تھے ع ہمنام دبیر فلک پیر مٹا دوں۔ کوئی صاحب نثر میں دل کے بخارات نکالتے تھے۔ مرزا صاحب کے طرفدار و شاگرد اُن کو جواب دیتے تھے۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے معتقدوں کو سمجھاتے رہتے تھے۔ کہ دیکھو۔ اُستاد کا مرتبہ باپ سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ کیسا ہی کوئی سخت کلمہ کہ بیٹھے۔ تم کوئی بات خلاف تہذیب نہ کہنا۔ واقعہ واقعی بیان کر کے بس اتنا کہدینا۔ کہ دبیر کا قصور نہیں ہے۔ اگر حیات مستعار باقی ہے۔ تو یہ سب شور شین اور سوزشیں آپ سے آپ مٹ جائینگی۔ بقول مصحفی ؎

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائینگے دن + فصل گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے

آدمی شدائد و مصائب میں مستقل رہے۔ زمانہ خود پلٹہ کھائیگا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائیگا۔ مرزا صاحب کی عادت تھی۔ کہ جب زمانہ مخالفت کرتا تھا۔ وہ سکوت اختیار فرماتے تھے۔ گویا ان اشعار جناب امیر علیہ السلام پر اُن کا عمل تھا ؎

جس چیز سے روکا جاتا ہے۔ اُس کے کرنے کو آدمی کا دل زیادہ چاہتا ہے +

اَلدَّهرُ یَخنُقُ اَحیَاناً قِلَادَتَہٗ ✤ عَلَیکَ لَا تَضطَرِب فِیہِ وَلَا تَثِبِ
حَتّٰی یُفَرِّجَہَا فِی حَالِ مُدَّتِہَا ✤ فَقَد یَزِیدُ اِختِنَاقاً کُلُّ مُضطَرِبِ

ماحصل اس کا یہ ہے۔ کہ زمانہ کبھی کبھی اپنا گلوبند تیری گردن میں چُست جکڑ دیتا ہے۔ پس تو نہ گود نہ تڑپ۔ یہاں تک کہ خود بخود زمانہ ہی اُس کو پُرانا کرکے ڈھیلا کر دے۔ کیونکہ تیرے تڑپنے سے وہ گلوبند اور زیادہ تنگ ہو کر تجھ کو زیادہ تکلیف دیگا۔ اور پُرانا پڑتا جائیگا۔ ڈھیلا ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ ایک دن تیری گلو خلاصی ہو جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ کہ چند سال کے بعد مرزا صاحب کی شہرت کمال کا آفتاب اطراف عالم میں چمک گیا۔ ایک دن وزیر اودھ نواب علی نقی خاں مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نیا مرثیہ پڑھنے کے لئے منبر پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک تو وزیر اودھ کی مجلس (جو مثل شاہ اودھ مرزا صاحب کے قدرشناس و فدائی تھے)۔ دُوسرے مرزا صاحب کا پڑھنا۔ گویا تمام شہر کے شہزادے۔ نواب زادے۔ عمائد اہل کمال۔ سخنور سخن شناس۔ سخن سنج لوگوں کا مجمع تھا۔ جناب میر ضمیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جو غالباً بانی مجلس کی طلب پر تشریف لائے ہونگے۔ اس مجلس میں تمام شاہزادے اور جلیل القدر حکام مع حضور عالم (وزیر اودھ) شہ نشین پر تھے۔ اول مرزا صاحب نے ایک نظر سے تمام حاضرین کو دیکھا۔ پھر بآواز بلند فرمایا۔ کہ حضرات یہ مجلس عزا کسی بادشاہ دُنیا کا دَربار نہیں۔ بلکہ شاہنشاہ دین و دُنیا کا دَربار دُربار ہے۔ آپ حضرات جو شاہ نشین پر ہیں۔ بے تکلف ہو کر زیر منبر تشریف لائیں۔ اب کس میں طاقت تھی۔ جو تعمیل حکم نہ کرتا۔ حضور عالم نے سبقت فرمائی۔ اُن کے پیچھے پیچھے تمام شہزادے اور عمائد زیر منبر آ بیٹھے۔ مرزا صاحب نے چند رباعیاں اور چند شعر سلام کے پڑھ کر یہ مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ جس کا مطلع روشن و مشہور یہ ہے۔

فصل ۱۱
اُستاد سے صفائی کی نوبت آئی

اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق[1]

حاضرین نے تعریفوں کے پھول نچھاور کئے۔ حضور عالم نے جب ایک موقع پر باآواز بلند بہت تعریف کی۔ تو مرزا صاحب نے میر ضمیر صاحب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ یہ سب تصدق اور فیض جناب اُستاد کا ہے۔ مرثیہ ختم ہونے پر مرزا صاحب منبر سے اُترے۔ تو میر ضمیر صاحب نے اُٹھ کر گلے سے لگایا۔ وہیں سے مرزا صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ سب اگلی پچھلی باتیں دُہرائی گئیں۔ میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب بولے۔ اب یہ شخص اس لائق نہیں۔ کہ ہمارے یہاں آئے۔ مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کی۔ کہ ان کی خطا بھی میری خطا کے ساتھ ہی معاف فرمائیے۔ میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا۔ اور کچھ نادم ہوئے۔ پھر کوئی رنجش باقی نہ رہی۔ اور میر ضمیر صاحب کی گھر کی مجلس میں جو ماہواری ہوتی تھی مرزا صاحب پڑھا کئے۔ اور میر ضمیر صاحب کے سوم کی مجلس میں بھی میر انیس صاحب کے اصرار سے مرزا صاحب پڑھے[2]۔ نانا مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ یہ مجلس سرائے معالی خاں میں (ماہواری) میر ضمیر صاحب کرتے تھے۔ اور تبرک مجلس میں میں خود تقسیم کیا کرتا تھا۔ دیکھئے مرزا صاحب کی نیک طینتی کہ میر عابد علی بشیر کی خطا بھی معاف کرائی۔ انتقام لینا تو کیسا۔ یہ انسانیت کے جوہر خداداد ہیں۔ میں نے اس مضمون کو ایک رباعی میں نظم کیا ہے۔ جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ رباعی

عادت اچھی نہیں بدی کرنے کی + خصلت بد ہے جلی کٹی کرنے کی
نیکی کے لئے بنا ہے تو اے ثابت + ممکن ہو تو دشمنوں سے بھی کر نیکی

---

[1] دفتر ماتم کی جلد ساتویں میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ پہلا یہ مطلع ہے ؎ قرآں سے فضیلت درو مرجاں کی عیاں ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس کا مفصل ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر ہوگا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس کے بعد میر عابد علی صاحب بشیر اور اکثر میر ضمیر صاحب کے شاگرد اُن کے حکم سے اپنا اپنا کلام مرزا دبیر صاحب کو دکھایا کرتے تھے۔ ع دشمن بھی دوست ہو گئے خلق حسن یہ ہے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے جو حکایت آب حیات میں اس باب میں لکھی ہے وہ غلط ہے۔ اور اگر آزاد مرحوم اُس کے بعد مجنون نہ ہو جاتے۔ تو غالباً آبحیات ہی میں اُس حکایت کی وہ تصحیح فرما دیتے۔ جیسا کہ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا اور مَیں نانا مرحوم کی کتاب تنقید آب حیات اور شمس الضحےٰ بھی اُن کو بھیج دیتا۔ مگر کُلّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهَا یہ کام اب ہونا تھا اب ہُوا۔ اس موقع پر آب حیات کا نام آگیا ہے۔ اس لئے مَیں اور واقعات غلط مندرجہ آب حیات کی صحت بھی کر دوں۔ آب حیات کے ساتھ تنقید آب حیات کے مضامین (مختصر عبارت میں) لکھے دیتا ہوں امید کہ مولانا آزاد دہلوی اور حضرت ظہیر لکھنوی کی رُوحیں خوش ہو ہو کر مجھے دعائیں دیتی ہوں گی ❊

تنقید بعض مضامین آب حیات

حکایت بے اصل مندرجہ آب حیات

"ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح مرزا دبیر کو پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ کے پاس گئے۔ اُنھوں نے کہدیا۔ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی۔ اِنھوں نے کہا۔ کتاب میں تو یُوں لکھا ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ ارے تو کتاب کو کیا جانے۔ ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصّہ ہوئے۔ کہ لکڑی لیکر اُٹھے۔ یہ بھاگے۔ دروازہ تک اُن کا تعاقب کیا" میر ظہیر مرحوم فرماتے ہیں۔ یہ بہتان عظیم ہے۔ خود یہ عبارت پیر بخارا کے پاک شہدوں کی لوبیوں کا سماں دکھلاتی ہے۔ اخلاق ذمیمہ کی بو آتی ہے۔ کبھی مرزا صاحب شیخ ناسخ کے پاس نہیں گئے۔ حالانکہ اُن کو حسرت رہی۔ نہ شیخ ناسخ مرحوم کے اخلاق کی شان کے یہ حکایت شایاں ہے۔ اور شیخ ناسخ صاحب کے پاس مرزا صاحب

کے نہ جانے کی یہ وجہ تھی۔ کہ میر ضمیر صاحب سے اور شیخ صاحب سے چشمک تھی۔ کہ میر ضمیر صاحب مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور شاگردان مصحفی شیخ صاحب کو تنہا شاگرد مصحفی کا تعلیم یافتہ بتاتے تھے۔ شیخ صاحب اور اُن کے تمام شاگردوں کو اس سے انکار تھا۔ ایسی ایسی رکاوٹیں مانع تھیں۔ نواب حسین علی خاں اثر کے یہاں شیخ ناسخ آتے تھے۔ مرزا صاحب کو رغبت سے سُنتے تھے۔ وہاں بھی کبھی اس قسم کی (خلاف انسانیت) گفتگو کا موقع نہیں آیا۔ یہ تو میر ظہیر مرحوم کے ارشاد کا خلاصہ تھا۔ اب مَیں عرض کرتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی پیدائش ۱۲۱۸ھ کی۔ اور صاحب شمس الضحیٰ کی تحریر سے اور لکھنؤ کے معمر آدمیوں کی تقریر سے ثابت ہے کہ بارہ برس کی عمر میں مرزا صاحب میر ضمیر صاحب کے شاگرد ہوئے۔ اس کو ۱۲۳۰ھ سمجھئے۔ ادھر تحصیل علوم اِدھر مشق سخن کرتے رہے۔ چار پانچ برس ہی میں خوب شہرت ہوگئی۔ پس ۱۲۳۵ھ کا یہ زمانہ ہوا۔ اسی سال نواب اودھ کو شاہ کا خطاب ملا۔ اور نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ پس اس زمانہ میں مرزا صاحب کی ایسی شہرت ہوگئی تھی۔ کہ وہ اُستاد مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ جیسا کہ فسانہ عجائب کی عبارت مذکورہ شاہد عادل ہے کہ اُس میں ضمیر و خلیق وغیرہما کے ساتھ ساتھ دبیر کا نام بھی ہے۔ اچھا اب شیخ ناسخ مرحوم کے حالات پر خیال فرمائیے۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے آب حیات کے صفحہ ۳۲۱ پر لکھا ہے۔ کہ خود شیخ ناسخ فرماتے تھے۔ کہ مَیں غزل لیکر گیا۔ مگر میر تقی میر مرحوم نے اصلاح نہ دی۔ مَیں غزل کہتا تھا۔ اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد غزل دیکھتا۔ اور خود

مولوی غلام ہمدانی مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ میں شیخ ناسخ کو یکے از دوستان محمد عیسےٰ تنہا لکھا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ وہ تنہا کے شاگرد نہیں تھے دوست ہونا اور بات ہے شاگرد اور چیز ہے۔ اُس زمانہ کے لوگ جن کے پاس زیادہ آمد و رفت و دوستی ہوتی تھی اُس کا شاگرد خیال کیا کرتے تھے۔ شاید اسی بنا پر شاگردان مصحفی نے شیخ صاحب کو شاگرد تنہا کہا ہوگا۔ اور غالباً اسی دورِاندیشی سے مرزا صاحب کبھی شیخ ناسخ کے گھر پر نہیں گئے۔ جیسا کہ میر ظہیر مرحوم نے تنقید آب حیات میں لکھا ہے۔ میر ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے گیارہ بارہ برس کی عمر میں شاگرد ہوئے۔ مدة العمر ساتھ رہے۔ وہ مرزا صاحب کی زندہ تاریخ تھے۔ اللہم اغفرہما ۱۲ مؤلف حقیر۔

اصلاح کرتا اور رکھ دیتا تھا۔ غزل (مشاعرہ میں پڑھنا تو درکنار) کبھی کو سُناتا نہ تھا۔ سید انشا۔ جرأت۔ مصحفی سب کو مشاعرہ میں سُنتا تھا۔ مگر وہاں خود کچھ نہ کہتا تھا۔ انشا و مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے۔ اور زمانہ سارے ورق اُلٹ چکا۔ اور میدان صاف ہو گیا۔ تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ یہ روایت جناب رغمی کی زبانی پروفیسر آزاد نے بہت وثوق سے لکھی ہے۔ جو رغمی شیخ صاحب کے شاگرد تھے۔ اب اس پر آپ غور فرمائینگے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ شیخ صاحب نے مصحفی کے مرنے پر یا کم سے کم بالکل اخیر زمانہ میں غزل مشاعرہ میں پڑھنا شروع کی تھی۔ اور مصحفی کا سال وفات آبحیات میں سنہ ۱۲۴۰ ہجری ہے شیخ صاحب مدت سے پوشیدہ مشق فرما رہے تھے۔ آدمی ذہین و ذی علم و صاحب ثروت تھے۔ برس دو برس ہی میں شہرت ہو گئی۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ سنہ ۱۲۳۵ھ سے سنہ ۱۲۴۰ھ تک جو زمانہ مرزا دبیر کی شہرت کا ہے۔ وہی تو شیخ صاحب کی شہرت کا ہے۔ فرق اس قدر ہے۔ کہ مرزا صاحب سنہ ۱۲۴۰ھ میں بائیس ۲۲ سال کے جوان تھے۔ اور شیخ صاحب قریباً چالیس ۴۰ پچاس ۵۰ برس کے تھے۔ مگر یہ کب ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شاعر اپنے معاصر کو گو وہ نوجوان ہی کیوں نہ ہو اس طرح پھٹکارے اور دھتکارے۔ اور ایسے ایسے کلمات تحقیر کہے۔ کہ "ارے تو کتاب کو کیا جانے"۔ "ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے"۔ اور لکڑی لیکر مارنے کو دوڑے اور معاصر نوجوان بھی وہ کہ جس کے علم و تقدس کا بھی شہرہ ہو۔ شاگرد بھی بڑے بڑے شہزادے اور شہزادیاں اور نواب و نواب زادے اور اہل علم ہوں۔ کہ یہ امر بھی آدمی کے اقتدار کا باعث ہوا کرتا ہے۔ یہ حکایت ضرور کسی ایسے شخص کی تراشی ہوئی ہے۔ جو شیخ ناسخ کی متانت و تہذیب اور مرزا صاحب کے تقدس و کمال بلکہ حال سے بھی ناواقف تھا۔

شیخ صاحب کے دل میں جو وقعت مرزا صاحب کی تھی۔ اُس کا اندازہ ناظرین کتاب کو حکایت ذیل سے ہوگا۔ جو نانا مرحوم (میر ظہیر) اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔

فصل ۹ بابت حکایت صحیحہ

حکایت صحیحہ۔ میں ایک روز محلہ ٹکسال میں ایک مجلس پڑھنے گیا۔ جو شیخ صاحب کے پڑوس

میں تھی۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ اُس وقت تک سامعین میں سے
کوئی نہ آیا تھا۔ مَیں بانی مجلس سے باتیں کر رہا تھا۔ کہ ایک صاحب آئے۔ مجھ سے
مخاطب ہو کر بولے۔ تمکو جناب شیخ صاحب یاد فرماتے ہیں۔ مَیں پہنچا۔ دیکھا جناب
شیخ ناسخ ایک کھاروے کی لُنگی باندھے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر
مونڈھوں پر خواجہ وزیر۔ میر علی اوسط رشک وغیرہ شاگرد حاضر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔
بھئی محمد رضا تم تو مہینوں نظر نہیں آتے۔ مَیں نے عرض کی۔ کیا عرض کروں۔ فرصت نہیں
ہوتی۔ فرمایا آج یہاں تم اپنے اُستاد کا کوئی نیا مرثیہ پڑھوگے۔ مَیں نے عرض کی۔
حضور ایسا ہی ارادہ ہے۔ فرمایا۔ افسوس گرمی بہت ہے۔ مَیں مجلس میں شریک نہیں
ہو سکتا۔ اچھا تم میرے حصہ کے ایک دو بند کسی مقام سراپا یا چہرہ کے یہیں مجھے
سُنا دو۔ مَیں نے اس خیال سے سکوت کیا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مَیں کوئی بند پڑھوں۔ یہ کہ
دیں۔ مرزا نے یُوں نہیں یُوں کہا ہوگا۔ اور اس پردہ میں یہ اعتراض کریں۔ مرزا صاحب
کو خبر ہو۔ وہ جواب دیں۔ بات کا بتنگڑ ہو جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے جناب میر
خلیق کے دو مصرعوں پر شیخ صاحب درپردہ دو اعتراض فرما چکے تھے جن کی اُس
زمانہ میں بہت شہرت تھی۔ (۱) لیلاف پڑھا جب کہ اُسے دُودھ پلایا۔ (۲) اکبر علی
اللہ نگہبان تمہارا۔ مصرع اوّل کو یُوں بنایا تھا۔ کہ ع پڑھ پڑھ کے لایلاف اُسے دودھ پلایا۔
اور مصرع دویم کو یُوں پلٹا تھا۔ ع پیارے مرے اللہ نگہبان تمہارا۔ اور پھر خود ہی کہدیا
تھا۔ کہ میر خلیق نے بھی یُوں ہی کہا ہوگا۔ میر خلیق تو سُن کر چپ ہو گئے تھے۔ مرزا دبیر
جن کے بازوؤں میں علم کی قوت ہے۔ ذہن بھی اقبال بھی حافظہ بھی شباب اور اوج
پر ہے۔ چپ ہونے والے نہیں ہیں۔ ضرور جھگڑا ہوگا۔ اِدھر مَیں چُپ۔ اُدھر
پھر شیخ صاحب نے فرمایا۔ ہاں بھئی پڑھو نا۔ مَیں نے پھر عرض کی۔ مَیں مرثیہ بآواز بلند پڑھونگا
یہاں تک میری آواز آئیگی۔ ذاکر کے پڑھنے کا مقام منبر ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے

دار د - حضور اُسی وقت سُن لیں - شیخ صاحب بولے - اس وقت تو دل یہی چاہتا ہے -
اچھا تم سراپا میں سے ایک ہی بند پڑھ دو - اِدھر میر علی اوسط رشک اُدھر خواجہ وزیر
بولے - جناب فرماتے ہیں ایک بند پڑھ دیجئے - میں نے اُسی مرثیہ میں سے جو پڑھنے
والا تھا حسب ذیل ایک بند پڑھا :-

گردش چشم کا مضمون

کیوں مدِ نظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار + پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردم بیمار
ابرو کے قرینے سے کھُلا چشم کا اسرار + ہیں نور کے گہوارے میں عیسیٰؑ خوش اطوار
یاں پنجۂ مریمؑ کہوں پنجے کو پلک کے
گہوارے میں عیسےؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے

یہ بند سُن کر شیخ ناسخ اچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانہ میں چلے گئے - تین چار منٹ
میں ایک کتاب لیکر آئے - فرمایا دیکھو یہ ظہیر فاریابی کا دیوان ہے - ظہیر نے بھی یہ دعوےٰ
کیا تھا - اور پُتلی کو عیسےؑ سے تشبیہ دی - مگر وہ ثابت نہ کر سکا - مرزا نے کمال کیا ہے -
پنجہ پلک کو پنجۂ مریمؑ کہکر ثابت کر دیا - کہ ع گہوارے میں عیسیٰؑ کو سُلاتی ہیں تھپک کے -
پھر فرمایا - کہ سلامت علی سا طبیعت دار خلاق مضامین نہ ہُوا ہے نہ ہو گا - بلا کی طبیعت
پائی ہے - لطف تخئیل یہی ہے - کہ شاعر جو دعوےٰ کرے - اُس کو ثابت کر دے - کیا
ثابت کیا ہے +

اسی طرح دُوسری حکایت خواجہ حیدر علی آتش کے متعلق آب حیات میں بے اصل لکھی
ہے - جس کا خلاصہ یہ ہے - کہ خواجہ صاحب نے مرزا صاحب کی زبانی ایک پہلوان کی طولانی
لڑائی سُن کر فرما دیا - کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی - آتش مرحوم تو شیخ

شیخ ناسخ کا سلامت علی پسندی

فصل ۱۰ حکایت ۲ بے اصل متعلق آتش مرحوم

۱؎ یہ بند اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے - اُس زمانہ میں یہ مرثیہ
مرزا صاحب نے نیا کہا تھا - جلد اوّل دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے +

تاریخ کی شہرت سُن کر فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے تھے سال کا زمانہ شہرت کا تو مرزا صاحب کے بھی بعد کا ہے۔ گو عمر میں یہ بھی مرزا صاحب سے بڑے تھے۔ مگر ان کا اور مرزا صاحب کا خاندان شاعری ایک تھا۔ یہ بھی مرزا صاحب کی بہت قدر و عزت فرماتے تھے۔ ان کی شرکت مجلس کی کیفیت نانا مرحوم یُوں بیان فرماتے تھے۔ کہ جس مجلس میں مرزا صاحب اشتہار دے کر اپنا غیر منقوط مرثیہ پڑھے تھے۔ اُس میں میر ضمیر مرحوم اور خواجہ آتش مغفور بھی تشریف لائے تھے۔ سامنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ مَیں (ظہیر) نے بے نقط سلام پیشخوانی میں پڑھا تھا۔ پھر مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ جس کا مطلع مشہور یہ ہے

؎ ہمہ علم سرور اکرم ہوا طالع۔ بعد ختم مجلس خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر یہ کلمہ کہا تھا کہ یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ آپ کا حصّہ ہے۔ یا فیضی کی تفسیر سُنی تھی۔ یا آج یہ مرثیہ سُنا۔ اس آواز کے سُننے والے ابھی کچھ اور لوگ بھی باقی ہیں[1]۔ یہ حکایت

آتش مرحوم کی قدردانی کی دوسری حکایت

ثانی (جس سے آتش مرحوم کی قدردانی ظاہر ہے) اور بھی سُن لیجئے۔ مرزا احمد صاحب ظہور مغفور مجھ سے ناقل تھے۔ کہ جس مجلس (عہد محمد علی شاہ یا امجد علی شاہ) میں مرزا صاحب یہ مرثیہ پڑھے تھے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؏ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل[2]۔ اُس میں خواجہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ جب مرزا صاحب نے یہ بند اسپ جناب علی اکبرؑ کی شان میں (جس کا نام عقاب تھا۔ اور جو جناب رسول خدا صلعم کی سواری کا گھوڑا تھا) پڑھا۔ ؎

---

[1] افسوس آج نہ مرزا صاحب ہیں نہ خواجہ صاحب نہ میر ظہیر نہ آزاد مرحوم۔ اور کچھ دنوں بعد راقم آثم بھی نہ ہوگا سلام بے نقط کلیات دفتر ماتم میں موجود ہے۔ جس کا انتخاب جلد دوم حیات دبیر میں حقیر نے بھی کیا ہے۔ مگر غیر مطبوعہ مرثیہ نہ چھپا ہے نہ تقسیم ہوا ہے۔ جناب استاذ مکرم حضرت اوج مدظلہ سے حقیر نے التماس کیا تھا کہ یہ چھپوا دیجئے۔ فرمایا وصیت جناب (دبیر) مرحوم کی مانع ہے۔ مَیں یہ کہکر چپ ہوگیا۔ ؏ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ ۱۲ ثابت +

[2] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں چھپا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال + نکہ سکھ ہے درست اور جواں بخت جواں سال
جادو کی نری آنکھ۔ فقط معجزے کی چال + خورشید کے سُم۔ برق کی دُم۔ سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی۔ دلیری کا جگر تھا
سرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر فرمایا۔ کہ بھئی سلامت علی خدا تمکو سلامت رکھے۔ کون کہتا ہے۔ کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو تم سے بہتر کوئی دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہ سکتا +

ناظرین آئیے حضرت آزاد وجناب ظہیر مرحومین کی رہبری سے چشمہ آبحیات کے کنارے کنارے ذرا تھوڑی دور اور چلئے۔ جواہرات رول لا بیے۔ پتھر پھینکتے جائیے +

فصل ۱۱ متفرق مضامین آبحیات کی تنقید و تصحیح +

(۱) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ مرزا صاحب نے بے نقط مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔
ع ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا۔ مگر تحقیق یہ ہے۔ کہ یہ مرثیہ مرزا صاحب کے ایک شاگرد آغا محمد تقی خاں اختر مرحوم کا ہے۔ جنہوں نے بعد کو مرزا صاحب کی شاگردی سے انکار کر دیا تھا۔ مرزا صاحب کا بے نقط وہی مرثیہ مذکورہ بالا ہے +

(۲) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ کہ کم سے کم مرزا صاحب نے تین ہزار مرثئے کہے ہونگے۔ یہ شاید صحیح ہو۔ مگر اس وقت تو ہمکو ایک ہزار مرثئے بھی اُن کے نہیں ملتے۔ بلکہ بمشکل چار پانچ سو مرثیہ پائے جاتے ہیں۔ مگر مرزا صاحب کے ہزاروں مرثئے مشہور ہونے کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) واقعی سیکڑوں مرثئے انہوں نے کہکر دوسروں کو دیدئے۔ پھر وہ مرثئے نہ اُن کے پاس رہے نہ آج دستیاب ہو سکتے ہیں۔ گویا معدوم ہو گئے +

(۲) بہت سے مرثئے دوسروں کے تخلص ڈال کر کہ دئے۔ یا دوسروں کی فرمائش

سے ایسے کہدئے کہ جس رنگ کو وہ زیادہ پسند نہ فرماتے تھے۔ مثلاً لکھنؤ میں مجھے دسمبر ۱۳۳ میں معلوم ہوا۔ کہ سلطان عالیہ کی فرمائش سے مرزا صاحب نے انکو چالیس پچاس مرثئے ایسے کہدئے۔ جن میں محض سلاست بندش اور لطف زبان ہے۔ استعارات اور صنائع و بدائع کا نام نہیں ہے۔ وہ مرثئے اُن کے عزیزوں میں کوئی بیگم صاحب ہیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ مَیں نے کوشش بھی کی۔ مگر اُن مرثیوں کی زیارت نصیب نہ ہوئی +

(۳) مرزا صاحب کے بعض کامل شعراء مرثیہ گو شاگرد منیر شکوہ آبادی۔ قدیر الدولہ قدیر۔ مولوی فقیر حسین عظیم۔ شیخ گوہر علی مشیر۔ نظیر لکھنوی۔ میر صفدر علی صفدر وغیرہ کے سیکڑوں مرثئے ہیں۔ جن کو عام لوگ مرزا صاحب کے مرثئے سمجھ رہے ہیں +

(۴) مرزا صاحب کا ایک خاص ایجاد یہ ہے۔ کہ ایک ایک مرثیہ میں موقع موقع سے چار چار پانچ پانچ مطلع کہدئے ہیں۔ کہ ذاکر جس موقع سے چاہے پڑھدے۔ اس صورت میں اگر ایک ہزار مرثیہ بھی کہے۔ تو خواہ مخواہ چار پانچ ہزار مرثئے مشہور ہو سکتے ہیں +

(۳) مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ کو انتقال فرمایا۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ۳۰ محرم سنہ ۱۲۹۲ ہجری کو رحلت فرمائی۔ عمر تخمیناً لکھی ہے وہ کچھ غلط نہیں ہے۔ اس لئے کہ ۷۴ سال کی عمر قمری حساب سے تھی۔ ہر ۳۶ سال میں شمسی و قمری حساب کی مطابقت سے ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ پس ۷۴ سال کے ۷۲ سال بحساب شمسی باقی رہ جاتے ہیں +

(۴) باقی آزاد مرحوم نے جو انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں لکھی ہیں۔ وہ بطور مزاح ہیں۔ اور آخر میں خود فیصلہ فرما دیا ہے۔ اور منصفی کی زبانی فیصلہ دیا ہے۔ کہ دونوں اچھے اس لئے اس پر مَیں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ میر انیس مرحوم کے حال کے اخیر میں بلکہ گویا آبِ حیات کے خاتمہ پر جو فقرہ لکھا ہے۔ اُس کو مَیں یہاں لکھکر کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ فقرہ یہ ہے "یہ بات درست ہے۔ کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی

لیکن جس قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ اُن کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے۔" میں اس فقرہ کی دل سے داد دینے کو طیار ہوں۔ مگر اُس کے ساتھ اتنا اور کہونگا۔ کہ غالبؔ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو مرثیہ پڑھتے ہوئے کبھی سُنا نہ تھا۔ ورنہ وہ جس طرح میر صاحب کا چشم دید مرثیہ پڑھنا آب حیات میں لکھ چکے ہیں۔ مرزا صاحب کا سُننا بھی ضرور لکھتے۔ میں نے میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں بزرگوں کو سُنا ہے۔ حقیقت میں میر صاحب کا پڑھنا لاجواب تھا۔ وہ خود گویا مضمون کی تصویر بن جاتے تھے۔ ایسا بتاتے تھے*۔ اور مرزا صاحب کا کم بتلانا اور وہ اُس کی سادگی۔ ایک ایسی قدرتی چیز تھی۔ کہ جس پر تمام مجلس تصویر حیرت بن جاتی تھی۔ میں نے میر صاحب کے سُننے کے بعد حاضرین مجلس کو یہ کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ کہ آج مرزا صاحب کو بھول گئے۔ اور مرزا صاحب کے سُننے کے بعد اُنہیں لوگوں کو یہ کہتے سُنا۔ کہ میر صاحب کو بھول گئے۔ اگر مرزا صاحب کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی۔ تو سامعین و حاضرین ایسا فقرہ کیوں کہتے تھے۔ ہاں یہ بات مولانا آزاد ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کا مرثیہ اور بھی کوئی پڑھتا ہے۔ تو زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میر صاحب کا کلام ایک طرز خاص کے بتانے کا محتاج ہے۔ اور مرزا صاحب کا کلام اکثر اداؤں (موشنس) کو خود ادا کرتا ہے۔ اور مرزا صاحب کے مرثیوں کی مجلسوں میں خواہ وہ سوز میں پڑھے جائیں خواہ تحت لفظ۔ رقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا آزاد نے یہ رائے بہت تجربہ کے بعد غالباً قائم فرمائی تھی۔ کیونکہ مجھ سے حکیم

* یوں میں نے میر صاحب کے خاندان کے اکثر ممبروں کو اور اُن کے شاگردوں میں شیخ امیر علی مرحوم کو سُنا ہے۔ اپنے اپنے مقام پر سب اچھا پڑھتے تھے۔ مگر میر صاحب کا طرز خاص بجز اُن کے چھوٹے صاحبزادے میر محمد صاحب سلیس کے اور کسی میں نہ پایا۔ لکھنؤ محلہ ٹکسال میں میر محمد صاحب مرحوم خوب خوب مجلسیں پڑھے۔ ہائے صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں۔ کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں ۱۲۔ ثابت حقیر۔

محمد حسین صاحب دہلوی (جن کا ابھی شاید دو سال ہوئے بمقام ڈبائی ضلع بلند شہر انتقال ہوا ہے) بیان فرماتے تھے۔ کہ دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء والد ماجد آزاد مرحوم جناب مولوی مرزا محمد باقر صاحب مرحوم بڑی سیر چشمی اور خوش اعتقادی سے مجلس کرتے تھے۔ اُس مجلس میں آزاد مرحوم میر صاحب کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اور اَور ذاکر کوئی میر صاحب کا کوئی مرزا صاحب کا کلام پڑھتا تھا۔ ان مجلسوں میں غالباً آزاد مرحوم کو اس بات کا اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ مرزا صاحب کے مرثیہ پر مجلس میں رقت زیادہ ہوتی ہے +

اب مَیں میر صاحب اور مرزا صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد اور جناب ظہیر مرحوم کی پاک رُوحوں پر بھی فاتحہ خیر پڑھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہُوں +

وصل (۱۱) خط مرزا صاحب مرحوم

خطّ۔ مرزا صاحب نہایت خوش خط اور باوصف خوش خطی زود نویس تھے۔ چنانچہ ایک مخمس کے چار بند اُن کے دست مبارک کے لکھے ہُوئے جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلّہ نے مجھے مرحمت فرمائے۔ مَیں نے اپنے عنایت فرما مولوی نظیر حسین صاحب سخا دہلوی مشنری اسلام و فوٹوگرافر کو دکھائے۔ اُنھوں نے اُس کا فوٹو لیا۔ جو ہدیہ ناظرین کرتا ہُوں +

اس خط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کا خط بہت پختہ اور روشن و باقاعدہ ہے۔ اور اُس زمانے کے عام آدمیوں خصوصاً ایرانیوں کی روش پر ہے۔ کہ تمام حرفوں پر نقطے نہیں ہیں۔ نہ کاف فارسی پر دو مرکز ہیں۔ بلکہ نقطے وہ بہت کم دیتے ہیں۔ اس سے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اُن کے قلمی مرثیوں سے جن کم علم کاتبوں نے اوّل اوّل نقلیں لی ہونگی۔ بعض لفظوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر تصرّف کیا ہوگا۔ اور یہیں سے تحریف کی ابتدا ہوئی۔ پھر نقل در نقل مرثیوں میں اکثر الفاظ بدلتے گئے۔ یہی سبب ہے۔ کہ اکثر مرثیوں کے الفاظ میں آج ہم بہت اختلاف و فرق پاتے ہیں +

باب چہارم۔ انداز تصنیف

باب چہارم فصل ۱ تصنیف کا انداز

مرزا صاحب اکثر باوضو جانماز پر بیٹھ کر تصنیف فرماتے تھے۔ کبھی کبھی بعد نماز شب اور کبھی بعد نماز صبح اور کھانا کھانے کے بعد گیارہ بجے دن کے کہا کرتے تھے۔ بعض بعض مصرعوں پر ایسا وجد طاری ہوتا تھا۔ کہ جھوما کرتے تھے۔ اور اکثر بین کے مضامین پر مسلسل آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ع موتی کی اک لڑی تھی کہ آنکھوں سے گر گئی[1]۔ اُس عالم وجد و جوش میں کہنے کا اثر اُن کے کلام میں سخن سنجوں کو نظر آتا ہے۔ جب تک طبیعت حاضر نہ ہوتی تھی۔ نہ کہتے تھے۔ اور جب حضور قلب کا عالم ہوتا تھا۔ کہتے تھے۔ اور جلد جلد کہتے تھے۔ جس کی تصدیق آپ کو ذیل کی روایت سے ہو جائیگی۔

جو میرے محسن جناب ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب لندنی پہرسری عالم علوم مشرقی و مغربی سابق ممبر کونسل کوٹ و جے پور نے اپنے خط مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھ کر مجھے بھیجی ہے:۔

"آپ کا خط جس وقت مجھے پہنچا۔ اس وقت میر باقر حسین صاحب پہرسری جو یہاں (جے پور میں) وکالت کرتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے کلام سے بہت انس رکھتے ہیں۔ اور مرثیہ خواں بھی بیں موجود ہیں۔ میں نے آپ کا خط اُن کو سُنایا۔ تو کہنے لگے۔ کہ سنہ ۱۸۷۱ء یا سنہ ۱۸۷۲ء میں میر وزیر حسین صاحب (مؤلف چہل مجلس شبیر وغیرہ وغیرہ) لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ میں محرر رجسٹری تھا۔ اُنہیں کے پاس رہتا تھا۔ اُس اثنا میں ایک مجلس میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں ہوئی۔ مرزا صاحب مرحوم نے نیا مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔ ~~س~~ مقتل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد[2]۔ ہجوم کی یہ کیفیت تھی کہ

فصل ۲ وجد گریہ [illegible] کا بیان

---

[1] یہ سب باتیں اپنے نانا مرحوم اور جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور مرزا آدمیوں کی زبان سے سُنی ہوئی ہیں لکھ رہا ہوں جو اُن لوگوں نے آنکھوں سے بارہا دیکھی تھیں۔

[2] جلد دوم دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔

چھتوں پر لوگ لدے ہوئے تھے۔ اور منڈیروں پر شل گھوڑے کے سوار تھے۔ اور درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی۔ تو میر وزیر حسین صاحب نے جو مجلس میں موجود تھے مرزا صاحب سے درخواست کی۔ کہ مرثیہ جو ابھی پڑھا ہے مجھکو مرحمت ہو۔ مرزا صاحب نے وعدہ فرمایا۔ کہ بہت اچھا۔ دو تین روز بعد میر وزیر حسین صاحب نے مجھکو مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ تاکہ وعدہ کو یاد دلاؤں۔ مَیں جس وقت مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ دوپہر یعنی دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مرزا صاحب خاصہ نوش فرما کر پلنگ پر استراحت فرماتے تھے۔ دو کاتب پلنگ کے اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے بعد آداب کے میر وزیر حسین صاحب کا پیغام عرض کیا۔ فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ مرثیہ لے جانا۔ مَیں بیٹھ گیا۔ مرزا صاحب کاتبوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور دونوں کاتبوں کو نو تصنیف دو مرثیہ لکھوانے لگے۔ کبھی اس کاتب کو دو تین مصرع بتا دیتے تھے کبھی اُس کاتب کو بعض مصرع یا بیت پر اُن کو ایسا جوش آجاتا تھا۔ کہ بیٹھ جاتے تھے۔ چار بجے تک یہی سماں رہا۔ چار بجے نماز (ظہرین) کے واسطے اُٹھے۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ ہر کاتب نے ساٹھ ساٹھ بند دو مرثیوں کے لکھے ہیں۔ ایک مرثیہ حال حضرت علی اکبرؑ میں اور دُوسرا امام حسینؑ کے حال میں تھا۔ میرا بھی جی ایسا لگا۔ کہ چار گھنٹے ایک آن میں ختم ہو گئے۔ نماز سے پیشتر مرزا صاحب نے مرثیہ موعود مجھکو دیدیا۔ اور یہ کہا۔ کہ راتوں رات یا کل تک نقل کر کے دے جانا۔ مَیں مرثیہ لیکر چلا آیا"۔

ناظرین دیکھئے ایسی آمد آپنے کسی شاعر کی طبیعت میں دیکھی ہے۔ جو چار گھنٹہ میں ایک سو بیس بند کہ ڈالے۔ دُوسرا شخص اتنی جلدی نثر بھی تو اس قدر نہیں لکھوا سکتا۔ ع

بحر رواں تھی یا کہ طبیعت دبیر کی۔ اور پھر اُس پر طرّہ یہ کہ کلام اچھا۔ یہ ممکن ہے۔ کہ ہر روز طبیعت میں ایسی روانی نہ ہو۔ مگر پھر بھی جو شخص ہفتہ میں ایک دن ڈیڑھ سو بند کہتا ہو۔ اُس کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں پر پہنچ جانا ممکن ہے۔ جبھی تو اکثر واقفانِ راز فرماتے ہیں۔ کہ یہ بیس جلدیں جو دفتر ماتم کی چھپی ہیں۔ کلام مرزا صاحب کا دسواں

حصّہ ہے۔

فصل ۲ حکایت ثانی طبیعت کی رسائی

اب ایک دُوسری حکایت مرزا صاحب کی روانی طبیعت کی سُن لیجیے۔ میرے کرم فرما جناب میر دستور علی صاحب بلگرامی سابق منصرم چجی سیکرٹری راجہ صاحب جہانگیر آباد جنوری یا فروری ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ فرماتے تھے۔ کہ میں ایک روز ماہ رمضان میں والد مرحوم کے ہمراہ صبح کے وقت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ وہ اُس دن داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے یہاں مجلس پڑھنے کو جانیوالے تھے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میر واجد علی صاحب کاتب سے فرما رہے تھے۔ کہ وہ ٹیپ جو میں نے پہلے کہی ہے ذرا سُست ہے۔ وہ کاٹ دو۔ اور یہ ٹیپ لکھ دو ؎

تابُوت اُٹھانے کی توانائی نہیں ہے ✦ بیٹوں نے علیؑ کے سحری کھائی نہیں ہے

یہ ٹیپ رات کو سوچی ہے۔ میں نے دیکھا۔ کہ مرزا صاحب کے پڑھنے کا مرثیہ میر واجد علی کاتب نے کھولا۔ اُس کے ہر صفحہ پر نہایت جلی قلم سے ایک بند لکھا ہُوا تھا پہلے کی ٹیپ اُنہوں نے کاٹ کر بخط جلی یہ ٹیپ مذکورہ لکھ دی۔

مرزا صاحب والد ماجد (میر محمد رضا صاحب بلگرامی) سے باتیں کرنے لگے۔ کہ یکایک ایک صاحب آئے۔ اور بعد معمولی آداب تسلیمات کے اُنہوں نے ہاتھ جوڑکر عرض کی۔ کہ مجھے اس وقت بارہ تیرہ بند اس حال میں کہہ دیجئے۔ کہ بعد شہادت علی اصغرؑ علی اصغرؑ کی ماں قبر علی اصغرؑ پر آئیں۔ کہ میں آج ہی اُن پر سوز رکھ کر کل اُن رئیس (نام رئیس کا یاد نہیں رہا) کے یہاں پڑھوں۔ کہ اس حال کا مرثیہ پڑھنے کی اُن رئیس نے مجھ سے فرمائش کی ہے۔ مرزا صاحب بولے۔ جناب اب تو میں مجلس میں جا رہا ہوں۔ اس وقت تو معاف فرمائیے۔ اُنہوں نے عرض کی۔ حضور میرے رزق کا معاملہ ہے۔ اگر ایسا مرثیہ نہ پڑھونگا۔ تو شاید مجھے نقصان پہنچ جائے۔ فرمایا تو اچھا۔ لکھتے جائیے۔ کھڑے کھڑے چودہ یا پندرہ بند کہہ دئے۔ وہ سوز خواں لکھتے گئے۔ اور اُن کے ساتھ ساتھ

مَیں لکھتا گیا۔ مرزا صاحب نے اپنے پاس اُس کی کوئی نقل نہیں رکھی۔ اس طبیعت حاضر اور زود گوئی پر والد ماجد کو اور مجھ کو سخت تعجب ہُوا۔ وہ بند اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ نہ دفتر ماتم میں چھپے ہیں اور نہ مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایسے ایسے سیکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے منتشر یا تلف ہو گئے جن کی نقل کچھ اُن کے گھر میں نہیں رہی +

فصل ۵

اصلاح دینے کا طریقہ - میر فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی (جو غزل میں مرزا غالب و سحر لکھنوی کے اور مرثیہ میں مرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے) اپنے تذکرہ مطبوعہ جلد دوم جلوہ خضر میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شاگرد سے اُس کا کلام سُنتے جاتے تھے۔ اور جس مصرع یا بند پر اصلاح دینا ہوتا تھا۔ تو مرثیہ لیکر اپنے ہاتھ سے بنا دیتے تھے۔ اور اکثر مرثئے تو خود دیکھ دیکھ کر بنا تے تھے[1]۔ اور مَیں نے اُن کے اور شاگردوں سے سُنا ہے۔ کہ جو لفظ کاٹتے یا بناتے تھے۔ اُس کی وجہ اگر وہ شاگرد حاضر ہوتا تھا۔ تو زبانی بتا دیتے تھے۔ ورنہ حاشیہ پر بطور اشارہ لکھ دیتے تھے۔ ایسے لفظ رکھ دیتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ سادہ کار نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا +

حکایت

میر واجد حسین مرحوم جو اخیر کو نثر پڑھنے لگے تھے۔ مجھ سے بمقام آگرہ ۱۸۸۱ء میں ناقل تھے۔ کہ ایک مرثیہ کسی شاگرد کا کہا ہُوا[2] مجھے مرزا صاحب نے دیا۔ کہ اس کو صاف کر دو۔ حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ تھا۔ اُس موقع پر کہ جب حضرت عباسؑ خیمے سے باہر برآمد ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب نے اصلاحاً ٹیپ لکھی تھی ؎

شاگرد کو ... کا طریقہ

[1] اور جس وقت کوئی شاگرد ہوتا تھا تو وہ کچھ شیرینی لاتا تھا جس پر باب مدینہ علم جناب امیرؑ کی نذر دیکر اُس شاگرد کو اور تمام شاگردوں اور خاص خاص دوستوں کو تقسیم فرما دیتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ میر واجد حسین پہلے مرثیہ پڑھتے تھے مرزا صاحب کے شاگرد تھے پھر نثر پڑھتے تھے میر فدا علی صاحب فدا مشہور اُستاد نثار کے شاگرد تھے۔ اکثر عشرہ محرم میں گوالیار جا کر پڑھتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے

اقبال سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے

مجھے جو شرارت سوجھی۔ تو میں نے دوسرا مصرع یوں لکھ دیا۔ ہاں **فتح** سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے۔ میں گردن جھکائے ہوئے لکھ رہا تھا۔ کہ مرزا صاحب آہستہ آہستہ آکر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مجھے خبر نہ ہوئی۔ اس ٹیپ کو پڑھ کر ہنسے۔ اور فرمایا واہ میر واجد حسین صاحب آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دیدی۔ اب میں نے گردن اٹھائی۔ دیکھا کہ مرزا صاحب کھڑے ہوتے ہیں۔ میں چپ۔ فرمایا کیا اقبال سے آپ فتح کو اس موقع پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں نے عرض کی۔ جی نہیں۔ اس وقت میرے خیال میں یونہیں آگیا۔ میں اب اس کو مٹائے دیتا ہوں۔ کپڑا پانی میں ڈوبا ہوا سامنے رکھا تھا میں نے اٹھایا۔ فرمایا ذرا ٹھیرو۔ سمجھ تو لو۔ لفظ فتح میں کیا برائی اور اقبال میں کیا خوبی ہے۔ میں نے کہا فرمائیے۔ فرمایا۔ اقبال اُردو میں مذکر اور فتح مؤنث ہے۔ پس جب شاعر اچھے شگون کے خیال سے یہ کہتا ہے۔ کہ عورت نہ کوئی سامنے آئے۔ تو فتح کا جو مؤنث ہے سامنے آنا کب مناسب ہوگا۔ اس کے سوا اقبال کے لفظی معنے پر غور کرو۔ اقبال کے خود معنے آگے آنے کے ہیں۔ لفظ فتح میں یہ بات کہاں"۔ میں نے عرض کی "درست ہے"۔ فرمایا "اکثر بزرگوار (ذاکر) از بسکہ میرے مرثیوں میں الفاظ کی خوبی اور اثر کو نہیں سمجھتے۔ اپنی سمجھ کے موافق الفاظ بدل دیتے ہیں۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے مصنف نے یوہیں کہا ہوگا۔ وہ اعتراض کرتا ہے۔ اس کو کیا خبر کہ دبیر کے اصلاح دینے والے

ہو یہ اس مرثیہ میں ٹیپ ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ یہ مرثیہ نظیر برادر دبیر مرحوم کی تصنیف ہے اور دبیر مرحوم کا اصلاحی ہے۔ نولکشور کے مطبع میں جلد اول میں یہ مرثیہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ غلطی ہے۔ پورا بند یہ ہے۔ غازی نے جو پردہ در دولت کا اٹھایا۔ اصطبل سے دوڑا ہوا یک اجل آیا۔ رہوار کو چمکار تا در سے لایا۔ اور شور نقیبان ادب نے یہ مچایا۔ آپ آتے ہیں عورت کوئی سامنے آئے۔ اقبال سے کہدو کہ عناں تھامنے آئے۔ ٹیپ مرزا صاحب نے اصلاح لکھی تھی ملاحظہ ہو جلد اول ص ۲۲ نولکشور پریس مرثیہ ہائے دبیر مرحوم

بے انتہا ہیں"۔

مَیں عرض کرتا ہُوں۔ کہ درحقیقت اکثر ذاکروں نے مرزا صاحب کے الفاظ اپنی سمجھ کے موافق بدل دئے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ قلمی مرثیوں میں بیحد اختلاف ہیں۔ اور چھاپہ میں جو کاپی لکھنے والے یا مصلح سنگ نے اصلاح دی ہے۔ وہ مزیدے برآں۔ اس لئے بعض لفظ کو گھنٹوں بعض کو منٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے کیا کہا ہوگا۔ ایسی حالت میں بعض ناواقف معترضوں کا یہ کہدینا کہ ہر جگہ چھاپہ کی غلطی کا عذر نہیں چل سکتا کس قدر ظلم کی بات ہے۔ میر علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ والبقاہ (یادگار خاندان میر انیس مرحوم) ایک روز بر سبیل تذکرہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ آپ دیکھئے۔ قرآن شریف مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اُس کی صحت کا کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اہل ہنود صاحبوں کے مطبعوں میں عموماً کاتب قرآن مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جو صحت کو اپنا ایمان سمجھ کر بہت کوشش کرتے ہونگے۔ کہ یہ کلام اللہ صحیح چھپے۔ مگر پھر بھی ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ پھر کلام دبیر و انیس (علیہما الرحمہ) پر معترض کا اعتراض کرنا اور یہ بتانے پر کہ اُن مرحوم نے یُوں نہیں یُوں کہا تھا۔ یہ جواب دینا کہ چھاپہ کی غلطی کا عذر ہر جگہ نہیں چل سکتا کس قدر نامناسب اور سینہ زوری ہے۔ خدا ایسے معترضوں کو ہدایت نیک دے۔

فصل ۵ پڑھنے کا انداز

پڑھنے کا انداز۔ جوش معرفت میں سینہ کے زور سے پڑھتے تھے۔ اور مجلس میں جب کبھی پڑھنے کو جاتے تھے وضو کر کے جاتے تھے۔ اکثر باوضو مرثیہ پڑھتے تھے۔ آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ فطرتی طور پر کہیں خود بخود ہاتھ اُٹھ جاتا تھا تو اُٹھ جاتا تھا۔ ورنہ منبر پر بیٹھ کر ہلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے۔ آنکھ اور ابرو کا اشارہ بھی اُسی قدر ہوتا تھا۔ جتنا باتوں میں ہوتا تھا[1]۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ ارتھ موسیقی میں داخل ہیں۔ مگر

[1] اس موقع پر میرے مکرم جناب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے وہ بات فرمادی۔ کہ جو اس فن کی اصل اصول (یورپ میں) سمجھی جاتی ہے۔ حقیقتاً اُسی قدر بتانے کو اس فن کے عالم اچھا سمجھتے ہیں جتنا آدمی باتوں میں بتاتا ہے زیادہ بتائیگا تو وہاں بھی معیوب سمجھا جائیگا۔ مَیں کہتا ہوں۔ اس میں بھی باہم آدمیوں کی عادتوں میں اختلاف و فرق ہے۔ کوئی باتیں کرنے

سوز خوانی میں بھی بتانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ پس مرثیہ خوانی سے بتانے کو کیا علاقہ ہے چنانچہ ایک رباعی میں اس مضمون کو وہ کہہ بھی گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:۔

ناحق کا نہ چیخنا نہ چلانا ہے + بیکار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ابنِ شہ مرداں کا ثناخواں ہوں میں + صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے

انہوں نے کبھی کسی اپنے شاگرد کو اپنے پڑھنے کا طرز نہیں سکھایا۔ نہ کسی شاگرد کو بجز ایک شخص آغا حیدر[1] مرحوم کے اُن کا طرز آیا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے میں ایسا وقار تھا۔ کہ سُننے والا ہمہ تن گوش اور محو حیرت ہو جاتا تھا۔ اور پھر تعریف کرنے پر آمادہ بلکہ مجبور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میر محمد شاہ[2] صاحب مرحوم حدیث خواں مجھ سے بیان فرماتے تھے۔ کہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ (چوک لکھنؤ) میں ایک مرتبہ مرزا صاحب مرحوم مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بڑا مجمع تھا۔ مَیں منبر سے دور اندر کے درجہ میں تھا۔ میرے پاس ایک نواب زادے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو میر انیس صاحب سے بہت حسن عقیدت رکھتے تھے۔ اور ایسے پکّے انیسئے تھے۔ کہ مرزا صاحب کی تعریف کرنا گویا گناہ اخلاقی سمجھتے تھے۔ بعض مصرع سُن سُن کر تعریف کے بدلے مجھ سے چُپکے چُپکے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھئے اس موقع کو میر صاحب کہتے تو یوں نہ کہتے۔ مَیں انکو منع کرتا تھا۔ کہ حضت (حضرت) کیا کسی دبیرئیے سے لڑوائیگا۔ اگر آپکو کلام پسند نہیں۔ تو خیر چُپکے سُنا کیجیے۔ اب وہ میرے تین چار بار کے کہنے سے چُپ ہو گئے۔ اور دیر تک چُپ چاپ

(بقیہ نوٹ نمبر۱) میں بالکل ہاتھ نہیں ہلاتا۔ کوئی کم بتلاتا ہے کوئی زیادہ۔ آخر مجبور ہو کر یہی عقل سلیم فیصلہ کرتی ہے۔ کہ متوسط درجہ اچھا ہے۔ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرو + ۱۲ مؤلف۔

[1] آغا حیدر مرحوم مرزا صاحب کے شاگرد رشید آغا حسن انس مرحوم کے بڑے بھائی تھے سُنا ہے کہ اُنکی آواز بھی مرزا صاحب سے مشابہ تھی اور اُسی طرح سے پڑھتے بھی تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ اور آغا حسن انس مرحوم میر احسن صاحب مؤلف واقعات انیس کے نانا تھے + ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ مرحوم زیادہ تر میر صاحب کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ اور اکثر میر چھیڑ چھیڑ کر مرزا صاحب کے کلام پر مرزا اعتراض کرتے تھے جس کے جواب میں میں اور سید مرتضیٰ صاحب اُن کے بھانجے کلام میر صاحب پر اعتراض کیا کرتے تھے ع عجب صحبتیں تھیں عجب وقت تھا + ۱۲ مؤلف۔

سُنا گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب پڑھتے پڑھتے اس موقع پر پہنچے:۔

ناگاہ آئے شمر و عمر رُو برُوئے شاہ
بولے سپاہ کیا ہوئی؟ اے شاہ کم سپاہ

کیوں؟ ہم ہُوئے تباہ کہ اب تم ہُوئے تباہ
اس لشکرِ قلیل پہ۔ یہ تھا غرور۔ واہ

ہرگز نہ بندگان خلیفہ سے ڈرتے تھے
اس فوج کے بھروسے پہ بیعت نہ کرتے تھے

شہ نے کہا نہ تم میں ہے انصاف نے حیا
یہ فوج۔ کیسی فوج۔ کہ جرّار۔ باوفا

اس بیکسی میں بھی ہے۔ وُہی حوصلہ مرا
بندہ جائیں ہات بیوں کی یا سر ہوں بے ردا

واللہ ہات دُونگا نہ۔ فاسق کے ہات میں
سر جائے گا۔ یہ فرق نہ آئیگا بات میں*

ظالم پکارے سر نہ کٹاؤ تو کیا کرو
اب اختیار کیا ہے جو قصد دغا کرو

بیعت کرو حسنؑ کی طرح تو بجا کرو
تیغ بنی امیہ غضب ہے۔ ڈرا کرو

ہاشم کے خاندان میں تو سب ولی ہُوئے
لشکر شکن ہُوئے تو فقط اک علیؑ ہوئے

شہ بولے تم سمجھتے ہو ناچار ہے حسینؑ
مختار و سبطِ احمدؐ مختار ہے حسینؑ

کرّار و ابن حیدرؑ کرّار ہے حسینؑ
قہر و جلالِ قادر و قہّار ہے حسینؑ

*اس مرثیہ کے یہ بند ہیں۔ جس کا مطلع یہ ہے ۔ پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد ہشتم میں چھپ چکا ہے۔ دیکھئے۔ یزید کے لشکریوں کے جیسے خیالات تھے ویسے ہی مضامین اُنکی طرف سے ادا کئے۔ وہ یزید کو خلیفۂ رسول اور اُس کی بیعت کو ایک فرض سمجھتے تھے۔ ان ہی کے خیال بحس کو انہیں کے الفاظ میں ادا کر دیا۔ امام حسین علیہ السلام جس آن بان سے حق پر مرتے دم تک قائم رہ کر بیعت سے انکار کرتے رہے۔ اُس کو حضرتؑ کے جواب میں دکھایا۔ مقتضائے حال کے موافق یہ کلام ہے۔ اور پھر کس قدر مختصر لفظوں میں یہ عین شان بلاغت کی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اچھا۔ بھلا۔ کھڑے تو رہو۔ تم۔ مَیں آتا ہُوں
اک فاقہ کش* کے دُودھ کی طاقت دکھاتا ہُوں

تصویرِ جنگ۔ لفظوں میں

شہ اک قدم بڑھے تھے کہ وہ دونوں ہٹ گئے
اُلٹی جو آستین دو عالم اُلٹ گئے
رکھا جو ہات قبضے پہ دل سب کے پھٹ گئے
ہر سمت پیک دوڑے کہ طالع پلٹ گئے

بے پیرو۔ بھاگو۔ تم کو قسم اپنے پیر کی
کھچتی ہے ذوالفقار جناب امیرؑ کی

اُوپر کے چار مسلسل بند اور پانچویں بند کے چاروں مصرع تو وہ چپ چاپ سُنا کئے۔ مگر جب پانچویں بند کی ٹیپ مرزا صاحب نے جوش میں آکر زوردار آواز سے پڑھی۔ تو بیتاب ہوکر چلّائے۔ اے سبحان اللہ۔ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جواب نہیں۔ مَیں آہستہ سے بولا۔ ہائیں یہ کیا؟ آپ تو تعریف کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کہا۔ میر صاحب۔ واللہ دل بے قابو ہو گیا۔ حقیقت میں میر صاحب اپنی طرز کے بادشاہ ہیں۔ یہ اپنے رنگ میں کامل و یکتا ہیں۔ بس بات وہی ہے۔ جو مَیں عرض کر چکا ہُوں۔ کہ اُن کے کم بتلانیکے سبب سے حاضرین اپنی پوری توجہ سے مخاطب رہتے تھے۔ اور سُنتے سُنتے محوِ حیرت ہو جاتے تھے۔ اور تمام واقعات کی تصویر خود اُن کا کلام کھینچ دیتا تھا۔ اسی طرح میر دستور علی صاحب بلگرامی منصرم جی و سیکرٹری جناب راجہ تصدق رسول صاحب راجہ جہانگیر آباد سلمہ اللہ والقاہ مجھ سے ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ ناقل تھے۔ کہ مَیں اپنے والد ماجد میر محمد رضا صاحب

مرزا صاحب کے پڑھنے کی نسبت دوسری حکایت

*یہاں پر فاقہ کش کے لفظ مصنف لائے ہیں۔ یہی وہ کنایہ و اشارے ہیں۔ جو کلام دبیر میں جج ابرات سمجھے جاتے ہیں۔ اگر اس موقع پر بنت نبی یا اور کوئی شاندار لفظ لاتے تو ہرگز سامعین و ناظرین کے دلوں پر یہ اثر نہ ہوتا۔ یہی چیزیں مرثیہ کی جان ہیں۔ جناب سیدہ کی فاقہ کشی ہی نئے باعث افتخار ہے کہ وہ دُوسروں کو اپنا کھانا کھلا کر خود بھوکی رہتی تھیں جسکو ایثار کہتے ہیں۔ یہ سخاوت کی اعلیٰ قسم ہے بس یہ کنایہ بیج ہے۔ کہ فاقہ کش کی لفظ سُنتے ہی ذہن اُن کے ایثار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے +۱۲ مؤلف حقیر

بلگرامی (رضا تخلص) مرحوم کے ساتھ غالباً ۱۸۷۲ء میں (جن دنوں کیننگ کالج میں پڑھتا تھا) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم کے امام باڑہ (واقعہ گولا گنج لکھنؤ) کی مجلس میں پہنچا۔ میری عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس قدر وہاں مجمع ہو گیا تھا۔ کہ صدر پھاٹک کے سامنے جو دیوار پردہ کی تھی۔ اُس کو تڑوا دیا گیا تھا۔ پھر بھی ایک آدمی سے ملا ہُوا دُوسرا آدمی بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ **پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی*** وہ مرثیہ سُن سُنکر والد ماجد مجھسے فرماتے جاتے تھے۔ کہ دیکھو بعض ناواقف کہتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب سلیس نظم نہیں کہتے۔ صرف مضمون آفرینی طبیعت میں ہے۔ دقیق نظم ہی کہتے ہیں۔ اس مرثیہ میں دیکھو۔ کس قدر زبان میں سلاست اور بندش میں صفائی ہے۔ اور واقعات کی تصویریں دیکھو۔ کس عمدگی سے کھنچی ہیں۔ یہ بھی خیال کرو۔ کہ ان کا پڑھنا کس قدر دلوں پر مُوثر ہے۔ کہ تمام مجلس تصویر بنی ہوئی ہمہ تن گوش ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب اس موقع پر پہنچے۔ کہ حضرت زینبؑ اپنے بچوں پر خفا ہو رہی ہیں۔ کہ تم نے شمر سے بات کیوں کی۔ اُس موقع پر یہ ایک مصرع مرزا صاحب تین طرح سے پڑھے۔ ع **کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔** ہر مرتبہ مصرع کے ایک نئے معنی سامعین کے ذہن میں آئے۔ (۱) گھُرکی کے لہجہ میں۔ کیوں۔ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی؟ (۲) استفہامیہ طور پر۔ کیوں؟ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی؟ (۳) تاسف و حسرت کے لہجہ میں۔ کیوں! تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی! اس قدر اس مصرع پر رقت ہوئی۔ کہ مرثیہ آگے نہ پڑھ سکے۔ والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا۔ اب کہو۔ مرزا صاحب سے بہتر کوئی شخص کلام کو ادا کر سکتا ہے۔ ایک ہی مصرع کو تین طرح پڑھ کر تین معنی پیدا کر دئے۔ یہ محض پڑھنے کی خوبی ہے یا نہیں۔ مَیں نے کہا بیشک کمال ہے۔ خاص کر بین کے مقامات پر پڑھنے

* جلد اوّل دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بین میں [illegible] کی نسبت

میں مرزا صاحب کو جو کمال حاصل تھا۔ شاید وہ کسی دُوسرے ذاکر کو ہو جناب استاذ مکرم (مرزا اوج صاحب قبلہ) فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ بنارس میں ایک ایرانی سوداگر نے مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلس کی تھی کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اوّل پیش خوانی میں مَیں پڑھا مجلس بالکل ٹھس تھی۔ اکثر آدمی صورت دیکھتے ہیں۔ نہ آہ ہے نہ واہ مجھے سخت تعجب ہُوا۔ کہ بظاہر ان میں اکثر پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں یہ بات کیا ہے۔ میرے بعد جناب مرزا (دبیر) صاحب منبر پر گئے۔ اور خوب جی لگا کر یہی مرثیہ (پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی) النصف اخیر اس مطلع سے پڑھا "جوشن میں دو۔ پر ایک صغیر اک کبیر ہے" مگر مجلس گم صُم مَیں حیرت میں یا اللہ یہ بات ہی کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے لڑائی ختم کی۔ اب بَین کے موقع پر جب وہ پہنچے۔ تو فرمایا۔ اس کا سبب۔ مَیں سمجھ گیا۔ کہ آپ لوگ کیوں متاثر نہیں ہوتے۔ خیر اب آپ یہ چند بند بَین کے بھی سُن لیجے۔ اور آپ کو قسم ہے اگر آپ روئے۔ اور مجھے یہ قسم ہے کہ مَیں آپ کو رُلاؤں۔ یہ کہکر جو بَین پڑھنا شروع کیا۔ تو ایک کہرام برپا تھا۔ سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے پیٹتے پیٹتے غش آ گیا۔ بعد ختم مجلس کچھ آدمیوں نے مرزا صاحب سے آکر عفو تقصیر چاہی۔ اور صاف اقرار کیا۔ کہ ہم میں آپس میں یہ عہد ہو چکا تھا۔ کہ کیسا ہی اچھا کلام کیوں نہ ہو۔ ہم نہ تعریف کرینگے۔ اور نہ روئینگے۔ ہمارے دل آپ کی نظم کے مزے اُٹھا رہے تھے۔ اور لب گویا سِئے ہوئے تھے۔ جب آپ نے بَین کے بند پڑھے۔ دل بے قابو ہو گئے اوّل آہستہ آہستہ اور پھر مجبوراً بآواز بلند ہم روئے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ ع مَیں نے بخشا مرے خدا نے بخشا۔ مگر انیسیت اور دبیریت کا ایسا خیال ایمان کا بگاڑنے والا ہے۔ آئندہ کیلئے آپ خدا سے توبہ کیجئے۔ اور کبھی کسی ذاکر کے پڑھنے میں ایسا تعصب نہ کیجئیگا۔[1]

[1] یہ لوگ پکے انیسیئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس صاحب کو بھی کبھی ایسا موقع پیش آیا تھا چنانچہ وہ اسکی شکایت

فصل ۶ قوت حافظہ

قوت حافظہ - نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ ایک دن دیوان خانہ میں دس یا نو بجے صبح کے میں پہنچا۔ مولوی کمال الدین[1] صاحب مرحوم بھائی مرزا محمد جعفر (ادام مد ظلہ) کو پڑھا رہے تھے۔ وہ مشکل مقام تھا۔ شاید حکمت کا کوئی دقیق مسئلہ تھا۔ مرزا صاحب نے مولوی صاحب ممدوح سے کہا۔ کہ حضت (حضرت) ہمکو تو ہمارے اُستاد نے یوں سمجھایا تھا۔ بڑی دیر تک مولوی کمال الدین صاحب سے بحث ہوئی۔ مرزا صاحب نے مرزا محمد جعفر سے فرمایا۔ کہ ذرا اندر جاکر ہماری کتابوں میں سے یہ کتاب اُٹھا لاؤ۔ جس میں ہم نے پڑھا تھا۔ جب تک وہ کتاب لائیں لائیں۔ مرزا صاحب کے قول کو مولانا کمال الدین نے قبول فرمالیا تھا۔ مولوی کمال الدین صاحب نے وہ کتاب لی۔ اور وہ مقام نکالا۔ تو حاشیہ پر بالکل وہی مضامین لکھے ہوئے تھے۔ جو مرزا صاحب نے بیان فرمائے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ مرزا صاحب کیا آپ نے زمانہ قریب میں اس کتاب میں یہ بحث دیکھی تھی؟ فرمایا۔ نہیں۔ جب پڑھا تھا۔ جبھی کا یہ مضمون یاد تھا۔ مولوی کمال الدین مرحوم اور میں اس حافظہ پر تعجب کرتے تھے۔ کہ اس یاد کا کیا ٹھکانہ ہے۔ ۵۰ سال بعد وہی یاد ہے۔ جو پڑھا تھا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ افسوس جابجا سے یہ کتاب دیمک کھا گئی۔ اور بہت سے حاشیہ ضائع ہو گئے۔ ورنہ یہ کتاب محمد جعفر کے بہت کام آتی۔ میں نے اکثر موقع پر حاشیہ لکھے تھے۔ یہ بھی نانا مرحوم

قوت حافظہ کی دوسری حکایت

(بقیہ نوٹ نمبر ۱) ایک مرثیہ میں یوں نظم کر گئے ہیں ؎ خاموش ہیں گوشیشۂ دل چور ہوئے ہیں۔ اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں۔ خدا ایسے طرفداروں کو توفیق دے کہ وہ کلام کی خوبی طرفداری و تعصب کی عینک اُتار کر دیکھا کریں۔ ۱۲ مؤلف

[1] مولوی کمال الدین مرحوم لکھنؤ کے چوٹی کے عالموں میں سے ایک عالم تھے مفتی میر عباس صاحب اور وہ ساتھ ساتھ سید العلما اور سلطان العلما سے پڑھے تھے۔ ان دونو صاحبوں میں مدت مدید تک مباحثہ اور مناظرہ ہوا کیا ہے جسکو لکھنؤ کے بڈھے بڈھے اہل علم بیان کیا کرتے ہیں۔ سلطان العلما اعلی اللہ مقامہ نے پھر وہ مباحثہ موقوف کرا دیا۔ لکھنؤ کے اکثر مجتہدین اور علما ان دونوں صاحبوں کے پڑھائے ہوئے تھے۔ اور آج بھی بالواسطہ ان کے کئی شاگرد مجتہد ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بیان فرماتے تھے۔ کہ مرزا صاحب سے منشی دلگیر مرحوم کو بہت محبت تھی۔ اور وہ بہت قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں جو شاید میر علی صاحب سوزخواں ہی کے امام باڑہ میں تھی۔ میر صاحب موصوف نے سوز میں منشی دلگیر مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا۔ سامعین میں مرزا صاحب بھی تھے۔ شام کو حسبِ معمول مرزا صاحب کے مکان پر مجمع ہُوا۔ ایک صاحب حاضرین میں سے بولے۔ کہ میر علی صاحب نے آج جو مرثیہ پڑھا بے مثل تھا۔ مرزا صاحب نے بھی تعریف کی۔ کہ درحقیقت ایک ایک مصرع موتیوں میں تولنے کے قابل تھا۔ وہ صاحب بولے۔ بڑی مشکل یہ ہے۔ کہ اب جب تک میر علی صاحب اس کو نہ تقسیم کر دیا جناب منشی دلگیر کسی کو نہ دینگے۔ (یہی منشی دلگیر مرحوم کا قاعدہ تھا) اور میرا دل اس مرثیہ کو چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ مرثیہ کے کل پندرہ سولہ بند تھے۔ اگر کسی کی قوت حافظہ اچھی ہو۔ تو وہ ایک۔ دو حد تین مرتبہ غور سے سُنکر یاد کر سکتا ہے۔ میر علی صاحب ابھی تو کئی مرتبہ پڑھینگے۔ اُنھوں نے کہا۔ حضت (حضرت) یہ ممکن نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا ذرا آپ لکھئے تو سہی۔ اب جو وہ لکھنے بیٹھے۔ تو مرزا صاحب نے ایک ایک بند کر کے وہ سب بند لکھوا دئے۔ اُنھوں نے مرثیہ لیکر بجائے شکریہ ادا کرنے کے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ حَضَت (حضرت) لوگ کہا کرتے ہیں کہ منشی دلگیر اور آپ مل کر مرثیہ کہا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ استغفر اللہ۔ جھوٹے ہیں۔ جو ایسا کہتے ہیں۔ بھلا جناب دلگیر ایسے مشاق کو مجھ سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مرثیہ مجھے دیجئے۔ اُنھوں نے مرثیہ دیدیا۔ مرزا صاحب نے وضو کے لوٹے میں جو پاس رکھا ہُوا تھا اُس مرثیہ کو ڈبو دیا۔ اُنھوں نے کہا۔ ہائیں قبلہ یہ آپنے کیا کیا۔ فرمایا۔ آپ مجھے بدنام کرتے۔ اور جا بجا کہتے پھرتے۔ کہ دبیر نے منشی دلگیر صاحب کا مرثیہ مجھے زبانی لکھوا دیا۔ وہ جناب دلگیر کو مدد دیتا ہے۔ جناب دلگیر کو خبر ہوتی۔ اُن کو صدمہ ہوتا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ کہ میں اُن کا دل دکھاؤں۔ اور ایک کامل فن کی

تنقیص کی شہرت کا باعث ہوں ۔

میرزا احمد صاحب ظہور تخلص جن کا انتقال زمانہ قریب میں ابھی تین برس ہوئے جب ہوا ہے مجھ سے ناقل تھے ۔ کہ ایک دن میر صفدر علی صفدر مرحوم میری موجودگی میں اپنا کہا ہوا مرثیہ سناتے جاتے تھے ۔ اور مرزا مرحوم سن سن کر جا بجا اصلاح دیتے جاتے تھے ۔ کہ اُنھوں نے ایک مقام پر تلوار کی تعریف میں یہ ٹیپ پڑھی ۔

قوت حافظہ کی تیسری حکایت مرزا احمد مرحوم ظہور تخلص کی زبانی

سد سکندری کو تپ لرزہ آتی تھی ۔ دیوار قہقہہ بھی کھڑی تھرتھراتی تھی

فرمایا ۔ اس کو یوں بناؤ ۔

سدِ سکندری پہ جو بھڑکی گھلا دیا ۔ دیوار قہقہہ پہ جو کڑکی رُلا دیا

میر صفدر علی مرحوم نے وہ اپنی کہی ہوئی ٹیپ کاٹ دی ۔ اور یہ ٹیپ لکھدی ۔ مجھے اُن کی ٹیپ بھی یاد ہو گئی تھی ۔ گھر آکر لکھ لی ۔ بیس پچیس ۲۵ برس کے بعد ایک اپنے مرثیہ میں وہی میر صفدر علی مرحوم کی ٹیپ (نظری) میں نے لکھدی ۔ وہ مرثیہ جب میں نے مرزا صاحب مرحوم کو سنایا ۔ تو وہ اس ٹیپ کو سن کر کچھ سوچنے لگے ۔ اور پھر فرمایا ۔ یہ ٹیپ تو میں نے کبھی سنی ہے ۔ نہ معلوم کس نے پڑھی تھی ۔ اور میں نے اس کو کٹوا دیا تھا ۔ مجھے اُن کے اس حافظہ پر سخت تعجب ہوا ۔ اور پھر میں نے صاف حال بیان کیا ۔ کہ یہ ٹیپ میر صفدر علی نے کہی تھی ۔ اور آپ نے اسکو کاٹ کر یہ ٹیپ بنائی تھی ۔ مجھے اُن کی ٹیپ پسند آئی ۔ میں نے لکھ لی تھی ۔ وہی ٹیپ میں نے اپنے اس مرثیہ میں لکھی ہے ۔ فرمایا اسے کاٹ دو ۔ اور پھر کہو ۔

فصل ۱۱ پابندی اوقات

پابندی اوقات ۔ مرزا صاحب کے اوقات مقرر تھے ۔ سر شام سے ۹ بجے تک وہ نماز مغربین اور تعقیبات سے فارغ ہوتے تھے ۔ پھر بارہ بجے رات تک احباب اور شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا ۔ بڑے بڑے شاہزادے اور نواب اور حکام در دولت پر حاضر ہوتے تھے ۔ علمی چرچے رہتے تھے ۔ مگر اُن کی صحبت میں جب کوئی کسی کی غیبت کرتا تھا ۔ تو اُس کو فوراً روک دیتے تھے ۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی کے شعر پر اعتراض کرتا

تھا۔ تو وہ اس کو ایک علمی بات سمجھ کر اپنے کسی شاگرد سے فرماتے تھے۔ کہ اس کا جواب دو۔ وہ جواب دیتا تھا تو خود سُنا کرتے تھے۔ ورنہ خود جواب دیتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ جناب میر انیس صاحب مرحوم کی تنقیص کرے۔[1] میر صاحب سے اُن کو دلی محبت تھی۔ اور وہ اُن کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ حقیقت میں سچ کہتے ہیں۔ اِنّ اَھلَ الفَضلِ یعرِفُ اَھلَہٗ[2] کامل ہی کامل کی قدر سمجھتا ہے۔ (بقول مصنّف حقیر) ؎

سخنور جانتے ہیں واقعی قدر سخنور کو + پرکھ لیتے ہیں مثلِ جوہری ہم اہل جوہر کو

آدھی رات کو جب یہ مجمع برخاست ہوتا تھا۔ تو پھر مرزا صاحب نماز شب میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ٹھیک حال نہیں معلوم کہ رات میں کس وقت سے کس وقت تک سوتے تھے + نماز صبح کا سلسلہ دو گھڑی دن چڑھے ختم ہوتا تھا۔ پھر کھانا کھاتے تھے۔ دوپہر کو اکثر اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ اور کبھی خود بھی وہ اسی وقت کہ لیتے تھے۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں یہ اس کثرت سے تصنیف فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے۔ کہ وہ مداحی اہل بیتؑ کو بھی عبادت خدا سمجھتے تھے۔ اکثر تعقیبات کے وقت بھی مناقب و مصائب اہلبیتؑ کہتے تھے +

---

[1] یہی حال جناب میر انیس مرحوم کی محبت کا جناب مرزا صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں مختلف لوگ کہتے تھے اور خصوصاً سید سجاد حسین صاحب رئیس بہیرہ سادات ضلع مظفر نگر مشہور مناظر و مصنف کتب مناظرہ نے بمقام پنڈراول ۷ ربیع الاول ۱۳۲۷ہجری کو مجھ سے بیان فرمایا کہ بارہ تیرہ برس ہوئے جب کہ اضلاع مظفر نگر میں جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم میر عنایت حسین صاحب کے یہاں شبیہ پڑھنے کو تشریف لائے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں خود میں نے اُن سے پوچھا کہ جیسے میر صاحب و مرزا صاحب کی نسبت باہم اختلاف لوگوں میں ہے۔ کیا ان دونوں صاحبوں میں بھی کوئی اختلاف تھا۔ یا ایک دوسرے کو کسی دوسری نظر سے دیکھتا تھا۔ تو جواب میں فرمایا کہ میر (انیس) صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص صراحتاً یا اشارتاً کسی قسم کی تنقیص جناب مرزا دبیر مغفور کی کر سکے۔ اور ایسا ہی حال جناب مرزا صاحب مغفور کا تھا۔ اُن کے یہاں بھی کوئی شخص کوئی کلمہ نامناسب کسی طرح میر صاحب کی نسبت نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک صاحب کو دوسرے صاحب سے بہت محبت تھی اور قدر کرتے تھے اور ایک صاحب دوسرے صاحب کی نسبت فرماتے تھے کہ ایسا صاحب کمال شاید پھر پیدا ہو ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یعنی تحقیق کہ اہل فضل اہل فضل کو پہچانتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۸ مہمان نوازی

مہمان نوازی بھی مرزا صاحب کی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اکثر باہر کے اہل کمال ان کے در دولت پر ٹھیرتے تھے۔ اور مہینوں رہتے تھے۔ مرزا صاحب مہمانوں کے گویا مشتاق رہتے تھے۔ اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جناب سید الطاف حسین عرف نواب صاحب ابن حسن ہمشیر زادہ نواب دولہ مرحوم رئیس شمس آباد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اس صفت میں وہ ایسے کریم تھے۔ کہ میری دانست میں کوئی مہمان حیثیت سے بے کھانا کھائے یا بے حصول نقد و جنس اُن کے دولت خانہ سے خالی کبھی نہ آیا ہوگا۔ بلکہ علیحدہ ٹھیرنے والوں کو بھی اکثر ان الفاظ سے مدعو کرکے کہ "کل نان خشک آپکی خدمت میں پہنچیگی" عمدہ سے عمدہ کھانوں کے خوان بھیجتے تھے۔ اور عموماً پردیسیوں کی وہ عزت و تعظیم فرماتے تھے۔ اگر مجلس میں کوئی صاحب[1] باہر کے ہوتے تھے۔ تو اُن کو محبت سے بُلاکر عزت سے قریب منبر بٹھلاتے تھے جہاں بعض وقت بڑے بڑے لکھنؤ کے امیروں کو جگہ ملنا دشوار ہوتا تھا[2]

فصل ۹ سخاوت

سخاوت۔ مرزا صاحب کی سخاوت سے لکھنؤ کا ہر خاندان واقف ہے۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ میں آج تک دھوم ہے۔ اُن کو جس قدر مال دُنیا حاصل ہوا شاید کسی شاعر یا مداح کو آج تک ملا ہو۔ سالانہ لاکھوں روپیہ ملتا تھا۔ سب اہل حاجت کو دیتے تھے

---

[1] چنانچہ سید علمدار حسین صاحب واسطی ۷ا نومبر ۱۹۱۱ء کے عنایت نامہ میں لکھتے ہیں کہ میرے دادا سید امیر علی صاحب مرحوم (جو ایک ذی علم بزرگ تھے) لکھنؤ میں گئے۔ مرزا صاحب بہت تپاک سے ملے۔ (اسی طرح جناب میر صاحب بھی خلق سے پیش آئے تھے) مرزا صاحب کے مرثیہ سُننے کی اُنہوں نے خواہش ظاہر فرمائی۔ تو اُنہوں نے ایک مجلس کا پتہ دیا جس میں وہ زمانہ قریب میں پڑھنے والے تھے۔ چنانچہ وہ مجلس میں پہنچے۔ تو مرزا صاحب نے باواز بلند یہ فرماکر کہ صاحبو ایک مومن پنجاب سے مجھے سُننے کو تشریف لائے ہیں براہ مہربانی اُنہیں آگے آنے دیجئے زیر منبر اُنہیں بٹھا لیا۔ اور یہ بھی وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب کے تبحر علمی نہ ما تقاعد الکلامی کا حال بیان کرتے کرتے والد صاحب مرحوم کے لب خاموش ہو جاتے تھے۔ یہ سید علمدار حسین صاحب نوشہرہ ریاست پٹیالہ کے رہنے والے اور بالفعل سررشتہ سیشن مجسٹریٹی ریاست مذکور میں ہیں ایک علم دوست ذی علم ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مشفقی و مکرمی مسٹر حامد علی خاں صاحب نے نواب الاقدر رزیر مرزا صاحب کے صاحبزادوں وغیرہ سے تحقیق کرکے فرمایا تھا کہ ملاقات

اپنے واسطے صرف مایحتاج (خرچ ضروری) رکھ لیتے تھے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء جب ٹٹیہ عظیم آباد جانا ہُوا۔ اُن کے اکثر ملنے والے نہایت عسرت میں بسر کرتے تھے۔ اور سوال کرنا تو درکنار اُن لوگوں کو کچھ لیتے ہوئے بھی حیا آتی تھی۔ مرزا صاحب بنارس کے پارچہ ریشمی و زرّین اکثر لاتے تھے۔ اور ایسے دوستوں کو بطور تحفہ دیتے تھے۔ اگر کوئی صاحب دختر ہوتے۔ تو اُن سے کہدیتے تھے۔ کہ یہ میری بھتیجی کے جہیز کے اسباب میں شامل فرما دیجیگا۔ دبیرئے و انیسے بالاتفاق مرزا صاحب کی سخاوت کی مجھ سے سیکڑوں روائتیں بیان کرتے تھے۔ اگر اس زمانہ میں وہ تمام حکایتیں لکھی جائیں۔ تو نہ معلوم نئے تعلیم یافتہ اُن کو غپیں (گپیں) سمجھیں یا کیا۔ مگر اس لئے کہ اگر سب کو نہ بیان کروں۔ تو سب کو چھوڑنا بھی نامناسب۔ اور اُن لوگوں کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔ جو ایسی روایات سُننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں سے بخیلوں کو بھی کچھ نہ کچھ حوصلہ سخاوت کا ہوتا ہے ❊

نوصل حکایت سخاوت

(۱) نانا مرحوم ناقل تھے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء میر محمد جعفر نام ایک میرے ملنے والے مجھ سے ایک روز بولے۔ کہ بھائی ایک جن ہمارے والد ماجد کے پاس رات میں چاندرات کے چاندرات آیا کرتا تھا۔ اور اُن کو پانچ روپے دے جاتا تھا۔ کل والد ماجد کا انتقال ہوگیا اب وہ آمدنی بھی غالباً گئی۔ مَیں نے کہا۔ وہ جن شاید اُن کے مرنے پر مطلع نہ ہُوا ہو۔ آج چاندرات ہے۔ شاید آئے۔ کس وقت آتا ہے۔ وہ بولے۔ دوپہر رات گئے کے قریب قریب۔ مَیں نے کہا۔ آج تم ضرور جاگنا۔ وہ بولے بھئی مَیں اکیلا ڈرونگا۔ تم میرے پاس آج رات میں جاگنا مَیں رات کو اُن کے پاس رہا۔ آدھی رات گئی ایک شخص نے زنجیر ہلائی۔ اُنہوں نے چُپکے سے مجھ سے کہا۔ تم دروازہ پر جاؤ۔ مَیں پہنچا۔ دروازہ کھُلنے پر ایک ہاتھ اُس نے بڑھایا مَیں

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) ماہواری تنخواہ کے (سلطان عالیہ کی ماں) ملکہ زمانی زوجہ نصیر الدین حیدر دوم شاہ اودھ عشرہ محرم میں دس ہزار روپیہ مرزا صاحب کو نقد پیشکش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں سے جو ملتا تھا وہ اس سے بدرجہا زیادہ تھا۔ اور اور محلات اور امرا جو پیشکش کرتے تھے۔ اُن تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے۔ تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہے ❊ ۱۲ مؤلف حقیر۔

نے اُس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ روپیہ چھن سے زمین پر گرے۔ گھبراہٹ میں مَیں نے ہاتھ پکڑ کر جو اُس کو اس خیال سے گھسیٹا کہ یہ مجھے اُڑا نہ لے جائے۔ تو وہ شخص گر پڑا۔ اب جو مَیں دیکھتا ہوں۔ تو مرزا دبیر مرحوم ہیں۔ فرمایا۔ ہائیں میر محمد رضا۔ یہ کیا حرکت تھی؟ مَیں نے اُن سبد کے مرثیہ کا حال کہا۔ اور محمد جعفر نے اور مَیں نے عفو تقصیر چاہی۔ مرزا صاحب نے مجھے اور محمد جعفر کو قسم دی۔ کہ جب تک مَیں زندہ رہوں۔ اس واقعہ کو تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جب دُوسرے دن تخلیہ میں مَیں نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو فرمایا کہ میر صاحب بڑے غیور فاقہ کش تھے۔ اگر میں اُن کو بظاہر دیتا۔ تو نہ لیتے۔ اس لئے پوشیدہ طور پر دیا کرتا تھا۔ یہ واقعہ ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے مرنے کے بعد اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔

بندگان خدا کی مطلب برآری۔ اس عبادت کو مرزا صاحب سب عبادتوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ وہ آدمی نہیں ہے۔ جو دُوسروں کے کام نہ آئے۔ شاہی زمانہ میں جب کبھی کوئی اہل حاجت اُن سے اپنی حاجت بیان کرتا تھا۔ تو وہ اگر خود اُس کو روا کر سکتے تھے۔ تو خود دیتے تھے۔ ورنہ کسی بیگم یا شاہزادہ یا شاہزادی کو رقعہ سفارشی لکھ دیتے تھے۔ اُن کا رقعہ پرامیسری نوٹ یا ہنڈوی کا کام دیتا تھا۔ اور کبھی خود پینس میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اور سفارش کر کے دلواتے تھے۔ یا جو حاجت ہوتی تھی روا فرماتے تھے۔

فصل ۱۰ مطلب براری

مولوی سردار مرزا صاحب سلمہ خلف مفتی نواب مرزا صاحب مرحوم مجھ سے ناقل تھے۔ کہ جناب میر انیس مرحوم کے ایک شاگرد نے ایک روز زمانہ شاہی لکھنؤ میں مرزا صاحب سے آکر کہا۔ کہ مجھے ملکہ زمانی کی مجلس میں آج پڑھوا دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا۔ اپنے پاس سے تمام قیمتی شاہانہ کپڑے اُن کو پہنوائے۔ ایک پینس[1] میں خود دُوسری میں

حکایت اوّل ۱

[1] پینس عام طور پر تمام ہندوستان میں بولا جاتا ہے۔ اور شاید یورپ کی کسی زبان کا یہ لفظ ہے۔ بعض اہل علم فنس کہتے ہیں۔ جو میرے نزدیک بنائی ہوئی لفظ ہے۔ مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ؎ پینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ

انکو سوار کرا کے ہمراہ لیگئے۔ سلطان عالیہ و ملکۂ زمانی سے تعریف کی۔ اور پڑھوایا۔ وہاں دو شالے اور شالی رومال اور شاید پانچ سو روپیہ اُن کو ملے۔ گھر واپس آکر وہ مرزا صاحب کے شالے کپڑے اُتارنے لگے۔ فرمایا۔ آپنے شاہزادی کا ہدیہ تو قبول فرمالیا۔ اب یہ فقیر کا ہدیہ کیوں رد فرماتے ہیں۔ اُن شالی کپڑوں کے ساتھ دو سو روپیہ اپنے پاس سے اور دئے۔ سچ ہے۔ ع مدّاح بھی کریم کا ایسا کریم ہو[1]۔

خلق انیسی مطلب براری کی دوسری حکایت

جناب سید حسن صاحب مضطر وکیل آگرہ شاگرد جناب میر مونس مرحوم مجھ سے اس واقعہ کو بمقام لکھنؤ ۱۹۰۹ء میں بیان فرماتے تھے۔ کہ (بعد غدر ۱۸۵۷ء) ایک سید صاحب نے مرزا صاحب سے آکر کہا۔ کہ آپ خود چل کر میری سفارش (ایک رئیس کا نام لیکر کہا) اُن سے دو سو روپیہ کے واسطے (کہ میں کربلائے معلّے جانا چاہتا ہوں) فرما دیجیے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ وہ جناب میر انیس صاحب سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ بہتر ہوگا۔ کہ آپ جناب میر صاحب کے پاس جائیے۔ اُن کی سفارش مؤثر ہوگی۔ مجھ سے اُن سے روابط نہیں ہیں۔ اُنہوں نے اصرار کیا۔ کہ مجھے استخارہ واجب آیا ہے۔ میں تو آپ ہی کو تکلیف دونگا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ آپ کو استخارہ آیا ہے۔ مجھے تو نہیں آیا۔ اُنہوں نے کہا۔ اچھا آپ بھی استخارہ فرمائیے۔ مرزا صاحب نے استخارہ کیا۔ اچھا آیا۔ اُن سید صاحب سے فرمایا۔ آپ تشریف لے چلئے۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔ وہ آگے

(بقیہ نوٹ نمبر۱) سے ہمارے۔ کاندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے۔ میں پنہیں کو فصیح سمجھتا ہوں۔ جو کثرت سے بولا جاتا ہے۔ اور اصلی لفظ ہے۔ اور حضرت غالب مرحوم نے نظم فرمایا ہے۔ جو اہل دہلی لکھنؤ بلکہ تمام اہل ہندوستان میں مستند و معتبر شاعر مانے جاتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[1] جناب میر اصغر حسین صاحب ساکن لکھنؤ کاظمین نے مجھ سے ۱۳۲۳ ہجری میں بیان فرمایا کہ یہ میرے والد میر امجد حسین صاحب مرحوم پر مرزا صاحب نے احسان فرمایا تھا۔ انکو ملکہ زمانی مرحومہ کے یہاں پڑھوایا تھا۔ یہ میر صاحب معمر سال ہیں اور نہایت ثقہ بزرگوار ہیں۔ ان کے والد ماجد میر صاحب کے شاگرد رشید تھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد پینس میں سوار ہو کر مرزا صاحب پہنچے۔ دن کے دس یا گیارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ رئیس گھر میں کھانا کھانے کو گئے تھے۔ بیٹھک کے کمرے میں مرزا صاحب بیٹھے۔ مہری نے اطلاع کی۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب تشریف لائے ہیں کھا رہے ہیں۔ پھر دریافت کیا کون صاحب ہیں۔ پھر اُس نے یہی جواب دیا۔ اب تو اُنہوں نے کھانا چھوڑ دیا۔ فوراً ہاتھ دھو کر باہر آئے۔ ملے۔ پُوچھا۔ حضور نے کیوں زحمت فرمائی۔ فرمایا۔ یہ سیّد صاحب مجھے لے آئے۔ اپنے دادا کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں دو سَو روپیہ درکار ہیں۔ نواب صاحب اندر گئے۔ چار سَو روپیہ لا کر اُن سیّد صاحب کو دئے۔ اور فرمایا۔ میر صاحب! یہ دو سَو روپیہ تو آپ کے مطلوبہ ہیں۔ اور دو سَو روپیہ اس شکریہ میں نذر سادات کرتا ہوں۔ کہ جناب مرزا صاحب قبلہ کفش خانہ پر تشریف لائے ✤ ناظرین دیکھئے۔ دبیرؒ و انیسؒ کی یہ وقعتیں رئیسوں کے دلوں میں تھیں۔ جن انیسیوں کو مرزا دبیر سے جلنے والا اور مٹانے والا لوگ سمجھتے تھے۔ اور جن دبیریوں کو میر انیس سے منحرف لوگ سمجھتے تھے۔ وہ بھی دل سے اُن سے ایسی محبت رکھتے تھے۔ ہائے وہ لوگ کہاں گئے ؎

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کے سناٹے ✤ مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

بندگان خدا کی حاجت برآری کی نئی حکایت

یہ بھی جناب میر الطاف حسین عرف نواب مُنّی صاحب سلمہ اللہ والبقاہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جب میرے والد مرحوم نے ۱۲۶۹ھ میں انتقال فرمایا۔ تو میرا سن ۲½ اڑھائی برس کا تھا۔ جناب مرزا صاحب مرحوم مجھ کو خود بادشاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے دربار میں لیکر گئے۔ اور میرے باپ کی جگہ (کہ سواروں میں اُن کا اسم تھا) میرا نام لکھوا دیا٭ پھر مَیں اُسی عمر میں شمس آباد (ضلع فرخ آباد) میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ چلا آیا۔ یہاں ایک

٭ انکے والد ماجد میر شرف الدین مرحوم مرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے بین بے مثل پڑھتے تھے آج تک لکھنؤ میں انکے پڑھنے کی دھوم ہے سدس بارہ بند پڑھتے تھے کہ مجلس میں ٹس ٹس پڑجاتی تھی مقبول ذاکر تھے ۱۲ مولف حقیر

مدت تک مرزا صاحب میری تنخواہ خزانہ شاہی سے لیکر بھجوایا کئے۔ مرزا صاحب سیرت وصورت میں فرشتہ صفات تھے +

چوتھی حکایت مطلب آرزی بندگان خدا کی

ایک بزرگ مجھ سے ناقل تھے۔ کہ زمانہ شاہی میں مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا تھا۔

ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ۔ تمام مرثیہ بالخصوص اس کا بین مرزا صاحب کو بہت پسند تھا۔ اکثر اُن کے شاگردوں اور دوستوں نے مانگا۔ مگر مرزا صاحب نے کسی کو نہ دیا۔ نواب محسن الدولہ مرحوم جو لکھنؤ کے ایک فیاض رئیس (اور شاہ اول اودھ غازالدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کے داماد) تھے اس مرثیہ کے بہت مشتاق تھے۔ وہ کسی رئیس کے یہاں مجلس میں نہ جاتے تھے۔ اور کلام مرزا صاحب کے گویا عاشق تھے۔ اُنہوں نے بارہا اپنے جلسہ میں فرمایا۔ کہ جو شخص یہ اصلی مرثیہ مرزا صاحب کا مجھے کسی ترکیب سے لادے۔ میں اُس کو پانچ سو روپیہ انعام دُوں۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ وہ مرثیوں کو اور خاص کر نئے مرثیوں کو بہت احتیاط سے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء ہوگیا۔ بعد غدر ایک سید صاحب مرزا صاحب کے پاس آئے۔ اور اُن سے کہا۔ کہ میں لڑکی کی شادی کرونگا۔ اور پھر کربلائے معلےٰ جاؤنگا۔ آپ پانچ سو روپیہ کسی رئیس سے مجھے دلوا دیجئے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کی تباہی کا تھا۔ اکثر رئیس اپنے حال میں مبتلا تھے۔ مگر نواب محسن الدولہ کے پاس کئی لاکھ روپیہ کے نوٹ اور پنشن معقول اور جائداد تھی۔ مرزا صاحب نے کچھ سوچ کر اُن کو اپنا یہی مرثیہ دیدیا۔ اور کہا۔ کہ آپ نواب محسن الدولہ کی ڈیوڑھی پر جاکر اطلاع دیجئیگا۔ کہ میرے پاس یہ مرثیہ ہے ع کس شیر کی آمد الخ۔ اور یہ بھی کہئیگا۔ کہ میں نے سُنا ہے۔ کہ آپ کا اشتہار ہے۔ کہ جو شخص یہ مرثیہ لاوے میں اُس کو پانچ سو روپیہ دُونگا اب مجھے ۵۰۰ روپیہ دیجئے۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے تو محسن الدولہ مرحوم سمجھے۔ کہ صرف وہ مطلع ہے۔ اور کسی نے اور بند کہکر لگا دئے ہیں۔ مگر جب اُن سید صاحب نے کہا۔ کہ آپ تو اُن کے خط کو پہچانتے ہیں (اور وہ واقعی

خط کو پہچانتے تھے۔ کہ اُن کی زوجہ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں) تو اُنہوں نے خط پہچان کر مرثیہ کی نقل لے لی۔ اور ... ۵ دیدئے۔ اور اصل مرثیہ واپس دیدیا۔ سید صاحب نے یہ بھی پوچھا۔ کہ یہ مرثیہ آپ کو کیونکر ملا۔ مگر اُنہوں نے کہا۔ یہ مَیں نہ بتاؤنگا۔

فصل ۱۱ متانت. خودداری، وضعداری، حاضر جوابی، وعدالت.

متانت و خودداری اور وضعداری و حاضر جوابی و عدالت۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔ کہ جو وضع مرزا صاحب نے اختیار فرمائی۔ خدا کے فضل سے مرتے مرتے نباہ دی۔ چنانچہ وہ کبھی شہر میں پیدل نہیں پھرے۔ ہمیشہ لوگوں نے اُن کو پینس میں دیکھا۔ اور متانت ایسی تھی۔ کہ باوصف ایک شاعر و مرثیہ گو کی حیثیت میں رہنے کے بڑے بڑے صاحبان علم اُن کو اپنا قبلہ و کعبہ اور لائق احترام جانتے تھے۔ اور جن امور میں دبنا اور عجز کرنا غیر مستحسن ہے۔ اُن میں وہ کبھی کسی سے دب کر نہیں رہے[۱]۔

عدالت کا اس قدر خیال رکھتے تھے۔ کہ کبھی کسی غریب کے مقابلہ میں کسی امیر کی بدآبند و بداصل طرفداری نہیں کی۔ نہ کبھی کسی بادشاہ یا رئیس کی اُنہوں نے خوشامد کی۔

حاضر جوابی کی حکایت

[۱] چنانچہ یہ واقعہ میرے کرم فرما سید احمد صاحب نقوی جائسی زاد کرمہ جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید علی حسن صاحب قبلہ ظلہ کے بھتیجے اور شاگرد جناب ممدوح سے سنکر لکھتے ہیں۔ کہ ایک روز جناب علیین مکان (سید العلماء میرن صاحب قبلہ) کی صحبت میں مَیں حاضر تھا۔ اور سید امداد علی صاحب مرحوم مصنف بحر المصائب جنکو اہلبیت میں حد درجہ غلو تھا۔ اور اور چند اہل علم حاضر تھے۔ کہ مرزا صاحب کے اس مرثیہ کا ذکر ہوا۔ **کس کے گل حدوث میں خوشبوِ قدم کی ہے**۔ مولوی امداد علی صاحب مرحوم نے (خدا اُن کی مغفرت کرے) میرن صاحب قبلہ سے عرض کی۔ کہ دیکھئیے حضور۔ اب تو مرزا صاحب نے حد درجہ غلو فرمایا ہے۔ کہ صفت قدم کو جو خدا سے مختص ہے آنحضرت صلعم سے منسوب کر دیا۔ اس پر میں نے کچھ اُن کے اعتراض کے جواب میں کہنا شروع کیا۔ کہ اتفاق سے مرزا دبیر صاحب بھی آ گئے۔ اُنہوں نے غالباً مکان میں آتے آتے کچھ الفاظ اس بحث کے سُنے تھے۔ کہ جناب سید العلماء سے عرض کیا۔ کہ اس وقت حدوث و قدم کی کیا بحث تھی۔ مولوی امداد علی صاحب نے کہا۔ کہ جناب آپ نے قدم کو صفات رسول مقبول ؐ سے متعلق فرما دیا۔ مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا۔ مَیں نے تو قدم نہیں بلکہ خوشبوئے قدم کا دعوے کیا ہے۔ حق تعالے تو ادنے چیز کی نسبت قدم کا ارشاد فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ یٰس میں ہے۔ والقمر قدّرنا منازل حتیٰ

نہ لباس درباری سے کہیں گئے۔ نہ مدۃ العمر کسی بادشاہ کو خداوند کہا۔ (حقیر ثابت) سے

رہے جہاں میں انسان آن بان کے ساتھ ✤ کہ جوہری جو ہیں۔ موتی کی آب دیکھتے ہیں

بر کتِ شاگردی۔ نواب منّی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اس کو ہم خرقِ عادت کہہ سکتے ہیں۔ کہ جو اُن کا شاگرد ہوا۔ خوب پھلا پھولا ✤

درحقیقت مرزا صاحب کے شاگرد جس کثرت سے کامل و قابل ہوئے ہیں۔ ایسے کم (شاعروں کے شاگرد) نکلینگے۔ مَیں نے اسی خیال سے اُن کے بالواسطہ و بلاواسطہ اکثر شاگردوں کے سبھی حالات لکھ دئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا۔ کہ ملک کو اُن سے کس قدر فیض پہنچا۔ اس موقع پر نواب منّی صاحب کی زبانی یہ دِکھانا چاہتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کے تلمذ کی برکت کس قدر تھی۔ اور وہ فخر و سربلندی کو بھی بتانے میں تامل نہ فرماتے تھے۔ نواب منی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ایک بار میرے ماموں نواب دولھا صاحب شمس آبادی مرحوم ایک منّت ادا کرنے کی تقریب سے (کہ درگاہ حضرت عباسؑ میں علم چڑھانا تھا) مع متعلقین کے لکھنؤ تشریف لیگئے۔ مرزا صاحب سے پہلے سے تعارف تھا۔ مرزا صاحب نے نواب صاحب کی اعلےٰ درجہ کی دعوت کی۔ اُسی زمانہ قیام لکھنؤ میں نواب صاحب نے مجھ سے اور بھائی نواب پیارے صاحب[1] اپنے منجھلے بیٹے سے فرمایا۔ کہ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ برکت کے لئے تمکو جناب مرزا صاحب کا شاگرد کرا دوں۔ ہم نے عرض کی۔ بہت

(بقیہ نوٹ نمبر۱) عاد کالعرجون القدیم۔ اس پر مولوی صاحب موصوف نے فرمایا کہ اب تو مَیں مایوس ہو گیا۔ فوراً مرزا صاحب بولے آپ مایوس نہیں بلکہ آئس ہیں۔ اس پر تمام مجمع اہل علم میں ریشخند (ہنسی) ہوئی۔ اور جناب مرزا صاحب کی سب نے تائید کی۔ (حقیقت میں مایوس بجائے آئس غلط ہے کیونکہ عربی کے قاعدے سے اس کے معنی پر آئس آتا ہے۔ مایوس اُس کا مفعول ہے) اور جب مرزا صاحب چلے گئے تو میں صاحب قبلہ نے مولوی ... علی صاحب سے فرمایا کہ کچھ بھی کہا ہی تعجب ہوتا ہے۔ جلد کو اس وقت نصیب ہوا۔ اللہ اللہ کس پایہ کی معلومات تھی۔ اور کیا حاضر جواب طبیعت پائی تھی ✤ ۱۲ مولف حقیر۔

[1] نواب پیارے صاحب کے بھی مختصر حالات تلامذہ مرزا صاحب کے سلسلہ میں (انشاء اللہ) لکھونگا ✤ ۱۲ مولف حقیر۔

فصل ۱۸ برکتِ شاگردی اور اس کے متعلق حکایات

نواب منی صاحب کی زبانی ایک

مناسب ہے۔ چنانچہ ایک دن کچھ مٹھائی اور کچھ آدمی ساتھ کر کے ہم دونوں کو جناب مرزا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ ہم نے جا کر دیکھا کہ اتنے بڑے نامی گرامی حضرت کی نشست گاہ میں (بشان اہل اللہ) چند چارپائیاں خالی پڑی ہیں۔ اور ایک تخت پر سفید بچھونا ہے۔ اُس پر جناب مرزا صاحب کچھ عبادت و اشغال میں مشغول ہیں۔ میرا اور بھائی پیارے صاحب کا سن غالباً نو دس برس سے زیادہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ کم عمر اپنے عزیز بچوں سے باتیں کرنے کا طریقہ ہے اُس طرح کی دو چار باتیں کر کے مرزا صاحب نے بھائی پیارے صاحب سے پوچھا۔ تم کچھ موزون کر لیتے ہو؟ شاید اُنہوں نے "جی ہاں" کہا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کچھ کہو۔ بھائی نے یہ ایک مصرع موزون کر کے سُنایا۔ ع خوف غالب ہے آپ سے مجھکو۔ یہ سُن کے بہت عمدہ طرز سے کہ ناگوار نہ گذرے فرمایا۔ کہ بھائی "آپ سے خوف غالب ہے" کا محاورہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ محاورہ ہے۔ کہ "آپ کا خوف غالب ہے"۔ یہ سُنکر میں فوراً بول اُٹھا۔ کہ ع خوف غالب ہے آپ کا مجھکو۔ یہ سُن کر میری طبیعت اور بھائی پیارے صاحب کی موزونیت کی تعریف کی۔ بس دو ایک باتوں کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے۔ مگر صرف اُس برائے نام شاگردی کا یہ اثر ہے۔ کہ بھائی پیارے صاحب اُن کے مرثیے وغیرہ دیکھ کر ایسے تاریخ گو شاعر ہوئے۔ کہ اس وقت ضلع فرخ آباد تو کیا اور اضلاع میں بھی ایسا جلد و خوب تاریخ کہنے والا شاعر دُوسرا نہ ہوگا۔ اور کمترین (ننّھے صاحب) کو صرف مشہور درسی فارسی کتب کی استعداد ہے۔ بایں ہمہ اپنی حیثیت سے زیادہ نظم و نثر لکھنے کا اتفاق ہُوا۔ جس کو دیکھکر عقل اس کی قائل ہوئی۔ کہ یہ صرف اُنہیں کی شاگردی اور دعائے خیر کی برکت ہے۔

دوسرے کو احمق بنانے کی عادت سے نفرت

دُوسرے کو احمق بنانے اور ہجو ملیح کرنیکی بعض حضرات کو عادت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کو اس سے کمال نفرت تھی۔ اور وہ ایسی تعریف کو منافقانہ کہا کرتے تھے۔

حسد اور رشک سے بھی اُن کو جلن تھی۔ اور اکثر اپنا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

مذہب میں مرے رشکِ خفی شرکِ جلی ہے + واللہ کہ یہ ولولۂ حُبِّ علیؑ ہے

ایفائے وعدہ - آندھی آئے مینہ آئے۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔ وہ سو کام چھوڑ کر وعدہ ضرور وفا فرماتے تھے۔ چنانچہ جناب مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا مقتدانا سید علی حسن صاحب قبلہ دام ظلہٗ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ مجلس میں مرزا صاحب نے ایک نیا مرثیہ پڑھا۔ جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ مرزا صاحب سے مانگا۔ فرمایا بروز روانگی وطن آپ کو ملیگا۔ میں عشرہ محرم ہمیشہ جائس ہی میں کیا کرتا تھا آخر ماہ ذیحجہ میں جب لکھنؤ سے قصد روانگی وطن کیا۔ تو میں نے شہر کے ناکے پر اپنے پہنچنے سے پہلے مرزا صاحب کی پالکی موجود پائی۔ مرزا صاحب ملے۔ تو وہی مرثیہ ہاتھ میں تھا۔ مجھے عنایت فرمایا۔ میں مرثیہ لیکر وطن کو روانہ ہوا[۲] +

دل جوئی - مرزا صاحب کبھی اپنے دشمن کی بھی دل شکنی گوارا نہ فرماتے تھے۔ اور دل آزاری کو بدترین خصائل ذمیمہ سمجھتے تھے۔ اور خلاف حیاؤ مروت اُن سے کوئی بات ظہور میں نہ آتی تھی۔ یہ اُن کا شعر بالکل اُن کے حسب حال ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو + مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

میر ضمیر صاحب سے جب لوگوں نے بگڑوا دی ہے۔ تو کیسے کیسے لوگوں نے حملے کئے۔ مگر میر ضمیر صاحب کی شان اقدس میں تو کوئی کلمہ کہنا مرزا صاحب کفر سمجھتے تھے۔ اُن لوگوں کی زبان درازیاں سنکر کبھی زبان نہ ہلائی۔ اور کہا تو بس یہ کہا۔ کہ جو بالکل زمانہ کے حسب حال

---

[۱] صدر الافاضل جناب مولوی سید سبط حسن صاحب جائسی جو آجکل محدث و ذاکر بے عدیل لکھنؤ اور ہندوستان بھر مانے جاتے ہیں۔ انہیں کے نواسے اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ع قیاس کُن زگلستان من بہار مرا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] آج یہ مرثیہ بھی نہیں ملتا۔ نہ معلوم جناب قبلہ وکعبہ سے کون لے گیا۔ ایسے ایسے سیکڑوں مرثئے مرزا صاحب کے بے پتہ ہیں۔ کہ جن کے مصرع لوگوں کو یاد ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ اور اپنے دلی خیال کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ~

برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے ✤ آئینہ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے

آستینوں اور زمینوں والے سلام پر جو طرفداران میر انیس مرحوم نے ایک جھگڑا کھڑا کر دیا تھا جس کا بیان اس کتاب میں اپنے مقام پر ہوگا۔ اُس زمانہ میں بھی کسی کو کوئی کلمہ جناب میر انیس مرحوم کی تحقیر کا نہیں کہنے دیا۔

خوش اخلاقی کی وجہ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ محمدؐ و آل محمدؐ علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے اخلاق و عادات کتب احادیث و سیر میں دیکھتے دیکھتے اور اُن کے مناقب و فضائل نظم کرتے کرتے اخلاق حسنہ نے مرزا صاحب کے دل پر پُورا پُورا اثر کیا تھا۔ جس طرح بعض تصوّف کی کتابوں میں محبوب کے ہمرنگ ہونیکی تشبیہ مذکور ہے۔ کہ لوہا باوصفیکہ آگ نہیں ہے۔ مگر جب آگ میں پڑیگا۔ تو آگ کا ہمرنگ و ہم اثر ہو جائیگا۔ کہ جو شخص اُس وقت چھو لیگا۔ جل جائیگا۔ پس آگ کی صحبت نے لوہے کو اپنا ہمرنگ و ہم اثر بنا دیا۔ یہی حالت مرزا صاحب کی ہو گئی تھی۔ کہ محمدؐ و آل محمدؐ کے اخلاق حسنہ نے اُن کے دل میں (ولائے محمدؐ و آل محمدؐ کی طرح) اپنا گھر کر لیا تھا۔ وہ آل محمدؐ کے ایسے غلام تھے۔ کہ جس غلام میں آقا کی صحبت کی بدولت آقا کی عادتیں سرایت کر جاتی ہیں۔ اُن کے اکثر پُرانے شاگرد جن کو اخیر زمانہ میں یہ شکایت رہتی تھی۔ کہ نیا مرثیہ نہیں ملا۔ ایسے ایسے ذریعوں سے اپنا مطلب نکال لیتے تھے۔ چنانچہ

لطیفہ ایک پیر صاحب کی حکایت

نانا مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ کہ ایک روز نگینہ کی طرف کے ایک کہن سال سید جو شاید نوّے اور سو برس کے درمیان میں ہونگے۔ مرزا صاحب کے پاس (بعد زمانہ دراز غدر ۱۸۵۷ء کے) آئے۔ میں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ بیٹھک کے مکان میں آتے ہی پوچھا۔ دبیر کس کا نام ہے؟ مرزا صاحب بولے۔ فرمائیے حقیر ہی دبیر ہے۔ خیر۔ بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بولے۔ میرا نام حسین بخش ہے۔ اور میں صحیح النسب سید ہوں۔ میرے نام کا سجع کہہ دیجئے۔ مرزا صاحب بولے۔ کہ آپ کا نام ایسا مسجّع اور اچھا

ہے۔ کہ اُس کے واسطے پہلے سے سجع موجود ہے*۔ پُوچھا وہ کیا؟ فرمایا ع یارب گناہِ ما بطفیلِ حسینؑ بخش۔ بڑے میاں خوش ہو گئے۔ مرزا صاحب کو دعائیں دے کر کہا۔ کہ ذرا ایک پرچہ پر اسے اپنے ہاتھ سے لکھ بھی دو۔ شاید مَیں بھول جاؤں۔ مرزا صاحب نے جلی قلم سے لکھ دیا۔ کہا اب مَیں چوک میں جاتا ہُوں۔ اور اس مصرع کو حکّاک سے ایک عقیق کے نگینے پر کھدوا کر ابھی انگوٹھی بنواتا ہُوں۔ یہ مصرع آپ کا یادگار میرے پاس رہیگا۔ یہ کہکر تشریف لیگئے۔ مَیں (محمد رضا ظہیر) کچھ دنوں سے نیا مرثیہ مرزا صاحب کے نہ دینے کے سبب سے ملول تھا۔ اُن کے بعد اُٹھا۔ بڑے میاں آہستہ آہستہ جب ٹیکتے ہُوئے نخاس کی سڑک کے قریب پہنچے تھے۔ کہ مَیں بھی برابر پہنچ گیا۔ وہ بار بار اُس لکھے ہُوئے مصرع سجع کو دیکھتے اور خوش ہوتے جاتے تھے۔ مَیں نے پُوچھا۔ حضت (حضرت) کہاں تشریف لیجائیگا۔ فرمایا۔ بس ذرا چوک تک۔ وہی سجع کا مصرع کندہ کراؤنگا۔ کیوں میاں لاجواب مصرع ہے؟ مَیں نے سر جُھکا کر کہا۔ جی ہاں! آپ کی پسند ہے۔ ہم تو اس کو کیا کہیں۔ کیسا سمجھتے ہیں۔ بڑے میاں بولے۔ کیوں صاحب آپ اس کو کیسا سمجھتے ہیں۔ مَیں بولا۔ جناب آپ اس کے کچھ معنی بھی سمجھے۔ کہا۔ ہاں میاں یہی معنی ہیں۔ کہ اے خدا میرے گناہ امام حسین علیہ السّلام کے صدقہ سے بخش دے۔ مَیں نے کہا۔ جی ہاں یہ تو سیدھے سادے معنی ہوئے۔ مگر دُوسرے معنی بھی آپ سمجھے۔ اُنہوں نے کہا۔ وہ تم کہو۔ مَیں نے کہا۔ ایک اس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اے خدا۔ مَیں نے حسین بخش کی طفیل یعنی سبب سے گناہ کئے ہیں وہ بخش دے۔ یہ مرزا صاحب نے آپ سے مزاح فرمائی ہے۔ بُڈھا یہ سُنکر آگ بگولا ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ ہاں میاں واقعی یہ معنی بھی ہو تو سکتے ہیں۔ مگر مَیں تو سَو برس کا بُڈھا ہُوں۔ کیا مُجھ سے بھی مرزا صاحب نے دل لگی کی۔ مَیں بولا۔

*۔ پہلے سے سجع موجود ہونا شاید اس لئے فرمایا ہو کہ شیخ ناسخ مرحوم کا سجع شہرۂ خاص و عام بہت مشہور ہے یعنی یارب گناہ ما بطفیل امام بخش۔ ناسخ مرحوم کا نام امام بخش تھا۔ ان ہی کے نام سے حسین بخش نام رکھا۔ فقط ۱۲ [illegible]

جناب آپ کیا سمجھتے ہیں ہم شہر والوں کی عادت ہوتی ہے۔ بیرونیوں۔ دیہاتیوں کو لو بنا تے ہیں۔ وہ بزرگوار اُسی پاؤں پھر کر مرزا صاحب کے پاس آئے۔ مرزا صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ پرچہ اُن کے سامنے غصّہ میں پھینک دیا۔ اور کہا۔ مرزا صاحب افسوس کا مقام ہے میرے پوتے تمہارے برابر ہیں۔ میں سید تم مغل۔ تمکو شرم نہیں آتی۔ مجھ سے دل لگی کرتے ہو۔ میرے طفیل میں تم نے کون کون سے گناہ کئے ہیں جنکی معافی خدا سے چاہتے ہو۔ اب مرزا صاحب ہیں کہ گردن جھکائے تصویر حیرت بنے ہوئے چپ بیٹھے ہیں۔ (القبول مؤلف حقیر)

ہراک کے شکوۂ بے جا پہ سرنگوں رہنا ۔ پسند آئی یہ پیرِ فلک کی چال مجھے

جب وہ بزرگوار خوب خوب دل کے پھپھولے پھوڑ چکے۔ تو مرزا صاحب نے سر اُٹھا کر فرمایا۔ بھلا میر صاحب۔ میں آپ ایسے مقدس معمّر بزرگ سے دل لگی کرونگا۔ پہلے یہ فرمائیے۔ یہ معنی آپکو کس نے بتائے۔ وہ جو صاحب ابھی یہاں آپ کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا انھوں نے یہ معنی سمجھائے ہیں۔ بڈھا اس کلمہ سے اور بھی بھڑک اُٹھا۔ گویا جلتی ہوئی آگ پر تیل پڑا۔ بولا۔ سبحان اللہ۔ کیا آپ نے مجھے کندہ ناتراش ہی سمجھ لیا۔ آپ لکھنؤ والوں میں یہ بھی سخت عیب ہوتا ہے۔ کہ سمجھتے ہو۔ بس ہم ہی پڑھے لکھے ہیں۔ ہمیں سمجھتے ہیں۔ بیرونی۔ دیہاتی تو سب احمق ہی ہوتے ہیں۔ جناب گلستاں۔ بوستاں۔ شاہنامہ۔ سکندرنامہ۔ یوسف زلیخا۔ سہ نثر ظہوری۔ پنج رقعہ۔ وقائع نعمت خان عالی سب چاٹے بیٹھا ہوں۔ جاہل مطلق نہیں ہوں۔ گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ آپکی طرح تڑاق پڑاق زبان چلانا نہیں آتا۔ مرزا صاحب نے بہت منّت سماجت سے اُن سید صاحب کو راضی کیا۔ با ایں ہمہ اس کے معنی اُن کے ذہن نشین ایسے ہو چکے تھے۔ کہ جبتک دوسرا مصرع صحیح مرزا صاحب نے نہ کہدیا وہ وہاں سے نہ اُٹھے۔

جب حسب معمول میں رات کو پہنچا۔ مرزا صاحب بولے۔ کیوں کٹّی میر محمد رضا؟ اب تم ایسی ایسی بدنامیاں کرنے لگے۔ اُلٹے پلٹے معنی سمجھا کر سادات کی دل شکنی کے مرتکب

ہوتے ہو۔ اور مجھے گالیاں سنواتے ہو۔ مَیں نے کہا۔ جناب! یہ محمد رضا بھی سیّد ہے۔
چمار نہیں ہے۔ اس کی دلشکنی چھ مہینہ سے ہو رہی ہے۔ اس کا آپ کو خیال ہی نہیں
کیا گاؤں میں رہنے سے اُن کی سیادت سندی ہو گئی۔ اور میرا رتبۂ سیادت شہر میں رہکر گھٹ
گیا۔ فرمایا۔ تم یہ تو سوچو۔ اب تک برابر سالانہ تمکو دو تین مرثیئے نئے ایسے دیتا رہا۔ کہ
پھر جب تک تم اُس مرثیہ کو عام طور پر تقسیم کرنیکی رائے نہ دیتے تھے مَیں سب شاگردوں
اور دوستوں کو نہ دیتا تھا۔ اب کچھ محمد جعفر اور محمد ہادی حسین کا بھی حق ہے یا نہیں۔ کچھ
ان کے واسطے رہنے دو۔ مَیں نے کہا۔ حضت (حضرت) بھائی محمد جعفر* ماشاء اللہ
چشم بد دُور ابتدائے مشق میں خود اچھا کہنے لگے ہیں۔ چند روز میں اور اچھا کہینگے۔ آپ
اُن کی فکر کیوں فرماتے ہیں۔ بھلا انصاف فرمائیے۔ ٹیپ بھائی محمد جعفر کی کس پایہ کی ہے ؎

کانٹا جو گل سے نوک کی لیتا ہے خوار ہے ✦ سبزہ۔ فروتنی سے چمن کی بہار ہے

ہم تو مر کے بھی جی اُٹھیں۔ جب بھی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ یہ آپ کی دعائے نیم شبی کا اثر
ہے۔ فرمایا۔ محض خدا کی عنایت ہے۔ یہ فرما کر اندر سے حبیب ابن مُظاہر اسدی (رفیق
امام حسینؑ) کے حال کا مرثیہ لائے۔ اور فرمایا۔ لیجئے۔ مگر یہیں بیٹھ کر دیکھ لیجئے۔ پھر آپ گھر
پر لے جا کر دوپہر کے بعد مسوّدہ کر کے مرثیہ واپس لائیگا۔ اور فرمائیگا۔ کہ دُوسرا مرثیہ
دو۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ تو مَیں نہ مانونگا۔ یہ مرثیہ میرا سُنا ہُوا تھا۔ مَیں نے ایک
دو بند دیکھ کر کہدیا۔ حضرت امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ مجھے چاہئے۔ فرمایا۔ کیوں۔
مَیں نے کہا۔ وجہ کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ تم ان کے مرتبہ سے واقف ہو۔ یہ کون بزرگوار
ہیں۔ یہ جناب رسول خدا صلعم کے وفادار صحابی۔ جناب امیرؑ کے غمگسار۔ امام حسینؑ کے
جاں نثار ہیں۔ یہ مرثیہ بہت اچھا ہے۔ مَیں نے کہا۔ یہ سب سہی (صحیح) مگر امام حسینؑ
نہ تھے۔ میرے پڑھنے سے ان کے حال پر لوگ بہت کم روئینگے۔ اگر یہ سوچینگے۔ کہ تریسٹھ [٦٣]

* یہ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کا اسم سامی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

سال کے بڈھے تھے۔ امام حسینؑ پر سے صدقے ہو گئے۔ مجھے تو وہ مرثیہ دیجئے۔ ؎
لے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے۔ فرمایا۔ یہ سب خیالات بیہودہ و جاہلانہ ہیں۔ حبیب ابن مُظاہر اسدی کے مرتبہ کو بڑے سے بڑا عالم و محدث و مجتہد بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ وہ بزرگوار تھے۔ جن کی نسبت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پر نثار ہوں[1]۔ مَیں نے عرض کی۔ خیر ان کے مرتبہ میں مجھے کلام نہیں۔ مجھے تو وہی مرثیہ چاہئے۔ مرزا صاحب نے وہی مرثیہ "لے دبدبۂ نظم الخ" دیا۔ اور پھر جب تک مَیں نے اجازت نہ دی عام طور پر (مرزا صاحب نے) تقسیم نہیں فرمایا۔ اللھم اغفرہٗ +

غیرت اور آن بان۔ (لمؤلّفہ) ؎

رہے جہاں میں انساں آن بان کے ساتھ + کہ جوہری جو ہیں۔ موتی کی آب دیکھتے ہیں

فصل ۱۴ غیرت اور آن بان

یہ بات بھی لکھنؤ میں مشہور ہے۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت اُن اسباب سے نہیں ہوئی جن کو عرف میں کوشش و سعی وغیرہ کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے جب ابتدائً قریباً ۱۲۳۰ھ میں مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اُس زمانہ میں اکثر مرثیہ گو شاعر گویا سوزخوانوں کے دستِ نگر تھے۔ اور ایک بڑے کامل سوزخواں **میر علی** صاحب[2] موجود تھے۔ جن کے درِ دولت پر بڑے بڑے شاہزادے

---

[1] بابی انتم و اُمّی کی طرف اشارہ ہے جو فقرہ زیارت ماثورہ میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی وارد ہے۔ کہ وہ جناب شہدائے کربلا سے خطاب فرماتے ہیں۔ ماں باپ میرے تم پر نثار ہوں۔ اللہ اللہ کیا مرتبہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مرزا محمد جان مرحوم (جو لعد غدر ۱۸۵۷ء لکھنؤ سے ٹونک میں آ رہے تھے اور اکثر کوٹہ میں مخدومی ڈپٹی حاجی سید جعفر حسین صاحب جعفری زقبلہ ابلسنتی ہیر سری کے یہاں عشرۂ محرم میں پڑھنے کو آتے تھے ابھی چار پانچ برس ہوئے کہ ٹونک میں انتقال کر گئے) میر علی صاحب کے جوابی مجھ سے کہتے تھے کہ میر علی صاحب خواجہ **میر درد** دہلوی کے نواسے تھے محسن الدولہ نے بہت کوشش کی کہ میر علی صاحب میرے یہاں آ کر پڑھیں مگر وہ نہ گئے۔ اکثر حالات میر علی صاحب کے متعلق مجھے انہیں سے معلوم ہوئے۔ مرزا محمد جان مرحوم اس زمانہ میں خوش گلو اور فنِ سوزخوانی کے ماہر اُستاد بلکہ اخیر زمانہ میں لاجواب سوزخواں تھے۔ آبِ حیات میں میر انشا مرحوم کے حالات میں کچھ حال میر علی صاحب کا پروفیسر آزاد مرحوم نے لکھا ہے۔ اور صحیح لکھا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

اور جو کلام سُننے کو آتے تھے۔ اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ میر علی صاحب زیادہ تر منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز رکھتے تھے۔ کہ جن کے کلام میں قدرتی طور پر سوز بہت ہے۔ اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیہ میر علی صاحب کے پاس لے جاتے تھے۔ جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی صاحب ایک مرتبہ پڑھ دیتے تھے۔ تمام لکھنؤ میں اور دُور دُور اُس کی شہرت ہو جاتی تھی۔ مرزا دبیر کی شہرت سُن کر میر علی صاحب نے کہلا بھیجا۔ کہ میاں اپنے ایک دو مرثئے میرے پاس بھیج دو۔ مرزا صاحب نے شاید تین[3] مرثئے یکے بعد دیگرے (۱) باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے (۲) سُبحان تاج سر عرش خدا ہے شبیر (۳) جب ہُوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر۔ بھیجے۔ اور میر صاحب نے سوز رکھ کر پڑھے۔ اور خوب رنگ ہُوا۔ ان مرثیوں کی زبان اور بندش میر صاحب کو بہت پسند آئی۔ اتفاق سے ایک روز درگاہ یا کربلا میں کسی شخص نے انہیں مرثیوں میں سے ایک مرثیہ منبر پر پڑھ دیا۔ میر علی صاحب بھی موجود تھے۔ اُن ذاکر سے پوچھا۔ یہ مرثیہ کس نے دیا۔ اُنہوں نے مرزا صاحب کا نام لیا۔ میر علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اپنے کسی بازو یا جوابی کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ صاحبزادے۔ میر علی امام حسینؑ کے تصدق سے وہ شخص ہے۔ کہ جس مصنف کا مرثیہ پڑھ دے۔ وہ تمام ہندوستان میں مستند مرثیہ گو مانا جاتا ہے۔ منشی دلگیر اتنے بڑے مشّاق مرثیہ گو ہو کر جو مرثیہ مجھکو دیتے ہیں۔ وہ تین برس تک بغیر میری اجازت کے دُوسرے کو نہیں دیتے۔ تم نے یہ مرثیہ جو میر علی کو دیا تھا۔ دُوسرے کو کیوں دیدیا۔ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا چاہتے۔ آئندہ اگر تمکو یہ منظور ہو۔ کہ تمہارا کلام میر علی پڑھے۔ اور تم مرثیہ گو مستند ہو۔ تو جو مرثیہ مجھکو دینا وہ تین برس تک دُوسرے کو نہ دینا۔ مرزا صاحب نے یہ پیام سُن کر (اُن بازو یا جوابی کو) جواب دیا۔ کہ میری طرف سے اداب عرض کیجئیگا۔ اور عرض کیجئیگا۔ کہ آپ اوّل[1] تو سید دُوسرے[2] بزرگ۔ تیسرے[3] ذاکر۔ ہر طرح واجب التعظیم ہیں۔ میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں

میر علی صاحب اور مرزا دبیر

مگر یہ جو ارشاد ہُوا۔ کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو۔ تو جو مجھے مرثیہ دینا وہ تین سال تک دُوسرے کو نہ دینا۔ اس کا یہ جواب ہے۔ کہ ؎

حقّا کہ با عقوبت دوزخ برابرست ✤ رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت[1]

مَیں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہُوں۔ تو امام حسینؑ کی امداد اور اپنی محنت و طبع خداداد سے۔ اور یہ بات شاید میری مروّت سے بھی دُور ہو گی۔ کہ کوئی ذاکر وغیرہ مجھ سے مرثیہ مانگے۔ اور مَیں یہ کہکر اُس کی دل شکنی کروں۔ کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں۔ اس لئے مرثیہ میں نہیں دے سکتا مجھ سے یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ مَیں مجبور ہُوں ✤

اُس دن سے پھر میر علی صاحب نے مرزا صاحب کی تصنیف کوئی اور مرثیہ نہیں پڑھا۔ مگر تین مرثیوں کے پڑھنے سے مرزا صاحب کے کلام نے ایسا اُن کے دل پر اثر ڈالا تھا۔ کہ اُن کا دل مرزا صاحب کی بندشوں اور دلکش اور درد انگیز الفاظ اور اشاروں کو یاد کیا کرتا تھا۔ اپنی وضعداری سے مجبور تھے۔ آخر الامر یہ ترکیب کی۔ کہ مرزا صاحب کے اصلاحی مرثیوں پر (جو مرزا صاحب کے شاگرد کہتے تھے) منگا منگا کر سوز رکھے۔ اور پڑھے۔ چنانچہ یہ مرثیہ ع بے چین تھی صغرا جو فراق پدری سے۔ بشیر (رام پرشاد)[2] سے منگوایا۔ اور سوز

شاگرد مرزا دبیر کا مرثیہ میر علی صاحب نے سوز میں پڑھا

---

[1] اس شعر کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ دُوسرے کی کوشش و محنت کی بدولت جنت میں بھی اگر گیا تو غیرتمند کیواسطے وہ دوزخ کے برابر ہے۔ سچ ہے اپنے اعمال سے جنت میں بھی جانا اچھا ہے۔ یا خدا کی رحمت دستگیری کرے ✤ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] رام پرشاد بشیر نواب افتخار الدولہ مرحوم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ سلام و مرثیہ کہتے تھے۔ سنا ہے۔ کہ جب یہ مرثیہ بشیر نے مرزا صاحب کے روبرو اصلاح کو پیش کیا۔ تو اُس کے مطلع ہی میں ایک لفظ ایسا نظر آیا جسکو مرزا صاحب ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اور وہ لفظ نتھہ اُٹھہ تھے۔ چنانچہ پورا بند مطلع کا یہ ہے ؎ بے چین تھی صغرے جو فراق پدری سے۔ نتھ اُٹھ یہی کہتی تھی نسیم سحری سے ✤ اے باد صبا مرتی ہوں درد جگری سے۔ کیونکر جو ملے تو مرے بابا سفری سے ✤ نرگس کی طرح چشم سوئے در نگراں ہے۔ جلد آؤ کہ ہستی کا چمن صرف خزاں ہے ✤ مرزا صاحب نے فرمایا۔ نتھہ اُٹھہ تو ٹکسال باہر ہے۔ نتھ نیا حرف ایک محاورہ ہے جس کو بعض شعراء وقت ضرورت باندھتے ہیں۔ بشیر نے عرض کی۔ حضور مَیں کا مُشتبہ ہوں

مرزا صاحب کے مرثیے سوز خوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں

رکھ کر پڑھا۔ جو آج تک بعض سوز خواں پڑھتے ہیں۔ ازبسکہ یہاں ایک نامی گرامی سوز خواں کا ذکر آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اور بھی چند سوز خوانوں کا حال لکھوں۔ اور یہ بھی کہ مرزا صاحب کے مرثیے سوز خوانی میں کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں +

میر احمد صاحب سوز خواں

سُنا ہے۔ کہ میر علی صاحب کا شہرہ کمال سن کر میر احمد صاحب لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ کے لئے تشریف لائے۔ یہ بھی علم موسیقی میں یکتائے فن سنے جاتے ہیں۔ یہ ایک آنکھ کچھ دبا کر دیکھتے تھے۔ لوگ کانا کہتے تھے۔ شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم نے کس خوبصورتی سے اس عیب کی طرف ایک سہرے میں اشارہ فرمایا ہے۔ جو قابل داد ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ع میر احمد کانِ علم موسیقی۔ مگر میر احمد صاحب کے لکھنؤ میں آتے ہی میر علی صاحب نے بستر اُٹھایا۔ سچ ہے ؎

عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر + کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

میر علی صاحب کے بعد تین سوز خوانوں نے نام نکالا۔ (۱) میر احمد صاحب۔ (۲) احمد علی خاں صاحب۔ (۳) میر زکی صاحب۔ میر احمد صاحب نے عموماً مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوز خوانی کے لئے چھانٹا۔ حسب ذیل مرثیوں پر ان کے سوز رکھے ہوئے سُنے

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) اس لفظ سے میری اصلی زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کو میر انتخاب توضیح سمجھ کر رہنے دیجئے۔ مرزا صاحب نے رہنے دیا۔ یہ بشیر تو مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ دوسرے بشیر (میر عابد علی صاحب) میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے۔ میر ضمیر صاحب صفائی ہو جانے کے بعد وہ بشیر بھی مرزا صاحب ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ رام پرشاد بشیر نے شاید اسی خیال سے یہ لفظ اُٹھا دیئے۔ کہ اُن کے مرثیہ کو کوئی شخص میر عابد علی بشیر کا مرثیہ نہ سمجھے + ۱۲ مؤلف

۳ مشیر مرحوم کے سہروں میں لکھنؤ کے اکثر اہل کمال کا اسی طور پر بیان ہے۔ افسوس کہ اُس لعل بے بہا کی کوئی قدر و محافظت نہیں کرتا۔ بزاروں بازاری محاورات نظم ہیں۔ جو دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے۔ چند روز میں زبان اردو کے طالب چراغ لیکر ڈھونڈتے پھرینگے۔ تو وہ لعل شب چراغ نہ ملینگے۔ مشیر ارشد تلامذہ دبیر تھے۔ اور تمام اصناف سخن میں ان کا کلام ہے۔ بڑے بڑے شاہزادے اور اہل علم مثلاً محمد علی شاہ و امجد علی شاہ و واجد علی شاہ میں ایک سے ایک بہتر ان کے شاگرد تھے۔ سراپا سخن میں

جاتے ہیں۔(۱) آمد ہند کا غل عترتِ شبیر میں ہے۔(۲) ہند جس وقت محل سے سوئے زندان آئی۔(۳) جب یزید اپنے گناہوں سے پشیماں ہُوا۔(۴) حل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔(۵) عابد کو جب یزید سے بابا کا سر ملا۔ میر احمد صاحب کے شاگردوں میں میر علی حسن صاحب اور میر بندہ حسین صاحب ؁ (دونوں بھائی) بڑے نامی گرامی سوزخواں ہُوئے۔ اِن دونوں صاحبوں کی رئیس مرشدآباد نے بڑی قدر و عزت کی۔ مرشدآباد یا لندن میں یا جہاں کہیں رہے۔ پاس رکھا خصوصاً میر بندہ حسین صاحب کو ایک دم جدا نہ کرتے تھے۔(۱) میر مہدی حسین۔(۲) محمد مرزا خاں۔(۳) سید سجاد حسین۔(۴) نواب اچھے صاحب خویش جناب اوج مدظلہ (۵) نادر صاحب۔ یہ سب اس زمانہ کے نامی گرامی سوزخواں بلاواسطہ یا بالواسطہ انہیں دونوں بھائیوں کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔

(۲) احمد علی خاں مرحوم بھی اُس زمانہ میں ایک کامل سوزخواں مشہور تھے۔ یہ مرزا صاحب کے گویا فدائی تھے۔ ان کے یہاں ۱۴-۸ تاریخوں میں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں بڑی دُھوم دھام کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ جس کا مفصل بیان ہم نے دوسرے مقام پر اسی کتاب میں کیا ہے۔ انہوں نے بھی مرزا صاحب کے بعض سلام اور مرثیوں پر سوز رکھے۔

(۳) میر زکی مرحوم۔ یہ نہایت خوش الحان۔ خوش گلو۔ حسین آدمی سُنے جاتے ہیں۔ واجد علی شاہ مرحوم کے مصاحب ہونیکے سبب سے ان کی بڑی شہرت و عزت تھی۔ بڑی دُھوم دھام کی مجلسیں کرتے تھے۔ اور لکھنؤ کا غذی کے تعزیہ کے مقابلہ پر بڑی شان و شوکت سے تعزیہ اُٹھاتے تھے۔ مجلس میں خود پڑھتے تھے۔ اور ریاؤ کی چوٹی دار رکابی

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر ۳) بھی شیر کے بعض تلامذہ نظر آتے ہیں شیعہ پارٹی میں شیر کی شہرت دبیر و انیس سے کچھ کم نہیں ہے ۱۲ مؤلف

؁ میر بندہ حسین صاحب مرحوم حقیر مؤلف کے خسر تھے۔ اپنے زمانہ میں اہل فن تھے۔ باایں ہمہ ان کے بڑے بھائی میر علی حسین صاحب ان سے بہتر تھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

ایک مرتبہ تمام حاضرین مجلس کو ہٹ جانے کے بعد جو خاص خاص ان کے ملنے والے بیٹھے رہتے تھے (غالباً ان کے کہنے سے بیٹھے رہتے ہو نگے) اُن کو دستار خوان بچھوا کر کھانا بھی کھلاتے تھے۔ دُنیا کے لوگوں کا کس نے منہ پکڑا ہے۔ بعض حاسد لوگ یہ کہتے تھے۔ کہ ان کے پڑھنے پر جو لوگ زیادہ روتے ہیں۔ اُن کو یہ ڈبل حصّہ ملتا ہے۔ چنانچہ مشیر مرحوم کے ایک مرثیہ میں اسی خیال کی طرف اشارہ ہے ؎

جس سمت دیکھتا ہوں اُدھر کھاؤ کھاؤ ہے ٭ پٹوائیگا یہ میرزکی کا پلاؤ ہے

ہائے دولت تیری چاٹ بھی نہ رہی۔ مگر زبانوں پر افسانے رہ گئے۔ وہ بھی اب چند روز میں نیست و نابود ہو جائینگے ؎

مٹا حسن خوباں دلخواہ کا ٭ ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرزکی مرحوم کے شاید بھانجے اور شاگرد رشید میر محمود مرحوم اور میر محمود کے فرزند اور یادگار میر علی محمد صاحب مرحوم تھے ٭

میر علی محمد بھی مرشد آباد میں ملازم تھے۔ اور بعد میر بندہ حسین صاحب کے یکتائے فن سمجھے جاتے تھے۔ میر علی محمد صاحب بھی مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ وہ سوز خواں بھی تھے تحت لفظ خواں بھی تھے۔ اور شاید سلام وغیرہ بھی کہتے تھے۔ میر علی محمد صاحب کے بھانجے اور داماد میر منجھو صاحب بھی فی زمانناً سوز خوانی میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ اور سوز واقعی خوب پڑھتے ہیں۔ المختصر یہ سوز خوانوں کے تمام گھرانے اس طرف جھک پڑے اور سبھوں نے مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوز خوانی کے لئے منتخب کیا۔ یہی سبب ہے۔ کہ مرزا صاحب کے مرثئے سوز میں جس کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔ دُوسرے کسی مرثیہ گو شاعر کے مرثئے نہیں پڑھے جاتے۔ اور سُنا ہے۔ کہ میر بندہ حسین صاحب اور میر علی محمد صاحب کا یہ قول تھا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے الفاظ اور ترکیبیں اور بندشیں سوز میں پڑھنے کے لئے جیسی مناسب واقع ہوئی ہیں۔ دُوسرے کی نہیں ہیں۔ مرزا صاحب

کے مرثئے میں یہ ایک آسانی کتنی بڑی ہے۔کہ ۲۰۰ یا ۱۵۰ بند کے مرثیہ میں سے ۱۵ یا ۱۲ بند سوز میں پڑھنے کو چھانٹ لو۔ مرثیہ بے ربط نہ ہوگا۔ جا بجا مطلع لگے ہوئے ہیں جس مطلع سے چاہو۔ مرثیہ شروع کردو۔ گویا ایک سنہری زنجیر ہے۔ جس کی کڑیاں پیوستہ و مسلسل بھی ہیں۔ اور الگ بھی ہیں۔ حسب ضرورت چند کڑیاں لیکر چھوٹی چھوٹی کٹی زنجیریں بن سکتی ہیں۔ ہر زنجیر خورد عروس سخن کے لئے زیور بن جاتی ہے۔ ان کا مرثیہ ایسا خوشنما سانچہ ہے۔ جس میں سوز آسانی سے ڈھل جاتا ہے۔ اور جو سوز خواں اس فن کو تھوڑا بھی جانتا ہے۔ وہ بھی ان کے مرثیہ پر سوز آسانی سے رکھ لیگا۔ دُوسروں کے مرثیوں کا مختصر کرنا اور سوز رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں کوئی سوز خواں تحت لفظ خوانوں کی طرح چالیس چالیس پچاس پچاس بند پڑھے۔ تو مضائقہ نہیں۔ اوروں کے مرثیہ بھی خوب پڑھ سکتا ہے۔ عموماً سوز خوانوں کا یہ مقولہ اور عقیدہ ہے۔ کہ جس مجلس کو ہم درہم برہم دیکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ رنگ نہ ہوگا۔ اُس میں ہم مرزا صاحب ہی کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ وہی رنگ دیتا ہے۔ دُوسرے کا مرثیہ رنگ نہیں دیتا۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ فی صدی ستّر اسّی مرثیہ مرزا صاحب کے سوز میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور اصلی سبب مقبولیت من جانب اللہ ہے۔ سچ ہے۔ ع

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

باب پنجم فصل ۱ غزل اور مرزا صاحب

غزلیں بھی ابتدا میں مرزا صاحب نے کہیں۔ اور کثرت سے کہیں۔ مگر خود ہی اُن کے عدم شہرت کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے۔

دُنیا کے شاعر متمنی رہتے ہیں۔ کہ ارباب نشاط اُن کی غزلیں گائیں۔ مگر مرزا صاحب اس سے بھاگتے رہے۔ سُنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی غزلوں کے تین دیوان تھے۔ اُن میں سے ایک یا دو دیوان میر بادشاہ علی ابقا مرحوم اُس زمانہ میں مانگ لائے تھے۔ جب وہ مشق سخن کرتے تھے۔ باقی ایک یا دونوں دیوان مرزا صاحب نے تلف کر دئے۔ وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب مرحوم کے یہاں (مکان لکھنؤ شاہ گنج میں)

جب آگ لگی۔ جب اور اسباب کے ساتھ جل گیا۔ آج مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہیں ملی۔ جو مَیں بالیقین کلام دبیر مرحوم کہکر ناظرین کے سامنے پیش کروں۔ اُن کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ اُن کی غزلیں گائی جائیں۔ چنانچہ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ قبل غدر ۱۸۵۷ء ایک شادی میں جناب مرزا صاحب بھی شریک تھے۔ مَیں بھی تھا۔ ازبسکہ محفل میں ارباب نشاط بھی تھے۔ صاحبِ خانہ نے ثقہ آدمیوں کے واسطے علیحدہ ایک مکان تجویز کر دیا تھا۔ باقی ہمہ شما سب محفل رقص و سرود میں تھے۔ مرزا صاحب ثقہ آدمیوں میں تھے۔ مجھے دس بجے رات کے بُلا بھیجا۔ مَیں دُوسری محفل میں سے گیا۔ تو دیکھا۔ کہ شعر و شاعری کے نکات بیان ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور مرزا صاحب کو اُس بحث میں محو دیکھکر۔ پھر دُوسری محفل میں چلا آیا۔ جب باتوں سے مرزا صاحب کو فراغت ہُوئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ پھر آدمی میرے بُلانے کو بھیجا۔ مجبور پھر مَیں محفل رقص و سرود میں سے گیا۔ فرمایا۔ ہم تو تمکو جنّت کی طرف کھینچتے ہیں۔ تم بھاگتے ہو۔ مَیں اُن جناب کی خدمت میں بہت گُستاخ تھا۔ عرض کی۔ کیا یہ محفل جنت ہے۔ فرمایا۔ اس وقت ایسی ایسی باتیں ہُوئیں۔ کہ تم سُنتے تو رُوح خوش ہو جاتی۔ مَیں نے عرض کی۔ حضت (حضرت) انّما الاعمال بالنیات[1]۔ خدا پلک نواز ہے۔ وہ چاہے۔ تو وہاں بھی بخشش کا وسیلہ پیدا کر دے۔ فرمایا۔ توبہ کرو۔ استغفر اللہ۔ محفل رقص کی نسبت ایسا کہتے ہو۔ الغناء اشد من الزناء[2]۔ مَیں نے عرض کی سُنئے تو سہی۔ مَیں تو خدا کی رحمت کا ذکر کرتا ہُوں۔ وہ چاہے۔ تو اُسی جگہ وسیلہ بخشش پیدا کر دے۔ فرمایا۔ بھلا۔ مجھے سمجھائیے تو وہاں کیونکر وسیلہ بخشش ہو سکتا ہے۔ مَیں نے عرض کی۔ مثلاً آپ کا کلام منظوم کوئی طوائف گائے۔ اور ہمارا دل کسی شعر پر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ تو فرمائیے خدا دل کو دیکھتا ہے۔ ظاہر کو نہیں دیکھتا۔

[1] یعنی تمام عمل نیتوں کے ساتھ ہیں جیسی نیت ہوگی۔ ویسا ہی پھل ملیگا۔ یہ مشہور حدیث ہے +

[2] یعنی غنا شدید تر ہے زنا سے +

حکایت

ممکن ہے گناہ بخش دے - فرمایا - یہ تو بناءِ فاسد علے الفاسد ہوئی - جب گانا حرام ہے
تو جو اشعار گائے جائینگے - چاہے وہ معرفت ہی میں ہوں - باعث مغفرت نہیں ہو سکتے -
اور یہ کیا آپنے فرمایا - کیا میری غزل کسی طوائف نے گائی تھی - مَیں چُپ ہو گیا - فرمایا سچ
کہو - مَیں نے کہا - جی ہاں - اور اُس غزل کا مطلع سُنا کر کہا - یہ غزل حسین باندی طوائف
نے گائی تھی - مرزا صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے - اور کچھ وظیفہ پڑھ کر نماز شب پڑھنے
کے لئے کھڑے ہو گئے - خیر رات گئی بات گئی - دُوسرے دن جو مَیں نو دس بجے پہنچا -
تو اُن کے آدمی نے کہا - کہ دیوان خانہ میں مرزا صاحب ہیں - اور حسین باندی طوائف سے
کچھ باتیں کر رہے ہیں - اب آپ کو اختیار ہے - چاہے جائیے چاہے نہ جائیے -
مَیں اُلٹے پاؤں پھر آیا - مگر دل میں کہتا تھا - کہ یا تو مرزا صاحب نے میرے قول کی تصدیق
کی غرض سے حسین باندی کو بُلایا ہوگا - یا اُس سے سیدھے سادے طور پر اپنی غزل سُنی
ہوگی - دُوسرے روز جو مَیں شاہ گنج میں ہو کر نکلا - تو حسین باندی کا لڑکا ملا - اُس نے
حسین باندی کا یہ پیام دیا - کہ آپ اجازت دیں - تو مَیں کسی وقت حاضر ہوں - مَیں نے
کہا - اچھا پانچ بجے شام کو آنا - شام کو جب وہ آئی - تو مجھ سے کہا - میر صاحب آپنے
مرزا صاحب سے یہ ذکر کر دیا - کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی - مَیں بولا - ہاں باتوں باتوں
میں مَیں نے کہا تو تھا - پھر کیا ہُوا؟ کہا - مرزا صاحب نے اول تو مجھ سے پوچھا - تمکو میری
غزلیں یاد ہیں؟ مَیں نے جواب دیا - بس ایک غزل - اُنہوں نے مطلع پوچھا - مَیں نے
مطلع پڑھ دیا - پوچھا کے شعر یاد ہیں؟ مَیں بولی - نو دس شعر - پوچھا رات کو یہ غزل گائی
تھی؟ مَیں نے کہا - جی ہاں - یہ سُن کر وہ گھر میں اُٹھے ہوئے چلے گئے - اور ایک توڑہ
پانچسو روپیہ کا ایک رُومال میں باندھ کر لائے - مجھسے فرمایا - یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ
لو - آج سے اس غزل کو نہ گانا - مَیں نے بہتیرا کہا - کہ مَیں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤنگی -

* یعنی فاسد کی بُنیاد فاسد پر ہے +

آپ روپیہ رہنے دیجئے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا۔ نہیں۔ اب میں یہ روپیہ نکال چکا۔ تم اس کو کسی کارِ خیر عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا۔ جب قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا۔ تو میں وہ توڑہ ڈولی میں رکھ کر لے آئی۔ اس حکایت کے لکھنے سے غرض یہ ہے۔ کہ خود مرزا صاحب نے کوشش کی۔ کہ اُن کا عاشقانہ کلام نہ مشہور ہو۔ اور ارباب نشاط نہ گائیں اور اُن کی خواہش و کوشش پوری ہوئی +

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

فصل ۸ مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں

لکھنؤ میں مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی مجلسیں حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں :-

(۱) ملکہ زمانی کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں عشرہ محرم میں بڑی شان و شوکت کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ بیگم نصیر الدین حیدر کی محل خاص تھیں[۱]۔ اور مرزا صاحب سے اعتقاد رکھتی تھیں۔ ان کے یہاں سے مرزا صاحب کو ماہواری تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اور مرزا صاحب کی سفارش پر سالانہ لاکھوں روپیہ اہل حاجت کو ملا کرتا تھا۔ ان کی فیاضی کا لکھنؤ میں شہرہ ہے۔ ان کی بیٹی سلطان عالیہ شاعرہ اہلبیت مرزا صاحب کی شاگرد تھیں۔ جو نواب ممتاز الدولہ مرحوم کی زوجہ تھیں +

(۲) افتخار الدولہ مرحوم کے یہاں جناب میر ضمیر مرحوم اور مرزا صاحب پڑھتے تھے جنکا ذکر خیر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بڑے خوش اعتقاد رئیس تھے۔ اور بڑے سخی رئیس گذرے ہیں[۲] +

---

[۱] جلد ۲ تذکرہ خمخانہ جاوید میں ان کا حال نصیر الدین حیدر بادشاہ دویم اودھ کے حال میں لکھا ہے۔ کہ جس سے انکی دولت و ثروت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] افتخار الدولہ کی سخاوت کی مدح میں مرزا صاحب کی تصنیف میں ایک رباعی ملی ہے وہ یہ ہے ؎ اس در پہ ہر ایک شادماں رہتا ہے۔ خنداں گلِ امید یہاں رہتا ہے۔ ہر فصل میں دست افتخار الدولہ نیساں کی طرح گہر فشاں رہتا ہے۔ آخر عمر میں یہ بزرگوار کربلائے معلےٰ میں جاکر بڑے حضرت (امام حسینؑ) کے کلیہ بردار ہو گئے تھے۔ وہیں سے سیدھے جنت میں گئے۔ ع کیا سخاوت کا ثمر پایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) حسین علی خاں اثر مرحوم خلف مرزا حیدر بیگ نائب آصف الدولہ کے یہاں تمام چہلم کی مجلسیں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ پھر جب عہد امجد علی شاہ میں میر انیس مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ تو ایک دن میر صاحب اور ایک دن مرزا صاحب اُن کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھے۔ یہ نواب خود بھی شاعر تھے۔ اور شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید تھے شیخ ناسخ مرحوم بھی انکے یہاں مجلسوں میں کبھی کبھی آتے تھے۔

(۴) میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقع لکھنؤ چوک میں پہلے تو پچیسویں کی مجلس میں مرزا ضمیر صاحب پڑھا کئے۔ پھر عہد محمد علی شاہ مرحوم سے مرزا دبیر صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ اور مدۃ العمر ۲۵ رجب اور ۲۵ ذیقعد کی مجلس میں پڑھا کئے۔ یہ دونوں مجلسیں بڑی شان و شوکت اور مجمع کثیر کے ساتھ ہوتی تھیں بعد زمانہ غدر میر اعظم علی مرحوم نے ۲۵ رجب کی ایک مجلس مقرر فرمائی۔ جو چوپٹیوں پر ہُوا کرتی تھی۔ وہ مجلس اسی مجلس کے مقابلہ پر میر صاحب کے طرفداروں نے مقرر فرمائی تھی۔ اور میرے ہوش میں اُس مجلس میں میر خورشید علی صاحب نفیس دلآرام کی بارہ دری میں پڑھتے تھے۔ لمؤلفہ

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں + کیسی کیسی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں

یہ مجلسیں بحمداللہ آج تک دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ میں جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور اُدھر دولھا صاحب پسر میر نفیس مرحوم پڑھتے ہیں +

(۵) وزیر خاں داروغہ دیوان خانہ شاہ اودھ کے یہاں (مفتی گنج احاطہ مرزا علی خاں میں) ہر مہینہ کی تئیسویں کو عہد واجد علی شاہ مرحوم میں مرزا صاحب اور اُن کے مقابلہ پر محمد خاں داروغہ فیل خانہ شاہی کے یہاں اُسی تاریخ اُسی محلہ میں میر صاحب پڑھتے تھے +

(۶) جواہر علی خاں خواجہ سرائے ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں محلہ گولا گنج میں ہر مہینہ کی بائیسویں کو اور نواب ناظر فیروز الدولہ خواجہ سرائے شاہی کے یہاں ہر مہینہ کی بارھویں کو مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ فیروز الدولہ کا مکان بھی گولا گنج میں اُس تراہہ سڑک پر تھا جہاں

سے اب ایک سڑک شفاخانہ درن بجے سنگھ کو جاتی ہے۔ یہ مجلسیں بھی عہد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ہُوا کرتی تھیں۔ اب نہ مکینوں کا نام ونشان ہے۔ نہ کوئی مکان ہے۔ خدا کی شان ہے۔ لمؤلفہ

فلک نے پیس کے برباد کر دئے وہ محل ✦ اجل یہ کس کی نظر کھا گئی مکینوں کو

(۷) ہر مہینے کی گیارھویں کو جو مرزا صاحب کی ولادت کا دن ہے خود مرزا صاحب کے مکان پر مجلس برسوں ہُوا کی۔ اور اب اُن کی قبر پر تیسویں یا پہلی کو (بروز وفات) مجلس ہوتی ہے ✦

(۸) ہر مہینے کی تیرھویں کو اور ماہ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علی خاں سوزخواں مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے۔ اُدھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انہیں تاریخوں میں میر صاحب پڑھتے تھے ✦

چنانچہ جناب مجتہد العصر مولانا السید علی حسن صاحب قبلہ علامہ جائسی مدظلہ العالی ایک سال کی اٹھارھویں ماہ صفر کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ احمد علی خاں مرحوم زمانہ شاہی میں قریباً پچاس مجلسیں کیا کرتے تھے۔ امام باڑہ آغا باقر مرحوم کے قریب اُن کا مکان تھا۔ جو مکانات اب بالکل کھد گئے ہیں۔ ہر روز اُن کے یہاں ایک ذاکر کامل پڑھتا تھا۔ اٹھارھویں صفر کو پچاسویں مجلس ہوتی تھی۔ اُس مجلس میں مرزا صاحب پڑھتے تھے۔ اور کچھ فاصلہ پر میر صاحب حیدر خاں مغفور کے یہاں پڑھتے تھے۔ دونوں مجلسیں بالمقابل ایک وقت پر ہوتی تھیں۔ میں اور میرے اُستاد جناب سید العلماء (سید حسین عرف میرن صاحب قبلہ علیین مکان طاب ثراہ) بھی احمد علی خاں کے یہاں شریک ہُوا کرتے تھے۔ ایک روز مرزا صاحب مرحوم حیدر خاں کے یہاں کچھ پہلے پڑھ چکے۔ تو وہاں کے اکثر سامعین بھی یہاں آئے۔ یہاں یہ آدمیوں کی کثرت تھی۔ کہ زانو بدلنا مشکل تھا۔ اُوپر نیچے کے تمام مکانات شائقین سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک کنواں جو صحن مکان میں تھا۔ اُس پر تخت پڑا ہُوا تھا۔ اور

اُس تخت پر بھی آدمی تھے۔ جب آدمیوں کے بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر لگادی تھی۔ اب جو دُوسری مجلس کے آدمی آئے اُنھوں نے باہر سے زور لگایا۔ تڑاق سے زنجیر ٹوٹ گئی۔ اکثر آدمی اندر چلے آئے۔ آدمیوں کے جزر و مد سے ایسا کچھ تلاطم ہُوا۔ کہ مرزا صاحب منبر پر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ بالآخر جہاں تہاں کر کے اُس مجمع کو بھی مجلس میں لے لیا۔ مجلس تو برہم ہو چکی تھی۔ مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال۔ بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں۔ کہ مجلس ہمہ تن گوش تھی۔

(رباعی ۱)

یاں مجھ کو بچھانا تھا ضرور آنکھوں کا + اس پردے میں تھا عین سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ + آنکھوں کے عوض بچھاؤنگا نور آنکھوں کا

(رباعی ۲)

ہر عضو سے سربلند گو آنکھیں ہیں + پر فرش کی ہو کمی تو لو۔ آنکھیں ہیں
کس کس کے بزیرِ پا بچھاؤں میں دبیر + ہم چشم بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اور مہینوں لوگوں میں اُس مجلس کے چرچے ہُوا کئے +

اس مجلس میں مرزا صاحب ہمیشہ ایک رباعی اس قافیہ و ردیف میں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ حقیر آیا ہے۔ دبیر آیا ہے۔ چنانچہ دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں جو رباعیوں کی جلد ہے۔ جس قدر رباعیاں اس ردیف و قافیہ میں ہیں۔ وہ اسی مجلس کی نسبت ہیں۔ دو تین رباعیاں اس موقع پر لکھتا ہُوں:۔

(۱) تیرھویں تاریخ کی مجلس کی نسبت ہے

کیوں آج یہ انبوہ کثیر آیا ہے + ہاں حضرت مقبل کا نظیر آیا ہے
ہوگا مہِ چاردہ کا منبر پہ کمال + تاریخ ہے تیرھویں دبیر آیا ہے

(رباعی ۲)

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + ہونے کو مرید چرخ پیر آیا ہے
چودہ معصوم کے موالی ہیں جمع + تاریخ ہے تیرھویں و بیر آیا ہے

رباعی (۳) اٹھارھویں کی مجلس کی نسبت فرماتے ہیں

مضمون سے وہ معنیٔ پرضو نکلا + ٹھنڈا جس سے قمر کا پرتو نکلا
ہر مصرع کُنہ کی چمک پر یہ غل + اٹھارھویں تاریخ مہ نو نکلا

انیسیوں اور دبیریوں کی چوٹیں تو مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ اس مجلس کے آنے والوں سے رستہ میں بعض اُدھر کے آدمیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آج تو مرزا صاحب احمد علی خاں کی مجلس میں نہیں آئے۔ شاید وہ مجلس آج نہ ہو۔ اس فقرے میں آکر کچھ آدمی جو اس مجلس میں آرہے تھے۔ حیدر خاں مرحوم کی مجلس میں چلے گئے۔ کچھ اپنے گھر پھر گئے۔ بعض آدمی یہاں آئے۔ تو مرزا صاحب کو موجود پایا۔ راہ کی کہانی بیان کی۔ مگر پھر بھی اس مجلس آدمی بہت آگئے تھے۔ مرزا صاحب منبر پر گئے۔ تو اول یہ رباعی پڑھی:۔

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے + سُننے کو بھی انبوہ کثیر آیا ہے
کیوں راہ میں بہکاتے ہیں مشتاقوں کو + یہ کون ہے۔ جو نہیں دبیر آیا ہے

ایک سال اس مجلس میں مرزا صاحب پڑھ رہے تھے۔ کہ یکایک بہت سے آدمی آگئے۔ اُن میں سے اکثر نے قریب منبر جانا چاہا۔ جو لوگ پہلے سے منبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو بُرا معلوم ہؤا۔ آپس میں تکرار ہوگئی۔ قریب تھا کہ مار پیٹ کی نوبت پہنچے۔ کچھ لوگوں نے اصلاح کرا دی۔ اتنی دیر میں مرزا صاحب نے منبر پر یہ رباعی کہ لی۔ اور جب اہل مجلس مطمئن ہُوئے۔ تو یہ رباعی پڑھ کر پراگندہ مجلس کو متوجہ کر لیا۔

دریائے ثواب میں تلاطم۔ کیسا + مجلس میں تاخُّر و تقدُّم کیسا
بیجا ہے غبار اشکباروں کے لئے + پانی موجود ہے۔ تیمم کیسا

قبلہ و کعبہ فرماتے ہیں۔ کہ افسوس جب زمانہ شاہی نہ رہا۔ اور احمد علی خاں مرحوم کی بھی وہ حالت نہ رہی۔ اور اٹھارھویں صفر کی مجلس ہوئی۔ تو اُس مجلس میں بھی مَیں شریک تھا۔ یہ چھوٹی سی مجلس تھی۔ حاضرین وہ مجمع عہد شاہی یاد کر کے افسوس کر رہے تھے۔ کہ مرزا صاحب نے منبر پر جا کر یہ رباعی حسب حال پڑھی۔ جو غالبًا فی البدیہ کہی تھی +

(رباعی)

پھر چرخ پر آسمان پیر آیا ہے + ہر کوچہ میں وقت دارو گیر آیا ہے
اگلا سا نہ مجمع ہے نہ اگلے سے وہ لوگ + یاں آن کے حیرت میں دبیرؔ آیا ہے*

احمد علی خاں مرحوم کے یہاں کی یہ گویا آخری مجلس تھی۔ ؎

اے مصحفیؔ مَیں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو + بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۹) داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیرؔ مرحوم بھی مرزا صاحب کے ایک معتقد بلکہ فدائی بالواسطہ و بلاواسطہ شاگرد تھے۔ یعنی اوّل اوّل وہ شیخ گوہر علی صاحب مشیرؔ مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر خود مشیرؔ مرحوم نے ان کو مرزا صاحب کا شاگرد کرا دیا تھا۔ غزل میں یہ جناب اسیرؔ مرحوم کے شاگرد تھے۔ کہ مرزا صاحب کو غزل پر اصلاح دینے کی فرصت نہ ہوتی تھی یہ غدر ۱۸۵۷ء میں کمپنی کے خیر خواہ رہے تھے۔ کئی معزز انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ اس صلہ میں گورنمنٹ سے معقول انعام ملا تھا۔ ان کے حالات ان کے فرزند ارجمند میر امیر حسن صاحب فروغؔ سلمہ اللہ والبقاہ نے جو مجھے لکھ کر بھیجے ہیں۔ وہ حال تلامذۂ مرزا صاحب میں ملاحظہ فرمائیگا۔ یہاں یہ لکھنا ہے۔ کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء ان کے یہاں محلہ گولہ گنج میں ہر سال اکیسویں ماہ رمضان کو مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ انکا امام باڑہ

*یہ رباعی دفتر ماتم کی جلدوں میں نہیں ہے۔ محض قبلہ و کعبہ کے ذریعے حقیر تک پہنچی ہے مَیں دعا کرتا ہوں کہ ہمارے سر پر ان نائب امامؑ کا سایہ رہے۔ اور میں عنایت فرما قبلہ و کعبہ کے بھتیجے اور شاگرد جناب منشی احمد رضا صاحب جائسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے یہ حالات قبلہ و کعبہ کے ارشاد کے موافق انکی زبان سے سنکر اور لکھکر مجھے بھجوائے۔ تاکہ مَیں اس کتاب کی رونق بڑھاؤں اور اس میں درج کروں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بہت بڑا ہے۔ وہ سب آدمیوں سے بھر جاتا تھا۔ ان کے یہاں بعض مجلسوں میں حقیر شریک ہوا ہے[1]

(۱۰) داروغہ شیخ محمد عباس صاحب (والد مرحوم شیخ علی عباس صاحب وکیل) کے یہاں کنکر کے کنوئیں پر میر انیس صاحب مرحوم اور اُسی کے قریب خان بہادر شیخ الطاف حسین صاحب مرحوم کے یہاں ۱۸ صفر کو مرزا صاحب مغفور پڑھا کرتے تھے[2]۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء یہ مجلسیں بھی ہوتی تھیں۔ حقیر ان بعض مجلسوں میں بھی شریک ہوا ہے۔ اور یہ مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ پڑھنے والے نہیں ہیں۔ بقول میر انیس مرحوم ؎

پھُولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں + افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

(۱۱) نواب ممتاز الدولہ مرحوم (داماد نصیر الدین حیدر شاہ دوم اودھ) بھی مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں بھی اربعین میں کبھی ایک کبھی دو مجلسیں مرزا صاحب ہر سال پڑھا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں حقیر بھی شریک ہوا تھا +

(۱۲) بابو بینی پرشاد وکیل ہائی کورٹ آگرہ سے لکھنؤ میں گئے تھے۔ اور نواب آغا علی خاں عرف آغائے صاحب (ناظم صاحب) سے درخواست کی تھی۔ کہ مجھے

---

[1] اسی مجلس کی کیفیت مَیں اُوپر مخدومی میر دستور علی صاحب بلگرامی سکرٹری جناب راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبانی اس کتاب میں ایک جگہ لکھ چکا ہُوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] میرے مکرم مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ دام اقبالہ کے یہ خسر تھے اور شفاق حسین صاحب خاں بہادر مرحوم کے فرزند ہیں وہ اب اٹھارھویں صفر کی مجلس کرتے ہیں۔ مدت تک جناب مرزا اوج صاحب کو وہ بھی پڑھوایا کئے۔ مگر ایک سال امروہہ کے سادات نے مجھ سے آکر اجازت چاہی کہ عشرۂ دویم صفر میں جناب مرزا اوج صاحب کو ہم امروہہ لے جائیں اور وہاں پڑھوائیں وہ جناب کی مجلس کے خیال سے نہیں جاتے۔ انھوں نے اُن سادات کی مجالس عزا کو اپنی مجلس پر مقدم رکھکر مرزا اوج صاحب سے قبلہ عرض کرکے اُن کو امروہہ بھجوایا۔ اور خود اپنی مجلس میں حدیث خواں کو پڑھوایا چنانچہ اب اس مجلس میں حدیث خوانی ہوتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مرزا صاحب کو سُنوا دیجئے۔ چنانچہ آغائی صاحب نے کہ یہ بھی مرزا صاحب کے معتقد تھے ایک بہت بڑی مجلس کر کے مرزا صاحب کو پڑھوایا تھا حقیر کو یہ مجلس یاد تو ہے۔ مگر میں اس میں شریک نہیں ہوا +

(۱۳) شاہ پنجم اودھ واجد علی شاہ مرحوم کے یہاں مجلس عشرہ محرم میں بھی مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اور شاہ مرحوم وہ عزت افزائی فرماتے تھے۔ جو کسی بادشاہ نے آج تک کسی شاعر اہلبیتؑ کی بھی نہ کی ہوگی۔ بھلا معمولی شاعروں کا تو کیا ذکر ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کہ شاعروں کا عروج بادشاہوں کی بدولت ہوا کرتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا عروج بادشاہان دین و دنیا ائمہ اطہار اور شہدائے کربلا کے سبب سے ہوا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

خاقانی[1] و فردوسی[2] و سعدی[3] و نظامی[4] — شاہوں کی مدد سے ہوئے آفاق میں نامی
عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی — دیتا ہے سخن لکھ کے مجھے خطّ غلامی

ہیں دو ہی دبیر۔ اس میں نہیں ایک کو شک ہے
منبر مری جاگیر۔ مقام اُس کا فلک ہے

فصل ۳ حکایت مرزا صاحب کا بادشاہ اودھ کو خداوند کہنا

علامہ جائسی مدظلہ العالی کے ارشاد سے معلوم ہوا۔ کہ مرزا صاحب ایک مجلس میں واجد علی شاہ مرحوم کے روبرو جب گئے۔ تو باتوں میں اُنہوں نے معمولی لفظ خداوند جو لکھنؤ کے اہل دربار کا تکیہ کلام تھا نہیں کہی*۔ جب بعد ختم مجلس مرزا صاحب چلے آئے۔ تو بادشاہ سے ایک مصاحب خاص نے تخلیہ میں عرض کی۔ کہ جہاں پناہ کی نسبت لفظ خداوند کہنے میں شاید مرزا صاحب کو کچھ اکراہ ہے۔ عالی ظرف بادشاہ نے اُنکی بات کو ٹال دیا۔ کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز کی مجلس میں منبر پر مرزا صاحب نے یہ دو

*اسی طرح راجپوتانہ میں عام طور پر راجاؤں کو اہل دربار اَن داتا کہتے ہیں جس کے لفظی معنی رازق کے ہیں۔ یہ لفظ خداوند سے بھی بڑھ کر ہے۔ بحمد اللہ حقیر نے ۲۹ برس کی ملازمت میں کبھی یہ لفظ نہیں کہی + ۱۲ مؤلف حقیر

رباعیاں پڑھیں۔

(رباعی ۱)

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں + یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو مُنہ دکھانا ہے دبیر + بندوں کو مَیں کس مُنہ سے خداوند کہوں

(رباعی ۲ منقبت میں)

حیدرؑ کو غنی سب کو غرض مند کہوں + بیجد ہیں شرف ان کے مَیں تا چند کہوں
ہے شیرِ خدا میں بخدا شانِ خدا + اس بندے کو سو بار خداوند کہوں

بادشاہ مرحوم نے اُن مصاحب خاص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ سُنئے؟ کیوں؟ اِن شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے یا نہیں۔ کچھ سمجھے۔ اُن مصاحب نے عرض کی بیشک جب بعد اختتام مجلس اُن مصاحب کے ایک رازدار نے پُوچھا۔ کہ آپ سے بادشاہ نے کیا فرمایا تھا۔ تو اُنہوں نے کہا۔ کہ کل مَیں نے تخلیہ میں بادشاہ سے عرض کیا تھا۔ کہ مرزا صاحب حضور کو خداوند نہیں کہتے۔ شاید اُن کو یہ لفظ کہنا مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ اور میرے اور بادشاہ کے سوا تیسرے شخص کو اس بات کا علم نہ تھا۔ مرزا صاحب نے آج گویا وہی مضمون نظم کر کے پڑھ دیا۔ اُس کل کی بات کا جہاں پناہ نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔ اور فرمایا تھا۔ کہ ان شاعران اہلبیتؑ کو الہام ہوتا ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ اکثر ایشیائی شاعروں کے کلام بادشاہوں اور دولتمندوں کی بیجا خوشامد میں ہیں۔ اُنہوں نے اپنی فطرتی شاعری کو مال دُنیا کے لالچ میں آکر ضائع کر دیا۔ جس کی مثالیں تاریخوں اور تذکروں میں اہل علم کو کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر مرزا صاحب نے اپنی شاعری کا صحیح مصرف خوب سمجھا۔ اور قانون فطرت کے مطابق (جو رضائے خدا کا گویا پرتو ہے) شاعری کو اس خوبصورتی سے صرف فرمایا۔ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شاعر کا کمال یہ ہے۔ کہ وہ عالم مادّی وغیر مادّی کے واقعات کو رضائے خدا کے مطابق بیان کرے۔ مرزا صاحب نے

دونوں قسم کے مضامین کو بہت خوبی و خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ صبح۔ شام۔ گرمی۔ تہذیب۔ عدالت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ صبر۔ علم۔ رضا۔ تسلیم۔ حلم۔ تواضع و انکسار۔ توحید۔ عدل۔ نبوت۔ امامت۔ معاد کی مدح میں کلام کے دریا بہا دئے ہیں۔ بادشاہ اور امیروں کے دربار میں جانے سے وہ اکثر پرہیز کرتے تھے۔ اور جب جاتے تھے۔ تو اپنے معمولی لباس سے جاتے تھے۔ اور معمولی بات چیت فرماتے تھے۔ دُنیا کے لالچ سے کبھی کوئی کلمہ خلاف حق نہیں کہتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

سرکار سلاطین سے سروکار نہیں + جز مجلس مولا کوئی دربار نہیں
مدّاح ہُوں میں امام بے سر کا دبیرؔ + سامان کیسا کہ سر بھی درکار نہیں[1]

ایک مقام پر وہ بے جا خوشامد کرنے والوں کی مذمت حسب ذیل فرماتے ہیں:۔

خوشامد بیجا کرنیوالوں کی مذمت

(رباعی)

پیش امرا طالبِ زر جُھکتے ہیں + سجدے کی طرح مجری کو سر جُھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح + ہو مال سدا جدھر۔ اُدھر جُھکتے ہیں

اگر کسی بادشاہ یا امیر کی مدح بھی کبھی کی۔ تو جب کہ اُس کو اُس مدح کا اہل و مستحق پایا چنانچہ امجد علی شاہ مرحوم کی مدح میں چند بند اُن کے مرثیہ (طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے[2]) میں موجود ہیں۔

---

[1] سر و سامان ایک معمولی لفظ ہے۔ اس کے دو ٹکڑے کس خوبصورتی سے کر کے مضمون پیدا کر لیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول میں سب سے پہلے چھپا ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت کے بعد بادشاہ موصوف کی تعریف اور بعض علمائے اسلام و ایمان کی مدح فرمائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا ہے کر کے انصاف کھا رہا ہے مرے قول پر قسم مطلوب داد نظم ہے نے شہرۂ رقم۔ واقف ہے کبریا کہ دروغ در یا نہیں۔ مطلب (مقصد) کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں۔ پس ایسے نیک نفسوں کی مداح کو مرزا صاحب عین رضائے خدا کے مطابق سمجھتے تھے۔ اس لئے تعریف کی ہے۔ اور صاف صاف کہدیا ہے۔ کہ ع مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُن دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح وثنا کے قابل سمجھتے تھے۔ اس لئے
مدح کی۔ کہ دُوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔ بے جا خوشامد وطمع کے
زنگ سے اپنی آئینہ شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس نیک نیتی کا پھل اُن کو دُنیا
میں خدا نے یہ دیا۔ کہ بادشاہ نے گویا اُن کی خدمت کی۔ چنانچہ شمس الضحٰے میں جو زمانہ شاہی
کی ایک تصنیف فارسی کی ہے۔ یہ واقعہ لکھا ہے۔ اور مَیں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔
کہ زمانہ سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ایک روز شاہ مرحوم ممدوح کی مجلس میں مرزا
صاحب منبر پر مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ بالائے منبر جو شامیانہ تھا اتفاقاً وہ ہوا سے پراگندہ
ہو کر ایک طرف ہو گیا۔ مرزا صاحب کے منہ پر دُھوپ آگئی۔ فے الفور قدر شناس علم دوست
بادشاہ نے چتر طلب فرمایا۔ اور خود قریب منبر چتر لگائے ہُوئے کھڑے رہے۔ مرزا
صاحب نے بہت عذر کیا۔ مگر فرمایا۔ کہ آپ پڑھے جائیے۔ اور پُورا مرثیہ پڑھئیگا۔
مَیں مشتاق ہُوں۔ مرزا صاحب نے الامر فوق الادب[1] پر عمل کیا۔ اور مرثیہ پورا پڑھا۔ اللہ اللہ
ظلِ اللہ جس شاعر اہلبیتؑ کے سر پر چتر شاہی لگائیں۔ اُس کی عزت وآبرو کی کیا حد ہو سکتی
ہے۔ اور بادشاہ مرحوم کی قدر شناسی اور تواضع کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی سچ ہے

تواضع زگردن فرازاں نکوست * گدا گر تواضع کند خوے اوست[2]

دنیا کے لوگ شاعر کی معراج عزت وکمال اس میں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کسی بادشاہ کا مداح ہو

---

[1] یعنی حکم ادب کے اُوپر ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] مولوی محمد علی صاحب نے شرح حیات انیس میں صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ پر لکھا ہے کہ حضور نظام دکن میر محبوب علی خاں صاحب مرحوم نے عشرہ چہلم ماہ صفر سنہ ۱۳۲۲ھ میں نواب فیاض علی خاں صاحب کے امام باڑہ میں تشریف لیجا کر جناب مرزا اوج صاحب کی اعجاز بیانی کو سماعت فرمایا۔ اور منبر کے سامنے بغیر تُوشک ومسند کے بیٹھ کر آخر مجلس تک بیٹھے رہے۔ اور بعض کشتیاں ابنوں اور خود بندوں کی بھجوائیں۔ ایسا موقع اُن کے والد ماجد جناب مرزا دبیر مرحوم کو کبھی حاصل نہیں ہُوا تھا۔ اور اس سے بڑھکر کوئی اوج نہیں ہو سکتا میں عرض کرتا ہوں کہ مولف صاحب کو پُورا علم نہ تھا۔ ورنہ وہ یُوں لکھتے کہ یہ اوج و اعزاز مرزا اوج صاحب قبلہ کو بیٹے گویا موروثی تھا۔ کہ اُن کے والد ماجد کی شاہ اودھ اس سے زیادہ عزت افزائی فرما چکے تھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر بادشاہ دین و دنیا کی قدر و منزلت کم سے کم یہ ہونی چاہئے۔ کہ خود دنیا کے بادشاہ اُس کے مدح خواں ہوں۔ چنانچہ یہ عزت بھی مرزا صاحب کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح کی بدولت حاصل ہُوئی تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ قریب ۱۲۹۱ھ کے مرزا صاحب نابینا ہو گئے تھے۔ سُنا ہے کہ کلکتہ میں کوئی جرمن کا ڈاکٹر آیا تھا۔ جو آنکھیں بناتا تھا۔ اور وہ مٹیا برج میں بادشاہ اودھ مرحوم کا مہمان تھا۔ شاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے اشارہ سے اُن کے کسی رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا۔ کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ تو آپ کی آنکھیں بن جائیں۔ بادشاہ اودھ کی بھی یہی خواہش ہے۔ مرزا صاحب کلکتہ مٹیا برج میں پہنچ کر بادشاہ مرحوم کے مہمان اور نواب مونس الدولہ کی کوٹھی میں مقیم ہُوئے۔ عرضداشت اطلاعی شاہ جم جاہ کی خدمت میں بھجوائی۔ بادشاہ مرحوم نے عرضداشت کو ان الفاظ دستخط خاص سے مزیّن فرمایا۔

گر برسر و چشم من بیائی + برقلب نهم کہ کیمیائی

بادشاہ کا مہمان ہونا اور بادشاہ کا استقبال و بازدید کو آنا۔

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ ہجری۔ اور پھر بمقام سلطان خانہ مبارک و سبطین آباد مبارک بادشاہ ممدوح مرزا صاحب کے استقبال کو تشریف لائے۔ اور اپنے ہمراہ مرزا صاحب کو لے گئے۔ اور پھر بازدید کی ملاقات کو جس کوٹھی میں مرزا صاحب ٹھیرے تھے۔ قدر شناس بادشاہ آئے۔ اور اپنی مجلس عزا میں خود بادشاہ مرحوم نے مرزا صاحب کی موجودگی میں برسرِ منبر مرزا صاحب کی مدح میں تقریباً پچیس ۲۵ بند پڑھے۔ جن میں سے یہ ایک ٹیپ بہت مشہور ہے۔

بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہُوں + مَیں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہُوں

پھر مرزا صاحب کی آنکھیں اُس ڈاکٹر سے بنوائیں۔ قدح چشم کے ساتھ ہی بصارت عود

مع اصل کتاب ضمیمہ شمس الضحیٰ میں ۱۲۹۱ھ ہی لکھا ہے۔ اس لئے مَیں نے بھی یہی لکھ دیا۔ مگر میرا خیال و علم یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب اواخر ۱۲۹۰ھ میں کلکتہ مٹیا برج گئے تھے۔ ۲۹ ذیحجہ ۱۲۹۰ھ کو یہ عرضداشت مزیّن ہوئی۔ کہ یہ غالباً ۱۲۹۰ھ کا اخیر دن تھا۔ اور ۱۲۹۱ھ میں قدح چشم اُس ڈاکٹر نے کیا۔ چنانچہ آئندہ جو تاریخ عود بصارت کی مرزا صاحب کی فرمائی ہُوئی ہے۔ اُس سے ۱۲۹۱ھ نکلتے ہیں۔ اس سے میرے خیال و علم کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ پس صحیح ۲۹ ذیحجہ ۱۲۹۰ ہجری ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

کرائی ۔ مرزا صاحب نے یہ رباعی تاریخیہ کہکر شکر خدا ادا کیا ۔

رباعی تاریخ عود بصارت

امداد علیؑ گاہ خفی گاہ جلی است + برمن ز ازل عین عنایات ولی است

چوں مادہ دفع شابگفتم تاریخ + چشم ۔ بددور ۔ عین اعجاز علی است[1]

جب تک لکھنؤ کی سلطنت قائم رہی ۔ مرزا صاحب ملک اودھ سے کہیں باہر نہیں گئے ۔ باہر سے بہتیرے بلاوے آئے ۔ مگر ہمیشہ انکار فرماتے رہے ۔ جب کوئی اس کا سبب پوچھتا تھا ۔ تو فرماتے تھے ۔ کہ ہماری زبان کے جاننے والے یا دہلی میں ہیں یا لکھنؤ میں ۔ تیسری جگہ یہ بات کہاں ۔ (دہلی ویران ہو چکی تھی ۔ وہاں سے کبھی طلب نہیں آئی) یہاں تک کہ زمانہ کی پریشان ہوائے وہ ورق الٹا ۔ اول سلطنت اودھ جاتی رہی ۔ برس ڈیڑھ برس کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا ۔ مگر اس شہر آشوب زمانہ میں مرزا صاحب نہایت مستقل رہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

رباعی غدر ۱۸۵۷ء کے حال میں

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا + گہ عدل گئے ظلم ۔ گیے جور ہوا

اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر + کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

لکھنؤ سے مرزا صاحب اس انتشار میں مع اہل و عیال چل کر سیتاپور میں پہنچے ۔ اور مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب مرحوم اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم ہوئے[2] ۔

عود بصارت اور تاریخ

فصل ۶ جب تک سلطنت اودھ قائم رہی مرزا صاحب اودھ سے باہر نہ گئے

غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا صاحب کا استقلال

غدر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور جانا

---

[1] اس میں نہایت لطیف تعمیہ خارجی مادہ کے پچاس عدد کا ہے ۔ یعنی ۵۰ عدد کم کرنے سے مصرع آخر سے تاریخ نکلتی ہے ۔ ایک تو یہی معنی ہوئے کہ جب ۵۰ عدد مادہ کے دفع ہوئے تاریخ نکلی ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب مادہ فاسد دفع ہوا ۔ جب تاریخ کہی اس صنعت کو صنعت ایہام کہتے ہیں ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

[2] میرے کرم فرما علم دوست غلام علی خاں صاحب ساکن لدھیانہ جو اب ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں مقیم اور اور سیر ہیں فرماتے تھے کہ میں جب ۱۹۰۰ء میں سیتاپور میں ملازم و مقیم تھا ۔ تو یہ مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب جو قریباً ۷۰ سال کی عمر کے تھے اور بڑے ثقہ

ایک فقیرنی بڑھیا نے اسی پُرآشوب زمانہ میں مجلس کی۔ اور مرزا صاحب اُسی بے سروسامانی کے عالم میں مرثیہ پڑھے۔ یہ واقعہ آج تک سیتاپور میں مشہور ہے۔ اُسی خانہ بربادی کے عالم میں یہ رباعی بھی کہی تھی۔ جس میں واقعی حالت (خانہ بربادی) کی تصویر کھینچ دی ہے۔

رباعی

شطرنج دورنگی[۳] سے ہیں ششدر بندے + آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل + تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

اسی زمانہ پُرآشوب میں یہ رباعی بھی فرمائی تھی۔

سیّارے سے چشم مہر نادانی ہے + اس دور میں دل بھی دشمن جانی ہے
مشکل ہے کہ ہات آئے عنانِ آرام + شبدیزِ فلک ستارہ پیشانی ہے[۴]

پھر لکھنؤ میں امن ہوجانے پر مع اہل وعیال واپس تشریف لائے۔ اور اکثر اپنے دوستوں کی موت اور بربادی کی خبریں سُن سُن کر نہایت ملال کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لکھنؤ میں نہ شاہ اودھ تھے۔ نہ وہ قدردان امیر۔ اکثر امیر فقیر ہو گئے تھے۔ اکثر سرکاریں مٹ گئیں تھیں۔ اور سامان خانہ داری کے ساتھ اکثر مرثئے بھی لُوٹ میں تلف

بعد غدر واپسی لکھنؤ کی مصلح

(بقیہ نوٹ نمبر۲) اور وضعدار زمانہ شاہی کی تعلیم یافتہ تھے رجہ سے ناقل تھے۔ کہ یہ مجلس جس فقیرنی نے کی تھی اُس کے گھر میں ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا تھا۔ اُس نے مرزا صاحب سے معذرت کی کہ میرے پاس اور کوئی کرسی وغیرہ نہیں ہے اور نہ کوئی اچھا مونڈھا ہے۔ مرزا صاحب نے فخریہ اُس مونڈھے پر بیٹھ کر پڑھا تھا۔ یہ خلق و انکسار مرزا صاحب کا سیتاپور میں آجتک مشہور ہے۔ مخدومی جناب مرزا اوج طاب ثراہ فرماتے تھے کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء وہ بڑھیا اکثر لکھنؤ میں آتی تھی اور جناب مرزا صاحب مرحوم اُس سے ہمیشہ مسلوک ہوتے رہتے تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] شطرنج دورنگی میں ایک لطیف استعارہ ہے شطرنج کے مہرے عموماً سرخ وسبز دو رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح اکثر خانہ بھی دو رنگ کے ہوتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۴] اکثر لوگ نجومیوں سے اپنا ستارہ دکھلایا کرتے ہیں غالباً اُن کے کسی رفیق نے کسی نجومی سے اپنے ستارہ کے دیکھنے کو کہا ہوگا۔ اُس پر فرماتے ہیں کہ سیارے سے مہربانی کی اُمید رکھنا نادانی ہے۔ کیونکہ یہ ایسا غدر کا زمانہ ہے کہ جس میں اپنا دل بھی دشمن جان ہو رہا ہے۔

ہو گئے تھے۔ پھر شاید ۱۸۵۸ء میں کانپور کے مشہور ذی علم امیر کبیر نواب دولھا صاحب نے بلایا۔ وہاں تشریف لے گئے۔ اور عشرہ محرم میں پڑھے۔ ایک رباعی اُس موقع پر اُن نئی نئی صورتوں کو دیکھ کر فرمائی تھی۔ وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

۱۸۵۸ء میں نواب دولھا صاحب کی طلب پر کانپور جانا

اُس مجلس کی رباعی پڑھنا

اس بزم میں ارباب شعور آئے ہیں ❊ یہ شیعہ ہیں یا آیۂ نور آئے ہیں
پڑھ مرثیہ لے دادِ سخن ان سے دبیر ❊ کیا کیا حضرات کانپور آئے ہیں[۵]

پھر شاید ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد سے سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ نے اپنے بعض اعزہ کو بھیج کر مرزا صاحب کو بلوایا۔ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی کے آئے ہوئے آباد تھے۔ وہاں زبان و کمال کے جوہر شناس اچھے تھے۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کی آمدنی صرف سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد اور ۳۰ روپیہ ماہوار وثیقہ حسینیہ[۴] (امام باڑہ) میر باقر تاجر مرحوم اور ایک گاؤں اور کچھ مکانات کے کرایہ کی رہ گئے تھے۔ جو مرزا صاحب ایسے حاتم مزاج کے واسطے کچھ بھی نہ تھی۔ ہر چند پٹنہ عظیم آباد دُور جگہ تھی۔ اور شاید اُس زمانہ میں مسلسل ریل بھی نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب کو اہل عظیم آباد کا خلق کھینچ لے گیا۔ اور بھی بعض رئیسوں کی طلب پر جناب میر انیس مرحوم و میر مونس مغفور و میر ظہیر[۶] مرور

عظیم آباد جانا

جناب میر انیس و میر مونس و میر ظہیر مرحوم کا بھی عظیم آباد میں جانا

(بقیہ نوٹ نمبر ۴) آرام کی لگام ہاتھ آنا مشکل ہے کیونکہ شبدیز آسمان خود ستارہ پیشانی ہے ستارہ پیشانی گھوڑا عرف عام میں منحوس مشہور ہے۔ آسمان کا ستارہ پیشانی ہونا ظاہر ہے۔ کہ اُس کی پیشانی پر ستارے ہیں ۱۲ مؤلف۔

۵ کانپور سے لکھنؤ ۴۲ کوس دور ہے مگر رسم و رواج و عادات میں بہت فرق ہے شاید مرزا صاحب نے نہایت مخفی اشارہ اسکا اس رباعی میں فرمایا ہے۔ مرزا صاحب کے بعد ایک اور ذاکر باکمال (مرزا نانک داغ) لکھنؤ کے کانپور میں انھیں رئیس کے یہاں پڑھنے گئے تھے۔ لوگ مجلس میں منبر سے دُور دُور بیٹھے تھے منبر کے رُو برُو سناٹا تھا۔ اُن ذاکر کامل نے فرمایا۔ آپ لوگ دُور ہیں ذرا منبر کے پاس آجائیے۔ تو ایک جاہل دُکاندار بولے۔ کہ آپ پنا منبر ہی اِدھر کچھ سرکا لیجے نا۔ اُن ذاکر نے نواب صاحب سے پُوچھا۔ کیا حضور یہی کانپور کی خلقت ہے۔ بھلا لکھنؤ میں ذاکر کے کہنے پر کب ممکن تھا کہ کوئی زیر منبر نہ آجاتا!! ایسا بے تکا جواب دیتا۔ ہائے لکھنؤ! ۱۲ مؤلف حقیر۔

۶ میر محمد رضا ظہیر مرحوم جو حقیر کے نانا تھے اور مرثیہ پڑھنے میں ایک طرز خاص کے موجد تھے اور ہمیشہ پڑھتے تھے جس طرح کی

اُسی سال عظیم آباد تشریف لے گئے تھے۔ یہ پہلا سال تھا جو لکھنؤ کے اتنے باکمال ذاکر لکھنؤ سے باہر ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ عظیم آباد میں دُور دُور سے لوگ ان کے سُننے کو آتے تھے۔ اکثر کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا۔ کہ نہ لکھنؤ اُجڑتا نہ یہ کامل یہاں آتے۔ سچ ہے۔ (بقول مؤلف) ؎

مضرتوں میں کبھی اکثر مفاد ہوتے ہیں ٭ کہیں ملول کہیں قلب شاد ہوتے ہیں

مرزا صاحب یکم محرم کو مجلس موصوف (گلزار باغ پٹنہ) میں منبر پر تشریف لائے۔ اول حمد و نعت و منقبت میں حسب معمول چند رباعیاں پڑھ کر ذیل کی دو رباعیاں اس مضمون میں پڑھیں۔ کہ سفر اہل کمال کے واسطے باعث نقص نہیں ہے۔ بلکہ کمال کو بڑھانے اور چمکانے کا ذریعہ ہے۔ اور گردش فلک آدمی کو سفر پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس فلسفہ کلام کو بغور دیکھئے۔ کیسی تخئیل ہے اور کیسی زبان ہے۔

(رباعی ۱)

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے ٭ اس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ۔ جنت تھا ٭ آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

(رباعی ۲)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا ٭ قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل ٭ پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

(بقیہ نوٹ نمبر ۴) تقلید کسی قدر فرق کیساتھ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ بعد (میر مغل صاحب سعید مرحوم دبیر و لا دحسین صاحب قوی مغفور و میر بادشاہ علی صاحب بقا) نے فرمائی۔ کہ یہ سب صاحب بھی اس خاندان کے اچھے پڑھنے والوں میں تھے۔ (میر محمد رضا) ظہیر مرحوم شاید نواب لطف علی خاں یا ولایت علی خاں کے یہاں پڑھتے تھے ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ف آدم ٹھہرے خاص و زمرہ ہے مطلب ہے کہ از بسکہ ہم آدم ہیں آدم کیواسطے جنت سے نکلنا لازم ہے۔ اور ٹھہرے اور نکلے میں صنعت تضاد بظاہر ہے۔ کہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔ حالانکہ ٹھہرے کے یہاں معنی ٹھہرنے کے نہیں ہیں۔ اس کو صنعت ایہام بھی کر سکتے ہیں ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اہل کمال کے لئے سفر مبارک ہے اس مضمون کی رباعیاں

فصل ۸ پٹنہ میں مرزا صاحب کی قدردانی کے وجوہ

از بسکہ پٹنہ عظیم آباد میں اکثر خاندان دہلی والوں کے جمع تھے۔ جو مرزا صاحب کی زبان کے قدرشناس تھے۔ اور زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کو جوہر شاعری سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب کی اہل عظیم آباد نے ایسی خاطر و مدارات کی۔ کہ پھر مرزا صاحب نے دوسری طرف کا رُخ نہ کیا۔ قریبًا تمام اہل عظیم آباد بالاتفاق مرزا صاحب کو تمام ہندوستان کے شاعروں پر ترجیح دیتے تھے۔ بڑے بڑے رئیس وہاں کے مرزا صاحب کے فدائی بن گئے تھے۔ جن میں سے دو بزرگوار میر محسن صاحب[۱] اور میر عباس صاحب[۲] مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد[*] کے چچا[۱] اور والد[۲] بھی تھے۔ جو خود بھی ذی علم تھے اور اہل کمال کے قدرشناس بھی تھے۔ الحاصل تمام قدردانوں کے اخلاق نے مرزا صاحب سے یہ رباعی کہوالی ہے

[*] مخدومی خان بہادر میر علی محمد صاحب شاد بھی مرزا صاحب کے ایک شاگرد ہیں۔ جن کا دم اس وقت بہت غنیمت ہے۔ ان کا ذکر خیر میں انشاء اللہ کرونگا۔ حقیر پر بیس برس سے شفقت فرماتے ہیں۔ خطوط و کتب مصنفہ اکثر ارسال فرماکر زیر بار احسان فرماتے رہتے ہیں۔ یہ بات کہ مرزا صاحب شاعران ہند سے اُس زمانہ میں بھی بہتر سمجھے جاتے تھے۔ واقعات انیس صفحہ ۶ سے بھی ظاہر ہے۔ جو نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال نے لکھکر بھیجی ہے اور واقعات انیس میں درج ہے۔ وہ بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ نواب صاحب موصوف بھی انہیں بزرگوں کے یادگار ہیں۔ مگر نئے خیال کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دکن ریویو میں جو انہوں نے بعض مضامین لکھے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے بزرگوں سے خیالات میں بہت مختلف اور دُور ہیں۔ میر علی محمد صاحب شاد ضرور میر انیس مرحوم کے کلام کو دل سے پسند فرماتے ہیں۔ باایں ہمہ مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے سرفرازنامہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء میں حقیر کو تحریر فرماتے ہیں۔ "کہ میں نے مرزا دبیر صاحب سے ۱۲۷۶ھ میں اصلاح لی ہے۔ اور میں اُن کو اپنا اور اس فن (شاعری) کا اُستاد جانتا ہوں۔ اور مرزا صاحب کو اعتبار کرنے کے میرے بزرگ اور کامل الفن صاحب اخلاق حمیدہ اور مومن کامل تھے۔ میں اُنکی مخالفت کیونکر کرتا اور کس مُنہ سے کرسکتا ہوں۔ ہاں ۲۵ برس ہوئے۔ کہ جناب مرزا صاحب کے بعض نادان دوستوں نے مجھ کو کچھ ایسا پریشان کردیا۔ کہ جوش جوانی میں من از خود رفتہ ہوگیا تو اے وطن میں بعض بیمار اکے میرے قلم سے ایسے نکلے کہ میں شرمندہ ہوں۔ اور اُنکی رُوح پرفتوح سے معافی کا خواستگار۔ اس کے بعد سے آج تک حاشا کہ میرے قلم و زبان سے کوئی حرف یا لفظ کنایۃً خواہ صراحتًا نکلا ہو"۔ یہ خط طولانی ہے۔ اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے۔ "کہ میں میر انیس صاحب کا طرز فطرتًا پسند کرتا ہوں"۔ اور اور بھی مضامین ہیں۔ جن کا اس موقع پر لکھنا ضرور نہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

این شهر ... + معموره خلق وحلم وعمل و داد دست

هر فرد لبشر دفتر خلق ست دبیر + این شه ز اخلاق عظیم آباد دست

باب ششم ۔ صدمات اواخر عمر

فصل ۱ صدمات و اواخر عمر

مرنے سے دو سال پہلے مرزا صاحب کو چند صدمہ روحانی بہت سخت پہنچے ۔

پہلا صدمہ ۔ محمد ہادی حسین عطارد تخلص نوجوان فرزند کا مرنا ۔ جو ۵ شعبان ۱۲۷۱ھ کو پیدا ہوئے تھے ۔ عین شباب کے عالم ۲۰ برس کی عمر میں جمادی الاوّل ۱۲۹۰ھ کی پانچویں کو یکایک تخمہ کر کے انتقال کر گئے ۔ یہ شاعر مبتدی تھے ۔ سلام کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے ۔ مولوی سید علی صاحب کامل عرف علی میاں مرحوم نے (جن سے مرزا صاحب کو خاص اس وجہ سے زیادہ محبّت تھی ۔ کہ اُن کی زوجہ دختر حکیم میر علی صاحب کو مرزا صاحب گویا اپنی بیٹی سمجھتے تھے ۔ حکیم میر علی صاحب مرزا صاحب کے ساتھ کے کھیلے ہوئے دوست تھے ۔ جن سے اور مرزا صاحب کے مدة العمر وہی محبت قائم رہی ۔ جو اُس زمانہ کے یکرنگ دوستوں میں ہوتی تھی ۔ اُنہیں کے سبب سے مولوی کامل مرحوم سے بھی محبّت تھی ۔ کہ یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کی حضوری سے اکثر فیضیاب ہوتے رہتے تھے) تاریخ وفات لاجواب فرمائی ۔ جو یہ ہے ۔

تاریخ وفات عطارد مصنفہ مولوی کامل مرحوم

روزگار ست گلشن نیرنگ	از جمال امید و صورت بیم
صبر کن صبر بر جفائے فلک	اے ترا طبع ورائے ہر دو سلیم
از علی اکبرِ حسینؑ شہید	یاد کن در عزائے نخل کریم
بود ہادی حسین رعناتر	یا کہ فرزند آں امام کظیم
آہ از مرگ نوجوانی او	پیش روئے پدر بحال سقیم
برگزیدت خدا برائے بلا	شکر کن شکر اے نبیہ حلیم

نورِ چشمِ ترا نہاد بسر ایزد از لطفِ سرمدی و بیم
غم ز رفتنش مخور کہ بعدِ رحیل او بہ کنج لحد نماند مقیم
ہاتفے گفتہ ست دوش بمن شد عطارد مکین بیت نعیم
۱۲۹۰ع

اس صدمۂ عظیم کے بعد مرزا صاحب کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ ادھر تو نورِ نظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ اُدھر جو وہ رات میں چند گھنٹہ سو رہتے تھے۔ وہ سونا بھی نورِ نظر کے داغ کی نذر ہو گیا۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا۔ مرزا صاحب پھر نمازِ شب اور وظائف پڑھتے تھے۔ اُس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے۔ تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ اکثر میں دن میں آٹھ نو بجے جب جاتا تھا۔ تو سوچ میں بیٹھا ہُوا دیکھا کرتا تھا۔ عرض کرتا۔ کیوں جناب کیا فکر فرمارہے ہیں۔ فرماتے۔ بھئی محمد رضا۔ رات کو تین بند کہے تھے۔ کچھ مصرع یاد رہ گئے۔ کچھ بھول گیا۔ اب بہتیرا سوچتا ہوں۔ نہ وہ مصرع یاد آتے ہیں۔ نہ ویسے دُوسرے مصرع خیال میں آتے ہیں۔ میں عرض کرتا تھا۔ کہ حضور نے بھائی محمد جعفر کو جگا دیا ہوتا وہ لکھ لیتے۔ تو آبدیدہ ہو کر فرماتے۔ کہ ہاں ایک (ہادی حسین) کو تو راتوں کو جگا جگا کر ہاتھوں سے کھو چکا۔ اب خدانخواستہ ان کو جگاؤں۔ تو ان سے بھی ہاتھ دھوؤں۔ اس صدمۂ عظیم کے بعد دُوسرا صدمہ رُوحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر مرحوم کے مرنے کا تھا۔ جو اٹھائیسویں صفر ۱۲۹۱ھ ہجری کو آخرت کا سفر کر گئے۔ یہ بڑے بھائی تھے۔ مگر مرزا صاحب کے تقدس و کمال کے سبب سے مرزا صاحب کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے چھوٹے۔ پہلے یہ بھی میر ضمیر صاحب کے شاگرد تھے۔ پھر اُنہیں کے حکم سے مرزا صاحب کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ان کے سو مرثئے سے اُوپر اور سیکڑوں سلام ہیں۔ یہ مشہور و مقبول مرثیہ ع ہمراہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ جو لولکشور صاحب کے مطبع میں مرزا صاحب کی جلدوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ بھی

انہیں نظیر مرحوم کا ہے۔ اسی طرح بہت سے ان کے مرثیے ایسے ہیں۔ جن کو ناواقف راز مرزا صاحب کا کلام سمجھتے ہیں۔ ان کے فرزند مرزا محمد عباس صاحب سفیر مرحوم تھے نظیر مرحوم کو توکیمیائی دہست تھی۔ اُس میں محو رہتے تھے۔ سفیر مرحوم کو خود مرزا صاحب نے عروض وغیرہ پڑھایا تھا۔ تیسرا صدمہ جوان دونوں صدموں سے بڑھ کر کاہش جان ہوا۔ وہ بروز دوشنبہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو قریب مغرب میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کا مرنا تھا۔ یہ شیر نیستان سخن کیا مرگیا۔ مرزا صاحب کی شاعری نہیں نہیں زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ اُس ماتم میں میر صاحب کے کمالات کا اکثر ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے۔ کہ اب نہ پڑھنے کا لطف ہے نہ کہنے کا مزہ ہے۔ اب ہمیں بھی چراغ سحری سمجھ لو۔ کوئی جھونکا آیا۔ اور خاموش ہو گئے (بقول جناب اوج مدظلہ)

تصنیف کا نہ لطف نہ خوانندگی کا لطف + وہ کیا اُٹھے کہ اُٹھ گیا سب زندگی کا لطف

مرزا صاحب نے خون جگر سے رنگین ایک تاریخ وصال میر صاحب کی لکھی۔ اور میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی تھی۔ مَیں اُس مجلس میں موجود تھا اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی۔ تو مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔ چند شعر یہاں لکھتا ہوں۔ یہ تاریخ اُن کے کلیات دفتر ماتم میں نہیں چھپی ہے۔ بلکہ اب سے ۳۲ سال پہلے شمس الضحیٰ کے بعد جو تتمہ مولوی بہادر حسین صاحب وحید نے لگایا ہے۔ اُس میں چھپی ہے۔

فصل ۲ تیسرا صدمہ وفات انیس مرحوم ہے

قطعۂ تاریخ وفات میر انیس مرحوم

قطعۂ تاریخ

(۱) دادخواہم یاغیاث المستغیثین الغیاث — ازکہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس

(۲) عبرةً للناظرین گردید افلاک وزمیں — دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس

---

(۱) خلاصہ یہ ہے کہ کوئی ایسا سخنور نہیں رہا جس سے دل بہلے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۲) ایضاً افلاک و زمین سراپا عبرت ہو گئے ہیں۔ آفتاب۔ ماہتاب ستارے کوئی چیز قابل دیکھنے کے نہیں رہا۔ ایسا دل ہزار ہے ۱۲ مؤلف

(۳) دادریغا عینی و دینی دو بازویم شکست | بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس

(۴) یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں | چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

(۵) الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوق نظم | شد حواس خمسہ ودہ عقل ششدر بے انیس

(۶) پوست کندہ موشگافان سخن گویند حیف | ہر سر مو بر رگ جاں نشتر بے انیس

(۷) اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما | رفتہ رفتہ رفت تا دامان محشر بے انیس

(۸) بسکہ در بزمم بسوز داغ بر بالائے داغ | نیست جز طاؤس دل پروانہ دیگر بے انیس

(۹) نیست ایام تماشائی چمن اکنوں کہ ہست | دانۂ شبنم سپند و غنچہ مجمر بے انیس

(۱۰) تازہ مضمون از نظم میفزود در ہر بحر شعر | چشمۂ چشمم شود ہم چشم کوثر بے انیس

(۱۱) سال تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

زبر و بینہ میں	زبر میں	زبر و بینہ میں	زبر میں
۵۷۲	۱۸۴	۴۱۴	۱۲۱

میزان ۱۲۹۱ سنہ بارہ سو اکیانوے ہجری نکلے

(۳) ایک ہی سال دو بازو ٹوٹ گئے اول سال میں نظیر برادر عینی اور آخر سال میں انیس برادر دینی گذر گئے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۴) ہم انکا یادگار ہو کر چند روز چند ہفتہ دنیا میں بچ گیا ایسا ہی ہوا کہ ۲۵ ذیقعدہ ۹۱ کو تاریخ پڑھی اور آٹھ ہفتہ و چند دن کے بعد ۳ محرم ۹۲ کو چل بسے +

(۵) اے ذوق و شوق تصنیف نظم لو اب رخصت ہو کہ اب ان صدموں سے نہ حواس درست ہیں نہ عقل + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۶) بات میں بات نکالنے والے شاعروں کا مرگ انیس میں یہ حال ہے کہ ان کو ہر بال کا سرا رگ جان پر نشتر معلوم ہوتا ہے + ۱۲ مولف۔

(۷) آنسو کو دامن سے قدرتی لگاؤ ہے کہ دامن پر گرتا ہے۔ مگر صدمہ کی حد ہو گئی۔ ہمارا آنسو دامن محشر تک پہنچیگا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۸) داغ پر داغ تھا کہ ہر دانۂ دل طاؤس کی طرح ہو گیا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۹) زمانہ میں چمن بھی تماشے کے قابل نہ رہا (جو تفریح کی جگہ ہے) اوس جلنے سے بکا قطرہ کا دانہ معلوم ہوتا ہے اور ہر غنچہ انگیٹھی کی صورت نظر آتا ہے۔ یہ تشبیہ اعلے ہے +
(بمعنی شبنم)

(۱۰) ہر بحر میں تازہ مضمون کہتے تھے اس لیے ان کے فراق میں میری آنکھ کا چشمہ بھی ہم چشم کوثر ہو جائے تو عجب نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۱) تاریخ زبر و بینہ میں ہے کہ طور سینا کے زبر و بینہ میں ۵۷۲ - بے کلیم اللہ کے حرف زبر میں ۱۸۴ - منبر بے کے زبر و بینہ میں ۴۱۴ - ۱۲

(۱۲) درسنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف　　گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

(۱۳) آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین　　طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۹۲۹　　۹۴۵

میزان

۱۸۷۴ عیسوی

زبر و بینہ کا حساب و قاعدہ

اب زبر و بینہ کا حساب بھی لکھ دُوں۔ کہ اس زمانے میں یہ حساب کتاب علوم مشرقی کے ساتھ ساتھ خواب و خیال ہوتا جاتا ہے۔ پھر لوگ وقت ضرورت ڈھونڈینگے تو مشکل سے ملیگا۔ واضح ہو۔ کہ زبر و بینہ دو لفظ ہیں۔ زبر اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر حرف کے نام کے اول حرف کا عدد لیا جائے۔ اور بیّنہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ ہر اسم حرف کے اول حرف کو چھوڑ کر باقی حروف کے عدد لیں۔ اور زبر و بینہ اُس کو کہتے ہیں۔ کہ شروع کے حرف کا عدد بھی لے لیں۔ اور باقی حروف کے عدد بھی لے لیں جیسے الف میں تین حروف ہیں۔ اَ لَ فَ۔ پس آ کا ایک عدد لیا۔ اس کو زبر کہینگے۔ ل ف کے ۳۰ و ۸۰ کل ۱۱۰ عدد لئے۔ اس کو بینہ کہینگے۔ اور تینوں حروف کے عدد ۱۱۱ لیلیں۔ تو اس کو زبر و بینہ کہینگے۔ اب جب کہ یہ حساب سمجھ میں آگیا۔ تو یہ بھی سُنئے۔ کہ میزان التاریخ میں جو فن تاریخ گوئی کی ایک معتبر کتاب عربی ہے۔ یہ لکھا ہے۔ کہ

یجوز فی المعمّٰی والتاریخ ان یوخذ اعداد الحروف بحساب الجمل وان یوخذ بطریق الزبر والبینات وان یوخذ اعداد بعض الکلمات بحساب الجمل۔ وبعضھا بالزبر و البینات وحینئذ یجب ان یشار الیھما بوجہ مّا مثلاً یلزم خلاف المقصود	معمّے و تاریخ میں یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب حرفوں کے عدد بحساب زبر لیں[۱] اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ سب کے عدد زبر و بینات میں لیں[۲]۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بعض کلمات کے اعداد زبر ہیں[۳]۔ اور بعض کے زبر و بینات میں لیں۔ مگر صورت آخر الذکر(۳)

میں یہ واجب و ضرور ہے۔ کہ شاعر کسی طرح اس کا اشارہ کردے۔ تاکہ پڑھنے والا خلاف مقصود عدد نہ جوڑے۔ اور غلطی سے بچے + پس اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے حسب ہدایت مذکورہ کوئی اشارہ بھی کیا ہے یا نہیں۔ مرزا صاحب کے بعض معتقد اور شاگرد کہتے ہیں۔ کہ وہ اشارہ اسی قدر کافی ہے۔ کہ طور سینا کے نیچے ۵۷۲ زبر بینہ بے کلیم اللہ کے نیچے ۱۸۴ زبر اور منبر بے کے تحت میں ۱۸۴ زبر و بینہ۔ اور انیس کے نیچے ۱۲۱ زبر۔ اور پھر سب کے مجموعی اعداد ۱۲۹۱ لکھ دئے۔ بس یہ اشارہ کافی ہے۔ مگر حقیر کہتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے ایک اور بھی نہایت صاف اشارہ فرمایا ہے (ذرا ناظرین اس مقام کو کہ علمی بحث ہے غور و انصاف سے ملاحظہ فرمائیں) وہ فرماتے ہیں

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف + گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

یعنی وفات انیس کے سبب سے طبیعت رنجیدہ و پریشان تھی۔ اور جو مادہ تاریخ ہے۔ وہ کسی قدر دقیق و پیچیدہ ہے۔ پس اب اُس کو تاریخ عیسوی میں صاف صاف بحساب زبر کہکر بیس عام فہم کئے دیتا ہوں۔ تمکو اگر سنہ ہجری میں شک ہے۔ تو سنہ عیسوی سے مطابق کرلو۔ کہ سنہ عیسوی جاننے والے اب ہندوستان میں بہت ہیں۔ اور سنہ عیسوی اس پورے شعر ہی سے بحساب زبر بلا کم و کاست نکلتے ہیں۔ ع

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامیں + طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

۱۸۷۴ء

یہ ۱۸۷۴ء سنہ ۱۲۹۱ھ کے مطابق ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیگا۔ کہ حقیر نے اپنے بالواسطہ اُستاد (دبیر مرحوم) کی طرفداری میں سنین عیسوی والے دو شعر خود گھڑ لئے ہیں۔ یہ پوری تاریخ جن میں یہ دو شعر بھی ہیں۔ آج سے قریباً ۲۲ برس پہلے کتاب شمس الضحےٰ کے ساتھ بطور ضمیمہ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپ کر شائع و مشتہر ہو چکی ہے +

(اشارہ صاف)

(رفع دخل) رفع دخل۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی صاحب یہ اعتراض فرمائیں۔ کہ یہ آخر الذکر

عیسوی تاریخ پورے شعر میں ہے۔ایک مصرع میں نہیں ہے۔اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں۔کہ جب تاریخ ایک مصرع سے کم ایک یا دو لفظ میں کہنا جائز ہے۔اور اسی طرح پورے ایک فقرہ میں یا آیت میں جائز ہے۔تو پورے شعر میں بھی جائز ہے۔ کیونکہ جس طرح نثر میں ایک فقرہ ہوتا ہے۔اُسی طرح نظم میں اُس کا قائم مقام عروضیوں کے نزدیک شعر ہے۔عروضی جب تقطیع کریگا۔پورے شعر کی۔بلکہ عربی میں تو کبھی کبھی ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ایک جزو مصرع اول کے اخیر میں اور دُوسرا مصرع ثانی کے اول میں لاتے ہیں۔یہاں تک جائز ہے۔جیسے شیخ سعدیؒ کا یہ شعر ہے۔ؔ

یا معشر الخلان قولوا۔للمعا ✢ فی لست تدری بالقلب المرجح

یہاں ایک لفظ معانی کے شاعر نے دو ٹکڑے کر دئے مصرع اول میں معا لائے۔ ثانی میں فی لائے۔اس میں کوئی کیا فی نکال سکتا ہے۔اس پر بھی اگر کسی کو اطمینان و تسکین نہ ہو۔اور یہ کہے۔کہ شیخ سعدیؒ ایرانی تھے عرب نہ تھے۔اُن کا کلام فارسی مستند ہے۔کلام عربی قابل سند نہیں۔(حالانکہ سعدیؒ کا کمال یہ ہے۔کہ اُن کا کلام عربی بھی سند مانا جاتا ہے)۔تو اب اُن اہل زبان بزرگ کا کلام سُنئے۔کہ بلاغت و فصاحت جن کی زبان سے نکلی ہے۔قرآن شریف جن کے گھر میں گویا زبان حال سے یہ آیت پڑھتا ہؤا اُترا ہے۔ اللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ[1] وہ بزرگوار محمدؐ و آل محمدؐ ہیں۔چنانچہ جناب امام حسینؑ کا یہ مشہور شعر لیجئے۔جو اُن جناب نے اپنے دوستوں کی یاد میں فرمایا تھا۔ؔ

لیتکم فی یوم عاشو ✢ را جمیعاً تنظرونی[2]

دیکھئے اس شعر میں بھی ایک لفظ عاشورا کے اُسی طرح دو ٹکڑے کر گئے دونوں مصرعوں

---

[1] ظاہر الفاظ کا خلاصہ یہ ہے۔کہ اللہ جانتا ہے۔کہ کس گھر میں رسالت ہونی چاہئے۔۱۲ مؤلف۔

[2] (اے میرے دوستو) کاش تم سب کے سب مجھے یوم عاشورا دیکھتے۔۱۲ مؤلف حقیر

میں لاتے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ایسے مصرع میں اتفاقیہ تاریخ نکالے۔ تو وہ جزو لفظ مصرع سے خارج ہونے کے سبب ایسی تاریخ نہ ہوگی۔ کہ جس کے معنی نکل سکیں۔ حالانکہ تاریخ کے لئے یہ ضرور ہے۔ کہ وہ مہمل الفاظ میں نہ ہو۔ اور جب ایک فقرہ میں تاریخ کہنا جائز ہے۔ خواہ وہ فقرہ کتنا ہی بڑا ہو۔ تو ایک شعر میں کیوں نہ جائز ہوگا۔ کہ فقرہ کا مقابل نظم میں ہمیشہ بیت سمجھا جاتا ہے نہ کہ مصرع ✦

اس تاریخ پر بعض اہلیوں کا اعتراض

مرزا صاحب کے اس تاریخ پڑھنے پر اُن لوگوں میں جو نہ سمجھے تھے۔ ایک ہلڑ مچ گیا۔ میر صاحب تو فرما گئے تھے ؎

سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس ✦ جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

مگر اُن کے طرفداروں اور شاگردوں نے اُن کے مرنے کے بعد بھی جھگڑہ کیا۔ اور گویا ثابت کر دیا۔ کہ ع بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا۔ پہلے کچھ مرزا صاحب نے سکوت فرمایا۔ جب اُن سے عرض کیا گیا۔ کہ لوگوں کے اعتراضوں کے باب میں کوئی رسالہ نکال دیجے۔ فرمایا۔ کہ ابھی ناواقفوں کو اور غوطے کھانے دو۔ جو واقف ہوگا۔ وہ اعتراض نہ کریگا۔

مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی کا تائید مرزا صاحب میں رسالہ لکھنا

علمائے اہل سنت وجماعت میں سے مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی ایک عالم متبحر* تھے۔ اُنہوں نے ایک لاجواب رسالہ مرزا صاحب کی تائید میں لکھا۔ پھر میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم اور اور لوگوں نے بھی اس کے جواز میں کئی رسالے لکھے مہینوں اس کے چرچے رہے۔ یہاں تک کہ اہل علم اور انصاف پسندوں نے مان لیا۔ کہ تاریخ صحیح ہے۔ اور یہ مصرع بلکہ تمام شعر آخر کا لاجواب ہے۔ یعنی آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین۔ طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس ✦

دنیا کی ترقیات اور تغیر

افسوس وہ کارواں بھی دور چلا گیا۔ وہ گرد کارواں بھی اب نظر نہیں آتی۔

* چند برس ہوئے کہ انتقال ہوا۔ [illegible] برس ہوئے ہیں بہت کتابیں ان بزرگوار کی تصنیف ہیں۔ اور بہت درسی کتابوں پر حاشیے [illegible] تمام [illegible] میں انتقال فرما گئے۔ بڑے ادیب و علامہ تھے ✦ ۲، مؤلف حقیر۔

مگر کبھی کبھی جب تیز ہوا چلتی ہے - یا آندھی آتی ہے تو اُس گرد کی بُو دماغوں میں کبھی کبھی آجاتی ہے - چنانچہ ہمارے کرم فرما میر مہدی حسن صاحب احسن سلمہ اللہ والبقاہ (۱) واقعات انیس کے صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ پر صرف ایک مصرع "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" لکھ کر لکھتے ہیں کہ پُوری تاریخ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں موجود ہے - اس مادہ میں مرزا صاحب مرحوم نے صنعت زبر و بینہ کا دعوے کیا ہے - لیکن گروہ شعرا کو اس میں کلام ہے - کیونکہ زبر و بینہ کے قاعدہ سے سن مقصود کا استخراج نہیں ہوتا - مرزا صاحب کے فاضل صاحبزادہ نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار میں تاویلاً تصحیح کی ہے - مگر واقفان فن کی تسلی نہیں ہوئی"۔

میں دوستانہ احسن صاحب سے عرض کرتا ہوں - کہ جب آپ واقعات انیس لکھنے بیٹھے تھے - تو کلیات مطبوعہ مرزا صاحب (دفتر ماتم) و شمس الضحٰے و تنقید آب حیات بھی (جو حالات مرزا صاحب میں برسوں کی تصنیف شدہ و مطبوعہ کتابیں ہیں) دیکھ لیتے - تو آپکو معلوم ہوجاتا - کہ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں یہ قطعہ تاریخ (قطعی طور پر) نہیں ہے ضمیمہ شمس الضحٰے میں پُورا قطعہ تاریخ چھپا ہے - اُس سے آپ یہ پُوری تاریخ لکھ دیتے - کہ پُوری بات سُن کر مصنف مزاج صحیح دماغ - ذی علم ناظر کتاب خود انصاف کرلیتا - کہ واقعی تاریخ نکلتی ہے اور مرزا صاحب کا دعوےٰ صحیح ہے یا غلط - اور یہ تاریخ مرزا صاحب کے کمال محبّت کی خبر دے رہی ہے - اور اس میں مرزا صاحب کی زبان سے میر صاحب کے کمالات کی مدح و ثنا ہے - ایک کامل دُوسرے کامل کی قدر خوب کرسکتا ہے - اور تاریخ دیکھنے سے ناظر ذیعلم کو معلوم ہوتا ہے - کہ اللہ اللہ ایک مدمقابل کی موت سے کیسا سخت صدمہ مرزا صاحب کے دل پر پہنچا ہے - اور کس قدر میر صاحب کا وقار اُن کے دل میں تھا - مگر افسوس نہ معلوم کیوں آپ نے قطعہ دبر بیہ فرماکر اور صرف ایک مصرع لکھ کر اس کا موقع ناظرین واقعات انیس کو نہیں دیا - اب میں نے ہندسی کی چندی کرکے ناظرین کو سمجھا دیا مجھے امید ہے کہ ناظرین - ذی علم منصف مزاج کی تسلی اس سے ہوجائیگی - اب جبکہ واقعات انیس کا

نمبر ۱

یہاں نام آگیا ہے۔ تو اور اُن بعض مضامین کی تنقید بھی ہیں کردوں۔ جو نیر صاحب کے
متعلق واقعات انیس میں آگئے ہیں۔ (۲) صفحہ ۸۰ تا ۸۲ پر لکھا ہے (کہ جس کا خلاصہ
یہ ہے)۔ (۱) کہ مرزا صاحب ملکہ کشور والدہ واجد علی شاہ مرحوم کی مجلس میں پڑھنے کو قبائے
درباری پر عمامہ باندھے ہوئے گئے۔ اور میر صاحب سادہ لباس سے گئے۔ (۲) اوّل
مرزا صاحب نے منبر پر جاکر حسب مقتضائے وقت بادشاہ اودھ کی مدح میں کچھ نظم پڑھی۔ شاہ
ممدوح سُن رہے تھے۔ (۳) پھر میر صاحب نے منبر پر جاکر یہ سلام میر مونس کا پڑھا ؎

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر + مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

(۴) یہ کہ میر انیس مرحوم نے گلہائے نظم خاندان رسالت کے مقدس مزاروں پر چڑھائے
ہیں۔ دولتمندوں کے دربار میں اُن کی نظموں کے گلدستے آرائش محفل نہیں ہوئے۔
اس تمام صغرے وکبرے کو آپ ملائیے گا۔ تو یہ نتیجہ نکلیگا۔ کہ مرزا صاحب لباس درباری
سے گئے۔ اور میر صاحب اپنی معمولی پوشاک سے گئے۔ اور اُن کی نظم کے گلدستہ بادشاہ
اودھ کی محفل کی زینت ہوئے۔ (برخلاف میر صاحب کے)۔ اور از بسکہ میر صاحب
اس قسم کی مدح وثنائے اُمرا کو بُرا سمجھتے تھے۔ انہوں نے اُسی وقت بادشاہ ممدوح کی
سماعت میں مرزا صاحب پر چوٹ کی۔ کہ ہائیں۔ غیر کی مدح کرتے ہو۔ اپنی ہوا کھوتے
ہو۔ ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم سلیمان ہو کر اپنی ہوا نہ کھوئینگے۔ نہ خود ڈوبینگے۔ نہ کمال کو
ڈبوئینگے۔ اگر یہ واقعات صحیح ہوتے۔ تو ضرور میر صاحب کے کمال اور مرزا صاحب کے
نقص پر دال ہوتے۔ مگر لکھنؤ میں بڈھے بڈھے آدمیوں سے تحقیق کرنے پر (جو
ایسی مجلسوں میں بار بار ہُوا کرتے تھے۔ اُن سے) معلوم ہُوا۔ کہ یہ سب محض غپ
(گپ) اور غلط ہے۔ مرزا صاحب مدۃ العمر کبھی کسی رئیس یا بادشاہ کے یہاں لباس
درباری سے نہیں گئے۔ مجلس عزا کا تو کیا ذکر ہے۔ کہ جہاں سوا آداب مجلس کے
اور کسی کا ادب کرنا گویا دہ گناہ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی غلط ہے۔ کہ مرزا صاحب ملکہ کشور

نمبر ۸
تاریخ شعرائے
مجلس میں
میر صاحب
مرزا صاحب
سلام پڑھنا

مرحومہ کے یہاں پڑھتے - وہاں ہمیشہ میر صاحب پڑھا کئے - مرزا صاحب کبھی اُس مجلس میں نہیں پڑھے - جس طرح ملکہ زمانی کے یہاں کبھی میر صاحب نہیں پڑھے - (۲) جب ملکہ کشور کے یہاں مرزا صاحب کبھی مجلس ہی میں نہیں پڑھے - تو بادشاہ کی مدح میں وہاں کچھ پڑھنا کیسا - (۳) یہ بھی خلاف عقل ہے - کہ میر صاحب ایسے متین و مہذب آدمی ہو کر مرزا صاحب پر بادشاہ کی حضوری میں سر منبر ایسا اعتراض اور طعن کریں - حالانکہ خود میر صاحب بادشاہ اودھ کی بیگم صاحب کی شان میں اپنے ایک مرثیہ کے مقطع میں فرما چکے تھے ع نواب مبارک محل وثانی مریم - اگر بادشاہ کی مدح غیر کی مدح ہے - تو بادشاہ بیگم کی مدح بدرجہ اولے مدح غیر اور غیر مستحسن ہوگی - (۴) دولتمندوں کی محفلوں کی آرائش میر صاحب کی نظم کے گلدستے ہوئے یا نہیں - اس کا جواب خود اسی واقعات انہیں سے نکل آیا ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے - صفحہ ۹۷ پر جو پھول میر احسن صاحب کی زبان سے جھڑے تھے (اگرچہ وہ مرزا صاحب کے حق میں کانٹے تھے) اور ہم اُن کو بھی چننے کو طیار تھے - مگر خود میر احسن صاحب نے صفحہ ۱۲۱ پر پہنچ کر تمام باغچہ کا سارا رنگ ہی بدل دیا - (گویا اُن کی کتاب زبان حال سے کہہ رہی ہے - آتش

ہم بھی گلشتہ تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے + او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے)

یعنی احسن صاحب لکھتے ہیں - کہ میر صاحب نے حیدر آباد دکن میں بر سر منبر یہ رباعیاں پڑھیں - جن میں مدح و دعائے نظام و وزیر دکن ہے :-

نظام دکن و وزیر نظام دکن کی مدح زبانی میر انیس صاحب

(رباعی ۱)

اللہ و رسولؐ حق کی امداد رہے ؛ سر سبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا - رئیس اعظم ایسے + یارب آباد حیدر آباد رہے

(رباعی ۲)

موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں + علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک و بندگان عالی + رحمت۔ رحمت پہ۔ نور پر نور ہے یاں

کہیا ایک آزاد طبیعت انصاف پسند ان رباعیوں کو سُن کر یہ نہیں کہیگا۔ کہ یہ امیروں کے بزم دولت کے گلدستہ نہ سہی پھول تو ہیں۔ مثل مشہور ہے۔ پھول نہیں پن کھڑی سہی۔ کیا شاہ اودھ کی (میر صاحب جن کی رعایا بھی تھے) مدح غیر کی مدح تھی۔ اور نظام دکن اور وزیر دکن کی مدح (معاذ اللہ) آل محمدؐ کی ثنا خوانی تھی۔ اور پھر مدح کے ساتھ دعا بھی۔ ع

وہ پھول ہے کہ رنگ بھی ہے جس میں بو بھی ہے۔ ناظرین مجھے آپ بھی معاف فرمائیں۔ اور میر صاحب کی رُوح سے بھی میں معافی کا خواستگار ہوں۔ کہ احسن صاحب نے خلاف واقع حالات (مرزا صاحب کی نسبت) لکھ کر مجھے اتنا کہنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میرے نزدیک جناب میر صاحب کی وضعداری میں کوئی کلام نہیں۔ نہ میرے اعتقاد میں اُن سے کوئی لغزش ہوئی۔ بات یہ ہے۔ کہ غیر کی مدح سے میر مونس مرحوم کی مراد دشمنان اہلبیت کی مدح سے ہے۔ شاہ اودھ یا نظام دکن و وزیر دکن اُن کے کلمہ گو و امت میں ہیں۔ یہ تو سب اپنے ہیں۔ غیر کب ہیں۔ پس نہ ان کی مدح قابل قدح ہے۔ نہ ان کے لئے دعا سے خیر کوئی بڑی بات ہے۔ جس طرح مصنوعی دستاویز میں کوئی نہ کوئی فقرہ یا لفظ گھبراہٹ میں ایسا درج ہو جاتا ہے۔ کہ جس کو دیکھ کر منصف مزاج حاکم اسکی مصنوعیت کا یقین کر لیتا ہے۔ اسی طرح بنائی ہوئی بات میں کوئی نہ کوئی ایسی نکل آتی ہے جس سے اُس کی بنوٹ اور قلعی کھُل جاتی ہے۔ یہ خدا کی شان ہے۔ یہی انجام اس مصنوعی و فرضی حکایت کا ہوا[*] مسدس مرثیہ کی نسبت صفحہ ۲۶ واقعات انیس

[*] مولوی امجد علی صاحب اشہری مرحوم نے بھی یہی حکایت بے اصل لکھدی ہے۔ مگر شاید ماخذ اُن کا بھی یہی ہے یا غالباً میر حسن صاحب کے کسی دوست سے لکھنؤ میں اُنھوں نے سُنا ہوگا وہی لکھدیا جس طرح حیات انیس میں اور واقعات غلط ہیں کہ جن میں سے بعض کی تردید واقعات انیس میں ہوئی ہے۔ اور بعض کی میں نے اس کتاب میں کی ہے۔ اُسی طرح یہ واقعہ بھی غلط ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سابق میں چار مصرعی (مربع) مرثئے کہے جاتے تھے۔ میر انیس صاحب نے اس (۶ مصرعی) کو رواج دیا۔ مگر یہ بھی خلاف واقع ہے۔ سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کہا۔ وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں۔ اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے جو ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول۔ یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انہیں کا تخلص ڈال کر مرزا سودا نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی ٭۔ جس کا مفصل ذکر آب حیات میں ہے۔ حق بات کہنا فرض ہے۔ حق پوشی فرض وقائع نگاری کے خلاف ہے۔ اس لئے کہتا ہوں۔ کہ دہلی و لکھنؤ والے اپنے اپنے مربی زبان و کمال ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر یہ خدا کی شان ہے۔ کہ اکثر باتوں کی درستی اور ایجاد کا سہرہ باہر والوں کے سر رہتا ہے۔ ولی دکنی کو دیکھئے۔ جو اردو کی شاعری کے بابا آدم ہیں۔ وہ دکن کے سکندر موجد طرز مسدس مرثیہ پنجاب کے میر ضمیر مرحوم (رزم و سراپا وغیرہ بلکہ) مرثیہ موجودہ کی طرز کے موجد پنگھوڑا ایک قصبہ کے رہنے والے۔ میر ضمیر اور میر خلیق بلکہ اکثر اہل لکھنؤ کے استاد میاں مصحفی امروہہ کے تھے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے۔ کہ اگر یہ لوگ دہلی و لکھنؤ میں نہ آتے۔ تو غالباً ان کو یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ اثر فیض دہلی و لکھنؤ کا ہر ایک کے ساتھ ضرور ہے۔ ایک مسدس مختصر سودا مرحوم کے کلیات میں بھی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی۔ مگر وہ کتاب میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے۔ مگر عام شاعر تھے۔ اور سکندر خاص مرثیہ گو مشہور ہیں۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کے ایجاد کا سہرہ میرے نزدیک سکندر کے سر ہے۔ یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے۔ کہ دو معاصروں میں سے

پہلا مسدس مرثیہ سکندر کا

مسدس مختصر سودا و مقبولیت مرثیہ سکندر اور دونوں کے مرثیوں میں فرق

٭ میر ضاحک میر حسن کے والد ماجد میر انیس مرحوم کے پردادا ہیں۔ جن میں اور میر صاحب میں غالباً۔۔ اسی برس کے قریب قریب فاصلہ ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ سو برس پہلے کی بات کو سو برس بعد کی ایجاد بتایا جاتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

اوّل کس نے کہا۔ تو سکندر و سودا دونوں کو موجد ماننا چاہئے ✤ (۳) صفحہ ۱۴ پر میر احسن صاحب نے لکھا ہے (جس کا خلاصہ یہ ہے) ۔ کہ "ایک سلام میر صاحب نے پڑھا جس کے شعر مندرجہ تحت کی عالمگیر شہرت ہوئی ۔

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے ✤ چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

اس سلام (میر صاحب) کی زمین مرزا صاحب کو پسند آئی ۔ انہوں نے بھی سلام کہا۔ کسی مجلس میں پڑھے ۔ بے فکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا۔ معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا ۔ رشک فن داخل خواص شعرا ہے ۔ خصوصاً ایسا شخص جس کی طبیعت تقابل پسند نہ ہو ۔ پھر تو دونوں جانب سے طبع آزمائیاں ہوگئیں ۔ بلند پروازیوں نے زمین شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ۔ دونوں صاحبوں کے سلام کلیات مطبوعہ میں موجود ہیں ۔ پھر اہل لکھنؤ نے اصلاح کی کوشش کی ۔ میر صاحب و مرزا صاحب کی طبیعتیں بغض و نفسانیت سے پاک تھیں ۔ صفائی ہوگئی" ✤

اب میں میر احسن صاحب سے کہتا ہوں ۔ بقول سحر ۔

چلے تھے تو مُڑ کر ادھر دیکھ لیتے ✤ کہ ہم آدمی بھی اک نظر دیکھ لیتے

مہربان! کم سے کم آپ کلیات مطبوعہ دبیر تو ایک نظر دیکھ لیتے ۔ دفتر ماتم کی بیسوں جلدیں بندہ نے چھان ڈالیں ۔ یہ سلام نہیں ملا ۔ اور ملے تو کیونکر ۔ مرزا دبیر مرحوم نے کوئی سلام ہی اس زمین میں نہیں فرمایا ۔ جھگڑا کبھی انیسیوں اور دبیریوں میں ضرور ہوا تھا ۔ مگر یہ محض غلط ہے ۔ کہ مرزا صاحب مرحوم نے جواب میں سلام کہا تھا ۔ اصل واقعہ جہاں تک میرے علم و یاد میں ہے ۔ اور جناب شیخ محمد جان صاحب عروج فیض آبادی نے اپنی کتاب "ترديد موازنہ (مولوی شبلی صاحب)" میں لکھا ہے یہ ہے ۔ کہ جناب میر صاحب نے یہ سلام فرمایا تھا ۔

مصلحِ رشتیوں کو زمینوں کو اس سلام پر انیسیوں و دبیریوں میں جھگڑے

[illegible]

سدا ہے فکر ترقی مآل بینوں کو + ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس پر اور شعرا نے سلام کہے۔ مرزا اوج صاحب قبلہ نے بھی سلام کہا۔ اُس کے بعد ۲۶ ویں کی مجلس میں جو آغا میر کی ڈیوڑھی پر نواب میر محمد حسین صاحب مرحوم کے یہاں ہُوا کرتی تھی۔ میر نواب صاحب مونس مرحوم نے اسی زمین میں ایک سلام نواب ممتاز الدولہ مرحوم (شاہزادہ اودھ) کو مخاطب کر کے پڑھا۔ کہ وہ بھی مجلس میں موجود تھے۔ اُس سلام میں یہ طنزیہ شعر بھی تھا ؎

بھلا تردد بے جا سے اُن میں کیا حاصل + اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

اور شاید یہ شعر بھی تھا ؎

نیا مزہ ہے کہ مضمون تو دستیاب نہیں + مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

نواب ممتاز الدولہ کو جو مرزا صاحب کے شاگرد تھے سخت ملال ہُوا۔ اور مجلس میں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر تو انیسیوں اور دبیریوں میں (تمام شہر میں) شور مچ گیا۔ دبیریوں نے بعض متقدمین کی غزلیں اور شاید ایک دو سلام بھی دکھائے۔ کہ پہلے بھی لوگ اس زمین میں کہہ چکے ہیں۔ مشیر مرحوم بھی زندہ تھے۔ اُنہوں نے بھی مرزا صاحب کی شاگردی کے جوش میں بہت کچھ کہا۔ چنانچہ یہ ایک شعر اُسی زمانہ کا یاد ہے ؎

مشیر کا دبیر (اپنے اُستاد) کی طرفداری کرنا

اساتذہ کی ہیں غزلیں۔ سلام بھی اکثر + نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

نظیر برادر دبیر مرحوم نے ایک سلام کے مقطع میں کہا ؎

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیر + کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں اور بھی ہے

سب سے زیادہ انیسیوں کو اس شعر پر فخر و ناز تھا۔ ؎

میر تقی میر کا شعر

یہ جھریاں نہیں ہاتوں پہ ضعف پیری نے + چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

دبیریوں نے میر تقی میر کے دیوان میں یہ شعر دکھا دیا۔ ؎

ہیں ضعف سے جھُریاں بدن پر + پیری جامہ کو چُن رہی ہے

اور یہ کہا۔ کہ دیکھئے۔ خدائے سخن میر کس قدر مختصر لفظوں میں ۷۰ برس پہلے اور عمدہ بندش میں کہ گیا ہے۔ کسی صاحب نے مطلع پر اعتراض جمایا۔ کہ دعوے تو یہ فرمایا ہے۔ کہ فکر ترقی ہے۔ اور بجائے ترقی کے دوسرے مصرع میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ع ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو۔ یہ ترقی کا پورا پورا ثبوت کب ہوا۔ یوں فرماتے۔ تو ترقی ثابت ہوتی۔ ع ملی ہے عرش پہ معراج ان زمینوں کو۔ غرض چند روز کی دبیریوں اور انیسیوں کی بحثوں میں پالی کا لطف آیا کیا۔ اور اُسی میں کچھ علم و ادب کی معلومات بھی بڑھتی رہتی تھی۔ مشیر مرحوم سے جو چوٹیں کی ہیں۔ وہ اشعار مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں ہیں۔ اور مَیں اُن کو اس کتاب میں لکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ ناظرین کتاب میں سے بعض کی دل شکنی ہو۔ (بقول انیس مرحوم) ؎

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم + انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

صفائی

المختصر اُدھر میر صاحب میر مونس مرحوم پر اور ادھر مرزا صاحب مشیر مغفور پر بہت خفا ہوئے اور میر مونس مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کی حضوری میں آکر عذر خواہ ہوئے۔ اور وہ گرد کدورت دلوں سے دھو گئی۔ واقعی طبیعتیں میر صاحب اور مرزا صاحب کی (بقول احسن صاحب) بغض و حسد سے پاک تھیں۔ اور زیادہ صفائی اور آئینہ قلب پر جلا ہو گئی۔

فصل ۷ تنقیہ نمبر ۳ وثیقہ نجف و امام باڑہ میر باقر صاحب مرحوم

(۳) صفحہ ۱۱۲ سے صفحہ ۱۱۴ تک میر احسن صاحب نے نواب مبارک محل کے للٰہ ماہوار وثیقہ کا جو میر انیس مرحوم کو ملتا تھا ذکر لکھا ہے۔ کہ متولی صاحب نے پہلے مجلس کا ذکر نہ کیا۔ عین وقت پر جب مجلس جمع تھی۔ سواری بھیجی۔ تو میر صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے وثیقہ بند کر دیا۔ میر صاحب نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ جب متولی صاحب نے مدت کے بعد معافی مانگی۔ تو میر صاحب نے فرمایا۔ وہ وثیقہ چڑھا ہوا بھیج دیں۔ اس کو انہوں نے منظور نہ کیا۔ میر صاحب کے بعد اُن کے جانشین میر نفیس مرحوم

نے بھی یہی جواب دیا۔ آخر کچھ نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کو مشرح لکھ کر تحریر کیا ہے۔
کہ" البتہ مرزا محمد جعفر صاحب اوج نے اپنے والد کے بعد اپنے موروثی حقوق امام باڑہ میر باقر سوداگر سے جو کچھ معین تھے بچارہ جوئی عدالت وصول کر لئے۔ اور استحقاق دکھا دیا"۔

جس طرح میں نے مختصر کر کے واقعات انیس سے یہ حال لکھا ہے۔ اُسی طرح ردّ واقعات انیس مؤلفہ جناب سردار مرزا صاحب سلمہ اللہ سے واقعہ مختصر لکھتا ہوں (کہ واقعات انیس و ردّ واقعات انیس ایک ہی مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپی ہیں اور طالب مشتاق کو مل سکتی ہیں) وُہی حکیم بندہ مہدی صاحب متولی نجف و وثیقہ نواب مبارک محل میر صاحب اور مرزا صاحب کے انتقال کے بعد نواب مصطفےٰ حسین خاں صاحب کے ساتھ جناب اوج مدظلہ کی خدمت میں ایک مخمس کہکر لائے۔ شیرینی رکھی شاگرد ہوئے۔ شیرینی شاگردوں اور دوستوں میں بٹی۔ پھر اُنھوں نے اپنے امام باڑہ میں مجلس کی۔ پہلے خود وہی مخمس پڑھا۔ پھر مرزا اوج صاحب قبلہ کو پڑھوایا۔ بعد مجلس کچھ نذر کرنا چاہا۔ تو مرزا صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ میں نے حال کے رؤسائے لکھنؤ سے کچھ لینا اپنے نفس پر حرام کر لیا ہے۔ چنانچہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والئے محمود آباد کے مرسلہ دو شالوں کا اور امیر محل مرحومہ کے پیشکش کا پھیر دینا بیان کر دیا۔ حکیم صاحب اُس وقت چُپ ہو گئے۔ پھر چند روز بعد یہ ذکر نکالا۔ کہ میں چاہتا ہوں۔ کہ نجف کی تنخواہ (وہی للعہ ماہوار جو میر انیس مرحوم کو ملتے تھے) آپکے نام جاری کی جائے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ میں آپکے شاگرد ہونیکا مطلب پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس تنخواہ میں سے ایک حبہ لینا میں اپنے نفس پر حرام سمجھتا ہوں اُنھوں نے فرمایا۔ کہ آپکے صاحبزادے کے نام پر وہ تنخواہ جاری ہو جائے۔ مرزا

حکیم بندہ مہدی صاحب متولی وثیقہ نجف کا شاگرد جناب اوج ہونا

مرزا اوج صاحب کی وضعداری

بعد اولاد کو اختیار رہے۔ یہ جناب مرزا اوج قبلہ کی وضعداری کا واقعی حال تھا جو عرض کیا۔ اب یہ بھی سُن لیجے۔ کہ نجف مبارک اور حسین آباد مبارک کے وثیقوں کی بحالی و برطرفی کا اختیار وہاں کے متولیوں کو ہے۔ چنانچہ جناب مرزا دبیر مرحوم اور اُن کے بعد جناب مرزا اوج قبلہ کو سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد سے ملتے تھے۔ گویا پشتینی وثیقہ تھا۔ مگر درباری گول ٹوپی پہن کر پڑھنے اور عشرہ محرم میں لکھنؤ سے باہر نہ جانے کی شرط و بحث پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے اُس کو ترک فرما دیا۔ اور نہیں پڑھے۔ ان وقفوں اور امام باڑہ میر باقر تاجر مرحوم کے وقف میں یہ فرق ہے۔ کہ وہاں متولی کو موقوفی و بحالی کا (مثل حسین آباد و نجف) مرزا اوج صاحب کی نسبت اختیار نہیں ہے۔ آخر الذکر وقف کی اصلیت قصہ طلب حسب ذیل ہے۔ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ چار آدمی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ جن میں مرتے مرتے محبت قائم رہی۔ خدا کی شان کہ ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل و یکتا ہوا۔ (۱) حکیم مرزا محمد علی صاحب (۲) میر باقر تاجر صاحب (۳) مرزا دبیر صاحب (۴) میر علی صاحب حکیم +

ایک دن ملکہ زمانیہ (ملکہ زمانی) نے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ میں اپنے شوہر نصیر الدین حیدر (شاہ دوم اودھ) کی قبر پر (جو لکھنؤ پار کی کربلا میں ہے) ایک مرصع تاج طلائی اور طلائی سینی مع اگر سوز و شمشیر و سپر وغیرہ بنوا کر چڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ طیار فرما دیجئے۔ مرزا صاحب نے صاف جواب دے دیا۔ کہ مجھے ان باتوں میں سلیقہ نہیں۔ مَیں معذور ہوں۔ رات کو جلسہ احباب میں حسب معمول میر باقر صاحب تاجر مرحوم مرزا صاحب کے مکان پر تھے۔ کہ یہ ذکر مرزا صاحب نے کیا۔ میر باقر صاحب مرحوم نے کہا۔ کہ آپ نے میرا نام کیوں نہ لے دیا۔ مَیں سب اسباب طیار کر سکتا ہوں۔ مرزا صاحب بولے۔ اب سہی۔ صبح کو دونوں صاحب بیگم صاحبہ کے ہاں پہنچے۔ مرزا صاحب نے میر صاحب موصوف کو ملکہ زمانیہ سے کہکر اُس اسباب کی طیاری پر مقرر کرا دیا۔ جب وہ سب چیزیں قریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں طیار ہو گئیں۔ (جو

وثیقہ حسین آباد
و مرزا اوج صاحب

مفصل و واقعی
وقف حسینیہ
و امام باڑہ
میر باقر تاجر
کی اصلیت

روپیہ پہلے ہی [illegible] کو [illegible] چکا تھا) تو میر صاحب کے وہ سب اسباب اور
اُس کے ساتھ ہی بچت کے بیس[20] ہزار کے نوٹ بیگم صاحب کے روبرو پیش کئے۔ اور کہدیا
کہ یہ مقدار زر فائدہ کی ہے۔ آپ لیں یا مجھے بحل کریں۔ اُنھوں نے کہا۔ یہ زر نفع آپ کا
حق ہے۔ اس میں بحل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بایں ہمہ مَیں بحل کرتی ہُوں۔ میر باقر مرحوم
وہ نوٹ لئے ہُوئے مرزا صاحب کے پاس آئے۔ اور وہ نوٹ مرزا صاحب کو دیکر کہا۔ کہ
اس میں نصف حق میرا اور نصف آپ کا حق سعی ہے۔ مرزا صاحب ہنسے۔ اور کہا۔ یہ آپ
کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا مَیں اور آپ جدا ہیں؟ اور باوصف اصرار کے وہ دس ہزار
روپیہ کے نوٹ نہیں لئے۔ میر باقر صاحب مرحوم وہ سب نوٹ لے گئے۔ مگر ایک عرصہ
کے بعد اُنھوں نے جب کچھ مواضع زر نفع تجارت سے خرید سے۔ اور وقف کی نوبت
آئی۔ تو اُسی دس ہزار روپیہ کی رعایت سے مرزا دبیر مرحوم کا نام نسلاً بعد نسلٍ شریک کیا۔
اور اُن کے امام باڑہ میں مرزا صاحب (کہ بعد میر ضمیر مرحوم کے حسین آباد میں مقرر ہو جانے
کے پڑھنے تھے) پڑھا کئے۔ اور میر باقر تاجر مرحوم کے انتقال کے بعد زمانہ تولیت جناب
ممتاز العلما مجتہد سید تقی صاحب طاب ثراہ میں بھی وہی عملدرآمد رہا۔ اور آج تک وہی
ہے۔ جب کبھی کسی متولی صاحب نے شرائط وقف و عملدرآمد قدیم کے خلاف کرنا چاہا۔
عدالت کی نوبت پہنچی۔ اور بحمد اللہ عدالت ابتدائی سے عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) تک
بمصداق الحق یعلوا ولا یعلیٰ[*] وہی حق موروثی قائم رہا۔ اس پچیسویں[25] رجب کی سالانہ مجلس
میں مرزا دبیر مرحوم بڑے مجمع میں پڑھا کرتے تھے۔ اب جناب مرزا اوج صاحب قبلہ پڑھتے
ہیں۔ دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ باقی ماہواری مجلسیں معمولی ہوتی ہیں۔ اب غالباً
میر احسن صاحب اور ناظرین سمجھ گئے ہونگے۔ کہ وقف حسین آباد و نجف اور اس وقف
میں کیا فرق ہے۔ وہاں ہر شخص کو وہی کرنا پڑتا۔ جو جناب میر انیس و میر نفیس مرحومین اور

---

[*] حق ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ پست نہیں ہوتا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب مرزا اوج مدظلہ نے کیا۔ (یعنی سکوت)۔ اور یہاں وقف حسینیہ میر باقر تاجر مرحوم میں یہی روش اختیار کرنا مناسب تھا۔ جو مرزا اوج صاحب نے فرمائی۔ اور اس وقف میں متولی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کی اولاد کو موقوف کر دے۔ بظاہر یہ ذکر اس کتاب سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ مگر احسن صاحب نے واقعات انیس میں اس کی چھیڑ کی۔ میں نے اصلیت دکھا دی۔ تاکہ ناظرین ناواقف نہ رہیں۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست + وگر خاموش بنشینم گناہ ست

(۵) واقعات انیس کے صفحہ ۵۶ پر لکھا ہے۔ کہ "میر انیس (مرحوم) کی شاعری نے جب لکھنؤ میں نشو و نما کیا۔ تو اُس وقت ناسخ مرحوم کی شاعری کا آفتاب نصف النہار ترقی پر تھا۔ مرزا دبیر مرحوم مضمون آفرینیوں میں امام وقت کی تقلید کر رہے تھے۔ انداز مقبول سے طبیعتیں مانوس ہو رہی تھیں۔ اور زمانے کی نظریں اسی رنگ میں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا + طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس کے بعد یہ بیان کیا ہے۔ کہ میر صاحب کا رنگ خاص اور اُس سے الگ تھا۔ اب میں کہتا ہوں۔ کہ نہ میں میر صاحب کے کمالات کا منکر ہوں۔ نہ اُن کی تردید کرنا چاہتا ہوں ہاں اتنا عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کا کلام مختلف رنگوں میں ہے۔ اور اُن کا یہ دعوےٰ ہے ع ہر طرز میں جو خوب کہے خوب ہے وہ۔ بالکل بجا ہے۔ اس لئے مرزا صاحب کو نہ کوئی ناسخ مرحوم کا مقلد کہہ سکتا ہے نہ آتش مغفور کا۔ اُن کی ابتدائی شاعری کا زمانہ میر تقی مرحوم کے پانچ سات برس بعد کا ہے۔ اور عروج کا وہی زمانہ ہے۔ جو ناسخ مرحوم کی شہرت کا ہے۔ جیسا کہ میں اُوپر مفصل لکھ چکا ہوں۔ اور مرزا صاحب خود مجتہد ہیں۔ دُوسرے اُن کے مقلد ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

دزدان مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید
تو مجتہد نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

جب مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا* ۔ اُس زمانہ میں بات میں سے بات نکالنے کو اصل شاعری سمجھا جاتا تھا۔ کوری رعایت لفظی پر لوگ تعریفوں کے پُل نہیں باندھ دیتے تھے۔ بقول شخصے ع دریا کے ساتھ جب مگر آیا اُچھل پڑے۔ البتہ بقول میر احسن صاحب جناب میر انیس مرحوم کی شہرت اور لکھنؤ میں آنے کا زمانہ عہد امجد علی شاہ مرحوم ہے۔ جو سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ (ناسخ مرحوم سنہ ۱۲۵۴ھ میں راہی جنت ہو چکے تھے)۔ اور اُس زمانہ میں لکھنؤ میں عموماً اور شاگردانِ شیخ ناسخ میں خصوصاً صنعت مراعات النظیر (رعایت لفظی) کا بڑا زور شور تھا۔ اور کانوں میں یہ صدائیں گونج رہی تھیں :۔

(۱) مرغِ دل کو توڑیگی بلّی اگر دروازے کی۔ رخنت تن کو کتریگا چوہا تمہاری ناک کا۔

(۲) بیر لویں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں۔

(۳) مہندی نے شعلہ پاؤں تمہارا بنا دیا۔ کیا گرم ہے کہ بوٹے کو ہولا بنا دیا۔

(۴) عید بھی وصل سے چلی خالی۔ کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں۔

(۵) ساون میں بھی وعدہ کبھی پورا نہیں کرتے۔ باتوں میں جھلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔

(۶) بھیڑیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر۔

بعض شعرا نے اس رعایت لفظی کا پردہ ایسا باریک کر دیا تھا۔ کہ وہ ہوا کی طرح چھن کر ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئی تھی۔ مرزا صاحب مرحوم اُس آندھی میں بھی اپنے رنگ پر قائم رہے۔ مگر جناب میر صاحب مرحوم نے ان معاصرین مجتہدین نظم میں سے غالباً کسی کی تقلید پر کمر باندھی۔ اور رعایت لفظی کی صنعت کو اس طرح برتا :۔

*یعنی سنہ ۱۲۳۰ھ میں یا اس کے قریب قریب مرزا صاحب کی شاعری شروع ہوئی۔ اور سنہ ۱۲۲۶ھ میں ۴ برس پہلے میر تقی میر انتقال فرما چکے تھے۔ انشاء مصحفی کا بازار شاعری گرم تھا۔ اور میر کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱) منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا۔

(۲) خال رخ دیکھا تو گھر خالقہ لگ جائیگا۔

(۳) کہیں کوثر کے تو چھنٹوں میں نہیں آیا ہے۔

(۴) چولیں ہوئیں ڈھیلی درِ خیبر کی ہمیں سے۔

طرفداران جناب میر صاحب مجھے معاف فرمائیں۔ میں مضمون آفرینی کی طرح رعایت لفظی کو بھی قابل مدح سمجھتا ہوں۔ مگرع ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے۔ میر احسن صاحب کے منہ سے میرے ممدوح کے حق میں جو پھول جھڑے تھے۔ اُسی مصالح سے یہ پھل جھڑی طیار ہو گئی۔ جس کا تماشا آپ دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ میں میر صاحب مرحوم کو اُن کے رنگ میں کامل سمجھتا ہوں۔ اور رعایت لفظی کو بھی ایک صنعت (فی حدہ) سمجھتا ہوں۔ اور اُبھری ہوئی رعایت نہ ہو۔ تو کلام میں مزہ آجاتا ہے۔ اور جن لوگوں سے مثل میرے ایسا رنگین کلام نہیں نظم ہوسکتا۔ اُن کا اور اپنا قصور طبیعت سمجھتا ہوں۔ اور تو کیا کہوں ۔

(۶) صفحہ ۹۱ پر جناب غالب مرحوم کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "کہ انہوں نے تین بند مرثیہ کے کہکر میر صاحب (انیس مرحوم) کے پاس اصلاح کو روانہ کئے اور اُس کے ساتھ لکھا۔ کہ اِمتثالِ امر سے مجبور تھا۔ مرثیہ کہا گو ہے۔ واسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ یہ آپ ہی کا کام ہے" میں اس کی تنقید اس موقع پر اس لئے نہیں کرتا۔ کہ ایک دوسرے مقام پر میں نے تذکرہ جلوۂ خضر و سرور ریاض سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ مرزا غالب مرحوم مرثیہ گوئی کو فقط دبیر کا حق فرمایا کرتے تھے۔ اور عود ہندی کے ایک رقعہ سے وہ اعتراضات بھی لکھ دئے ہیں۔ جو غالب مرحوم نے میر صاحب کے اس بیت پر کئے ہیں ؎

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا ۔ برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

نا ... صاحب اپنی ... صفحہ ۱۱۲ ... شاعری کیسا ...

تنقید نمبر ۶ غالب نہیں

غالب نہیں ... سے شاگرد تھے ... معترض

(اور پھر اپنی سمجھ کے موافق میر صاحب کی طرف سے جواب بھی دے دئے ہیں) جس سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں۔ کہ غالب شاگرد تھے یا معترض تھے ۔

میر مہدی حسن صاحب احسن کے کلام کی جو تنقید دل کھول کر میں نے کی ہے۔ اس کا حق مجھے یوں حاصل ہوا۔ کہ اُن کے بزرگ محض طرفداران میر صاحب نہیں ہیں۔ بلکہ مرزا صاحب سے بھی اُن کا ویسا ہی تعلق ہے۔ جیسا کہ خود انہوں نے واقعات انیس کے صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر فخریہ لکھا ہے۔ کہ والد ماجد ہر مہینے کی سولھویں تاریخ مجلس کیا کرتے تھے۔ اُس میں عجیب قسم کا متضاد مجمع ہوا کرتا تھا۔ وہ نظارہ دیکھنے کو لوگ مشتاق ہو کر آتے تھے۔ یعنی میر انیس و مرزا دبیر و میر عشق مرحومین مع اپنے خاندانی ممبروں کے تشریف لاتے تھے۔ اور راقم کے بزرگوں کے تعلقات ان سب بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے تھے۔ اب مجھ سے سُنئے۔ وہ تعلقات کیا تھے۔ احسن صاحب کے والد مرحوم تو خالص میر انیس مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔ اور اُن کے حقیقی نانا سید آغا حسن صاحب ازل مغفور غزل میں میر وزیر علی صاحب صبا مرحوم کے شاگرد تھے۔ اور مرثیوں پر اُنھوں نے اصلاح میر صاحب و مرزا صاحب و آغا صاحب (میر عشق صاحب مرحوم) سے الگ الگ لی تھی۔ اور کمال یہ کہ ہر ایک اُستاد سے اجازت لیکر ایک کے بعد دوسرے کو مرثیہ دکھائے تھے۔ کچھ مرثیے میر صاحب کو دکھائے۔ پھر اُن سے اجازت مانگی۔ کہ حکم ہو۔ تو کچھ اور مرثئے مرزا صاحب کو بھی دکھلاؤں۔ اور ہر ایک نیک نفس پاک طینت نے نہایت خوشی سے اجازت بھی دے دی تھی۔ یہ وجہ تھی۔ جو سب خاندانوں کے سر گروہ و ممبر تشریف لاتے تھے۔ اور سُنا ہے۔ کہ وہ مرثئے میر احسن صاحب کے والد مرحوم پڑھتے تھے۔ اور صاف کہ دیتے تھے۔ کہ یہ مرثیہ میر صاحب کا یہ مرزا صاحب کا یہ آغا صاحب کا اصلاحی ہے۔ لکھنؤ میں یہ

وجہ تنقید واقعات انیس و تعلقات بزرگان میر احسن مرزا صاحب سے بھی

وَمیر حسین جان صاحب ساکن محمود نگر نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اور میر آغا حسن صاحب
ازل مرحوم کے حقیقی بڑے بھائی میر آغا حیدر صاحب مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد رشید
اور ہم آواز بھی تھے۔ تمام ملک میں ایک وہی بزرگوار تھے۔ جو مرزا صاحب کا طرز
پڑھتے تھے۔ جیسا اُوپر ذکر ہوُا۔ اور آواز زبان حال سے تصدیق کرتی تھی۔ کہ بیشک
مرزا صاحب کا یہ اصلی طرز ہے۔ جو تیسرا نہیں پڑھ سکتا۔ اور آغا حسن صاحب مرحوم
کے خسر حکیم نواب مرزا صاحب شوق مرحوم (جو زبان کے لحاظ سے قابل رشک شاعر
تھے) بھی مرزا صاحب کے گہرے دوست تھے۔ کبھی کبھی رات کے جلسہ میں مرزا صاحب
کے یہاں آتے تھے۔ اور مرزا صاحب کے کمالات کے دل سے مدّاح تھے پس ان
حقوق وتعلقات کی بنا پر مَیں میر احسن صاحب سے دوستانہ کہتا ہوں۔ کہ احسن کما
احسن اللہ الیک الآیہ۔ اور اس کتاب میں شکایت بھی کہیں ہے تو دوستانہ ہے۔ ؎
بے محبّت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے + بے شکایت نہیں اے ذوق محبّت کے مزے

اب مَیں مختصر حال وفات جناب مرزا صاحب مرحوم کا لکھتا
ہُوں ۔ میر انیس مرحوم کے مرنے کے بعد مرزا صاحب مرحوم تین مہینے اور ایک
دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے۔ سیّدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسۂ عظیم آباد
کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرہ محرم میں ہر
روز مجلس جناب اوج مدظلہ پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے۔
کہ علیل تھے۔ کچھ سادات ومومنین دُور دُور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ
محرم کی مجلسوں کو چھوڑ کر محض مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخری نویں محرم کو
بعض مومنین نے مرزا صاحب مرحوم سے افسوس کے لہجہ میں عرض کیا۔ کہ ہم حضور کے

فصل ۱۰
حال انتقال
دبیر مرحوم

نویں محرم ۱۲۹۲ھ
کی آخری مجلس
عظیم آباد میں
پڑھنا

۔ تو احسن نیکی کر جیسے خدا نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے۔ کہ ایسے سخن شناس سخنور سخن فہم سخن سنج خاندان میں اسکو خدا نے پیدا کیا اور

[illegible] ایڈیشن ہٰذا واقعات انیس میں کچھ حالات کی اصلاح کر دو نہ شرطیکہ مناسب ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سُننے کو آنے تھے۔ اپنے گھر کی مجلسیں بھی چھوڑیں۔ اور حضور کو نہ سُنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ حضور علیل ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہ انشاءاللہ آج مَیں پڑھونگا۔ جتنا پڑھا جائیگا۔ خدا جانے پھر عشرہ محرم نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیاں پڑھ کر چند بند بین کے پڑھے۔ اللہ اللہ مرزا صاحب مرحوم کا بے تصنع حضور قلب سے پڑھنا۔ ایسی رقت ہوئی۔ کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔ مرزا صاحب منبر پر رو یا کئے۔ طاقت خود سے اُترنے کی نہ تھی۔ بڑی دیر کے بعد جب جوش رقت کم ہُوا۔ لوگوں نے منبر سے اُتارا۔ بعد سویم ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ کے ایک ایک دو دو روز راستہ میں بمقام آرہ وحسین گنج مقام کرتے ہُوئے لکھنؤ میں تشریف لائے*۔ ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا۔ مگر مرض الموت کا کیا علاج۔ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر اُسی عارضہ ورم کبد میں ۳۰ (تیسویں) ماہ محرم کی رات میں قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری و مداحی غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ✢

دن میں جنازہ اُٹھا۔ دریا پر غسل میت کے واسطے جنازہ کو لیگئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ علما وصلحا وشعرا تھے۔ اور اکثر اُن مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے ہُوئے روتے چلے جاتے تھے:۔

رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہُوں ✢ مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں

چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل ✢ تابُوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

لاجواب رباعی

---

* پھر لکھنؤ میں مرزا صاحب نے کوئی مجلس ۱۲۹۲ھ میں نہیں پڑھی۔ آخری مجلس وہی ۲۵ ذلیقعدہ ۱۲۹۱ھ کو پڑھے تھے جس میں حقیر شریک تھا۔ اور یہ مرثیہ پڑھے تھے ع انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباسؑ۔ مرثیہ تمام تھا جب پڑھتے پڑھتے آپ ساکت ہوئے۔ لوگوں نے عرض کی حضور کچھ اور عنایت ہو۔ تو مرثیہ کا آخری سادہ ورق دکھا کر

لکھنؤ میں آخری مجلس مرزا صاحب کی

دفن

جناب سید ابراہیم صاحب اعلی اللہ مقامہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے گھر پر دفن ہوئے۔ جو مقبرہ چھوٹا سا اب تک برقرار ہے۔ ؎

انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں * سرتاج فصیحان زمانہ اُٹھا

اُن کی موت کا محض شیعوں کو نہیں۔ بلکہ سُنّیوں اور ہندوؤں کو بھی صدمۂ عظیم ہُوا ہزاروں شاعروں نے تاریخیں کہیں۔ ان میں سے منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم کی تاریخیں جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ اکثر لاجواب ہیں۔ یہ مرحوم بھی مرزا صاحب کے ارشد تلامذہ سے تھے*۔

تواریخ علماء

مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی نے (جو فرقہ احناف کے ایک مشہور و مستند عالم و شاعر تھے) بھی لاجواب تاریخ فرمائی تھی جس میں سے ایک شعر یاد ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ؎

چوں داشت ذوق ذکر شہیدان کربلا * سلخ محرم آمدہ روز وصال او

مرزا صاحب کے سویم کی مجلس میں جو میری یاد و علم میں میر باقر تاجر کے امام باڑہ واقعہ لکھنؤ چوک میں ہُوئی تھی بہت بڑا مجمع تھا۔ مَیں اُس زمانہ میں مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ میں پڑھتا تھا۔ اُس روز مدرسہ میں اسی تقریب سویم کے سبب سے تعطیل ہوگئی تھی۔ جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ نے عین انتشار و کمال رنج میں حسب ذیل قطعہ تاریخ کہکر پڑھا تھا:۔

قطعۂ تاریخ وصال دبیر از حضرت اوج مدظلہ

قطعۂ تاریخ وصال دبیر مرحوم

حیف شد برباد اقلیم بلاغت بے دبیر	خاک برسر کن۔ صبا۔ در ماتم سلطانِ نظم
در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر	بنگر اندر بوستاں ہر نخل نخلِ ماتم ست

*۔ منیر سال دو روز و وقت تاریخش پگاہ وسلخ سہ شنبہ معزا بودہ ۔ کتنا عمدہ مادہ فرمایا ہے جس میں روز وقت و تاریخ صوری اور سال ۱۲۹۲ھ معنوی ہے۔ کہ مصرع میں سے سنہ ۱۲۹۲ھ اعداد نکلتے ہیں۔ منیر مرحوم نے کمال کیا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

نیست آں بسم اللہ دیباچہ معنی و لفظ ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر

غیر ممکن طالب دیدار را شام و سحر اندریں فرقت سرائے یک لحظہ راحت بے دبیر

نے دل رنجور را آرام بے وصل حبیب نے مذاق زندگانی را حلاوت بے دبیر

مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت

آسماں بے مہر و دیہیم فصاحت بے دبیر
۱۲ ۹۲

تمام ہندوستان میں دبیر و انیس آفتاب و ماہتاب کہلاتے تھے۔ کبھی اُن کو آفتاب کہتے تھے کبھی اُن کو۔ جناب سید حسین مرزا صاحب عشق مرحوم نے ایک رباعی اُسی زمانے میں فرمائی تھی۔ جو حسب ذیل ہے :-

رباعی آغا عشق مرحوم

ہے نظم کے جوہر کا خزینہ خالی + گویا جگر و دل سے ہے سینہ خالی

اے عشق نہیں ہیں جو انیس اور دبیر + ہے شمس و قمر سے یہ مہینہ خالی

حقیر ثابت نے بھی تاریخ کہی تھی جس میں سے فقط دو مصرع آخر کے عرض کرتا ہوں ہر مصرع میں سے سال وفات نکلتے ہیں ؎

آسماں بے ماہ تاباں سدرہ بے رُوح الامیں
۱۲ ۹۲

طور بے موسے ۔ ادب بے شمع ۔ منبر بے دبیر
۱۲ ۹۲

اس موقع پر انصاف کا خون ہوگا ۔ اگر میں یہ ذکر نہ کروں ۔ کہ فخر خاقانی و قاآنی جناب سید احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم نے جو قطعہ تاریخ وفات مرزا صاحب فرمایا ہے ۔ وہ (۱۰۷) شعر کا ہے۔ اور ہر شعر لاجواب ہے ۔ اس کے بعض شعروں میں اُس بشارت کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جو انکو

رباعی آغا عشق مرحوم

تاریخ مؤلف حقیر

تاریخ منظومہ حضرت فرقانی مرحوم

مؤ۔ مرزا صاحب مرحوم کا مصرع تھا ع آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے رُوح الامین ۔ میں نے کامل کی جگہ تاباں لکھکر ۱۲۹۲ھ نکال لئے ۔ یہ بھی انیس مرحوم کی رُوح اور بالواسطہ تلمذ کا فیض ہے ۔ کہ گویا انیس کے مصرع میں سے ایک لفظ کی تبدیل سے تاریخ بے کم و کاست بے تکلف نکل آئی ہے ۱۲ ۔ مؤلف حقیر۔

ہُوئی تھی۔ اور جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ خواب میں فرقانی مرحوم کے روبرو جناب رسول خدا
نے جناب علی مرتضےٰ سے پُوچھا۔ کہ ہمارا مداح ہندوستان میں آج کل کون ہے۔
اُن جناب نے جواب دیا۔ کہ دبیر۔ اور ایک اور شاعر اہلبیتؑ کا نام لیا تھا۔ جناب فرقانی
نے یہ خواب ۱۲۸۴ھ میں دیکھا تھا۔ مگر مرزا صاحب کے مرنے تک ظاہر مصلحتاً ظاہر نہیں
کیا تھا۔ میرے معزز دوست فرقانی کے لختِ جگر سید کرار حسین صاحب روحانی دام مجدہ
لکھتے ہیں۔ کہ یہی وجہ تھی۔ کہ اُن کو مرزا صاحب سے محبت اور حسن عقیدت تھی۔ اور دُوسرے
شاعر اہلبیتؑ کا نام اس قصیدہ میں بھی ظاہر نہیں کیا۔ کہ وہ بزرگوار اُس زمانہ میں زندہ تھے۔
رُوحانی دام مجدہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ والد مرحوم نے وہ دُوسرے مدّاح مقبول جناب مفتی
میر عباس صاحب شوستری لکھنوی طاب ثراہ بتلائے تھے۔ خیر اب اخیر کے چند شعر اس
قطعہ کے سُنئے۔ جس کے ہر مصرع اخیر میں سے تاریخ نکلتی ہے:۔

خضر چنیں گفت بمرگ دبیر	۹۲ ۱۲ خضر بسر چشمہ احساں رسید
ز نفس الیاس و چہ نیکو نفس	۹۲ ۱۲ تن بہ ہرم رُوح بجاناں رسید
گفت امام فصحاے عرب	۹۲ ۱۲ مور فصاحت بسلیماں رسید
گلشن فردوس چنیں داد بوے	۹۲ ۱۲ شیفتہ جاں بلبل جاناں رسید
وان قلم تعزیتش سفت دُر	۹۲ ۱۲ بر علم شاہ شہیداں رسید
نیز ز فرقانی فانی شنو	۹۲ ۱۲ عاشق صادق بر سلطاں رسید*

فرقانی مرحوم نے فارسی و عربی کی کئی لاجواب تاریخیں اور بھی فرمائی ہیں۔ مگر از بسکہ
کلیات اُن مرحوم کا چھپ گیا ہے ۱ اور اُن کے علم دوست فرزند سید کرار حسین صاحب

* اس موقع پر میرے دوست روحانی تحریر فرماتے ہیں۔ اے کاش مرزا دبیر مرحوم ایک دفعہ پھر زندہ ہو جاتے
اور اس قطعہ تاریخ کو جو بیشک اعجاز سخن ہے۔ ایک نظر ملاحظہ فرما لیتے۔ در حقیقت یہ قطعہ اُسی طرح لاجواب ہے۔
جیسے حضرت دبیر و جناب فرقانی بے نظیر تھے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

رُوحانی جنرل سپرنٹنڈنٹ صاحب گورکھپور کی توجہ خاص وصرف زر کثیر سے نہایت خوشخط عمدہ کاغذ پر چھپا ہے - اس لئے ہر شخص اُس کو دیکھ سکتا) میں اور تاریخیں تو اس موقع پر نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتا - مگر اُردُو کی دو تاریخیں اُنہیں کے دو نور نظر لخت جگر کی تصنیف لکھتا ہُوں - جو انیسؔ و دبیرؔ کی تاریخیں ہیں - اس میں کمال یہ کیا ہے - کہ ایک مصرع مشہور میر انیس مغفور سے ایک لفظ کے تغیر و تبدیل سے دونوں بزرگوار دل کی تاریخیں ایک صاحب نے نکالی ہیں - اور دُوسرے صاحب نے دُوسرے مصرع مشہور دبیر مرحوم سے خود دبیر مرحوم کی تاریخ وفات نکالی ہے - سچ ہے الولد سر لابیہ ایسے کامل باپ کے ایسے ہی لائق فرزند ہونے چاہئیں +

سیّد سجاد حسین ریحانی مرحوم*

انیس — طبع ریحانی نے لکھی ہے یہ تاریخ انیس
ہائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

دبیر — نکلی یوں مصرع مذکور سے تاریخ دبیر
وائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

سیّد کرار حسین رُوحانی دام مجدہٗ

یا شاہ زمن لطف کی ہو جائے نگاہ
دروانہ دولت پہ فقیر آیا ہے

تم سے ہے امید گل سے ہے قطع نظر
تحصیل سعادت کو دبیر آیا ہے — دبیر

مقبرۂ دبیر مرحوم

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا — کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چتر زریں — تربت پہ نہ اُن کی شامیانہ دیکھا

سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد لکھنؤ سے مرزا صاحب کو ملا کرتا تھا - اور کچھ اور آمدنی

---

* سیّد سجاد حسین مرحوم (ریحانی) بھی بڑے پایہ کے شخص تھے انگریزی - فارسی - عربی میں اچھی دستگاہ تھی میرٹھ سے طوطی ہند مدت تک نکالتے رہے جس میں کبھی کبھی حقیر بھی مضمون بھیجتا تھا - ۱۳۱۱ھ میں جب میں عتبات عالیات گیا ہُوں - تو میرا سفرنامہ نثر بھی مدت تک اُسی اخبار میں مرحوم چھپواتے رہے اب اُسی طرح سیّد کرار حسین صاحب دام مجدہ نظر کرم فرماتے ہیں - اس کتاب کے لئے یہ سب مصالح انہیں نے فراہم فرما کر ارسال فرمایا میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہُوں - خدا جزائے خیر دے + ۱۲ مؤلف حقیر -

حسب مذکورہ تھی۔ اور مرزا صاحب مرحوم اپنے اور اپنی فیاضیوں کی دو یادگار چھوڑ
گئے تھے۔ ایک اپنے نور نظر لخت جگر مرزا اوج صاحب (مدظلہ) کو۔ دوسرے کثیر
قرضہ کو۔ بعد مرزا صاحب مرحوم کے بعض منتظمان حسین آباد نے ایسی شرائط پیش کیں۔
جن کی تعمیل کرنا جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے خلاف اخلاق و انسانیت و وضعداری
سمجھا۔ یعنی سب سے بڑھ کر یہ شرط تھی۔ کہ عشرہ محرم میں لکھنؤ سے باہر نہ جایا کریں۔ {کیونکہ
پہلی شرط کو کہ درباری کلاہ سے مرزا اوج صاحب اگر پڑھا کریں (مرزا صاحب موصوف کے
اس عذر پر کہ میرے والد مرحوم نے اور میں نے کبھی ایسا نہیں کیا) واپس لینے پر اکثر متولی
طیار تھے} لکھنؤ سے عشرہ محرم میں باہر نہ جانے کی شرط کو مرزا اوج صاحب نے اس لئے
خلاف وضعداری سمجھا۔ کہ جناب (دبیر) مرحوم وصیت فرما گئے تھے۔ کہ پٹنہ عظیم آباد
کا جانا تم خود نہ چھوڑنا۔ اور یہی وعدہ خود انہوں نے سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ
مرحومہ سے فرمایا تھا۔ کہ تاحیات میں آؤنگا۔ اور میرے بعد میری اولاد انشاء اللہ
حاضر ہوگی۔ اُس وقت وصیت کے موافق حسین آباد کے وثیقہ کو مرزا اوج صاحب نے
چھوڑ دیا۔ اور پٹنہ عظیم آباد عشرہ محرم میں ہمیشہ جاتے رہے۔ اور جاتے ہیں۔ جناب
نواب سید عباس صاحب سعید دام اقبالہ رئیس عظیم آباد جو سیدہ ممدوحہ کے جانشین اور
ذیعلم نواسے اور مرزا اوج صاحب قبلہ کے شاگرد رشید اور قدرشناس ہیں۔ ویسی ہی
عزت و قدر کرتے ہیں؛

نواب سید عباس صاحب سعید رئیس عظیم آبادی قدردانی

پس قرضہ کی کثرت اور آمدنی کی قلت کی وجہ سے یہ مقبرہ ایک چھوٹا سا مکان تھا
اور رہے٭ مرزا صاحب مرحوم کے فدائیوں میں وارو غہ میر واجد علی صاحب تسخیر مرحوم اور

٭ پہلے خام تھا۔ اب پختہ ہے۔ مگر بہت مختصر۔ اور اُس میں کبھی جناب مرزا صاحب مرحوم کے اعزہ میں سے بعض صاحب مع مستورات
رہتے ہیں بعض وقت بعض معتقدین آتے ہیں اور قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں مگر پردہ نہ ہونیکی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں بعض صاحب
مجھ سے اس کا افسوس فرماتے تھے۔ اور میں خود بھی اسی سبب سے اکثر قبر پر فاتحہ خوانی سے محروم رہا ہوں ۱۲ مؤلف حقیر۔

ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب اور نواب آغا علی خاں عرف آغائی و ناظم صاحب تھے۔ ان لوگوں نے مرزا اوج صاحب سے بار بار خواہش کی۔ کہ ہم پختہ مکان عالیشان مقبرہ کا بنوادیں۔ مگر اُنھوں نے منظور نہیں فرمایا۔ اور یہی عذر فرمایا۔ کہ وصیت جناب مرحوم کے موافق جب کبھی جس حیثیت سے بنواؤنگا میں بنواؤنگا۔ ایک خواجہ سرائے شاہی بڑے مالدار میاں فیروز الدولہ ساکن گولہ گنج لکھنؤ تھے*۔ اُنھوں نے ایک روز زبردستی ایک ہزار روپیہ کا توڑہ مرزا اوج صاحب کی پینس میں (جب کہ مرزا اوج صاحب اُن کے یہاں کسی تقریب سے گئے تھے) رکھ دیا۔ اور یہاں تک مصر ہوئے۔ کہ اگر آپ یہ روپیہ لیکر مقبرہ نہ بنوائینگے۔ تو مَیں اپنا خُون کر لُونگا۔ مرزا اوج صاحب اُس وقت وہ توڑہ لے آئے۔ مگر پھر دو تین روز کے بعد جب سمجھ لیا۔ کہ اُن کا غصّہ دھیما پڑ گیا ہوگا وہ توڑہ مع معذرت نامہ کے اُن کے پاس بھیج دیا۔ اور لکھ دیا۔ کہ وصیت جناب مرحوم مانع ہے ✣

یادگار انیس و دبیر مرحومین

یہ حکایت مَیں نے اس غرض سے لکھی ہے۔ کہ مولوی اشہری صاحب نے اپنی کتاب حیات انیسؔ میں رؤسائے لکھنؤ وغیرہ کو میر صاحب کی یادگار قائم کرنیکی طرف توجہ دلائی ہے۔ جس سے غالباً مراد کسی عالی شان عمارت کی معلوم ہوتی ہے۔ اور عمارت یادگار سب سے بہتر مقبرہ ہے۔ کہ اور بھی صاحبوں کو اس کا افسوس ہے۔ مگر اُن لوگوں کو معلوم نہیں۔ کہ ان باکمال غیرت مندوں کے وارث بھی ویسے ہی صاحب غیرت ہیں۔ کہ اس قسم کی اعانتوں کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں۔ ورنہ اب تک نہ معلوم کس شان و شوکت کے ان کے مقبرے طیار ہو جاتے۔ ہر چند صاحب مزار کو اس کی حاجت نہیں۔ وہ زبان حال سے گویا کہ رہے ہیں بقول سحرؔ

*۔ ان کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں ماہانہ مجلس پڑھا کرتے تھے۔ یہ مرزا صاحب کے معتقد تھے۔ اُوپر مفصل ذکر ان کے یہاں کی مجلس کا ہو چکا ہے ✣ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے + یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے ✲

اُن کے کمال کی یادگار اُن کے مختلف کلام ہیں۔ جو دلوں پر اپنی یادگار قائم کئے ہوئے ہیں۔ اور جن کے سکّہ اہلِ زبان کی زبانوں پڑے ہوئے ہیں۔ (بقول مؤلف) ؎

زبانوں پہ لفظ اور دلوں پر ہو سکہ + یہ لطفِ زباں ہے یہ حسنِ بیاں ہے

باب ہفتم۔ مرزا صاحب مرحوم کی ترقی سخن کی مثالیں اور رنگا رنگ کلام کا بیان

فصل ۱ رنگا رنگ کلام و ترقی سخن کی مثالیں

حقیر کے نزدیک اچھے کلام کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) مزہ دار سادہ۔ وہ کلام جس میں سادگی کے ساتھ مزہ ہو۔ سادگی کے ساتھ مزہ کی قید اس لئے مَیں نے لگا دی ہے۔ کہ ایسا کلام نہ ہو۔ جیسا یہ مشہور شعر ہے ؎

دنداں تو جملہ در دہانند + چشمان تو زیرِ ابروانند

(۲) مؤثر۔ وہ کلام جس کو سُن کر اثر پیدا ہو۔ خواہ طبیعت میں خوشی کا بیان سُن کر خوشی کا کچھ اثر ہو۔ خواہ غم کا حال سُن کر دل کچھ محزون ہو +

(۳) دردانگیز یا مسرت خیز۔ جس کو سُن کر آدمی مارے غم کے بے چین یا خوشی کے

✲ اس موقع میرے کرم فرماؤں اور علم دوست احباب نے مجھ سے بحث کی اور فرمایا کہ اس زمانہ کی رفتار کے موافق میر و مرزا کی یادگار مقبرہ عالیشان یا اور کوئی چیز محض اہلِ لکھنؤ کو نہیں بلکہ تمام ممالک متحدہ کے روشن خیال اہلِ علم کو بنوانا لازم و واجب ہے۔ خواہ اُن کے وارث راضی ہوں یا نہ ہوں۔ ورنہ ہم لوگوں کی جہالت اور ناقدردانی اہلِ کمال پائی جاتی ہے جو قابلِ افسوس ہے۔ اسی طرح مرزا غالب مرحوم کا مقبرہ یادگار قائم ہونیکی تحریک علم دوست روشن خیال مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ نے چند انگریزی اخباروں میں فرمائی اور کچھ تھوڑا سا وعدہ بھی چندہ کا بعض لوگوں نے کیا۔ مگر سرانجام نہ ہوا۔ ہماری ناقدردانی اہلِ کمال پر نہایت افسوس ہے ؎ کریماں را بدست اندر درم نیست۔ خداوندان دولت را کرم نیست + ۱۲ مؤلف حقیر۔

سبب سے آپے سے باہر ہوجائے۔ اسی طرح الفاظ کی تین قسمیں ہیں۔ دلگداز۔ دلچسپ۔ دلکش۔ مگر ہر صورت میں یہ شرط ہے۔ کہ سُننے والا بھی صحیح مذاق سخن رکھتا ہو۔ دل رکھتا ہو۔ محض منجمد خون کا قطرہ پہلو میں نہ ہو۔ ورنہ جس کو مذاق صحیح حاصل نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک گھاس کٹی تو پولہ کٹا تو سب برابر ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ جن لوگوں کے دلوں میں مثل ابولہب وابوجہل وغیرہ کے مادۂ قبولیت نہیں تھا۔ اُن پر کلام خدا (قرآن مجید) کا بھی کچھ اثر نہ ہوا*۔ دلکش یا دردانگیز کلام کی نسبت کسی شخص کا یہ شعر مشہور ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعار این قوم + ورائے شاعری چیزے دگر ہست

یہی چیز دیگر کہیں زبان کی شیرینی کہلاتی ہے۔ کہیں طرز بیان کی خوبی کا خطاب پاتی ہے کبھی اس کو نازک خیالی کہتے ہیں۔ کبھی سین دکھلانے اور تصویر کھینچ دینے سے تعبیر کرتے ہیں +

فصل ۳ مرثیے مختلف مقام تعریف

مرثیہ اردو فی زمانہ کیا چیز ہے۔ اُس کی مختصر تعریف یہ ہے۔ کہ تمام اقسام سخن غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ناول۔ ڈرامہ۔ حکایت وروایت واقعی جس نظم میں جمع ہیں۔ اب اُس کا نام مرثیہ ہے۔ اور وہ زیادہ تر شہدائے کربلا کے حال میں کہا جاتا ہے۔ مرثیہ کے حصہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ جن کو مرثیہ گویوں کی اصطلاح میں (۱) **چہرہ** (۲) **رخصت** (۳) **سراپا** (۴) **آمد** (۵) **رجز** (۶) **لڑائی** (۷) **بیان شہادت یا بین** کہتے ہیں +

مطلع وچہرہ مرثیہ کا

(۱) مرزا صاحب مرحوم چہرہ بہت شاندار کہتے ہیں۔ اور مطلع ہر مرثیہ کا نہایت پھڑکتا ہوا ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کا اور بالخصوص مولوی احمد حسین صاحب فرقانی مرحوم کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ مرزا صاحب سے بڑھ کر مطلع مرثیہ کسی مرثیہ گو کا نہیں ہوتا۔ اور اکثر مرثیوں میں وہ نئے انداز کا مطلع کہتے ہیں۔ میں نے جا بجا اس کتاب میں اُن کے مرثیوں کے مطلع لکھے ہیں۔

* ملٹن کا یہ قول مشہور کہ سب سے عمدہ نظم وہ ہے۔ جو سادہ۔ نازک خیال۔ موثر ہو۔ ایک حد تک قابل قبول ہے۔ مگر تینوں صفات ایک ہی کلام میں جمع ہونا اور سب کلام بشر ایک ہی رتبہ کا ہونا محال ہے۔ جس شاعر کے کلام میں معقول حصہ ایسے عمدہ کلام کا ہے وہ ضرور قابل مدح ہے۔ ورنہ شاعر نہیں تُک بند ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

مطلع میں براعت استہلال

اُن پر غور کرنے سے میرے قول اور اس مشہور مقولہ کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ چہرہ میں شوکت دار (مگر موثر) الفاظ لانے سے کلام مرصع ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی مطلع میں صنعت براعت استہلال کا التزام کرتے ہیں۔ کہ اگر صحیح المذاق سامع ہے۔ تو سمجھ لیتا ہے۔ کہ (آئندہ) مرثیہ اس حال میں ہوگا۔ وہ الفاظ جو قصیدہ کے واسطے ہیں اکثر چہرہ میں نظم فرماتے ہیں جس سے سامعین کے دلوں کو ایک حظ خاص حاصل ہوتا ہے۔ اور دل آئندہ کلام سُننے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ اور تمہید مرثیہ کی بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ پھر جس موقع پر تمہید ختم کر کے وہ رخصت وغیرہ (اصل حال) شروع کرتے ہیں۔ وہاں قصیدہ کی تشبیب وگریز کا لطف آتا ہے +

(۲) رخصت

(۲) **رخصت** کے موقع پر وہ اکثر سادہ مگر مزہ دار دلگداز الفاظ لاتے ہیں۔ اگر (مخدرات عصمت میں سے) کسی بی بی کی زبانی کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو اکثر وہی الفاظ وہی محاورے لاتے ہیں۔ جو محلات شاہی میں رائج تھے۔ یا دہلی و لکھنؤ کی شریف زادیاں بولتی تھیں۔ اور اکثر اب بھی اُسی طرح بولتی ہیں۔ رسم و رواج سے بھی اس موقع کو زیادہ تعلق ہے۔ مرزا صاحب کے بزرگ شاہان دہلی کے اتالیق تھے۔ اور خود مرزا صاحب کی شاگرد اکثر شاہزادیاں اور محلات شاہی کی باعفت بیبیاں تھیں[1]۔ اس لئے جس قدر عورتوں کے رواجوں سے وہ واقف تھے شاید کوئی دُوسرا شاعر واقف ہوگا۔ اکثر رخصت کے موقع پر اور جابجا ہندو شیریں اور جناب فاطمہ زہراؑ کے حالات کے مرثیوں میں انہوں نے زبان محلات شاہی اور شریف عورتوں کے رسم و رواج کی کیفیت جُوں کی تُوں دکھا دی ہے۔ رواج میں کہیں ہندوستان کی عورتوں کا برتاؤ بیان کیا ہے۔ کہیں عرب کا رواج مدنظر رکھا ہے[2] +

[1] اور اُن کی والدہ لکھنؤ کے ایک شریف خاندان کی بیٹی اور اُن کی زوجہ میر انشاء اللہ خاں مرحوم کی حقیقی نواسی تھیں۔ عورتوں کے صحیح محاورے اور رواج عورتوں ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

[2] اس کی مختصر مثالیں ہم نے اسی جلد اول میں اور بکثرت نظائر جلد ثانی میں پیش کئے ہیں۔ اور جلد ثانی میں ہند کے حالات و زنان شام کے مرثیوں کا انتخاب کثرت سے اسی خیال سے کیا ہے۔ جو دیکھنے کے قابل ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) سراپا میں اکثر صنائع و بدائع لاتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ مضامین خیالی کو نازک خیالی کے معراج کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا مینہ برساتے ہیں۔ اور ایک خاص امتیاز جو اُن کے مرثیوں میں (اکثر) نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ امام حسینؑ یا اُن کے کسی عزیز یا رفیق کی سراپا میں وہ شان دکھاتے ہیں۔ جو دُنیا کے اعلےٰ تریں یا اشجع آدمی سے بھی بڑھی ہُوئی ہو +

(۴) آمد میں بھی وہی خیال وہی انداز قائم ہے۔ کہ وہ اپنے عقیدہ میں (جس کی گواہی صحیح تاریخ عالم دے رہی ہے) امام حسینؑ کو روئے زمین کے بہادروں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں محض بہادر ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اُن کو روئے زمین پر خدا اور رسولؐ کا قائم مقام بھی جانتے ہیں۔ جن کے جلال و جبروت کا اثر ہر شے میں ہے۔ آمد رزم کو سُننے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فوج کوفہ و شام کے ہزاروں یا لاکھوں بُزدل آدمی تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور آدمیوں کے دلوں کے اثر سے ہر چیز میں خوف و خطر بیٹھ گیا ہے۔ اور اگر وہ آمد علمدار فوج خدا یا ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ یا قاسم ابن حسنؑ کی ہے۔ تو ان شاہزادوں کی ان کے رتبہ کے موافق شان شجاعت و ہیبت دکھاتے ہیں۔ جو امام حسینؑ سے کم مگر بہادر سے بہادر آدمی سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی ہے۔ اب اس کو نا واقف راز چاہے مبالغہ یا حسن اعتقاد یا ما فوق العادہ یا خلاف قدرت (ان نیچرل) سمجھے یا کہے۔ مگر ہر کلام کا اندازہ متکلم کے خیالات کی بنا پر صحیح المذاق کرتے ہیں۔ آمد کے موقع پر شوکت دار اور ہیبت ناک الفاظ اور چُست بندشیں سامعین کے دلوں پر بہت کچھ اثر کر جاتی ہیں۔ جو باتیں بیان میں نہیں آسکتی ہیں +

(۵) رجز میں عموماً وہ الفاظ لاتے ہیں۔ جو بلاغت کے کانٹے پر تلے ہُوئے ہوں۔ الفاظ فصیح و عالمانہ اور مضامین عالی ہوں۔ اگر امام حسینؑ کا رجز ہے۔ تو اُس میں اس بات کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ کہ اُن کی مصیبتِ واقعی یا پیاس کا بھی بیان ہو۔ تو کوئی کلمہ زبان قلم سے ایسا نہ نکلے۔ جو منصب امامت کی شان کے شایاں نہ ہو۔ اور شہدائے بنی ہاشم یا بہادر

رفیقوں کے رجز میں اُن کے مرتبہ خالی کا لحاظ رہتا ہے +

(۶) لڑائی کے موقع پر بھی ہیبت ناک الفاظ لاتے ہیں۔جس سے سامع کو گمان ہوتا ہے۔کہ میدان جنگ سامنے ہے۔تلواروں کی بجلیاں اور برچھیاں چمک رہی ہیں۔گرز اُٹھے ہوئے ہیں۔تیر سن سن جا رہے ہیں۔اگر کسی پہلوان کی لڑائی ہے۔تو اُس کے قابل لاحول ڈیل ڈول اور طاقت کی تصویر نہایت مختصر لفظوں میں کھینچ دیتے ہیں +

(۷) رزمیہ

مگر مرزا مرحوم میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ دیکھی گئی۔کہ آمد ہو یا رجز ہو۔یا سراپا یا رزم ہر موقع پر وہ دو ایک بند یا دو چار مصرع ایسے کر دیتے ہیں۔جن کو غم انگیز کنایہ اشارے کہتے ہیں۔اور یہی چیزیں مرثیہ کی جان ہیں۔کیونکہ مرثیہ وہی ہے۔جس میں ہر مقام پر مرثیت یعنی بَین کا پہلو قائم رہے۔اس کی مثال یہ سمجھئے۔کہ امام حسینؑ سے ایک پہلوان یزید الابطحی {ابطح پتھریلی زمین کو کہتے ہیں۔شاید وہ یا اُس کے باپ دادا کسی ایسے ہی پتھریلے (کوہستانی) مقام کے باشندے ہونگے} امام حسینؑ سے لڑنے کو آیا ہے۔وہ اور باتیں رجز وغیرہ کی کہکر اور امام حسینؑ سے جواب سُنکر (کہتا ہے)۔

مثال طرز قاسمی جدید

یوں گرم سخن نور خدا سے ہوا ناری	لاریب اجل اب ہے ہماری کہ تمہاری*
یاں فوج ہے سب لاش اُٹھانیکو ہماری	تم بھی کسی یاور کو بلالو پئے یاری

جب تیغ مری۔آپ کی تصویر مٹا دے
لے جاکے تمہیں گنج شہیداں میں لٹا دے

قاسمؑ کو بلا لیجئے؟ عباسؑ علی کو	خیمے سے طلب کیجئے ہمشکل نبیؐ کو
شہ بولے کہ تم لوگوں نے چھوڑا ہے کسی کو	ششماہے کے بھی غم میں کُڑھایا مرے جی کو

مَیں نے ہی سبھوں کے تن صد پاش اُٹھائے
باقی نہیں کوئی۔جو مری لاش اُٹھائے

* رزم میں مرثیت کا پہلو دیکھئے + ۱۲ مؤلف حقیر

(۷) **شہادت وبین** - یہ بات مشہور ہے - کہ مرزا صاحب تمام مرثیہ گویوں سے بہتر شہادت وبین کہتے ہیں۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی بہت شرح وبسط سے اس کو دبیر وانیس کے حالات کے اخیر میں بلکہ تمام آب حیات کے خاتمہ پر بیان فرمایا ہے۔ جو آب حیات کا دور آخر بلکہ جام آخر سمجھنا چاہئے - اور مرثیہ کی جان یہی ہے - اس لئے میں اس مقام کو ذرا شرح وبسط سے بیان کرنا چاہتا ہوں - (تاکہ زمانہ حال کے مرثیہ گویوں کے واسطے وہ دستور العمل کا کام دے - کیونکہ آج کل یہ شکایت زبانوں سے ترقی کرکے اخباروں میں چھپ کر عام ہوگئی ہے - کہ آج کل کے مرثیوں میں سب کچھ ہوتا ہے - مگر بین یا مرثیت نہیں ہوتی) اصل مطلب سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سن لیجئے - زمانہ حال کی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے - کہ ہر سکنڈ (ثانیہ) میں قریباً ایک آدمی مرجاتا ہے - (قریباً) ایک پیدا ہوتا ہے - پس کیا عقل سلیم تسلیم کرسکتی ہے - کہ ہر اچھے برے آدمی کا سوگ رکھا جائے - ماتم کیا جائے - نہیں ہرگز نہیں - بلکہ اُس شخص کا سوگ رکھنا (قانون اخلاق کے موافق) ضرور ہے - جو دُوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہو - نیک ہو جس طرح ایک سے بڑھ کر دُوسرا بدآدمی دیکھنے میں آتا ہے - یہاں تک کہ بدترین خلائق کے مقابلہ میں ایک معمولی بدآدمی کو اچھا یا غنیمت سمجھا جاتا ہے - اُسی طرح نیکوں اور نفع پہنچانے والوں کے درجے ہیں - پس جو بزرگوار سب اہل دُنیا سے بڑھ کر نیک اور نفع رساں ہو - وہ ہم مسلمانوں کے نزدیک پیغمبر خدا صلعم کا جانشین حقیقی ہے - کوئی اُس کو خلیفہ کہتا ہے - کوئی امام - کوئی غوث۔* پس سنہ ۶۰ ہجری میں خلیفہ برحق اور امام اور غوث سب باالکثر مختلف العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک امام حسینؑ ہی قرار پاتے ہیں - افسوس کا مقام یہ ہے - کہ ایسے مقدس نبی زادے کے نواسے کو انہیں لوگوں نے جو اُن کے نانا کا کلمہ پڑھتے تھے تین دن کا بھوکا پیاسا محض دُنیا کے لالچ سے یزید اور ابن زیاد وغیرہ چند دُنیاداروں بدکاروں کا ساتھ دیکر ایسا سا

* صوفیوں کی اصطلاح میں اُس کو غوث کہتے ہیں - اور شیعہ امام وخلیفہ کہتے ہیں اسی طرح اور فرقہ مسلمانوں کے کوئی خلیفہ کوئی امام کہتا ہے۔ مولف

فصل ۳ (شہادت وبین)

شہید و قتل کر دیا۔ امام حسینؑ اور اُن کے بہتّر بہادر ساتھیوں نے کربلا میں وہ داد شجاعت دی ہے۔ اور حق کی ایسی طرفداری کی ہے۔ جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ پس جب کہ اُن کے اخلاق۔ شجاعت۔ صبر۔ عبادت۔ سخاوت وغیرہ کا نمونہ زمین پر نظیر نہیں ہے۔ تو ضرور ہے کہ اُن کا بیان بھی اس خوبصورتی سے کیا جائے۔ جو عام لوگوں سے اعلیٰ اور بالا ہو۔ اور الفاظ بھی ایسے لائے جائیں۔ جو اگرچہ زبان ولغت میں داخل ہوں۔ مگر بظاہر وہ فرشتوں کی زبان معلوم ہوتی ہو۔ اس کو بعض آدمی شوکت الفاظ کہتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ بلاغت کی جان یہی ہے۔ ملا محتشمؒ اور مقبلؒ کے کلام میں یہی بات ہے۔ اس لئے وہ محتشم و مقبول ہوئے۔ مَیں اس موقع پر فقط ایک شعر ان دونوں بزرگواروں میں سے ایک آخرالذکر مداح کا لکھتا ہوں۔

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں اُفتاد + اگر غلط نکنم عرش بر زمیں اُفتاد

اگر شاعر فقط اتنا ہی کہدیتا۔ کہ حسینؑ بر زمیں اُفتاد۔ تو مطلب تو ضرور حاصل ہو جاتا۔ مگر ممدوح کی شان نہ معلوم ہوتی۔ اور جب شان اعلیٰ نہ معلوم ہوتی۔ تو دل پر چوٹ نہ لگتی۔ شاعر نے اول تو کہا۔ **بلند مرتبہ**۔ پھر شاہ کہا۔ پھر صرف زین نہیں کہا۔ بلکہ صدر زین کہا۔ اسی طرح ترقی دے کر ممدوح کی شان ورفعت دکھائی۔ پھر دوسرے مصرع میں کہا۔ کہ اگر مَیں غلطی نہیں کرتا۔ تو یہ کہونگا۔ کہ عرش خدا زمین پر گر پڑا۔ امام حسینؑ کو عرش سے تشبیہ دیکر رفعت پیدا کی۔ اب عرش کا گرنا یہ بتا رہا ہے۔ کہ اللہ اکبر۔ کس قدر عظیم الشان صدمہ پہنچا۔ اس لئے اس شعر کو سنکر دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور امام حسینؑ کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ترکیب مرزا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اب مَیں ایک مشہور مطلع کا ایک پورا بند مع شرح لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ جس دم نگینِ خاتم پیغمبراں گرا۔ ایک پیغمبراں کی شوکت دار لفظ فرمائی۔ پھر اُس پر ترقی یہ کی۔ کہ خاتم پیغمبراں کہا۔ خاتَم (بفتح تا) انگوٹھی اور زینت کے معنی آتا ہے۔ یہاں خاتم پیغمبراں سے مراد جناب محمد مصطفےٰ صلعم سے ہے۔ پھر اُس پر ترقی

ما تعبول سے
متحبول شعر

مرزا صاحب کی مراثی
بیہم بلند
مع شرح

یہی کہ اُس انگوٹھی کا نگینہ گر پڑا۔ وہ کون؟ امام حسینؑ۔ نگینہ انگوٹھی کے اُوپر رہتا ہے۔ یہاں امام حسینؑ اپنے نانا کی پیٹھ پر اکثر سوار ہُوا کرتے تھے۔ یہ شان اعلےٰ دکھا کر کہتے ہیں ع رونق اُٹھی زمین سے امام زماں گرا۔ مذہب شیعہ کے موافق امام اور مذہب صوفیہ کے موافق غوث گویا تمام دُنیا کی جان ہے۔ ہر چیز اُس سے وابستہ ہے۔ پس فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ گھوڑے سے کیا گرے کہ دُنیا بھر سے رونق اُٹھ گئی۔ زمین و زمان میں جو نسبت و صنعت ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور نہایت بے تکلف ڈھلے ہُوئے لفظ لائے ہیں۔ اب جب یہ شان عالی دکھا چکے۔ تو ظالموں کے ظلم کی تشریح کرتے ہیں۔ ع گرنے پہ سب گروہ لئے برچھیاں گرا۔ اب اس ظلم پر افسوس و تعجب ظاہر کرتے ہیں ع ہے ہے ان جفاؤں پہ بھی آسماں گرا۔ یعنی ایسی جفاے شدید ہوگئی۔ اور پھر آسمان قائم رہا۔ تعجب اور افسوس ہے۔ اب اس ظلم کی زیادہ تشریح کرتے ہیں ع زہراؑ سے پُوچھئے یہ قلق اور زمین کا۔ ماں کو جو محبت ہوتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں ہوتی۔ اس لئے اُن کی مادر گرامی دختر جناب رسول خدا صلعم سے اس قلق کو پُوچھئے۔ ع تپنا زمیں کا اور تڑپنا حسینؑ کا۔ ادھر تو زمین تپ رہی تھی۔ ادھر امام حسینؑ زخمی پیاسے تڑپ رہے تھے۔

ظاہر ہے۔ کہ اس رفعت و شان کے بیان سے جو صدمہ سُننے والے کو پہنچیگا۔ وہ معمولی طور پر یہ کہنے سے کہ "امام حسینؑ گرم زمین پر گرے۔ ظالم برچھیاں لئے ہُوئے لُوٹ پڑے"، ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بلاغت کے نکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر شخص مجبور ہو کر یہ کہتا ہے۔ کہ جس قدر رقت مرزا صاحب کے مرثیہ پر مجلس میں ہوتی ہے۔ خواہ وہ سوز میں پڑھا جائے خواہ منبر پر۔ دُوسرے کے مرثیہ میں نہیں ہوتی۔ بعض صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب شوکت دار الفاظ بہت لاتے ہیں۔ جس سے کم علموں کے سمجھنے میں پیچ پڑ جاتا ہے۔ دُوسرے شعراء اہلبیت صاف صاف کہتے ہیں۔ مگر اُن کہنے والوں سے یہ کون کہے۔ کہ ایسے ہی ایسے شوکت دار الفاظ لانے اور پیچ ڈالنے سے تو

داوں پر چوٹ لگتی ہے۔ اور ممدوح کی شان معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ ہزاروں قتل بھی ہوتے ہیں۔ پیاسے بھی مرجاتے ہیں۔ سب کے واسطے نہ یہ سامان ماتم ہوسکتے ہیں۔ نہ یہ مجلسیں نہ مرثئے کہے جاتے ہیں*۔ المختصر مرزا صاحب بین میں شان ممدوح دکھلانے کا خاص التزام فرماتے ہیں۔ اور خاندان رسالت کے حفظ مراتب کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ اس کے سوا نہایت سریع الفہم اور آسان الفاظ لاتے ہیں۔ تاکہ بین کے مضامین و واقعات کو ذی علم و بے علم ہر ایک بخوبی سمجھے۔ زبان کی صفائی اور بیان کے عام فہم ہونے کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی لڑائی اور سراپا میں گویا دُوسرا مصنف تھا۔ بین میں دُوسرا شخص متکلم ہے۔ اور اس فرق کو وہ خود ایک رباعی میں کہ گئے ہیں۔ وہ رباعی یہ ہے:۔

ہے رزم و سراپا تو زباں اور ہی ہے + اور بین کے مابین بیاں اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تری فکر دبیر + کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بعض الفاظ دیکھنے میں بہت ہی کم وزن معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کثرت استعمال یا بندش وغیرہ کے لحاظ سے دل پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب **منیر** مرحوم جو ہمارے زمانے میں ایک شاعر اکمل مانے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر یہ چاروں مصرع (جو ایک پہلوان کی لڑائی کے موقع پر مرزا صاحب نے کہے ہیں) پڑھتے تھے:۔

ترچھا کبھی نیزے کو ہلایا کبھی آڑا + پڑھ پڑھ کے رجز باغ فصاحت کو اُجاڑا
ظالم نے کئی پُشت کے مُردوں کو اُکھاڑا + بولا مری ہیبت نے جگر شیروں کا پھاڑا

حفظ مراتب کا خیال
بین میں مرزا صاحب کی زبان عام فہم جو معلوم ہوتی
فصاحت کا
الفاظ کی بندش
جوش کے قافیہ اور حرف ... شان

* محرم و صفر سنہ ۱۳۲۳ ہجری کے شیعہ و اثنا عشری وغیرہ پرچوں کے ناظرین کو بعض مرثیہ گویان حال کی یہ شکایت ہے کہ اُن کے پڑھنے سے گل و بلبل۔ مدح ذوالفقار۔ مدح ذوالجناح۔ سراپا وغیرہ کے بیان پر اس قدر مجلس میں واہ واہ ہُوئی کہ مجلس ماتم محفل مشاعرہ سے بڑھ گئی۔ مگر جو علت غائی رقت و بکا تھی۔ وہ مطلق نہیں ہوئی۔ وہ لوگ اس مضمون پر غور کریں جبتک حال کے ایسے مرثیہ گو اس طرز خاص میر کی پوری تقلید و اتباع نہ کرینگے۔ مرثیہ کہنا نہ آئیگا۔ گو شاعر غزل گو اعلے رتبہ کے ہوجائیں + مؤلف حقیر

اور فرماتے تھے۔ کہ دیکھو کیسے بھونڈے قافیہ ہیں۔ مگر شان اُستادی و کمال کو دیکھو۔ کہ کس عمدگی سے بندش دی ہے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے کے واسطے اب اس سے بہتر الفاظ شاعر کو نہیں مل سکتے۔ واقعی جو پہلوان میدان جنگ میں آتا ہے۔ وہ جنگ کی اُمنگ میں نیزے کو کبھی نرچھا کبھی آڑا ہلاتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں اُس کی رجز خوانی کی ہجو کس خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں کی ہے۔ کہ باغ فصاحت کو رجز بڑھ کر اُجاڑا۔ رجز کے موقع پر عرب کا عام دستور تھا۔ کہ اپنے باپ دادا کے نام لیکر کارنامے بیان کرتے تھے۔ اس کے واسطے خاص ایک روزمرّہ اردو کا صرف فرمایا ہے۔ کہ کئی پُشت کے مُردوں کو اُکھاڑا۔ یعنی مُردوں کے حالات بیان کئے۔ غزل میں خواجہ آتش مرحوم نے بھی یہ روزمرّہ ایک موقع پر خوب نظم کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

کہتے ہیں ذکر لیلی و مجنوں جو چھیڑئیے + چپ رہئیے بس گور کے مُردے اُکھیڑئیے

اب وہ پہلوان اپنا اور اپنے باپ کا نام لیتا ہے۔

ہم پنجہ نہ رُستم ہے نہ سہراب ہے میرا + مرحب بن عبد القمر القاب* ہے میرا

اب میں مرزا صاحب کی وقت وقت کی ترقی سخن کی مثالیں بیان کرنے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب نے جب سنہ ۱۲۳۰ھ یا ۱۲۳۲ھ کے قریب قریب مرثیہ کہنا شروع کیا۔ تو اُس وقت تک رزم و سراپا مرثیہ میں نہیں کہا جاتا تھا۔ ہر مرثیہ گو کی توجہ بین پر تھی۔ سب سے بہتر وہ مرثیہ گو سمجھا جاتا تھا جسکو مصیبت کے موقعوں کے روزمرّے کثرت سے معلوم ہوں۔ کہ وہ موقع سے کھپا دے۔ مرثیہ اُس زمانہ میں ۱۲ یا ۱۵ بند سے لے کر ۳۵ یا ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ اس کی وجہ

وقت وقت کی ترقی سخن کی مثالیں

مرزا صاحب کے زمانہ ابتدائی شاعری میں رزم و سراپا و فخر مرثیہ میں نہ ہوتا

*اس موقع پر جو بزرگوار اردوئے معلے کی باریکیوں سے ناواقف ہیں وہ غالباً مولوی شبلی صاحب کی طرح یہ اعتراض فرمائینگے کہ القاب جمع ہے بجائے واحد کیوں باندھا۔ یا مگر اردوئے معلے کے وارث شعرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ جانتے ہیں کہ القاب اردو میں واحد کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً روزمرّہ میں کہتے ہیں۔ کہ تم اُن کا القاب کیا لکھا کرتے ہو + ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اکثر مرثئے سوزخواں پڑھتے تھے۔ سُنا ہے۔ کہ ابتدائی مشق کے مرثیوں میں سے یہ مرثیہ مرزا صاحب کا بہت مشہور ہوا تھا۔

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے ٭
ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا سوتی ہے

اس مرثیہ میں مادر علی اصغر کا اپنے بچہ کی یاد میں گھبرانا اور تنہا رونا بیان کیا ہے۔ چنانچہ رات اور تنہائی کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:۔

تصویر تنہائی

سوگ کا فرش ہے۔ اور سامنے جلتا ہے چراغ — شانے میں داغ رسن۔ سینے میں اولاد کا داغ
جانِ اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ — نہ وہ گل ہیں، نہ وہ غنچے۔ نہ وہ زہرا کا باغ

گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

اس سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا صاحب قدرتی شاعر تھے۔ اور بڑے بڑے واقعہ کو مختصر لفظوں میں تصویر کھینچ کر دکھا دینے کا جوہر قدرت نے اُن کی طبیعت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اب اضطراب کی چلتی پھرتی تصویر دیکھئے:۔

کبھی گوشے میں وہ مُنہ ڈھانپ کے چلاتی ہے — اور کبھی صحن میں گھبرا کے نکل آتی ہے
کوکھ پکڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے — ڈھونڈتی ہے مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے

تن کو لغزش ہے جُدا۔ اور ہے مُنہ زرد جُدا
دل تڑپتا ہے جُدا۔ سینے میں ہے درد جُدا

پھر علی اصغر کی ماں کہتی ہیں۔

٭ بعض آدمی فرماتے تھے۔ کہ یہ مرزا صاحب کا پہلا مرثیہ ہے۔ بعض کہتے تھے۔ کہ پہلا یہ نہیں ہے مگر ابتدائی مرثیوں میں اس کی بہت شہرت ہوئی تھی ۱۲ مؤلف حقیر۔

ابتدائی مشق کے مرثیہ مرزا صاحب کا جس نے شہرت پائی

تصویر تنہائی اور رات کا سماں

اضطراب

بُوند پانی کے لئے ہائے تری جان گئی + اماں صدقے گئی۔ واری گئی۔ قربان گئی

پھر کہتی ہیں۔ ؎

تم نے بیٹا مری گودی کو کیا کیا خالی + بخدا میرے حسابوں ہُوئی دُنیا خالی

میرے حسابوں خاص عورتوں کا محاورہ ہے۔ گو بعض مرد بھی بولتے ہیں۔ آگے چل کر اپنی مصیبت میں محویت بیان کرتی ہیں۔ کہ ؎

مصیبت میں محویت

مَیں نہیں جانتی ہوتا ہے زمانے میں کیا + ہُوں وہ بے خود کہ نہیں مجھ کو خبر ہوتی ہے

شام کب ہوتی ہے۔ کس وقت سحر ہوتی ہے

باوصف عطف و اضافت اعلان نون

اس زمانے میں باوصف عطف و اضافت بھی نون کا اعلان شاعروں میں جائز ہی نہیں تھا۔ بلکہ فصیح سمجھا جاتا تھا۔ کہ بولنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جزدانِ قرآن کے بولنے میں عام طور پر ہر شخص نون کا اعلان کرتا ہے۔ اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب بھی اُس زمانہ کے مرثیوں میں باوصف عطف و اضافت نون کا اعلان کرتے ہیں۔ اور بہت سے الفاظ اور ترکیبیں جو زمانہ مابعد میں متروک ہُوئے۔ اور خود مرزا صاحب نے بھی ترک کر دئے۔ اُس زمانہ کے مرثیوں میں جو نظم کر چکے تھے۔ وہ یُوہیں ابتک چلے آتے ہیں۔ گویا زبان حال سے اپنی تاریخ تصنیف بتاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر فہرست ایسے الفاظ کی پیش کرتا ہُوں:۔

فصل ۵
فہرست بعض الفاظ کی جو خود مرزا صاحب نے بعد کے مرثیوں میں ترک کردئے

نمبر شمار	مصرع	نمبر مرثیہ	نمبر صفحہ	کیفیت
۱	بے گور پڑا رن میں شہنشاہ عرب ہے	۱	۱۹۸	پڑا اور ہے میں فصل ہے +
۲	ہُوں میں وا اسد دل و جاں سے قربان علی	۲	۱۴۴	دل و جان میں عطف ہے۔ پھر بھی نون کا اعلان ہے۔ ہر چند دل و جاں بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اُس وقت تک ایسا اعلان فصیح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جو

نمبر شمار	مصرع	نمبر جلد مراثی	نمبر صفحہ	کیفیت
				دل وجان چھپا ہے۔ وہی صحیح پایا جاتا ہے +
۳	قیمت ان کی مجھے یا حیدر صفدر دیجے	۳	۱۰۵	دیجے بعد کو ترک فرما دیا۔ دیجئے لاتے ہیں +
۴	کربلا کو حرم سرور ذی شان چلے	۳	۱۶۵	ذی شان میں بحالت اضافت نون کا اعلان ہے۔ ہرچند بعض شعرا کا خیال یہ ہے۔ کہ یہ مرکب عربی کی لفظ ہے۔ اس لئے اس میں بحالت اضافت بھی اعلان نون جائز ہے۔ مگر بعد میں خود مرزا صاحب نے احتیاطاً ترک فرما دیا ہے +
۵	دین احمد مختار کا مقبول کیا ہے	۳	۱۹۰	بجائے قبول کیا ہے کے اُس زمانہ کا روزمرہ ہے +
۶	خوش ہوئینگے پاؤں پہ آنکھوں کے ملنے سے	۴	۷۷	اب ایسے مقام پر ملنے سے بولتے ہیں۔ یہ پُرانا محاورہ تھا +
۷	وہ بولی تسلّی تمہیں دے آتی ہے بھائی	۴	۲۱۸	اب یُوں بولتے ہیں۔ دینے آتی ہے یا دینا آتی ہے +
۸	دُلھن کا محافہ جو لگا اُن کے در سے	۹	۱۱۰	دُلھن فعلن کے وزن پر۔ بعد کو ترک کر دیا۔ فعُولُ کے وزن پر رہا +
۹	وہاں سے جاکے بقبر رسول رو روکر	۵	۱۹۳	بقبر کی ترکیب فارسی آمیز بعد کو ترک کر دی +
۱۰	باطل کو حق سے تیغ نے یُوں کر دیا پرے	۸	۱۷۴	پرے دہلی کا محاورہ ہے۔ لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مرزا صاحب کا بچپن کا محاورہ اُن سے نہیں چھُوٹا۔ کہ دہلی کی پیدائش تھی۔ پانچ سات برس کی عمر تک وہاں رہے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء تک کے مرثیوں میں نظر آتا ہے +
۱۱	جب عنقریب دشت نجف کے ہوا گذار	۹	۱۴	عن قریب ایسے موقع پر بعد کو ترک کر دیا۔ اب صرف زمانہ

نمبر شمار	مصرع	نمبر جلد	نمبر صفحہ	کیفیت
				کے لئے بولتے ہیں +
۱۲	یہ صدا آئی بگوشِ پسرِ شاہ نجف	۵	۵۸	بگوش کی ترکیب کو بعد کو ترک کر دیا +
۱۳	قتلِ حسینؑ ہیں تا خراب ذری	۵	۱۶۸	ذری کو بعد میں ترک کر دیا۔ ذرا ہر موقع پر آتا ہے +
۱۴	ہمسائے میں تیرے ہیں یہ سب بھوکی پیاسیاں			بجائے بھوکی پیاسی کے بھوکی پیاسیاں دہلی کی زبان کی ترکیب ہے۔ جو لکھنؤ والوں شیخ ناسخ رہا اور اُن کے معاصرین نے ترک کی۔ مرزا صاحب کے بھی بعد کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ جس میں یہ مصرع ہے۔ اُس کا مطلع یہ ہے۔ ع جب قیدیوں کو راہ میں ماہ صفر ہوا +

سنہ ۱۲۴۰ھ کے بعد مرثیہ ۵۰ بند سے آگے بڑھا مرثیہ جس میں روایت نظم کی

سنہ ۱۲۴۰ھ کے قریب اور اُس کے بعد مرثیہ کی لے بڑھی۔ مرثیوں میں روایتیں نظم ہونے کے سبب سے مرثیہ ۵۰ بندوں سے آگے بڑھا۔ ستّر اسّی بند کا ہونے لگا۔ یہ میر ضمیر مرحوم کا پہلا ایجاد تھا۔ روایت کے نظم کرنے میں علاوہ محاورہ بندی کے رسم و رواج کا بھی خیال کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کا مرزا صاحب کا یہ مرثیہ ہے۔ ؎

اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو

اس میں وہ روایت نظم کی ہے۔ کہ ایک شخص ایک ہرنی کا بچّہ جناب رسول خدا صلعم کے واسطے تحفہ لایا تھا۔ (امام) حسنؑ پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے اُن کو دے دیا۔ وہ گھر لیکر پہنچے۔ اپنی ماں اور بھائی کو دکھایا۔ (امام) حسینؑ بھی مسجد میں آئے۔ کہ میرے حصّہ کا بھی بچّہ ہوگا۔ یہاں دُوسرا بچّہ آہو نہ پاکر اپنے ناز اُٹھانیوالے نانا سے رُوٹھ گئے۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولے۔ حضور صلعم نے پُوچھا۔ ؎

کس چیز کی خواہش ہے تمہیں کیا نہیں ملتا — دیکھو تو سہی ملتا ہے اب یا نہیں ملتا

سب کچھ نہیں موجود ہے فوراً جو کہے تُو — بس دیر ترے ہونٹ ہلانے کی ہے گل رُو

آگے تو نہ تھی ایسی تری رُو ٹھنے کی خُو   کیا لوگے بتاؤ؟ کہا شبیرؑ نے - آہُو

آہُو کہا اور لوٹ گئے خاک کے اُوپر

صدمہ ہُوا رُوحِ شہِ لولاک کے اُوپر

اب جناب رسول خدا صلعم اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ~~~

سمجھا کے حسنؑ کو یہی آہُو تجھے لے دُوں   وہ کہنے لگے کا ہیکو لُوں۔ بھائی سے کیوں لُوں

لُوں میں تو کوئی اور ہی لُوں۔ ورنہ خفا ہُوں   کم پیار ہمارا ہُوا۔ اور بھائی کا افزوں

شہ نے کہا ہم اور ہی آہُو تمہیں دینگے

وہ بولے کہ وعدہ نہیں۔ ہم تو ابھی لینگے

نازوں کا پالا نواسا اپنے ناز بردار نانا سے ناز کرتا ہے۔

مانُونگا نہ مَیں دیجئے لاکھ آپ دلاسے   ہو گا یہ گلہ۔ فاطمہؑ و شیرِ خدا سے

اور دو ہیں آہُو اگر الطاف و عطا سے   پھر تم وہی نانا ہو وہی ہم ہیں نواسے

غمگین ہے پر آہُو جو ابھی پاتا ہے شبیرؑ

نانا کے گلے ہنس کے لپٹ جاتا ہے شبیرؑ

المختصر دُوسرا بچہ آہُو امام حسینؑ کے واسطے جب آیا۔ اور جناب رسول خداؐ نے ان کو عطا فرمایا۔

تب سر کو جھکائے ہُوئے ہاتھوں کو بڑھایا   باہیں گلے میں ڈال کے نانا کو سُنایا

اماں سے نہ کہنا کہ یہ گودی میں نہ آیا   بابا سے نہ کہیو کہ مجھے اس نے ستایا

نازاں ہیں سب اطفال تو ماں باپ کے اُوپر

پر ناز ہمارے ہیں فقط آپ کے اُوپر

یہ روایت آہُو نظم کر کے پھر اسی مرثیہ میں ربط دیگر امام حسینؑ کا سفر کرنا اور کربلا میں آنا اور شب عاشور عمر ابن سعد سردار لشکر یزید کو تنہائی میں بُلوانا اور اُس کا مع ایک فرزند اور ایک غلام کے آنا نظم کیا ہے جب حضرت کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ مقام خلوت

دوسری روایت

پر آگیا۔ تو آپ چلے۔ علی اکبرؓ ساتھ ہوئے۔ پُوچھا۔ تم کیوں چلتے ہو۔ کہا اُس کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ آیا ہے۔ پھر آگے بڑھے۔ کہ پاؤں کی آہٹ معلوم ہُوئی۔ پھر کر دیکھا۔ کہ جاں نثار بھائی (حضرت عباسؓ) چلے آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نہ تکلیف کرو۔ مَیں اسد اللہ الغالبؑ کا فرزند ہُوں۔ میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ عباسؓ نے کی عرض نہ مانینگے کبھی ہم

ہمراہ عمر کے ہے غلام عمر اس دم
کس طرح مَیں چھوڑوں تمہیں اے سیّد اکرم

مَیں خاص غلام اور تم آقائے دوعالم
تم جانتے ہو۔ اعدا میں نہ ساتھ آؤں مَیں کیونکر

ایمان مرا جاتا ہے۔ پھر جاؤں مَیں کیونکر

اس مصرع آخر کے معنی کی بلاغت پر غور کیجئے۔ ایک معنی تو یہ ہُوئے۔ کہ خود امام حسینؑ کو اپنا ایمان قرار دیتے ہیں۔ کہ آپ میرے ایمان ہیں پھر میں ساتھ کیوں نہ چلوں۔ کیونکر پھر جاؤں۔ دُوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ میرے لوٹ جانے میں میرا ایمان جاتا رہیگا۔ مَیں ضرور ساتھ چلُونگا۔ بعض صاحب مرزا صاحب کے کلام پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ بعض مضمون تو مرزا صاحب کے بہت بلند ہوتے ہیں مگر پھر وہ سلسلہ ترقی مضامین کا قائم نہیں رہتا۔ اُس کے بعد مضامین گرے ہُوئے ہوتے ہیں۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ شاعر یا مبصّر کلام شعرا ہو کر تو کوئی منصف مزاج ایسا اعتراض نہ کریگا۔ کیونکہ یہ بات تو کسی انسان (غیر معصوم) کے کلام میں ممکن نہیں۔ کہ سب کلام یکساں ہو۔ پھر مرزا صاحب کی تخصیص کیوں۔ بات یہ ہے۔ کہ جس بلندی پر پہنچ کر مرزا صاحب کا شہباز طبیعت شکار لاتا ہے۔ عام شاعروں کے شکرے وہاں تک رسائی سے مجبور ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ کبھی کبھی جب مرزا صاحب کو کوئی عالی درجہ کا مضمون مل جاتا ہے۔ تو پھر بہت دیر تک وہ خود بھی ویسے یا اُس سے بہتر مضمون لانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ ع یہی ہے فرق بندے اور خدا میں۔ آپ اسی مصرع کو دیکھ لیجے۔ ع ایمان مرا جاتا ہے پھر جاؤں مَیں کیونکر۔ کبھا دُوسرے شاعر کے خیال میں آسکتا ہے۔ المختصر یہ روایت نظم فرمائی ہے۔ کہ امام حسینؑ نے ابن سعد کو بہت سمجھایا۔ اور اُس وقت وہ مکّار نیم راضی بھی ہوگیا۔ کہ

مضمون کی ترقی و تنزل

ابن زیاد کو صلح کے لئے لکھیگا۔ مگر پھر صبح کو انجام یہ ہوا۔ کہ ؎

واں کفر کی صف۔ یہاں صف اسلام کھڑی تھی + اور فیصلے کو بیچ میں تلوار پڑی تھی

مرزا صاحب کی معلومات بہت بڑھ گئی تھی۔ کہ شاعری کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا تھا اس لئے روایتیں (جو عربی زبان کے محفوظ صندوقوں میں مقفّل تھیں) اُنھوں نے خوب خوب نظم کیں۔ اُن کے اور معاصر جو اتنی لیاقت علمی نہ رکھتے تھے۔ اُن کے مقابلہ کی کوشش کرتے تھے۔ مگر کچھ خداداد دماغ اور کچھ لیاقت علمی کے (کمال کے) سامنے اُن کا چراغ نہ جلتا تھا

روایات مرزا صاحب نے خوب خوب نظم کیں

اب مرثیہ گوئی نے تیسرا پلٹا کھایا۔

مرثیہ گوئی نے تیسرا پلٹا کھایا

جناب میر ضمیر صاحب مرحوم نے سراپا و رزم و طولانی رجز کو مرثیہ میں بڑھایا۔ اور چہرۂ خاص آب و تاب کے ساتھ نظم فرمایا۔ تمہید بیان کر کے مطلب کی طرف گریز فرمائی۔ جس طرح قصیدہ میں ہوتی ہے۔ اور ان مضامین کے بڑھنے کے ساتھ مرثیہ کے بندوں کی تعداد بھی ۱۰۰ پر یا اس سے زیادہ (نمبروں) عددوں پر پہنچا دی۔ اور اُس کے ساتھ ہی صاف لفظوں میں یہ دعوے بھی کر دیا۔ کہ میں اِس طرز خاص کا موجد ہوں چنانچہ ایک مرثیہ میں جس کا یہ مطلع ہے کہ ع کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے مقطع میں فرماتے ہیں۔

سراپا و رزم مرثیہ میں داخل ہوا

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبیؐ کے	سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجر نبیؐ کے (۱۲۴۹ھ)
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے	اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا

اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر[۱] صاحب کے برابر کے اُستادوں میں میر خلیق[۲] ۔ مرزا فصیح[۳] ۔ منشی دلگیر[۴] موجود تھے۔ میر خلیق و منشی دلگیر تو وہی بہئیت مختصر مرثیہ کہتے رہے۔ مگر مرزا فصیح مرحوم نے بعض مرثیہ رزمیہ فرمائے۔ اور خوب فرمائے۔ ادھر مرزا دبیر نے اپنے اُستاد کی تقلید میں اُسی

حال شاہزادہ علی اکبرؑ میں اُسی طرز کا ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیہ کے مطلع میں بھی وہی شان ہے مطلع یہ ہے ؏ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل[1] سنہ ۱۲۵۰ھ بارہ سو پچاس اور اُس کے بعد کے اکثر مرثیے مرزا صاحب کے سو ڈیڑھ سو یا زیادہ بند کے ہیں۔ اور اُن میں سراپا و رزم وغیرہ ہے ؂

اب یہ بھی کہدوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت کے زمانے میں تین طرح کے شاعر لکھنؤ میں تھے۔ اور ہر فرقہ اپنی زبان کو زیادہ فصیح اور ٹکسالی سمجھتا تھا۔ (۱) وہ شعرا جو خود دہلی کے تھے یا اُن کے والدین دہلی کے تھے۔ اور وہ لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ مرزا صاحب اس صنف میں سے تھے۔ اور یہ لوگ بعض الفاظ یا بعض ترکیبیں زبان دہلی کی اپنے کلام میں ضرور لاتے تھے۔ اور اس کو اپنا تمغائے زبان سمجھتے تھے جیسے مرزا صاحب کے کلام میں ورے۔ پرے اور ا تے لیے اور بعض الفاظ نظر آتے ہیں۔ (۲) وہ شعرا جو دہلی وغیرہ سے فیض آباد میں جا بسے تھے۔ اور پھر جوانی یا بڑھاپے میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے کلام میں بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی تھیں۔ جو فیض آباد میں فیض پانے کی خبر دیتی تھیں[2]۔ (۳) وہ شعرا جو محض لکھنؤ کی

فصل ۶ مرزا صاحب کی شہرت کے زمانہ میں لکھنؤ میں تین قسم کے شاعر تھے

---

[1] ہائے اردوئے معلےٰ سے نا واقفی بھی کیا بری بلا ہے۔ مولوی عصمت اللہ الشیخ طاب ثراہ اغلاط میں ہمارے اُستاد شیخ امام صاحب کے اس شعر کے نالوں کے الم ہم بھی ضرور آئینگے ہو گی جو اب نو محرم میں ترے گھر محفل۔ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ گو محفل و مجلس مرادف ہے۔ مگر محرم کی محفل نہیں البتہ محرم کی مجلس سُنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ صاحب نے سنا ہی کیا ہے سچ ہے تمام دنیا کی خبریں جاننا ہر ایک شاعر ہو سکتا ہے۔ اور معترض کی بھی اسی قدر معلومات ہو بجائے مجلس محفل مرادف ہے پہلے محفل زیادہ بولتے تھے اب مجلس زیادہ بولا جاتا ہے۔ سنہ میں میر و دبیر کے یہی مطلع بطور گواہ عادل پیش ہیں ۱۲ مؤلف

[2] احسن صاحب کا یہ لکھنا کہ میر انیس صاحب اپنی زبان فیض آبادی پر فخر فرمایا کرتے تھے بیجا ہے۔ اصل نہیں ہے۔ اور کبھی اہل لکھنؤ سنا کہ میر صاحب کبھی کبھی صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ صاحب اہل لکھنؤ نہیں ہیں مگر میری زبان ... وہ بھی مرد ... تو فیض آبادی ... دہلی کی زبان انکو فخر تھا ... فضل علی ... میں اللہ ... لکھنؤ ... افسوس بعد ۴

پیدائش تھے۔ خواہ اُن کے والدین بھی لکھنؤ کے تھے۔ خواہ دہلی کے سوا کہیں اور سے آئے تھے۔ ازبسکہ اُسی زمانے میں اہل لکھنؤ نے اہل زبان ہونیکا دعوے کیا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو اہل زبان سمجھتے تھے ٭

المختصر مرزا صاحب نے اوّل اوّل مرثیوں میں بین عمدہ کہکر نام پیدا کیا۔ اور محاورہ کا خیال رکھکر سلیس اردو میں سیدھے سادے مرثئے کہے۔ پھر جو لکھنؤ میں باریکیاں اور صنعتیں بڑھتی گئیں۔ وہ بھی ہر رنگ میں مرثئے کہتے گئے۔ ادھر قدرتی شاعری پر علم کی صیقل ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر رنگ میں اُن کا کلام نظر آتا ہے۔ اور اس کثرت سے ہر رنگ میں کہا ہے۔ کہ دریا بہا دئے ہیں۔ چنانچہ خود وہ دعوے فرماتے ہیں ؎

اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام ٭ ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

کہیں تو وہ اس قدر صاف و سلیس نظم کہتے ہیں۔ جو اس شعر (حقیر ثابت) کی مصداق ہے ؎

یہ نظم مصفا پہ دھوکا ہُوا ٭ کوئی باتیں کرتا ہے بیٹھا ہُوا

اور کہیں ایسا دقیق کلام نظر آتا ہے۔ کہ بڑے بڑے شعرا و علما گھنٹوں غور فرماتے ہیں باریکیوں کو سمجھ کر لطف و حظ اُٹھاتے ہیں۔ اگر غور سے آپ دیکھینگے۔ تو ہر صاحب علم مصنف کے کلام میں آپ کو (خواہ وہ کلام نثر ہو یا نظم ہو) ایسا دقیق کلام ضرور ملیگا۔ مَیں اپنے دعوے کی تائید میں اُن بزرگوار کا کلام پیش کرتا ہُوں۔ جن کا کلام کلام اللہ کے بعد فصاحت و بلاغت میں یکتا مانا گیا ہے۔ وہ کون؟ جناب امیر علیہ السلام ہیں۔ کتاب مستطاب نہج البلاغہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ اوّل تو اکثر خطبوں میں بعض دقیق جملے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص خطبۂ شقشقیہ میں۔ پھر ایک خاص فصل ایسے دقیق جملوں کی ہے جس کی سرخی (ہیڈ نگ) سید رضی (رضی اللہ عنہ) نے یہ لکھی ہے۔ فصل نذکر فیہ شیئاً من اختیار کلامہ المحتاج الی التفسیر٭۔ افسوس اب علوم مشرقیہ کی ایسی کچھ کمی ہوتی

٭ یعنی اب ہم کچھ ایسا اُن حضرت کا کلام لکھتے ہیں جو تفسیر کا محتاج ہے۔ جناب مفتی عبد اللہ مصری کی محشی نہج البلاغہ میں صفحہ ۲۰۲ سے یہ فصل شروع ہوتی ہے ٭ مرزا

جاتی ہے۔ کہ لوگ دقیق کلام کو جو فی نفسہٖ ہنر ہے ایک عیب سمجھتے ہیں۔ خیر جاہلوں سے ہمیں
کیا شکایت۔ جو شخص اہل علم بنتا ہے۔ اور پھر ایسی شکایت کرتا ہے۔ کہ وہ کلام بہت
مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ اُس سے ضرور شکایت ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ مرزا صاحب
کا لکھنؤ میں وہ زمانہ تھا۔ کہ جب لکھنؤ علوم مشرقی کا مجمع و مرکز ہو رہا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ
اُس کے قریب قریب کی اکثر بستیاں بلگرام۔ کاکوری۔ موہان کنتور۔ جرول۔ جائس۔ بدایوں۔ امروہ
نصیر آباد۔ سندیلہ۔ خیرآباد وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کی خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ عربی و
فارسی کے علوم کے ساتھ ساتھ سیکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ لکھنؤ کے عالم سے لیکر
جاہل تک۔ بولتے تھے*۔ اور ہر لفظ و محاورہ وہ لوگ موقع سے استعمال کرتے تھے۔ اب
جو جو عربی۔ فارسی اس ملک میں کم ہوتی جاتی ہے۔ وہ بیچارے الفاظ بھی اپنا بستر باندھے
جاتے ہیں۔ لوگ اُن کو غریب سمجھتے ہیں۔ خیر اس زمانے میں اگر کوئی نیا شاعر وہ الفاظ لائے۔
اور کوئی اُن کو غریب و ثقیل بتائے۔ تو چنداں مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے
کہ جس کلام کو یقیناً ستر ساٹھ برس پہلے کا سمجھتے ہیں ۱۲ اور اُن میں اہل علم کی زبان کے الفاظ

*۔ دہلی میں بھی عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے عالم سے لیکر جاہل تک بولتے تھے چنانچہ راجہ شو پرشاد صاحب ستارہ ہند اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۳ء (موسومہ "کچھ بیان اپنی زبان کا") میں لکھتے ہیں کہ "ایک شاعر دہلی کے نواح میں پہنچا۔ پوچھا قلعہ کتنی دور ہے۔ لوگوں نے جواب دیا پاس ہے۔ آگے بڑھکر پوچھا۔ جواب ملا نزدیک (نزدیک) ہے۔ پھر پوچھا تو جواب پایا نزدیک ہے۔ آگے بڑھکر پھر پوچھا تو لوگوں نے کہا۔ قریب ہے۔ جب قلعہ کا دروازہ دکھلائی دیا پھر پوچھا۔ وہاں لوگوں نے بتایا متصل ہے۔ اب اس سے آپ لوگوں کو قلعہ کی اردو کے معنے کی بالکل حقیقت دریافت ہو جائیگی"۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جو جو دہلی نزدیک آتی گئی عربی و فارسی الفاظ کی زیادہ بوچھاڑ ہوتی گئی۔ دہلی کے قصبات قریبہ میں شاید اس کثرت سے اہل علم نہ تھے جتنے لکھنؤ کے قریب قصبات و دیہات میں تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے گرد و نواح میں بھی عربی و فارسی الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ اور مفہوم کو جاہل بھی صحیح طور پر سمجھ لیتے تھے۔ گو لغوی معنی نہ جانتے تھے۔ پس اس زمانہ کی نظم میں جو کثرت سے عربی و فارسی کے الفاظ تمام شعرا کے یہاں نظم ہیں۔ اُن کو غریب و ثقیل و غیر فصیح کوئی اہل عقل نہیں کہہ سکتا۔ یہ خیال غدر ۱۸۵۷ء کے تقریباً بیس سال بعد پیدا ہوا ہے۔ کہ عربی و فارسی کے الفاظ نظم میں کم آئیں۔ اور اُسی زمانے سے الفاظ عربی و فارسی بھی زبان سے اُٹھتے جاتے ہیں۔ اور اُن کی عوض اردو یا انگریزی الفاظ زبانوں پر جاری ہوتے جاتے ہیں۔ ع کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

پاتے ہیں۔ اُن کو ثقیل و غریب بتاتے ہیں۔ جن لوگوں کو علم السنہ سے کام پڑا ہے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں۔ کہ جو الفاظ جس زمانہ میں بولے جاتے ہوں۔ اگر وہ اُسی زمانہ کے شاعر یا ناثر کے کلام میں ہوں۔ (ہر چند زمانہ مابعد میں متروک ہو گئے ہوں) وہ ثقیل (ہرگز) نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جناب مفتی عبدربہ مفتی دیارِ مصر نے جو اس زمانہ کے ادیب کامل و فاضل متبحر تھے۔ اپنی کتاب شرح (حل الفاظ) نہج البلاغہ کے دیباچہ میں فرمایا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ "چونکہ عبارت کتاب نہج البلاغہ دقیق ہے۔ اور ہم لوگ اس زمانہ میں ہیں۔ کہ اصل زبان عرب سے بہت کچھ نا آشنا ہو رہے ہیں۔ لہذا بعض بعض الفاظ غریب ملتے ہیں۔ مگر وحشت و تنافر سے معرا و پاک ہیں۔ بعض ایسی دقیق ترکیبیں ملتی ہیں۔ مگر تعقید سے مبرا ہیں۔ یہ قصور ہمارے فہم کی کمی کا ہے۔ معاذ اللہ مصنف کا ہرگز نہیں ہے"۔ مرزا صاحب کے یہاں جس طرح عربی و فارسی کے الفاظ اور بعض ترکیبیں فارسی آمیز نظر آتی ہیں۔ ویسی ہی حالت اُن کے تمام اہل علم معاصرین شعرا کی ہے۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ۔ وزیرؔ۔ برقؔ رشکؔ وغیرہ سب کو دیکھ جائیے۔ پس اس کو رواج یا فیشن کہنا چاہیئے۔ اس پر بجز کم فہم یا جاہل شخص کے کوئی اہل علم معترض نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اُن کی بندشوں میں عطف و اضافت کی بھی کثرت ہے۔ جس طرح اُن کے معاصرین اہل علم کے کلام میں ہے۔ والد مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جناب میر کلو عرش خلف میر مرحوم نے بہت کوشش کی۔ کہ عطف و اضافت کم آئے۔ مگر اُن کی ایک نہ چلی۔ مرثیہ گویوں میں دلگیر مرحوم عطف و اضافت کم لاتے تھے۔ اُن کی مشق سلیس کلام کی پرانی مشق تھی۔ شیخ ناسخ مرحوم کو بھی وہ کلام دکھاتے رہے۔ جب کبھی وہ اپنے رنگ پر قائم رہے ناسخ مرحوم نے کبھی اُن کو اُن کے حال پہ چھوڑ دیا۔ اور سمجھ لیا کہ یہ مشق اُن کی پرانی ہے۔ اپنی طرز کو یہ نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ پرانی وضع و طرح جو میر مرحوم و مصحفی کی تھی۔ وہ یہی

الفاظ غریب نہج البلاغہ میں ہیں

معاصرین مرزا مرحوم کے کلام میں الفاظ عربی و فارسی

عطف و اضافت کی کثرت

پرانی وضع سیدھی سادی تھی

محاورہ بندی کی سیدھی سادی تھی۔ اوّل اوّل سید انشا نے اور پھر شیخ ناسخ اور اُن کے معاصرین آتش و ضمیر اور اُن کے ساتھ ساتھ دبیر مرحوم نے نظم اردو میں رنگینیاں پیدا کیں۔ پُرانے مشّاقوں کے دلوں میں اس نئی تراش و خراش نے خراش پیدا کیا۔ چنانچہ مصحفی اپنے آخر زمانہ کے ایک قطعہ میں اس کی شکایت بالفاظ ذیل فرماتے ہیں:-

(شکایت مصحفی نظم رنگین و دقیق کی نسبت)

تھا جو شعر راست سرو بوستانِ ریختہ ۔۔۔ اب وہی ہے لالۂ زرد خزانِ ریختہ

آگے کچھوے کی کماں کے قدر کیا اگلی رہی ۔۔۔ تھی نصیرآبادی گو اپنی کمانِ ریختہ

پیچ دیئے لفظ و معنی کو بتاتے ہیں کلفت ۔۔۔ اور وہ پھر اس پہ رکھتے ہیں گمانِ ریختہ

فہم میں اتنا نہیں آتا بحکم رائے پست ۔۔۔ اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شانِ ریختہ

خوان لغمابن کے پہنچا ہر کس و ناکس کے ہات ۔۔۔ قطع سلطاں کا جو تھا مخصوص خوانِ ریختہ

جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفی ۔۔۔ خلط میں جاتا رہا حسن زبانِ ریختہ

مگر معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اپنی روش پہ اس بڈھے مشّاق سخن کو بھی کھینچ لایا۔ کہ مصحفی کے دیوان ششم میں کہیں کہیں اس طرز جدید کی جھلکی نظر آتی ہے۔ المختصر مرزا صاحب مرثیہ کو اپنے اُستاد کے ساتھ ساتھ اس رنگین پٹری پر لائے۔ اور اُس میں طبیعت کی روانی اور علم کی روشنی نے علاوہ نئے مضمون کے اور اور جدّتیں پیدا کیں۔ ہزاروں آیتوں اور حدیثوں کے مضامین آسان الفاظ اردو میں نظم کر دئے۔ چنانچہ وہ اس بات کو جابجا کہتے ہیں۔

(آیات اور احادیث کے مضامین نظم مرزا دبیر مرحوم کی)

ہے مجھکو استفادہ حدیثوں کی سیر سے ۔۔۔ واللہ ننگ و عار ہے مضمون غیر سے

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں ۔۔۔ ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

(کلام معصومین سے مضامین مرزا دبیر کے)

کلام معصومین علیہم السّلام سے جو مضامین مرزا صاحب نے لئے ہیں۔ وہ مفصل لکھوں۔ تو بارہ چودہ جزو کی ایک مستقل کتاب ہو جائیگی۔ اس لئے فقط دو تین نمونے دکھاتا ہوں:۔

(۱) جناب امیرؑ ایک مختصر خطبہ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں۔ ان المرء اذا هلك

قال الناس ما ترک و قالت الملئکہ ما قدم^ک - اس کا ماحصل اس رباعی میں نظم فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی عزت بڑھاتے ہیں :-

مال و زر دُنیا جسے ہات آیا ہے + مشکل سے کفن بعد فنا پایا ہے

چرچے یہ۔ یہاں ہوتے ہیں کیا چھوڑ گیا + پرسش یہ وہاں اُس سے ہے کیا لایا ہے

(۲) امام حسین ع نے اتمام حجت کے واسطے لشکریان یزید سے یہ بھی فرمایا تھا انا سبط المصطفیٰ وستقتل عطشانا[۲] - اس کا مضمون کس خوبصورتی سے اس ٹیپ میں نظم کیا ہے ؎

اک دم میں پھر احمد کا نواسا نہ ملیگا + دریا کے کنارے تمہیں پیاسا نہ ملیگا

(۳) امام حسین ع رجز میں فرماتے ہیں ؎

فَاَبِی شَمْسٌ وَاُمِّی قَمَرٌ + فَاَنَا الْکَوْکَبُ وَابْنُ الْقَمَرَیْنِ

اس کا خلاصہ و ماحصل مرزا مرحوم نے نظم کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :-

ہے مشرق و مغرب میں کوئی میرے برابر
بابا مرا خورشید ہے مادر مہ انور
اور اُس مہ و خورشید سے نکلا ہے جو اختر
وہ میں ہوں چھپاتے ہو جسے خاک کے اندر

ہے نحس تمہیں کو یہ عمل حکم خدا سے
عقرب کا طریقہ نہ کرو آل عبا ع سے

دوسرا شعر امام مظلوم ع کے رجز کا یہ ہے ؎

فِضَّۃٌ قَدْ خُلِصَتْ مِنْ ذَھَبٍ + فَاَنَا الْفِضَّۃُ وَابْنُ الذَّھَبَیْنِ

مرزا مرحوم نے اس کا ماحصل یہ نظم کیا ہے :-

---

[۱] جب آدمی مرجاتا ہے۔ تو دُنیا کے آدمی پوچھتے ہیں۔ کیا مال چھوڑ گیا۔ اور فرشتے اُس سے پوچھتے ہیں۔ کیا (اعمال خیر) لایا ہے ؎ یہاں ہے مال کی پرسش وہاں اعمال کی پرسش + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] میں محمد مصطفیٰ کا نواسا ہوں۔ اور پھر عنقریب پیاسا قتل ہوا چاہتا ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

وہ نقرہ بے عیب کہ زر سے ہوئے پیدا ہے ذات مری۔ اور وہ زر حیدر و زہرا

جیتے ہوئے اُن کے کوئی آنچ نہ آئی اصلا تم کرتے ہو کُشتہ پئے سیم و زر دُنیا

کُشتہ بھی جو ہم ہونگے تو اکسیر بقا ہیں

اب عیسئے دوران ہیں تو پھر خاکِ شفا ہیں

تیسرے مصرع میں ایک روزمرّہ لطیف عین موقع پر نظم فرمایا ہے۔ آنچ آنا آفت آنے کے معنی پر اردو میں بولا جاتا ہے۔ اور چاندی اور سونے کو تپاتے ہیں۔ یہ آنچ آنیکی خصوصیت سیم و زر سے ہے۔ چوتھے مصرع میں کُشتہ کی لفظ عجیب لطیف آئی ہے۔ کُشتہ ایک تو مقتول کے معنی پر آتا ہے۔ دُوسرے چاندی کا کُشتہ ہوتا ہے۔ کُشتہ سے اکسیر بنتی ہے۔ پس کُشتہ ہو کر اکسیر ہو جانیکا ثبوت کس قدر عمدہ ہے۔ کہ بعد شہادت ہم خاکِ شفا ہونگے۔ خاکِ شفا تربت امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حیات و ممات میں ہم یکساں فیض رساں ہیں۔ اب اگر عیسئے عہد میں تو مرنے پر شہید راہ خدا ہو کر خاکِ شفا کا کام دینگے*۔

صنائع لفظی و معنوی

فصل ما صنائع لفظی و معنوی

جب مرزا صاحب کو سلیس نظم پر (اور زبان پر) مشق و قدرت ہو گئی۔ اور معلومات بھی بڑھ گئی۔ تو صنائع و بدائع کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس بات کا خیال رکھا۔ کہ ایسے اشعار بے تکلف (حتے الامکان) ہوں۔ اور اس میں ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اور اُن کا اس قسم کا کلام بھی اکثر شعرا سے بہتر ہے۔ یہ بات جب صاف نظر آتی ہے۔ جب دُوسروں کا کلام صنائع و بدائع مرزا صاحب

* اور بھی اشعار رجز امام حسینؑ کا ماحصل مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے جس کو میں نے جلد دوم حیات دبیر میں نقل کیا ہے۔ وہ مقام دیکھنے کے قابل ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے کلام کے ساتھ پڑھا جائے[1] اب میں ایک ایک صنعت لکھ کر چند اشعار مرزا صاحب کے لکھتا ہوں سخن فہم غور فرمائیں *

طباق - اس صنعت کو تقابل - تضاد - مطابقت - تطبیق - تکافو بھی کہتے ہیں - اسی کی ایک شاخ صنعت مقابلہ ہے - یہ صنعت قرآن شریف میں بھی موجود ہے - تحسبھم ایقاظاً وھم رقود الآیہ[2] - یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کردیں - جو آپس میں مطابق یا متقابل یا متضاد ہوں - اب ایسے اشعار مرزا صاحب کے سنئے :-

(۱) شجاع ازلی حسینؑ ابن علیؑ لڑنے کو میدان میں آتے ہیں - لشکریان یزید کہ رہے ہیں :-

حق یہ ہے رگ و ریشہ میں ڈر بیٹھ گیا ہے * کیا پاؤں اٹھیں رن کو کہ جی بیٹھ گیا ہے

اٹھیں اور بیٹھ گیا میں تضاد ہے *

---

[1] مولوی شبلی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۸ پر گویا مانا ہے کہ مرزا صاحب میر صاحب سے ان اوصاف میں بڑھے ہوئے ہیں - مگر ازبسکہ ان کو امر گوارا نہیں کہ کسی صنعت کلام میں بھی مرزا صاحب کو ترجیح و تفضیل دی جائے اس لئے وہ یوں بات بناتے ہیں کہ میر صاحب کی اصل فطرت میں سلامت روی و اعتدال تھا اس لئے وہ خیال بندی و مضمون آفرینی میں بقول ان کے حریفوں کے مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کرسکے - دیکھئے یہاں خیال بندی و مضمون آفرینی کو جو شاعری کی روح رواں ہے خلاف اعتدال و فطرت بتاگئے - اب جبکہ میں نے اکثر صنائع قرآن شریف میں دکھادئے ہیں جنکو وہ خلاف فطرت بتاتے ہیں یا ضد اعتدال و سلامت روی قرار دیتے ہیں خصوصاً جبکہ کلام دبیر صنائع میں سلیس بھی ہے - تو اس کو وہ کیا کہینگے - اگر اب بھی نہ مانیں تو میں کہونگا - وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں - ع مقتضائے طبیعتش این است * ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] تو ان کو جاگتا ہوا سمجھتا ہے اور وہ سورہے ہیں - جاگنے اور سونے میں تضاد ہے - بعض بزرگوار ان صنائع کی نسبت دبیر کی ضد میں آکر فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں دربار فصاحت و بلاغت میں نامقبول ہوچکی ہیں جیسا کہ پروفیسر آزاد مرحوم نے بعض لوگوں کا قول نقل فرمایا ہے - میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا قرآن شریف سے بڑھکر مسلمانوں کے اعتقاد میں دربار فصاحت و بلاغت کوئی اور ہے اور اگر نہیں ہے - اور مرزا صاحب نے صنائع و بدائع بے تکلف نظم فرمائے ہیں تو انکو ماننا پڑیگا کہ دربار بلاغت و فصاحت کے مرزا صاحب ضرور باریاب دربار ہیں - اور جو صاحب مسلمان ہوکر نہ مانینگے میں ان کے لئے دعا کرونگا کہ خدا قرآن شریف سے انکو ہدایت کرے - واضح ہو کہ جو شخص محض واقعہ کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور ان صنائع و بدائع سے اس کا کلام خالی ہے وہ شاعر نہیں بلکہ تک بند ہے - بیشک واقعات کو الفاظ میں دکھا دینا ایک خوبی ہے - مگر جب کلام میں بلاغت کے اور اصول بھی پائے جائینگے جبھی وہ کلام منیع سمجھا جائیگا - ورنہ نہیں * ۱۲ مؤلف حقیر -

(۲) رجز میں امام حسینؑ فرماتے ہیں۔

جب روز حساب آئیگا فریاد کروگے + بھولے ہوئے ہو خیر کبھی یاد کروگے

(۳) عید آئی ہے۔ اور حسنینؑ کے پاس پوشاک نہیں ہے۔ اُس موقع پہ کہتے ہیں ؎

رنگین لباس سے تو یہ خود ناامید تھے + نیرنگ دیکھنا کہ نہ رخت سفید تھے*

(۴) رات اخیر ہوئی۔ صبح نمودار ہے ؎

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا + پھر مشک شب جہاں سے کافور ہوگیا

(۵) دُنیا مقام عبرت ہے۔ ہر شخص مرنے کو پیدا ہوا ہے ؎

جو مر گئے مٹی ہیں جو زندہ ہیں مریں گے + تجھ کو بھی یوں ہیں بعد ترے یاد کریں گے

(۶) شجاعت جناب امیرؑ اور بیر السلم میں جنوں پر فتح پانا ؎

جنات پہ تو فتح نہ پائی تھی کسی نے + اس آگ کو پانی کیا کس طرح علیؑ نے

(۷) حبیب ابن مظاہر اسدیؑ کی بڑھاپے میں ثابت قدمی (میدان جنگ میں) ؎

سر ملتا ہے پر سر کف پا رن میں جمی ہے + جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

(۸) جناب زینبؑ دربار یزید میں سفیر سلطان رُوم سے فرما رہی ہیں (امام حسینؑ کی نسبت) ؎

حق پر ہوا ہے فرقہ باطل سے پوچھ لے + سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

(۹) حضرت عباسؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ خوف و رعب چھایا ہوا ہے ؎

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحہ خیر + کہتے ہیں انا العبد لرز کر صنم و دیر

(۱۰) اے خانہ خراب قبر تیری خاطر + کھویا بھی جو نقد جان تو کیا خاک لیا +

(۱۱) آتے ہیں وہ دن لطف جوانی نہ ملیگا + ہم خاک میں مل جائینگے پانی نہ ملیگا +

(۱۲) اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر + جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا +

(۱۳) منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے + انصاف تو کہتا ہے خداوند یوں ہیں ہے +

* جز جز الفاظ مطابقت بالتضاد ہے۔ میں نے آن بر ا۔ ۲ کے ہندسے بنا دئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۴) حق عاشقی حق کا ادا اس نے کر دیا + دشمن کو راہ دوست میں خوش ہو کے سر دیا +

(۱۵) یکساں نہیں رکھتا ہے فلک دورِ کسی کا + یاں آج ترا ہے دورِ کل اور کسی کا +

(۱۶) ہے فاش ہر اک شامی بد ذات کا پردہ + چھپ جانے کو دن ڈھونڈتا ہے رات کا پردہ +

(۱۷) لینا نہ منہ پہ ڈھال کر دینا جناب ہے + دینا نہ آبرو کہ یہ موتی کی آب ہے +

(ترقی و تنزل) (حضرت عباس علی علیہ السلام کی تعریف میں)

(ایہام)

ایہام - یہ بھی صنعت طباق کی ایک پھلی پھولی شاخ ہے - اس کی قسمیں ایہام اتضاد و ایہام تناسب ہیں - ایہام کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں - یعنی ایسے دو لفظ آئیں جو بظاہر آدمی کو وہم میں ڈالیں - کہ یہ باہم ضد و متقابل یا متناسب ہیں - مگر اُن میں سے کسی ایک کے معنی مصنف نے دُوسرے لئے ہوں - قرآن شریف میں بھی یہ صنعت اس آیت میں موجود ہے - والشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان - نجم کے دو معنی ہیں - ایک ستارہ - دُوسرے وہ نبات جو ساق نہیں رکھتی - جیسے ساگ وغیرہ - اور جو نبات ساق دار ہے - اُس کو شجر کہتے ہیں پس شمس و قمر کے ساتھ ساتھ نجم آنے سے یہ وہم ہوتا ہے - کہ نجم سے مراد ستارہ سے ہو گی - مگر یہاں نبات بے ساق کے معنی پر آیا ہے - یہ صنعت بھی مرزا صاحب کے یہاں ہے +

(۱) عرشی فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے + ہشیار - خبردار - پرے[1] - دور کنارے +

(۲) سر سبز ہے نجف کا یہ سخن گر و نہیں ہے + آمد[2] کے مضامین ہیں آورد نہیں ہے +

(حضرت عباس کی تعریف میدان کو جانے میں)

(۳) عبداللہ ابن عامر صحابی جناب رسول خدا کے گھر لڑکی (ہند) پیدا ہوئی ہے - وہ جناب فاطمہ زہرا کے قدم کے نیچے کی خاک خوش اعتقادی سے دامن میں باندھ کر گھر لے گیا - اور

[1] پرے کے ایک معنی لشکر کی ایک ٹولی - دُوسرے معنی پرے ہو یعنی پیچھے ہو جاؤ - جو ورے کی ضد ہے دہلی والے بولتے ہیں - عام اہل لکھنؤ میں مدت سے متروک ہے - یہاں معنی آخر لئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] آمد کے دو معنی ہیں - ایک تو حضرت عباس کے میدان جنگ میں آنے کے مضمون ہیں - دُوسرے آمد کے مضامین جو فی الفور ذہن میں آ جاتے ہیں - اس کی ضد آورد ہے - یہاں معنی آخر معنی مراد ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر -

لڑکی کی آنکھوں میں بجائے سُرمہ لگائی۔ اُس روایت کو نظم کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:-

اُس خاک کا سُرمہ جو دیا آنکھوں میں گہرا
ہر چشم میں اک نُور کا چشمہ گیا لہرا
تھا خاک میں نورِ قدم فاطمہ زہرا
پارا ہُوا کاجل نہ کسی آنکھ میں ٹھہرا

یہاں مصرع چہارم میں صنعت ایہام ہے۔ ایک تو یہ معنی ہیں۔ کہ کاجل پارہ ہوگیا۔ اُڑ گیا۔ دُوسرے یہ کہ عورتیں کاجل پارتی ہیں۔ یعنی دیسی تیل چراغ میں جلا کر ایک سکورا اُس پر ڈھکر کاجل اُس کے دھوئیں سے لیتی ہیں۔ اُس کو پارا ہُوا کاجل کہتی ہیں۔ یہاں یہی اصطلاح رکھی ہے۔ اس لئے صنعت ایہام ہے*

مراعات النظیر اور اُس پر ایک بحث

مراعات النظیر۔ اس صنعت کو توفیق۔ تناسب۔ ایتلاف۔ رعایت لفظی بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت بھی طباق کی گویا چھوٹی بہن ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے۔ کہ اس میں ایسی چند چیزیں مذکور ہوتی ہیں۔ جو باہم ضد و مقابل تو نہ ہوں۔ مگر متناسب ہوں۔ صاحب حدائق البلاغہ نے ایہام متناسب کو اسی سے ملحق بتایا ہے۔ اس صنعت کا حسن یہ ہے۔ کہ بہت ابھری ہُوئی رعایت نہ ہو۔ ورنہ پھر اُس کو ضلع جگت کہینگے۔ اُس میں ایک قسم کا ابتذال ہو جاتا ہے۔ اُردو کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ولی دکھنی کے بعد جو دہلی وغیرہ میں شاعران اردو ہُوئے۔ اُن کو اس کا اور ایہام کا بڑا شوق تھا۔ حضرت سودا کے وقت میں بھی عام شاعروں کو یہ سودا تھا۔ حضرت سودا اور جناب میر مرحوم نے جو اس کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں قدرتی شاعر اس کی بھلائی اور بُرائی اور قابل استعمال مقدار مناسب کو خوب جانتے تھے۔ اور ذوق سلیم پایا تھا۔ چنانچہ حضرت سوداؔ فرماتے ہیں۔

کامل فنِ سخن کہتے ہیں اُس کو اکمل
پرورشِ لفظ کی منظور ہو جس کو اوّل
پر نہ یاں تک کہ عبارت ہی کو کر دیں مہمل
اعتقاد اُن کا ہے یُوں۔ وہ جو کہے ہیں اجہل

مُو نہ ہو پرورشِ شانہ میں تو ہو مُوسَل

میر صاحب ایہام کے باب میں فرماتے ہیں[1]۔ در شاعران سلف این فن رواج داشت اکنوں طبعہا مالوف باین صفت کم است۔ مگر بسیار برجستگی ورفتگی بستہ شود۔ یعنی ایہام این ست کہ لفظے کہ بر او بنائے بیت بود۔ آں دو معنی دارد۔ یکے قریب۔ دویم بعید۔ و بعید منظور شاعر باشد۔ و قریب متروک۔ اُس کے بعد انشا و مصحفی کے زمانہ میں بھی اس کا زور کم رہا۔ ناسخ رح کے زمانہ میں تو متانت اس قدر رواج پاگئی تھی۔ کہ اُبھری ہُوئی رعایت لفظی اور ایہام وغیرہ کے پر جلتے تھے۔ آتش رح بھی سلجھے ہُوئے شاعر تھے۔ ناسخ رح کے بعض شاگردوں میں پھر اس رعایت لفظی نے آکر جنم لیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اور بھی لکھنؤ کے شاعروں میں یہ رنگ اُچھلا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اس کو لکھنؤ کا ہی رنگ کہنے لگے۔ مگر بعض شعرائے لکھنؤ نے اس تہذیب و متانت سے اس رنگ کو اختیار کیا۔ کہ زمانہ (حالانکہ اس رنگ کے گویا خلاف ہے۔ مگر پھر بھی) اُن کا لوہا مانے جاتا ہے۔ جیسے گلزار نسیم مشہور و مقبول مثنوی یا صبا وغیرہ کی بعض غزلوں میں ہے[2]۔ مَیں نے لکھنؤ کے بڈھے بڈھے اہل سخن سے اس رنگ کے عام پسند ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اُس زمانہ کے شعرا میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا تھا۔ کہ اردو کا مکمل لغت (مع مصطلحات) کلام شعرا سے طیار ہو۔ اور زبان اردو میں وسعت پیدا کی جائے۔ کہ ہر قسم کے روزمرّے۔ محاورے۔ اصطلاحات۔ امثال کثرت سے نظم ہوں۔ ان سب کے

---

[1] اگلے شاعروں میں ایہام بہت رُائج تھا۔ اب طبیعتیں اس سے کم مانوس ہیں مگر بہت خوبی و صفائی سے باندھا جائے۔ ایہام کی تعریف یہ ہے کہ جس لفظ پر بنائے بیت ہو اُس کے دو معنی ہوں ایک قریب فہم دُوسرے بعید فہم اور شاعر نے بعید الفہم معنی رکھے ہوں اور قریب الفہم کو چھوڑ دیا ہو ۔ ۱۲ مُولف

[2] گلزار نسیم میں اس صنعت کے بیشمار رنگا رنگ پھول کھلے ہُوئے ہیں مزہ دار پھل لگے ہُوئے ہیں ہر چند زمانہ میں دُوسری ہوا چلنے لگی اور لوگ ایسی صنعتوں کو تکلف بلکہ تکلیف دہ سمجھنے لگے مگر بحمد اللہ چشم بد دور گلزار نسیم خزاں سے محفوظ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی رعایت لفظی اُبھری ہُوئی نہیں ہے۔ اور نسیم باتیں ہی نہیں بناتے۔ بلکہ رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ مضامین کے گلدستے پیش کرتے ہیں خواجہ حالی پانی پتی مدظلہ کے سوا ہر اہل سخن اُس کا ہوا خواہ ہے۔ ملاحظہ ہو خواجہ حالی صاحب کا دیباچہ دیوان بحث شعر و شاعری پر ۔ ۱۲ مؤلف

واسطے رعایت لفظی وایہام سے بڑھ کر کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے اکثر شعرا ناسخ مرحوم کے انتقال کے بعد ادھر جھک پڑے۔ اور رعایت لفظی وایہام وغیرہ کے خوب گل کھلائے۔ گل چھرے اُڑائے۔ جناب **امانت** مصنف اندرسبھا کو اس صنعت کا بڑا شوق تھا۔ اُن کے قدم بقدم مشیر لکھنوی مرثیہ گو نے چل کر سرسبجوں میں سرسوں کے پھول کھلائے ہیں۔ باغ نظم میں نئے گل بوٹے لگائے ہیں۔ جن کا مثل ونظیر آج روے زمین شاعری پر مجھ کو نہیں ملتا۔ جن بعض ذیعلم ومتین شعرا نے اُس کو اُبھرنے نہ دیا۔ اور مضمون کو مقدم رکھا۔ اُنہیں میں سے ہمارے ممدوح دبیر مرحوم ہیں +

اس میں شک نہیں۔ کہ اگر یہ رعایت لفظی وایہام خوبصورتی سے بندھ جائے۔ تو کلام میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک شعر بہادر شاہ ظفر مرحوم اخیر بادشاہ دہلی کا مجھے بہت پسند ہے۔ وہ یہ ہے۔ ؎

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑے کی طرح صاف جواب + اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

اس میں ایک محاورہ ٹکڑے کی طرح توڑ کے جواب دینے کا اور دوسرا گھر کے ٹکڑے کھا کر پلنے کا نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔ اور ٹکڑے کے لفظ میں صنعت مراعات النظیر ہے۔ یہ شعر ضرور قابل تعریف ہے۔ جو لوگ اس رنگ کو محض اس خیال سے ناپسند کرتے ہیں۔ کہ یہ لکھنؤ کا رنگ خاص ہے۔ اور وہ خود دہلی کے رنگ کے پسند کرنے والے ہیں۔ وہ زبان کا مذاق سلیم نہیں رکھتے۔ یا تعصب زبانی ومقامی سے کام لیتے ہیں۔

(حکایت ولطیفہ) نانا مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جس زمانے میں (عہد آخر محمد علی شاہ و عہد امجد علی شاہ مرحومین میں) لکھنؤ میں یہ رنگ اُچھل رہا تھا۔ مرزا صاحب نے تلوار کی شرر افشانی میں ایک مرثیہ میں یہ ایک بند کہا تھا۔ ؎

شامی کباب تھے یہ ہوئے جب شرر فشاں ۔ اہل تتار۔ بن کے ہرن۔ رن سے تھے رواں
مصری۔ نہ بات کر سکے سب بولے الاماں ۔ بُت بن کے گر رہ گئے۔ پتھرائیں پتلیاں

بہادر شاہ ظفر مرحوم کا شعر رعایت لفظی

حکایت ولطیفہ

زرداِرہ۔ زرد ہو کے گُلِ اشرفی بنے
نصرانی۔ خاک ہو کے گُلِ ارمنی بنے

لوگوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دئے۔ لکھنؤ میں بڑا شہرہ ہُوا۔ حالانکہ مرزا صاحب کو نہ اس رنگ پر فخر و ناز تھا۔ نہ وہ اس کو دل سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ مگر ازبسکہ ہر رنگ میں کہتے تھے۔ اس طرز میں بھی کہدیا۔ اُس زمانے کے ایک مشہور شاعر تھے جو مرزا صاحب کے مقابلہ کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیاب نہ ہوتے تھے[1] اُنھوں نے بھی اسی طرز میں ایک بند کہا۔ اور لوگوں سے کہا کہ مَیں نے ایک مرثیہ کہا ہے۔ جس میں اکثر صنائع و بدائع ہیں۔ اگر کوئی بڑی مجلس ہو۔ تو مَیں پڑھوں۔ مگر دبیرؔ و انیسؔ کے لکھنؤ میں ایسے جھنڈے گڑے ہُوئے تھے۔ کہ ان دونوں کے سوا کسی تیسرے ذاکر کے پڑھنے کی مجلس میں ویسا مجمع مشکل سے ہوتا تھا[2] آخر جب بڑی مجلس میں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ تو اُنھوں نے ایک بڑے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے پُوچھا۔ صاحبو۔ اگر اجازت ہو۔ تو ایک اپنے نئے مرثیہ کے (رزم کے) چند بند غزل سے پہلے سُناؤں؟ چاروں طرف سے (اُن کے شاگردوں اور طرفداروں کی) آوازیں بلند ہُوئیں بسم اللہ۔ ضرور عنایت کیجے۔ اُنھوں نے چند بند پڑھ کر ایک بند کا صرف ایک مصرع (مندرجہ تحت) پڑھا۔ شامی کباب تھے جو پسندِ قضا ہُوئے۔ اس میں شامی کباب کی

---

[1] مَیں نام نہیں لُونگا۔ کیونکہ کسی اُستاد کی منقصت کرنیکو مَیں ناپسند کرتا ہُوں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اور اگر مجمع کثیر ہوتا تھا۔ تو پھر انہیں دونوں (دبیرؔ و انیسؔ) کے کسی مشہور شاگرد کی مجلس میں۔ آغا میر اور شیخ امیر علی بیر صاحب کے شاگردوں میں۔ اور میر شرف الدین و میر محمد رضا و میرزا مغل مرزا صاحب کے شاگردوں میں لکھنؤ میں بہت اچھے پڑھنے والے ذاکر زمانہ شاہی میں مشہور تھے۔ میر مظفر حسین صاحب مدظلہ (جن کا ذکر خیر پہلے ہو چکا) مجھ سے فرماتے تھے کہ مقبولیت مَیں نے میر محمد رضا ظہیر کے پڑھنے کی مجلس میں دیکھی۔ کہ اُسی محلے میں میر صاحب یا مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں! اور وہیں قریب یہ پڑھ رہے ہیں! اور دونوں جگہ معقول مجمع ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

رعایت لفظی لپسندے کے ساتھ تھی۔ اور وہ بزرگوار رومی کا لبادہ پہنے ہوئے تھے کچھ پہلے سے پھولے ہوئے تھے۔ کچھ اہلِ مشاعرہ کی تعریفوں سے اور بالیدہ ہوگئے۔ کہ اے سبحان اللہ۔ واہ وا۔ ماشاء اللہ۔ کیا کہنا۔ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ ایسی ایسی آوازیں بلند ہوئیں۔ انہیں آوازوں میں ایک شخص نے آوازہ کسا۔ کہ "چھوڑ دے بغل سے **بھیڑ کا بچّہ**"۔ ایسی پھبتی پھبی۔ اور ایسا قہقہہ ہوا۔ کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے بعض شاگرد بولے۔ ہائیں یہ کون تھا۔ کوئی بولا۔ اِدھر سے آواز آئی۔ کوئی بولا اُدھر سے۔ مگر تحقیق نہ ہوسکا۔ کہ یہ کون ذات شریف تھے۔ وہ شاعر کچھ ایسے غصّہ ہوئے۔ کہ معمولی غزل بھی اُنھوں نے نہ پڑھی۔ اور مشاعرہ بھی برخاست ہوگیا +

المختصر مرزا صاحب کے کلام میں رعایت لفظی اُبھری ہوئی بہت کم ملیگی۔ گویا نہیں ملیگی۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جن میں رعایت متانت کے ساتھ ہے۔

واللہ ہات دُونگا نہ۔ فاسق کے ہات میں — سر جائیگا پہ فرق نہ آئیگا بات میں

ہر مورچہ لرزاں ہے۔ سلیماں کی ہے آمد — فرعونیوں پہ موسئے عمراں کی ہے آمد

جن سیر کو نکلے تھے پہ رستے سے مڑے ہیں — پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اُڑے ہیں

ہر عُہدے پہ سرگرم خوصیں ہوئیں آکر — مُنہ ہات دُھلانے لگی اک اشک بہاکر

اک جامے سے باہر ہوئی پوشاک پہناکر — اک تکیہ بزانو۔ ہوئی مسند کو بچھاکر

آئینہ دکھاکر۔ اُسے حیران ہوئی کوئی

سر گوندھ کے بی بی کا۔ پریشاں ہوئی کوئی

دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں — پوشیدہ ہیں پانی میں مگر۔ کانپ رہے ہیں

نظارہ غنیمت رُخ پر نُور کا جانا — موسے کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا

مشہور زباں ہی عرش [illegible] ہیں — واللہ کسی بات میں ہم بند نہیں ہیں

(۱) ہزنا مرجب
(۲) الف
(۳) الف
(۴) ہندرہ حال میں
(۵) خود نمٰ
(۶) امام عصرع
(۷) [illegible]

صنعت عکس

خود پیاسے ہیں جو چاہیں جسے آب بقا دیں   جس کو مرض الموت ہو ہم اُس کو شفا دیں

عکس۔ اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے۔ کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں۔ پھر اُن دونوں کو اُلٹ پلٹ دیں۔ یعنی دُوسرے کو پہلے لے آئیں اور اوّل کو ثانی کر دیں۔ یہ صنعت قرآن شریف کی اس مشہور آیت میں ہے۔ یخرج الحیّ من المیّت و یخرج المیّت من الحیّ [1] مرزا صاحب اس صنعت میں فرماتے ہیں۔

انصاف کہاں ہے ہو کہ دل صاف نہیں ہے ٭ دل صاف کہاں ہے ہو کہ انصاف نہیں ہے

ناظرین انصاف سے دیکھیں۔ الفاظ انصاف و دل صاف کو کس صفائی سے عکس و تبدیل کیا ہے۔ صنعت کا کمال دکھایا ہے [2]۔ صنائع و بدائع کے پسند کرنے والوں پر منحصر نہیں۔ عام

---

[1] لفظی معنی یہ ہوئے کہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو خدا نکالتا ہے۔ مرادی معنی یہ مشہور ہیں۔ کہ عالم سے جاہل کو اور جاہل سے عالم کو خدا پیدا کرتا ہے ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس موقع پر اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ایسی صنعت لطیف کو ایک مسلمان عالم بلکہ شمس العلماء وہ کون؟ مولوی شبلی صاحب یعنی اس شعر کو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں جن کی رگ غصہ مرزا صاحب کے محاسن کلام دیکھ کر فوراً استادہ ہو جاتی ہے۔ اور فوراً یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عیب لگاؤں۔ ملاحظہ ہو موازنہ کا صفحہ ۲۶۵ و ۳۴۸۔ دُوسرا اتہام یہ لگایا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے اس شعر کو اڑایا ہے ٭ عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے۔ اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ میر صاحب کا شعر مقدم ہے۔ اس سے زیادہ میں اس جگہ لکھتا۔ مگر مرزا صاحب مجھے یہ اپنا شعر پڑھ کر منع فرما رہے ہیں ٭ برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے۔ آئینۂ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ اس صنعت عکس میں مرزا صاحب سے مولوی شبلی صاحب برعکس و برخلاف ہیں۔ مگر مرزا صاحب کا آئینۂ دل اُن سے بھی صاف ہے۔ اس لئے میں نے سمجھا۔ کہ مرزا صاحب نے مولوی صاحب کو بخش دیا۔ مگر میں مؤدبانہ و مہذبانہ مولوی صاحب کو مشورہ دیتا ہوں۔ کہ زندگی کا اعتبار نہیں۔ قرآن شریف میں یہ صنعت ہے۔ اور اس کو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں۔ اعتراض اُنکا جناب احدیت تک پہنچتا ہے۔ جلد توبہ کر کے خدا سے اپنی صفائی حاصل کر لیں۔ میں نے دوستانہ عرض کیا۔ اب مولوی صاحب کو ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے ٭ حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس۔ دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

طبیعتوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور کیسی سچی بات کہی ہے۔ کہ جس شخص کا دل صاف نہ ہوگا۔ انصاف کیا خاک کریگا۔ اور جس کی طبیعت میں انصاف نہ ہوگا۔ کبھی اُس کا دل صاف نہ ہوگا۔

رجوع۔ یہ صنعت اس طور پر ہے۔ کہ خود ہی شاعر پہلے ایک بات کہتا ہے۔ پھر خود ہی اُس کی تردید کر کے دُوسری بات کہتا ہے۔ اس طرح وہ مدح میں ترقی کرتا ہے۔ مرزا صاحب سراپائے جناب علی اکبرؑ میں فرماتے ہیں:۔

رجوع

بینی کی ثنا مثلِ قلم زیبِ ورق ہے — انگشتِ یدِ قدرتِ حق کہئے تو حق ہے
ابرو کے شرف کا سرِ بینی پہ سبق ہے — یہ ناخنِ انگشتِ یدِ قدرتِ حق ہے

دل شیعوں کا چسپیدہ نہ کیوں اس سے سدا ہو
ممکن نہیں ناخن سے کبھی گوشت جدا ہو*

خورشید جبیں کا سرِ بینی ہے یہ اظہار — خورشید یونہیں نیزے پہ کل ہوگا نمودار
تو یہ کہاں نیزہ کہاں۔ بینی خوش اطوار — چشم علی اکبر ہے درِ رحمتِ غفار

درباں کہوں ابرو کو یہاں میں تو بجا ہے
بینی مبین حاجب ابرو کا عصا ہے

*پہلے تو بینی کو قلم سے مثال دی پھر دستِ قدرتِ حق کی انگشت بتا کر ابرو کو ناخن سے تشبیہ دی پھر نیزے سے تشبیہ دیکر پیشانی کو آفتاب بتا کر یہ گریہ خیز مضمون پیدا کیا کہ کل یہی آفتاب (سر علی اکبر ہم شکل محبوبِ خدا) نیزے پر علم ہوگا جس طرح مشہور ہے کہ قیامت میں سورج نیزے پر ہوگا پھر اُس پر ترقی دیکر آنکھ کو رحمتِ خدا کا دروازہ بتلایا۔ اور بھوؤں کو دربان۔ اور دربان کا عصا بینی کو بتایا پھر اس مضمون سے ترقی دیکر یہ مضمون فرمایا کہ ناک دونوں آنکھوں کے درمیان میں مثل تکیے کے ہے۔ اور مردم بیمار (پُتلیاں) اِدھر اُدھر ہیں مگر یہ معمولی بیمار نہیں ہیں بلکہ خدا کی محبت کی شراب میں ایسے مست مخمور ہیں کہ بیہوشی میں بھی خدا کے سوا کسی سے تکیہ (بھروسہ) نہیں کرتے۔ اور پلکوں کے سوا نام کو بھی بستر نہیں رکھتے ایسے آزاد ہیں اس کے بعد ان تمام مضامین پر ترقی کر کے فرماتے ہیں کہ یہ قلم ہے نہ نیزہ۔ نہ عصا ہے نہ تکیہ بلکہ دو عالم کا نور سمٹ کر ایک جگہ ہو گیا ہے اس لئے غش ہونیکا مقام ہے۔ تجلی تو دیکھکر حضرت موسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کو غش آگیا تھا۔ تو دیکھکر غش آنا ایک مشہور معمولی بات ہے۔ اس لئے غش ہونیکا مقام کہا۔ دونوں آنکھیں عالم نور ہیں اور دونوں آنکھوں میں سے ناک بین السطور ہے پس گویا دو عالم کا نور سمٹ کر بینی میں آگیا ہے ہمشکل محمد مصطفےٰ صلعم کی مدح واقعی سب حسینوں سے الگ اور ایسی ہی اعلےٰ ہونی چاہیے۔ یہ خاص طرز مرزا مرحوم کا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بینی کا کھلا بیچ میں آنکھوں کے یہ اسرار ہے بیچ میں اک تکیہ دو جانب ہیں دو بیمار
بیمار ہیں مخمور مئے الفت غفار بیہوشی میں بھی غیر یہ تکیہ نہیں زنہار

پلکوں کے سوا نام کو بستر نہیں رکھّا
سونا کہاں تکئے پہ کبھی سر نہیں رکھّا

پھر مدحت بینی میں مری عقل رسا ہے نیزہ ہے نہ تکیہ ہے نہ خامہ نہ عصا ہے
اب ہم سے محبان علیؑ پوچھیں یہ کیا ہے ہشیار ہو ہشیار یہ غش ہونے کی جا ہے

بینی کی زیارت کرو آداب سے ہٹ کر
اک جا ہوا ہے۔ نور دو عالم کا سمٹ کر

(۲) صنعت رجوع میں ایک یہ بند بھی مدح سراپائے ہمشکل محبوب خداؐ میں قابل صاد ہے۔

تاروں کا ہے دعوے کہ یہ رخ بدر دجےٰ ہے پر بدر ہے منکر۔ یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذرّوں کا اشارہ ہے کہ یہ شمس ضحےٰ ہے خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے

پروانہ و بلبل میں جدا بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

لف و نشر ۔ لف کے معنی لپیٹنے کے اور نشر کے معنی بکھیرنے کے ہیں۔ یہ صنعت اس طور پر ہے۔ کہ اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ پس اگر منسوبات نمبردار لائیں۔ تو اُس کو لف و نشر مرتب کہتے ہیں۔ اور یہ اعلےٰ قسم ہے۔ ورنہ غیر مرتب کہینگے +

لف و نشر

خدائے سخن فردوسی طوسیؒ کا ایک مشہور قطعہ ایرانیوں میں لاجواب مانا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند بشمشیر و خنجر و بگرز و کمند

دریدو برید و شکست و بہ بست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست*

فائدہ اس کا ظاہر ہے۔ کہ بہت بڑا مضمون تھوڑے لفظوں میں آگیا۔ یہ صنعت نظم و نثر دونوں میں آتی ہے۔

اب اردو کے خدائی سخن دبیر کی نظم اس صنعت میں سُنئے۔ اور انصاف فرمائیے کہ کس کی نظم بہتر ہے۔ یہ میں عرض کرونگا۔ کہ ایجاد و تقدم کا فخر تو فردوسی کو ہے۔ مگر وہ ایک معمولی پہلوان کی مدح کرتا ہے۔ جو اُسی (فردوسی) کا بڑھایا ہوا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

منش کردہ ام رستم داستاں — وگرنہ یلے بود در سیستاں

اور دبیر کے ممدوحٗ معمولی پہلوان نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کا زور خدا داد ایسا ہے۔ کہ ویسے بہادر خدا کی خدائی میں نہیں ہوئے۔ واقعہ کربلا زبان حال سے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ دبیر کے ممدوح کو خدا نے بڑھایا ہے۔ بہرحال کلام دبیر ایسے شجاع ازلی ولی ابن ولی جان محمدؐ دلبند علیؑ کی مدح میں ہونے سے ضرور فردوسی کے کلام پر ترجیح و تفضیل پانیکا حق رکھتا ہے۔ یا اُن کے بھائی (ابوالفضل العباسؑ) یا فرزند (علی اکبرؑ) کی مدح میں ہے۔ تو وہ کلام بھی مرتبہ میں قریب قریب اُسی مدح امامؑ کی ہے۔ یا اور شہداء کربلا کی ثنا میں ہے جب بھی دُنیا کے معمولی لوگوں سے بدرجہا بہتر و اعلےٰ ہے۔ اس راہ سے کلام دبیر کلام فردوسی سے بہتر ہے۔ اور جو صفائی اور بیساختہ پن مرزا کے کلام میں ہے۔ اُس سے بھی ضرور مرزا کے حق میں افضلیت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے۔ کہ فردوسی رحمہ نے صرف ایک قطعہ کہا۔ مرزا نے لف و نشر کے دفتر کے دفتر لکھ دئے ہیں (۱) اشجع عالم امام زماں امام حسینؑ جہاد راہ خدا کے واسطے آرہے ہیں۔ اُس آمد کی ہیبت سے جو عالم کی کیفیت ہے۔ اُس کی تصویر دیکھئے۔ اس تصویر دیکھنے کے واسطے تھوڑی دیر

*۔ میں نے لف و نشر الفاظ پر نمبر لگا دئے ہیں۔ تاکہ سمجھنے والے نمبر ملا کر سمجھ لیں یعنی تلوار سے سر کھیا (۱) (کاٹا) خنجر سے سینہ کاٹا۔

کے لئے دُوسرے عقیدہ رکھنے والوں کو بھی مصنّف کی عقیدت کی عینک لگالینا چاہئے، کہ جو امامؑ کو خدا کا جانشین زمین پر سمجھتے ہیں۔ اور ہر شئے کو امام کا تابع جانتے ہیں۔ جیسے صوفی غوث کو سمجھتے ہیں۔ اور اُس زمانہ سنہ ھ کا غوث صوفی بھی امام حسین علیہ السّلام ہی کو سمجھتے ہیں۔

لٹ چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم — وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم[1]
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم — جس طرح سے آندھی میں جُدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں۔ خوں سے۔ اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

(۲) امام حسینؑ میدانِ جنگ میں تشریف لاتے ہیں۔ عالم پر ہیبت طاری ہے۔

یاں بخت وہاں عمر ادھر عقل اُدھر ہوش — خوابیدہ و برباد و پراگندہ و روپوش
یاں ناطقہ واں حافظہ خاموش و فراموش — بے نور ادھر چشم تو بے بہرہ اُدھر گوش
واں شیرِ فلک جھکتا ہے تسلیم کی خاطر
یاں گاوِ زمیں اٹھتی ہے تعظیم کی خاطر

(۳) جہاد میں امام حسینؑ کی شمشیر شرربار (ذوالفقار) علم ہے۔

ایمان و کفر و توبہ و عصیان دمِ جہاد — یہ زندہ اور وہ مردہ یہ خوشدل وہ نامراد[2]
کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیرِ خوش نہاد — جوہر۔ کمند۔ لوک سناں۔ خود وہ برق و باد
دشمن کو قیدِ آب و خورش سے چھڑا دیا
کھینچا۔ گرایا مارا۔ جلایا۔ اڑا دیا

---

[1] صرف دل کے دو شعروں میں لف ونشر مرتب ہے۔ چرخ کو سکتہ۔ دشت کو گرد۔ کہسار (پہاڑ) کو رعشہ اور سمند کو تلاطم مصنّف نے قرار دیا ہے۔ باقی چاروں مصرع میں نے اس خیال سے لکھدئے ہیں، کہ سخن فہم ناظرین تشبیہ و مضمون کا لطف اُٹھائیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[2] ایمان زندہ ہوگیا۔ کفر مردہ۔ توبہ خوشدل۔ گناہ نامراد ہوگئے۔ کمالات متضاد جمع تھے۔ جوہر تلوار کا یہ تھا کہ دشمن کو کھانے

سراپا حضرت عباسؑ

(۴) حضرت عباسؑ کا نئے انداز سے سراپا لف ونشر میں۔ اور فقط ایک بند میں۔

طیار مرقع ہو۔ اگر نورِ خدا کا ۔ ہو زیب رقم اوج اگر عرشِ علا کا
قالب جو بنے شاہِ شہیداں کی ولا کا ۔ اور عطر کھنچے صاف گل مہر و وفا کا
مداح علمدار کے قدرت حق ہے
عباس کا یہ سر ہے۔ یہ تن ہے۔ یہ عرق ہے

(۵) جناب رسول خدا صلعم کا خاص گھوڑا عقاب نام جس پر ہمشکل محمد مصطفےٰ علی اکبرؑ (شہید) سوار ہو کر جہاد کو جا رہے ہیں۔ اُس کی مدح۔

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب ۔ لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب
خورشید و سحاب فلک و انجم و مہتاب ۔ سوزاں و خروشاں و سراسیمہ و بے خواب
بازارِ گل و موج و صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے وہ آب ہے۔ وہ گرد ہے اس سے

بدحواسی

(۶) آمد علی اکبرؑ سے لشکرِ مخالف میں جو انتشار اور بدحواسی ہے۔ اُس کی تصویر اور عام چیزوں پر اُس کا اثر شاعرانہ۔

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) پینے کی قیمت سے چھڑا دیا کہ وہ مر گیا کھانے پینے کی فکر نہ رہی تلوار کُندہ کا کام دیا۔ کہ دشمن کھینچا اور نوک سناں کا کام دیا کڑکڑا کر مارا اور بجلی کی طرح جلایا۔ آندھی کی طرح اُڑا دیا۔ اللہ اللہ کتنا بڑا مضمون ایک بند میں صفائی سے لائے ہیں۔

ایک بات

اب ایک بات اور سن لیجئے۔ فردوسیؒ کے قطعہ میں ہر ایک چیز کے دو منسوبات تھے۔ ان مرزا صاحب کے کلام کے نظائر میں ایک چیز کا ایک ہی منسوب آیا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی شخص کہے۔ کہ فردوسی کا کمال بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے اب میں مرزا صاحب کا ایک بند ایسا سُنانا چاہتا ہوں جس میں ایک ایک چیز کے گویا پانچ پانچ منسوبات ہیں۔ اور پھر لف ونشر مرتب ہے۔ غیر مرتب نہیں ہے۔ یاد رکھنا ہے کیوں نہ ہو مرزا صاحب پنجتن پاک کے مداح ہیں۔ اس لئے منسوبات بھی پانچ پانچ نکلے۔ وہ بند نمبر ۷ پر میں لکھتا ہوں سُنئے اور انصاف فرمائیے۔ کہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کا یہ قول کہ "تمام شاعروں سے فردوسی و جامی اور سعدیؒ جامی سے دبیر و انیس بہتر ہیں" کس قدر صحیح ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

تیغیں وہ کھولنے لگے جن کی بندھی تھی دھاک موجوں نے خنجر اپنے چھپائے بزیر خاک
سیمرغ و شیر و کرگدن و گرگ خشمناک پر بستہ ۔ دل شکستہ ۔ جگر خستہ ۔ سینہ چاک
سہمے ہوئے پروں میں ستمگر تڑپتے تھے
بے پر تھے مرغ قبلہ نما پر تڑپتے تھے

عون و محمد پسران زینبؑ کی مدح میں یہ بند ہے ۔ اب اس کے ساتھ شمع کو پروانے سے دریا کو شناور سے موج کو کوثر و دریا و	دو صفدر	دو شمشیریں	دو رہوار	دو نیزے	(۷)
	دو شناور	دو دریا	دو پروانے	دو شمعیں	
	دو کوثر	دو موجیں	دو صاعقے	دو بجلیاں	
	دو اختر	دو باراں تھے	دو رعد	دو ابر تھے	
	دو فلک تھے	دو مہِ نو	دو گلشن	دو سرو	
	دو ملک تھے	دو شاہیں	دو طاؤس	دو سانپ	

شناور سے ابر کو رعد باراں سے اختر کو فلک اور مہ نو سے سرو کو گلشن سے سانپ کو طاؤس و شاہین سے اور پھر پردار جانوروں سے فرشتوں کو کہ وہ بھی پر رکھتے ہیں جو جو نسبت ہے وہ غور و انصاف سے دیکھئے ۔ یہ بھی دیکھئے ۔ کہ کتنے بڑے مضامین کس قدر مختصر و مناسب الفاظ میں کس بے تکلفی سے نظم کرتے ہیں ۔ اب جو چاہے ۔ اس کو گورکھ دھندہ کہدے چاہے بھول بھلیاں ۔ مگر یاد رہے ۔ کہ عام شعرا اور خصوصاً ایسے معترض ایسی نظم کرنے سے عاجز ہیں ۔ ورنہ کہدیں ۔ تو ہم جانیں ۔ اور آئندہ ان تبرکات کو اردو میں آپ ڈھونڈینگے ۔ تو شاید ملیں ۔ کیونکہ اب زمانہ کی ہوا بدل گئی ہے ۔ دماغ نہ ایسے قوی ہوتے ہیں ۔ نہ ایسی محنتیں اب ہو سکتی ہیں *

جمع

صنعت جمع ۔ شاعر یا ناثر چند چیزیں ایک حکم میں جمع کر دے ۔ جیسے قرآن کی آیت کریمہ ۔ المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا ۔ یعنی مال و اولاد ۔ زندگی دنیا کی زینت ہے پس مال و اولاد کو ایک حکم زینت میں جمع فرما دیا ہے ۔ دیکھئے اس باغ میں مرزا صاحب کے یہاں

مدح امام حسینؑ

کیسے خوش ذائقہ پھل اور خوشنما خوشبودار پھول ہیں۔ مَیں چند نمونے دکھاتا ہوں۔ مثل مشہور ہے۔ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی۔ عام طور پر بہت مثالیں آپ کو جا بجا جلد دوم میں ملینگی ۔

(۱) نقاش و نقش و کاتب و خط و بانی و بنا — بود و نبود و ذات و صفت ہستی و فنا
آدم۔ ملک۔ زمیں۔ فلک۔ گرد۔ کیمیا — دنیا و دیں۔ حدوث و قدم۔ بندہ و خدا

سب شاہد کمال شہ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں

اس کمال کو دیکھئے۔ کہ ہر مصرع میں چھ چھ چیزیں لائے ہیں۔ نہ کم ہیں نہ زیادہ۔ اور پھر بے تکلف۔ جب تک زبان پر پوری قدرت اور طبیعت میں آمد نہ ہو۔ شاعر ایسی نظم نہیں کہہ سکتا*

مدح امام حسینؑ

(۲) باران و قطرہ۔ باغ و گل و معدن و گہر — صحرا و ذرہ۔ برج و نجوم۔ آتش و شرر
طور و کلیم و آب بقا۔ خضر نامور — ظلمات و نور و شہر و بیاباں و خشک و تر

شاہد ہیں سب۔ کہ صاحب اعجاز ہیں حسینؑ
جاں آفریں کے عاشق جاں باز ہیں حسینؑ

باران و قطرہ اور باغ و گل اور معدن و گہر اور اسی طرح تمام الفاظ ہیں جو قدرت نے مناسبت رکھی ہے۔ وہ غور سے دیکھئے۔ اور پھر ٹیپ میں جان آفریں کے ساتھ جاں باز کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہی وہ الفاظ ہیں۔ جو دبیر کے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتے۔ اور انہیں باتوں نے دبیر کو دبیر منوایا ہے۔ یہیں منکروں کے سر نیچے ہوتے ہیں۔

(۳) ذیل کے بند میں بہت سی چیزوں کو اس ایک حکم میں شامل کر دیا ہے۔ کہ سب میں ایک ایک عیب ہے۔ مگر رُخ ممدوح (حضرت عباسؑ) بے عیب ہے۔

سورج کو چھپاتا ہے گہن آئینہ کو زنگ — داغی ہے قمر۔ سوختہ دل لالہ خوش رنگ
دیکھو گل و غنچہ وہ پریشاں ہے یہ دل تنگ — کیا اصل دُر و لعل کی وہ پانی ہے یہ سنگ

اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا

بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا

کمال یہ کیا ہے ۔ کہ دُنیا بھر کی اعلےٰ درجہ کی چیزیں ہر قسم کی بیان کر کے سب کے عیب بیان فرما کر چہرہ ممدوح کو بے عیب اور سب سے بہتر ثابت فرمایا ہے ٭

(۴) مدح رخ امام حسینؑ میں بہت سی چیزوں کو ایک دُوسرے انداز بیان سے جمع کیا ہے قریباً دُنیا بھر کے تمام منوّر اور قیمتی چیزیں آگئی ہیں ۔

شمع[1] و چراغ[2] و آئینہ[3] و صبح[4] و آفتاب[5] ۔ باغ[6] و بہار[7] و یاسمن[8] و لالہ[9] و گلاب[10]

ناہید[11] و بدر[12] و مشتری[13] و قطب[14] و ماہتاب[15] ۔ آب حیات[16] ۔ لعل بدخشاں[17] ۔ دُرِ خوش آب[18]

یوسفؑ[19] ۔ اور اُن کے سارے خریدار اک طرف

سب اک طرف ۔ یہ رُوئے ضیا بار اک طرف

اُنیس[19] چیزیں جمع کر کے فیصلہ کر دیا کہ سب سے رُوئے انور بنیں[20] (بہتر) ہے ٭

(۵) یہ دو بند بھی مدح حضرت عباسؑ میں صنعت جمع میں مجھے بہت پسند ہیں ۔

(۱) ہر کلیہ میں جزو یہ ہیں چیدۂ تقدیر ۔ مردوں میں علیؑ تیغوں میں کرار کی شمشیر

فرقان کتابوں میں اور ارکان میں تکبیر ۔ عباسؑ علمداروں میں سرداروں میں شبیرؑ

سقائے حرم سا کوئی سقا نہیں دیکھا

اور ایسا علمدار بھی حقا نہیں دیکھا

(۲) شبیرؑ کے بازو بھی ہیں اور زور کمر بھی٭ ۔ رشتہ میں برادر بھی ہیں اُلفت میں پسر بھی

خادم بھی مصاحب بھی دل و جاں بھی جگر بھی ۔ اللہ کی شمشیر شہ دیں کی سپر بھی

٭ زور کمر کے لفظ میں ایک باریک کنایہ غریب کا ہے ۔ وہ یہ کہ جب حضرت عباسؑ قتل ہوئے ۔ تو امام حسینؑ فرماتے تھے اس وقت میری کمر ٹوٹ گئی ۔ ہر موقع پر بین و رقت کا پہلو نکالنا یہ مرزا صاحب کا خاص کمال ہے ٹیپ میں کمال کیا ہے شمشیر و سپر تک تو عام خیال پہنچتا ہے مگر آگے پھر خیال ہی نہیں آتا کہ کیا کہینگے مرزا مرحوم نے ترقی یہ کی ۔ کہ جب تیروں سے بدن چھن گیا ۔ تو خود زرہ کی صورت بھی بن گئے ۔ لہٰذا تلوار ڈھال کے علاوہ زرہ بھی ہیں ۔ اس میں بھی بین کا کنایہ ہے کہ حضرت عباسؑ پر تیروں کی بوچھاڑ ہوئی تھی ٭ ۱۲ مؤلف عفی عنہ

ثابت یہ ہوا رن میں جو تیر دس کے چھنے ہیں
شبیرؑ کی خاطر سے زرہ حفظ بنے ہیں

صنعت تفریق - دو امروں میں جو ایک طرح کے ہوں - فرق ظاہر کرنیکو صنعت تفریق کہتے ہیں - مرزا صاحب اس صنعت میں کہتے ہیں -

(رباعی مناقب میں)

(۱) رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہوکر | حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہوکر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر | وہ دیتا ہے رو رو کے - یہ خنداں ہوکر[1]

صفائے قلب اور آئینہ میں فرق

(۲) آئینہ کے آئین پہ میں نے جو کیا غور | منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور | پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور

جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے[2]

(۳) آئینہ اور روئے الانور جناب عباسؑ میں نہایت عمدہ فرق بتاتے ہیں -

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی | صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی

---

[1] شعرا فیاض ممدوح کو ابر - بحر کرم - سحاب کہتے ہیں - مرزا صاحب کہتے ہیں - ابر بھی موتی دیتا ہے - مگر میرے ممدوح میں اور ابر میں فرق یہ ہے - کہ وہ رو رو کے دیتا ہے - ابر کے برسنے کو رونا قرار دیا - اور حضرت ممدوح ہنس ہنس کے دیتے ہیں - یہ وہ مضامین ہیں - جن کی بدولت دبیر دبیر مشہور ہوئے - ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] شعرا دل کو اور بعض سینہ کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں - شاید طالب آملی کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے ؎ کفر است در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن - مگر مرزا صاحب دل اور آئینہ میں ایک عجیب و غریب تفریق بیان فرماتے ہیں کہ آئینہ منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ اور ہے - یہ بری صفت ہے - مگر میرا دل دونوں طرف چمک بک و صفا و جلا میں یکساں ہے - لہٰذا اس کی تشبیہ آفتاب سے درست ہے - جو دونوں طرف یکساں چمک اور روشنی رکھتا ہے - ۱۲ مؤلف -

طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی — واں خاک نے صیقل۔ یہاں قدرت نے جلا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اُس رُخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

(۴) یاقوت اور لب حضرت عباسؑ میں تفریق۔

اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے — شیریں قلموں میں رقم اس لب کی جُدا ہے
یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے — یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے
چوسا ہے یہ لب مثلِ رُطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا۔ کس روز؟ علیؑ نے

(۵) اسپ جناب رسول خدا صلعم کی مدح جس پر روز عاشورا امام حسینؑ سوار تھے۔

صانع نے گوندھ گوندھ کے ہیکل میں جو لگائے — آئینے آفتاب کے اتنے کہاں سے آئے
لائے تو سُم کی آنکھ میں وہ کس طرح سمائے — اور نعلبند چارمہ نو کہاں سے لائے
سانچہ بنا جو بدر کا۔ نو شکل سُم بنی
خورشید کی کرن جو ہوئی جمع دُم بنی

تقسیم ۔ جمع وتفریق کے بعد تقسیم بھی ایک صنعت ہے*۔ اس میں اور لف ونشر میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کہ لف ونشر میں اوّل چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔ پھر اُن کے منسوبات لاتے ہیں۔ سُننے والا خود بخود ہر ایک شے کو منسوب لیہ کی طرف منسوب وتعین کر لیتا ہے۔ اور تقسیم میں کہنے والا چند چیزیں بیان کرتا ہے۔ یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعین بیان کرتا ہے۔ اور اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ کہ کسی شے کی

لطیفہ * مجھے علم معانی وبیان کے عالموں اور شاعروں سے تعجب ہے۔ کہ جمع وتفریق وتقسیم تک تو صنعتوں کو لیا۔ مگر بیچاری ضرب کو چھوڑ دیا۔ لا الہ الا اللہ کہ کیسی ایک ضرب بس یہ بھی لگائی ہوتی۔ اور ایک صنعت کا نام ضرب بھی رکھ دیا ہوتا جو ۱۲ مؤلف حقیر

تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

اس صنعت تقسیم میں مرزا صاحب عزاداران امام حسینؑ کی مدح فرماتے ہیں

پابندی طاعت پہ ہے اس مشغلہ کو فوق — سجادؑ کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دلدل کے بنانے کا کسی شیعہ کو ہے ذوق — عباسؑ کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ۔ زہراؑ کے خلف کا
تابوت اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

(اب ان سب کی تقسیم دیکھئے۔ ہر ایک کے ثواب کو اپنے عقیدہ کے موافق بیان فرماتے ہیں)۔

تابوت اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت — دلدل کے بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی حکومت — دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابدؑ کے لئے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرہ حفظ خدا ہے

جمع و تفریق کو اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو ساتھ ساتھ لاتے ہیں۔ اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں یعنی چند چیزوں کو ایک جگہ جمع کرکے اُن کا فرق بیان کردیں یا اُن کو تقسیم کردیں۔ یا دونوں باتیں کریں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں:۔

(حضرت عباسؑ کی مدح میں)

پیدا ہوں جو ایسے چمنستانِ جہاں لاکھ — افلاک کروڑ اور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کے ہر اک قطرے سے طوفاں ہوں عیاں لاکھ — گھر گھر ہوں مسِ خضر سے۔ یوسفِ جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دُور کی شکلیں
سب نور کے رخسار ہوں سب نور کی شکلیں

کیا منہ جو نقابوں سے حسیں منہ کو نکالیں — عیسیٰؑ قسم انجیل کی بے ساختہ کھالیں
توریت کو موسیٰؑ ید بیضا پہ اُٹھالیں — فرقان میں فرق یہ خاصان خدا لیں

انصاف نہ ابڑھ کے حکم ہو کہ یوُنہیں ہے
اِتنوں میں کوئی ثنائے عباس نہیں ہے

صنعت تجرید۔ یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ کے قصد سے اُسی شے کی مانند دُوسری چیز حاصل کریں اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے۔ کہ شاعر اپنے آپ کو دُوسرا شخص قرار دے کر اپنے نفس سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے کوئی شاعر خالی نہیں ہے۔ کیونکہ فی زماننا مقطع میں ہر شاعر اسی طرح خطاب کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے نفس سے خطاب کرتے ہیں:۔

آغاز ترا خاک تھا۔ ہے خاک ہی انجام ۔۔۔ دیکھ اپنی بدی خوُب۔ بد و نیک سے کیا کام
گر مُہر نہیں دل پہ۔ تو نخوت کا نہ لے نام ۔۔۔ ناراں نہ ہو دُنیا پہ۔ نہ کر شکوہ ایام

ارشاد کیا۔ طوُر پہ مُوسٰے سے خدا نے
اچھا وہ ہے۔ جو سب سے بُرا آپ کو جانے

(یعنی اپنے نفس کو)

(پھر اپنے نفس سے خطاب ہے)

بالوں کی سفیدی سے سر مُو نہیں رنجوُر ۔۔۔ دُھوپ آگئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستوُر
ہُشیار کہ نزدیک رہا اب سفر دُور ۔۔۔ ہاں ڈُھونڈ کفن مُشکِ جوانی ہُوا کافوُر

اے مُلکِ عدم کے سفری زادِ سفر لے
مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے*

مبالغہ مقبول مقبول کی قید اس لئے لگا دی ہے۔ کہ اگر وہ طبیعتیں جن کو مذاق سلیم حاصل ہے قبول نہ کرینگی۔ تو پھر وہ صنعت نہ رہیگی۔ اس صنعت میں تو مرزا صاحب ایسے مشہور و مقبول ہیں کہ جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسہ نے ایک سائل کے جواب میں اُن کے

*۔ واقعی یہ چاروں سخت دشوار گذار گھاٹیاں درپیش ہیں۔ خدا آسان کرے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

مشہور بیت کی شرح (عشرہ کاملہ) میں لکھ کر مدح فرمائی ہے۔ اور نافہموں کو سمجھایا ہے۔ وہ بیت یہ ہے،

اس رخش کے منہ پر کوئی من جیڑھ نہیں سکتا ٭ چلنے میں یہ سرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

میں نے جناب مفتی صاحب کی عبارت اس کتاب میں ایک دُوسرے موقع پر لکھی ہے۔ اس لئے یہاں طول نہ دُونگا۔ مبالغہ سے یہ مراد ہے۔ کہ کسی شے کی صفت کو شدّت یا ضُعف میں اُس حد تک پہنچائیں۔ کہ عادتاً یا عقلاً بعید و محال ہو۔ اگر عقلاً ممکن ہو۔ تو اُس کو اغراق۔ اور عقلاً و عادتاً ممکن ہو۔ تو تبلیغ کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں مقبول ہیں۔ اور اگر عادتاً یا عقلاً دونوں طرح محال ہو۔ تو پھر اُس کو غلو کہینگے۔ یہ جب مقبول ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی ایسا لفظ لائیں۔ جو کلام کو صحت کے قریب کر دے۔ یا خیالات نازک و لطیف پیدا کریں[1]۔

(۱) مرزا صاحب کے کلام میں سے اب چند مثالیں اس کی پیش کرتا ہُوں۔ عقاب نام اسپ خاصۂ جناب رسالتمآب صلعم کی مدح میں فرماتے ہیں۔ جس پر بروز عاشورا شہزادہ علی اکبرؑ سوار تھے۔

چلنے میں یہ شمشیر ہے پلے میں یہ ہے تیر ٭ لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں ہے تدبیر

چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر ٭ جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر

مضمون ہیں بہت۔ پر کوئی دلچسپ نہیں ہے[2]

اسرار ہے۔ اعجاز ہے۔ یہ اسپ نہیں ہے

---

[1] اس نئی روشنی میں مبالغہ اکثر آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اور اکثر لوگ مذمت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ایشیائی شاعری بیچاری اسکی بدولت بدنام ہے۔ مگر وہ بزرگوار یورپ والوں کی اندھا دھند تقلید میں یہ نہیں سوچتے۔ کہ مبالغہ سے کلام میں اثر و زور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مبالغہ سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جنکو کروڑوں آدمی خدا کی کتاب سمجھ رہے ہیں۔ مثلاً بائبل کی یہ مشہور آیت کہ تجھ کو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں سُجھائی دیتا۔ دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے۔ اس بحث کو مفصل میں نے مولوی شبلی صاحب کے جوابات اعتراضات میں لکھا ہے ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ روزمرہ ہے کہ تلوار چلے۔ اور تیر کا پلہ مشہور ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں چلنے میں (گھوڑا) گویا تلوار ہے۔ پلہ میں تیر ہی تیر کی طرح جاتا ہے۔ لڑنے میں تقدیر ہے۔ یہ بھی روزمرہ ہے۔ کہ کہتے ہیں فلاں شخص کی تقدیر لڑ گئی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تدبیر بگڑ گئی۔

(۲) یہ بند اسپ جناب امام حسینؑ کی مدح میں ہے۔ یہ گھوڑا بھی جناب محمد عربی صلعم کا وفادار گھوڑا ہے۔ جس کو عام لوگ ذوالجناح کہتے ہیں۔ اور لسان الملک مرزا محمد تقی خاں سپہر مرحوم صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق مرتجز اس کا نام معلوم ہوتا ہے۔

لڑنے میں یہ ہے عقل۔ بگڑنے میں جہالت ‏ ‏ بڑھنے میں یہ ہے حرص۔ تو گھٹنے میں قناعت

جانے میں حواس آنے میں عاشق کی طبیعت ‏ ‏ مخفی ہے تو اسرار۔ عیاں ہے تو کرامت

ہر سُو جو نسیم اس کے طرارے کی بھی ہے

سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے

مذہب کلامی

مذہب کلامی۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ کسی کلام کو دلیل کے ساتھ بیان کریں۔ اور اگر تمثیل یعنی قیاس فقہا کے ساتھ کلام ہوگا۔ تو اُس کو **مذہب فقہی** کہینگے۔ قرآن شریف میں یہ آیت اول الذکر صنعت میں ہے۔ لوکان فیہما الھۃ الا اللہ لفسدتا یعنی اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے۔ تو زمین و آسمان فاسد ہو جاتے۔ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد حضرت اوج مدظلہ کا مطلع یاد آگیا۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

فساد حکم و عمل میں جُدا جُدا ہوتے + خلل خدائی میں پڑتا جو دو خُدا ہوتے

اب مرزا صاحب کا کلام اس صنعت میں سُنئے۔

(۱) ہوتی تھیں صفیں آبِ دمِ تیغ سے بے دم ‏ ‏ پانی جو کھڑے ہو کے پیو ہوتا ہے سن کم

حل کرتی تھی۔ ہر مسئلہ تیغ شہِ عالم ‏ ‏ ہے خون نجس اُس میں یہ آلودہ تھی ہر دم

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر۲) یہاں یہ غرض ہے کہ یہ اسپ اس طرح لڑتا ہے جیسے مقدّرا و غصّہ میں لُوٹی بگڑتا ہے جیسے تدبیر فوراً بگڑ جاتی ہے جیسے خواب چھپا ہوا ہوتا ہے اس طرح پوشیدہ ہے اور تعبیر خواب کی مانند ظاہر ہوتا ہے جانے میں رسولوں کی دُعا ہے کہ کہیں رُکتی ہی نہیں اور آنے میں تاثیر اجابت دعا ہے کہ انبیا کی دُعا پر فوراً تاثیر قبول نازل ہوتی ہے۔ ایسے چار مصرعوں کا ٹیپ لگانا بہت مشکل تھا۔ مگر واہ وا کیا خیال بلند اور دماغ قوی پایا ہے فرماتے ہیں۔ ان سب چیزوں سے بڑھکر یہ ہے کہ یہ اسرار و اعجاز ہے۔ اسرار گو جمع ہے مگر واحد کے معنی پر ایسے دیں مستعمل ہے۔ اسرار و اعجاز نے اوپر کے تمام مضامین کو صحت کے قریب کر دیا۔ کہ اسرار و معجزہ سے ہر نا ممکن ممکن ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

پر اس پہ نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
یعنی کہ نجس آبِ رواں ہو نہیں سکتا*

امام حسین علیہ السلام لشکریان یزید کو وعظ فرماتے ہیں

(۲) باطل ہے سوا حق کے بد و نیک کا سجدہ
ہے ایک جبین فرض ہے بس ایک کا سجدہ

اس میں یہ استدلال ہے۔ کہ اگر کئی خدا ہوتے۔ تو ایک انسان کے ماتھے بھی کئی ہوتے۔ پس ایک پیشانی ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ایک ہی خدا ہے۔ اُسی ایک کو سجدہ کرو۔ اُسی کو مانو +

فصل ۴
حسن تعلیل

حسن تعلیل۔ اس صنعت کی تعریف یہ ہے۔ کہ کسی وصف کے واسطے ایسی علّت مناسب کا دعوے کریں۔ جو درحقیقت اُس کی علّت نہ ہو۔ مگر اس کا لطف یہ ہے۔ کہ ثابت کردیں۔ باقی اس کی تعریف معانی و بیان کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیے +

واضح ہو۔ کہ شاعری کی جان یہی صنعت ہے۔ حافظ و صائب کو اسی صنعت کی بدولت لاجواب شاعر مانا جاتا ہے۔ مولوی روم کی مثنوی اسی صنعت کے سبب سے ممتاز و مقبول ہے۔ غرضکہ ہر شاعر کامل کے یہاں یہ صنعت بکثرت ہے۔ جس شاعر کی قوت دماغی جس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ اُسی قدر اُس کے کلام میں لطف تخیّل و حسن تعلیل زیادہ ہے۔ شاعر کی معراج کمال گویا یہ صنعت ہے۔ اسی صنعت کے سبب دبیر مرحوم کو ملک نے لاجواب شاعر مانا ہے۔ اسی مقام پر اور شعرا مرزا مرحوم سے نیچے نظر آتے ہیں۔ جن کو خدا نے شاعر پیدا کیا ہے۔ وہ (شاعر) نازک خیالیاں اسی صنعت کے لباس میں دکھاتے ہیں۔ اس کتاب کی جلد دوم میں اس کی ہزارہا مثالیں (غالباً) آپ کو ملینگی۔ یہاں دو چار مثالیں لکھتا ہوں۔ کہ طُول نہ ہو +

* کیا اچھا استدلال ہے۔ فرماتے ہیں۔ آبِ دم تیغ تو آبِ رواں کا حکم رکھتا ہے۔ گو دشمنوں کا خون نجس ہے۔ مگر آبِ رواں سے مل کر آبِ رواں کو نجس نہیں کر سکتا۔ اُوپر کے مصرعوں میں ایک مشہور مثل بیان کی ہے۔ کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے عمر گھٹتی ہے۔ لشکری کھڑے کھڑے [illegible]

عبرتِ عالم　فروتنی

(۱) عبرتِ عالم و بے ثباتیِ زمانہ۔

گُل پانچ روز باغ میں گُل میہماں ہے　سبزہ۔ گُل بہار کی رُخصت کا پان[1] ہے

(۲) انکسار و فروتنی کی مدح۔ اور قلم کے کاغذ پر جھکنے کی وجہ (حسن تعلیل)۔

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے　جھک کر شرفا اور نُجَبا ملتے ہیں سب[2] سے

مروت

(۳) خلق و مروّت و انکسار کی معراج کمال۔

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو　مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا[3] کو

تلمیح

(۴) صبح عاشورا امام حسینؑ نے علم رسالت پناہ صلعم نکال کر نصب فرمایا ہے۔ ابھی تک کسی کو دیا نہیں۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔

کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں　اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

تلمیح

(۵) حضرت عباسؑ علمدار کی شہادت کے بعد علم امام حسینؑ گھر میں لاتے ہیں۔

ڈیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر　ماتم کا اشارہ کیا پنجہ نے لرز کر

حسنِ تشبیہ تلوار

(۶) ذوالفقار آبدار میں سے دشمنوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔

عالم نہ پُوچھو قطرہ فشانی کے حُسن کا　جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حُسن کا

(۷) ذوالفقار نے اُن بے حیاؤں کی ناک بھی اُڑا دی۔

---

[1] رخصت کا پان چلنے وقت مہمان کو دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ باغ میں سبزہ نکلا۔ کہ گویا بہار کو رخصت کا پان پہنچا۔ اب بہار رخصت ہے۔ یہ مضمون عرب عجم کے یہاں تو کیوں ہوتا۔ کہ وہاں پان کا رواج ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک میرا علم ہے کسی ہندی شاعر نے بھی نہیں کہا ہے۔ بالکل نیا اور نازک خیال ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] فرماتے ہیں۔ قلم جو کاغذ پر جھکتا ہے یہ ادب کی افراط و زیادتی سے (کہ جو انکسار پیدا) جھکتا ہے جیسے شریف نجیب سب سے جھک کر ملتے ہیں۔ ویسے کاغذ سے قلم جھک کر ملتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] ہوا اُڑ کر غبار کو پریشان کر دیتی ہے۔ گویا دشمن ہے۔ مگر غبار اپنی دشمن (ہوا) کی بھی تعظیم کرتا ہے اسی طرح میں دشمن سے بھی خلاف مروت و حیا نہیں کرتا اور اسے بھی تعظیم دیتا ہوں۔ یہ بیت گویا مرزا مرحوم کے حسن اخلاق کا آئینہ یا فوٹو ہے ۱۲ مؤلف حقیر

چہرے سے بینی صفِ لشکر بھی دُور کی — بُت خانے سے شباہت منبر بھی دُور کی

(۸) حضرت حرؒ جری کے جسم پر جو زرہ ہے۔ اُس کی نسبت حسن تعلیل۔

زرہ حرؒ

دل صاف سینہ صاف۔ بدن صاف واہ واہ — تن پر زرہ بتاتے ہیں گو صاحب نگاہ
پر عقل کہہ رہی ہے کہ سب کو ہے اشتباہ — حرؒ کی صفائے قلب ہے اس بات پر گواہ
دل حرؒ کا مضطرب غم شاہ زمنؑ میں ہے
یہ دل کا پیچ و تاب نمایاں بدن میں ہے

یہ عجیب بات کہی ہے۔ کہ زرہ نہیں ہے۔ بلکہ دل کا پیچ و تاب صفائی قلب کی بدولت نظر آرہا ہے۔ دور سے دیکھنے والے اُس کو زرہ سمجھتے ہیں۔ رعب دلاور کی وجہ سے پاس کون جا کر دیکھ سکتا ہے۔

باغ میں فوّارہ جاری ہے

فوّارہ

(۹) فوّارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا — پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اُٹھا تھا

گرمی کی شدّت میں فوّارہ کی حسن تعلیل

گرمیٔ فوّارہ

(۱۰) فوّارہ کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی — پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

گرمی کا سماں

گرمی اور دھوپ

(۱۱) چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھُپ رہی ہے دُھوپ درختوں کی چھاؤں میں

شب عقد جناب امیرؑ

شبِ عقد جناب امیرؑ

(۱۲) ناگاہ وہ شام آئی کہ جو صبح سے لے باج — غازۂ رُخ نوروز کا عیدین کی سر تاج
حُسن شب قدر و شب بدر و شب معراج — تھی رات بھی نازاں کہ علیؑ کی ہے برات آج
کثرت وہ ستاروں کی شب جلوہ فگن پر
مشاطوں کا جھرمٹ تھا شب عقد دُلہن پر

[illegible]

سج دھج تھی عروس شب شادی کی نرالی — پھُولی شفق شام کے لالے کی جو لالی
ہلکی سی لبِ بام فلک اُس نے جمالی — پازیب بھی اور کان کے بُندے بھی ہلالی

موباف زری نظم کیا کاہکشاں کو
مضموں یہی چوٹی کا ملا اہل زباں[1] کو

تاکید المدح بما یشبہ الذم۔ یعنی مدح میں ایسی تاکید کی جائے کہ مذمت کے مشابہ معلوم ہو۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

تاکید المدح بما یشبہ الذم

(۱) بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں	ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہل ہنر ہوں[2]
(۲) میں کون ہوں صاحب علم کلک جہانگیر	نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر
تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر	خاک قدم محتشم و مقبل شبیر[3]

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے۔ خداوند یوں ہیں ہے

---

[1] یورپ میں ایسے نامور و مشہور شعرا کے کلام میں چھان بین کی جاتی ہے کہ انہوں نے پہلے پہل کون کون سے محاورے اور الفاظ نظم کیے اور کس خوش سلیقگی و صفائی سے نظم کئے ہیں یا نہیں۔ ہمارا ملک ابتک ایسے جزئیات سننے کا مشتاق ہے نہ کوئی شخص ایسی سردردی کرنیکو طیار ہے ورنہ دبیر مرحوم کے ایسے محاوروں اور الفاظ کو کوئی شخص جمع کرے تو معلوم ہو کہ جس کثرت سے اس قادر الکلام شاعر نے الفاظ و محاورے (عمدگی و روانی سے) نظم فرمائے ہیں شاید کسی اور شاعر نے نظم کیے ہوں۔ اسی ایک بند میں دیکھ لیجئے پیچ و خم بنانا۔ لالی۔ ہلکی سی جھلی۔ پازیب۔ رشتے۔ موباف۔ چوٹی۔ عروس کے سامان آرائش کے کتنے الفاظ کس حسن و خوبی سے جمع کر دئے اور ابتذال نہیں پیدا ہوا۔ چوٹی کے لفظ میں صنعت ایہام ہے۔ ایک تو یہ مراد کہ چوٹی کے واسطے موباف زری کا کہکشاں کو بنایا۔ دوسرے یہ کہ چوٹی کا مضمون ملا یعنی اعلے درجہ کا مضمون ہاتھ آیا ۱۲

[2] آسمان جو میرا دشمن ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں ایک بڑا عیب ہے بظاہر سننے والا یہ سمجھا کہ شاعر اپنا عیب بیان کرتا ہے پھر جب اس عیب کی تشریح کی تو یہ کہا کہ میں صاحب ہنر ہوں لہذا مذمت نما مدح ہوئی کہ صاحب ہنر ہونا فی الحقیقت عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ مگر دشمنی فلک کا باعث یہی ہنر ہے اسی کی لئے زمانہ دشمن ہو رہا ہے پس گویا مجھ میں یہی بڑا عیب ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] یہ چوتھا مصرع اس صنعت میں ہے کہ خاک قدم ایک ناقص چیز ہے۔ بظاہر مذمت پائی گئی۔ مگر جب الفاظ مابعد پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اہلبیت محمد صلعم کے مقبول مداحوں (محتشم و مقبل) کی خاک قدم شاعر خاکسار اپنے آپکو کہہ رہا ہے۔ یہ در اصل مدح میں تاکید ہو گئی۔ مولوی شبلی صاحب کو بے ربط فرماتے ہیں۔ یا تو انکی ناواقفی انکی معذرت خواہ ہے یا مقتضائے طبیعت خالی ہے۔ (پہلا مصرع حذف کر کے پڑھئے) عیب نماید ہنرش در نظر۔ مفصل بحث تنبیہ اعتراضات مولوی شبلی صاحب میں ملاحظہ فرمائیے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۳) معصوم کی صفت میں کہتے ہیں۔

قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی — لیکن نہ ہے نہ ہوئیگی قدرت گناہ کی[1]

(۴) حضرت علی اکبرؑ رجز میں فرماتے ہیں

جز دست گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے — تکیہ کرم حق پہ ہے۔ بستر نہیں رکھتے[2]

(۵) مدح سخاوت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

ہوتے جو نہ تیس[۳۰] روزے واجب تو علیؑ — اک روز بھی اُمت کو نہ بھوکا رکھتے[3]

(۶) منقبت جناب امیرؑ میں کہتے ہیں۔

کیا زہد ہے کیا فیض کہ رغبت سے کبھی — روزے کے سوا کچھ نہ علیؑ نے رکھا[4]

استتباع ۔ اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔

استتباع

(۱) منقبت جناب امیرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں۔

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت — لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت

گردوں نے بلندی لی۔ زمیں نے زر و دولت — یوسفؑ نے لیا حسن۔ سلیماںؑ نے حشمت

پر ان کی قناعت ہے فزوں حدّ بیاں سے

جز نام خدا۔ آپ لیا کچھ نہ زباں سے[5]

---

[1] طاقت و قدرت نہ ہونا بظاہر ایک نقص ہے مگر گناہ کی قید لگا دی کہ گناہ کر نیکی قدرت نہیں ہے۔ یہ مدح ہو گئی ۔ ۱۲ مؤلف

[2] زر رکھنا سخی کیواسطے گویا عیب ہے مگر اس کے ساتھ کہدیا کہ جز دست گدا۔ تو اعلیٰ درجہ کی مدح ہو گئی۔ کہ یعنی فقیر کے ہاتھ میں زر رکھتے ہیں اور کہیں نہیں رکھتے ۔ ۱۲ مؤلف

[3] دوسرے کو بھوکا رکھنا بظاہر بری بات ہے۔ مگر روزے کی قید سے مدح ہو گئی۔ کہ روزے کی وجہ سے تیس[۳۰] روز بھوکا رکھا ۔ ۱۲ مؤلف

[4] کچھ باہر رکھنا سخی کیواسطے گویا عیب ہے مگر روزے کے استثنا نے اسکو مدح کر دیا۔ کہ بس روزہ ہی رکھا اور کچھ نہ رکھا۔ اور یہ صنعت استتباع میں بھی آسکتی ہے جس صنعت کا اس کے بعد بیان ہے۔ کہ مدح عبادت میں سے مدح سخاوت بھی نکلتی ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[5] نام خدا کے سوا کچھ زبان سے نہ لیا پس مدح قناعت میں سے صنعت عبادت۔ نام خدا لینے کو نکالا۔ اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ علیؑ خدا کا نام ہے۔ نام خدا کا بس لیا ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

(۲) امام حسین ع کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ فوج یزید پر ہیبت و ابتری طاری ہے۔

دُرہم ہیں یُوں پرے۔ کہ قرار اب محال ہے ۔۔۔ دِرہم کاشہ کے دستِ کرم میں جو حال ہے[1]

(۴) حضرت عباسؓ کی مدح میں کہتے ہیں۔

دُنیائے دنی ان کا نشانِ کفِ پا ہے ۔۔۔ لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جُدا ہے[2]

عقبےٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو۔ کیا ہے؟ ۔۔۔ وہ اک رہ باریک ہے۔ یہ راہ نُما ہے

لو سُن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے

بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

ادماج - یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے۔ کہ ایہام میں ایک لفظ ذو معنیین ہوتا ہے۔ اور ادماج میں تمام کلام سے دُوسرے معنی نکلتے ہیں۔ اور ادماج عام ہے۔ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔

ادماج

مرزا صاحب اس صنعت میں اُس موقع پر فرماتے ہیں۔ کہ جب شمر نے عونؓ و محمدؓ پسران جناب زینبؓ کو دو علم پیش کرکے ملانا چاہا ہے ؎

بہکا اُنہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں ۔۔۔ کہ اُن سے یہ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں[3]

تعجب - یعنی کلام میں کسی فائدہ یا غرض کے واسطے تعجب ظاہر کریں۔ اور ایسے تعجب سے اکثر شاعر کی غرض مبالغۂ مدح ہوتی ہے ؞

تعجب

---

[1] اس میں شجاعت کی مدح ہے کہ ہیبت آپ کے سے پرے دِرہم و برہم ہو رہے ہیں۔ اور تشبیہ یہ دی کہ جیسے امام حسین کے دست کرم میں آکر درہم بے قرار رہتا ہے۔ کہ وہ جناب کسی کو دیدیں۔ اس سے ایک دُوسری مدح سخاوت کی نکلی دِرہم و دَرہم میں تجنیس خطی بھی ہے۔ یہ مزید برآں ہے ۱۲ مؤلف

[2] دُنیا کو انکی کف پا کا نشان بتایا پھر اسی میں سے دُوسری مدح نکالی۔ کہ وہ ایسا نشان ہے جو کف پا سے جُدا ہے۔ دِراتی نشان کف پا سے ہر قدم پر جُدا ہوتا رہتا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ دُنیا انکی بدولت قائم ہوئی ہے تاہم یہ دُنیا سے ہمیشہ الگ رہتے ہیں (ٹیپ میں) پانچویں مصرع میں حق خدا کے معنی پر ہے۔ چھٹے میں حق باطل کی ضد ہے۔ اختلاف معنی کے سبب سے قافیہ ایطا کی تعریف سے نکل گیا اور جائز ہوگیا ۱۲ مؤلف حقیر

[3] ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ انکو بہکا جو تجھکو نہ جانتے ہوں۔ دُوسرے معنی یہ نکلے کہ انکو بہکا جو تجھکو شقی نہ سمجھتے ہوں ۱۲ مؤلف حقیر

آمد جناب علی اکبرؑ میں مرزا صاحب کہتے ہیں

(۱) نورِ نظرِ شاہ جو گھر سے نکل آیا — حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

(۲) ہنستے تھے آہ رونے پہ ابن بتولؑ کے — کیسے یہ کلمہ گو تھے جناب رسولؐ کے

صنائع لفظی

اُوپر جتنی صنعتیں بیان ہوئیں۔ اُن کا تعلق معانی (مضامین) سے تھا۔ اب جو صنعتیں بیان کرونگا۔ اُن کا تعلق الفاظ سے ہوگا۔ علمائے معانی و بیان کا ارشاد ہے۔ کہ ہر شاعر و ناثر صنائع لفظی میں معانی کو مقدم رکھے۔ ایسی صنعت نہ ہو۔ کہ الفاظ تو پیارے معلوم ہوں۔ مگر مطلب خاک نہ نکلے۔ اب دیکھئے۔ کہ ان مشکل صنائع میں مرزا صاحب کس قدر کامیاب ہوتے ہیں۔ اور اُن کی نظم کس قدر بامعنی ہوتی ہے۔ ان صنائع میں بیساختہ پن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ عموماً آورد ہوتی ہے۔ مگر جن شعرا کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ اور طبیعت تیز اور دماغ سلیم ہے۔ اُن کے کلام میں باوصف ایسے صنائع کے بھی کبھی کبھی روانی و بیساختہ پن قائم رہتا ہے۔ ہمارے مرزا صاحب ایسے کاملوں کے سرتاج ہیں۔ وزیر صاحب مرحوم پسر جناب مفتی میر عباس صاحب بارک اللہ رسہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ اکثر مرزا صاحب کے بے نقط مرثیہ (ع مہر علم سرور اکرم ہُوا طالع) کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ فیضی نے سواطع الالہام تفسیر قرآن بے نقط لکھی۔ مگر جا بجا ٹھوکریں کھائیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کو ولدالاعمٰے لکھا ہے۔ لفظ اعمٰے ایک نبی معصوم (یعقوبؑ) کی نسبت سوءادب ہے۔ مرزا صاحب کا مرثیہ ان لغزشوں سے پاک ہے٭۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ۔ اب چند صنعتیں (لفظی) سُنئے :۔

٭ اس حکایت کو میں نے دوسرے مقام پر بھی اس کتاب میں لکھا ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

تجنیس

صنعت تجنیس۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) دو لفظ ایسے لائیں جو صورت میں ایک ہی ہوں۔ مگر معنی مختلف ہوں۔ (۲) دونوں الفاظ کے اجزا میں مشابہت ہو۔ (۳) قریب المخرج الفاظ ہوں۔ (۴) تجنیس قلب کہ ایک لفظ کو اُلٹیں۔ تو دوسرا لفظ پیدا ہو۔ اس صنعت کی لے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی۔ کہ پورے مصرع یا فقرہ کو اُلٹیں۔ اور وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دوسرا فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ اس کو مقلوب مستوی کہتے ہیں تجنیس کی ایک قسم تجنیس تام ہے۔ جو قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ یوم تقوم الساعة یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعة[1]۔ اس میں ساعة کے لفظ اول قیامت کے معنی پر دوسری گھڑی بھر کے معنی پر ہے۔ اسکی مثالیں مرزا صاحب کے کلام میں بہت ہیں حسب ذیل پیش کرتا ہوں:۔

زاری تین معنی پر

(۱) رباعی ذیل میں ایک لفظ زاری کو تین جگہ تینوں قافیوں میں لائے ہیں۔

رباعی

مومن کو ہر اک بکا سے بیزاری ہے	واجب غم شہ میں گریہ و زاری ہے
جز ماتم نور عین زہرا رونا	آنکھیں کہتی ہیں مردم آزاری[2] ہے

(۲) رجز میں حضرت عباسؑ فضیلت جناب امیرؑ کی بیان فرماتے ہیں۔

جب قبلہ کو ہم نے رُخ امید پھرایا	مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا[3]

[1] ظاہری الفاظ کے معنی یہ ہیں "جس روز قیامت قائم ہوگی۔ گنہگار قسم کھائینگے۔ کہ نہ ٹھیرے وہ مگر ایک گھڑی" ۱۲ مولف حقیر۔

[2] پہلے مصرع میں بیزاری نفرت کے معنی پر۔ دوسرے میں زاری رونے کے معنی پر۔ چوتھے میں مردم آزاری آدمیوں کو دُکھ دینے کے معنی پر ہے۔ مگر اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ اپنی آنکھوں کو آزاد دینا کیونکہ مردم کے دوسرے معنی پُتلی کے بھی ہیں۔ یہ دوسری صنعت ہے جس کو ایہام کہتے ہیں ۱۲ مولف حقیر۔

[3] پہلے مصرع میں منہ پھرایا کے معنی منہ کو پھیرا کے ہیں۔ دوسرے میں پھر آیا کے معنی پلٹ آنیکے ہیں۔ رجعت خورشید کے مشہور معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بیت ذو قافتین بھی ہے۔ ایک قافیہ امید و خورشید دوسرا پھرایا۔ پھر آیا ہے ۱۲ مولف حقیر۔

لفظ بار چار معنی پر

(۳) ذیل کے چاروں مصرعوں میں (قافیہ میں) بار کی لفظ ہر جگہ ایک نئے معنی پر ہے اور پھر تکلف یہ ہے کہ بے تکلف نظم ہے۔ حضرت عباسؑ کی مدح میں ہے۔

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سرِ دُربار — دُربار میں دُربار علیؑ ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھر بار — عارض ہیں قمر بار لب لعل گہر بار
یہ والی۔ اقلیم ولایت کا ولی ہے
تصویر تو لا کے حسینؑ ابن علیؑ ہے [۱]

تجنیس خطی

تجنیس خطی بھی اسی کی شاخ ہے۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف کی اس آیت میں ہے۔ وھو یطعمنی ویسقین واذا مرضت فھو یشفین [۲] اس میں یسقین ویشفین میں تجنیس خطی ہے۔ کہ ایک طرح لکھا جاتا ہے۔ فقط نقطوں کا فرق ہے۔ قرآن ناطق جناب امیرؑ کا ایک خطبہ بھی اس صنعت میں مولوی ظہیر الدین صاحب بلگرامی کی کسی کتاب شاید ظہیر الانشا میں میری نظر سے گذرا ہے۔ مگر اس وقت وہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ ورنہ لکھ دیتا۔ اور نہج البلاغہ میں وہ خطبہ مجھے نہیں ملا۔ شاید نہج البلاغہ کے علاوہ جو خطب ہیں۔ اُن میں ہو۔ مرزا صاحب کا اس صنعت میں ایک بند لکھتا ہوں۔

حبیب ابن مظاہر پیغام عقد جناب امیرؑ لیکر والد ماجد حمیدہ (حمیدہ کا نام ام البنینؑ ہے) کے پاس گئے ہیں۔ اُس موقع پر والد حمیدہ جناب امیرؑ کے اوصاف حمیدہ میں کہتے ہیں۔

---

۱ دُربار مصرع اول میں ایک مستقل لفظ لائے۔ پھر دوسرے میں دُربار لائے۔ جو کتابت میں دربار سے مشابہ ہے اس میں تجنیس خطی ہے۔ پھر ہر بار لائے جس کے معنی ہر دفعہ کے ہیں۔ تیسرے مصرع میں گھر بار زبان اردو کا ایک ٹکسالی لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں مکان اور تمام سامان، اور اسباب مکان کا۔ چوتھے مصرع میں گُہر بار لائے جس میں اور گھر بار میں تجنیس خطی ہے۔ اور گہر بار کے معنی موتی برسانیوالا۔ ٹیپ میں والی، ولایت، ولی، تولا کے الفاظ میں صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق ہے۔ جو صنعتیں اسی تجنیس کی سرسبز خوش نما شاخیں ہیں۔ ناظرین! دیکھئے بار بار کس قدر سلیس نظم ہے۔ ع یہ نظم مسلسل ہے کہ موتی کی لڑی ہے۔ صل علیٰ محمد وآل محمد ۱۲ مؤلف حقیر۔

۲ وہ (خدا) مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں۔ تو مجھے شفا دیتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

بولا صدف عقل کا وہ دُرِ یگانہ　　آدم کے پسر ہیں بشر فخرِ زمانہ
مَیں نم ہُوں وہ یم ہیں میں خرابہ وہ خزانہ　　تجنیس سہی فرق تلفظ بھی ہے یا نہ[۱]

اشتقاق
شبہ اشتقاق

صنعت اشتقاق و شبہ اشتقاق بھی صنعت تجنیس کی گویا مُنہ بولی بہنیں ہیں۔ اشتقاق یہ کہ دو لفظ ایسے لائیں۔ جن کا ایک مادہ ہو۔ اور شبہ اشتقاق یہ کہ ایک مادہ تو نہ ہو مگر بظاہر ایک مادہ معلوم ہوتا ہو صنعت شبہ اشتقاق میں یہ آیت قرآن مجید پائی جاتی ہے۔ قال انی لعملکم من القالین[۲]۔ اس میں قال اور قالین میں شبہ اشتقاق ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

(۱) بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق　　ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق

اس میں طاقت و طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے +

شبہ اشتقاق
ذوقافتین

(۲) بند ذیل کے اوّل کے چاروں مصرعوں میں یہ صنعت اور اس کے ساتھ صنعت ذوالقافتین دیکھئے شمشیر حسینی کی مدح (جہاد امام حسینؑ) کے بیان میں کہتے ہیں۔

یاں سب کو تھا یقین وہاں تھی وہیں نہ تھی　　واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی　　لاکھوں کے قتل کر نیکو ہاں تھی نہیں نہ تھی
اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
(شبہ اشتقاق)　　واں تھے جہاں زمین نہ تھی۔ آسماں نہ تھے

(۳) حضرت حُرِ دلیر کی آمد سے لشکر دشمن میں انتشار ہے۔ اُس موقع پر فرماتے ہیں۔

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ ہر چند اولاد آدم ہونیکے رشتہ سے میں مثل اُن کے ہوں۔ مگر کہاں وہ کہاں میں۔ نم یم نہیں ہو سکتا۔ خرابہ خزانہ کا مرتبہ نہیں پا سکتا۔ ہر چند تجنیس خطی ہے مگر تلفظ کا فرق ہے۔ یہ اُس کا جواب ہے۔ کہ حبیب بن مظاہر نے کہا تھا۔ کہ جناب امیر[۲] ایسے ہیں فردتن کہ مقولہ ہے یہ ہر دم۔ جو بندہ حق سب بنی آدم ہیں وہی ہم۔ پیدا کیا کعبہ میں یہ قدرت ہے خدا کی بخشی جو امامت یہ عنایت ہے خدا کی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] کہا کہ میں تمہارے اعمال کے سبب سے تمہارے دشمنوں (بغض رکھنے والوں) میں سے ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کھولا کسی نے جینے سے ہو کر بہ تنگ تنگ | گوشے میں کوئی رکھ کے کمان و خدنگ و ننگ
بے وقفہ ہوش اُڑ گیا اور بے درنگ رنگ | یہ کیا تھا منزلوں ہوئے پائے پلنگ لنگ

گو مکر و حیلہ۔ ظالموں کی آب دگل میں تھا
اُس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل میں تھا

شبہ اشتقاق

مقلوب

صنعت مقلوب۔ ایک لفظ کو لوٹنے سے دُوسرا لفظ پیدا ہو۔ یہ بھی ان اقسام تجنیس کی ایک **قسم** ہے۔ اور سب سے زیادہ مشکل صنعت مقلوب مستوی ہے۔ کہ ایک فقرہ یا مصرع کے اُلٹنے سے وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ سب سے پہلے قرآن شریف میں یہ صنعت ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) **ربّک فکبّر**۔ (۲) **کُلٌّ فی فلک** میں الگ الگ حرف لکھتا ہوں۔ آپ چاہے دہنی طرف سے پڑھیں۔ چاہے بائیں طرف سے۔ وہی فقرہ پڑھا جائیگا۔ ر ب ك ف ك ب ر۔ ك ل ف ی ف ل ك

مقلوب مستوی قرآن شریف میں ہے

اس صنعت میں امیر خسرو کی ایک بیت بہت مشہور ہے۔ اور وہ یہ ہے ؎

(۱) شکر بترازوے وزارت برکش | (۲) شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش
(۱) ش ک ر ب ت ر ا ز و ی و ز ا ر ت ب ر ک ش | (۲) ش و ہ م ر ہ ب ل ب ل ب ل ب ہ ر م ہ و ش

مقلوب مستوی پر اعتراض کا جواب

بعض بے درد جو خود ایسی نظم کہنے سے عاجز ہیں۔ اس بیت پر یہ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ اس میں بہ تکلّف جب معنی پہناؤ۔ جب مطلب شعر کا نکلتا ہے۔ صاف نہیں ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ گو بتکلّف معنی حاصل ہوں۔ مگر پھر بھی کمال شاعری ہے۔ دُوسرا کہنے بیٹھے جب حقیقت کھُلتی ہے۔ اب ہمارے اردوئے معلّے کے خسرو معانی کی بیت فارسی دیکھئے۔ اور انصاف سے فرمائیے۔ کس قدر صاف و بامعنی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے۔ تو جب تک اُس سے کہا نہ جائے۔ کہ یہ مقلوب مستوی ہے۔ اُس کا خیال بھی شاید نہ پہنچے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بیت دبیرؒ

(۲)	(۱)
امید آباد بد آبادی ما (۲)	امید آشنایان شادی ما (۱)
ام ی داب ادب داب ادی م ا	ام ی دا ش ن ای ان ش ادی م ا

یہ تو کلیات فارسی جناب مرحوم میں سے بیت عرض کی۔ اب اردو میں اس صنعت کو کلام مرحوم سے دکھاؤں۔ سُنا ہے۔ کہ ایک خاص مرثیہ صنائع مشکلہ میں فرمایا ہے۔ جو ابھی تک محفوظ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے۔ استاذی حضرت اوج مدظلہ نے اس کتاب کی عزت بڑھانے کے لئے میری عرض کرنے پر چند بند اُس میں سے مرحمت فرمائے ہیں۔ (اس عنایت کا شکریہ نہیں ادا ہو سکتا) اُس میں سے ذیل کا بند لکھتا ہوں :-

(۲) امام حسینؑ کی میدان جنگ میں آمد ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

چلّاتے ہیں مردم لئے جاروب پلک کی ہاں جھاڑو جلوگاہ شہ ارضؑ و فلک کی

تسلیم کو خلق آئی ہے فردوس تلک کی ہیں فرش سرِ راہ صفیں حور و ملک کی

آقا ہے امم عرش معلّےٰ کا شرف ہے

یہ فرش باداب۔ اک، آقا کا شرف ہے (صنعت مقلوب)

(ی ہ ف رش ب اداب اک اق اک اش رف ہ ے)

مقلوب

یہ مصرع قلب ہونے پر جوں کا توں باقی نہیں رہتا۔ مگر ایک ایسا مصرع پیدا ہوتا ہے۔ جو وہی معنی دیتا ہے یعنی ع یہ فرش اک آقا کا باداب شرف ہے۔ اور جب مصرع آخر الذکر کو ہم قلب کرینگے۔ تو مصرع اول الذکر ع یہ فرش باداب اک آقا کا شرف ہے۔ پیدا ہوگا *

* جو لوگ ایسی صنعتوں کو گورکھ دھندہ کہدیتے ہیں۔ وہ اگر ایسے دو چار مصرع کہدیں جب تو ہم بھی اُنکی ہاں میں ہاں ملانے کو طیار ہو جائیں۔ بلکہ مداری کا کھیل کہدیں۔ اور جب وہ ایسی صنعتیں کہنے سے عاجز ہیں۔ تو انکی یہ مثل سمجھی جائیگی کہ کھسیانے کا گھی گرا۔ اُس نے کہا مجھے اُبالا ہی بھاتا ہے۔ خود عاجز ہیں۔ اہل کمال پر فضول اعتراض کرتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

(۳) اب میں اسی مرثیۂ غیر منقسم میں سے ایک مصرع ایسا بھی پیش کرتا ہوں جس کو اُلٹنے سے وہی مصرع حاصل ہوتا ہے۔ وہ بند مندرجہ ذیل کا چھٹا مصرع ہے۔ امام حسینؑ لشکریانِ یزید کو (رجز میں) وعظ فرما رہے ہیں۔

دو مال رہِ حق میں یہ سودا برِ ضا ہے　　لو نقدِ عمل صاف کہ صرّاف خدا ہے
اس نقد کا سکّہ شہِ مرداں کی ولا ہے　　کیا زیست کا دم بھرتے ہو اک دم میں فنا ہے

پُرزرے نہ کرو مصحفِ اسلام ہمارا
آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا※ (مقلوب مستوی)

ارام ہ م ار ا ہ ے ی ہ ا ر ا م ہ م ا ر ا

مقلوب مستوی

مقلوب کل اوّل یا مقلوب مجنح

(۴) **مقلوب کل اوّل** بھی اسی کی ایک قسم ہے۔ جس کو **مقلوب مجنح** بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو لفظ ایک مصرع کے اوّل یا آخر میں ہے۔ اُس کا معکوس دُوسرے مصرعوں میں ہے۔ اس صنعت میں بند مندرجہ تحت ملاحظہ فرمائیے:-

(اُسی مرثیہ غیر منقسم میں رزم کے موقع پر کہتے ہیں)

راہ ایسی سیہ بختیٔ لشکر سے ہوئی تار　　رات ایک طرف ظلمتِ دوزخ تھی نگوں سار
راس آئی نہ یہ جنگ ہوئے جینے سے بے زار　　راز اس میں یہ تھا تیغ گلے کا ہوئی تھی ہار

ہے صنعت مقلوب کل اوّل تو بجا ہے※
آخر ولد القلب ہر اک اہل جفا ہے

※ چاروں مصرعوں میں حسب ذیل الفاظ معکوس ہیں:-

(۱) راہ کا اُلٹا ہار۔ ہار کا معکوس راہ +
(۲) تار کا اُلٹا رات۔ رات کا معکوس تار +
(۳) سار کا اُلٹا راس۔ راس کا معکوس سار +
(۴) زار کا اُلٹا راز۔ راز کا معکوس زار +

ردالعجز علے الصدر - یہ صنعت علم عروض کی بعض اصطلاحات سمجھنے پر سمجھ میں بخوبی آتی ہے۔ شعر کو بیت (گھر) کہتے ہیں۔ جس کے دو مصرع (کنواڑ) ہوتے ہیں۔ پہلے مصرع کے پہلے جزو کو صدر اور پچھلے (آخر) کو عروض۔ اور دُوسرے مصرع کے پہلے جزو کو ابتدا اور آخر جزو کو عجز (اور ضرب) کہتے ہیں۔ باقی جو الفاظ دونوں مصرعوں میں رہ جاتے ہیں۔ اُن کو حشو (بھرتی) کہتے ہیں۔ اب یہ بھی سمجھ لیجئے۔ کہ جو لفظ آخر مصرع میں آئیں۔ اگر وہی مصرع ثانی کے اوّل میں لائیں۔ تو اُس کو بھی ردّ العجز علے الصدر کہتے ہیں۔ (بعض کتب معانی و بیان میں اس کا نام معاد بھی ہے۔ مگر مشہور اُسی نام سے ہے) حالانکہ اس کو ردّ العجز علے الابتدا کہنا چاہئے تھا۔ مگر غالباً جو موجد اوّل نے نام رکھ دیا۔ وہی ابتک چلا آتا ہے۔ یہ سچ ہے۔ باپ گورے بچّہ کا بھی نام کلّو رکھ دے۔ تو سب کلّو ہی کلّو کہینگے۔ اور یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ آخر مصرع اوّل کے دو تین لفظوں میں سے ایک لفظ بھی دُوسرے مصرع کے شروع میں آجائیگا جب بھی یہ صنعت ردّ العجز علے الصدر کہلائیگی اس کی مثالیں کلام دبیرؔ میں سے حسب ذیل پیش ہیں:-

(۱) پہلوان کی لڑائی میں سے ایک بند لکھتا ہُوں۔

خنجر کو جو کاٹا تو وہ ۔ ٹھہری نہ سپر پر
ٹھہری نہ سپر پر تو وہ رسیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر
تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامن زیں پر
تھی دامن زیں پر۔ تو نہ مرکب تھا زمیں پر*

(۲) تین بند ذیل مسلسل امام حسینؑ کی رجز میں فرمائے ہیں۔

کوثر کی آبرو ہُوں مَیں رضواں کی آبرو
رضواں کی آبرو ہُوں مَیں سلماں کی آبرو

* الفاظ کی بندش میں کیا صفائی ہے کہ تلوار گویا چلی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس بے تکلفی سے کہتے پر جب شاعر قادر ہو جائے جب ایسی صنعتیں کہنے کا لطف ہے ۔ ۱۲ مؤلف۔

ردّ العجز علے الصدر کی تعریف

مثال (۱) ردّ العجز علے الصدر

مثال (۲) ردّ العجز علے الصدر کی

مسلماں کی آبرو ہوں۔ میں ایماں کی آبرو ایماں کی آبرو ہوں۔ میں قرآں کی آبرو
قرآں کی آبرو ہوں۔ تو آدم کا فخر ہوں
آدم کا فخر ہوں۔ تو دو عالم کا فخر ہوں
عالم کا فخر ہوں کہ میں عالی وقار ہوں عالی وقار ہوں کہ میں حق پر نثار ہوں
حق پر نثار ہوں کہ میں طاعت گذار ہوں طاعت گذار ہوں کہ میں اُلفت شعار ہوں
اُلفت شعار ہوں کہ میں عاشق خدا کا ہوں
عاشق خدا کا ہوں کہ میں دل مصطفےٰ کا ہوں[1]
دل مصطفےٰ کا ہوں کہ میں نورِ الٰہ ہوں نورِ الٰہ ہوں۔ میں ہی زہرا کا ماہ ہوں
زہرا کا ماہ ہوں شہِ انجم سپاہ ہوں انجم سپاہ ہوں مَیں شاہوں کا شاہ ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں مَیں کُل کا امیر ہوں
کُل کا امیر ہوں۔ میں علیؑ کا وزیر ہوں[2]

مثال (۳) ردالعجز علے الصدر

(۳) ردّ العجز علے الصدر میں ایک مرثیہ حال جناب علی اکبرؑ کا مطلع سُنئے:۔
معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے ہے ذہن رسا اُوج پہ اکبر کی ثنا سے
اکبر کی ثنا کرتا ہوں افضال خدا سے افضال خدا ہے مدد خیر ورا سے
جب ہو مددِ خیرِ ورا ذہن رسا پر
پھر ذہن رسا کا ہو گذر عرش علا پر

لزوم مالا یلزم

لزوم مالا یلزم۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے۔ جس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ یعنی جو صنعت چاہے۔ شاعر و ناثر لازم کرلے۔ جیسے مقید قافیہ لانا۔ اسکی مثال قرآن شریف

[1] اس میں ایک باریک نکتہ ہے جسکی داد صرف اہل دل اہل عشق دے سکتے ہیں۔ کہ حضورصلعم خود محبوب و معشوق خدا ہیں۔ اور اُن کا دل خدا کا عاشق ہے۔ اور امام حسینؑ گویا اُن کے دل ہیں۔ تو یہ بھی عاشق خدا ہوئے ۱۲ مؤلف۔

[2] اللہ اللہ کس قدر زبان پر قدرت حاصل ہے معلوم ہوتا ہے۔ بے تکلف نثر کے فقرے فرمائے ہیں ۱۲ مؤلف۔

میں یہ آیت ہے۔ فاما الیتیم فلا تقہر واما السائل فلا تنہر۔ اس میں لازم کر لیا ہے کہ حرف آخر رے کے ماقبل ہائے ہوز ہو۔ حالانکہ تقہر کا قافیہ تسخر بھی ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں منقید قافئے ہزاروں ہیں۔ مثلاً ایک بند ذیل کے چاروں مصرع پیش کرتا ہوں:۔

حضرت عباسؑ کی مدح میں عونؑ محمدؑ شمر سے کہہ رہے ہیں

منقید قافیہ

اس بار کے اٹھانے کو طاقت بھی چاہئے ۔۔۔ طاقت فقط بخیر لیاقت بھی چاہئے
صاحب علم کو حسن رفاقت بھی چاہئے ۔۔۔ دل کو وفا زباں کو صداقت بھی چاہئے
ایسا ہے منتظم کوئی تیرے قیاس میں
لاکھوں سے جو لڑائے بہتر کو پیاس میں

غیر منقوط

صنعت غیر منقوط بھی اسی لزوم مالایلزم میں سے ہے۔ جس کو صنعت مہملہ اور بے نقط بھی کہتے ہیں۔ اس صنعت میں پورا ایک مرثیہ جناب مرزا مرحوم کا ہے۔ جو غیر منقسم ہے۔ جس کا یہ مطلع ہے۔ ع مہر علم سرور اکرم ہوا طالع۔ میں اس موقع پر صرف تین بند دوسرے مرثیوں سے لکھتا ہوں*:۔

بند غیر منقوط

(۱) صمصام کو الہام ہوا سر کو علم کر ۔۔۔ گہ سورۂ الحمد کو گہ صور کو دم کر
اک وار لگا اور دو دا عدا کا علم کر ۔۔۔ ہر دم عمر سعد کا دم محو عدم کر
دو حصہ کمر کر کہ الگ کاسۂ سر کر
ہر طرح مہم سہل کر اور معرکہ سر کر

(۲) حر رضی اللہ عنہ کے حال میں۔

غیر منقوط

حر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا ۔۔۔ وہ حملہ ور ادھر ادھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سر اعدا اگر ہوا ۔۔۔ وہ گل کھلا کہ لالہ کہسار سر ہوا

* کیونکہ وہ مرثیہ میرے پاس ہے نہ اور کسی کے پاس ہے۔ بجز جانشین جناب مرحوم حضرت اوج مدظلہ کے ...

اہل حسد کو درس اُدھر آہ آہ کا
حور و ملک کو ورد ادھر واہ واہ کا

(۴۳) ہمدم دم حسام کا اعدا کا دم ہُوا ‫ ‫ درد و الم سوا ہُوا آرام کم ہُوا
صمصام سکّہ اور دل اعدا درم ہُوا ‫ ‫ وہ دل اگر درم ہُوا مال عدم ہُوا
مدّاح حر کا سرورِ والا گہر ہُوا
اور رہرو عدم وہ گروہ عمر ہُوا

منقوط

منقوط۔ جس کے ہر حرف پر نقطہ ہو۔ یہ صنعت بہ نسبت غیر منقولہ کے اس لئے زیادہ مشکل ہے۔ کہ حروف منقوط کے الفاظ کم ہیں۔ مرزا صاحب کا اس صنعت میں کلام ملاحظہ فرمائیے! ور اوروں کے منقوط کلام سے ملائیے۔ تو معلوم ہو کہ کس قدر بے تکلف ہے*۔

منقوط رباعی

(۱) زہیر بن قین جو میمنہ لشکر امام حسینؑ کے بروز عاشورا ۶۱ھ علمدار تھے۔ اُن کی مدح میں رباعی۔

جب بخت بن قین نے زینت بخشی ‫ ‫ زینب نے تشفّی تب بشفقت بخشی
تیغیں جزِ تن جبین شق۔ جی بے چین ‫ ‫ جنت بخشی نبی نے جنّت بخشی

صنعت موصل منشاری

اس رباعی کے دو مصرع (ثانی و رابع) میں ایک اور صنعت بھی ہے جس کو موصل کہتے ہیں یعنی تمام حروف ملاکر لکھ سکتے ہیں سوائے حرف اول کے (اس طور پر):۔

(۱) زینبنیتشفیتببشفقتبخشی ‫ ‫ (۲) جنتبخشینبینیجنتبخشی

مقابلہ تذکرہ منسوبہ تذکرۃ البلاغہ

*مولوی ذوالفقار علی صاحب نے کتاب تذکرۃ البلاغہ اردو میں لکھی ہے۔ (جس کے صلہ میں فیّاض علم دوست گورنمنٹ نے پانچ سو روپیہ بخشے ہیں) اور انھوں نے اس صنعت میں حسب ذیل نظم و نثر اپنی کتاب مذکور میں لکھی ہے۔ (مثال نثر) بی بی زینب نے تین شب جنے بچے۔ (مثال نظم) جب تب شب غضب بخشش نبی بخشش فیض حش تخت نشیں۔ اس لکھنے سے غرض ممدوح کی ہجو تنقیص منظور نہیں ہے۔ بلکہ مقابلہ کرکے صرف یہ دکھانا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی نظم کس قدر با معنی اور بے تکلف ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

ان کے لکھنے میں آرہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے اس کو موصل منشاری کہینگے۔

صنعت منقوط میں جند

(۲) صنعت منقوط کی دُوسری مثال تلوار کی مدح میں۔

تیزی تپ تیغ نے بخشی نئی خفت　بے چین شقی۔ بخت بنی جبن بہ نیّت

چینی ختنی۔ چیں بجبیں پُشت بجنّت　نے جی نہ بچے نے تن نہ بچے نے زین نہ زبینت

نے چین جبیں نے ذقن زشت نہ بینی

نے نبض نجنبش نتن زشت نہ بینی*

اس کے دُوسرے اور تیسرے مصرع میں صنعت موصل منشاری ہے۔

بیچینشقیبختبنیجبنبہنیّت

چینیختنیچیںبجبیںپشتبجنّت

فصل ۲ سجع کی تعریف

سجع - ایک لفظ کے مقابل جب دُوسرے ہموزن لفظ لائیں۔ تو اُس کو سجع کہتے ہیں اس میں اختلاف ہے۔ کہ سجع نظم و نثر دونوں کے واسطے آتا ہے۔ یا صرف نثر سے مختص ہے صاحب حدائق البلاغہ اور قریبًا تمام متاخرین کے نزدیک نظم و نثر دونوں میں آتا ہے۔ وزن سے یہاں مراد وزن عروضی ہے۔ جیسے فَاعِلُن لُوزَتَن کے وزن پر ہے۔ جس میں حرکات الفاظ کا باہم متفق ہونا ضرور نہیں ہے۔ اور اگر متفق ہوں۔ تو اور خوبی ہے۔ اور جب وہ الفاظ باہم قافیہ بھی ہو سکیں۔ تو اُس کو نثر صبیع کہتے ہیں۔ اس کا مرتبہ سجع سے اعلےٰ ہے

مثال سجع (۱)

(۱) حضرت علی اکبرؑ کے رجز میں مرزا صاحب کا ایک بند ہے۔

خاطر	کی	کفّار	ہیں	ارواح	قابض	ہم
خاطر	کی	دیندار	ہیں	آرام	مرہم	ہم

*. واضح ہو کہ اظہار حرکت کے واسطے جو ہمزہ یا ہائے ہوّز لکھی جاتی ہے۔ اُس کا شمار حروف میں نہیں ہے پس نہ جنبش نہ نتن زشت نہ بینی وغیرہ میں نہ کو ملاکر بھی لکھو جب بھی اس کو منقوط ہی مانا جائیگا۔ کہ ہ واسطے اظہار حرکت کے ہے۔ اسی طرح تیزیٔ اور نئی کے اُوپر کا ہمزہ ہے +۱۲ مؤلف حقیر۔

ہم	[illegible]	[illegible]	ہیں	اشرار	کی	خاطر
ہم	قوت	اسلام	ہیں	ابرار	کی	خاطر
ہم	پردۂ	ستاری	و	غفاری	رب	ہیں
ہم	خنجر	قہاری	و	جبّاری	رب	ہیں

(۲)

لے	ہدیۂ	تائیدِ	قدیرِ ازلی	لے
لے	خلعتِ	تحسین	حسینؑ ابن علیؑ	لے

مثال (۲) بحج

(۱) **صنعت ترصیع** ۔ رجز امام حسینؑ کے موقع پر چاروں مصرع کہے ہیں۔

مثال (۱) ترصیع

معبود جزو کل	نے	کریمانہ	رضا	دی
اور صاحبِ دلدل	نے	بزرگانہ	دُعا	دی
فوج اپنی توکل	نے	دلیرانہ	بڑھا	دی
آمد کے تجمّل	نے	نقیبانہ	ندا	دی

(۲) ترصیع میں یہ ٹیپ ایک باغ کی تعریف میں ہے۔ دیکھئے اس رنگ میں بھی مرثیت کا پہلو موجود ہے۔

مثال (۲) ترصیع (باغ)

ہر غنچہ	ہے	دفتر	غم	شاہ دوسرا کا
ہر لالہ	ہے	محضر	گل	زخم شہدا کا

مثال (۳) ترصیع تلوار کا کاٹ

(۳)

تھا شور وہ تڑپی	وہ گری	فوج پر آکر
وہ جسم میں ڈوبی	وہ تری	خون میں نہاکر
چمکی وہ زمیں پر وہ	پھری	چرخ پہ جاکر
وہ خون میں ڈوبی وہ	اُٹھی	سر کو گراکر

وہ پے کیا پیدل کو وہ اسوار کو کاٹا

وہ تنگ میں در آئی وہ رہوار کو کاٹا*

* دیکھئے پہلا اور دوسرا مصرع بے تکلف صنعت ترصیع میں نظم ہوگیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ اس صنعت میں بے تکلف نہ ہوگا۔ یہ صنعت ختم کی۔ [illegible]

ذوالقافیتین

ذوالقافیتین - ہر ایک مصرع میں دو قافیہ ہوں - اور جو ہر مصرع میں تین یا زیادہ قافیہ ہوں - تو ذوالقوافی کہتے ہیں -

ذوقافیتین

سردار لشکر کوفہ و شام اپنی فوج سے کہ رہا ہے

ہاں سرفروشو جان لڑانا لڑائی میں   پیاسوں کے خون کی نہر بہانا ترائی میں

تلمیح

تلمیح - جس میں کسی مشہور واقعہ کا اشارہ ہو - یہ صنعت مرزا صاحب کے مرثیوں میں بہت ہے -

مثال (۱)

(۱) زعفر جن کو جب جنوں نے خبر دی ہے - کہ امام حسینؑ ایک میدان میں تنہا تین دن کے پیاسے کھڑے ہوئے ہیں - زعفر اُن جنوں سے کہتا ہے -

دم غم سے اُلجھتا ہے یہ کھلتا نہیں ہم پر   پانی بھی ہوا بند شہنشاہ امم پر
تم لوگوں کا پہرہ تھا اسی بیرِ علم پر   آئے جو علیؑ گر پڑے سر کٹ کے قدم پر

پتھر تھے کناروں پہ مگر ہو گئے پانی
یوں لے گئے پانی کہ جگر ہو گئے پانی

اس میں مشہور واقعہ جنگ بیرالعلم کی طرف اشارہ ہے - جو جنات اور جناب امیرؑ میں ہوئی تھی +

مثال (۲)

(۲) مناقب جناب امام حسینؑ میں مناقب جناب رسول خداؐ و علی مرتضےٰؑ سے مشابہت بیان کرتے ہیں -

روشن ہے مثل مہر یہ اعجاز مرتضےٰؑ   مغرب سے آفتاب نے رجعت کی بارہا
روزہ مگر حسینؑ نے طفلی میں جو رکھا   پیش از زوال چھپ گیا مہر جہاں نما

انگشتِ مصطفےٰؐ سے دو پارہ قمر ہوا
اور خاطر حسینؑ سے ٹکڑے گہر ہوا

اس ایک بند میں حسب ذیل واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) جناب امیرؑ کے واسطے آفتاب نے (غروب ہوکر) رجعت کی۔ (۲) امام حسینؑ نے بچپن میں روزہ رکھا۔ تو آفتاب پہلے سے غروب ہوگیا۔ (۳) جناب رسول خدا صلعم کے واسطے شق القمر ہوا۔ (۴) امام حسینؑ کی خاطر سے بحکم خدا جبریلؑ نے آکر پر مار کر ایک موتی کے دو ٹکڑے برابر کر دئے۔ کہ ایک ٹکڑہ امام حسنؑ نے دوسرا ٹکڑہ امام حسینؑ نے لیا +

سیاق الاعداد

سیاق الاعداد - عدد دس کو باترتیب یا بے ترتیب ایک جگہ نظم کر دینے کو صنعت سیاق الاعداد کہتے ہیں۔

مدح پنجتن پاکؑ میں کہتے ہیں

واجب ہے ۶شش جہت پہ تولاّے پنجتن ۵ | ہیں ۸ہشت خلد بہر احبائے پنجتن ۵
۷ساتوں سقر ہیں مسکن اعدائے پنجتن ۵ | چرخ ۹نہم ہے کرسئے زیبائے پنجتن ۵

ایماں پناہ ہیں یہ شریعت پناہ ہیں
ان کے شرف پہ ۵پانچ نمازیں گواہ ہیں*

ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ ۵ حواس | تا حق پنجتن ۵ کے ثنا ساہوں حق شناس
ناموس ان کے ۵پانچ نمازوں کا ہے اپاس | جن کو کہ ان کا پاس ہے وہ ہیں خدا کے پاس

۵پانچ انگلیوں سے ہم نے چُنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

تنسیق الصفات

تنسیق الصفات - ممدوح کی چند صفات ایک جگہ جمع کر دینے کو صنعت تنسیق الصفات کہتے ہیں۔

قرآن شریف کی آیت مندرجہ ذیل اس صفت سے متصف ہے۔

هو الله الذی لا اله الا هو۔ الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن

---

* ۵-۶-۷-۸-۹ - یہ سب اعداد جمع کر دئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس میں خدا نے اپنی صفات ملک ۔ قدوس ۔ سلام ۔ مومن ۔ مہیمن ۔ عزیز ۔ جبار ۔ متکبر بیان فرمائی ہیں

مثال (۱)

(۱) مرزا صاحب مدح امام حسینؑ میں کہتے ہیں۔

سرتاج عرش ۔ زیب دہ کرسی بلند — سرکار حق کے کارگذار اور کاربند
عاشق ۔ مطیع ۔ فدیہ ۔ مصاحب ۔ نیازمند — راضی رضا پہ ۔ محو شہادت ۔ بلا پسند*

سب کچھ خدائے عزوجل کے حسینؑ ہیں
مالک ابد کے اور ازل کے حسینؑ ہیں

مثال (۲)

(۲) ذو الفقار شرربار حیدر کرارؑ کی مدح میں فرماتے ہیں۔

پھل وزن میں تھا پھول تجلی میں نخل طور — گرمی میں محض نار ۔ تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ ۔ چال پری ۔ قبضہ چشم حور — خودلہر ۔ آب زہر ۔ تڑپ قہر ۔ شور صور

نکلی بس اور زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر

مثال (۳)

(۳) اقربائے امام حسینؑ کی صفات حمیدہ میں مصنف کہتے ہیں۔

گل پیرہن و گلبدن و گل رخ و گل فام — شمشاد قد و غنچہ دہان و سمن اندام
خوش قامت و خوش رو و خوش آغاز و خوش انجام — حسن چمن شرع ۔ بہار گل اسلام

کس عرصہ میں یہ فاطمہؑ کا باغ کھلا تھا
سو ظہر تلک رن میں تہ خاک ملا تھا

مثال (۴)

(۴) حضرت عباسؑ کی تلوار کی تعریف (صنعت تنسیق الصفات میں)۔

بجلی کا جست ۔ شیر کی آمد ۔ ہوا کا شور — قدرت کا کھیل ۔ قہر کی طاقت ۔ بلا کا زور
راہ عدم ۔ جنازہ ہستی ۔ دہان گور — جلوہ وہ تھا کہ دیکھنے سے مدعی تھے کور

*بارہ صفات حمیدہ کو چار مصرعوں میں کس خوبی سے جمع فرمایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

رن میں جدھر یہ پارۂ الماس مڑ گئی
مانندِ ہوشِ اہلِ جفا۔ دھوپ اڑ گئی

صنعت تضمین۔ بعض الفاظ عربی یا بعض کلام عربی وفارسی کو صفائی و خوبصورتی سے لانے کو صنعت تضمین کہتے ہیں۔

تضمین

حبیب ابن مظاہر کی مدح میں کہتے ہیں

(۱) بنتے ہی یہ قالب سوئے شبیرؑ پکارا   القلب علی بابک لیلاً ونہارا

لشکر امام حسینؑ کی کیفیت صبح عاشورا محرم ۶۱ھ

(۲) پڑھتا تھا کوئی فاعتبروا یا اولی الابصار   اک سمت توکلت علی اللہ کی تکرار
اک جا فسیکفیکہم اللہ کی گفتار   مُنہ سے کہیں وجہت الی اللہ کا اظہار
وہ مصحف ناطق کی حفاظت میں سدا تھے
گر حافظ قرآں رفقا تھے تو بجا تھے

باب ہشتم۔ فصیح و سلیس کلام دبیرؒ

فصل ۱
فصیح و سلیس کلام

ناظرین! آپ نے تصویر کا ایک رُخ دیکھا۔ کلام بلیغ و دقیق کے چند نمونے نظر آئے۔ اب کلام دبیرؒ میں سے چند نمونے سلیس و فصیح کلام کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جن لوگوں کو کلام دبیر دیکھنے کا موقع کم ملا ہے۔ (اکثر) اُن کا یہ خیال ہے۔ کہ مرزا صاحب کلام دقیق ہی اچھا کہتے ہیں۔ مگر اُن کے ہر قسم کے کلام پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب وہ سلیس و فصیح نظم کرنے پر آتے ہیں۔ تو اس میں بھی وہ ویسے ہی کامیاب ہو کر دریا بہاتے ہیں۔ اسی کے ذیل میں چند واقعات کی تصویریں بھی آپ کو نظر آئینگی۔ وہ دیکھ کر انصاف سے فرمائیے گا۔ کہ وہ واقعات کے مرقع کتنے خوشنما (اور مختصر اور دلکش) کھینچتے ہیں۔ یہاں تھوڑے سے نمونے دکھاتا

ہوں۔ جلد دویم میں بکثرت یہ مرقع ہیں۔

(۱) تلوار کے ہاتھ صفائی سے

(۱) ایک پہلوان حضرت علی اکبرؑ پر اپنا وار کر چکا ہے۔ اب علی اکبرؑ اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں:۔

اکبرؑ نے کہا۔ سیکھ ابھی تیغ لگانا — لے دیکھ۔ مری ضرب۔ مرا ہات اٹھانا
ہاں تیغ مری آئی۔ ارے سر کو بچانا — اس کہنے میں نے سر تھا نہ گردن تھی نہ شانا
دم تن سے نہ نکلا کہ وہ چھپنے کی گھڑی تھی
ڈر سے نہ اجل آئی کہ تلوار کھڑی تھی

تلوار سے کٹنے کے بعد مضروب میں تھوڑی دیر تک جان باقی رہتی ہے۔ اس کی حسن تعلیل یہ فرمائی۔ کہ تلوار کے ڈر سے نہ موت آئی۔ نہ دم بدن سے نکلا۔ کہ تلوار کھڑی ہوئی تھی جب یہ کاٹ کر ہٹی۔ تو موت بھی آئی۔ اور دم بھی نکلا۔ اوپر کے چاروں مصرع بھی کس قدر سلیس ہیں اور جیسی اصیل تلوار میں صفائی ہوتی ہے۔ ویسی ہی بندش میں بھی صفائی دکھائی ہے۔ ع
کٹے جاتے ہیں جس کو حسن کے حاسد +

(۲) دو پہلوانوں سے لڑائی کی تصویر

(۲) دو پہلوانوں سے ایک ساتھ شاہزادہ علی اکبرؑ کی لڑائی۔

دو دیوؤں سے کی ایک سلیماں نے لڑائی — روکی سپر اُس سمت۔ اِدھر تیغ لگائی
تلوار اُدھر کو گئی۔ ڈھال اِس طرف آئی — کاندھوں پہ فرشتوں کا وظیفہ تھا دہائی
دونوں طرف اک بار صفائی نظر آئی
نے ہات نہ تیغیں نہ کلائی۔ نظر آئی

تصویر جنگ

گھوڑے کی عناں باندھ لی اکبرؑ نے کمر سے — زانو کے تلے تیغ و سپر رکھ لی ہنر سے
اور دونوں کی گردن لی۔ اِدھر اور اُدھر سے — سر ایک کا ٹکرانے لگے۔ ایک کے سر سے
اکبرؑ کے تصرف میں خدائی نظر آئی
جنگل میں پہاڑوں کی لڑائی نظر آئی

(۳) حرؑ کی میدان جنگ میں آمد کے وقت دشمنوں کے اضطرار کی تصویر
(نہایت مختصر لفظوں میں)۔

(۳)
(اضطرار ہیبت)

میداں سے پاؤں اُٹھ گئے اور خود گر گئے
مارا طمانچہ خوف نے مُنہ سب کے پھر گئے

(۴) جناب رسالت مآب صلعم کی وفات کے بعد اُن کی اکلوتی چاہیتی بیٹی (جناب فاطمہؑ) کی کیفیت حسب ذیل سیدھے سادے مگر دلکش الفاظ میں مصنّف بیان کرتے ہیں:۔

(۴)
جناب سیدہ کا جناب رسول خدا کے سوگ میں جو حال تھا اس کا مرقع

کھانے کو۔ کھا لیا۔ جو کسی نے کھلا دیا
لیکن عزا میں۔ کچھ نہ۔ غذا نے مزا دیا[1]
غش میں کسی نے مُنہ میں جو پانی چُوا دیا
قطرہ پیا اور آنکھوں سے دریا بہا دیا
نسبت ہے کس سے فاطمہؑ کے شور و شین کو
زہراؑ کے بعد۔ روئی ہیں زینبؑ۔ حسینؑ کو

سن کم۔ قلق زیادہ۔ قلق سے فغاں سوا
سینے سے دل۔ تو دل سے جگر ناتواں سوا
اور بین میں نبیؐ کے کرم کا بیاں سوا
تپ وہ کہ نبضوں سے طپش استخواں سوا[2]
جب فاطمہؑ نے ہائے پدر۔ کہکے آہ کی
واں ہل گئی۔ ضریح رسالت پناہ کی

فضہ کنیز فاطمہؑ کرتی ہیں یہ بیاں
گھر سے ہوا جنازہ پیمبرؐ کا جب رواں
بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں مخدومۂ جہاں
اک ہفتہ رات دن اُسی حجرے میں تھا جاں[3]
دیکھا جو میں نے جھانک کے۔ تو۔ آنکھ بند ہے
آواز آہ آہ کی دل سے بلند ہے

کمال غم کی تصویر

---

[1] یہی ہیں کہ کنایۃً اشارہ ہیں کہ واقعۂ کربلا کو چار لفظوں میں یاد دلا کر سامعین ناظرین کے دلوں کو تڑپا دیا علت غائی مرثیہ کی یہی ہے اور ان کے مزا افزا موید بادہ ہیں عزا۔ غذا۔ مزا۔ یہ الفاظ پاس پاس ایک ہی مصرع میں لانے سے جو دلوں پر اثر ہوتا ہے۔ اسکی کیفیت اہل زبان کے دل سے پوچھئے + ۱۲ مولف حقیر۔

[2] اس میں ردیف ہے اور مشکل ردیف ہے مگر غور سے دیکھئے قافیہ سے کس قدر چسپاں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] کمال غم کی حالت اس سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں بیان کر سکتا۔ کہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہمسائیاں یہ کہتی تھیں اے عاشق پدر
دیدار مصطفےٰ تو ہے موقوف حشر پر
اُن کے عوض تو اپنی زیارت سے شاد کر
حجرے میں بیٹھی تھی یہ کہکر وہ نوحہ گر

اب میں ہُوں اور ہر ایک حقارت ہے صاحبو
بابا موئی[1]۔ کی خاک زیارت ہے صاحبو

القصہ بعد ہفتہ کے دن آٹھواں ہُوا
اور نیل پوش ظلمتِ شب سے جہاں ہُوا
یاں مہرِ بُرج حجرۂ ماتم عیاں ہُوا
پر اس طرح کہ مُردے کا سب کو گماں ہُوا

یہ شکل ہوگئی تھی عزا میں رسُولؐ کی
پہچانی بیٹیوں نے نہ صُورت بتُولؑ کی

وہ وقت شام اور وہ اندھیرا اِدھر اُدھر
ششدر ہر ایک رہ گیا مُنہ دیکھ دیکھ کر
زینبؑ نے جاکے حجرے میں ڈھونڈا بچشم تر
چلائی ہائے لوگو نکل جاؤں میں کدھر

ماں میری کیا ہُوئی۔ میں قلق سے ملُول ہُوں
مڑکر پکاریں آپ۔ عِہیں تو بتُولؑ ہُوں

فِضّہ بیان کرتی ہیں اُس وقت کا یہ حال
دُبلاپے سے ہُوا تھا بدن صورت ہلال
ماتم کے نیل سینے پہ رونے سے آنکھیں لال
مُنہ زرد ہونٹ خشک۔ پریشان سر کے بال

روتی چلیں مزار رسُولؐ انام کو
جس طرح۔ شمع۔ گور غریباں پہ شام کو[2]

برجستہ نکلیں جناب فاطمہ تصویر بین

تصویر جناب فاطمہؑ اور مزار رسول صلعم برجستہ

[1] بابا موئی خاص عورتوں کی زبان کی لفظ ہے یعنی وہ عورت جس کا باپ مر گیا ہو ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] ناظرین! دیکھئے کس قدر مختصر لفظوں میں جناب فاطمہ زہراؑ کی شکل پریشان و غمگین دکھائی ہے اور تشبیہ کس قدر معقول ہے یہ شام کا وقت بھی ہے اور قبر پر جاتی بھی ہیں اور روتی ہوئی جا رہی ہیں شمع بھی گور غریباں پر شام کو روتی ہوئی جاتی ہے ایسی تشبیہ کو تشبیہ تامہ کہتے ہیں بعض ناواقف ایسی باتوں کو مبالغہ مذموم سمجھتے ہیں مگر مصیبت زدہ انسان جانتے ہیں کہ انتہا مصیبت میں زمین کا پھٹنا ہوئی معلوم ہوتی ہے چنانچہ حمدی مسٹر نواب حامد علیخان صاحب بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ ایک شعر میں کیا خوب کہتے ہیں جس شے پہ نگاہ پڑی نظر آئی سوگوار۔ اس قول میں بھی فرقت کو دکھایا یہ واقعی بات ہے جسکو موثر الفاظ میں ادا کیا ہے یہ بھی ایک نکتہ بلاغت ہے ۱۲

گھر سے نکلنے کا حال

اندھیر - فاطمہؑ کے نکلنے سے ہوگیا ۔۔۔ طوفانِ نوحؑ - اشکوں کے ڈھلنے سے ہوگیا
برہم زمانا ہاتوں کے ملنے سے ہوگیا ۔۔۔ عاجز فلک بھی راہ کے چلنے سے ہوگیا
حوّاؑ کفن سے قبر میں مُنہ ڈھانپنے لگی
آدمؑ - لحد میں تڑپے - زمیں کانپنے لگی

راہ چلنے کی حالت اور اضطراب کی تصویر

جُز اشک دونوں آنکھوں میں آتے نہ تھی خارِ خار ۔۔۔ رگر گر ردا اُلجھتی تھی پاؤں سے باربار
اور ماتمی قبا کا گریبان تارتار ۔۔۔ دل تھا ضعیف و زار یہ روتی تھیں زار زار[1]
جب آہ کی - تو چاروں طرف بجلیاں گریں
ٹھہرا کے یاں گریں کبھی غش کھا کے واں گریں

رستے کے لوگ فضّہ نے بڑھ کر ہٹا دئے ۔۔۔ ہمسائیوں نے غرفوں کے پردے گرا دئے
مردوں کے مُنہ پہ دوڑ کے دامن اُٹھا دئے ۔۔۔ رنے چراغ اپنے گھروں کے بجھا دئے[2]
کہتی تھیں فاطمہؑ کے پدر کا یہ شہر ہے
نامحرموں نے بی بی کو دیکھا تو قہر ہے

یثرب میں وقت شام یہ زہراؑ کا تھا ادب ۔۔۔ دن کو پھرایا بلوے میں زینبؑ کو ہے غضب[3]

[1] باوجودیکہ ہر مصرع میں دوہرے دوہرے قافیہ ہیں مگر کتنے بے ساختہ نظم کئے ہیں ۔ یہ سب زبان پر قدرت ہونے کی وجہ ہے جس کا ثبوت وہی شاعر خوب دے سکتا ہے جو زبان کا پورا قادر ہو کہ بے تکلّف اور بناوٹ نظم کرتا دے ۔ یہ واقعہ تاریخی ہے جب آج تیرہ سو برس بعد سنکر دل تڑپ جاتا ہے تو اُس وقت کیا معلوم کیا کیفیت ہوگی ۱۲ مؤلف

[2] اُس زمانے کے بعض خوش اعتقاد مدینے کے مسلمانوں کی حسن عقیدت کی تصویر کھینچی ہے - اور ظاہر کیا ہے کہ جناب فاطمہؑ کے گھر سے نکلنے پر اہل مدینہ میں کیا تھلکہ پڑ گیا تھا ۱۲ مؤلف حقیر

[3] ایک ادعا کا پہلو اپنی قوت تخیل سے نکال لیا کہ مدینہ منورہ میں تو شام کو قت مسلمانوں نے رسولؐ کی بیٹی کا یہ ادب کیا کہ چراغ تک گھروں کے بجھا دئے اور ایک وہ دن بھی آیا کہ دن دہاڑے انہیں کی بیٹی جناب زینبؑ بعد شہادت امام حسینؑ اونٹوں پر پھرائی گئیں ۱۲ مؤلف حقیر

القصہ آئی قبر پہ وہ کشتۂ تعب ‏ ‏ پر کس گھڑی کہ ملی تھی قبر رسولؐ رب

تربت کے گرد پھرنے سے طاقت جو گھٹ گئی

لیکر بلائیں قبر کی - زہراؑ لپٹ گئی

چلائی آہ وا ابتا وا محمدؐاہ ‏ ‏ نور الٰہ - وا ابتا وا محمدؐاہ

شاہوں کے شاہ - وا ابتا وا محمدؐاہ ‏ ‏ وا سیداہ - وا ابتا وا محمداہ[1]

بابا - بتولؑ آئی ہے - تسلیم کے لئے

اُٹھئے - یتیم بیٹی کی تعظیم کے لئے[2]

اور بین اور محبت کی باتیں سنئے

بین

گذرے ہیں آٹھ دن کہ زیارت نہیں ہوئی ‏ ‏ اس بے نصیب سے کوئی خدمت نہیں ہوئی

منبر ہے سونا وعظ و نصیحت نہیں ہوئی ‏ ‏ مسجد میں بھی نماز جماعت نہیں ہوئی

حضرتؐ کے منہ سے وحی خدا بھی نہیں سنی

جبریلؑ کے پروں کی صدا بھی نہیں سنی

حجرہ وہی ہے گھر ہے وہی - ایک تم نہیں ‏ ‏ تارے وہی قمر ہے وہی - ایک تم نہیں

شب ہے وہی سحر ہے وہی - ایک تم نہیں ‏ ‏ ہے ہے یہ بے پدر ہے وہی - ایک تم نہیں

دیتے ہیں سب دعا کہ ٹھہر جائے فاطمہؑ

اور فاطمہؑ یہ کہتی ہے مر جائے فاطمہؑ

---

[1] الفاظ عربیہ وا ابتا وا محمداہ کی تضمین کو دیکھئے - اگر بجائے اس کے اردو کے الفاظ لاتے - ہرگز یہ اثر نہ ہوتا ۔ ۱۲ مؤلف -

[2] ٹیپ میں اس مشہور فضیلت جناب فاطمہؑ کی طرف اشارہ ہے جسکو تمام مورخ بلا اتفاق لکھتے ہیں کہ جب جناب سیدہ جناب رسول خدا کی خدمت میں جاتی تھیں وہ جناب صلعم تعظیم کو سرو قد کھڑے ہو جاتے تھے - اس پیاری عادت کو یاد دلاتی ہیں - اب دیکھئے کہ بیٹی اپنے باپ سے تعظیم دینے کو صرف بین میں کہ سکتی ہے - دوسرے مقام پر نہیں کہ سکتی - یہ بلاغت کے نکتے ہیں جنکو دیکھ کر بالغ نظر کلام دبیر پر جان دیتے ہیں ممکن ہے کہ کوئی ناواقف کہدے - کہ بیٹی کی باپ عام طور پر کب تعظیم کرتا ہے - مگر خواص عوام سے کیا کام ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر -

محبت کی باتیں

تسلیم میری اے پدر نامدار لو — یہ بال بکھرے۔ ہاتھوں سے اپنے سنوار لو
راضی ہوں میں نہ گود میں بھی زینہار لو — قربان جاؤں فاطمہؑ کہکر پکار لو
پوچھو یہ تم ۔ مزاج تو تیرا ۔ بخیر ہے
لونڈی کہے کہ حال جُدائی سے غیر[1] ہے

مشہور ہے ۔ کہ بیٹے کا داغ سب صدموں سے بڑھ کر ہے ۔ مگر مصنف ایک عجیب دعوے جناب فاطمہؑ کی زبانی کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں ۔ کہ باپ کا داغ اُس سے بھی بڑھ کر ہے ۔ شاعری میں جائز ہے کہ ایک شخص تمام دُنیا کے خیال و مقولہ کے خلاف دعوے کرے ۔ مگر یہ شرط ہے ۔ کہ ثابت کردے ۔ یہی تمثیل کی خوبی و کمال ہے ۔ جیسے تمام شعرا کہتے ہیں ۔ کہ شمع معشوق اور پروانہ عاشق ہے ۔ برخلاف اس کے ایک ایرانی شاعر نے دونوں میں دشمنی ہونیکا دعوے کیا ہے ۔ مگر کمال یہ کیا ۔ کہ ثابت کردیا ۔ وہ شعر یہ ہے ۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را — چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[2]

اب ناظرین دیکھیں ۔ کہ تمام شاعروں بلکہ تمام دُنیا کے خلاف مرزا صاحب مرحوم جناب سیدہؑ کے واسطے باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے بڑھ کر مشکل ثابت کرتے ہیں یا نہیں ۔ وہ فرماتے ہیں :۔

باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے بڑھکر ہے

آساں پسر کا داغ ہے مشکل پدر کا داغ — وہ کچھ دنوں کا داغ ہے یہ عمر بھر کا داغ
یہ تن بدن کا داغ ہے وہ اک جگر کا داغ — پیدا ہُوا پسر تو مٹا اُس پسر کا داغ

[1] مرثیہ گو شاعر کی قلعی یہیں بَین میں کھُلتی ہے ۔ دیکھئے جیسی محبت سید الانبیا صلعم باپ اور سیدۃ النساؑ بیٹی میں تھی ۔ ویسی ہی محبت ان بندوں میں بین لکھکر دکھائی ہے ۔ دل کی تڑپ کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ بس یہی مشکل ہے ۔ سراپا یا لڑائی وغیرہ کے ہزار بند کہنے آسان ہیں ۔ اور ایسے بین کا ایک بند مشکل ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

[2] یہ شعر حافظ شیرازؒ کا مشہور ہے ۔ مگر مجھے اُن کے دیوان میں اب تک نہیں ملا ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

اولاد کا بدل ہے - پدر کا بدل نہیں
یہ وُہ درد ہے - جس کی دوا - جُز اجل نہیں[1]

اور باپ بھی وہ باپ کہ سرتاج انبیا — نورِ خدا - جلالِ خدا - رحمتِ خدا
روزِ ازل سے تا با بد کُل کا پیشوا — بیٹی پہ صدقے - بیٹی کے بچّوں پہ بھی فدا
کیونکر نہ اپنی موت مجھے اب قبول ہو
دُنیا میں ایسا باپ نہ ہو - اور بتولؑ ہو

سکھیہ خراش بین

(خیر اب ذرا یہ جگر خراش بین بھی سُنئے - یہ باتیں مرثیہ کی جان ہیں)

کیا سو رہے ہو قبر میں بابا جواب دو — چلّا رہی ہے آپ کی زہرا جواب دو
مولا جواب دو - مرے آقا جواب دو — دل مانتا نہیں مَیں کروں کیا؟ جواب دو
بولو مَیں صدقے جاؤں بہت دل ملول ہُوں
بابا بتولؑ ہُوں میں - تمہاری بتولؑ ہُوں

پھرتے تھے جب سفر سے مرے پاس آتے تھے — لونڈی کے بے ملے نہ کبھی حج کو جاتے تھے
فاقہ جو میرا سُنتے تھے کھانا نہ کھاتے تھے — جو جو مَیں ناز کرتی تھی حضرتؐ اُٹھاتے تھے
کیسی حقیر بعد رسولؐ کریم ہُوں[2]
دُرِّ یتیم آگے تھی - اب تو یتیم ہُوں

---

[1] دیکھئے کیسی عمدہ دلیل سے ثابت کر دیا - کہ باپ کا داغ بیٹے کے داغ سے مشکل تر ہے - کہ دُوسرے بیٹے کے پیدا ہونے پر وہ داغ مِٹ سکتا ہے مگر باپ کا داغ نہیں مِٹ سکتا بس اسکی دوا یہی ہے کہ عاشق بیٹی بھی مر کر باپ سے جا ملے اپنی دلیل کو اور ترقی دیتے ہیں اور کہتے ہیں باپ بھی وہ باپ جو تمام خدا کی خدائی سے بہتر ہو - یہ حفظ خاندان سالت کے ۱۱ سبب ہیں جنکا اکثر موقعوں پر مرزا صاحب خیال رکھتے ہیں اور یہ بھی اسباب بلاغت میں ایک سبب ہے جس وجہ سے وہ اپنے معاصرین سے بہتر سمجھے جاتے ہیں لوگ نیچرل نیچرل پکارتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ خاصان خدا کی شان عوام کالانعام سے الگ کر کے دکھانا یہی تو (نیچر) قدرت کا نظارہ ہے ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] مرثیہ کے اصلی معنی یہی ہیں - کہ کسی (بزرگ) مرحوم کے اخلاق و عادات حسنہ یاد کر کے رونا - یہ انھی عادات حضور صلعم کی نظم کئے ہیں

(۵) صبح عاشورا جناب امام حسینؑ اپنے بعض عزیزوں کو بعض تبرکات سلاح وغیرہ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کہ اب لڑائی ٹھیر گئی ہے۔

پردہ اٹھا کے ڈیوڑھی سے زینبؑ کی نظر
دیکھا سلاح بانٹتے ہیں شاہ بحر و بر
بے ساختہ پکاریں۔ بہن صدقے آپ پر
حقدار۔ امیدوار کھڑے ہیں ادھر ادھر[۱]

آقا ہر اک غلام کے جوہر شناس ہیں
دو نیمچے بھی تیغ حسینیؑ کے پاس ہیں

تصویر واقعہ

گردن ہلا کے شاہ نے وہ نیمچے اٹھائے
اور پہلوؤں سے سامنے ہمشیر زادے آئے
ننھے سے ہات قبلۂ دیں کی طرف بڑھائے
ماں اس طرف۔ ادھر شہ ابرار مسکرائے

فرمایا اپنی ماں کے اشارے سمجھ گئے
کی عرض۔ ہاں۔ غلام تمہارے سمجھ گئے[۲]

تصویر

(بقیہ نوٹ نمبر ۲) جیسا کہ مؤرخین و محدثین نے لکھا ہے کہ وہ جناب جب سفر سے پھرتے تھے جناب فاطمہؑ کے گھر میں اوّل آتے تھے۔ اور جاتے تھے تو ضرور اور سب کے بعد جناب سیدہؑ سے ملتے تھے۔ جناب سیدہؑ فاقہ سے ہوتی تھیں تو خود بھی بھوکے رہتے تھے۔ اس مرثیہ کی بندش اور مضامین عالیہ و زبان کی خوبیاں تو کہتے ہیں کہ اور کچھ بند لکھوں مگر خیال طول کتاب مانع ہے۔ تیسری جلد دفتر ماتم میں یہ مرثیہ چھپ چکا ہے مقطع میں اپنی والدہ کی مغفرت کے واسطے مرزا صاحب نے دعا کی ہے سنا ہے کہ ان کی چہلم کی مجلس پڑھا تھا جو شاید ۱۲۵۰ھ کے قریب قریب انتقال فرما گئی ہیں۔ یہ عجیب و غریب بات ہے۔ کہ ایسے فصیح و سلیس مرثیے مرزا صاحب نے اس زمانہ میں اکثر کہے ہیں۔ کہ جب تک میر انیس مرحوم لکھنؤ میں تشریف نہ لائے تھے و مشہور ہوئے تھے۔ پھر وہ مضمون آفرینی و مشکل و دقیق نظم پر متوجہ ہو گئے ۔ مؤلف حقیر۔

[۱] اس مصرع میں حقدار۔ امیدوار دو لفظ مصنف علام لائے ہیں بلاغت کا نکتہ یہ ہے کہ لکھنؤ کی شریف بیبیاں لونڈیوں کو بولتی ہیں اس کے بدلے اگر مستحق سزاوار۔ لائق یا اور کوئی لفظ لاتے تو یہ بات حاصل نہ ہوتی۔ اور کمال بلاغت یہ ہے۔ کہ یہ کہاوت بھی دی ہیں ۔ ۱۲ مؤلف حقیر

[۲] اس بند میں امام حسینؑ کے نیمچے اٹھانے بھانجوں کے سامنے آنے اور ہاتھ بڑھانے کی تصویر مختصر لفظوں میں کھینچدی ہیں۔ اور پھر ننھے سے ہاتھ کہکر گریز کن نظم فرمایا ہے کہ مجلس عزا میں سامعین کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ افسوس کے بھولے بھولے یہ نونہال بھی کٹ مرے گئے ۔ ۱۲ مؤلف

محبت بھرا جواب

اب یہ جواب سُنیئے۔ کہ پیارے بھانجے اپنے نازبردار ماموں سے کیا کہتے ہیں - ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔

شفقت سے والدہ نے کہی اس گھڑی یہ بات ‏ خود ہم پہ آپ کو ہے نگاہِ تفضلات

دُنیا میں آنکھ کھول کے دیکھا تمہارا ہات ‏ دعوے یہ ماں کے ساتھ نہ ہم کو پدر کے سات

اماں اگر نہ کہتیں تو حضرت نہ دیتے کیا؟

نیچے حضور سے خادم نہ لیتے کیا؟

زینبؑ پکاریں بس بہت اخلاص میں نہ آؤ[1] ‏ عاشق سہی مگر نہ ادب قاعدہ بھلاؤ

باور مجھے تو جب ہو کہ قدموں پہ سر کٹاؤ ‏ آئی ہو جو حسینؑ پہ ساتھ اپنے لیتے جاؤ[1]

کچھ آج تو نئے نئے انداز کرتے ہو

کیا سر فدا کئے ہیں جو یہ ناز کرتے ہو

بانکپن کے پہلو لئے ہوئے جواب

اب ان شیروں کا بانکپن پہلو لئے ہوئے جواب بھی سُن لیجئے:-

بیٹوں نے دی ندا کہ ہے مرنا محال کیا ‏ ہم سرفروش ہیں سرو تن کا خیال کیا

ماموں سے بڑھ کے عرض کریں یہ مجال کیا ‏ دُنیا ہے چند روز پھر اس کا ملال کیا

اب یا کہ وقتِ عصر یہ سامان کیجئے

جب چاہئے۔ غلاموں کو قربان کیجئے

حضرتؑ نے بھانجوں کو گلے سے لگا لیا ‏ خود نیچوں کو پیار سے زینبؑ کمر کیا

زینبؑ نے واں زمیں پہ سر اپنا جھکا دیا[2] ‏ ناگہ ہوا وفور تجلّیِ کبریا

---

[1] بس بہت اخلاص میں نہ آؤ۔ یہ پورا شریفانہ دلوں کا روزمرہ ہے۔ جو ایسے ہی موقع پر بولتی ہیں اسی طرح چوتھے مصرع میں فرمایا کہ آئی ہو جو حسینؑ پہ ساتھ اپنے لیتے جاؤ۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ بلا جاتی ہو۔ اس لئے کہ یہ روزمرہ بھی لکھنؤ کی شریف زادیاں یوں ہی بولتی ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] زمین پر سر جھکانے سے مراد سجدۂ شکر کرنے سے ہے۔ الکنایۃ ابلغ من التصریح کے یہی معنی ہیں۔ ایسا ہی کنایہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ چوتھے پانچویں چھٹے مصرع میں ایک حیرت فیضا بات کہہ گئے کہ ناظرین یا حاضرین مجلس متحیر ہو جائیں کہ اب کیا بیان کریں گے۔ اب کسی ایسی چیز کا (تبرکات میں سے) ذکر کریں گے جو جسم جناب رسول خدا صلعم سے زیادہ ملحق رہتی تھی۔ اور جس میں خوشبوئے جسم حضور صلعم سرایت کر گئی ہے۔ اُس کا بیان حقیر ع۳۶ میں کریگا + ۱۲ مؤلف حقیر

عرشِ عُلا پہ صلِّ علیٰ کی صدا گئی
خوشبو نبیؐ کی سب کے دماغوں میں آگئی

(۶) زینبؑ نے پھر نظارہ کیا رُوئے شاہ کا — دیکھا کہ سر جھکا ہے شہِ کم سپاہ کا
اک ہات میں ہے تاجِ رسالتؐ پناہ کا — اک ہات میں نشان ہے شیرِ الٰہ کا
تجویز کر رہے ہیں۔ کسے یہ عطا کروں
منصب ہیں دو۔ عزیز بہت۔ عُذر کیا کروں

ازبسکہ حضور صلعم بادشاہ دین ودُنیا تھے۔ حضُور کی کلاہ کو مصنف نے تاج سے تعبیر کیا۔ اسی کی خوشبو آئی تھی۔ اس موقع پر مَیں کئی بند چھوڑ کر وہ رائے بیان کروں۔ جو جناب زینبؑ نے دی۔

لشکر کی افسری انہیں دونوں کو آج دو — عبّاسؑ کو علم۔ مرے اکبرؑ کو تاج دو
مشتاق اس کلام کے تھے شاہ اتقیا — بوسہ جبینِ اکبرِ گلفام کا لیا
اور مُسکرا کے تاجِ نبیؐ سر پہ رکھ دیا — آنکھوں کے آگے پھر گئے محبوبِ کبریا
سرتاجِ عرش روشنیٔ تاج ہوگئی
اکبرؑ کے سر سے تاج کو معراج ہوگئی

(۷) علم جناب رسول خدا صلعم کس کو ملنا ہے۔ مختصر لفظوں میں اب یہ بھی سُنئے:۔

یہ تہنیت سُنی جو سکینہؑ نے بار بار — عبّاسؑ کی ولا نے کیا اُس کو بے قرار
پردے سے مُنہ نکال کے بولی وہ گُلعذار — بھیا ہُوئے پھوپھی کی سفارش سے تاجدار
خاطر مری بھی۔ قبلۂ ابرار۔ کیجئے
بابا۔ مرے چچا کو۔ علمدار۔ کیجئے

تصویرِ واقعہ

ہنس کر پکارا شاہ نے اپنے فدائی کو — لبیک کی ندا دی۔ بھادرنے۔ بھائی کو

(۶) تصویرِ واقعہ تاج

(۷) علم بخشی کی تصویر

دامن علم کا اُڑکے چلا پیشوائی کو ٹھنڈی ہوا نے یاد دلایا ترائی کو[1]

رایت تھا یا کہ قاصد ربِّ انام تھا
گویا علم کے شُقے میں غازی کا نام تھا

اب ذرا ان برمحل تشبیہات و تمثیلات کو بھی ملاحظہ فرمائیے: ۔

تمثیلات

کھنچتا تھا یُوں علم طرف بازوئے امام دل جس طرح سے شیعوں کا سوئے علیؑ مدام
شکل زباں بنا تھا نشانِ شہِ انام گویا پکارا چاہتا تھا لے کے اُن کا نام
عالم جو دیکھا دوشِ مبارک کی شان کا
بے ساختہ پھڑک گیا شانہ نشان کا

ابنِ علیؑ کے بختِ رسا نے رسائی کی پائی علم کے پردے میں دولت خدائی کی
عزت بڑھائی بھائی نے جانباز بھائی کی دیکھی نشان دے کے جو شان اُس فدائی کی
نظروں سے دُور۔ اَوجِ شرف کے قریب تھا
پنجہ۔ سپاہ پنجتنی کا۔ نصیب تھا[2]

حضرت عباسؑ علم لیکر جب باہر نکلے ہیں

(۸) جب صبحِ عاشور حسب الحکم امام حسینؑ جناب عباسؑ پرے علم لیکر نکلے ہیں اُس موقع پر مصنف کہتے ہیں

القصہ لے کے رایت شاہِ امم چلے جنت کو سیدھی چوبِ علم۔ کر کے خم چلے
اور ہات میں سپر سرِ اُٹھائے حرم چلے گودی میں بچے لے کے بزیرِ علم چلے

---

[1] امام حسینؑ کا ہنس کر پکارنا اور پیارے بہادر بھائی کا لبیک۔ (حاضر) کس کیسی محبت و نعمات کی لطیف و حسین تصویریں ہیں۔ اب مضمون اُنھی کو دیکھیے۔ کہ ہوا کے سبب سے دامن جو علم کا اُڑ کے آگے کو چلا۔ تو مصنف اس کو پیشوائے علمدار قرار دیتے ہیں یہ لطفِ تخییل و حسن تعلیل ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اُس ہوا سے سرد نے ترائی کو یاد دلا دیا۔ ترائی مقتل حضرت عباسؑ ہے یہ گریہ خیز کنایہ ہے۔ شقہ فرمان شاہی کے معنی پر بھی بولا جاتا ہے۔ شقہ علم بھی کہلاتا ہے۔ اس لئے یہ کیسا دلچسپ استعارہ ہے کہ گویا شقہ علم میں نام حضرت عباسؑ علمدار کا مرقوم تھا۔ اور وہ رایت قاصد خدا تھا کہ علمدار کو بلانے آیا تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] پنجہ نشان کا کیا چمک رہا تھا۔ گویا فوج پنجتنِ پاک کا نصیبہ چمک رہا تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

زینب پکاریں شاہ نجف یاد آتے ہیں
کس شان سے علم لئے عباسؑ جاتے ہیں

(بڑی بہن دعا دیتی ہیں)

(بڑی بہن دعا دیتی ہیں)

یارب نشان والے کا نام و نشاں رہے
یہ شمس بے زوال یہ گل بے خزاں رہے
لشکر سے حسینؑ رہیں۔ یہ نشاں رہے
اس حامل علم پہ علیؑ کی اماں رہے
روشن رہے قمر شہ بدر و حنین کا
وہ خاک میں ملے جو ہو دشمن حسینؑ کا*

(شاہزادی سکینہ کی باتیں)

سکینہ دختر امام حسینؑ کو حضرت عباسؑ سے انس و محبت ہے۔ کہ گود میں پلی ہیں۔ وہ اس موقع پر کیا کہتی ہیں

بڑھ کر سکینہ بولی ذرا منہ ادھر پھراؤ
پیاسوں کو اس علم کی خوشی میں نہ بھول جاؤ
بابا تو کچھ خفا ہیں۔ تمہیں مجھ پہ رحم کھاؤ
اچھے مرے چچا ابھی دریا سے پانی لاؤ
ایسا نہ ہو کہ جا کے فراموش کیجئے
اپنے علم میں مشک مری باندھ لیجئے

(اعجاز بلاغت)

اس بلاغت بیان کو دیکھئے۔ بچے جس طرح اپنے چاہنے والوں سے ناز کرتے ہیں۔ اسکی تصویر کھینچ دی ہے۔ اللہ اللہ کیا شان دکھائی ہے۔ ذرا منہ ادھر پھراؤ۔ اس اقتضائے مقام کی بلاغت پر نظر کیجئے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا کہ علم ملنے کی خوشی میں کہیں ہم پیاسے بچوں کو نہ بھول جانا۔ کیسی ناز و محبت کی باتیں ہیں۔ تین روز سے پیاسی ہیں۔ اس کا گلہ بھی کرتی ہیں تو کس طرح۔ کہ "بابا تو کچھ خفا ہیں تمہیں مجھ پہ رحم کھاؤ" "اچھے مرے چچا" کتنا پیارا روزمرہ ہے۔ کہ بچے اپنے ناز بردار بزرگوں سے یوہیں کہتے ہیں۔ اس سب پر طرہ یہ کہ "کہیں بھول نہ جانا" یاد رکھنے کے واسطے معمول ہے۔ کہ کوئی بند میں گرہ دے لیتا ہے۔ کوئی نشان کے طور پر کچھ چیز لے لیتا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ ع اپنے علم میں مشک مری

* ناظرین غور و انصاف سے دیکھئے۔ کیا اس سے بہتر سلیس و فصیح نظم اور پھر مختصر کوئی دوسرا شاعر کر سکتا ہے جب تو دبیرؔ کا جھنڈا ملک سخن میں گڑا ہوا ہے۔ (بقول حقیر) زبانوں پہ لفظ اور دلوں پر ہو سکہ۔ یہ لطف زباں ہے یہ حسن بیاں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

لطف لیجئے۔ فرمائیے اگر کوئی شخص اس نظم کو نثر میں بیان کرنا چاہے۔ تو کیا اس سے مختصر لفظ جامع معانی لا سکتا ہے۔ یہ زبان پر قدرت ہے۔ اس کا نام بلاغت ہے۔ اس کو مقتضائے حال کے موافق کلام کہتے ہیں ع ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ❊

(۹) دو یتیم کم سن بچوں (پسران مسلم بن عقیل) کو حارث نامی قاتل قتل کرنے کو دریائے فرات پر آبادی سے دور لاتا ہے۔ اس موقع کا مرقع دیکھئے:۔

صبح کا وقت ہے دریا سے دھواں اٹھتا ہے ۔۔۔ دل سے بچوں کے ادھر شور فغاں اٹھتا ہے
قبر سے شیر خدا۔ نعرہ زناں اٹھتا ہے ۔۔۔ آسماں گرتا ہے مسلم کا نشاں اٹھتا ہے
طوق کا نیل بھی گردن پہ ابھی باقی ہے*
اور گلے ملنے کی تلوار کو مشتاقی ہے

پاس سے بھائی کا منہ دیکھ رہا ہے بھائی ۔۔۔ کوئی کوسوں نظر آتا نہیں۔ جز تنہائی
دل آگاہ یہ کہتا ہے کہ اب موت آئی ۔۔۔ خوف سے بند ہے آواز۔ دم گویائی
عذر سنتا ہے۔ نہ منت نہ قسم مانتا ہے
قتل بچوں کا ثواب اہل ستم جانتا ہے

(۱۰) لشکر ابن زیاد کی بدحواسی کی تصویر۔

(۱) ترکش میں عدو ڈھونڈتے تھے نیزے کو ہر بار ۔۔۔ زہ کرتے تھے نیزوں کو کمانوں میں کماندار
مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار ۔۔۔ تیغوں کی جگہ ڈھالوں کا کرتے تھے کبھی وار
اک نہر زرہ پوشوں کے خون کی جو بھی تھی

*کوفہ میں عبید اللہ ابن زیاد نے ان بچوں کو قید کر دیا تھا۔ مگر مشکور نامی داروغہ محبس (جیل) نے رحم کھا کر رات میں رہا کر دیا تھا۔ ابن زیاد نے اشتہار دیا تھا۔ کہ جو کوئی ان بچوں کو گرفتار کر کے لائیگا۔ اسکو دو ہزار درہم دونگا۔ حارث جو ایک دشمن آل محمد صلعم تھا۔ اس کو یہ بچے مل گئے۔ وہ قتل کرنے کو دریائے فرات پر شہر کوفہ سے دور لایا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ کہ ان کے سروں کو جدا کر کے لیجاؤنگا۔ تو ابن زیاد زیادہ خوش ہو کر خوب انعام دیگا ❊ ۱۲ مؤلف حقیر۔

لشکر کی حالت کی تصویر

موجوں کی طرح آپ زرہ کانپ رہی تھی

(۲) ایک دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

گھبرا کے تاسف جو عدو کرتے تھے رن میں
انگشت کی جا تیروں کو رکھتے تھے دہن میں

(۳) تیسرے مرثیہ میں آمد حضرت عباسؑ کے وقت جو بدحواسی لشکر یزید پر چھائی ہوئی ہے۔ اُس کو بیان کرتے ہیں:۔

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کی فکر میں بے پیر
ترکش میں رکھیں تیغیں نیاموں میں رکھے تیر
جی کرکے جو ٹھہرے بھی دم دار و دم گیر
قبضہ کے عوض ہات میں پکڑا سر شمشیر
تیروں کے بدل ہات فقط جوڑ رہے تھے
ہاتوں سے کماندار کماں چھوڑ رہے تھے

(۴) چوتھے مرثیہ میں کہتے ہیں:۔

خود رفتہ تھا ہر تیر یہ رفتار نئی تھی
انگڑائی کا لینا بھی کماں بھول گئی تھی

(۱۱) دریائے فرات کو فوج یزید گھیرے ہوئے ہے۔ اُس کی نسبت کہتے ہیں:۔

چاروں طرف تھا بسکہ ہجوم سپاہِ شام
گویا سیاہ پوش تھا آب رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالک کوثر ہے تشنہ کام
بالکل اُلٹ دئے تھے حبابوں نے اپنے جام
دریا جو دور۔ پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
مُنہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

(۱۲) صبح عاشور عمر بن سعد سردار لشکر یزید جاسوسوں سے امام حسینؑ کے خیموں کا حال پوچھ رہا ہے۔ جو حالات وہ پوچھتا ہے۔ وہ سب ضروری ہیں۔ میں نے اُن پر نمبر ڈال دئے ہیں:۔

جاسوسوں کو قریب بلا کر کہی یہ بات
لو تم بھی اب کہو خبر شاہِ نیک ذات
بن پانی۔ کس طرح سے کٹی یہ تمام رات
شب کیا تھی واردات اور اب کیا ہے واردات
نامہ تو کوئی۔ اہل وطن کو لکھا نہیں

(۱۱) دریائے فرات کا بیان

(۱۲) جاسوسوں سے عمر سعد کا حال امام حسینؑ پوچھنا

بہرِ کمک طلب تُو کسی کو کیا نہیں

کس کس کو شہ نے اسلحہ بخشا ہے کچھ سُنا
شمشیرِ حیدری ہوئی کس شیر کو عطا

پچھلے کو خیمہ گاہ میں کیوں حشر تھا بپا
ہم کو تو دیتے ہو نہ لگے شبیرؑ بددعا

مشتاقِ اجل ہے۔ کہ شوقِ جہادؑ ہے*

جاسوس نے کہا کہ فقط حق کی یاد ہے

ہر سجدے میں شفاعتِ اُمت کی ہے دعا
کیسی مدد حسینؑ کو ہے احتیاج کیا

اکبرؑ سے شاہ کہتے تھے بیٹا وطن کو جا
تنہائی کی اجل میں ہے پیارے بڑا مزا

کب اسلحہ کسی کو دیا ہے حسینؑ نے

تقسیم سب کو صبر کیا ہے حسینؑ نے

پچھلے پہر کے رونے کا مضموں ہے دردناک
شبیرؑ نے سکینہ کا کُرتہ کیا تھا چاک

مُنہ پر ملی تھی اُس کے یتیموں کی طرح خاک
روتے تھے سب کہ صلح نہ ٹھہری امامِ پاک

سمجھاتے تھے حسینؑ کہ کل صلح ہوئیگی

لیکن وہ صلح ہوگی کہ سب خلق روئیگی

حضرتؑ نے بیکسی سے کہا جب کہ یہ سخن
مل کر گلے سے بھائی کے رونے لگی بہن

پہنائے اپنے بیٹوں کو چھوٹے سے دو کفن
مادر ہوئی جوانیٔ اکبرؑ پہ نعرہ زن

غش آیا۔ تین بار شہ بے نظیر کو

بالوؑ سے بخشوایا جو اکبرؑ نے شیر کو

(۱۳) فوج یزید کی طیاری کی مختصر تصویر۔

جوابِ مجمل ایک مصرع میں دس سوالوں کا

(۱۳) فوجِ یزید کی طیاری کی مختصر تصویر

---

* اُوپر کے دس سوالوں کا جواب مجمل گویا ایک مصرع میں دے دیا ہے۔ ع جاسوس نے کہا کہ فقط حق کی یاد ہے۔ اب بعد اجمال کے آئندہ بند میں تفصیل جار ہر بات کا جواب جاسوس دیتا ہے۔ اس میں بین کے کنایہ اشاروں کو دیکھنے چاہئے جو نشتر و خنجر کا کام (مجلس ماتم میں) دیتے ہیں۔ اور مرثیہ کی علتِ غائی اور جان ہیں +۱۲ مؤلف حقیر۔

ناگاہ - اُقتلوا - کی صدا[1] تا فلک گئی
آوازِ طبلِ جنگ کی عیّوق تک گئی

چِلّے کھچے - کمانِ کیانی کڑک گئی
ہر سمت مغربی و جنوبی چمک گئی

رن کے ورق پہ جنگ کے آئین کھنچ گئے
ہندی سروہیاں، عربی زین - کھنچ گئے

اُٹھ اُٹھ کے پھیلے رن میں بگولے نشانوں کے
ٹاپوں کے غل سے کان کھلے آسمانوں کے

شکلِ زبانِ مار - ملے پھل سنانوں کے
جھومے وغا کے نشہ میں سر نوجوانوں کے

مستوں نے مثلِ شیشہ وہاں قہقہے کئے
طوبے کے عندلیبوں نے یاں چہچہے کئے (یعنی لشکر امام حسینؑ نے)

امام حسینؑ اور اُنکے جاں نثار عزیز و انصار سوار ہوتے ہیں۔ اس واقعہ کی مختصر مگر لاجواب تصویر دیکھئے:-

لشکریان امام حسینؑ گھوڑوں پر چڑھے

فرما کے یا علیؑ شہِ صفدر ہوئے سوار
ہٹ کر عقاب پر علی اکبرؑ ہوئے سوار[2]

عباسؑ لے کے رایتِ حیدر ہوئے سوار
بتیس[32] شہسوار برابر ہوئے سوار

---

[1] اقتلوا کے معنی (اے لشکر والو) قتل کرو - عیّوق ایک ستارہ کا نام ہے جو مشہور ہے کہ زمین سے بہت دور ہے ملا محتشم فرماتے ہیں ع زاں تشنگان ہنوز بعیوق میرسد - آوازِ العطش زبیابانِ کربلا - اس شعر مرثیہ ملا محتشم کے سبب سے عیّوق ستارہ بہت مشہور ہو چکا تھا اس لئے مرزا صاحب نے بھی عیّوق نظم کیا۔ مغربی و جنوبی تلواروں کی مشہور قسمیں ہیں یعنی مغرب جنوب کی بنی ہوئی - اور ہندی سروہی اسقدر عرب میں مشہور تھی کہ وہاں تلوار کو مہنّد کہتے تھے۔ نشانوں کے بگولے پھیلنا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے آسمانوں کے کانوں کا کھلنا اور سانپ کی زبان کی طرح برچھیوں کے پھلوں کا ملنا اور لڑائی کے نشہ میں نوجوانوں کے سروں کا جھومنا عجب مضامین و واقعات ہیں ایسی باتیں دوسرا شاعر اگر ایک جگہ جمع بھی کر دیگا تو اتنے مختصر الفاظ میں غالباً جمع نہ کر سکے۔ ٹیپ میں لشکر امام حسینؑ کا ذکر چھیڑ دیا ۱۲ مؤلف

[2] عام اہل اسلام لڑائی کیواسطے جب تیار ہوتے ہیں تو یا علیؑ کہتے ہیں پہلا امام حسینؑ کو سوار فرمانا ہے نام قدس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خدا کا نام بھی ہے۔ مصنف نے پہلے امام حسینؑ کا سوار ہونا بیان کیا۔ اس کے بعد ہمشکل رسول خدا علی اکبرؑ کا سوار ہونا کہا جنکی نسبت مسلمانوں میں مشہور ہے کہ فوج خدا کا سپہ سالار امام حسینؑ نے انکو مقرر فرمایا تھا۔ علی اکبرؑ کی شان سواری کو دیکھئے کہ اپنے والد ماجد سے کچھ پیچھے ہٹ کر سوار ہوئے شہسواروں کا قاعدہ ہے کہ ذرا پیچھے سرک کر سوار ہوتے ہیں اسکے بعد علمدار علم لیکر سوار ہوئے اور ساتھ ہی (اُن کے) تمام شہسوار انصار جو شمار میں بتیس[32] تھے سوار ہو گئے۔ اب ۳۲ کے عدد کے بعد پیدلوں کو بھی بتا دیا کہ چالیس پیادے تھے ہمت انکی دیکھئے کہ ہزاروں یا لاکھوں سے لڑائی کو سر کیف جاتے ہیں۔ اس مختصر نظم کو اور اس ترتیب و تہذیب فوج کو اور اس شان و شوکت نظم کو دیکھئے ۱۲ مؤلف حقیر

چالیس پیدل آگے جلو میں بہم چلے
یہ فوج لے کے لڑنے کو شاہ امم چلے

امام حسینؑ اور اُن کے بہتّر ساتھی ہتھیلی پر جان لئے ہُوئے لڑنے مرنے کو جارہے ہیں بھلا ان سے مقابلہ کرنے کی کس کو تاب ہے۔ ان کی شجاعت میں جس قدر مبالغہ کیا جائے کم ہے۔ یہ حسن عبث نہیں ہے۔ بلکہ جاں بازی اور سرفروشی کی شان ہے۔ اُس شان ہیبت و دبدبہ کو مصنّف یُوں دکھاتے ہیں:۔

شانِ شجاعت و دبدبہ

باگیں حسینیوں نے اُٹھائیں جو ناگہاں | دستِ فلک سے چھُٹ گئی جوزا کی بھی عناں
اللہ رے دبدبہ کہ دبا اوجِ آسماں | اللہ رے طنطنہ کہ تنا پھر نہ اک جواں

آئینہ ہو کے شرع کا آئین رہ گیا
رستوں سے کفر بھاگ گیا دین رہ گیا ✻

علی اکبرؑ کے مرگِ ناگہاں و حسن کا اثر دشمنوں کے دلوں پر

(۱۴) علی اکبرؑ ہم شکل محمد مصطفےٰ صلعم لڑنے اور مرنے کو میدان میں آتے ہیں۔ مرگِ ناگہاں اور حسن کا اثر دشمنوں کے دلوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس مضمون کو مرزا صاحب کہتے ہیں:۔

رن میں عقاب کو جو اُڑاتے ہُوئے یہ آئے | اکبرؑ کے قصدِ مرگ پہ دشمن بھی تھرتھرائے
تیغیں پلک جھپک میں ہاتوں کو مل کر کہا کہ ہائے | سچ ہے منابعت میں کوئی دین کیا بچائے

✻ دبدبہ۔ دبا۔ طنطنہ۔ تنا۔ ان الفاظ کی مناسبت کی داد صرف اہل زبان یا خوش مذاق زباندان دے سکتے ہیں۔ کمال شجاعت مدح یہ ہے کہ ان بہتّر شہیدوں کی بدولت دین اسلام کی حقانیت آئینہ ہوگئی۔ کفر رستوں سے بھاگ گیا دین قائم رہ گیا۔ ورنہ یزید کو لوگ خلیفہ مان چکے تھے۔ اسلام مٹ جاتا۔ اس مضمون کو اکثر شعرا نے خوب خوب پیرایوں میں ادا فرمایا ہے۔ چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ فرماتے ہیں:۔ (رباعی) شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ۔ دین ہست حسینؑ دین پناہ ہست حسینؑ۔ سرداد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ۔ جناب میر انیس مرحوم نے بھی خوب فرمایا ہے سے تباہی میں سفینہ آچکا تھا اُمت جد کا۔ یہ کشتی بحر خوں میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے۔ اسی مضمون کے قریب قریب ایک بے بضاعت نے بھی کہنا چاہا ہے تین آفتابوں کو چراغ دکھایا ہے۔ یعنی حقیر نے شہدائے کربلا کی مدح میں ایک مرثیہ میں کہا ہے سے باغ دہبار کر دیا ریتی کو دین کی سینچا ہے اپنے خون سے کھیتی کو دین کی۔ ۱۲ مؤلف حقیر

ایسے جوان مرتے ہیں عقبےٰ کے واسطے
ہم ان کا خون کرتے ہیں دُنیا کے واسطے*

اولاد والے اپنے کلیجوں کو تھام کر — رو کر پکارے الحذر اے موت الحذر
کس ناامید باپ کا لائی ہے تو پسر — کس بے نصیب ماں کا شکستہ کیا جگر
جاہ و جلال ہیں نبیؐ ذوالجلال کے
لائی ہے موت کس کا کلیجہ نکال کے*

(۱۵) علی اصغرؑ دودھ پیتے ہوئے چھ ماہ کے بچے پیاس کے سبب سے جھولے میں بیہوش سے ہیں
ان کی ماں جھولے کے پاس بیٹھی ہوئی کہہ رہی ہیں :-

کہتی تھی نجف میں انہیں لیکے جاؤنگی — شاہ نجف کا ان کو مجاور بناؤنگی
پٹی پکڑ کے گرد لحد کے پھراؤنگی — ہے ہے انہیں کو قبر میں اب میں سلاؤنگی
منت کے طوق بڑھ چکے۔ پروان چڑھ چکے
یٰسین کا وقت آگیا۔ قرآن پڑھ چکے

کس کی بامراد بڑھاؤنگی ہنسلیاں — ہے ہے کرخت ہو گئیں یہ نرم انگلیاں
ہل ہل کے پھراتے ہیں پُتلیاں — لے لے کے اُلٹے سانس گراتے ہیں ہچکیاں
باقی جواب پیاس سے معصوم کے نہیں
منہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

شریف عورتوں کی زبان اور خیالات۔ اور ننھے بچوں کی عادتیں۔

(۱۵) علی اصغرؑ بیہوشی میں اور ماں کے ارمان اور خیالات

ننھے بچوں کی پیاری عادتیں

* دیکھئے۔ یہ بیت ذوقافیتین ہے۔ ایک قافیہ مرتے ہیں کرتے ہیں۔ دوسرا دُنیا عقبےٰ ہے۔ مگر کس سلاست و صحت کی ہے۔ کہ جبتک غور نہ کرو نہیں معلوم ہوتا لشکر والوں کی گفتگو دلوں پر خنجر و نشتر کا کام دیتی ہے۔ اور دُنیا طلبی کی کس بیرایہ میں کی ہے۔ کہ ہم انکا خون کرتے ہیں دنیا کیواسطے۔ ورنہ کلمہ گو ہو کر مشکل محمد مصطفےٰ کو کیوں شہید کرتے۔ اخیر کا مصرع کس غضب کا ہے۔ ع لائی ہے موت کس کا کلیجہ نکال کے۔ یہ باتیں دوسروں کو نصیب نہیں ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

روتا نہ جانتے تھے سدا مسکراتے تھے — پھیلا کے ہات گود میں سب کے یہ آتے تھے
خاطر سے میری جھولے میں یہ لیٹ جاتے تھے — جاتی تھی میں جدھر یہ اُدھر مُنہ پھراتے تھے

کس کی نظر لگی - کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاؤ پیار اب نہ رہا - آنکھ پھر گئی

بہن کی بھائی سے محبت کی باتیں جن سے بچپن کی عادتیں معلوم ہوتی ہیں -

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے — ہاتوں میں لیکے اُن کے کھلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سناتی ہے — من جاؤ - بھائی جان - سکینہ مناتی ہے

کُڑھتی ہیں اماں - آنکھ کبھی تم کھولتے نہیں
اللہ - ہم پکارتے ہیں - بولتے نہیں *

علی اصغرؑ کے جھولے کے ارد گرد تردد میں مبتلا بیبیاں بیٹھی ہوئی ہیں - اُس کی تصویر ہیشل کھینچی ہے -

سر ننگے - گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم — سہلا رہے ہیں بیٹھے ہوئے پاؤں کو حرم
تکئے پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم — چھاتی پہ ہات رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم

قرآن کی ہوا - کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بالو کو دیکھتے ہیں - تو منہ پھیر لیتے ہیں

گھر میں تو یہ تشویش پھیلی ہوئی ہے - اب باہر سے امام حسینؑ تشریف لاتے ہیں مگر کس شان سے وہ مصرع تحت میں بلاحظہ فرمائیے :-

مُنہ پر جوان بیٹے کا تازہ لہو لگائے — ماتم سرا میں گنج شہیداں سے شاہ آئے
جھولے پہ ہات پکڑے ہوئے اہلبیت لائے — بچے کے ہات پاؤں ہلا کر انہیں دکھائے

رو کر کہا کہ سانس فقط آشکار ہے
سو اس کا کیا حساب کہ دم کا شمار ہے

بہن کی بھائی سے محبت

جھولے کے ارد گرد بیبیاں

امام حسینؑ کس شان سے آتے ہیں

* یہ خاص بچوں اور عورتوں کے الفاظ ہیں *

(تصویر)

(امام حسینؑ جھولے کے سرہانے بیٹھے ہیں۔ اور کچھ لب اعجاز نما سے فرماتے ہیں)۔

بیٹھے سرہانے جھولے کے شبیرؑ سر جھکائے ۔۔۔ اصغرؑ کے کان سے لب معجز نما ملائے
چپکے سے کچھ کہا کہ وہ سنتے ہی مسکرائے ۔۔۔ سوئے حسینؑ ہات بھی بیساختہ بڑھائے
بولی بہن ۔ نصیب نے اب تو بھلائی کی
اماں ۔ مبارک آنکھ کھلی میرے بھائی کی (چھوٹے بچوں سے چپکا نہیں جاتا)

[illegible]

امام حسینؑ علی اصغرؑ کو لئے جاتے ہیں۔ اُس کی بے مثل مختصر لفظوں میں تصویر۔

ہاتوں پہ لے چلے جو اُسے شاہِ اتقیا ۔۔۔ بانو پکاری ۔ لونڈی کو ۔ صاحب جلا لیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا ۔۔۔ بولی خدا نے سب کی دعا سے کرم کیا
لب پر تبسم ۔ آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں
ہم ۔ تم کوئی نہیں ۔ انہیں بابا ہی پیارے ہیں

ماں کی مامتہ اور وہم

ماں کی مامتہ پر خیال کیجئے ۔ امام حسینؑ بچہ کو پانی پلانے کی غرض و خیال موہوم سے دشمنوں میں لئے جاتے ہیں ۔ ماں کو وہم آتے ہیں ۔ انکار کر نہیں سکتی ہیں ۔ کہتی ہیں :۔

دیکھوں پھر آج گود میں کب تم کو لیتی ہوں ۔۔۔ اللہ و پنجتن کی ضمانت میں دیتی ہوں

عورتوں کی عادت ہے ۔ کہ جب یہ فقرہ کہتی ہیں ۔ کہ خدا و رسول یا اللہ و پنجتن کی ضمانت میں دیتی ہوں تو اپنے بچوں سے کہتی ہیں ۔ کہ کہو قبول کیا ۔ علی اصغرؑ بات نہیں کر سکتے ۔ اس لئے اس نازک خیال کو دیکھئے ۔ کس طرح (مصنف) ادا کرتے ہیں :۔

کس دھوپ میں سدھارتے ہو اے علیؑ کے پھول ۔۔۔ سر پر خدا کا سایہ ہو ۔ اور پشت پر رسولؐ
اور دہنے بائیں پیارے کے ہوں حیدرؑ و بتولؑ ۔۔۔ واری گئی ۔ اشارے سے کہہ دو کیا قبول
کھیلے نہ ہم سنوں سے نہ تم گھٹنیوں چلے
میں ہات مل کے رہ گئی ۔ دنیا سے یوں* چلے

* دشمنوں میں بچہ جاتا ہے ۔ مگر حیرت ہے کہ ... زبان سے نکل ہی گیا ۔ [illegible] ۱۲ مؤلف حقیر

اصغرؑ کو لے چلے جو شہنشاہ بحر و بر
مُڑ مُڑ کے اُس نے کُنبہ پہ حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہات ماتھے پہ رکھا جُھکا کے سر
بانو پکاریں پھیر کے مُنہ کو اِدھر اُدھر

لوگو۔ مرا کلیجہ نکلتا ہے تھام لو
اصغرؑ سدھارتے ہیں سفر کو سلام لو*

(۱۶) ذیل کے بند میں علی اصغرؑ کی شہادت کی افسوسناک تصویر مصنف نے کھینچی ہے۔ اس سے بہتر تصویر واقعۂ غم اس بے بضاعت کی نظر سے نہیں گذری۔ یہ اصل واقعہ بہت مشہور ہے۔ کہ اس بچہ کو ایک دشمن نے امام حسینؑ کے ہاتھوں پر تیر مارا تھا:۔

تصویرِ غم

دم توڑا عجب شان سے ہاتوں پہ پدر کے
اک ہات پہ گردن ڈھلی اور رہ گئے مر کے
اک ہات پہ سمٹے ہُوئے تھے پاؤں پسر کے
ٹکڑے ہُوئے جاتے تھے شہِ دیں کے جگر کے

اس تیر کی آواز سے ڈر کر جو مُوئے تھے
بابا سے گلے ملنے کو ہاتھ اُٹھے ہُوئے تھے

* یہ مرثیہ "بانو کے شیرخوار کو مہنت سے پیاس ہے" جلد سوم دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ اس میں سے چند بند میں نے اس موقع پر انتخاب کئے ہیں ورنہ تمام مرثیہ بلیغ فصیح و عام فہم ہے۔ حیات دبیر کی دوسری جلد میں اکثر بند اس کے میں نے پیش کئے ہیں۔ یہ مرثیہ محمد علی شاہ مرحوم شاہ سوم اودھ کی زمانہ سلطنت کی تصنیف ہے کہ جس زمانہ تک جناب میر انیس مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں نہ آئے تھے نہ ان کے کلام کی لکھنؤ میں شہرت تھی لیکن مولوی شبلی صاحب کا موازنہ میں لکھنا کہ مرزا صاحب میر صاحب کی تقلید بھی کرتے تھے کس قدر خلاف واقع افسوس کے قابل ہے اس مرثیہ کا وہی رنگ ہے جس رنگ میں میر انیس صاحب نے اکثر مرثیے کہکر شہرت پائی اس کے مقطع سے بھی زمانہ کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ برعکس ہے کوئی کوئی بر خلاف ہے۔ آئینہ دل اپنا ہر اک سے صاف ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس وقت میر ضمیر صاحب سے بگاڑ تھا اور ان کے تمام تلامذہ طرفدار بگڑے ہُوئے تھے یہ زمانہ میر انیس صاحب کے لکھنؤ آنے سے کچھ پہلے کا ہے۔ صفحہ ۲۷۹ پر موازنہ میں مولوی شبلی صاحب نے بھی اس مرثیہ کے چند بند انتخاب کر کے قبول فرمایا ہے کہ حال شہادت علی اصغرؑ کا تمام واقعات کربلا میں نازک عجیب و غریب ہے۔ اور یہ بھی مانا ہے کہ مرزا صاحب نے اس حال کو تمام مرثیہ گویوں و میر انیس صاحب سے بہتر نظم کیا ہے مگر ایسے دل سے کما لات مرزا صاحب کے منکر ہیں وہ رسائی کی کوشش فرماتے ہیں اس کو ایک اتفاقیہ بات داخل مستثنیات کرتے ہیں۔ یہ خیال نہیں فرماتے کہ جو شاعر ایسے نازک عجیب و غریب حال کو سب سے بہتر نظم کر دیگا وہ غریب حالات کو اوروں سے بہتر کیوں نہیں کر سکتا ہے ۱۲ مؤلف۔

در صفت طفلی علی اصغرؑ

علی اصغرؑ کی شہادت کی تصویر ایک بند میں

(۱۷) حضرت عباسؑ علمدار نے ایک پہلوان کی لڑائی نظم کی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

(۱۷) حضرت عباسؑ کے تلوار کے وار

ٹکّے کی سپر کے مقابل ہوا دشمن ‌ ‌ ‌ بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن

یہ سینہ یہ بازو یہ کمر اور یہ گردن ‌ ‌ ‌ یہ خود یہ چار آئینہ یہ ڈھال یہ جوشن

کس وار کو وہ روکتا تلوار کہاں تھی

آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی[1]

(۱۸) عونؑ و محمدؑ امام حسینؑ کے بہادر بھانجوں کی بہادرانہ موت کی تصویر۔

عون و محمد کی بہادرانہ موت

یہ تن کے مطمئن ہوئے وہ غازی و غنی ‌ ‌ ‌ منہ کا ڈھلا نہ اشک بہا وقت جاں کنی

لوکاں کی مڑی نہ پھری منہ پہ مردنی ‌ ‌ ‌ پتھرا نا کیسا آنکھ میں دونی تھی روشنی

مرتے ہوئے غضب کی دلبری دکھاتے تھے

رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مسکراتے تھے

عام لوگوں کی موت کی طرح بہادروں کی موت کبھی نہیں ہوتی۔ بلکہ شجاع کی شجاعت اُس وقت بھی نظر آتی ہے۔ اس بند میں چھ چیزیں ایسی بیان کی ہیں جن میں شجاعت کی شان نظر آتی ہے۔ یہی وہ کمالات ہیں۔ جن کو عام لوگ دیکھتے ہیں۔ مگر بیان نہیں کر سکتے۔ قدرتی شاعر ہی بیان کر سکتا ہے +

(۱۹) جناب قاسمؑ ابن حسنؑ کے تلوار لگانے کی تصویر۔

(۱۹) جناب قاسم کے تلوار لگانے کی شان

---

[1] یہ بند اس مشہور مرثیہ میں ہے ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے :: دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔ نولکشور صاحب کی مطبوعہ جلد میں بھی چھپا ہے مگر وہ بہت غلط اور بہت سے بند کسی اور شاعر کے کہے ہوئے اُس میں ملا دئے ہیں۔ آٹھ ہفتہ تار ایک کس صفائی سے نظم کئے ہیں کہ جس صفائی سے تلوار چلتی ہے جو لوگ نبوٹ جانتے ہیں اُن کے دل سے پوچھئے۔ وہ داد دے سکتے ہیں۔ پھر ٹیپ میں تلوار کی صفائی کس بلاغت سے بیان فرمائی ہے۔ کہ ع آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی ۱۲ مولف حقیر۔

[2] یہ بند اس مرثیہ مشہور سے ہے جو دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے اور جس کا مطلع مشہور یہ ہے ع پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی۔ ۱۲ مولف

گروار کر کے بیٹھ گیا کوئی نابکار — قاسم نے واں کیا ہنرِ جنگ آشکار
گھٹنوں کے بَل زمیں پہ بٹھلا کے راہوار — اور تول کر حسام شرر ریز و آبدار

ضربت لگائی آپ نے یوں اُس لعین پر
اک پاؤں تھا رکاب میں اور ایک زین پر

(۲۰) امام حسینؑ نے سب راہ نے پیا — علمدار بھائی عباسؑ کو جس شان سے پایا۔ اُس کی تصویر

ناگاہ ملا لاشۂ ابنِ شہِ مرداں — اک دست بریدہ میں علم خاک پہ غلطاں
اُڑ اُڑ کے پھرے ہے رُخ پر خوں پہ مگس راں — اک ہاتھ کے نیچے میں حسام شرر افشاں

ہر چار طرف زخموں سے فوارے بہے ہیں
گویا کہ مصلّے پہ علیؑ لوٹ رہے ہیں[1]

سر گرز سے دو ٹکڑے جبیں خوں سے بھری ہے — منہ مشک پہ ہے مشک کلیجے پہ دھری ہے
ہر سمت سے جز یادِ خدا بے خبری ہے — دم سینے میں رُکتا ہے پریشاں نظری ہے

لو حق سے لگی ہے جو عدم کے سفری کی
آنکھوں پہ اُداسی ہے چراغِ سحری کی

(۲۱) عمر ابن سعد نے شمر کو دو علم اور کشتیوں میں میوے اور سرد پانی دے کر بھیجا ہے۔ کہ عونؑ و محمدؑ پسران جناب زینبؑ کو بہکا کر اور یہ لالچ دے کر کہ تم کو امام حسینؑ نے تو علم نہ دیا ہم علمدار کرتے ہیں لے آئے۔

آگے گمان بد ہُوا پیچھے یہ بد گماں — تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیاں
رعشہ کی ہر قدم تھی ندا جھک یہاں وہاں — آیا وہاں کھڑے تھے یہ دو لو خضرِ جہاں[2]

[1] یہ بند اس مرثیہ کے ہیں جو دفترِ ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ع اے صبح دفا کون ترا شمس ضحےٰ ہے ۱۲ مؤلف

[2] اس موقع پر خضر کہا۔ قمر نہیں کہا۔ اس لئے کہ شمر بہکا نے کو آیا ہے وہ گویا رہزن ہے اور یہ خضر ہیں انکا کام بھٹکے ہوئے کو راہ پر لانا ہے نہ کہ خود بہک جانا پس یہاں گویا تشبیہ انکو خضر سے دی ہے کہ خضر راہ راست بتلاتے ہیں نہ رہزنوں کو نیک دیتے ہیں۔ یہ تشبیہ بلاغت کی جان ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(حاشیہ:) حضرت عباسؑ کی تصویر — امام حسینؑ نے ان کی لاش کو کس حالت میں پایا
شمر کا عون و محمد کو بہکانا

دونوں کی آنکھ شمر پہ جو یک بیک پڑی
نخوت۔پسینہ بن کے۔جبیں سے ٹپک پڑی

شمر کی مکاری کی تصویر اور چاپلوسی کی چالیں۔

شمر کی مکاری و خوشامد

خم ہو کے نیم قد یہ کیا شمر نے کلام | اے وارثانِ حیدرؑ و جعفرؑ مرا سلام*
یہ آن بان۔مان گئے رستمانِ شام | واللہ واہ تم پہ ہے جرأت کا اختتام

یہ بانکپن نظر میں کھبا۔جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

جب عونؑ و محمدؑ نے شمر کی باتیں سنیں۔اور اس کو جواب شافی دے دیا۔تو اب وہ ناکام جاتا ہے۔ادھر خیمۂ عصمت میں اس واقعہ کی خبر ہوگئی۔ان کی والدہ جناب زینبؑ نے بھی سنا۔کہ شمر سے جو امام حسینؑ کا جانی دشمن ہے بات چیت ہوئی۔وہ غصّہ میں بھری ہوئی بیٹھی ہیں۔فضہ کنیز جناب فاطمہؑ نے ان بچوں کو آواز دے کر خیمہ میں بلایا ہے اس موقع پر کہتے ہیں*:-

تصویر

شیروں سے ڈر کے بھاگ گیا شمر بد خصال | جس طرح چوٹ کھا کے بھرے چوکڑی غزال
راہی حرم سرا کو ہوئے یہ ملک خصال | کچھ غصہ کچھ حجاب کچھ افسوس کچھ ملال

چلنے میں شرم سو قدم آگے بڑھی ہوئی
منہ اترا اترا غصہ سے تیوری چڑھی ہوئی

(۲۲) میدان میں جناب عباسؑ آتے ہیں نقیب نور آواز دے رہا ہے

(۲۲) میدانِ جنگ میں حضرت عباسؑ آتے ہیں۔نقیب نور آواز دے رہا ہے۔

* شمر نے جس جس طرح لالچ دئے ہیں۔اور ان بچوں کو بہکایا ہے اور انہوں نے دندان شکن جواب دئے ہیں۔وہ تمام تقریر لاجواب ہے۔اگر دیکھنا منظور ہے۔تو اس کتاب کی جلد دوم میں دیکھئے۔یہ بھی اسی مرثیہ کے بند ہیں۔جو جلد اول فقر ماتم میں چھپا ہے۔اور جس کا مطلع شہ و یہ ہے ع پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی۔وارثان حیدرؑ و جعفرؑ اس لئے کہا کہ حیدر کرار ان صاحبزادوں کے نانا اور جعفر طیار دادا ہیں۔یہ دونوں بزرگوار جناب رسول خداؐ کے علمدار تھے ۱۲ مؤلف حقیر

سر کیسہ جو بڑھا فخر شجاعان زمن کا
ڈنکا ہوا ماتھا ستم و ظلم کا ٹھنکا

چاوش قمر دوڑا عصا لیکے کرن کا
میدانی خورشید نے میدان لیا رن کا

کڑکا یہ دیا داد رہے شان و کرامت
اقبال بلند۔ اوج دوچند۔ آپ سلامت*

(۲۳) زعفر جن سے چند جن جو حال امام حسینؑ دیکھ آئے ہیں بیان کر رہے ہیں:۔

جس وقت زیارت سے مشرف ہوئے ہم ہائے
ننھی سی لحد کھودتے تھے شاہ امم ہائے

اک رشک قمر توڑتا تھا گود میں دم ہائے
ڈوبا ہوا اور لہو ڈالتا تھا ہائے ستم ہائے

اب شہ سے کلیجے کو سنبھالا نہیں جاتا
تیر اُس کے گلے میں ہے نکالا نہیں جاتا

(۲۴) میدان کربلا میں لاش امام حسینؑ کس شان سے زمین پر پڑا ہوا ہے اس کی تصویر

اصغر کی ننھی لاش کو مولا گلے لگائے
آلودہ گرد خاک میں اور خوں میں نہائے

سوتے تھے قتل گاہ میں بے فرش و سایہ ہائے
اور گرد و پیش خویش و اقارب تھے سر کٹائے

تھا فرش ریگ گرم امام قتیل کا
دامن نہ فاطمہؑ کا نہ پر جبرئیل کا

علی اصغرؑ کی لاش کی تصویر۔

سر کے جھنڈولے بالوں پہ گو خاک ہے جمی
پر خوبصورتی میں سر مو نہیں کمی

ہے مثل زلف پلکوں کے بالوں کو برہمی
بہنے ہیں دونوں پتلیاں پوشاک ماتمی

زعفر جن کا حال خیمہ میں امام حسینؑ بیان کر رہے ہیں

(۲۴) لاش امام حسینؑ اور میدان

* چاوش اور میدانی پنجابی الفاظ ہیں میدانی وہ نقیب ہوتا ہے جو میدان جنگ میں کڑکا سناتا ہے اسی کو کڑکیت بھی کہتے ہیں مرزا صاحب کے بزرگ شاہان دہلی کے تابع میر منشی رہے تھے خود انہوں نے لکھنؤ کے شاہی جنگ خوب دیکھے تھے اس لئے ایسا ماحول نہایت شاندار الفاظ میں بیان کرتے ہیں یہ بیت میں وہی الفاظ لائے ہیں جو کڑکیت میدان جنگ میں بادشاہوں کے روبرو کہتے ہیں ذرا مصرع دوم میں تو غور فرمائیے۔ ڈنکا ہونیکو تابت کیا خوب کہا ہے فرماتے ہیں ستم کا ماتھا ٹھنکا کا ڈنکا ہو گیا۔ ماتھا ٹھنکنا خاص محاورہ ہے جو بد شگونی کا یقین ہے پس ظلم کے حق میں یہ ایک میدان جنگ بد شگونی تھی کہ ستم و ظلم اب مٹیگا

پیدا ہے نور چہرے کا گرد و غبار سے
لکھا ہے سورہ نور کا خطِ غبار سے*

(۲۵) جنابِ شہربانو کی تشویش و بے خودی کا سماں۔

جنابِ شہربانو کی تشویش وغم کا سماں

اندوہ میں کچھ زیرِ لب آہستہ سے کہنا
گہ دینا جواب آپ ہی گہ سکتے میں رہنا
وہ یاس کا رونا وہ غمِ ہجر کا سہنا
واں سانس کا رُکنا اور اِدھر اشکوں کا بہنا
پُوچھا جو کسی لونڈی نے طیار ہے کھانا
تو رو کے یہ کہنا۔ مجھے دشوار ہے کھانا

(۲۶) فرزند کا داغ

(۲۶) فرزند کا داغ

وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا
وہ رنج ہے کیا رنج کہ پایاں نہیں رکھتا
کس زخم کا مرہم دلِ انساں نہیں رکھتا
کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا
بے صبر جس اندوہ میں ہر ایک بشر ہے
وہ داغِ پسر داغِ پسر داغِ پسر ہے

جس درد کی تسکین میں عاجز ہیں خردمند
وہ درد ہے کیا؟ رحلتِ فرزندِ جگربند
جب دست و گریباں ہو پدر سے غمِ فرزند
وہ چاک یہی چاک ہے جس کا نہیں پیوند
سچ پوچھو تو فرزند کلیجہ ہے پدر کا
ناسور جگر میں نہ ہو اس لختِ جگر کا

یہ حالِ سکندر ہے تواریخ میں لکھا
فرزند نہ تھا اور ہر اک شے تھی مہیا
جاہ و حشم و مال و زر و شاہیِ دُنیا
کہتا تھا دمِ نزع کہ وا حسرت و دردا

* خطِ غبار خط کی ایک قسم ہے۔ جس میں حروف بہت چھوٹے چھوٹے (مہین مہین) لکھے جاتے ہیں۔ جو غبار سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور سورۂ نور قرآن میں ایک سورت ہے۔ اُوپر کے چاروں مصرعوں کو غور سے دیکھئے۔ نہ مقید ہیں۔ مگر بندش میں کس قدر صفائی اور روانی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اقبال ہے۔ دولت ہے۔ جہاں رنگیں ہے
پر ایک پسر جو نہیں۔ تو کچھ بھی نہیں ہے

فرزند گلِ باغ تمنّائے پدر ہے ۔ بے قدر ہے وہ شاخ جو بے برگ و ثمر ہے
تعویذِ تسلّیِ دلِ خلق پسر ہے ۔ داغ اس کا شگافِ جگر و زخمِ جگر ہے

کیوں دل میں پدر کے نہ ہو۔ ناسور خلف کا
جب چاک گہر کے لئے سینہ ہو صدف کا[1]

(۲۷) امام حسینؑ پیدا ہوئے ہیں۔ جناب فاطمہؑ مریض ہیں۔ اُن کا دودھ خشک ہو گیا ہے۔ تشویش (خاندان رسالت میں) پھیلی ہوئی ہے :-

(امام حسینؑ کا پیدا ہونا رسول خدا کا زبان چُسانا)

رسولؐ کہتے ہیں حاجت ہے انکو شیر کی کیا ۔ مری زبان میں ہے انکا قُوت اے زہراؑ
ندے جواب زباں بھی۔ انہیں رسولؐ خدا ۔ یہ ہیں وہ صابر و شاکر۔ کہ ہو نہ کچھ پروا

غذا سے صبر و قناعت کے درجے پائے ہیں
یہ پیاسے۔ رہنے کا اقرار کر کے آئے ہیں

تصویرِ واقعہ

(تصویر)

یہ کہکے پیار سے پھیلائے دست لطف و عطا ۔ رُخِ حسینؑ سے سرکایا دامنِ زہراؑ
تلے شلوکے کے ہات اپنے لائے خیر وریٰ ۔ کہا جَعِلْتُ فِدَاكَ اے ذبیحِ تیغِ جفا[2]

---

[1] کیا وجہ ثبوت معقول ہے۔ موتی بمنزلہ پسر ہے۔ اور صدف یعنی سیپ کا سینہ چاک ہوتا ہے۔ جب وہ جدا ہوتا ہے یہی حال اشرف مخلوقات انسان کا ہے۔ کہ پسر کی جدائی سے سینہ چاک ہو جاتا ہے۔ سیپ جس طرح موتی کے نکل جانے کے بعد کم قیمت رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان پسر کے مرنے سے گویا کم وقعت ہو جاتا ہے ۔۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] جُعِلْتُ فِدَاكَ کے معنی ہیں میں تجھ پر قربان ہو جاؤں۔ عرب یہ کلمہ ایسے ہی محبّت اور پیار کے مقام پر اپنے بچوں سے کہتے ہیں۔ اور جوش ولا میں اپنے بزرگ یا آقا سے بھی کہتے ہیں۔ کیا موقع پر تضمین کیا ہے۔ ایک ایک لفظ سے جناب محبوب خدا صلعم کی محبّت ٹپکتی ہے عجب اثر ہے۔ اور ذبیحِ تیغِ جفا اور کربلا کے پیاسے۔ ان الفاظ میں عجب گریہ خیز کنایہ ہے ۔۔ ۱۲ مؤلف حقیر

خدا کے لاڈلے آ - نانا کے نواسے آ
میں تجھ کو شیر دُوں آ - کربلا کے پیاسے آ

(تصویر واقعہ)

تصویر

نبیؐ کی گود میں آتے ہی مُنہ کو کھول دیا — نبیؐ نے مُنہ میں زباں دیکے مُنہ کو چوم لیا
حسینؑ نے تو زبان نبیؐ سے شیر پیا — دہن سے اُس کے پیمبرؐ نے قند نوش کیا

نبیؐ کا آب زباں آہ - جس کے قابل ہو
لب فرات سے پانی نہ - اُس کو حاصل ہو*

امام حسینؑ گھوڑے سے زمین پر آتے ہیں

(۲۸) امام حسینؑ میدان کربلا میں گھوڑے سے زمین گرم کربلا پر تشریف لاتے ہیں - اُس موقع پر مصنف کہتے ہیں :-

تالو سے زباں لگ گئی تھی خشک دہن میں — پھل برچھیوں کے سینے میں تھے تیر بدن میں
زخموں کو نہ پوچھو وہ ہزاروں سے سوا تھے — فرماتی ہیں زینبؑ کہ ستاروں سے سوا تھے

تصویر

امام حسینؑ کی اخیر وقت کی تصویر

مُنہ لال جبیں لال - بدن لال قبا لال — لہراتے تھے بل کھائے ہوئے گیسوؤں کے بال
زلفوں کی لٹیں چہرے پہ تھیں سہرے کی تمثال — مرتے ہوئے دُولھا بنے تھے فاطمہؑ کے لال

آلودہ بخوں ریش امام دوسرا تھی
اس شان سے طیاری دربار خدا تھی

لب پہ علی اکبر - علی اکبر - علی اکبر — سیدھی جو کمر کی - تو کہا ہائے برادر

---

* یہ حدیث کتب احادیث شیعہ کافی وغیرہ میں ہے - جو کچھ اس غرض سے نظم میں اس کا مطلب ادا کیا ہے بعض علماء نے اسلام نے فرمایا ہے کہ لحمک لحمی دمک دمی جو آپ نے امام حسینؑ کو فرمایا ہے حقیقی معنی پر ہے - کہ خون و گوشت امام حسینؑ کا رسول خدا کے خون و گوشت سے اس طرز خاص پر بنا تھا - اور وہ تھی جو خون زمین کربلا پر بہایا گیا وہ حبیب خدا صلعم کا خون تھا - اب اس خون و گوشت کے ساتھ جو سلوک ان محسن کشوں نے کیا وہ عدد ۲۸ میں دیکھئے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر -

(۲۹) بیکسی و تنہائی میں امام حسینؑ کے حواس کا درست رہنا۔

نازاں تھا صبر۔ صبر شہ حق شناس پر | قربان تھا ہوش ابن علیؓ کے حواس پر
دریا کا زہرہ آب تھا سیّد کی پیاس پر | مایوسی آس پاس تھی مرنے کی آس پر

ماں رن میں اور خیمے میں ماں جائی روتی تھی
تنہائی پر حسینؑ کی تنہائی روتی تھی

(۳۰) شاہزادہ علی اکبرؓ کی شہادت کے بعد گھر کی حالت اور مادر علی اکبرؓ کی غم کی تصویر

وہ شمع گل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا | نبیؐ کی آل کا گھر صبح و شام روشن تھا
دل حسین علیہ السّلام روشن تھا | مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا

نصیب بانو کے دل کو جگر کا داغ ہوا
پکارتی تھی کہ ٹھنڈا مرا چراغ ہوا

(بین)

یہ میری آنکھوں کے آگے ہے کیا سیاہ سیاہ | یہ کیا جگر میں کھٹکتا ہے جس سے دل ہے تباہ
کدھر گئے علی اکبرؓ۔ انہیں علیؑ کی پناہ | حسینؓ امام کہاں ہیں پکار لو للّٰہ

تڑپ کے منہ سے نکلتا ہے اب جگر میرا
چھٹتا ہے پہلے پہل نوجواں پسر میرا

(۳۱) ایمان کے جوش میں جو کیفیت ایماندار کے دل کی ہوتی ہے۔ اُس کی تصویر مرزا صاحب نے ایک مومنہ کا حال لکھ کر سلیس نظم میں کھینچی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُحد کی لڑائی میں لشکر اسلام نے فرار کیا۔ اور مدینہ میں یہ خبر مشہور ہوئی۔ کہ حضور صلعم شہید ہو گئے۔ اُس وقت مدینہ منوّرہ میں ایک تلاطم تھا۔ اور خانہ رسالت کی حالت حسب ذیل تھی:۔

پر فاطمہؓ نے جب یہ خبر قہر کی پائی | سر پیٹتی بے ساختہ باہر نکل آئی
جو ڈیوڑھی چھپتا تھا کیا ہے۔ تو کہتی تھی۔ دہائی | اعدا نے مرے باپ کی تصویر مٹائی

(۲۹) بیکسی میں ویسی ہی حواس بجا رہنا

علی اکبرؓ کے بعد گھر کی پریشانی

(بین)

(۳۱) احد میں خبر قتل حضور صلعم کی مدینہ میں ہونا

ویران مدینہ کو اجل کر گئی۔ ہے ہے
بابا کی بلا لیکے نہ میں مر گئی۔ ہے ہے

فاطمہ زہراؑ کی بے قراری کی تصویر۔ اور ایک **مومنہ** کا وقت پر کام آنا:۔

(بے قراری جناب فاطمہؑ اور ایک مومنہ کا کام آنا)

یہ کہتی تھی اور دوڑتی تھی جانب جنگاہ　　بسمل کی طرح گرتی تھی اور اُٹھتی تھی وہ آہ
اک مومنہ نے عرض یہ کی آکے سرِ راہ　　زہراؑ میں تری قاصدی اب کرتی ہوں واللہ
فرمایا کہ۔ احسان کر۔ اللہ جزا دے
اچھا۔ میں ترے صدقے۔ خبر باپ کی لادے*

(پیغام جناب بنت فاطمہ)

گر زندہ ملیں فضل خدا سے شہِ ابرار　　بابا سے حقیقت مری سب کیجیو اظہار
آنکھوں کو جو پوچھیں تو بتانا کہ ہیں خوں بار　　دریافت کریں دل کو۔ تو کہنا کہ ہے افگار
ہاتوں کو جو پوچھیں تو بتانا یہ قرینہ
اک ہات سے سر پیٹتی ہے ایک سے سینہ

گر پوچھیں وہ۔ کیا حجرے میں بیہوش پڑی ہے　　کہہ دیجیو رستے میں سراسیمہ کھڑی ہے
فرمائیں جو بابا کہ وہ صابر تو بڑی ہے　　کہنا یہ نہیں صبر و تحمل کی گھڑی ہے
جنگاہ میں خود آنے کو طیار ہے زہراؑ
پر کانپنے سے پاؤں کے ناچار ہے زہراؑ

(حسن عقیدت)

اُس زمانہ کے سچے مسلمانوں کے جوش محبت اور جذبۂ ایمان کی دلکش تصویر۔ یہ مومنہ کس ذوق حسن عقیدت سے جاتی ہے:۔

یہ سُن کے پیادہ وہ چلی ڈھانپا نہ سر بھی　　مقتل میں جو پہنچی نہ رہی اپنی خبر بھی
بسمل ملا بیٹا بھی برادر بھی پسر بھی　　پر واہ رے صبر۔ اُس نے نہ کی اُن پہ نظر بھی
بھائی نے کہا۔ گود میں سر رکھ لے ہمارا

---

*۔ اضطراب میں جیسے چھوٹے چھوٹے جملے شریف زادیاں بولتی ہیں ویسے ہی نظم کئے ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

فرزند و پدر نے کیا پانی کا اشارا*

منہ پھیر کے وہ بولی۔ نہ ٹھیروں گی میں حاشا
میں سُوئے محمدؐ ہوں فرستادۂ زہراؑ

اس وقت بھلا گود میں سر لُونگی میں کس کا
ہے خاک پہ وہ تاج سرِ مریمؑ و حواؑ

اب تو کسی پیاسے کی نہیں مجھ کو خبر ہے
سیدانی مری۔ تشنۂ دیدار پدر ہے

اب چاہئے کیا۔ دولت عقبےٰ ہو مبارک
جنّت ہو مبارک تمہیں طوبےٰ ہو مبارک

ہمسائگی حمزہؑ کا تمہیں ہو مبارک
مجھ کو شرفِ خدمت زہراؑ ہو مبارک

ہر ایک ہے یاں فکر سعادت طلبی میں
میں فاطمہؑ کی راہ میں تم راہ نبیؐ میں

القصّہ نہ ٹھہری کسی کُشتے پہ وہ زنہار
آگے جو بڑھی وہ تو ملے احمدؐ مختار

استادہ تھے زیرِ علم حیدرؑ کرار
دیکھا جو ہراساں اسے بولے شہ ابرار

ہے خیر تو کیوں آئی ہے۔ کھولے ہُوئے سر کو
کیا بھیجا ہے زہراؑ نے۔ تجھے میری خبر کو

وہ رو کے یہ چلائی کہ ہاں اے شہ والا
بی بی مری رونے میں گھڑی کرتی ہیں نالا

فرمایا جبھی یاں مرا دل تھا تہ و بالا
جا فاطمہؑ کو جلد مرے پاس بُلا لا

کتنا تو ہے بیتاب ہمارے لئے زہراؑ
بابا بھی تڑپتا ہے تمہارے لئے زہراؑ

(اس جہاد میں حضور صلعم زخمی ہُوئے تھے۔ دندان مبارک بھی ٹوٹ گیا تھا۔ فرماتے ہیں):۔

*حقیقت میں ایماندار وہی ہے۔ جس کو سب عزیزوں سے اور اپنی جان سے بھی بڑھ کر حضور صلعم کی محبت ہے۔ جیسا کہ خود حدیث صحیح میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

لیکن مرے زخموں کا سُنانا نہ اُسے حال — فریاد کو فوراً نہ کہیں کھول دے وہ بال
ہوگا چمن ہستی اُمت ابھی پامال — اُلٹے ہی قدم واں سے پھری یاں وہ خوش اعمال
زہراؑ سے کہا حال شہنشاہِ عرب کا
اک مژدہ دیا خیر کا ۔ اور ایک طلب کا

(باپ بیٹی کی محبت)

ساتھ اُس کے چلیں فاطمہؑ خوش خوش سرِ میداں — لینے کو بڑھے واں سے نبیؐ خرّم و خنداں
آغوش کے اندر لیا مثلِ بدنِ جاں — یہ بولے میں صدقے ترے وہ بولی میں قرباں
زہراؑ نے بلائیں لیں ۔ پیمبرؐ نے دعا دی
دونوں نے جبیں شکر کے سجدے میں جھکا دی[1]

(باپ بیٹی کی محبت)

(۳۲) باغ کا سماں جو ایک شخص خواب میں دیکھ رہا ہے۔

(باغ کا سماں خواب میں)

شبنم کا عجب لطف ہے ہر برگ چمن پر — سجّادے پہ ہے ٹوٹ گیا سبحہ گوہر
ہر شاخ ہے معراج بہارِ گُلِ احمر — جس طرح سناں پر سرِ فاطمہؑ کا سر[2]
ہر غنچہ ہے دفتر غم شاہ دوسرا کا
ہر لالہ ہے محضر گل زخم شہدا کا

رشک ورق نقرہ ہے اُس باغ کی دیوار — ہے اُس کی سپیدی و تجلّی سے نمودار
خورشید نے مُہرہ کیا ہے صبح نے آہار — ہر خشت کے قالب میں نگہ ہوتی ہے تیار

(دیوار باغ کی صفائی)

[1] جس طرح کسی بات کے کہنے سے پہلے کوئی مقرر تمہید اُٹھاتا ہے یا شاعر قصیدے میں تشبیب کی بہار دکھا کر اصل مطلب پر آتا ہے ۔ اسی طرح مرزا صاحب مرحوم بعض مرثیوں میں اوّل اوّل (چہرے میں) ایسی روایات لکھ کر اصل مرثیہ شروع فرماتے ہیں۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہرا کا باپ سے ملن لکھکر اس مرثیہ میں آئندہ یہ حال کہا ہے ۔ کہ اُن کی ہمنام و ہمشکل پوتی فاطمہ صغرا اپنے باپ امام حسینؑ کی انتظار و اشتیاق ہی میں رہیں ۔ ورجا ۔ امام حسینؑ کے اُن کی سنائی اور رسیدائیاں مدینہ میں آئیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہاں بھی ایک کنایہ مرثیت کا کہ گئے ۔ یہی کمال مرثیہ گوئی ہے ۱۲ مؤلف حقیر

باغِ اِرم اُس باغ کے اک خار کی قیمت
اقبالِ ہُما سایۂ دیوار کی قیمت

باغ میں فوّارہ کی حسن تعلیل

فوّارہ

فوّارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا ۔ پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اُٹھا تھا
فوّارہ نہ تھا خضر کی پیری کا عصا تھا ۔ رفعت سے ستونِ فلکِ پیر بنا تھا
ازبسکہ حبابُ اُس کی تجلّی میں بھرے تھے
بلّور کے پیمانۂ معکوس دھرے تھے

(۲) دعبل خزاعی کی بیت کا انجام بخیر

(۳۴) دُوسری صدی میں دعبل خُزاعی ایک مشہور مرثیہ گو شاعر عرب میں گذرا ہے۔ جس کو امام رضاؑ کی مدّاحی اور اُن جناب کے حضور میں مرثیۂ امام حسینؑ پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہُوا ہے۔ اپنے زمانہ میں عرب میں یہ شاعر فرد مانا جاتا تھا۔ اس کا واقعہ مرزا صاحب نے ایک مرثیہ میں نظم کیا ہے۔ مگر دیکھئے۔ کتنا دلچسپ و مختصر ہے:-

حسن سیاہی کی تاویل

مشہور ہے مے خوار رہا دِعبلِ دیندار ۔ پر مومنوں کو پاک اُٹھاتا ہے بہ جو غفّار
مُنہ اُس کا دمِ نزع سیہ ہو گیا اک بار ۔ روشن کروں اُس تیرگیٔ رُخ کا میں اسرار
مرنے پہ زیادہ اُسے توقیر ملی تھی
وہ رُخ کی سیاہی پئے تحریر ملی تھی*
مانندِ گنہ بیٹے نے موت اُس کی چھپائی ۔ جب شب نے کیا پردہ تو قبر اُس کی بنائی
مرقد میں علیؑ آئے پئے عقدہ کشائی ۔ فانوس نمط قبر اُسے روشن نظر آئی

---

* شاعر کے واسطے جو لازمی طور پر کاتب بھی ہوتا ہے۔ سیاہی کی توجیہ کتنی معقول ہے۔ پھر اُس کے بعد (بتشبیہ) ع مانندِ گنہ بیٹے نے موت اُس کی چھپائی۔ ایسے شخص کے بیان میں کہ جو ایک گناہ کبیرہ (شراب خواری) کا عادی تھا۔ کیسی معقول تمثال ہے کہ ہر شخص گناہ چھپایا کرتا ہے۔ اس نے گنہگار کی موت دوستوں سے چھپائی ۱۲ مؤلف حقیر

مرقد میں یہ کہتے ہوئے خیر الامم[1] آئے
مشتاقِ سخن کے ترے جنت سے ہم آئے

طوبیٰ لک[2] اے خاص شہ کرب و بلائی
لے مرثیہ پڑھ تو مرے مظلوم کا بھائی
دعبل نے پڑھا مرثیہ رقت انہیں آئی
چہرہ پہ کفِ دستِ پیمبرؐ نے پھرائی

کافور وہ ظلمت ہوئی رخسار سے ہٹ کر
سجدے کا نشاں بن گئی ماتھے پہ سمٹ کر[3]

پھر حلّہ نور اپنا پیمبرؐ نے اُتارا
یہ کہکے اُسے قامتِ دعبل میں سنوارا
نکلا جو ترے مرثیہ پر اشک ہمارا
اب دفترِ عصیاں ترا دھویا گیا سارا

لے خاص تبرک ہے یہ احمدؐ کے بدن کا
تو مرثیہ گو ہے مرے محتاجِ کفن کا

(۴۳) ہندہ یزید کی زوجہ زندانِ شام میں آئی ہے۔ امام زین العابدینؑ سے بات چیت کر رہی ہے۔ اب اس کمال کو دیکھیے کہ چار مصرعوں میں ہر مصرع میں ہندہ کا سوال بھی ہے اور حضرت کا جواب بھی ہے۔ یہ اختصار بلاغت کی جان ہے۔ خیر الکلام ماقلّ ودلّ مشہور مقولہ ہے:۔

مندرجے سوال و جواب ایک ہی مصرع میں سوال بھی جواب بھی

[1] فانوس لفظ کی جگہ فانوس صفت بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس زمانے کے فصحا کی زبانوں پر لفظ زیادہ تر چڑھ رہا تھا۔ لہذا مصنف مرحوم نے یہی لفظ لکھی۔ ناسخ و آتش و ذوق وغیرہم کے یہاں یہ لفظ (نمطا) بہت ہے۔ آج کم بولا جاتا ہے۔ تو ستر اسّی برس پہلے کے کلام پر کوئی اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ خیر الامم جناب رسول خدا صلعم سے مراد ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] طوبیٰ لک۔ یہ خاص فقرہ ہے جو عرب میں بولا جاتا ہے۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ طوبیٰ درخت بہشت نصیب ہو۔ اور تہنیت کے موقع پر عرب بولتے ہیں جیسے اردو میں کہتے ہیں مبارک باد یا مبارک ہو۔ حضور صلعم کی زبانی اس موقع پر اس لفظ کی تضمین نے کیا لطف کلام میں پیدا کیا ہے

[3] کافور ہونا اردو کا روزمرہ ہے۔ دور ہو جانا، اڑ جانا اس کے معنی ہیں۔ کافور سفید ہوتا ہے ظلمت سیاہی کو کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضد ہے صنعت تضاد ہوئی۔ پھر کہتے ہیں سجدے کا نشان بن گئی ماتھے پہ سمٹ کر کیا عمدہ مضمون بنایا ہے۔ ایسے مضامین عالیہ میں دوسرے معاصرین دبیرؔ سے پیچھے اور نیچے رہ جاتے ہیں۔ یہ بند اس مرثیہ کے ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔ ع ناجی بجملہ فرقہ اثنا عشری ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہند نے پُوچھا۔ مرض کیا ہے؟ کہا بے پدری ۔۔۔ رو کے وہ بولی۔ دوا کیا ہے؟ کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا۔ کہنے لگے۔ دربدری ۔۔۔ بولی لیتا ہے خبر کون؟ کہا۔ بے خبری
آہ۔ کرنے کا سبب پُوچھا۔ تو شرمانے لگے
تازیوں کے نشان پُشت پہ دکھلانے لگے[1]

(۳۵) یزید بعد شہادت امام حسینؑ اپنے عروج اقبال پر فخر و مباہات کر رہا ہے جیسے بعض ظالموں کی عادت ہوتی ہے۔ دیکھیے اُس کے خیالات وارندانہ کو کس کس لطیف و عبرت خیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اور زبان کتنی پیاری ہے:-

یزید کا جاہلانہ و ظالمانہ فخر

جلّاد کھائینگے مری تلوار کی قسم ۔۔۔ اک بار پنجتنؑ کے گلوں کو کیا قلم
اب چرخ ہفتمین پہ علم ہے مرا علم ۔۔۔ اُنسٹھ[2] برس کے بعد گرا دین کا علم
نوبت اب آئی دین نبیؐ کے مٹانے کی
ہے عرش پر صدا مرے نقارخانے کی
نمرود سے کچھ آنچ نہ پہنچی[3] خلیل کو ۔۔۔ مَیں نے جلایا قلب رسولِؐ جلیل کو

---

[1] ہند کے حال میں مرزا صاحب کے کثرت سے مرثیے ہیں اور زبان نہایت سلیس ہے جنمیں اکثر جگہ محلات شاہی کی روزمرہ اشال چُن کی نقل ملتی ہیں مرزا صاحب کے زمانہ میں شاہی محلات میں انکے کلام سے زبان کی سند لیجاتی تھی اور تمام ملک میں محلّات شاہی کی زبان مستند مانی جاتی تھی اس سے مرزا صاحب کی زبان کی وقعت معلوم ہوتی ہے۔ اسی بند میں ذرا غور فرمائیے۔ ایک مصرع میں فرمایا "ہند نے پُوچھا" دوسرے میں کہا "رو کے وہ بولی" تیسرے میں "گھر جو دریافت کیا" چوتھے میں "بولی" لائے۔ اگر ہر مصرع میں ایک ہی لفظ پوچھا یا دریافت کیا یا اور کچھ لاتے۔ تو بلاغت کی شان قائم رہتی۔ ایسے ایسے نکات بلاغت کلام دبیر میں ہزاروں لاکھوں ہیں مبصر جانتے ہیں۔ کامل مانتے ہیں ۱۲ مؤلف۔

[2] سنہ ۶۰ھ میں واقعہ کربلا ہُوا۔ عروج اسلام سنہ ۱ ہجری سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اُنسٹھ ۵۹ برس کہا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[3] آنچ پہنچنا اردو میں گزند پہنچنے کے معنی پر محاورہ ہے۔ از بسکہ نمرود نے جناب براہیمؑ کو جلانا چاہا تھا۔ اس لئے اس بیان میں اس روزمرہ نے جان ڈال دی ہے۔ جناب براہیمؑ خانہ کعبہ کے بانی ہیں۔ اُن کے ذکر کے ساتھ اصحاب فیل کے کعبہ پر قابو نہ پانے کا اور جناب امیرؑ کے مولود کعبہ ہونے کا بیان سلسلہ تقریر کے واسطے کتنا مناسب ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

قابو ہُوا نہ کعبے پر اصحاب فیل کو — مَیں نے گرایا تاجِ سرِ جبرئیلؑ کو
مارا اُسے جو قبلۂ آلِ خلیل تھا
فرزندِ خانہ زادِ خدائے جلیل تھا

(خدا کی شان۔ صابروں کا امتحان۔ دُنیا کی نیرنگی۔ اہلِ دُنیا کی دُنیا پرستی)

جلوہ دکھا رہا ہے خدا کبریائیؑ کا — ناحق بہاؤں خون مَیں حق کے فدائیؑ کا
ہو میری نذر کے لئے بلوہ خدائیؑ کا — پرسا نہ جا کے دے کوئی زینبؑ کو بھائیؑ کا
اُمّت کو ناگوار بھی یہ تہنیت نہ ہو
مرجائے ابنِ فاطمہؑ اور تعزیت نہ ہو

(۳۶) جنابِ زینبؑ درِ خیمہ پر آ کر حُرؑ کی لاش دیکھ کر اُس کی شجاعت و ایمانداری کی مدح فرماتی ہیں۔ اور اپنے بیٹوں کو جوشِ مردانگی و غیرت دلاتی ہیں۔ جب اُنھوں نے ایمان و اعتقاد کی آنکھوں سے

دیکھا کہ ہراول کا بدن خون میں تر ہے — جنت میں قدم زانوئے شبیرؑ پہ سر ہے

تو اپنے بیٹوں سے خطاب فرماتی ہیں۔

پہچانو تو پیارو۔ یہ فرشتہ ہے کہ حُر ہے — یہ وہی بہادر ہے کہ غلطاں کوئی دُر ہے
رُخ مہرِ اللہ کی رشکِ مہ و خور ہے — شبیرؑ کا بندہ ہُوا دوزخ سے یہی حُر ہے*
کیا خوب دمِ جنگ۔ نصیب اس کا لڑا ہے
یہ مُردہ ہے یا چودھویں کا چاند پڑا ہے

کیا تختۂ تن پر چمنِ زخم کھِلے ہیں — کیا خدمتِ شبیرؑ کے پھل اس کو ملے ہیں
نے پیاس کے شکوے ہیں نہ فاقوں کے گلے ہیں — اب آٹھ بہشت اس کی شہادت کے صلے ہیں

* مصرعِ اوّل میں حر نام ہے۔ اور اس چوتھے مصرع میں حر کے معنی آزاد کے ہیں۔ اگر دو معنی جدا جدا نہ ہوتے۔ تو یہ قافیہ

جو مرد ہیں وہ نام پہ سر دیتے ہیں پیارو
سر دیتے ہیں اور تاج شرف لیتے ہیں پیارو
اس موت میں جینے کا مزہ مل گیا حُر کو شبیرؑ کے ملنے سے خدا مل گیا حُر کو

(۳۷) بعد شہادت حضرت عباسؑ راوی نے جناب امام حسینؑ اور اُن کے ساتھ ایک چار سالہ لڑکی (سکینہ) کو گھبرا کر خیمہ سے نکلتے دیکھا۔ اُس کی مختصر **تصویر**۔

ہائے اُس لڑکی کا بین کیا کہوں کیا عالم تھا زلفیں بکھری ہوئیں۔ کُرتے کا گریباں پھٹا
ٹوپی اک سمت پڑی۔ ایک طرف سر کی ردا آنکھیں دریا کی طرف۔ اور بدن میں رعشا
گر کوئی پوچھتا تھا۔ کون ترا قتل ہوا؟
رو کے کہتی تھی۔ کہ فریاد۔ چچا۔ **قتل** ہوا

(۳۸) جناب عباسؑ علمدار کی آمد جنگاہ کے موقع پر لشکر یزید میں غل ہو رہا ہے۔

غل ہے کہ علمدارو۔ علم اپنے سنبھالو ہاں پیدلو۔ ہاں راکبو۔ ہاں برچھیوں والو
یہ مشک تو سوکھی ہوئی نیزے پہ اُٹھالو غازی نے کہا۔ جان ہی تم اپنی بچالو
لو آؤ۔ بڑھو نیزے سنبھالو۔ تو میں جانوں
کاندھے سے بھلا مشک اُٹھالو۔ تو میں جانوں

(۳۹) حضرت عباسؑ کی دلیرانہ تقریر اور دریا میں درآنے کی شیرانہ **تصویر**

دریا کے نگہبانوں کو عباسؑ نے ٹوکا لو روک لو دریا کہیں پھر ہو نہ دھوکا
وہ بولے کہ روکا ہے یہ بولے نہیں روکا وا دیدۂ بنیار ہانے ایک نہ دوکا
یوں گھوڑے کو چمکایا کہ سب غش میں پڑے تھے
عباسؑ یہاں دبیر سے دریا میں کھڑے تھے

(۴۰) جناب عباسؑ شہید کی عالم نزع کی مختصر **تصویر**

یہ کہتے تھے جو نزع کی ہچکی ہوئی طاری گردن جو ڈھلی بھائی کو دیکھا کئی باری

امام حسینؑ (۳۷) کے ساتھ ایک چار برس کی ننھی بچی نکلی (تصویر)

(۳۸) جناب عباسؑ علمدار

(۳۹) حضرت عباسؑ کی دلیرانہ تقریر و دلیرانہ تصویر

جناب عباسؑ کی نزع کی تصویر

تن گیا پا ہلیں انگلیاں پاؤں کی بھی ہاری		اشک آنکھوں سے اور کلمہ زباں سے ہوا جاری

جھپکی نہ پلک بھی کہ قضا کر گئے عباسؑ
آنکھیں سوئے مولد رہیں اور مر گئے عباسؑ

(۱۴۱) جناب امام حسینؑ اپنے **فرزند** نوجوان ہم شکل محمد مصطفےٰ صلعم کی لاش اُٹھانے کو جا رہے ہیں۔

لکھا ہے وا ابتا کی جو رہیں صدا آئی		حسینؑ امام کے چہرے پہ مُردنی چھائی
وہ آہ کی کہ ضریح رسولؐ تھرائی		روانہ ہوگئی اشکوں کے ساتھ بینائی

سوارِ دوشِ پیمبرؐ کی آس ٹوٹ گئی
عنانِ صبر تو تھامی۔ لگام چھوٹ گئی

تصویر واقعات غم

قدم قدم پہ ٹھہرتے تھے شاہ تشنہ گلو		ہوا میں سونگھتے تھے اپنے لال کی خوشبو
زمیں پہ بیٹھ کے گاہے بہاتے تھے آنسو		تلاش کرتے تھے ہاتوں سے لاش کو ہر سو

جو کوئی پوچھتا تھا۔ کیا حضور ڈھونڈتے ہیں؟
تو رو کے کہتے تھے۔ آنکھوں کا نور ڈھونڈتے ہیں

اس بند کو دیکھئے۔ کیا اس سے بہتر و مختصر کوئی شخص نثر میں بھی یہ مضمون ادا کر سکتا ہے (نظم تو درکنار)

تمہارے تیرِ جفا کا تو میں نشانا تھا		بھلا نبیؐ کے مرقع کو کیوں مٹانا تھا
کہ فیضیاب زیارت سے اک زمانا تھا		جو نیزہ سینے پہ مارا تھا دل بچانا تھا

گلہ۔ کسی کا نہیں۔ جو ہُوا۔ سو خوب ہُوا
بتاؤ چاند ہمارا کہاں غروب ہُوا؟

جواب سُنئے

پکارا شمر۔ یہ۔ کوئی نہیں بتانے کا		بڑا ثواب ہے سادات کے رُلانے کا

نہ زندہ چھوڑتے بنانے بچے بھی اس گھرانے کا　　ارادہ ہے۔ علی اصغرؑ کے خوں بہانے کا

جو تیر یار ہو ننھے گلے سے عید کریں
تمہاری گود میں شش ماہے کو شہید کریں

یہ سُن کے اُور طرف شاہ حق شناس چلے　　کبھی حواس میں اور گاہ بے حواس چلے
نہ تھا یہ ہوش۔ کدھر آئے کس کے پاس چلے　　پکارتے ہوئے ہر سُو بحال یاس چلے

مرے جوان۔ مرے عاشق۔ مرے جگر بولو
کہاں سدھارے۔ کدھر چُھپ رہے پسر بولو

(ایک شخص نے بتا دیا)

یہ کہتے تھے۔ کہ پکارا کوئی ترس کھا کر　　کہ ایک شیر وہ گھائل پڑا ہے زیر شجر
کہاں کہاں؟ کہا۔ اور دوڑے سبط پیغمبرؐ　　دُعائیں دے کے اُسے پوچھنے لگے سرور

بھلا نشان تو دے۔ کیا ثبوت ہوتا ہے
یہ شیر اور ہے۔ یا شیر حق کا پوتا ہے

(سراپا نئی شان کا)

وہ رو کے بولا سنو۔ لمبے لمبے گیسو ہیں　　ستارہ خال۔ قمر رُخ۔ ہلال ابرو ہیں
علیؑ کے زور کا سانچہ وہ گول بازو ہیں　　پسینہ عطر ہے۔ کپڑے تمام خوشبو ہیں

بڑا۔ پتہ تو یہ ہے۔ وہ نبیؐ کا ثانی ہے
وداع عمر ہے۔ اور موسم جوانی ہے

(اور نشانات۔ مرثیت کے پہلو)

دہان خشک سے باہر نکل پڑی ہے زباں　　زباں کے ساتھ ہے انگشتری بھی مُنہ سے عیاں
کہا حسینؑ نے بس بس وہی ہے میرا جواں　　انہیں کے واسطے رن میں ہوں کب سے سرگرداں

نشان پسر کا ہمیں تجھ سے بھائی جان* ملا

ایک شخص نے نشان بتا دیا

نئی شان کا سراپا

نشانات

* وہ شخص دشمن کی فوج کا کوئی آدمی ہے۔ مگر پھر بھی آپؑ کو بھائی جان کر رہے ہیں۔ کہ اُس نے علی اکبرؑ کا پتہ بتایا ہے۔ یہ لفظ (بھائی جان) خلق محمدیؐ کی خبر دے رہی ہے۔ جو امام حسینؑ کی طبیعت میں تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

پر آج خاک میں بالکل مرا الشان ملا

(امام حسینؑ آگے بڑھے)

گئے جو زیر شجر اپنے گُل کی بُو پائی — مگر نہ لاش مفصّل اُنہیں نظر آئی
وہ شوق دیکھنے کا اور وہ ضعف بینائی — تڑپ تڑپ گیا دل اور رُوح گھبرائی

جدھر سے آئی تھی بُو۔ اُس طرف کو جانے لگے
پسینہ آنے لگا۔ پاؤں تھرتھرانے لگے

پکارے گر کے۔ کدھر ہو۔ کہاں ہوئے بیٹا — پسر نے ہات اُٹھایا۔ اِدھر اِدھر۔ بابا[1]
یہ حال قبلہ وکعبہ کا آہ کب سے ہُوا؟ — حسینؑ بولے۔ تمہارا مزاج ہے کیسا[2]؟

کہا پسر نے۔ کوئی دم کی اور ایذا ہے
قدم حضُور کے دیکھے۔ غلام اچھا ہے

(سلاست و فصاحت کا کمال۔ بھلا اسکو نثر تو کیجئے)

یہ سُن کے جانب آواز شاہ تشنہ چلے — قریب جاتے ہی ملنے لگے پسر کے گلے
جبیں جبیں سے ملی۔ لب پسر کے لب سے ملے — اُٹھا کے سر کو رکھا ایک ہاتھ سر کے تلے

پکارے ہائے غضب۔ چہرہ زرد ہوتا ہے
وہ بولے۔ میرے کلیجہ میں درد ہوتا ہے

(علیؑ اکبر کا جواب)

امام حسینؑ آگے بڑھے

آخری باتیں

سلاست و اختصار اور باتیں

علی اکبرؑ کا جواب

---

[1] پسر نے ہاتھ اُٹھایا۔ ادھر ادھر بابا۔ کمال بلاغت یہ ہے کہ اضطراب و انتہائے ملال و درد میں جس طرح مجروح آدمی بات کرتا ہے آدھی منہ تک کر دیتا ہے اسی طرح نظم کر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ ادھر ادھر آئیے۔ یا ادھر میں موجود ہوں ۔۔۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ تقریر امام حسینؑ کی مصیبت و محبت کی خبر دے رہی ہے کہ علی اکبرؑ تو امام حسینؑ کا حال پوچھتے ہیں امام حسینؑ اپنا حال کچھ نہیں بتاتے۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ تمہارا مزاج کیسا ہے۔ کیونکہ مصیبت زدہ آدمی ہر بات کا جواب نہیں دیا کرتا۔ اور محبت کے سبب سے مجروح یا علیل ہی کا حال پوچھے جاتا ہے ۔۔۱۲ مؤلف حقیر۔

وداع ہوتے ہیں جنت کو جاتے ہیں بابا   یہ دیکھئے۔ وہ پیمبرؐ بلاتے ہیں بابا
برہنہ سر مرے دادا ابھی آتے ہیں بابا   چچا حسنؑ بھی وہ تشریف لاتے ہیں بابا

جبیں پہ موت کا ٹھنڈا پسینہ آتا ہے
رگوں کے کھنچنے سے جی سن سنایا جاتا ہے

خاندان رسالت کے شہید کی موت

خاندان رسالت کے شہید کی موت کی **صورت حال**۔

یہ کہکے کلمہ کی انگلی بلند کی ناگاہ   کہا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللہ
پھرا کے آنکھوں کو کی جانب حسینؑ نگاہ   حسینؑ رونے لگے اور پکارے وا اسفا

میں زندہ بیٹھا ہوں تم میرے آگے مرتے ہو
پدر کو کلمہ کا اپنے گواہ کرتے ہو

(۴۲) فاطمہ صغرےٰ کی تنہائی کی تصویر

(۴۲) امام حسینؑ بنابر ایک روایت کے مدینہ منورہ میں اپنی ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغرےٰ کو چھوڑ کر سفر عراق کو گئے ہیں۔ اُن (فاطمہ صغرے) کی تنہائی و اضطرار کی **تصویر**۔

بالوں کو کبھی کھولنا اور خاک سے بھرنا   بند آنکھیں کئے۔ دل سے بیاں باپ کا کرنا
اٹھ بیٹھنا۔ اور بیٹھ کے سر تکئے پہ دھرنا   سنسان مکاں دیکھنا۔ اور دیکھ کے ڈرنا

خود کہنا کہ بابا سے نہ دنیا میں ملیں گے
پھر آپ ہی سمجھانا کہ عقبیٰ میں ملیں گے

اضطرار اور انتشار

مایوسی کے عالم میں بڑھانا کبھی زیور   یعنی نہ ملاقات پدر ہوگی میسّر
گہنے کو پہننا کبھی اور کہنا یہ ہنس کر   اللہ کرے آتے ہوں فرزند پیمبرؐ

گہ ذکر شہِ دیں۔ کبھی عباسؑ کی باتیں
گہ یاس کی باتیں تو کبھی آس کی باتیں

سمجھاتی تھیں نانی* تو یہ کہتی تھی وہ بیمار   جو جو تھا مقدر میں وہ ہوتا ہے نمودار

* نانی سے یہاں مراد اُمّ المومنین اُم سلمہؓ سے ہے۔ جن کو امام حسینؑ مدینہ میں چھوڑ گئے تھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

آگے تھا بخار اب ہُوا وحشت کا بھی آزار ۔۔۔ اس حال سے ہوتی ہے خجالت[1] مجھے ہر بار

غفلت میں تو کیا کیا نہیں کہ جاتی ہُوں نانی

پھر ہوش جو آتا ہے تو شرماتی ہُوں نانی

سب رنج و قلق میرے مقدّر کے لئے تھا ۔۔۔ سوزِ تپ ہجراں تنِ لاغر کے لئے تھا

داغِ غمِ فرقت دلِ مضطر کے لئے تھا ۔۔۔ دورانِ زمانے کا مرے سر کے لئے تھا

نے دیکھنے کو شاہ کے ۔ نے سونے کی خاطر

تقدیر نے دی آنکھ ہمیں رونے کی خاطر

(۴۳) مناجات امام حسینؑ

(۴۳) امام حسینؑ روزِ عاشورا درگاہ خدا میں مناجات فرماتے ہیں۔

تُو نے بچپن میں کھلائے ثمرِ خلدِ بریں ۔۔۔ اب اگر تنبیر افاقہ ہے نہیں کچھ میں حزیں

چُوسی چھٹپن میں زباں نبیؐ عرش نشیں ۔۔۔ آج اگر پینے کو پانی نہیں ۔ تو خیر نہیں

ایک دن حلق تھا اور فاطمہؑ کے شیر کی دھار

آج راضی ہُوں گلے پر چلے شمشیر کی دھار

مصائب پنجتن پاکؑ

دُرِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا ۔۔۔ لے گئیں نذر کو داغِ غمِ احمدؐ زہراؑ

سرخرو ہے ترے دربار میں بابا مرا ۔۔۔ دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے[2] کئے تجھ پہ فدا

آج شبیرؑ بھی ان سب کے مقابل ہوجائے

سر مرا اگر تری سرکار کے قابل ہوجائے

ف ۱ بعض نسخوں میں خجالت غلط ہے خجلت صحیح ہے مگر معتبر نسخوں میں خجالت ہی لکھا ہے بعض نسخوں میں بلفظ ندامت موجود ہے مگر اس میں وہ بات کہاں ۔ ۱۲ مولف حقیر

ف ۲ جناب سرورِ کائنات صلعم کا دندانِ مبارک اُحد کی لڑائی میں شہید ہوا تھا مصرع اول میں اس مصیبت کی طرف اشارہ ہے مصرع دوم میں جناب فاطمہ زہرا کو جو صدمہ بعد وفات حضور صلعم پہنچے اُنکو کنایۃً بیان فرمایا تیسرے مصرع میں جناب امیرؑ کے مسجد کوفہ میں سر پر تلوار کھانے کا اشارہ ہے کہ سر کے خون سے رُوئے مبارک سرخ ہو گیا تھا چوتھے مصرع میں امام حسنؑ کے حال کو بالاجمال بیان کیا کہ زہر سے دل پارہ پارہ ہو کر قے کے ذریعے سے وہ ٹکڑے لگن میں گرے تھے [illegible] (میں بھی نہیں [illegible] یاد گار ہو)

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بار خدا　　　ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطر عاشق جاں باز ہے البتّہ جُدا　　　اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے سینے پہ جلّاد رہے
لب پہ ہو نام ترا۔ دل میں تری یاد رہے[۱]

(۴۴) مادر علی اصغرؑ کا علی اصغرؑ کو قید خانہ شام میں یاد کرنا۔ (تصویر)

یاد آتے ہیں اصغر مجھے اب تک نہیں بھولے　　　چھوٹا سا وہ قد۔ چاند سا منہ۔ بال جھنڈولے
ایسے گئے گہوارے میں پھر آکے نہ جھولے　　　پھل تیر کا کھایا نہ پھلے اور نہ پھولے

اب جا کے مَیں اصغرؑ کو وہاں پیار کروں گی
اُس چھوٹی سی میّت کو کلیجے پہ دھروں گی

(۴۵) عہد حضور صلعم میں ایک ایسی عید آئی۔ کہ حسنینؑ کے پاس نئی پوشاک نہ تھی۔

القصّہ سُن کے چار طرف عید کی خبر　　　آئے حضور فاطمہؑ۔ سبطین نامور
باہیں گلے میں ایک نے ڈالیں اِدھر اُدھر　　　اک سینے سے لپٹ گیا جلدی جھکا کے سر

بولے حسنؑ۔ ہمیں پہ بہت مہربان ہیں
شبیرؑ بولے۔ واہ مری امّاں جان ہیں[۲]

اب دیکھئے۔ جناب فاطمہ زہراؑ ایسا جواب دیتی ہیں۔ کہ دونوں میں سے کسی سے محبت کم نہ ثابت ہو۔ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

ماں بولی۔ ہم تو دونوں کے قربان جاتے ہیں　　　اتنا نہ چاہو تم۔ مجھے وسواس آتے ہیں
حاسد کی چشم زخم سے ہم ہول کھاتے ہیں　　　سب سے چھپا کے تم کو گلے سے لگاتے ہیں

(۴۳) تیغ میں پیہم سپر... (حاشیہ: علی اصغرؑ کی ماں قید خانہ میں علی اصغرؑ کو یاد کرتی ہیں)

(۴۵) حسنینؑ کے لئے نئی پوشاک نہیں اور عید آئی ہے۔ ماں کا جواب دونوں بیٹوں کی برابری کی محبت مع دلیل اور ثبوت شاعرانہ

۱؎ یہ مشہور و مقبول مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے ع جب جو بی ظہر تک قتل سپاہ شبیرؑ۔ ابتدا سے انتہا تک ایسا ہی فصیح ہے جس کی مثال لاجواب ہے۔ جلد دوم میں مرثیہ کے بہت سے بند انتخاب کئے ہیں۔ دفتر ماتم کی بارھویں جلد میں بھی یہ مرثیہ چھپ چکا ہے۔ ۲؎ یہ بیت سیل متنت کی صف میں آتی ہے۔ ۳؎ حلق پر تیغ رہے سینہ پہ جلاد رہے۔ لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

خاصانِ حق کے خاص ہو نیکوں کے نیک ہو
مثلِ نگاہ۔ تم مری آنکھوں میں ایک ہو[1]

(۳۶) حضرت امام حسینؑ کی تنہائی اور جاں نثار جرار بھائیؑ اور نوجوان فرزند کی یاد۔

(۳۶) تنہائی امام حسینؑ اور بھائی و فرزند کی یاد

حال کمر و چشم پہ کہتے ہیں بصد یاس | کیوں بندِ کمر توڑ گئے تجھ کو بھی عباسؑ
مَیں جانتا تھا بھائی نے تو رسی ہے، فقط آس | عباسؑ کو کیا روؤں کہ اکبرؑ بھی نہیں پاس

مَیں جانتا تھا دردِ جگر دے گئے اکبرؑ
کیوں چشمِ بصارت بھی تری لے گئے اکبرؑ

اے چشم جواں مرگ کے حق کو تو ادا کر | جس نے تجھے بے نور کیا اُس پہ بکا کر
اے سینۂ محزون علمِ آہ بپا کر | مظلوم علمدار حسینی کی عزا کر

اے دل نہ تڑپ۔ یاد سکینہ کی بھلا دے
اے خشک زباں۔ نانا کی اُمت کو دعا دے[2]

(۳۷) عرب کی دھوپ اور گرمی ضرب المثل ہے مرزا صاحب روزِ عاشورا ۶۱ھ کی گرمی کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

(۳۷) گرمی اور دھوپ

کیا گرم ہوا قہر کی مقتل میں چلی ہے | دن ڈھل گیا ہے دھوپ نہیں دن کی ڈھلی ہے
وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا | بس ہات دھرا قبضے پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہُوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا | اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا

پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر[3]

---

[1] آدمی کی آنکھیں دو ہوتی ہیں مگر نگاہ ایک ہوتی ہے۔ دونوں نورِ چشموں کا ایک ہی مرتبہ ہونا کس خوبی سے ثابت کیا ہے کیا حسن تعلیل اس سے بہتر ہو سکتی ہے تمام عرب و عجم کے دیوان چھان ڈالیے ایسے مضامین نہیں ملینگے۔ یہ مرثیہ بھی دفترِ ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپ چکا ہے جس کا مطلع مشہور ہے ع ستارہ کا مُنات حسن و حسینؑ ہیں۔ مؤلف حقیر

[2] دفترِ ماتم کی تیرھویں جلد میں مرثیہ چھپ چکا ہے اس کا مطلع یہ ہے ع تسبیحِ امامت جو گری خاک شفا پر۔ اچھا مرثیہ ہے۔ مؤلف حقیر۔

[3] دفترِ ماتم کی چودھویں جلد میں مرثیہ چھپ چکا ہے جس کا مطلع یہ ہے ع جب سیکڑوں اشقیا میں شہ اور پیر ہوا روز ... مؤلف حقیر۔

سایہ کے تجسس میں بشر پھرتے ہیں ششدر — سایہ تہ دیوار و شجر بیٹھا ہے چھپ کر
سب لیتے پناہ اپنے ہی سایہ میں مقرر — پر دھوپ نے سایہ ہی جلا ڈالا سراسر
مضمون عدم سایہ کا یہ میں نے نکالا
سایہ نے بھی آج آپ کو دریا میں ہے ڈالا

نایاب ہیں مرغان ہوا صورت عنقا — بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لب دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا — پر اوج امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے۔ سایہ نہیں۔ اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے۔ پانی نہیں۔ اور پیاس بڑی ہے[1]

سرسام فلک کو ہوا ہے گرم ہوا سے — شب ہو تو ملے شیر کو اک کف پا سے
کافور قمر اُڑ گیا ہے دار شفا سے — گرمی یہ ہے اور عابدؑ بیمار ہیں پیاسے
بالائے زمیں دھوپ کی زردی سے عیاں ہے
گردوں کو ہے سرسام زمیں کو یرقاں[2] ہے

اب ایک ایسے مرثیہ میں سے تحت کے چند بند لکھتا ہوں۔ جو نہ تقسیم ہوا ہے۔ نہ چھپا ہے۔ بلکہ اس کتاب کی رونق و عزت بڑھانے کے واسطے جناب استادی ملاذی حضرت اوج مدظلہ نے یہ چند بند عنایت فرمائے ہیں۔ کہ یہ سب کلام حسب وصیت جناب دبیر مرحوم محفوظ ہے۔ میں جناب ممدوح کے شکریہ کے ساتھ ان جواہرات کو ناظرین جوہر شناس کے روبرو پیش کرتا ہوں۔

تنہا کھڑے ہیں رن ہیں امام فلک جناب — گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب

---

[1] یہ ٹیپ مسجع ہے کہ ہر مصرع کے تین تین جزو بالمقابل وزن میں آئے ہیں۔ مگر کس قدر بے ساختہ پن ہے ۱۲ مولف

[2] علم طب کے ماہر اس بند کو بغور دیکھیں اور حسن تخئیل کی داد دیں۔ یہ تینوں بند بھی اُسی مرثیہ سے لئے ہیں۔ جس کا مطلع اُدر لکھ چکا ہوں۔ ع تسبیح امامت جو گری خاک شفا پر ۱۲ مولف حقیر۔

بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب ۔ خطِ غبار سے ہے لپی - ابر کی سحاب

چھالا ہے آفتاب کا گردن کے پاؤں میں

خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی ۔ رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی

دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی ۔ حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی

فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی

پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی[1]

پانی کا زبان نکالنا کی شدت

آتش بدل سمندر ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش ۔ آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش

سوز جگر سے مردم آبی ہیں نالہ کش ۔ نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش

نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں

تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں[2]

سایہ دار درختوں کا غائب ہونا

جو نخل سایہ دار ہیں وہ بے نشان ہیں ۔ بالائے سر کھنچے ہوئے نُو سائبان ہیں[3]

اک سایۂ حسین میں دونوں جہان ہیں ۔ جو گرد سات چتر لئے آسمان ہیں

---

[1] مولوی شبلی صاحب نے موازنہ میں شعر مرزا صاحب کا صفحہ ۳۵ پر لکھا ہے نیست ممکن قطرہ سر جلوہ گر در حوض کردہ بہت از تشنگی بیرون زبان حوض آب گویا جانتے ہیں کہ اس قسم کا اکثر توارد ہو جاتا ہے اور جو شخص نیک طینت تجربہ کار رہتا ہے وہ ضرور ایسا خیال کرتا ہے اور جو دوسری طرح کی طبیعت رکھتا ہے سرقہ کی تہمت لگا دیتا ہے حقیر نے ایک سلام میں کہا ہے چونکہ میں سمجھتے ہیں کہ اور کچھ خیال جیسا ہے ویسا ہی اب دیکھتے ہیں بخیال مرزا صاحب کو مرزا صاحب کے شعر کا علم ہوگا یا نہیں مگر دونوں میں ایک بڑا فرق بھی ہے وہ یہ کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں پانی اپنی زبان نکال دی گویا فعل اختیاری ہوا مرزا صاحب کہتے ہیں کہ زبان دہن سے نکل پڑی یہ فعل پانی کا اضطراری ہے جو پانی میں پیاس کی کمال شدت کو ظاہر کرتا ہے کہ گرمی اور پیاس کی شدت میں بے اختیار زبان منہ سے نکل پڑتی ہے اس بنا پر دبیر مرحوم کا شعر ان سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ ابھی تک میری نظر سے یہ شعر دیوان غالب میں نہیں گذرا ہے ۱۲ مؤلف حقیر

[2] زہد کو بے آبرو کرنے کی وجہ کیسی عمدہ نکالی ہے کہ تردامنی یعنی گناہ سے وضو کریں مطلب یہ ہے کہ اس قسم (عالم میں) ریاکاری بڑھ گئی ہے کہ زاہدان بانی گناہ کو ہی ذریعہ عبادت الٰہی کرنا چاہتے ہیں یہی حال آج کل سنہ [illegible] میں عام مسلمانوں کا تھا ۱۲ مؤلف حقیر

[3] نُو سائبان سے مراد نُو آسمان ہیں ۱۲ مؤلف حقیر

قامت کی زیب گیسوئے شاہ جلیل ہیں
پر کھولے۔ ایک سدرے پہ۔ دو۔ جبرئیل ہیں*

(۴۸) عرب آج بھی اپنے گھوڑوں سے باتیں کرتے ہیں۔ اور گھوڑے زبان اشارہ سے جواب دیتے ہیں۔ اس مضمون کو دیکھئے کیسی سلاست ولفاست سے مرزا صاحب ادا کرتے ہیں۔

امام حسینؑ کے حال میں

راکب پہ بھی مرکب پہ بھی ہے تیسرا فاقا   بند آنکھیں ہیں، سوار کی اور غش میں ہیں آقا
فرصت نہ انہیں ضعف سے نے اُس کو افاقا   دُنیا میں ہیں۔ لیکن نہیں دُنیا سے علاقا
مولا کے رکابوں سے قدم چھوٹ چکے ہیں
اتنا بھی فقط گھوڑے کے روکے سے رُکے ہیں

مرکب کا ہے یہ حال کہ جب ہوش میں آنا   راکب کی طرف خوں بھری گردن کو پھرانا
اور دیکھ کے بے حال اُنہیں یہ حرف سُنانا   آقا مجھے بے صاحب و وارث نہ بنانا
مولا مرے سنبھلو کہ مجھے خوف بڑے ہیں
تم غش میں ہو اور ناک میں جلّاد کھڑے ہیں

شہ کہتے ہیں مجھ کو غم اکبرؑ ہے گراتا   گھوڑے مَیں سنبھلتا ہوں پہ سنبھلا نہیں جاتا
طاقت مَیں بھلا پاتا تو گردن کو جھکاتا   اس وقت۔ مَیں۔ ملنے کو سکینہ سے نہ جاتا
جانے وہی جس پر یہ بلا آئی ہے گھوڑے
مجبوری ہے۔ ناچاری ہے تنہائی ہے گھوڑے

* ایک سدرہ پر دو پر کھولے ہوئے جبریلؑ ہیں۔ اس میں قامت امام حسینؑ کو مصنف نے سدرۃ المنتہیٰ قرار دیا۔ اور دونوں گیسوئے امامؑ کو جبرئیلؑ کے دو پروں سے تعبیر کیا۔ اس میں "دو" کی لفظ ذرا اپنے مقام سے کچھ ہٹی ہوئی ہے۔ مگر ایسی تعقیب سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں ہے۔ اور ہر شاعر وزن وقافیہ کی رعایت سے نظم میں الفاظ آگے پیچھے لانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو نظم ونثر میں پھر فرق ہی کیا ہے۔ ع والعذر عند کرام الناس مقبول ۱۲ مؤلف حقیر

(۴۹) دربار یزید میں علی اصغرؑ کا بیان

تصویر اصغرؑ لفظوں میں

اعدا کا اگر ہوش بجا ہے تو بجا ہے
اُن کا علی اکبر سا پسر کون مُوا ہے[1]
بچوں کے لئے سایہ ہے پروا نہیں کیا ہے
یاں دھوپ میں لاشہ مرے اصغرؑ کا پڑا ہے
ناموس عدو خیمہ میں بے رنج و محن ہے
اور روبرو وہ سر ننگے کھڑی میری بہن ہے[1]

(۴۹) دربار یزید میں جس وقت اور شہیدوں کا ذکر ہوتے ہوتے علی اصغرؑ کا ذکر ہوا۔ تو ایک قاتل (حرملہ بن کاہل) نے کہا۔ کہ اُس دودھ پیتے بچّے کو میں نے تیر سے مارا تھا۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

زانو پہ ہات مار کے چلایا وہ شریر
بچّہ کا کیا قصور تھا کیوں مارا اُس کو تیر
اُس نے کہا خوشی کیلئے تیری۔ اے امیر
حاضر ہے سر بھی چھوں میں اب تک بھرا ہے شیر
بولا یزید عذر و سماجت کرونگا میں
لا بے خطا کے سر کی زیارت کرونگا میں

جب سر علی اصغرؑ روبرو آیا۔ اُس موقع کی تصویر دیکھئے۔

دیکھا بہت یزید نے شش ماہے کا جمال
وہ بھولی بھولی شکل وہ بکھرے جھنڈولے بال
آنکھوں کو ڈبڈبا کے[2] کیا شمر سے سوال
پھولوں کے ساتھ ہوگئیں کلیاں بھی پائمال
میرے تو ہوش دیکھ کے یہ سر بجا نہیں
بتلا کہیں گڑھا تھا ترا دل بھی یا نہیں

---

[1] یہ بند بھی اُسی مرثیہ میں سے ہیں۔ ع جب سکۂ زر شرقی مہر ہوا رد زد ۱۲ مؤلف بے بضاعت۔

[2] اگر یورپ کی طرح آج ہمارا ملک بھی علوم و فنون کا قدردان ہوتا۔ اور وہاں کے شعرا کی طرح شعرائے اردو کے الفاظ کی بھی چھان بین کی جاتی۔ تو معلوم ہوتا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے سب شعرائے اردو سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی سے نظم کئے ہیں۔ کیونکہ ذاتعات ہر قسم کے ان کے مرثیوں میں ہیں۔ میرے خیال میں روزمرّہ "آنکھوں کو ڈبڈبا کے" بھی اوّل اوّل مرزا صاحب نے باندھا ہے۔ اور اس مصرع کا تو جواب ہی نہیں ع پھولوں کے ساتھ ہوگئیں کلیاں بھی پائمال۔ جس مرثیہ سے یہ بند لئے ہیں وہ بھی ابھی تک نہیں چھپا۔ میرے پاس قلمی ہے مطلع اس کا یہ ہے ع اے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۵۰) جس مضمون کو میں ذیل میں ایک مرثیہ غیر تقسیمی سے لکھنا چاہتا ہوں بہایک مشہور مضمون ہے۔ اور قریب قریب اکثر شعرا نے اس کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ اور آیہ کریمہ تحت سے یہ مضمون لیا ہے ۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا جس کا مفہوم ظاہری یہ ہے۔ کہ اس بار امانت خدا کو صرف انسان نے اٹھایا ہے جس کے اٹھانے سے آسمانوں۔ زمینوں۔ پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ بار امانت سے مراد علما نے راہ خدا میں مصیبت اٹھانے سے لی ہے۔ حافظ شیراز فرماتے ہیں

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

آتش مرحوم فرماتے ہیں ؎

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے

کتاب کے حجم بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ تو اور بھی شعرا کے کچھ اشعار یہاں میں لکھتا۔ خیر انیس صاحب مرحوم کی نظم اس بزرگوار کے حال میں سنئے۔ جس سے بڑھ کر روئے زمین پر کسی نے خدا کے واسطے مصیبتیں نہیں اٹھائیں۔ مثل مشہور ہے۔ کہ حصہ بقدر جثہ۔ از بسکہ امام حسین پر مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ فلہذا حضرت سب سے بڑے امانت دار خدا کے ہوئے۔ اس امانت کو ممدوح نے عشق خدا سے تعبیر کیا ہے۔ اور کمال یہ کیا ہے۔ کہ اسی لفظ (عشق خدا) سے مرثیہ شروع کیا ہے۔

مطلع

عشق خدا کا بار نہ کہسار سے اٹھا افلاک سے نہ عرش ضیا بار سے اٹھا

۱؎ لفظی ترجمہ اس آیت کا یہ ہوسکتا ہے کہ تحقیق کہ ہم نے امانت کو زمینوں اور آسمانوں اور پہاڑوں پر عرض کیا مگر سبھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ اس لئے کہ وہ ظلوم و جہول ہے ۔ ۱۲ مؤلف بیچارہ۔

عشق خدا ۷۶

عشق خدا کا بار غیر تقسیمی مرثیے کا

یہ کیا۔ نہ انبیائے خوش اطوار سے اٹھا لیکن حسینؑ بے کس و بے یار سے اٹھا

رُخ زرد۔ آدم و ملک و جن کا ہو گیا
یہ ہو گئے خدا کے خدا[1] ان کا ہو گیا

اللہ رے حسن عقل کہ عشق خدا لیا لُبِّ لبابِ[2] چشمۂ آبِ بقا لیا
نعمت وہ لی کہ دل کی زباں نے مزا لیا تریاق زہرِ تشنگی کربلا[3] لیا

بار گراں عشق کے حامل حسینؑ ہیں
شاہد خدا ہے عاشق کامل حسینؑ ہیں

خود بیں نہیں۔ ازل سے خدا بیں حسینؑ ہیں چشم مبیں۔ صاحب یٰسیں حسینؑ ہیں
گلزار حسن کے گلِ رنگیں حسینؑ ہیں پر حق کے باغ عشق کے گلچیں حسینؑ ہیں

شہادت کا مال

---

[1] اس موقع پر خود مصنف مرحوم نے حاشیہ پر ایک حدیث قدسی لکھی ہے جو اسلام کے دونوں فرقوں سُنّی و شیعہ میں متفق علیہ پائی جاتی ہے میں بھی اسکو لکھ دوں جس سے اس بند کا لطف زیادہ ہو جائیگا۔ یہ بند بھی عطیہ حضرت روح معلا ہیں۔ مَنْ طَلَبَنِیْ فَطَلَبْتُہٗ۔ وَمَنْ طَلَبْتُہٗ فَوَجَدَنِیْ وَمَنْ وَجَدَنِیْ فَعَرَفَنِیْ۔ وَمَنْ عَرَفَنِیْ فَعَشِقَنِیْ۔ وَمَنْ عَشِقَنِیْ فَعَشِقْتُہٗ۔ وَمَنْ عَشِقْتُہٗ فَقَتَلْتُہٗ۔ وَمَنْ قَتَلْتُہٗ فَاَنَا دِیَتُہٗ۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ (خدا فرماتا ہے) جو میرا طالب ہوا میں بھی اس کا طالب ہوا اور جو میرا طالب ہوا اس نے مجھے پایا۔ اور جس نے مجھے پایا اس نے مجھے پہچانا۔ اور جس نے مجھے پہچانا وہ مجھ پر عاشق ہوا اور جو مجھ پر عاشق ہوا میں بھی اس کا عاشق ہو گیا۔ اور جس کا میں عاشق ہوا اس کو میں نے قتل کیا۔ اور جس کو میں نے قتل کیا اس کا خون بہا میں خود ہوں گویا میں نے اپنی ذات کو اس کے اختیار میں دیدیا جو اس حبیبِ معشوق کی رضا ہے وہی میری رضا ہے۔ اسی بنا پر مصنف مرحوم نے کہا ع یہ ہو گئے خدا کے خدا ان کا ہو گیا ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ بھی ویسی ہی لفظ معلوم ہوتی ہے جس کو شاید مرزا صاحب کے زمانہ تک کے شعرائے مستندین میں سے بجز ان کے کسی نے نظم نہیں کیا۔ لُبِّ لباب یعنی منتخب میں کا انتخاب کیا ہوا۔ جیسے پھول خوشبودار ہوتا ہے اس کا عطر بنایا پھر عطر کی روح کھینچی۔ مصنف کہتے ہیں کہ امام حسینؑ جو شہید راہ خدا ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے تو انھوں نے چشمۂ آب بقا کا لُبِّ لباب لیا۔ جو لوگ مرزا صاحب کے کلام میں اس بنا پر کلام کرتے ہیں کہ وہ دقیق لفظ بہت لاتے ہیں ان سے آپ میری طرف سے ذرا پوچھئے تو کہ جناب اس جگہ آپ اردو یا فارسی کے دوسرے لفظ کو فرما دیجئے جس میں حسن و زیادہ اثر ہو اور یہ مطلب ادا ہو سکے ۱۲ مؤلف۔

[3] اسی طرح تریاق زہر تشنگی کربلا کو دیکھئے کہ اس کا مرادف دوسرا لفظ شاید نہ ملیگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

کی طاعت خدا وہ خدا کے فدائی نے

جو مان لی خدا کی خدائی۔ خدائی[۱] نے

اب یہ مسئلہ مصنف ممدوح بیان فرماتے ہیں کہ عشق خدا تو ہر ایک شخص میں پایا جاتا ہے۔ مگر درجات کا فرق ہے۔ سب سے اعلےٰ درجہ امام حسینؑ کو ملا ہے۔ کہ وہ جناب امتحان میں پورے اترے۔

ہر جزو و کُل کو عشق خدا ہے بقدر حال ۔۔۔ پر امتحان عشق کی برداشت ہے محال

وہ کیا ہے یاس و حسرت و رنج و غم و ملال ۔۔۔ شمع مراد گُل۔ گُلِ امید پائمال

یہ بار قابلِ شہِ عالی تبار تھا

ہوگا۔ نہ ہے۔ نہ ایسا کوئی بُردبار تھا

مصائب کی فہرست بالاجمال

اب مصنف اُن مصائب کی (جس میں امام حسینؑ کا امتحان ہوا) بالاجمال گویا فہرست بیان کرتے ہیں۔

وہ بار کیا تھا۔ ہجرت یثرب۔ سفر کا داغ ۔۔۔ سوزش عطش کی دل میں اور اُس پر جگر کا داغ

اکبرؑ کا داغ مثلِ قمر۔ عمر بھر کا داغ ۔۔۔ بھائی کا داغ شکل میں مرگ پدر کا داغ

یہ داغ کس نبیؐ نے سہے کس رسول نے

غم کے پہاڑ اٹھا لئے زہراؑ کے پھول نے[۲]

وہ بار کیا تھا دربدری اہلبیتؑ کی ۔۔۔ بے وارثی و بے پدری اہلبیتؑ کی

بچوں کی موت نوحہ گری اہلبیتؑ کی ۔۔۔ درباروں میں برہنہ سری اہلبیتؑ کی

---

۱ خدا اور خدائی یہاں دونوں لفظوں کی تکرار نے جان ڈالدی ہے خدا کے فدائی نے اسطرح اسکی عبادت کی کہ خدا کی خدائی (معبودیت) کو تمام خدائی یعنی مخلوقات نے مان لیا۔ ایک لفظ خدائی کو دو معنی پر ایک ہی مصرع میں لانے سے الفاظ مضمون بن گئے ہیں ۔ ۱۲ مؤلف۔

۲ نازک خیالی ہر شاعر کے خیال میں نہیں آتی ہے سہل ممتنع ایسی نظم کو کہتے ہیں جیسی یہ بیت ہے حق تو یہ ہے کہ تعریف سے زبان قاصر ہے۔ دل جو لطف اٹھاتا ہے اسکے بیان کرنے سے زبان مجبور ہے۔ اگر دل کو خدا نے ایک علیحدہ زبان دی ہوتی تو شاید اسکی خوبی وہ بیان کر سکتا۔ آیۂ کریمہ کو پیش نظر رکھیگا تو معلوم ہوگا کہ اس بار کے اٹھانے سے زمین اور آسمانوں نے انکار کیا اور انسان ضعیف نے اسکو اٹھا لیا تو ایسی عظیم الشان زمین و آسمان کے مقابلہ میں انسان بمنزلہ ایک پھول کے ہے۔ اور وہ بار گویا پہاڑ ہیں بس مصرع غم کے پہاڑ اٹھا لئے زہرا کے پھول نے یہ مضمون صحیح اور لاجواب مصرع ہے گو بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں مبالغہ نہیں ۱۲ مؤلف مرحوم

گریاں سکینہؑ۔ شاہ مدینہ کے واسطے
تسکین کو طمانچہ سکینہ کے واسطے

(امام حسینؑ کی کارگذاری)

ہمت یہ کی حسینؑ نے اُمت کے واسطے
سر پر لیا یہ بارِ شفاعت کے واسطے
باندھا کمر کو حُسینؑ شہادت کے واسطے
سب کچھ کیا محبوں کی راحت کے واسطے

غربت میں ننھے بچوں سے آکر بچھڑ گئے
اُمت کو عافیت دی۔ خود آفت میں پڑ گئے[1]

یہ بار جب پسندِ شہ کربلاؑ ہُوا
ارشاد ذوالجلال کا یہ برملا ہُوا
احسنت اے حسینؑ بہت خوش خدا ہُوا
پر خُون کی دیت میں بھی سب کچھ عطا ہُوا

ہر شے پہ اختیار ہمیشہ رہا ترا
تو فدیۂ خُدا ہے۔ خُدا خوں بہا ترا[2]

---

[1] عافیت اور آفت دو لفظوں کے ایک مصرع میں آنے سے جان پڑ گئی ہے۔ جو دونوں لفظ ظاہر میں ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ مگر معنی میں گویا متضاد ہیں۔ صنائع ایسی سلاست سے نظم ہوں جب قابل تعریف ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] حدیث قدسی جو اُوپر میں لکھ چکا ہوں۔ وہ اس موقع پر پھر پڑھ جانا چاہئے خصوصاً یہ فقرہ "فَاَنَا دِیَۃٌ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ میں خود اُس بندۂ مظلوم و مقتول کا خُون بہا ہُوں۔ اسی کا مضمون اس ٹیپ میں نظم ہے۔

یہ پچاس نمونے اس مقام پر میں نے لکھ دئے ہیں علاوہ اس کے اور کلام جابجا متفرق درج ہے مسلسل کلام جن صاحب کو دیکھنا ہو۔ وہ اس کتاب کی جلد ثانی ملاحظہ فرمائیں جو انشاء اللہ جلد اوّل کے بعد ہی چھپیگی بالکل تیار لکھی ہوئی ہے۔ یا اصل تین جلدیں دفتر ماتم کی جو لکھنؤ چوک۔ میر عبد الحسین صاحب تاجر کتب سے دس روپیہ عشرہ میں ملتی ہیں منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔ آپ لوگوں کی آسانی کے خیال سے میں نے جابجا مرثیوں کے مطلع لکھ لکھ دیا ہے۔ کہ وہ مرثیہ کس جلد میں چھپا ہے۔ آپ اصل مرثیہ اُسی جلد میں دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ جو انتخاب کلام غیر مطبوعہ غیر تقسیمی کا میں نے اُوپر کیا ہے۔ وہ اُن جلدوں میں نہیں ملیگا۔ بلکہ انشاء اللہ وہ کلام حیات دبیرؔ جلد ثانی میں آپکے ملاحظہ سے گذریگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

امام حسینؑ کی کارگذاری

ناظر۔ بن حق بین!!! اچھا اب مَیں اُن چیزوں کو بیان کرنا چاہتا ہُوں جو مرثیہ میں جناب مرزا مرحوم نے ایجاد فرمائی ہیں۔

باب ششم۔ ایجاداتِ دبیرؒ

فصل ۱

یہ بات اس کتاب کے دیکھنے والے سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ مرزا صاحب نے تخمیناً بارہ برس کی عمر میں مرثیہ پڑھنا اور کہنا شروع کیا۔ ۱۲۱۸ھ کی اُن کی پیدائش تھی ۱۲۳۰ھ میں تصنیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کا زمانہ تھا۔ تین چار برس میں مرزا صاحب کو لکھنؤ میں شہرت ہوگئی۔ کہ مجالس عزا کا بہت چرچا تھا۔ تصنیف کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۳۵ھ ہجری میں غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب ملا۔ ادھر بادشاہ اودھ کا سکّہ پڑا۔ ادھر دلوں پر اس شاہ نظم کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اُس زمانہ میں جو مرثیہ گو شاعر تھے۔ اُن میں سے ضمیر[1]۔ خلیق[2]۔ دلگیر[3]۔ فصیح[4] اُستاد مانے جاتے تھے۔ پس مرزا صاحب کے پُرانے مرثیوں کو اُن بزرگواروں کے مرثیوں سے ملانے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے بہت سی باتوں میں ایجاد و اختراع کی۔ ان چاروں مرثیہ گو شاعروں کی موجودگی میں ہی ملک نے مرزا صاحب کو مستند مرثیہ گو مان لیا تھا۔ جیسا کہ مَیں اُوپر فسانۂ عجائب کی عبارت سے (جو عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر میں کئی برس کی محنت شاقہ کے بعد مسجّع و مقفّٰی عبارت میں لکھا گیا) ثابت کر چکا ہُوں۔ میر انیس صاحب جو آج مرزا صاحب کے مدّ مقابل سمجھے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کی شاعری و شہرت کے عرصہ دراز ۳۵ یا ۴۰ سال کے بعد عہد امجد علی شاہ میں فیض آباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ اُس زمانہ تک مرزا صاحب کو اس قدر مقبولیت ہو چکی تھی۔ کہ شاہزادوں اور شاہزادیوں اور شرفا و اہل علم میں سے ہزاروں ان کے شاگرد تھے۔ شاگردوں کے شاگرد بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ

تذکرہ سراپا سخن میں صفحہ ۴۲ پر شاہزادہ والا گوہر قیصر (شاہزادہ دہلی) کو شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم کا شاگرد لکھا ہے۔ جناب ناسخ مرحوم اور حضرت آتش مغفور کے شاگردوں میں بھی جو صاحب مرثیہ کہنا چاہتے تھے۔ وہ اُن بزرگواروں کے حکم وارشاد سے مرثیہ اپنا مرزا صاحب کو دکھاتے تھے۔ چنانچہ منشی سید اسمعیل حسین صاحب منیر مرحوم شاگرد ناسخ مرحوم اور مولوی بہادر حسین صاحب و حید تلمیذ آتش مغفور اور بہت سے بزرگوار ایسے نظر آتے ہیں۔ اسی خیال سے مَیں نے ایک مستقل باب میں تلامذۂ مرزا صاحب کے حالات لوگوں سے دریافت کر کے لکھے ہیں ؛

اس تمام تمہید سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ جو باتیں میر ضمیر و میر خلیق و منشی دلگیر و مرزا فصیح مرحومین کے کلام میں نظر نہیں آتیں۔ اور دبیرؒ و انیسؒ کے کلام میں موجود ہیں۔ اُن کا شرف ایجاد و اختراع غالباً مرزا صاحب کو حاصل ہے۔ خصوصاً ایسے مرثیوں میں جو میری تحقیق کے موافق عہد امجد علی شاہ سے پہلے مرزا صاحب کہہ چکے ہیں۔ مگر یہ امر میرے اکثر احباب کو جو میر صاحب کے شاگرد یا طرفدار ہیں سخت ناگوار ہوگا۔ اور وہ غالباً اس بات کو مشکل سے قبول فرمائینگے۔ کہ یہ مرثئے عہد امجد علی شاہ سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ اس خیال سے اور نیز اس خیال سے کہ شاید کوئی بات اِدھر مرزا صاحب نے لکھنؤ میں اُدھر میر صاحب نے فیض آباد میں ایجاد کی ہو۔ اور ایک کو دُوسرے کی ایجاد و اختراع کی خبر نہ ہو[2]۔ مَیں ایسے ایجادوں میں (جو میر صاحب و مرزا صاحب کے یہاں نظر آتے ہیں) (میر و مرزا) دونوں بزرگواروں کو

[1] کتاب سراپا سخن عہد امجد علی شاہ میں شروع اور عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ختم ہوئی۔ اور جناب میر انیسؒ مرحوم کے لکھنؤ میں آنے اور شہرت پانے کا بھی یہی زمانہ ہے۔ اس زمانے میں میر صاحب مرحوم لکھنؤ میں آچکے تھے۔ مگر سراپا سخن میں اُن کا کلام و نام نہیں ہے حالانکہ اُن کے والد ماجد اور بھائیوں کا نام و کلام ہے۔ اُس وقت مرزا صاحب مرحوم کو اس قدر مقبولیت ہو چکی تھی۔ کہ اُن کے شاگردوں کے شاگرد ایسے ایسے ذی علم صاحب کمال شاہزادے نظر آتے ہیں جیسے شاہزادہ والا گوہر قیصر مرحوم ؛ مؤلف حقیر۔

[2] کیونکہ میر صاحب لکھنؤ میں آنے سے پہلے فیض آباد میں مرثیہ تو کہتے ہونگے۔ مشہور نہ ہونا دُوسری بات ہے ؛ ۱۲ مؤلف حقیر۔

شریک قرار دیتا ہُوں۔ اور ایسے ایجادوں کو اس باب میں بیان نہیں کرتا۔ اگر زندہ رہا، اور یہ کتاب دوبارہ چھپی۔ تو میں ایک ایسا باب بڑھا دُونگا۔ جس سے وہ تمام ایجادات اختراعات معلوم ہوں۔ جو میر و مرزا کے قبل نہ تھیں۔ اور انہیں کے کلام میں ہیں ؛

اس موقع پر صرف وہ ایجادات بیان کرتا ہُوں۔ جن کے موجد یقیناً مرزا صاحب ہیں۔ اور جو چیزیں میرے علم میں میر صاحب کے کلام میں نہیں ہیں۔ اور ان ایجادوں کو میں چند نمبروں میں لکھتا ہُوں :۔

مرثیہ میں حمد و نعت

(۱) مرثیہ کو حمد و نعت و منقبت سے شروع کیا۔ اور بادشاہ و مجتہدین عصر کی بھی مدح فرمائی۔ یہ مرثیہ بہت مشہور ہے۔ اور دفترِ ماتم کی جلد اوّل میں سب سے اوّل چھپا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے ؛

چہاردہ معصومین کے حال پر مراثی

(۲) چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حال میں علیحدہ علیحدہ مرثئے کہے۔ چنانچہ دفترِ ماتم کی چودہ جلدوں میں یہ ترتیب مبارک ہے۔ کہ ہر جلد ایک معصومؑ کے حال کے مرثیہ سے شروع ہُوئی ہے۔ ان مرثیوں کی تصنیف کی نسبت استاذی حضرت اوج مدظلہٗ فرماتے تھے۔ کہ نواب نادر مرزا صاحب فیض آبادی* نے مرزا صاحب کو فیض آباد میں زمانہ شاہی اودھ میں بُلوایا تھا۔ (یہ بزرگوار خاندان امرائے نیشاپور کے ایک ممبر تھے۔ چودہ ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے۔ خود بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزل میں جناب آتش مرحوم کے اور مرثیہ میں جناب مرزا صاحب مغفور کے شاگرد تھے) اور فرمائش کی تھی۔ کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مختصر مرثئے کہدیجئے۔ کہ ہر معصوم کی وفات کے دن میں مجلس کیا کرتا ہُوں۔ پڑھا کرونگا۔ مرزا صاحب فیض آباد سے جب چلے ہیں۔ تو اُن کے چند نوکر ہمرکاب آئے تھے۔ مرزا صاحب پالکی میں آئے تھے۔ راستہ میں

*: پروفیسر جناب آزاد مرحوم نے آب حیات کے صفحہ ۱۲ ۴ پر تلامذہ آتش مغفور کے ذکر میں ان کا نام لیا ہے۔ اور نامور شاگرد لکھ کر لکھا ہے۔ کہ رُتبۂ اُستادی رکھتے تھے ؛ مؤلف حقیر۔

یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے۔ لکھنؤ آکر جب اُن کے ملازم رخصت ہوئے۔ تو وہ تمام مرثیے مرزا صاحب نے اُن کے ہاتھ نواب صاحب کو بھجوا دئے۔ از بسکہ یہ مرثیے رواروی میں بہت جلد و مختصر کہے تھے۔ مرزا صاحب کا ارادہ یہ تھا۔ کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ طولانی اور کہونگا[1]۔ چنانچہ امام موسیٰ کاظم ؑ کے حال میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا۔ جو حسبِ حیثیت محفوظ ہے۔ مگر چند مرتبہ خود اُن مرحوم نے پڑھا تھا۔ اُس کی یہ ایک ٹیپ بہت مشہور و مقبول ہے۔ جس کو مرزا عبد التقی مرحوم نے بھی اپنی کتاب اخسا[2] میں لکھا ہے۔

(امام موسیٰ کاظم ؑ کے باب میں کہتے ہیں)

حضرت پر انتہائے اسیری گذر گئی   زندان میں جوانی و پیری گذر گئی

(۳۳) حال ولادت جناب امیر و جناب امام حسین ؑ میں تو اور بھی معاصرین مرزا صاحب کے مرثئے ہیں۔ مگر حال ولادت جناب عباس ؑ میں مرزا صاحب نے مرثیہ فرمایا جس کا مطلع مشہور یہ ہے۔ ؎ **انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباس ؑ**[3] اور حال ولادت جناب علی اکبر ؑ میں یہ مرثیہ فرمایا۔ ؎ **جب رونق مرقع کون و مکاں ہوئی**[4]

(۳۴) جناب امیر ؑ اور جناب فاطمہ زہرا ؑ کی شادی کا حال مرثیہ میں نظم فرمایا جس کا مطلع

مرثیہ میں حال ولادت

مرثیہ میں حال شادی

---

[1] پنجتن پاک ؑ کے حالات میں اُس کے بعد چند مرثئے کہے۔ جو دفتر ماتم میں چھپے ہیں۔ باقی ائمۂ اطہار ؑ کے حالات میں پھر شاید مرثئے کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف امام موسیٰ کاظم ؑ کے حال میں مرثیہ فرمایا۔ جو نہ تقسیم ہوا ہے نہ چھپا ہے۔ اور ایک لاجواب مرثیہ سُنا جاتا ہے ۔۔

[2] اخسا مناظرہ کی ایک مشہور و مقبول کتاب ہے۔ جو مرزا عبد التقی صاحب مینیجر رسالہ "روشنی" نے لکھی ہے۔ یہ مرحوم بھی ہمارے اُستاد بھائی اور عنایت فرما تھے۔ نہایت ذکی و ذہین تھے جس کی جھلک روشنی کے پرچوں میں ہے ۔۔ ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

[3] جلد دویم میں (دفتر ماتم کی) یہ مرثیہ (انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباس ؑ) چھپ چکا ہے ۔۔

[4] یہ مرثیہ جب رونق مرقع الخ جلد اول دفتر ماتم میں چھپا ہے ۔

مشہور یہ ہے۔ سہ جب فاطمہؓ سے عقد شہ لافتےٰ ہوا[1]۔ اسی طرح حال عقد جناب امیرؑ جو حمیدہ ام البنین سے ہوا تھا۔ مرثیہ مذکورہ (سہ انجیل مسیحؑ لب شبیرؑ ہیں عباسؑ) میں نظم فرمایا۔ اور حضرت عباسؑ کے عقد کا حال اس مرثیہ میں نظم کیا جس کا مطلع یہ ہے۔ سہ جب اختر یعقوب پہ کی مہر خدا نے[2]۔ یہ مرزا صاحب کا کمال قابل داد ہے۔ کہ حال ولادت یا حال شادی وغیرہ میں ہر مقام پر مرثیت کے پہلو نکالتے گئے ہیں۔ اور گویا ثابت کرتے گئے ہیں۔ کہ دنیا میں شادی و غم توام ہے ٭

فصل ۲ مرثیہ میں مناظرہ

(۵) مرزا صاحب کے زمانے میں ایک شخص نے بڑی شد و مد سے تعزیہ داری کا رد لکھا تھا۔ مرزا صاحب نے اُن کے رد میں ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے سہ اے شمع قلم انجمن افروز رقم ہو[3]۔ اور اس ایجاد کے ذریعہ سے فن مناظرہ کو بھی گویا مرثیہ میں داخل کر دیا۔ اس میں بھی یہی کمال کیا ہے۔ کہ مرثیت کو قائم رکھا ہے ٭

واقعہ قتل عام کربلا میں

(۶) مرزا صاحب کے عہد میں ترکوں نے کربلائے معلےٰ میں قتل عام کیا تھا جس میں بعض علمائے اسلام بھی شہید ہو گئے تھے۔ ازبسکہ علما کا قتل بالخصوص اہل علم کے دلوں پر بہت صدمہ پہنچاتا ہے۔ اسی عالم غم و رنج میں مرزا صاحب نے بھی (کہ اہل علم میں سے تھے) ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ سہ اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر[4]۔ یہاں رومیوں سے وہی رومی مراد تھے۔ جنہوں نے روضۂ اقدس میں یہ ظلم کیا تھا۔ عام رومی مراد نہیں ہو سکتے۔ کہ جو شریک ظلم نہ تھے۔ (عام رومیوں کو مرزا صاحب کب ظالم کہ سکتے

[1] یہ مرثیہ "جب فاطمہؓ سے عقد" الخ دفتر ماتم کی چودھویں جلد میں چھپا ہے ٭

[2] "جب اختر یعقوبؑ" الخ۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی نویں جلد میں چھپا ہے ٭

[3] "اے شمع قلم انجمن" الخ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپا ہے ٭

[4] "اے قہر خدا" الخ۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی بارھویں جلد میں ہے ٭

تھے۔ کیونکہ اُن میں تو اہل انصاف و اہل ایمان و اہل درد بھی تھے) اس مرثیہ میں کہیں مرثیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور جو جو واقعات اُن کو معلوم ہوتے تھے نظم کر دئے +

حالات تاریخی بطور مرثیہ

(۷) بطور حالات تاریخی ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ فہرست یہ شبیرؑ کے لشکر کی رقم ہے[۱] ۔ اس مرثیہ میں جناب علی اکبرؑ کی عمر کی نسبت لکھا ہے۔ کہ بعض مؤرخوں نے پچیس[۲۵] سال کی بھی عمر لکھی ہے۔ مگر مشہور اٹھارہ[۱۸] سال ہے پچیس سال کی عمر پر بہت لوگوں نے کان کھڑے کئے تھے۔ مگر علما نے مرزا صاحب کی تائید کی۔ اُس زمانے میں کتابیں نہ عام طور پر ملتی تھیں۔ نہ ایسے فارسی و اُردو میں ترجمے ہوئے تھے۔ اب تو علامہ ابن شہر آشوب رح مازندرانی کی کتاب مناقب بھی بمبئی میں چھپ کر مشتہر ہو چکی ہے۔ جس میں جناب علی اکبرؑ کی عمر کی نسبت دونوں روایتیں موجود ہیں۔ اس تحریر سے غرض یہ ہے۔ کہ بہت سی باتیں جو عربی کی نایاب و کمیاب کتابوں میں مقفل و محفوظ تھیں۔ مرزا صاحب کے اُردو مرثیوں کی بدولت ہندوستان میں مشہور ہوئیں +

حضرت زینبؑ کی زبانی امام حسینؑ کی کہانی

(۸) مرثیوں میں طرز بیان کے ہزاروں نئے نئے پہلو نکالے۔ چنانچہ دو مرثیوں میں (یکے بعد دیگرے) قید خانہ شام میں جناب سکینہؑ کے سو جانے کے لئے جناب زینبؑ کا کہانی کہنا بیان کیا ہے۔ اور وہ کہانی خود امام حسینؑ کی ہے۔ ایک مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎ جب کہ زنداں میں نبیؐ زادیوں کو رات ہوئی[۲] ۔ دوسرے کا یہ مطلع ہے ؎ جس دم اسیر عترت مشکل کشا ہوئی[۳] ۔ مرثیۂ اوّل الذکر حیثیت ہے۔ زبان اس کی سلیس و فصیح اور بیان دلکش زیادہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا

[۱] "فہرست یہ" الخ۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیسری جلد میں مطبوع ہوا ہے +

[۲] یہ مرثیہ "جب کہ زنداں میں" الخ دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں چھپا ہے +

[۳] یہ مرثیہ "جس دم اسیر عترت" الخ دفتر ماتم کی آٹھویں جلد میں چھپا ہے +

کوئی بی بی کہانی کہ رہی ہیں +

(۹) بہت سی روایتیں نظم کی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تواریخ و سیر و مقاتل وغیرہ کی کتابیں کثرت سے مرزا صاحب نے دیکھی تھیں چنانچہ یہ مرثیہ ؎ "جب رن میں بعد فتح عدو ایک شب[1] رہے" ایسا سلیس و فصیح ہے اور کربلا کے میدان وحشت ناک کا ایسا سماں دکھایا ہے۔ جس کو سن کر آدمی محو حیرت ہو جاتا ہے۔ روایت یہ نظم کی ہے۔ کہ ایک نصرانیہ تاجرہ کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت کے دو تین روز بعد آ نکلی ہے۔ اُس نے لاشوں کو دیکھا ہے۔ جب اس عورت نے علی اصغرؑ کی لاش دیکھی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں ؎

لب پر انگوٹھا منہ سے تبسم ہے آشکار + گویا پکارا چاہتا ہے ماں کو شیر خوار

جب دریا کے کنارے پر جناب عباسؑ کی لاش دیکھی ہے۔ تو کہتے ہیں ؎

مشکیزہ سوکھا ننھا سا سینے پہ برقرار گویا ہوا ہے داغ کلیجہ کا آشکار

اسی طرح ایک دوسرے مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ "واجب ہے شش جہت پہ تولائے[2] پنجتن" ایک دیندار با ہمت عاشق حسینؑ کی حکایت نظم کی ہے۔ کہ جس نے اس عزم بالجزم پر کمر ہمت چُست باندھی تھی۔ کہ سر امام حسینؑ شام سے لاکر نجف میں دفن کرونگا۔ مگر یہ شخص مفلس تھا۔ اس کی ناداری کو مرزا صاحب ایک نئے طرز سے بیان فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ؎ نادار اس قدر تھا کہ تھے اقربا بھی کم۔ سچ ہے۔ امیر آدمی کے سو عزیز بن جاتے ہیں۔ غریب کے عزیز قریب بھی رشتہ داری سے انکار کر جاتے ہیں۔ المختصر یہ شخص شام میں پہنچا۔ یزید کا نوکر و مقرب ہوا۔ اور آخر کار اُس کنوئیں کا محافظ (پاسبان) ہو گیا جس میں سر امام حسینؑ مقید تھا۔

[1] دفتر ماتم کی جلد دوم میں یہ مرثیہ چھپا ہے ؎ جب رن میں بعد فتح الخ +

[2] واجب ہے شش جہت پہ الخ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی دسویں جلد میں چھپا ہے +

روایات کثیرہ

اور ایک رات وہ سر کنوئیں سے نکال لیا۔ اس موقع پر کہتے ہیں۔ ~

ہات اپنا دھو کے ابرو وُجاں سے ایک رات — اُس چاہ سے نکالا سرِ شاہِ نیک ذات
بے آبرو زمیں میں ہوا چشمۂ حیات — اور آبروئے ہر دو جہاں آئی اُس کے ہات

سرِ ابنِ فاطمہؑ کا کنوئیں سے جُدا ہوا
نورِ خدا کا شعلہ دھوئیں سے جُدا ہوا

(لطفِ تشبیہات)

نکلی دہن سے شیشے کے نکہت گلاب کی — یا چاہِ مشرقی سے کرن آفتاب کی
یا آب و تابِ دُرج سے دُرِّ خوش آب کی — یا نافۂ بہشت سے بو مشکِ ناب کی

ذرّوں نے مہر سے کہا ماہی نے ماہ سے
شمعِ نبیؐ جُدا ہوئی فانوسِ چاہ سے

پھر آگے جا کر لکھا ہے۔ کہ یہ باہمت سرِ امام حسینؑ لا رہا تھا۔ کہ راستہ میں وہاں آکر اُترا۔ جہاں ایک تاجرہ عیسائی مع اپنی چالیس لونڈیوں کے فروکش تھی۔ اُس نے اوّل حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا۔ پھر سرِ امام حسینؑ دیکھ کر مسلمان ہوئی۔ یہ تمام مرثیہ نہایت سلیس و فصیح ہے۔ ہر واقعہ کی تصویر کھینچ کر دکھائی ہے۔ ہر موقع پر آمد معلوم ہوتی ہے۔ اورد کا گویا کہیں نام نہیں ہے۔ واقعات کی تصویریں دیکھنا ہو۔ تو ناظرین اس مرثیہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دو مرثئے بطور نمونہ میں نے لکھے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مرثئے ہیں۔ جن میں بہت سی روایات نظم کی ہیں۔ پس کسی واقعہ کے نظم کرنے والے شاعر کو جو کلام دبیر سے مدد ملتی ہے۔ دُوسرے کسی شاعر کے کلام سے نہیں مل سکتی۔ اور مختلف روایتوں کے نظم کرنے کے سبب سے جس کثرت سے الفاظ دبیر نے نظم کئے ہیں۔ دُوسرے کسی شاعر نے نہیں[1] کئے۔

[1] چنانچہ حالِ شہادت محمدؑ بن عباس علمدار میں مرزا صاحب کا مرثیہ ہے جس کا یہ مطلع ہے ع عباس گل رو دفتہ سلطان نجف ہے

(۱۰) پانی اور آگ کا مناظرہ عجیب عمدہ پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ اور ان دونوں عنصروں کے سبب سے جو ظلم اہلبیتؑ پر ہوئے۔ اُن کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎ آتش سے سبب دشمنی آب کا کیا ہے[۲]۔

(۱۱) امام حسینؑ کے قتل کے بعد ہی اُن مسلمانوں نے جو دل سے آلِ محمدؐ کے دوست تھے قاتلانِ امام حسینؑ کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ طوفانِ انتقام پانچ چھ برس تک اُٹھتا رہا جس سے یزید وغیرہ بنی اُمیّہ کی سلطنت کو بہت صدمہ پہنچا۔ ان بدلہ لینے والوں میں سے مسیب و سلیمان صرد وغیرہ کئی صحابی مقبول تھے۔ اور بعض اصحاب علیؑ و حسنینؑ علیہم السلام سے تھے۔ سب سے زیادہ جن دلیر جاں باز کو کامیابی ہوئی۔ وہ مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی ہیں۔ جنہوں نے ۶۴؁ھ کے قریب قریب ایک لشکر فراہم کر کے ابراہیمؒ ابن مالک اشتر رح کو سپہ سالار فوج بنا کر قریباً تمام قاتلانِ حسینؑ و اصحابِ حسینؑ کو قتل کیا۔ اور خوب ہی بدلا لیا۔ اس حال میں بھی مرزا صاحب نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ کہ ؎ جب تیغِ انتقام برہنہ خدا نے کی۔ ازبسکہ اس حال میں یہی ایک مرثیہ کہا گیا تھا۔ اور مرزا صاحب نے سخت محنت و کوشش سے کہا تھا۔ تمام مرثیہ لاجواب ہے۔ مرزا صاحب سے اکثر شاگردوں اور دوستوں نے مانگا۔ مگر انہوں نے نہ دیا۔ اب شاگردوں نے یہ تدبیر کی

(بقیہ نوٹ نمبر ۱) جلد ششم دفتر ماتم میں چھپا ہے۔ حال جنابِ زینبؑ بنت امیر المومنینؑ میں یہ مرثیہ اٹھویں جلد دفتر ماتم میں ہے ؎ جب دخترِ خالقِ قیامت ہوئی پیدا۔ جنابِ علیؑ اکبرؑ سے شادی ایک رئیس حلب نے اپنی دختر کی شادی چاہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎ جب دولتِ شبیر کو وہ مکان ہوئی۔ یہ جلد اوّل دفتر ماتم میں ہے۔ رتبہ بھر میں مرثیہ مرزا صاحب نے کہا تھا۔ ایک لاجواب مرثیہ ہے۔ راہِ شام میں ایک راہب سرِ امام حسینؑ دیکھ کر مسلمان ہوا۔ اس حال کو بھی مرثیے کے اخیر میں نظم کیا ہے جس کا مطلع ؎ آتش سے سبب دشمنی الخ ہے۔ شکیل سلطانِ روم عیسائی جو دربارِ یزید میں حاضر تھا اور سرِ امام حسینؑ و اہلبیتؑ کو دیکھ کر یزید سے حالات پوچھ کر مسلمان ہو کر شہید ہوا۔ اُس کا حال اس مرثیہ میں نظم کیا ہے ؎ دختر تاکِ امام گذر گیا۔ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیرھویں جلد میں چھپا ہے۔ راہِ شام میں جنابِ زینبؑ نے ایک مومنہ سے ملاقات کی جس نے اپنی دختر کا نام زینبؑ رکھا تھا۔ اس مرثیہ کا یہ مطلع ہے ؎ ذاکر کا تقاضا جب الفرات کی مختصر یہ کہ جس کثرت سے مرزا صاحب نے روایات نظم فرمائی ہیں کسی مرثیہ گو نے نہیں نظم کیں + ۱۲ مؤلف۔

[۲] مرثیہ ؎ آتش سے سبب دشمنی الخ جلد سوم دفتر ماتم میں چھپا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

نوٹ: پانی اور آگ کا مناظرہ

حال مختار منتقم خون حسینؑ

کہ جا بجا سے چند بند یاد کر لئے۔ اور ایک مجمع نے اور بند کہکر جا بجا لگا لئے۔ اور وہ پنچایتی مرثیہ لوگوں میں اس مطلع سے تقسیم ہوا ؎ **جب نخلِ انتقام میں تیغوں کے پھل لگے**۔ اس کارستانی کی مرزا صاحب کو بھی خبر ہوئی۔ اُنھوں نے جو بند نکل گئے تھے۔ اُن کے عوض اور بند کہے۔ جو پہلے بندوں سے بھی زیادہ چست ہیں۔ اکثر مرزا صاحب کے شاگردوں کا یہ خیال ہے۔ کہ مرزا صاحب کے اور تمام مرثیے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ایک طرف اور یہ ایک مرثیہ ایک طرف ہے۔ مَیں نے بھی اس کے چند بند جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ سے ایک مجلس میں (جو صفر ۱۳۲۳ھ میں بمقام لکھنؤ حسین آباد۔ رئیس منزل ہوئی تھی) سُنے۔ میرا خیال بھی یہ ہے۔ کہ اگر تمام مرثیوں کے برابر نہیں۔ تو ایک چوتھائی تصنیف کے برابر ضرور یہ ایک مرثیہ ہے۔ از بسکہ جناب اوج مدظلہ نے بھی ایک مرثیہ حالِ مختار میں کہا ہے۔ مَیں نے جناب ممدوح سے عرض کیا۔ کہ اب جناب مرحوم والا مرثیہ تقسیم فرما دیجے۔ کہ اُن کے زیادہ کمالات کا ملک میں اظہار ہو۔ فرمایا۔ کہ وصیّت جناب مرحوم کی مانع ہے۔ میرا مصنّفہ مرثیہ تو چاہے۔ تو مَیں تجھ کو دے سکتا ہوں ✤ المختصر اس حال میں بھی پہلے پہل مرثیہ کہنے کا فخر جناب مرحوم کو حاصل ہے ✤

(۱۲) اصحابِ امام حسینؑ میں سے صرف حضرت حُرِ ریاحی کے حال میں عام طور پر مرثیہ گویوں نے مرثیہ کہے ہیں۔ مگر حضرت حر کا سراپا پہلے پہل مرزا صاحب نے فرمایا۔ چنانچہ خود وہ اس دعوے کو نظم فرما گئے ہیں ؎

اب تک کسی نے حر کا سراپا نہیں کہا — گنجینۂ فیض سے ہے خدا کا بھرا ہوا

مضمون میرے حصّہ کا یہ تھا دھرا ہوا

علاوہ اس ایجاد کے حالات حبیبؓ ابن مظاہر اسدی و زہیر ابن قین بجلی و وہب ابن عبداللہ کلبی میں کہ یہ سب بزرگوار امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہوئے مرزا صاحب نے مستقل مرثیے کہے۔ اور عام طور پر مشتہر ہوئے۔ اور چھپے[۱]۔ مگر خود مرزا صاحب نے حبیبؓ ابن مظاہر کے

[۱] حالِ حبیبؓ ابن مظاہر کے مرثیہ کا یہ مطلع اوّل ہے ؎ معروف نگہ دشت شہنشاہ قلم ہے۔ دفتر ماتم کی چھٹی جلد

مرثیہ میں فرمایا ہے۔ کہ یہ ایجاد اُن کے اُستاد حضرت ضمیر مرحوم کی ہے۔ البتہ روایت جو اس حال میں نظم کی ہے۔ اُس کا میں موجد ہوں ❊

فصل سوم
چار سعود مرثیہ

(۱۴۳) میر ضمیر (مرحوم) کے زمانے سے پہلے عموماً چھوٹے چھوٹے بندیہ مرثئے کہے جاتے تھے۔ اور اکثر مرثیہ گو اپنے مرثئے سوزخوانوں سے پڑھواتے تھے۔ بعض خود بھی پڑھتے تھے تو بتاتے نہ تھے۔ میر ضمیر صاحب نے منبر پر ہاتھ اور اشارات چشم و ابرو سے بتانا شروع کیا۔ اور مرثیہ میں سراپا۔ لڑائی۔ رجز وغیرہ بڑھایا۔ اور عموماً مرثیوں کو ان چار بحروں میں کہا۔ رمل۔ ہزج۔ مضارع۔ مجتث[۲] کیونکہ مختلف راگوں کے سبب سے مختلف بحروں میں مرثئے زیادہ تر سوزخواں ہی کہواتے تھے۔ اب گویا وہ ضرورت باقی نہ رہی۔ کہ میر ضمیر صاحب اپنا مرثیہ خود پڑھتے تھے۔ اُس زمانہ کے سوزخواں یا شعرائے سابق سکندر۔ سودا۔ احسان۔ افسردہ وغیرہ کے مرثئے پڑھتے تھے۔ یا خلیق و دلگیر مرحوم کے۔ ان چار بحروں کے خاص کر لینے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی۔ کہ تحت لفظ پڑھنے میں جس قدر ان بحروں میں رنگ ہوتا ہے۔ دُوسرے بحروں میں نہیں ہوتا۔ دُوسرے اکثر ایسے شاگرد بھی مرثیہ کہتے تھے۔ جو علم عروض سے ناواقف ہوتے تھے۔ اور ان بحروں میں وہ شخص جو بالطبع موزون ہو بغیر علم عروض پڑھے ہوئے بھی مرثیہ کہہ سکتا ہے۔ دُوسرے بحروں میں یہ بات مشکل ہے۔ اب جبکہ مرزا صاحب کی شہرت کمال ہوئی۔ اور سوزخواں پُرانے مرثیہ پڑھتے پڑھتے

(بقیہ حاشیہ نوٹ نمبر۱) میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ اور حال زہیر بن قین بجلی میں یہ مرثیہ ہے ؎ جب نقش کُن سے زینت لوح لقا ہوئی۔ دفتر ماتم کی گیارھویں جلد میں یہ مرثیہ چھپا ہے۔ اور حال وہب ابن عبداللہ میں یہ مرثیہ ؎ مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ۔ دفتر ماتم کی پانچویں جلد میں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] بحر رمل ؎ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر۔ بحر مجتث ؎ روانہ نہ لیں کو جو شیر خوار ہوا۔ بحر ہزج ؎ اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے۔ بحر مضارع ؎ فولاد کی ضریح میں کس کا مزار ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُکتا گئے۔ تو اُنہوں نے مرزا صاحب کو آگھیرا۔ اور مختلف راگ راگنیوں کے اُتار چڑھاؤ کے لحاظ سے مختلف بحروں میں مرثیہ چاہے۔ مرزا صاحب ایک تو قدرتی شاعر۔ دُوسرے علم عروض سے بخوبی ماہر تھے (چنانچہ وہ خود اس کا فخر بہ اشارہ ایک مرثیہ میں کرتے ہیں ؎ ہر بحر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی) اس لئے مختلف بحروں میں بھی سوزخوانوں کو مرثیہ کہدئے۔ چنانچہ چار معروف بحروں کے علاوہ حسب ذیل مرثیہ مختلف بحروں میں (مرزا صاحب کے) ہیں:۔

مختلف بحورِ مرثیہ

نمبر	مطلع مرثیہ	نمبر جلد دفتر ماتم کا جس میں یہ مرثیہ چھپا ہے
۱	روزِ دہم کا یہ ماجرا ہے	جلد سوّم[۳]
۲	عزیزو آج پہلی رات ہے ماہ محرم کی	ایضاً
۳	جب رہے میدان میں تنہا حسینؑ	جلد چہارم
۴	جعفر صادقؑ کا رُتبہ خلق میں مشہور ہے	جلد ہشتم
۵	جب شب عاشور سے نور سحر پیدا ہُوا	ایضاً
۶	جب اہلبیتؑ آئے لاشوں پہ اقربا کے	ایضاً
۷	جب صف آرائی کی میدان میں سپاہ شام نے	جلد دوازدہم[۱۲]

مسدس مرثیہ از سکندر و سودا

سکندر و سودا کے وقت میں مرثیہ عموماً مربع (چو مصرع) کہے جاتے تھے۔ پہلے پہل سکندر نے یہ مسدس مرثیہ کہا ؎ ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول۔ اور سودا نے بھی ایک مسدس مرثیہ نہ معلوم اس سے قبل یا بعد کہا۔ ضمیرؔ و خلیقؔ و فصیحؔ و دلگیرؔ کے مرثئے عموماً مسدس ہیں۔ مرزا صاحب سے کسی سوزخواں نے فرمائش کی۔ کہ اس سودا کے مربع مرثئے پر مربع مرثیہ کہدیجئے۔ ؎ یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے۔ مرزا صاحب نے یہ مرثیہ مربع کہا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے۔ مگر مقطع میں سودا مرحوم کے فضل تقدم کا صاف اعتراف کیا۔ کہتے ہیں۔ بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب۔ سودا کے مرثئے کا تو ممکن نہیں جواب۔

مربع مرثیہ از دبیر مرحوم کا

پرفضل حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب۔ کافی ہے تجھ کو بخشش محشر کے واسطے۔ یہ مرثیہ بھی دفتر ماتم کی چوتھی جلد میں چھپا ہے +

ایک مرثیہ میں جا بجا کئی مطلع

(۱۴) یہ بھی ایجادات مرزا صاحب سے ہے۔ کہ ایک ایک مرثیہ میں جا بجا رخصت لڑائی شہادت وغیرہ کے موقع پر کئی مطلع کہ دیتے ہیں۔ اس سے حسب ذیل فائدے ہوئے:

(۱) مجلس مختصر میں جس مطلع سے چاہو۔ چند بند پڑھ دو۔ اچھا رنگ ہو جائیگا۔ گویا ایک استاد کامل فن کی (طلائی حلقہ دار) زنجیر بنائی ہوئی ہے۔ کہ جس جس حلقہ پر کاریگر نے نشان کر دیا ہے۔ وہاں سے چاہو۔ تو اُن حلقوں کو نکال کر ایک زنجیر کی کئی خوشنما زنجیریں بنا کر کام میں لاؤ +

(۲) اگر ایک ہزار مرثئے مرزا صاحب نے کہے۔ تو خواہ مخواہ پانچ ہزار یا چھ ہزار مرثئے مشہور ہوئے +

(۳) اکثر سوز خوانوں کو طیار مرثئے ملے۔ کہ ایک مطلع سے انہوں نے چند بند لے لئے اور پڑھ دئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مرزا صاحب کا کلام سوز میں بھی جس کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ دوسرے مرثیہ گو شاعر کا کلام نہیں پڑھا جاتا +

احکام ذبیحہ

(۱۵) شرع اسلام میں ذبیحہ (عید اضحیٰ) کے واسطے جس قدر شرائط (کتب فقہ میں) ہیں سب کو ایک مقام پر بطور تمہید بیان فرما کر (صاحب ذبح عظیم) امام حسینؑ کی تشنہ دہنی اور مصائب ذبح و قتل کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے۔ ؎
آہوئے کعبۂ قربانی داور ہے حسینؑ[۱]۔ اور زیارت ناحیہ مقدسہ کے اکثر فقرات کا اس مرثیہ میں مطلب بیان کیا ہے ؎ کیا شان روضہ خلف بوتراب[۲] ہے +

سلام میں حالات مسلسل

(۱۶) سلام میں بھی مرزا صاحب نے ایک خاص بات ایجاد کی۔ وہ یہ کہ کسی واقعہ مسلسل کو دس پندرہ بیس شعروں میں (بطور قطعہ) نظم کیا۔ جیسے حضرت حر اور ابن سعد کی گفتگو

---

[۱] آہوئے کعبہ الخ۔ یہ مرثیہ جلد دوم دفتر ماتم میں چھپا ہے +

[۲] کیا شان روضہ خلف الخ۔ یہ مرثیہ چوتھی جلد دفتر ماتم میں چھپا ہے + ۳۰۷ شوکت۔

یا جنابِ زینبؑ اور ہندزوجہ یزید کی قیدخانہ شام میں بات چیت یا اور کوئی واقعہ +

چنانچہ اُن کے اور اُن کے شاگردوں کے سلاموں میں ایسے قطعے کثرت سے پائے جاتے ہیں ※۔ اور جب ذاکر اس قطعہ کو مسلسل طور پر ایک سانس میں پڑھتا ہے جب اور بھی یہ نظم مجلس عزا میں خوش نما معلوم ہوتی ہے +

اس زمانہ کے بعض مغربی تعلیم یافتہ (اہل علم) ہماری غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلسل مضامین غزل میں نہیں ہوتے۔ ہرچند اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کہ غزل کے ہر شعر کا مضمون علیحدہ ہونا بہتر ہے۔ یا مسلسل ہونا۔ کیونکہ جس طرح ایک قسم کے کھانے سے آدمی اُکتا کر چاہتا ہے۔ کہ دُوسرے مزہ کا اب طعام ملے۔ اُسی طرح ایک ہی حال مسلسل کو دیکھتے دیکھتے دل چاہتا ہے۔ کہ اب دُوسرا حال دیکھوں۔ بہرحال سلام میں (جو گویا غزل کی ایک شاخ ہے) یہ ایجاد مرزا صاحب مرحوم ہی نے اپنی طبع موزون سے فرمایا۔ کہ اُن کے معاصر شعرا قطعہ کو عجز طبیعت شاعر سمجھے ہوئے تھے۔ (کہ جب ایک شعر میں مضمون نہ آسکتا تھا۔ تو دُوسرے اور تیسرے شعر میں کہتے تھے)۔ مگر مرزا صاحب اور اُن کے شاگردوں نے لمبے لمبے قطعے عمداً مختلف واقعات کے نظم کر دئے۔ اور بتا دیا۔ کہ یہ بھی شاعر کی کمال کی دلیل ہے۔ عجز طبیعت نہیں ہے +

باب دہم ۔ تعداد کلام مرزا صاحب

فصل ۱

مرزا صاحب کا یہ کمال تمام ملک میں مشہور و مسلّم ہے۔ کہ وہ بہت جلد اور کثرت سے کہتے تھے۔ اور پھر اچھا کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ خدا نے اُن کو شاعر پیدا کیا تھا۔

※ میر عبدالوہاب (وہاب) رئیس حیدرآباد مرحوم نے ایک سلام کے قطعہ میں جناب علی اکبر کا میدان میں آنا رجز سراپا رزم سب کچھ نظم کر کے آخر میں کئی شعر کہکر ختم کیا ہے۔ گویا پورا ایک مرثیہ ایک قطعہ میں ہے۔ یہ سلام دفتر ماتم میں چھپ چکا ہے اور مرزا صاحب مرحوم کا اصلاحی ہے۔ مجھے اس کا ایک شعر بہت پسند ہے جس کا مضمون بالکل اچھوتا ہے۔ وہ یہ ہے سکی کی یاں نہیں سُوئی گی میں بھی آرام ۔ دہن میں سوزن ہے اور گردن آسیا کیلئے ۔ ۱۲ مولف

لیکن کسی ناقل یا تذکرہ نویس نے اُن کے کلام کی صحیح تعداد نہیں بیان کی کسی نے اُن کے فقط مرثیوں کی تعداد دس ہزار لکھ دی[1] کسی نے تین ہزار۔ اس تین تیرہ میں اصلی مقدار کلام کی ابتک نہ معلوم ہو سکی۔ مگر قبل اس کے کہ میں موجودہ کلام کی مقدار لکھوں یہ کہنا چاہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب کے ہزاروں مرثئے مشہور ہونے کی چند وجوہ ذیل ہیں:-

مرزا صاحب کے ہزاروں مرثئے مشہور ہونے کی وجوہ

(۱) وہ جب کبھی طبیعت حاضر ہوتی تھی۔ تو دو دو چار چار گھنٹہ میں ستّر ستّر اسّی اسّی بند کہکر اُٹھتے تھے۔ اس سماں کے دیکھنے والے (اہل بصیرت) بحمد اللہ ابتک موجود ہیں جیسا کہ میں نے اسی کتاب میں ایک جگہ اپنے محسن ڈپٹی حاجی سیّد جعفر حسین صاحب لندنی جعفری بہرسری کے خط کے حوالے سے میر باقر حسین صاحب بہرسری وکیل ریاست جے پور کی زبانی ایک اُن کی چشم دید حکایت لکھی ہے۔ کہ ان کے روبرو دو کاتبوں کو چار پانچ گھنٹے میں ۱۲۰ بند کہکر لکھوا دئے تھے پس ایسے واقعات دیکھنے والے ضرور یہ خیال فرماتے ہیں۔ کہ ہزاروں مرثئے کہے ہونگے۔ کہ اُنہوں نے تمام عمر گویا یہی کام کیا[2]+

زمانۂ تصنیف ۶۲ برس

(۲) مرزا صاحب نے ۷۴ برس کی عمر پائی۔ بارہ[12] برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ۶۲ برس کامل اس کام کو کیا۔ برسوں یہ ربط رہا کہ ہر مہینے میں کم سے کم ایک مرثیہ ضرور کہکر اپنی گھر مجلس میں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ میں مفصّل ایک دُوسرے مقام پر لکھ چکا ہُوں۔ اور بعض مہینے میں دو دو تین تین مرثئے کہ لیتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے

---

[1] آبِ حیات کے صفحہ ۵۵۴ پر حضرت آزاد مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے اس مدت عمر ۷۲ سال میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ کہا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ پھر صفحہ ۵۵۷ پر مضامین مرثیہ کی تفصیلی حالت لکھکر (جناب میر انیس مرحوم کے حالات لکھتے ہُوئے جناب آزاد مغفور) تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے کم سے کم دس[1] ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔ اور سلاموں کا کوئی شمار ہے۔ رباعیاں تو باتیں تھیں + ۱۲ مؤلّف حقیر۔

[2] پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی غالباً کسی معتبر ذی علم راوی سے ایسی ایسی غلط حکایتیں سُن کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ دس ہزار مرثئے ضرور کہے ہونگے + ۱۲ مؤلّف۔

مرثئے اس سے بھی زیادہ۔ اس خیالی حساب سے بھی نوبت سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں پر پہنچتی ہے +

(۳) بعض موقع پر رات بھر میں مرثیہ کہا۔ اور پڑھ دیا۔ جیساکہ اس مرثیہ کی نسبت مشہور ہے۔ ؎ جب رونق مرقع کون و مکاں ہوئی۔ اس کا واقعہ بھی میں ایک جگہ مفصل لکھ چکا ہوں +

(۴) بعض موقع پر تین چار گھنٹہ میں ایک مرثیہ کہا اور پڑھ دیا چنانچہ ایک مرثیہ کے مقطع میں خود کہتے ہیں۔ ع کل چار ساعتوں میں ہے یہ مرثیہ کہا +

(۵) اکثر دوستوں اور شاگردوں کی فرمائش سے کبھی مرثیہ لکھکر انہیں کا تخلص ڈال دیا کرتے تھے۔ اور اُن مرثیوں میں اُن پابندیوں کا لحاظ بھی کم رکھتے تھے۔ جو اپنے خاص مرثیوں میں رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء میں تحقیق کرنے پر بعض رشتہ داران و متوسلین سلطان عالیہ مرحومہ کے پاس مرزا صاحب کے ساٹھ ستر مرثئے ایسے فصیح و سلیس سُنے گئے۔ کہ بعض بند کے بند گویا نثر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے چاہا بھی۔ کہ کچھ روپیہ صرف کر کے اس دُرِ بے بہا کو لے لوُں۔ اور ملک کے سامنے پیش کر دُوں۔ کہ وہ مرثئے جناب مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس بھی نہیں ہیں۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح جناب میر دستور علی صاحب بلگرامی سلمہ اللہ والبقاہ منصرم جی و پرائیویٹ سکرٹری راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ مرزا صاحب کی تصنیفات سے اُن کے پاس ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جو نہ مرزا اوج صاحب کے پاس ہے۔ نہ اور کہیں۔ اس مجموعہ کا نام "دفتر پریشان" ہے۔ وہ سب ایک بحر میں ہے۔ اس میں ۳۰ بتیس چہرے ۳۰ بتیس رخصتیں ۳۰ بتیس لڑائیاں ۳۰ بتیس رجز ۳۰ بتیس سراپا ۳۰ بتیس بین و بیان شہادت نظم ہیں۔ تاکہ ذاکر جب چاہے ایک مرثیہ نیا ترتیب دے لے۔ اور پڑھ دے۔ میر صاحب ممدوح کے والد ماجد مرزا صاحب کے شاگرد اور اُن کے دادا جناب میر ضمیر مرحوم کے شاگرد تھے مرزا صاحب نے

رات بھر میں ایک مرثیہ کہا

تین چار گھنٹہ میں مرثیہ

دفعہ مرثیوں کو لکھکر دوسرے کا تخلص ڈال دیا

دفتر پریشان

یہ مجموعہ اُن کے دادا (اپنے اُستاد بھائی) کو دیا تھا جو ابتک اُن کے پاس چلا آتا ہے۔ میر صاحب نے باتوں باتوں میں اُس مجموعہ خوبی کے بعض مصرع سُنائے تھے۔ جو مَیں نے لکھ لئے تھے۔ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہُوں۔ ایک موقع پر جہاں ایک پہلوان کی (امام حسینؑ سے) لڑائی نظم کی ہے۔ امام حسینؑ کی زبانی کہتے ہیں۔ (اے کاش) یہ معرکہ شبیہ پیمبرؐ بھی دیکھتے۔ لڑنا ضعیف باپ کا اکبرؑ بھی دیکھتے۔ اسی موقع کے قریب کا ایک بند حسب ذیل سُنایا تھا ؎

تلوار کی چمک سے ہلا دشت ہولناک | نابین تھیں اُس کی رشتۂ تسبیح خاک پاک
جس جوہروں پہ اُس کے جمی کربلا کی خاک | غُل تھا کہ بس عدو سے امام اب ہوئے ہلاک

کاٹو نگی سر قسم یہی کھائی ہے تیغ نے
تسبیح خاک پاک اُٹھائی ہے تیغ نے

ایک ٹیپ یہ بھی پڑھی تھی۔ ؎

مشکل کشا کا ذکر قوی ہیکلوں میں ہے | پہلے سے آب تیغ کی گرمی گلوں میں ہے

اسی طرح وہ مرثیہ جو مرزا صاحب نے جناب مجتہد العصر علامۂ جائسی مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ کو دیا تھا۔ اور جس کا ایک مصرع اُن جناب نے یہ تحریر فرمایا ہے۔ ع اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے۔ نہ اب جناب کے پاس ہے۔ نہ مرزا اوج صاحب کے یہاں ہے۔ نہ اور کہیں ملتا ہے*۔ پس اس طرح سینکڑوں یا ہزاروں مرثئے مرزا مرحوم کی طبعی سخاوت و بے پروائی کی نذر ہو گئے۔ بہت کلام غدر ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ سیکڑوں مرثئے

* مرزا صاحب کے بہت سے مرثئے اس طرح بھی تلف ہوئے کہ مرثیہ پڑھ کر وہ منبر سے اُترے اور کسی ایسے دوست یا شاگرد نے مانگ لیا جن کا سوال رد کرنا مرزا صاحب کی خوش خلاقی کے خلاف تھا۔ مرزا صاحب نے کہہ یا نقل کرکے دو روز میں واپس دیجیگا۔ وہ کسی مجبوری میں مبتلا ہو گئے اور مرثیہ واپس نہ کر سکے۔ اور وہ مرثیہ تلف ہو گیا۔ یہ تو خوش معاملہ لوگوں کا ذکر تھا۔ اب سے وہ لوگ جو مرثیہ لیکر دبا رکھنا بد خلاقی سمجھتے ہیں۔ اور مرثیہ و تسبیح کو مال وقف سمجھے ہوئے ہیں اُن سے تو مرثیہ واپس ملنا ہی محال ہے مجھے خود ایسے لوگوں کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور بعض مرثئے ایسے احباب نما غارتگروں کی نذر کر چکا ہُوں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

دُوسروں کے نام سے شائع و مشتہر ہو کر تلف ہو ہو گئے۔ مگر سخاوت کا عوض ضرور ملتا ہے۔ اس کا بدلا بظاہر یہ ملنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج بہت سے مرزا صاحب کے شاگردوں کے مرثئے اُن کے نام سے مشہور ہیں۔ ازبسکہ یہ سب قلمی ہیں۔ کچھ دنوں میں یا تلف ہو جاینگے۔ یا دُوسرے مرثیہ گو شعرا وغیرہ کچھ تغیر کر کے اپنے نام سے منسوب کرینگے۔ اسی خیال سے میرا عزم ہے۔ کہ اس حیات دبیر کی تالیف و طبع سے فارغ ہو کر بشرط حیات مرزا صاحب کے تلامذہ کے مرثیوں کی چند جلدیں چھپوا دوں +

ایک مرثیہ میں پانچ چھ مطلع

(۶) ایک ایک مرثئے میں پانچ پانچ چھ چھ مطلع کہنے کے سبب سے بھی مرزا صاحب نے اگر ایک ہزار مرثئے کہے ہونگے۔ تو پانچ سات یا دس ہزار مشہور ہو گئے +

ذخیرۂ کلام

بہر حال اب جو مرزا صاحب کا کلام میرے علم میں موجود ہے۔ وہ حسب ذیل دو قسم کا ہے۔ (۱) **مطبوعہ** (۲) **غیر مطبوعہ**۔ مطبوعہ کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مطبع اودھ اخبار میں دو جلدوں میں چھپا ہے۔ دُوسرا وہ جو اور مصنّفوں کے کلام کے ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مرثئے چھپے ہیں۔ ان سب مرثیوں میں اکثر کلام غلط اور ایسا پیوندی کلام شامل ہے۔ جس کا چھانٹنا دشوار ہے۔ بلکہ مطبع اودھ اخبار کی جلدوں میں تو بعض مرثئے ایسے ہیں۔ جن کا ایک بند بھی کلام مرزا صاحب سے نہیں ہے۔ جیسے یہ مرثیہ؎ ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ مرزا نظیر برادر مرزا دبیر مرحوم کی تصنیف ہے۔ پیوندی مرثیوں میں اب یہ امتیاز کرنا کہ کون سا بند مرزا صاحب کا ہے کونسا دُوسرے کا ہے بہت مشکل ہے + پیوندی یا

پیوندی مرثئے

اصلی مرثیوں کی یہ کیفیت ہے۔ کہ ذاکروں میں یہ عادت جاری تھی۔ اور اب بھی ہے۔ کہ پانچ سات مرثیوں کے چُست چُست بند چھانٹ کر ایک مرثیہ کسی ذاکر نے بنا لیا۔ اور پڑھا۔ ظاہر ہے کہ معمولی مرثیہ سے زیادہ اُس پر مجلس میں رنگ ہوگا۔ خربزے کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے۔ (مثل مشہور ہے) اب جو دُوسرا ذاکر ذاکر اول کا مدمقابل منبر پر گیا۔ تو اُس نے بھی یہ سمجھ کر کہ معمولی مرثئے پر شاید یہ رنگ نہ ہو۔ ایسا ہی پیوندی مرثیہ

پڑھ کر کامیابی حاصل کی۔ کبھی کبھی مَیں خود بھی ایسے جرم اخلاقی کا مرتکب ہُوا ہُوں مگر کب جب کہ دُوسرے ذاکر نے پیوندی مرثیہ پڑھا۔ مَیں نے بھی ایسا ہی کیا۔ چنانچہ قدر بلگرامی قدیر مرحوم اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں۔ ؎

اپنا ہی کلام ہم تو پڑھتے ہیں قدیر + اور یاروں کا ہر مرثیہ پیوندی ہے

تیسری قسم کلام مطبوعہ کی وہ بیس جلدیں دفتر ماتم کی ہیں۔ جو یکجائی میر عبد الحسین صاحب دس روپیہ میں بیچتے ہیں۔ ان میں بھی بعض کلام غیر (بعض مرثئے کے مرثئے اور بعض بند کلام غیر کے) شامل ہے۔ جن کا امتیاز مشکل ہے۔ مَیں آگے چل کر دفتر ماتم کے بعض مرثیوں کی نسبت مع دلیل یہ رائے ظاہر کرونگا۔ کہ وہ مرزا صاحب کی تصنیف نہیں ہے۔ البتہ بند جو جابجا مخلوط ہیں۔ اُن کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرنے سے مجبور ہُوں۔ کہ اتنی چھان بنان کا وقت و فرصت نہیں ہے۔ ایسے مرثئے چھپ جانے کی وجہ یہ معلوم ہُوئی۔ کہ جب یہ مرثئے چھپنا شروع ہوئے تو مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس بہت تھوڑے مرثئے تھے۔ اُنہوں نے جابجا سے مرثئے منگوا کر مطبع کو دئے۔ وہ اکثر شاگردوں کے پاس کے تھے۔ جن میں شاگرد پیوند لگا چکے تھے۔ اُن کا علیحدہ کرنا امر دشوار تھا۔ وہ اسی طرح چھپ گئے۔ یہ حال مجھے یُوں معلوم ہُوا۔ کہ اُسی زمانے میں مرزا اوج صاحب نے کچھ مرثئے میرے نانا ظہیر (مرحوم) سے بھی منگائے تھے۔ ان اکثر مرثیوں میں ترتیب اصلی وقت تصنیف کی قائم نہیں رہی۔ اور بعض مقام سے بعض مرثئے غیر مسلسل نظر آتے ہیں +

ان دفتر ماتم کی ۱۴ جلدوں کے مرثیوں کی تعداد ۲۶۶ حسب شرح تحت ہے۔ اور یہ سب بجز ایک مرثیہ مربّع کے (جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے) مسدّس ہیں +

فصل ۲ تعداد مراثی دفتر ماتم

تفصیل و تعداد مرثیہ ہائے دفتر ماتم جلد وار

نمبر شمار	تعداد مرثیوں کی	نمبر شمار	تعداد مرثیوں کی
۱	۲۵	۲	۲۵
۳	۲۹	۴	۲۷
۵	۲۷	۶	۲۹
۷	۲۵	۸	۳۰
۹	۲۶	۱۰	۲۷
۱۱	۲۵	۱۲	۲۹
۱۳	۲۳	۱۴	۱۹
میزان			۳۶۶

تفصیل دیگر مطبوعہ کلام

دفتر ماتم کی پندرھویں جلد میں مثنوی ہے۔ جس کا نام احسن القصص ہے۔ اس میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حالات ولادت و فضائل و معجزات کو نظم کیا ہے۔ معراج نامہ بھی اس میں ہے۔ اس مثنوی کی نسبت میری یہ رائے ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم نے بہت رواروی میں کہی ہے۔ اور بندش و زبان سے ابتدائی مشق کی تصنیف پائی جاتی ہے۔ کہ جو شان اُن کے اعلےٰ درجہ کے مرثیوں میں ہے۔ وہ اس مثنوی میں نہیں نظر آتی۔ اور میری رائے میں اُن کے شاگرد رشید منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر مرحوم کی مثنوی معراج المضامین مرزا صاحب کی مثنوی سے بہتر ہے۔ دفتر ماتم کی سولھویں (۱۱۰) سترھویں (۱۲۴) اٹھارھویں (۹۸) جلد میں الف سے لیکر ی تک ۳۳۲ مسلسل ردیف وار سلام ہیں۔ ان میں بعض بعض مرزا صاحب کے شاگردوں کے بھی سلام ہیں۔ جن کا حال مقطع سلام سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ہیچمدان کے بھی تین چار سلام ہیں۔

ان سلاموں میں بھی چُست وسُست ہر قسم کا کلام ہے - اور سب سے زیادہ سُست میرا کلام ہے - انیسویں جلد میں ۴۶ مخمس سلاموں پر ہیں - اسی میں وہ مخمس بھی ہے - جو ہفت بند ملا کاشی علیہ الرحمہ پر فارسی میں مصرع لگا کر مرزا صاحب نے مخمس کیا ہے - اور جو اس سے پہلے شمس المشرقین کے نام سے چھپ چکا تھا مصرع اکثر ایسے اچھے لگائے ہیں - کہ پانچوں مصرع ایک شخص کے معلوم ہوتے ہیں - یہی حال اکثر مخمسوں کا ہے - اور یہی کیفیت ہفت بند ملا کاشی کے خمسہ کی نظر آتی ہے - اہل زبان (ایرانی) کے کلام پر ایسے مصرع لگانا کہ جو کل کلام اہل زبان کا معلوم ہو - بیشک کمال مرزا مرحوم کا ہے - اور یہ بات ہر ہندی شاعر کو نصیب نہیں ہوتی*

رباعیاں نوحے وقطعات وغیرہ

دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں ردیف وار رباعیاں اور نوحے اور واقعات اور تضمینیں اور مناجات وقطعات وغیرہ متفرق کلام ہے - جن کی تعداد سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں پر پہنچتی ہے - ان میں بھی چُست وسُست کلام ہر رنگ کا ہے +

قصیدہ

دفتر ماتم میں کوئی قصیدہ مرزا صاحب کا نہیں چھپا - مگر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ نے اپنی کتاب علم عروض (مقیاس) میں جو ایک قصیدہ مرزا صاحب مرحوم کا بجواب قصیدہ رشید وطواط لکھا ہے - اُس سے اندازہ ہوتا ہے - کہ وہ قصیدہ اوسط درجہ کا کہتے تھے - اور اگر اُن کو زیادہ قصائد کہنے کا موقع ملتا - تو غالباً جمیع اصناف سخن سے وہ قصیدہ بہتر کہتے - کیونکہ اُن کے بعض مرثیوں میں بھی بعض موقع پر قصیدہ کی لطیف شان نظر آتی ہے +

ازبسکہ میں کلام مطبوعہ کا حال لکھ رہا ہوں - اس لئے اس موقع پر وہ فہرست بھی پیش

* ایرانیوں کے ساتھ برسوں رہنے اور بولنے کے بعد یہ بات حاصل ہوتی ہے - مرزا صاحب کے ایک استاد مجتہد مازندرانی تھے - جن کا ذکر میں کر چکا ہوں - غالباً یہ انہیں کے تلمذ وصحبت کا فیض ہے - بعد اس قدر لکھنے کے مجھے جناب استاذ مکرم حضرت اوج مدظلہ سے معلوم ہوا - کہ شمس المشرقین پر اُن مجتہد مازندرانی (طاب ثراہ) کی اصلاح ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

کردوں۔ جو مرثئے سرسری نظر سے دیکھنے پر مجھے مرزا صاحب کے نہیں معلوم ہوئے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

نمبر	مطلع مرثیہ کا	کس جلد میں ہے	کیفیت
۱	جو زائرِ حسین علیہ السلام ہو	۲	مرزا مرحوم کی زبان نہیں معلوم ہوتی اس لئے اُن کا کلام نہیں ہے۔
۲	شیرِ خدا کا شیر ہے آہوئے مصطفےٰ	۵	ایضاً
۳	عباسؑ کو جو سبطِ نبیؐ نے علم دیا	۷	نہ مرزا صاحب کی زبان ہے۔ نہ طرزِ بیان ہے۔ غالباً اُن کے کسی شاگرد کا ہے۔
۴	شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضےٰ	۸	زبان سے بھی مشیر مرحوم کا معلوم ہوتا ہے۔ اور مجھے تحقیق بھی ایسا ہی ہُوا ہے۔
۵	یارو غمِ حسینؑ کی عزّت عظیم ہے	۹	مرزا صاحب کی زبان نہیں۔ غالباً مشیر مرحوم کا ہے۔
۶	کیا ذات ذوالجلال غفور و رحیم ہے	۱۱	مرزا صاحب کی زبان نہیں معلوم ہوتی۔

مرثئے جو زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہیں

اب یہ بھی لکھ دُوں۔ کہ میرے علم میں جس قدر مرثئے دفترِ ماتم میں چھپے ہیں۔ بجز پانچ مرثئے مندرجۂ تحت کے سب زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل کی تصنیف ہیں:۔

نمبر	مطلع	حال
۱	اے صبحِ وفا کون ترا شمس ضحےٰ ہے	حضرت عباسؑ کے حال میں جلد اوّل دفترِ ماتم میں چھپا ہے۔
۲	انجیلِ مسیحؑ لبِ شبیرؑ ہیں عباس	حال حضرت عباسؑ میں ناتمام مرثیہ ہے جلد دوم میں چھپا ہے

نمبر	مطلع	حال
۳	یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا	حضرت امام حسینؑ کے حال میں جلد پنجم میں ہے۔
۴	پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی	عونؑ و محمدؑ کے حال میں ہے۔ جلد اوّل میں چھپا ہے۔
۵	گل گشت گلستاں اجل کرتے ہیں اکبرؑ	حال شہزادہ علی اکبرؑ میں ہے۔ جلد دویم میں چھپا ہے۔

تاریخ گوئی

تاریخ گوئی میں بھی مرزا صاحب کو کمال تھا۔ چند منٹ میں اکثر تاریخ کہہ دیتے تھے۔ ہزاروں تاریخیں کہی ہیں۔ مگر دفتر ماتم میں ایسی تاریخیں نہین چھپیں۔ یہانتک کہ میر انیس مرحوم کے انتقال کی تاریخ بھی دفتر ماتم میں نہین چھپی +

غزل

غزل۔ سُنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے تین دیوان مکمل تھے۔ مگر اُنھوں نے خود مشتہر نہیں کئے۔ جس زمانہ میں اُن کے داماد میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم (پسر میر وزیر علی صبا مغفور) ابتداءً غزل کہتے تھے۔ مرزا صاحب سے مانگ کر ایک یا دو دیوان وہ لے گئے۔ برسوں اُن کے یہاں رہے۔ پھر ایک زمانہ میں اُن کے یہاں آگ لگی۔ وہ دیوان بھی سُنا ہے کہ اور اسباب کے ساتھ جل گئے۔ بعض غزلیں جو مرزا صاحب کے تخلص سے ایک آدھ تذکرہ میں پائی جاتی ہیں۔ نہ معلوم اُن کی ہیں یا نہیں +

نثر اردو

نثر اُردو۔ مرزا صاحب خط تو ہمیشہ فارسی میں لکھا کرتے تھے۔ اور بہت کم لکھتے تھے۔ اس لئے اُن کا اُردو کا (بلکہ فارسی کا بھی) کوئی خط ابتک نہیں ملا۔ البتّہ ایک اُردو نثر کی کتاب مصائب میں مطبع یوسفی دہلی مین چھپی ہے۔ جس کا نام ابواب المصائب ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہُوا۔ کہ اس کا اصل مسوّدہ مرزا صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پس یہ کتاب بالتحقیق اُنہیں کی تصنیف پائی جاتی ہے۔ میرے کرم فرما سید صغیر حسین صاحب شمس مالک مطبع یوسفی دہلی و مینجر اخبار اثنا عشری دہلی کی

شجاع توجہ و مہربانی سے یہ کتاب مجھے پہنچی۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کے عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے لکھی۔ حضرت یوسفؑ کے واقعات جابجا لکھ کر حالات امام حسینؓ کا پیوند لگایا ہے۔ باوصفیکہ اب اسّی پچاسی سال پہلے کی تصنیف ہے۔ مگر زبان سلیس ہے۔ عبارت میں اُس زمانہ کی روش کے موافق فارسی و عربی کے الفاظ بہت ہیں۔ مگر عبارت کو خواہ مخواہ مقفّیٰ نہیں بنایا ہے۔ اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے *

فصل ۴

اب مَیں اپنے علم کے موافق اُن مرثیوں کے مطلع بھی لکھ دُوں۔ جو اب تک چھپے نہیں ہیں :۔

مرثیے جو اب تک نہیں چھپے

نمبر	مطلع	کیفیت
۱	جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے	ایک پُرانا مرثیہ ہے۔ میرے پاس بھی موجود ہے۔ نہایت فصیح و سلیس نظم ہے۔
۲	اے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج	اہلبیتؑ کے دربار یزید میں آنیکے حال کو نظم کیا ہے۔ یہ بھی میرے پاس اور بہت صاحبوں کے پاس ہے۔ شان نظم اور زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد شاہی کی تصنیف ہے۔ عمدہ مرثیہ ہے۔
۳	کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے	یہ ایک بہت بڑا مرثیہ ایک ہزار بند کے قریب سُنا جاتا ہے۔ سُنا ہے۔ کہ اکثر اقربائے امام حسینؓ کے حالات نظم فرمائے ہیں۔ میرے پاس ایک ٹکڑہ اس کا ہے۔ جو شاید ساٹھ ستّر بند کا ہوگا۔ یہ بھی عہد شاہی کی تصنیف عمدہ مرثیہ ہے۔

نمبر	مطلع	کیفیت
۴	مہر علم سرور اکرم ہُوا طالع	یہ بے نقط مرثیہ ڈیڑھ سو بند سے کچھ اُوپر سُنا جاتا ہے۔ اس صنعت میں یہ لاجواب مرثیہ قابل دید ہے مگر بوجہ وصیّت مصنّف تقسیم نہیں ہُوا۔
۵	آمد ہے خداوند شجاعان زمن کی	امام حسینؑ کے حال میں ایک لاجواب مرثیہ ہے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء کی تصنیف اور غیر تقسیمی ہے۔
۶	ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے	امام حسینؑ کی مدینہ منوّرہ سے روانگی اور فاطمہ صغرا سے مفارقت نظم کی ہے۔ یہ بھی بعد غدر ۱۸۵۷ء کی تصنیف اور لاجواب غیر تقسیمی مرثیہ ہے۔
۷	اے کلک قسم سلک قلمداں سے جُدا ہو	بس یہی ایک مصرع سُنا ہے۔ اور یہ سُنا ہے کہ لاجواب مرثیہ ہے۔ اور حال معلوم نہیں۔
۸	جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی	مختار کے حال میں ایک غیر تقسیمی مرثیہ ہے جسکی نسبت مرزا صاحب کے شاگردوں وطرفداروں کا یہ خیال ہے۔ کہ تمام تصنیفات مرزا صاحب کی ایک پلّہ میں اور یہ مرثیہ دُوسرے پلّہ میں رکھنے پر بھی شاید یہی پلّہ جُھکتا ہُوا ہوگا۔ میں اس کا حال اُوپر بھی لکھ چکا ہُوں۔ مرثیہ بہت اچھا ہے۔
۹	کیوں چرخ میں گردُوں کی طرح رن کی زمیں ہے	حال حضرت امام حسینؑ میں لاجواب مرثیہ ہے۔ صنائع بدائع میں اکثر بند ہیں۔ جن میں سے بعض بند جناب استاذی اوج مدظلہ نے مجھے عنایت فرمائے۔ اور میں نے اس کتاب میں لکھ دئے ہیں۔

نمبر	مطلع	کیفیت
۱۰	قبضہ ہے علقمہ کی ترائی پہ شیر کا	مطلع کے مصرع کی طرح تمام مرثیہ حال حضرت عباسؑ میں شاندار اور لاجواب ہے سگر مشتہر نہیں ہوا۔
۱۱	....	مطلع مجھے یاد نہیں رہا۔ حال حضرت امام موسیٰ کاظمؑ میں لاجواب مرثیہ ہے۔ جس کا کچھ ذکر مَیں نے ایک جگہ اس کتاب میں لکھا ہے۔

مرزا صاحب کے مرثیے میر صاحب سے بہت زیادہ ہیں

ناظرین! آپ مجھے معاف فرمائیگا۔ میر انیس صاحب مرحوم کی کسی طرح تنقیص (معاذ اللہ) مقصود نہیں ہے۔ بلکہ مؤرخی کی شان مجھے اس کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ کہ جب ملک نے میر صاحب کو مرزا صاحب کا مدِ مقابل مان لیا ہے۔ اور مرزا صاحب و میر صاحب کا کمالات میں مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو مَیں اپنے علم کے موافق یہ بھی عرض کروں کہ ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے کلام کی تعداد کس قدر ہے۔ کیونکہ عام طور پر لوگ یہی کہدیتے ہیں۔ کہ ان کے بھی ہزاروں مرثیے ہیں۔ اُن کے بھی ہزاروں ہیں۔ حالانکہ واقعی ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک مجھ کو علم ہے۔ میر صاحب کے سَو سوا سَو (۱۲۵) مرثیوں سے زیادہ نہیں ملتے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں عرض کروں۔ کہ میر صاحب کی کل ۶ جلدیں چھپی ہیں۔ اور مرزا صاحب کی ۲۰ جلدیں کچھ کلام غیر ان میں بھی شامل ہے۔ اُن میں بھی ہے اس کے ساتھ اور ایک بات بھی سُن لیجئے۔ میر ضمیرؒ۔ میرزا فصیحؒ۔ منشی دلگیرؒ ان سب کے مرثیوں کی جلدیں چھپ گئیں۔ انہیں صاحبوں کے معاصر و ہم پلّہ میر خلیق مرحوم تھے۔ (جو میر انیس مرحوم کے والد ماجد اور اُستاد تھے)۔ اُن کے مرثیوں کی کوئی جلد نہیں چھپی [illegible] ان کے مرثیے نہاں خانے [illegible] ۔ اگر مولوی شبلی صاحب کی تحقیق صحیح ہے۔ (جیسا کہ اُنہوں نے مفصّل و مدلّل موازنہ انیسؒ و دبیرؒ کے صفحہ پندرہ پر لکھا ہے)۔ تو یہ

نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ بعض مرثئے جو آج میر انیس مرحوم کے نام سے مشہور ہیں (اور وہ بھی ان چند جلدوں میں ہیں) وہ درحقیقت میر خلیق مرحوم کی تصنیف ہیں۔ پس جو لوگ بے تعصبی سے دبیرؔ و انیسؔ کا مقابلہ کرنا چاہیں۔ وہ اس بات پر بھی خیال فرمائیں۔ کہ ایک شاعر کثیر الکلام کے ساتھ ایک قصیر الکلام شاعر کا مقابلہ ہے*۔ ایک ہی قسم کا مضمون اگر ایک ابتدائی مشق کے مرثیہ میں مرزا صاحب کے یہاں سُست بندھا ہُوا ہے۔ تو وہی یا ویسا ہی مضمون ایک دُوسرے درمیانی مشق کے زمانہ کے مرثیہ میں (مرزا صاحب کے یہاں آپکو چُست ملیگا۔ پس اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے۔ تو میر صاحب کے ہم مضمون نظم کو مرزا صاحب کے اُسی نظم سے نہ ملائیے۔ جو ابتدائی زمانہ کی ہے۔ بلکہ دونوں زمانوں کی نظم سے ملائیے۔ اور انصاف فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب باوصف اس قدر پرگو ہونے کے کس قدر اچھا کہتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر جو شعرا پرگو ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام اکثر سُست ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا جتنا کلام مطبوعہ اس وقت موجود ہے۔ اُتنا کلام بھی کسی مشہور شاعر عرب یا عجم یا ہند کا مجھے تو نظر نہیں آتا۔ اور کثیر الکلام شاعر کے کلام میں سُست و چُست کلام ہونا ایک لازمی بات ہے۔ بلکہ جو شاعر پھونک پھونک کے قدم رکھتے ہیں۔ بار بار کاٹتے اور بناتے ہیں۔ اُن کا بھی کلام چُست و سُست نظر آتا ہے۔ اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد بھائی تخمی پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔اے کا ایک شعر یاد آیا ہے۔ جو ایسے محتاط شاعروں کی شان میں ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ؎

کثرتِ کلام کے باوصف اکثر عمدہ کلام ہے

شعرا نے جب بھائے الفاظ کچھ بنائے + پیوند تو لگائے پیراہن کہیں میں

* پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی آبِ حیات میں انیسؔ اور دبیرؔ کی فرضی بحث ص ۴۱۲ کا اشارہ کیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے۔ دبیری کہتے تھے "کس کا منہ ہے۔ جو ان کو مٹھے اور سو بند کہکر اُٹھے بیس دن تک خامہ فرسائی کی۔ اور محرم پر دس پندرہ مرثئے لکھ کر طیار کئے۔ تو کیا کئے۔ وہ بھی دادا اور بھائیوں کے مشورے ملاکر۔ اور مصاحبوں کے پسینے بہاکر" + ۱۲ مؤلف حقیر۔

انتخاب کلام جناب غالب و جناب سحر

جن شاعروں نے اپنا سست کلام نکال دیا ہے۔ اُن میں سے مَیں مثال کے طور پر دو مسلم الثبوت شاعروں کو پیش کرتا ہوں۔ ایک بزرگوار دہلی کے دُوسرے لکھنؤ کے ہیں۔ دہلی کے جناب غالب مغفور اور لکھنؤ کے سحر مرحوم ہیں +

مرزا غالب مرحوم نے اپنے اردو کے بڑے کلیات میں سے ہزاروں اشعار حذف کر کے ایک بہت مختصر دیوان اردو باقی رکھا۔ جس پر خود اُن کا قول شاہد عادل ہے ؎

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ + شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

یہاں تک اشعار دیوان سے نکال دئے۔ کہ وہ مشہور سہرہ بھی۔ جس پر شیخ ابراہیم صاحب ذوق سے جھگڑا ہُوا تھا۔ دیوان اردو میں نہیں ہے*۔ (اور جس کو پروفیسر آزاد مرحوم نے اپنی آزادی یا اپنے اُستاد کی طرفداری کے خیال سے کہ ذوق کا سہرہ غالب کے سہرہ سے چُست معلوم ہوتا ہے۔ آب حیات میں آب و تاب سے لکھا)۔ غالب مرحوم نے تو عاشقوں کے فرضی گریبان کی طرح سہرہ کا تار تار الگ کر کے ایسا پھینک دیا تھا۔ کہ آج شاید اُس کا ایک تار یا سُوکھا ہُوا ایک پھُول بھی ہم کو نہ ملتا۔ مگر آب حیات نے یہ جان بخشی کی۔ کہ دونوں سہروں کے مقابلہ کا آج موقع مل گیا۔ بہرحال اس کثرت سے اشعار نکال دینے کے بعد بھی دیوان اردوے غالب مرحوم میں بہت سُست شعر موجود ہیں۔ اسی طرح شیخ امان علی صاحب سحر مرحوم نے اپنا پُرانا دیوان جس میں رعایت لفظی بہت اُبھری ہُوئی تھی۔ اُس رنگ کو ناپسند کر کے پھاڑ پھینکا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

سودا ہے نئی بات کا لے جان پڑ انا + سب پھینک دیا پھاڑ کے دیوان پُرانا

گو اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے۔ کہ سحر مرحوم نے مضمون کو رعایت لفظی خصوصاً اُبھری ہُوئی رعایت لفظی پر [illegible] سے وہ ایک صحیح المذاق شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

* حالانکہ اُس کی معذرت میں جو نظم کہی تھی۔ وہ دیوان میں موجود ہے۔ جس کا ایک شعر لاجواب یہ ہے [illegible]

طبیعت بُری نہیں۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے ۱۲ مؤلف

اور جس شخص نے اتنے بڑے دیوان کو تلف کر دیا۔ اُس سے یہ بھی بعید نہیں۔ کہ جو شعر سُست سمجھے ہوں۔ اُن کو بھی نکال دیا ہو۔ پھر بھی ان کے دیوان میں چُسپت وسُست اشعار موجود ہیں۔ ان پر کیا منحصر ہے۔ ہر شاعر کے یہاں چُسپت وسُست کلام (چاہے وہ کتنا ہی کلام کاٹ چھانٹ کر باقی رکھے) ضرور ملتا ہے۔ ع یہی ہے فرق بندے اور خدا میں۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ اس میری تحریر کو دیکھ کر کوئی صاحب یہ نتیجہ نہ نکالیں۔ کہ معاذ اللہ مرزا غالب مرحوم قصیر الکلام تھے۔ نہیں بلکہ وہ بہت پر گو تھے۔ اُن کا فارسی کا کلیات بہت بڑا موجود ہے۔ اُردو میں علاوہ نظم کے نثر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اور وہ خود عود ہندی کے ایک رقعہ میں اپنے پُر گو ہونے پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ اور یہ ناز و فخر اُن کا بیجا نہیں ہے۔ درحقیقت جس شخص کا کلام بہت ہے اور پھر اچھا بھی ہے۔ وہ ضرور فخر کریگا۔ اور فخر اُس کو زیبا بھی ہے +

ناظرین! جب کہ مَیں نے اس کثرت کلام کی بحث میں اس قدر آپ کا وقت لیا ہے۔ تو ایک نقل بُڈھے شاعر گر شاعر* میاں مصحفی کی بھی سُنا دوں:۔

مصحفی سے ایک شاگرد نے کہا۔ اُستاد آپ بُرا نہ مانئے۔ تو مَیں ایک بات عرض کروں +

میاں مصحفی۔ کہو +

شاگرد۔ بعض شعر تو آپ کا ایسا پھڑکتا ہوا ہوتا ہے۔ کہ دل کو تڑپا دیتا ہے۔ جیسے ؎

اے مصحفی مَیں رووں کیا اگلی صحبتوں کو + بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

*حضرت مصحفی کو میں شاعر گر شاعر اس لئے کہتا ہوں کہ اکثر لکھنؤ کے معزز شاعر اس شاعر استاد کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد ہیں جیسے [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ جن جن بزرگوار کے ایسے ایسے تعلیم یافتہ فیض یافتہ بلاواسطہ یا بالواسطہ (شاعر) شاگرد ہوں۔ اُسکو شاعر گر [illegible] ہے +۱۲ مؤلف حقیر۔

مگر بعض شعر آپ ایسے سست فرماتے ہیں۔ کہ شاید مجھ جیسا مبتدی بھی کہ لے میر انشاؔ
کا یہ حال نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہے؟

مصحفی۔ (ذرا تیور بدل کر) سنو بھئی۔ کوئی شاعر کنوآں ہے۔ اُس کا فائدہ اُسی
گھر والوں تک محدود ہے۔ کوئی اندارہ ہے۔ کہ محلہ بھر پانی بھرتا ہے۔ اسی طرح کوئی
تالاب۔ کوئی رجبہ۔ کوئی نہر۔ کوئی دریا ہے۔ تمہارا بڈھا مصحفی سمندر ہے سمندر۔
پھر سمندر میں تو کوڑہ کرکٹ بھی نکلیگا۔ موتی بھی۔ عنبر بھی۔ مونگا بھی۔ اور ہزار ور چیزیں
مختلف قیمت کی سمندر میں ملتی ہیں۔ میرا اور ایسے شاعروں کا کیا مقابلہ۔ جو ایک کنوئیں
یا تالاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ کہ جس میں ایک رنگ اور ایک ذائقہ کا پانی
نکلتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا (خیر و صلاح)

اس حکایت کے لکھنے سے میرا مقصود صرف اتنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کا اس کثرت
سے کلام ہے۔ اس پر بھی اُن کا کلام اس قدر چسپت ہے۔ یہ اُن کے ممدوحین محمدؐ و
آل محمدؐ علیہم السلام کی تائید ہے۔ اور یہ بھی خدا کی قدرت یا ممدوحوں کی مدح کی برکت
ہے۔ کہ مرزا صاحب کے یہاں ہر رنگ کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔ جیسا کہ میں اُوپر
ثابت کر چکا ہوں۔ اور جلد دویم (حیات دبیر) میں ہر قسم کے کلام کے بکثرت نمونے
میں نے پیش کر دئے ہیں۔ اور جس کا فخر خود مرزا صاحب اس شعر میں کرتے ہیں ؎
اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام ✣ ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

ناظرین!! اب میں دبیر مرحوم کے چند قدر شناس اہل کمال کا ذکر کرتا ہوں

باب یازدہم۔ دبیر مرحوم کے قدر شناس اہل کمال

مثل مشہور ہے کہ دُنیا مردہ پرست ہے۔ اکثر مصنفوں و شاعروں کے مرنے پر
زمانہ قدر کرتا ہے۔ مگر کبھی کسی کامل کی قدر (زمانہ) اُس کی زندگی میں بھی کرتا ہے۔ چنانچہ

جناب مرزا صاحب کی جو عزّت و توقیر اہل زمانہ نے اُن کے زمانے میں کی۔ اور ابتک قدر کر رہا ہے۔ وہ بھی شاید ہی کسی شاعر و مصنّف کو نصیب ہوئی ہوگی۔ ہزاروں اُمرا اور اہل علم مرزا صاحب کے کمال کے معترف اور بعض فدائی ہو گئے تھے۔ مَیں اس باب میں اگر سب کا بیان کروں۔ تو یہ ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ لہذا یہاں صرف چند سربرآوردہ اہل کمال و اہل علم کا بیان کرتا ہوں +

فصل ۱ — مجتہد العصر علّامۂ جائسی مدظلہ العالی

(۱) مجتہد العصر علّامۂ جائسی جناب مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی۔ یہ بزرگوار بمصداق مثل مشہور اِنّ اھل الفضل یعرف اھلہ* مرزا صاحب کے فضل و کمال کے معترف ہیں۔ اور اس قدر جناب مرحوم سے محبت ہے۔ کہ اس کمال ضعیفی میں میری معروضہ کو قبول فرمایا۔ اور مرزا صاحب مرحوم کے حالات اپنے شاگرد اور برادر زادہ منشی سید احمد رضا صاحب جائسی سے لکھوا کر مرحمت فرمائے۔ جو اس کتاب میں موقع موقع سے مَیں نے لکھ دئے ہیں۔ اور کچھ اس موقع پر لکھنا چاہتا ہوں۔ اور جناب کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ کہ ہمارے سر پر ان کا سایہ رہے۔ اور منشی صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں + جناب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب مرحوم کا جو اعزاز اُن کے کمال کے سبب سے خاندان عالی شان اجتہاد میں تھا۔ اُسی نظر سے وہ جناب حضرت زبدۃ العلما معین المومنین سید نقی صاحب مرحوم (خلف الصدق سید العلما طاب ثراہ) کی مجلس میں پڑھا کرتے تھے۔ اُس مجلس میں خاندان اجتہاد کے تمام مجتہد اور لکھنؤ کے قریباً تمام اہل کمال شریک ہوتے تھے۔ یہ عزّت تمام اعزازوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

(جناب فرماتے ہیں) ۱۲

مجلس سویم فرزند جناب سید العلما

(۲) جب زین العلما عضد الدین سید علی ابن الحسین فرزند اکبر جناب سید العلما نے انتقال فرمایا۔ تو اُن کے سویم کی مجلس میں مرزا صاحب نے مرثیہ اور مرثیہ سے پہلے قطعہ تاریخ وفات پڑھا تھا۔ اُس کا یہ ایک شعر اب تک یاد ہے۔ ~

* کامل کامل کو پہچانتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مرگ فرزند علیؑ۔ واقعۂ اکبر بود + رفت از مرگ علی۔ راحت و آرام حسینؑ*

(۳) جناب **علیین مکان** (سید العلما میرن صاحب طاب ثراہ) کی مجلس سویم میں جناب مرزا صاحب مرحوم کے اشارے سے جناب سلطان العلما (**سید محمد صاحب**) کی حضوری میں مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد شیخ گوہر علی صاحب **مشیر** (مرحوم) نے اپنی تصنیف ایک مرثیہ پڑھا تھا۔ جس میں اوّل اوّل صفات حمیدہ و خرق عادات جناب علیین مکان کے نظم کئے تھے۔ مطلع اُس کا یاد نہیں۔ البتہ ایک شعر یاد ہے۔ جس موقع پر میرن صاحب مبرور کے غم میں سلطان العلما کی اشکباری کی تصویر کھینچی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں ؎

آنسو رواں تھے غیرت الیاسؑ کے لئے + شبیرؑ یوں ہیں روئے تھے عباسؑ کے لئے

خاندان اجتہاد نے اس مرثیہ کی یہ قدردانی فرمائی تھی۔ کہ یہ مرثیہ ایک بیاض میں نقل کر کے کتب خانہ جناب ممتاز العلماء سیّد تقی صاحب قبلہ میں بحفاظت رکھا گیا تھا۔ اور تمام علمائے کرام نے اس نظم کو پسند فرمایا تھا۔ یہ امر بھی فضیلت جناب مرزا صاحب کی ایک روشن دلیل ہے۔ کہ اُن کے ایک شاگرد کی بھی اہل علم میں اس قدر قدر و عزّت کی جاتی تھی +

(۴) **شمس العلما** جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنان۔ باوصفیکہ ان جناب سے بقول صاحب رد و اقعات انیس جناب میر انیس مرحوم اپنے مرثیہ پر اصلاح لیتے تھے (جیساکہ خود ان جناب نے عظیم آباد میں چند صاحبوں کے روبرو بیان فرمایا)

مشیر مرحوم

فصل ۲

---

*۔ میں کہتا ہوں کہ اس شعر میں صنعت ایہام ہے کہ جناب سید العلما میرن صاحب قبلہ کا نام (سید) حسین تھا اور ان کے فرزند اکبر کا نام علی تھا اور جناب امام حسینؑ کے فرزند اکبر کا نام علیؑ تھا اور جو علی اکبرؑ نام ہے جنکی شہادت کے بعد مظلوم کربلا نے فرمایا تھا۔ علی الدنیا بعدک العفا تیرے بعد دُنیا پر خاک ہے پس دونوں واقعات میں سے جس پر چاہیے یہ شعر چسپاں ہو سکتا ہے۔ اور مقصود شاعر واقعہ جنت مکان زبدۃ العلما ہے۔ حضرت علی اکبر کو فرزند اکبر امام حسینؑ میں اس روایت کے مطابق لکھا بعض علما بھی کہتے ہیں جس میں اُنکی عمر وقت شہادت ۲۵ سال کی منقول ہے کہ اس وقت امام زین العابدینؑ کا کمال کے تھے اس لئے وہ امام حسینؑ کے فرزند اکبر تھے جیسا کہ مناقب ابن شہر آشوب سے ظاہر ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور مجھ سے وزیر صاحب (سید محمد صاحب پیش نماز اکبر اولاد جناب مفتی صاحب) ایک وزیر بیل تذکرہ بمقام آگرہ شاہ گنج ناقل تھے۔ کہ جناب میر صاحب نے اوّل یہ مصرع یوں فرمایا تھا ع جب حملہ ور امام کریم النفس ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا۔ ع جب حملہ ور امام مسیحا نفس ہوئے۔ میر صاحب نے یوہیں درست کر لیا۔ مگر ان جناب نے شان عدالت و انصاف کو پیش نظر رکھ کر دبیرؒ و انیسؒ کے باب میں جو فیصلہ فرمایا ہے۔ وہ ان کی کتاب عشرۂ کاملہ میں مسطور اور تمام ہندوستان میں مشہور ہے + یہ مسئلہ مولوی ابوالقاسم صاحب عرف مولوی مقرب علی خاں صاحب (ہمشیرزادہ ارسطو جاہ منشی رجب علی خاں صاحب مرحوم میر منشی چیف کمشنری پنجاب) سابق ہیڈ مولوی ضلع اسکول ریواڑی و مؤلف ذریعۃ النجات نے پوچھا ہے۔ خلاصہ سوال یہ ہے۔ کہ بعض اہل ہند میر انیس مرحوم کو مرزا دبیر مغفور پر اور بعض میرزا صاحب کو میر صاحب پر شاعری میں ترجیح دیتے ہیں۔ آپ فیصلہ فرما دیجئے کہ کون صاحب افضل و اکمل ہیں۔ اس کے جواب میں جناب ممدوح ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے۔ مرزا صاحب کا کلام دقیق و نمکین ہے۔ پس جب ہر ایک کا ذائقہ مختلف (اور ہر شخص کا مذاق مختلف) ہے۔ تو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی* + یہ بات بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ کہ ایک عظیم آبادی بزرگ نے مرزا صاحب کے اس بیت پر اعتراض فرمایا تھا ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا + سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اور اپنے نزدیک اس قسم کے مبالغہ کو خلاف عقل و مہمل سمجھ کر جناب مفتی صاحب قبلہ سے پوچھا تھا مفتی صاحب نے اُن کو مدلّل و معقول جواب دے کر اسی کتاب عشرہ کاملہ میں۔

مفتی صاحب کا فیصلہ انیسؒ و دبیرؒ کے باب میں

کسی عظیم آبادی کا مرزا صاحب پر اعتراض اور جناب مفتی صاحب کا جواب

* ملاحظہ ہو عشرۂ کاملہ کتاب مسائل میں (مطبوعہ مطبع اثنا عشری لکھنؤ)۔ اس میں سائل کا نام مولوی سید مقرب علی خاں لکھا ہے مگر میرے عنایت فرما منشی سید علمدار حسین صاحب دہلوی ملازم ریاست پٹیالہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ دراصل خلیفہ سید محمد حسین مرحوم انجاز التنزیل نے پوچھا تھا ممکن ہے کہ اُن جناب نے مولوی صاحب ممدوح سے خط لکھوایا ہو + ۱۲ مؤلف حقیر

مسئلہ بھی چھپوا دیا ہے - ہر چند یہ سوال و جواب فارسی میں ہے - اور طالبانِ فن کے واسطے ایسے زمانہ میں کہ فارسی ہند میں لبِ بام ہے - شاید زیادہ مفید نہ ہو - مگر میں یہاں لکھے دیتا ہوں کہ ایک تو یہ مفتی صاحب کی تحقیق بمنزلہ تبرک ہے - دُوسرے جب اس قسم کے مبالغہ کے اشعار کوئی صاحب تلاش کرنا چاہینگے - تو اُن کو ایک جگہ مل جائینگے *

(ماحصل اُردُو میں اُردُو خوانوں کے لئے)

عرض کیا جاتا ہے - کہ مرزا دبیر صاحب نے ایک مرثیہ کے ایک بند میں تعریف و توصیف تیز رفتاری اسپ مبارک (امام حسینؑ) کی بیان فرمائی ہے - اس طرح کہ اسپ مبارک بسبب تیزی رفتار کے صاحب سن نہیں ہوا - جیسا پیدا ہُوا تھا - ابتک ویسا ہی ہے - اس کے بعد ٹیپ میں فرمایا ہے ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اس شہر کے نکتہ رسوں اور معنی سنجوں اور اہلِ علم میں سے کسی کی سمجھ میں اس بیت کے معنی نہیں آئے - بلکہ اکثر تو مہمل بتاتے ہیں - اس لئے کہ امتدادِ زمان (زمانہ کا گزرنا) حرکتِ فلک کو کہتے ہیں - اور سن کا تعلق امتدادِ زمانہ سے ہے - اگر شاعر کا مطلب یہ ہے - کہ تیزیِ رفتارِ اسپ کے مقابلہ میں آسمان حیرت یا رشک سے

سوال

عرض می شود - کہ جناب مرزا دبیر صاحب و قبلہ دریک بند مرثیہ تعریف و توصیف تیز رفتاری اسپ مبارک بیان فرمُودہ اند - بدیں نمط کہ اسپ مبارک حضرتؑ بسبب سرعت رفتار خود صاحب سن نگشتہ - چنانچہ خلق شدہ بود - ہنوز ہم چنانست - بعد ایں مضمون مصرع ٹیپ دراں بند چناں فرمُودہ اند - ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

معنی ایں بیت دریں شہر ہیچکس از نکتہ رساں و معنی سنجاں و ذی علماں بالفہم درنمی آید - بلکہ اکثرے میگویند کہ مہمل است - چہ امتدادِ زماں مقدار حرکت فلک را گویند - و سن تعلق با امتدادِ زماں دارد - اگر مقصود قائل ایں باشد کہ بمقابل سرعت رفتار اسپ فلک از حیرت یا از رشک ساکن گشتہ -

سالکن ہوگیا۔ تو اس صورت میں امتداد
زمان ہی نہیں پایا جاتا۔ اور جب امتداد
زمانہ نہ پایا گیا۔ تو گھوڑے کی موجودگی
کہاں۔ بلکہ کوئی چیز بھی نہ پائی جائیگی۔
اور اس صورت میں گھوڑے کی موجودگی
کہاں سے آئی۔ اور اگر شاعر کی یہ غرض
ہے۔ کہ گھوڑے کی رفتار کی تیزی کے مقابلے
میں آسمان کی حرکت گویا بمنزلہ عدم کے ہے۔
تو اس صورت میں آسمان نے جتنی حرکت کی۔
تھوڑی یا بہت۔ امتداد زمان حاصل ہوتا
ہے۔ جب امتداد حاصل ہوا۔ تو صاحب
سن ہونا گھوڑے کا بھی ثابت ہوتا ہے۔
اور اگر شاعر کا یہ خیال ہے۔ کہ اس شعر میں
غلو ہے۔ جو حسب عقل و عادت محال ہو۔
تو اس صورت میں بھی نفی سن پر ثبوت چاہیئے۔
جیسا کہ نظامی نے فرمایا ہے۔ ؎

زسم ستوراں وراں پہن ودشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

چھ ہونا زمین کا اور آٹھ ہونا آسمان کا اس
شعر میں مصرع اول سے ثابت ہے۔ یعنی
زسم ستوراں وراں پہن دشت

دریں صورت امتداد زماں یافتہ نمی شود۔ وہرگاہ
امتداد زماں یافتہ نشد۔ وجود اسپ
چہ۔ بلکہ وجود ہیچ چیز ہم یافت نمی گردد۔
ودریں حال وجود رفتار است از کجا
آمد۔ واگر مقصود قائل ایں باشد۔ کہ
مقابل سرعت رفتار اسپ حرکت
فلک گویا بمنزلہ عدم است۔ پس
دریں صورت فلک ہر قدر کہ حرکت
کرد۔ خواہ اندک خواہ بسیار۔ امتداد
زماں حاصل می شود۔ ہرگاہ امتداد
حاصل شد۔ صاحب سن گشتن اسپ
نیز ثابت می شود۔ واگر قائل برآں
رفتہ۔ کہ دریں شعر غلوست۔ کہ
بحسب عقل و عادت ہر دو محال باشد۔
درآں صورت ہم اثبات ادعا یعنی ثبوت نفی
سن میباید۔ چنانچہ نظامی فرمودہ۔ ؎

زسم ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

شش شدن زمین و ہشت گشتن آسمان دریں
شعر از مصرع اول ثابت شد۔ یعنی
زسم ستوراں دراں پہن دشت

اور مرزا صاحب کی بیت بلکہ تمام بند میں کچھ
ثبوت اپنے دعوے پر نہیں ہے۔ ازبسکہ
آپ جامع علوم اور فن شاعری میں اُستاد
کامل ہیں۔ لہٰذا عرض ہے۔ کہ اگر یہ شعر
حقیقت میں مہمل ہو۔ تو ویسا ہی تحریر
فرمائیے۔ تاکہ عبث اس کے معنی کی تلاش
میں فکر نہ کی جائے۔ اور یہ امر مرزا صاحب
ممدوح سے بہت دُور معلوم ہوتا ہے۔
کہ وہ مہمل فرمائیں۔ اور اگر یہ شعر بامعنی ہو۔
اور اس جگہ کوئی اُس باریکی کو نہیں پہنچا ہو۔
تو جناب اس کے معنی مشرح ومفصل بدلائل
تحریر فرمائیں۔ خواہ دُوسرے کاغذ پر خواہ اسی
فرد کی پُشت پر۔ تاکہ لذت مطلب سے جناب کی
بدولت ہم بھی کامیاب ہوں۔ اور منکروں کو
ساکت کریں۔ اور یہ خیال مرزا صاحب کے
اس شہر (عظیم آباد) سے تشریف لے جانیکے
بعد دلوں میں آیا ہے۔ ورنہ خود مرزا صاحب
قبلہ سے پُوچھ لیا جاتا۔ یہ کاغذ بہت جلدی
میں لکھا گیا ہے۔ عجب کیا بلکہ یقین ہے۔
کہ جابجا غلطی ہوگئی ہو۔ ملامت نہ فرمائیگا۔
زیادہ حد ادب۔ از عظیم آباد ۔ ۔

ودر بیت مرزا صاحب قبلہ بلکہ در تمامی بند
ہیچ ثبوت بر ادّعائے مقصود نیست۔ چوں
آں جناب جامع علوم اند ودر فن شاعری اُستاد
کامل لہٰذا استدعا اینکہ اگر ایں شعر
درحقیقت مہمل باشد۔ ہمچناں قلمی فرمایند۔
تا عبث بتلاش معنی آں فکر کردہ نشود۔ و
ایں بسیار از مرزا صاحب ممدوح بعید
می نماید۔ کہ مہمل فرمایند۔ واگر ایں شعر
بامعنی باشد۔ ودریں جا کسے بداں
باریکی نمی رسد۔ آں جناب معنی آنرا
مشرح ومفصل بدلائل قلمی فرمایند۔
خواہ بر کاغذ دیگر خواہ بر ظہر ایں فرد۔
تا از لذّت معنی بطفیل آں جناب کامیاب
شویم۔ ومنکراں را ساکت گردانیم۔
وایں خیال بعد از تشریف بردن
جناب مرزا صاحب وقبلہ ازیں شہر
مردماں را بدل آمد۔ ورنہ خود از مرزا صاحب
وقبلہ استفسار نمودہ می شد۔ ایں کاغذ در
عجلت نوشتہ شد۔ عجب چہ بلکہ یقین ہست۔
کہ جابجا غلطی شدہ باشد۔ ملامت نخواہند فرمود۔
زیادہ حد ادب۔ از عظیم آباد*

* کاتب معترض کا نام نہیں لکھا۔ خدا جانے۔ کون اچھے شخص ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

جواب ۔ شاعروں نے ایسے قول بہت
کہے ہیں ۔ (کیا نہیں دیکھا تو نے کہ وہ ہر جنگل
میں پھرتے ہیں) اور امر محال کا دعوے کرنا
شاعروں میں شائع ہے ۔ **سعدیؒ** کہتے ہیں
آسمان کی ڈہری (جھکی ہوئی) پیٹھ خوشی سے
سیدھی ہوگئی ۔ جب کہ مادر ایام نے تجھ ایسا
لڑکا جنا ۔ **عرفیؒ** کہتے ہیں ۔ وہ سبک سیر (گھوڑا)
کہ جب تو اس کو تیز بھگائے ۔ ازل سے ابد کو
اور ابد سے ازل کی جانب آجائے ۔ چلنے
میں پسینے کے قطرے جو اس کے ماتھے سے
ٹپکیں ۔ تو شبنم (اوس) کی طرح وقت واپسی کے
بیٹھیں کفل میں اگر وہ گھوڑا دم بھر کو اپنی تیزی
سورج کو دیدے ۔ تو برج ثور سے منزلوں کو بہ ترتیب
طے کرتا ہوا (سورج) برج حمل میں آجائے ۔ پھر
عرفی کہتے ہیں ۔ زمانوں کے منہ پر اگر گھوڑا اپنی
آستین جھاڑ دے ۔ تو تموج کی کوشش سے زمانہ
حال (جو حادث ہے) قدیم ہو جائے ۔ اور یہ بھی
عرفی کا شعر ہے ۔ اگر ایک مرتبہ آواز سے یہ
گھوڑا بولے ۔ تو اس کی جوانی کی میں تعریف کروں
اور اگر ایک نقطے پہ چلے ۔ تو اس رفتار کا نام میں
طے ارض رکھوں ۔ **ناصر علی** کہتے ہیں ۔ ملک فنا

جواب ۔ شعرا ازیں مقول بسیار گفتہ اند ۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ
یَّهِیْمُوْنَ ۔ و ادعاے امر محال شائع
و ذائع است ۔ **سعدیؒ** گوید ۔ ؎
پشت دوتاے فلک راست شد از خرمی
تا چو تو فرزند زاد مادر ایام را
عرفی گوید ۔ آں سبک سیر چوں گرم
عنانش سازی از ازل سوے ابد واز
ابد آید بازل ۔ قطرہایش سر رفتن چکد
از پیشانی ۔ شبنم آسا شنید گو
رجعت بکفل ۔ گر بخورشید دہد سرعت
خود در یک دم ۔ آید از ثور بترتیب منازل
بحمل ۔ **وایضاً** برد ۔ از سنگرہ آستین
برافشاند شود بسعیِ تموج زمانِ حال
قدیم ۔ **وله** گر صہیل زند بجوانی ستائمش ۔
ور نقطہ رود کنمش نام طی الارض ۔ و
ناصر علی گوید در ملک فنا ہمہ نمودیم
اقامت ۔ از بسکہ علی تیز ہماندیم فرس
را ۔ و **ناسخ** گفتہ ۔ ؎
ہے یہ اپنے ضعف را ۔ ورجدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دلوار پر

میں بھی ہم نہ ٹھیرے - ازبسکہ ہم نے اپنا
فرس تیز بھگایا - ناسخ فرماتے ہیں ؎

ہے یہ اپنے ضعف کا روز جدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر

پس اگر مضامین شعر کی بنا حکمت اور دلائل
فلسفہ پر رکھی جائے - تو اس قسم کے اشعار کی
صحت میں کلام ہو سکتا ہے - اس لئے کہ
آسمان مستدیر ہے - اس کے سیدھے ہونیکا
دعوے درست نہیں - اسی طرح ترک حادث
یومی ازل سے چاہئے - اس کا الٹا ممکن نہیں -
اور وہ بھی اس تیزی سے کہ جبتک ماتھے کا پسینہ
زمین پر ٹپکے - اس سے بھی کم زمانہ میں - اسی
طرح سورج کی حرکت دم بھر میں برج ثور سے برج
حمل تک - اور اسی طور پر انقلاب زمانہ حال کا قدیم
سے یا قدیم کا حال سے محال ہے - اور حرکت تدریجیہ
گھوڑے کے نقطہ پر کسیطرح ممکن نہیں خاص کر ایسی تیز حرکت
جس کو طے ارض کہا جائے - اور اسیطرح باقی شعروں کا حال ہے

خلاصہ یہ کہ شاعر صاحب براق صلعم کے
فرزند کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں -
اور ظاہرا یہ دعوے ہے - کہ باوصفیکہ گھوڑا
زندہ ہے مگر صاحب سن نہیں ہوتا - اور مسن ہونے

پس اگر بنائے مضامین شعریہ بر
قوانین حکمیہ و براہین فلسفیہ گذاشتہ
شود - در صحت امثال این اشعار
سخنے میرود - چہ فلک مستدیر است -
دعوے راست شدنش غیر مستقیم
و ہم چنیں ترک حادث یومے از
ازل با بد - و بالعکس فی نفسہ ممکن
نیست - وانگہے بایں سرعت کہ زماں
از زماں وصول عرق جبیں تا زمیں
اقل بودہ باشد - و ہمیں نہج حرکت
شمس از ثور بحمل دریک دم و ہمیں
سیاق انقلاب حال بقدیم - یا قدیم
بحال - محال و حرکت تدریجیۂ اسپ
بر نقطہ اصلا ممکن نیست -
علی الخصوص چناں سریعہ کہ
طے الارض نامیدہ شود - و البواقی
علے ہذا القیاس *

خلاصہ مقصود قائل کہ فرس خاصہ
فرزند صاحب براق صلعم را می ستاید -
ظاہرا دعاے ایں معنی است کہ آں اسپ
باوجود بقا صاحب سن نمی شود - و از عیب

کے عیب سے بری ہے۔ اور وجہ ثبوت اس
امر محال کی سرعت قرار دی ہے۔ یعنی اُس کی
تیزی اس حد کی ہے۔ کہ کوئی چیز اُس پر سبقت
نہیں لے جاتی۔ یہانتک کہ سن۔ اور اردو میں بڑھنے
کے دو معنی ہیں۔ ایک زیادہ ہونا۔ اور دُوسرے
کسی چیز سے حرکت میں گزرنا۔ پس اس لفظ
(بڑھ) میں ایک صنعت مثل صنعت ایہام کی رکھی
ہے۔ اس طور پر کہ واسطہ سے نفی سبقت کے
بسبب شرکت لفظ کے ازدیاد کو ثابت کیا ہے۔
(یعنی ایک یہ معنی ہوئے کہ گھوڑے سے سن کبھی آگے
بڑھ نہیں سکتا۔ وہ کبھی پیچھے رہتا ہے۔ کیونکہ تیز گھوڑا
دوسرے کو آگے نہیں بڑھنے دیتا) جیسے شیخ علی حزین
نے یہ شعر کہا ہے۔ مشکین شدہ ست رنگ تو اے خط سبز
فام۔ ازبس در آفتاب رخ یار گشتہ [یعنی مشکین
(سیاہ) پڑ گیا ہے تیرا رنگ اے خط سبز فام۔
اس لئے کہ تو رخ یار کے آفتاب یا دُھوپ میں
گھوما ہے یا متحرک ہوا گیا ہے] اس لئے کہ آفتاب
کے دو معنی ہیں۔ ایک جرم خورشید جس سے رخسار
کو تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ دُوسری شعاع جس کو دُھوپ
کہتے ہیں۔ اسی طرح گشتن عموماً حرکت کے معنی پر بھی
آیا ہے۔ اور استدارت کے معنی خاص کر اطلاق

مُسن بودن مبرا است۔ و وجہ ثبوت ایں
امر محال سرعت را قرار دادہ۔ یعنی سرعتش
بحدیست۔ کہ ہیچ چیز بر او سبقت نمی گیرد
حتےٰ کہ سن۔ و لفظ بڑھنا در ہندی
بدو معنی می آید۔ یکے افزودن و دیگر
بیشی گرفتن و گذشتن از چیزے در حرکت
پس دریں لفظ صنعتے بشبیہ ایہام بکار
بُردہ۔ بایں معنی کہ بواسطہ نفی سبقت
بسبب اشتراک لفظ نفی ازدیاد را
ثابت کردہ۔ چنانچہ شیخ علی حزین
گفتہ۔ ؎

مشکین شدہ ست رنگِ تو اے خط سبز فام
ازبس در آفتاب رخ یار گشتہ

چہ آفتاب دو معنی دارد۔ یکے جرم
خورشید کہ بآں رخسار را تشبیہ
می دہند۔ و دیگرے شعاع آں
کہ در ہندی دُھوپ می گویند۔
و ہم چنیں گشتن بمعنی حرکت عموماً
آمدہ۔ و ہم بر استدارت خصوصاً
اطلاق می شود۔ و تحقق و استدارت
خط در آفتاب بمعنیین دیگر و انطباق

ہوتا ہے۔ اور تحقق اور ساتدارت خط آفتاب میں
دو اور معلول پر ہے۔ اور منطبق ہونا دلیل کا دوسرے
دو معنیوں کی نظر سے ہے۔ اس پر غور کرو اور سمجھو
یا یہ دعوے ہے کہ توسن فلک (سورج) اس گھوڑے
کے ساتھ ساتھ چلنے سے تھک گیا۔ اور یہ گھوڑا
سرعت سیر کے سبب زمانہ اور زمانیات اور فلک و
فلکیات سے گزر کر عالم بالا میں پہنچ گیا۔ کہ جس عالم میں
بقا بغیر عمر بڑھنے کے حاصل ہے۔ مجرد ہو گئی ہیں۔
عقلیں نزدیک اعلیٰ درجہ کے حکیموں کے۔ خالی زمانہ
اور امتداد زمانہ سے۔ اور اللہ اعلم ہے اپنے بندوں
کی مراد سے۔ پوشیدہ نہ رہے۔ کہ سببیت و مسببیت کا
دعوے دو قسم پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اصل چیز
موجود ہو۔ اور اسکی مسببیت ادّعائی ہو۔ دوسرے
یہ کہ معدوم چیز کو موجود فرض کر کے اس کے واسطے
مسببیت قرار دیں شیخ حزیںؔ کا شعر قسم اوّل سے
ہے۔ اور فردوسی و سعدی و مرزا دبیر کے اشعار قسم
دوئم سے ہیں۔ اس لئے کہ سبز فامی خط محبوب کے
موجود و متحقق ہے۔ اگرچہ اس کی علت کہ کیونکر
سیاہ ہو گیا ادّعائی ہے۔ بخلاف آسمان کے
چھ طبق و زمین کے آٹھ طبق ہو جانے اور
آسمان کے سیدھے ہونے اور سن کے مؤخر

دلیل نظر بمعنین دیگر ست۔ فافہم۔
یا ادّعائے ایں کہ توسن فلک
از ہم عنانی آں رخشش وا ماندہ۔
و رخش مذکور بسبب سرعت سیر
از زمان و زمانیات و فلک و فلکیات
گذشتہ بعالم بالا رسیدہ۔ کہ
بقا در آں عالم بغیر ازدیاد عمر
حاصل ست۔ کہ جرّد العقول
عند الحکماء الفحول مخلوۃ
عن الزمان و امتدادہ واللہ
الاعلم بمراد عبادہ۔ پوشیدہ
نماند۔ کہ ادعائے سببیت و مسببیت
بر دو قسم ست۔ یکے آنکہ اصل شے
موجود باشد و مسببیت آں ادعائی بود
دوئم آنکہ شے معدوم را موجود فرض کردہ
مسببیت برائے آں قرار دہند۔ و شعر شیخ حزیں
از قسم اوّل و شعر فردوسی و سعدی و ما نحن فیہ
از قسم دوئم ست۔ چہ سبز فامی خط محبوب
متحقق است۔ اگرچہ علتش ادعائی ست
بخلاف شش گشتن زمین و ہشت گشتن
آسمان و استقامت فلک و تاخر سن

ہونے کے کہ ان میں وجود سببیت و مسببیت دونوں ادّعائی ہیں +	کہ وجود سببیت و مسببیت ہر دو ادّعائی ست[۱] +

(۲۲) سید المتکلمین آیۃ اللہ فی العالمین شمس العلما مولینا سید حامد حسین صاحب بارک اللہ رمسہ وثراہ ہیں[۲]۔ جن کی وسعت نظر پر استقصاء الافحام و عبقات الانوار دو لاجواب کتابیں شاہد عادل ہیں۔ یہ بزرگوار بھی مثل جناب مفتی صاحب (اعلی اللہ مقامہ) کے میر و میرزا دونوں شاعران اہلبیتؑ کے قدرشناس و مدّاح تھے۔ چنانچہ صاحب ردّ الموازنہ نے بحوالہ مولوی حسن مرزا صاحب مرحوم کے کتاب مذکور میں لکھا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی اس ٹیپ کو جو اسپ امام حسینؑ کی شان میں ہے۔ وہ جناب پڑھ کر فرماتے تھے۔ کہ یہ مضمون تو فارسی میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ (ٹیپ یہ ہے) ؎

طے ہر قدم پہ ایک مہینے کی راہ ہے + رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ ہے

یہ ظاہر ہے۔ کہ ائمۂ اطہارؑ اپنے شاعروں کی عزت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ اور علماء اُن حضرات کے نائب ہیں۔ اس امر میں بھی یہ بزرگوار اپنے آقاؤں (ائمۂ اطہارؑ) کے قدم بقدم رہے ہیں۔ یہی حال آیۃ اللہ فی العالمین کا تھا۔ اور اب اُن کے جانشین صدر المحققین مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی ویسی ہی عزت افزائی میر و میرزا کے جانشینوں اور اولاد کی اور اور شعرائے اہلبیتؑ کی فرماتے ہیں۔

[۱] یہ رسالہ عشرہ کاملہ ۱ جمادی الاول ۱۲۹۶ ہجری کو مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ میں چھپا ہے۔ اور میرے کرم فرما میر علی صاحب (عارف) کی اس پر تاریخ بھی ہے۔ مگر عارف صاحب اُس زمانہ میں علی تخلص کرتے تھے کہ مشق سخن کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اب ماشاء اللہ شاعر کامل بلکہ عارف کامل ہیں۔ اور خاندان جناب میر صاحب میں اُن سے بہتر مرثیہ گو شاعر حقیر کے نزدیک اب نظر نہیں آتا + ۱۲ مؤلف حقیر

[۲] حقیر نے جو وقت انتقال تاریخ وفات جناب آیۃ اللہ فی العالمین کہی تھی۔ وہ اودھ اخبار و اخبار المومنین و وطن ہند وغیرہ سے اخبار وں میں اُسی زمانہ میں چھپی تھی۔ مادّہ کا مصرع یہی کہا تھا ع بارک اللہ رمسہ وثراہ۔ اس میں سے بلا کسی قسم کے تعمیہ کے پورے سنین وفات ۱۳۰۶ ہجری نکلتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر

فصل ۳ السکلمین سید حامد حسین صاحب آیۃ اللہ

اور اُن بعض مجالس میں کہ جن میں جناب مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ یا میر عارف صاحب یا میر رشید صاحب یا دولہ صاحب پڑھتے ہیں تشریف لے جا کر داد نظم کا خلعت فاخرہ عطا فرماتے ہیں۔ اور ایسا ہی شعرا اور علما کا ہے۔ خدا علما کا سایہ ہمارے سر پر رکھے۔ اور ہم کو اُن کی تعمیل احکام کی توفیق عطا فرمائے۔

فصل ۴ مولوی سید علی حسن صاحب قبلہ شمس طاب ثراہ

(۴) مولوی سیّد علی حسن صاحب قبلہ شمس جو لکھنؤ میں ایک مستند عالم و ادیب مانے جاتے تھے ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ مگر ایسے محتاط و متقی۔ کہ لکھنؤ میں یہ بات مشہور ہے۔ کہ کبھی نہ کسی سودی مقدمہ میں وکیل ہوئے۔ نہ اُس فریق کے وکیل بنے۔ جس کا باطل پر ہونا اُن کو ثابت ہو گیا۔ اور وکیل کو اکثر بات چیت کرنے پر موکل سے اُس کا حق یا باطل پر ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ ان کے فضل و کمال پر ان کا وہ لاجواب قصیدہ عربی شاہد عدل ہے۔ جس کے اشعار کئی ہزار ہیں۔ اور ایک قصیدہ میں تمام واقعات اختصاراً عہد جناب رسالت مآب صلعم سے لیکر شہادت امام حسینؑ کے بعد تک کے نظم فرمادئے ہیں۔ یہ قصیدہ اُن کے کامل و فاضل فرزند مولوی غلام جبّار صاحب وکیل ہائی کورٹ نظام دکن نے چھپوا دیا ہے۔ حقیر کے پاس موجود ہے*۔ اور اس قصیدہ کے علاوہ اور بھی بعض ان کی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ جو اِن کے ادیب اکمل ہونے پر برہان قاطع ہیں۔ یہ بزرگوار بھی مدۃ العمر مرزا صاحب کے فضل و کمال کے مداح رہے۔ کہ جس سے اہل لکھنؤ واقف ہیں۔

فصل ۵ سید غلام حسنین صاحب کنتوری مدظلہ العالی

(۵) مولانا السیّد غلام حسنین صاحب قبلہ کنتوری مدظلّہ العالی جن کی لاجواب کتابیں

* قلائد الغرائد اس قصیدہ کا نام ہے۔ عربی میں یہ قصیدہ ہے پہلا شعر یہ ہے۔ لک الحمد یا ربّ لما لشیّد۔ و ربّ المرامی البساط الممہد۔ ولادت حضور صلعم سے قصیدہ شروع کیا ہے ۳۴۳ صفحہ ہیں۔ اور ہر صفحہ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ اور کم سے کم آٹھ دس شعر ہیں۔ اگر دس شعر فرض کیجئے تو تین ہزار سے اوپر اشعار ہوئے۔ یہ ایک ہی قصیدہ دلیل کمال ہے۔ مطبع مطلع الانوار لکھنؤ میں سنہ ۱۳۱۶ ہجری میں چھپا ہے۔ خدا کی شان ہے۔ ایسے ایسے اکمل فن بھی ہوتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

مآتین و انتصار الاسلام و لائف زبان حال سے کہہ رہی ہیں۔ کہ مرزا دبیر کے کلام و کمال کا سکہ ان کے دل پر پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ مآتین میں جا بجا مرزا صاحب کی تصنیفات پر اشارے[1] فرما گئے ہیں۔ اور کبھی کبھی میر صاحب و مرزا صاحب کے اشعار آبدار سے اپنی لاجواب تصنیفات کو رونق بخشتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی مصنف کسی شاعر کا کلام اپنی تصنیف میں اُسی حالت میں لائیگا جب اُس کو پسند کریگا۔ ۱۸۷۲ء کے قریب قریب مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ کے یہ بزرگوار منتظم اعلےٰ تھے[2] اور از لبسکہ اُس زمانے میں دبیرؔ و انیسؔ زندہ تھے۔ اور اُس زمانہ میں اُن کے کلام اور افضلیت کی بحث ہر جلسہ اور ہر طبقہ کے آدمیوں میں رہتی تھی۔ مدرسہ ایمانیہ کیوں اس سے مستثنےٰ رہتا۔ ہر چند شاعر کہا کریں۔ کہ یاران شعرا بمدرسہ کہ برد۔ اور مدرس لاکھ کوششیں کریں۔ کہ شعر و شاعری کا چرچا مدرسہ میں نہ ہو۔ کہ اس سے لڑکوں کے سبق یاد کرنے میں حرج ہوتا ہے۔ مگر لڑکے کب مانتے ہیں۔ چنانچہ اُس زمانے میں مدرسہ ایمانیہ میں بھی یہ بحثیں رہتی تھیں میں اس

مدرسہ ایمانیہ
دبیر و انیس [illegible]

---

[1] چنانچہ مآتین جلد اول مطبوعہ کے صفحہ ۲۰۸ پر جہاں آخر منزل سفر امام حسینؑ کا بیان ہے وہاں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ تو ثابت ہوگیا کہ جو بعض شعرا نے نظم کیا ہے وہ بھی صحیح ہے کہ ببولوں کے کانٹوں سے بدن اصحاب کے زخمی ہوگئے تھے اور یہ مضمون مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے۔ بیت منزل دراز رہت بیہ راہ بے نشاں جنگل سبب خار مغیلاں یہاں وہاں + تن غازیوں کے کانٹوں سے افگار ہوگئے + آگو وہ خار گل بے خار ہوگئے + ملاحظہ ہو یہ مرثیہ مرزا صاحب کا بعد دست خیبر کا قوت بازو حسینؑ ہے۔ اور اسی تحریر میں مرزا صاحب نے وہ روایت بھی نظم فرمائی ہے۔ کہ منزل کربلا پر پہنچکر امام حسینؑ کے ایک رفیق نے بیری کے درخت کی ایک شاخ کاٹی۔ تو اُس سے خون تازہ جاری ہوگیا۔ یہ روایت بھی بعض شعراء اہلبیتؑ کے نظم کے حوالے سے صفحہ ۲۶۸ پر مآتین میں درج ہے اسی طرح اور بھی بعض روایات لکھتے وقت علامہ مد ظلہ بعض شعراء اہلبیتؑ کے لفظ سے مرزا مرحوم کی نظم کا حوالہ فرما گئے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] حقیر کو بھی اُس مدرسہ میں اُسی زمانہ میں پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ بعض روایات کی نسبت جو مآتین میں بعض شعراء اہلبیت کے مرثیوں میں نظم کرنے کا حوالہ درج ہے۔ وہ علامہ مد ظلہ سے پوچھ لوں۔ کہاں مقامات پر مرزا دبیر مرحوم کے مرثیوں سے آپکی مراد ہے۔ کیونکہ وہ روایات بجز نظم مرزا مرحوم اور دوسرے شاعر کے مرثیوں میں میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ اور میں نے لکھنؤ سے صفر ۱۳۳۰ھ میں ایک عریضہ بھی فیض آباد خدمت علامہ مد ظلہ میں بھیجا۔ مگر جواب آیا۔ یہ خیال کیا۔ کہ کثرت تصنیف وغیرہ سے فرصت نہ ہوگی پھر خاموش ہو رہا ۱۲ مؤلف حقیر

سید محمد مہدی صاحب وکیل الٰہ آباد

واقعہ کو علامہ کنتوری مدظلہ کی الالئف سے انہیں کے متبرک الفاظ میں لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۷۲ الالئف کا "اے حبیب حسین* میرے درجہ کے طلبہ اور نیز دیگر درجہ کے طلبہ جو اعلےٰ طبقہ کے تھے۔ سب میں ایک لڑکا سید محمد مہدی نصیر آبادی تھا۔ (جو آج کل بڑے نامی گرامی وکیل الٰہ آباد کے ہیں)۔ اُس کی ذہانت اور تیزی ایسی تھی۔ کہ میں نے ایسا ذہین اور زود فہم لڑکا نہیں دیکھا۔ میں اُس کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ شاید اکثر میرے ہی قریب شب کو رہتا تھا۔ اور تمام طلبہ کو اُس سے رشک اور غبطہ ہو رہا تھا۔ یہ ساری جماعت اطفال انیسیہ مشہور تھی یعنی میر انیس مرحوم کے کلام پر گرویدہ تھے۔ اور محمد مہدی سلمہ اللہ آپ کو دبیریہ کہتا تھا یعنی مرزا دبیر مرحوم کے کلام دقیق پر زیادہ راغب تھا۔ اور یہ محض لڑکپن دونوں گروہ کا (تھا)۔ اس لئے کہ اہل علم کی شان ارفع ہے اِس جھگڑے سے۔ پھر چونکہ یہ اکیلا اور سب کی نظروں میں خار تھا۔ لہٰذا اس مسئلہ میں محمد مہدی اور دیگر طلبہ سے مباحثہ زیادہ رہا کرتا تھا۔

اغراض

ایک روز روتا ہوا محمد مہدی میرے پاس آیا۔ اور لوگوں کی کاوش اور پرخاش بے جا کی از حد شکایت کی۔ میں نے کہا۔ کہ دو شعر میر انیس کے ہم تم کو بتلاتے ہیں۔ اُن کے معنی تم اپنے مخاطبین سے پوچھو۔ پہلا شعر

جب قتل کی شب سبطِ نبیؐ کو خبر آئی ✤ اے چاند ید اللہ کی شب دوپہر آئی

یہ خبر کہاں سے آئی؟ خبر کا آنا اُسی جگہ بولا جاتا ہے۔ کہ دُور مقام سے وہ خبر آئی ہو۔ ایضاً دوسرا یہ شب کا ہونا محسوسات سے ہے۔ جو ہر شخص بذاتہ جان سکتا ہے۔ خبر دہی کا محتاج نہیں ہے۔ اور محسوسات کی خبر دہی اُسی مقام پر ہوتی ہے۔ جو ہماری حس سے غائب ہو۔ دُوسرا شعر

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری سے ✤ چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

* قریباً ۱۸۷۰ء کا یہ تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس کے چار برس بعد میر صاحب و مرزا صاحب کا انتقال ہوا ہے ۱۲ مولف حقیر۔

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ آستین کا چُنوانا زینت کے واسطے ہوتا ہے۔ اور جھُرّیاں پڑنے سے آدمی کے بدن کی زینت جاتی رہتی ہے۔ پس یہ تشبیہ بطور مدح کے ہے یا بطور ذم کے۔ کیا غرض شاعر کی ہے؟ میری غرض میر انیس پر اعتراض کی نہ تھی۔ بلکہ اُن اطفال کو جو روزانہ بیہودہ بحث کر کے اپنے اوقات عزیز کو خراب کرتے تھے۔ اور علم معانی و بیان جو اُن کو پڑھنا ضرور تھا۔ اُس کی جگہ یہ بحث کرتے تھے۔ بقول مشیرؔ
جھگڑا ابکر کا ہے نہ جناب امیرؑ کا * اب قصّہ رہ گیا ہے انیسؔ و دبیرؔ کا
یہ لغو بحث نہ دینی ہے نہ دنیوی۔ **خلاصہ**۔ محمد مہدی نے اُن اطفال سے یہی دو شعر پیش کر کے زور شور سے بحث کی۔ وہ جماعت چونکہ ابھی قواعد بلاغت سے واقف نہ تھی۔ جواب سے عاجز ہو کر بخدمت میر انیس مرحوم گئے۔ میر صاحب نے خلق عمیم سے اُن کو طلبہ مدرسہ سمجھ کر بلایا۔ اور اپنے پاس بٹھایا۔ پہلے سے میر صاحب کو ان اطفال کا اپنا معتقد ہونا معلوم تھا۔ اس کے بعد پوچھا۔ آج بے وقت کیوں آئے؟ اُن اطفال نے بے سمجھے بوجھے ساری کیفیت بیان کی۔ اور محمد مہدی کا ذکر کیا۔ کہ ہماری جماعت میں وہی ایک دبیریہ ہے۔ اور ہم کو روزانہ دق کرتا ہے۔ اور آپ کے کلام کے اغلاط نکالا کرتا ہے۔ میر صاحب کو ان کا کلام صحیح نہ معلوم ہوُا۔ بلکہ اُلٹا سمجھے۔ کہ یہ لڑکے مجھ پر اعتراض کرنے آئے ہیں۔ نہایت برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے دُور ہونے کا حکم دیا۔ اور جواب سوال کچھ بھی نہ دیا۔ وہ لڑکے محجوب ہو کر واپس آئے۔* پھر اُس روز سے محمد مہدی کا پیچھا چھُوٹا۔ اور وہ بحث بے جا بالکل اُٹھ گئی۔ اور ہماری غرض اسی قدر تھی۔ اصل کلام کا صحیح یا غلط ہونا یہ مقصود نہ تھا۔" میں (بے بضاعت) عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت علامہ کنتوری

طلبا کا جناب انیس میں بخدمت

* خواہ مخواہ جو لوگ میر صاحب یا مرزا صاحب کے کمالات سے انکار کرتے ہیں اور خاک نہیں سمجھتے۔ اور پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کو یُوہیں اکثر شرمندہ ہوتے دیکھا ہے ۱۲ مؤلف۔

میر صاحب کے کمال کے بھی قائل ہیں۔ اور یہ دونوں اعتراض اُنہوں نے محض اس غرض سے فرمائے تھے۔ کہ روزمرہ کی یہ بحث لڑکوں میں سے دُور ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ ورنہ یہ دونوں شعر قابل اعتراض نہیں ہیں شعر اوّل الذکر تو یوں صحیح ہے۔ کہ جملہ کی دو قسمیں ہیں۔ یا انشائیہ یا خبریہ۔ اور ظاہر ہے۔ کہ یہ جملہ کہ "دوپہر رات آئی" خبریہ ہے۔ پس ایسی جگہ کہ جب کوئی شخص وقت کی خبر دے۔ خبر دینا یا خبر آنا ہی کہا جائیگا۔ جو چیزیں محسوسات سے متعلق ہیں۔ اُن کی بھی خبر آتی ہے۔ مثلاً کسی وقت چاند گہن ہو۔ اور کوئی شخص کسی شخص سے کہے۔ کہ چاند گہن کی نماز پڑھو۔ اس وقت چاند کو گہن لگا ہے۔ تو اس کو خبر دینا یا خبر آنا ہی کہینگے۔ خواہ وہ مقام بعید سے آئے یا قریب سے۔ دُوسرے اعتراض کا جواب میرے نزدیک یہ ہے۔ کہ ہر چیز کا حُسن اُس کے اصلی اسباب سے ہے۔ مثلاً موسم گرمی کا حُسن یہ ہے۔ کہ گرمی خُوب پڑے۔ آدمی پسینے میں شرابور ہو جائے۔ جاڑے کا لُطف یہ ہے۔ کہ سردی کی شدت سے کانپے اور تاپے۔ بڑھاپے کا لُطف اس میں ہے۔ کہ ضعیفی کے آثار ظاہر ہوں۔ کہ جن میں ہاتھوں پر جُھریوں کا پڑنا بھی ہے۔ اور بیشک آستین زینت کے واسطے چُنتے ہیں۔ پس یہاں خود ضعف پیری نے جامہ اصلی یعنی جسم کی آستینوں کو چُنا ہے کہ حُسن پیری کا ظاہر ہو۔ اور یہ بڑھاپے کی مدح ہے۔ ذم نہیں ہے۔ ایک میرے بزرگ (عزیز) نے (جن کا نام آغا سیّد صاحب مرحوم اور تخلص محبّت* تھا) پیری کے متعلق کیا خُوب شعر کہا ہے۔ ہدیۂ ناظرین کرتا ہُوں ؎

جواب اعتراض

*آغا سیّد صاحب محبّت لکھنوی مرحوم جناب آغا عشق لکھنوی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ جو میرے دُور کے رشتہ دار تھے۔ میرے پاس کوٹہ میں بھی تشریف لائے اور چند روز مہمان رہے تھے۔ اور جب میں ۱۳۱۱ھ میں کربلائے معلےٰ سے واپس آتا تھا۔ تو یہ مشہد مقدس جانے کو بمبئی میں آئے تھے۔ وہیں آخری ملاقات ہُوئی تھی۔ (المؤلف) صُورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ نقشے یاد ہیں۔ کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

چمک کے کہتے ہیں مُوئے سفید پیری ہیں ٭ کہ اپنے عہد کے اہل شباب ہم بھی ہیں

فصل ۶ — مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب

(۶) **مولوی سید صدیق حسن خاں صاحب محدّث** جو فرقۂ اہل حدیث کے ایک عالم کامل علم دوست رئیس گذرے ہیں۔ اور جن کی تصانیف سے بہت سی کتابیں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب **حدیث غاشیہ** میں مرزا صاحب کی یہ رباعی لکھی ہے۔ جس سے ان کی پسند طبعی و رجحان کا حال معلوم ہوتا ہے۔٭

رباعی

کس خواب میں زندگی بسر کرتا ہے؟ ٭ کس فکر میں شام کو سحر کرتا ہے؟
طالع ہوئی صبح بج گیا کوس رحیل ٭ بیدار ہو۔ قافلہ سفر کرتا ہے

فصل ۷ — مولوی عبدالحی صاحب عالم کامل حنفی

(۷) **مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی فرنگی محلی**۔ یہ فرقۂ احناف کے متکلمین میں فرد مانے جاتے ہیں۔ مولوی صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی کے جواب میں جو ان کی کتابیں ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے خدا کی شان اور ان کے کمال و ادب کی آن بان نظر آتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ مولوی صدیق حسن خاں صاحب ہزاروں روپیہ اہل زبان (عربوں) وغیرہ کو جابجا بھجواتے رہتے تھے۔ اور غالباً اپنی کتابیں اُن کو دکھا کر زبان کے متعلق بلاغت و فصاحت کی صیقل کرا لیتے تھے۔ جیسا کہ سُنا گیا ہے۔ یہ اُن کے مقابلہ میں ایک غریب (مفلس) تھے۔ مگر انھوں نے محنت کرکے خود ہی اپنی عبارتوں کو ایسا فصیح و بلیغ لکھا ہے۔ کہ دیکھنے والے کو علاوہ اور کمالات کے انکی سلاست و بلاغت و فصاحت زبان پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ ایسے ادیب کامل بھی میر و مرزا کے کمالات کے قائل تھے۔ چنانچہ میرے کرم فرما مولوی سلیم الدین صاحب

٭ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کہ جب تک کسی کے کلام کو کوئی مصنّف یا مؤلف دل سے پسند نہ کرے اپنی کتاب میں نہیں لکھتا۔ خصوصاً مولوی صدیق حسن خاں صاحب تو بہت کم کسی شاعر اردو کا کلام اپنی تصانیف میں لاتے ہیں۔ پس اس سے ان کی پسند کا پتہ چلتا ہے۔ مؤلف حقیر۔

درویش سیاح* ناقل ہیں۔ کہ ایک مرتبہ میں مولوی عبدالحی صاحب کی زندگی میں لکھنؤ میں گیا۔ مولوی صاحب سے حسن عقیدت تھی۔ اُن کی خدمت میں پہنچا۔ نہایت خُلق و مروت سے پیش آئے۔ روزمرہ حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز میں نے عرض کیا۔ کہ لکھنؤ کی وہ تمام چیزیں جن کی میں تعریف سُنتا تھا دیکھ چکا۔ دبیرؒ و انیسؒ کی شاعری (مرثیہ گوئی) کی بہت تعریف سُنی تھی۔ افسوس وہ دونوں کامل گذر گئے۔ اب آپ مجھے کسی ایسے شخص سے ملا دیجئے۔ جو ان کا کلام صحیح مجھے سُنا دے۔ فرمایا۔ اچھا آج آپ رات کو میرے پاس آئیے۔ رات کو حاضر خدمت ہُوا۔ تو بالکل تخلیہ تھا۔ مجھے یہ خیال تھا۔ کہ شاید کسی ایسے شخص کو مولوی صاحب مرحوم نے بلایا ہوگا۔ جو اُن کا کلام مجھے سُنا دے۔ مگر وہاں کسی اور کو نہ پایا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ دبیرؒ و انیسؒ کا کلام سنو گے؟ میں نے عرض کی۔ حضُور دل تو بہت چاہتا ہے۔ فرمایا۔ اچھا۔ ایک جلد نکالی۔ اُس میں سے دونوں بزرگوں کے مختلف مرثیوں کے منتخب بند مجھے سُنائے۔ اور فرمایا۔ کہ ایسے کامل شاعر ہندوستان میں تو کیا عرب و عجم میں بھی نہیں نکلینگے۔ اور درحقیقت وہ تمام بند جو انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے پڑھے لاجواب تھے۔

فصل ۸ مولوی عبدالعلی صاحب آسی

(۸) مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی۔ یہ بھی فرقہ احناف میں اعلےٰ درجہ کے عالم اور ادیب کامل گذرے ہیں۔ ابھی دو تین برس ہُوئے لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ان کے حاشیے بڑی بڑی کتابوں پر زبان حال سے ان کے کمال تبحّر کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ بھی مرزا صاحب مرحوم کے کمال کے تمام عمر معترف رہے۔ جب مرزا مرحوم کے مشہور مادۂ تاریخ **طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس** پر انیسیوں نے اعتراض کیا۔ کہ سنین مقصود نہیں نکلتے۔ تو انہوں نے مرزا صاحب کی تائید میں ایک مبسوط رسالہ لکھ کر اہل ملک کو سمجھایا اور ثابت کیا تھا۔ کہ سن مقصود کے اعداد نکلتے ہیں۔ اور اعتراض غلط ہے۔

* مولوی سلیم الدین صاحب ایک صوفی مشرب بزرگ ہیں۔ جو بھرت پور میں اکثر رہتے ہیں۔ آج کل مئی ۱۹۱۲ء میں کوٹہ راجپوتانہ میں آئے ہوئے ہیں۔ یہیں مجھ سے یہ حکایت انہوں نے ایک دن بیان کی ۱۲ مؤلف

مرزا صاحب کی تاریخ وفات بھی کہی تھی۔ جس کا ایک شعر میں لکھ چکا ہوں +

وصلہ حضرت غالب مرحوم

(۹) مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم دہلوی۔ یہ کامل اپنے معاصر مرزا دبیر مرحوم کے کمال کے بدرجہ کمال معترف و مدّاح تھے۔ اور میں نے لکھنؤ کے بعض مُسن آدمیوں سے سُنا ہے۔ کہ جب مرزا غالب (۱۲۵۲ھ کے قریب قریب) لکھنؤ میں آئے تھے (اُس وقت مرزا دبیر کی شُہرت کا آفتاب عروج پر تھا)۔ وہ مرزا دبیر سے ملے تھے۔ پھر اُس کے مدّت دراز کے بعد ان کے بھانجے مرزا عبّاس بیگ مرحوم لکھنؤ کی قسمت میں (بعد غدر ۱۸۵۷ء) اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ اور کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی رہے۔ لکھنؤ میں پھر اُنھوں نے پنشن بھی لیلی تھی۔ یہ مرزا صاحب کے کلام کے فدائی تھے[۱]۔ ان کے پاس جوان کے ماموں مرزا غالب مرحوم کے خطوط آتے تھے۔ اُن میں ہمیشہ مرزا دبیر کو وہ سلام اور کبھی کبھی مختصر پیام اشتیاق ملاقات بھی لکھا کرتے تھے۔ ڈپٹی عبّاس بیگ مرحوم کے بیٹے مرزا فیاض بیگ منصف حاتم تخلّص میرے نانا (میر محمد ظہیر)[۲] اور جناب مرزا اوج صاحب مدظلہ العالی کے شاگرد بھی تھے۔ افسوس کہ وہ بھی انتقال فرما گئے۔ اب کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔ جو وہ خطوط نکال دے۔ نہ اس امر میں کوئی بحث ہے۔ کہ مرزا غالب مغفور مرزا دبیر مرحوم سے ملے تھے یا نہیں۔ مطلب تو فقط اتنا ہے۔ کہ وہ مرزا دبیر کے کمالات کے اور مرزا دبیر اُن کے دل سے مدّاح تھے۔ اس کا ثبوت تحریری حسب ذیل ہے:۔

جلوۂ خضر

(۱) منشی فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی اپنے تذکرہ جلوہ خضر کے جلد اوّل کے

---

[۱] میں نے فروری ۱۹۱۲ء میں مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ کے ہمراہ جا کر سرور جنگ بہادر سے اس امر کو تحقیق کرنا چاہا۔ کہ لکھنؤ میں آنے پر مرزا غالب مرحوم مرزا دبیر مغفور سے ملے تھے یا نہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ تحقیق تو یاد نہیں ہے۔ مگر مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ چچا ڈپٹی عباس بیگ صاحب کہا کرتے تھے۔ کہ مرزا غالب مرزا دبیر سے ملے تھے +

[۲] ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے یہاں عشرہ محرم میں رات کو مجلس ہوتی تھی۔ میر ظہیر مرحوم پڑھتے تھے۔ تمام شاہزادے اور عمائد شہر کا مجمع ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اپنے نانا مرحوم کے ہمراہ گیا۔ اور اُن کی پیش خوانی میں سلام پڑھا ہوں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

صفحہ ۲۲۵ پر ۱۸۶۲ء میں بمقام دہلی مرزا غالب مرحوم کے حالات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا غالب صاحب کی صحبت میں ایک دن مرثیہ کا ذکر آگیا۔ فرمایا۔ کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا۔ تین بند لکھکر دیکھا۔ تو واسوخت ہو گیا۔ وہ بند یہ ہیں :-

مرثیہ مصنفہ غالب مرحوم

*

(۱)

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو۔ بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے مُحابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہِ نہ پایہ جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں۔ اس رو سے کہو برق نہیں ہے

یہ بند مجمع میں پڑھکر مرزا غالب نے فرمایا۔ کہ "واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا"۔

* ناظرین! اس بندۂ ناچیز کے کہنے سے ان بندوں کو بنظرِ غور ملاحظہ فرمائیے۔ بندشِ الفاظ، طرزِ بیان، مضمون آفرینی۔ زبان سب باتوں کو دبیرؔ و انیسؔ کے کلام کا طرز ذہن میں ملحوظ رکھکر دیکھئے۔ مجھے آئندہ اس کی نسبت ایک بحث کرنا ہے۔ آپ کو (جج) حَکَم بنا کر اسکا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مرزا غالب مرحوم مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کو سب مرثیہ گویوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اب یہاں ایک وہم پیدا ہوتا ہے۔ جس کو بعض میرے دوستوں (طرفدارانِ میر انیس صاحب) نے مجھ سے بیان فرمایا۔ اور وہ یہ کہ میر صفیر جس طرح مرزا غالب کے معتقد اور شاگرد تھے۔ اُسی طرح مرزا دبیر کے۔ شاید اُنھوں نے اپنے ایک اُستاد مرزا دبیر مرحوم کی طرفداری میں یہ الفاظ لکھ دئے ہوں۔ اس لئے مَیں نے اس باب میں زیادہ چھان بنان کی مثل مشہور ہے۔ کہ جوئندہ یابندہ۔ مجھے ایک غیر شخص حنفی المذہب کی تحریر ملی۔ جو مرزا دبیر کے نہ شاگرد ہیں نہ طرفدار۔ وہ کون؟ مولوی محمد امجد علی صاحب ریاض۔ یہ بزرگوار محرم ۱۲۷۷ھ میں غدر ۱۸۵۷ء کے تخمیناً تین چار برس بعد دہلی کے دیکھنے کو متھرا سے گئے ہیں۔ مرزا غالب مرحوم کی خدمت میں بھی پہنچے۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ ۱۲ محرم ۱۲۷۷ھ کے واقعہ میں اپنی کتاب (سرورِ ریاض) مطبوعہ میں لکھتے ہیں "بعدہٗ مرزا (غالب) نے ۳ بند اپنے مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سُنائے۔ لوگ روئے پیٹے۔ چلّائے۔ وہ بند مَیں نے طلب کئے۔ مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دئے"۔ (یہاں وہی ۳ بند لکھے ہیں۔ جو مَیں جلوۂ خضر سے اُوپر لکھ چکا ہُوں) پھر مولوی امجد علی صاحب ریاض لکھتے ہیں۔ کہ مرزا خود فرماتے تھے۔ کہ "یہ حصّہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ ناتمام رہ گیا"۔ ان روایتوں کا سُننے والا منصف مزاج کم سے کم اتنا فیصلہ تو ضرور کریگا۔ کہ اس باب میں مرزا غالب غالباً تفضیلیہ تھے۔ یہاں تفضیلیہ سے میری مراد یہ ہے۔ کہ وہ مرزا دبیر کو اُن کے تمام معاصر مرثیہ گویوں پر ترجیح و تفضیل دیتے تھے۔ مگر میرے اور معاصرین نے اس باب میں جو جو صناعیاں اور موشگافیاں اور کوششیں فرمائی ہیں۔ اُن کو لکھنا بھی مَیں اپنا فرض مؤرخی سمجھتا ہُوں۔ ان میں سے ایک ہمارے مخدوم مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مد ظلہ العالی

مولوی محمد امجد علی صاحب ریاض کا

حضرت حالی مد ظلہ العالی

ہیں - جو غالباً تمام یا اکثر لکھنؤ کے شاعروں کو ناقص اور دہلی والوں کو کامل ثابت کرنیکی کوشش فرماتے ہیں - خواجہ صاحب موصوف کا دیباچہ دیوان حالی میرے اس خیال کی تائید کر رہا ہے - کہ اُس میں جتنے شاعری کے نقص اور کمزوریاں بیان فرمائی ہیں - اکثر میں لکھنؤ والوں کے اشعار نظیراً پیش کئے ہیں - اور جتنے شعر کی عمدگیاں اور لطائف بیان کی ہیں سب یا اکثر میں دہلی کے شاعروں کے اشعار لائے ہیں - یہاں تک کہ لکھنؤ والوں کی وہ مثنوی بھی بادِ سموم عیوب شاعری سے نہیں بچی - جو ہم لکھنؤ والوں کے لئے مایۂ ناز ہے - جس کو گلزارِ نسیم کہتے ہیں - حالانکہ پروفیسر آزاد مرحوم بھی اُس مثنوی کو بے مثل آبِ حیات میں بتلا چکے ہیں - اور غالباً کسی دہلی کے منصف مزاج شاعر کو اُس کی یکتائی میں کلام نہیں ہے - اس امر کی شکایت تنہا مجھ کو نہیں ہے - بلکہ عموماً لکھنؤ والوں کا یہی خیال ہے - جیساکہ وکیل ہائی کورٹ منشی چک بست صاحب کشمیری پنڈت نے شرح دلبسط کے ساتھ لکھا ہے - یہ بھی اس موقع پر لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا - کہ مولوی حالی صاحب بھی سمجھے ہوئے ہیں - کہ میر انیس مرحوم جو یہ فقرہ اکثر لکھنؤ والوں سے فرمایا کرتے تھے - کہ صاحبو لکھنؤ والے یوں نہیں بولتے - یہ میری خاص زبان ہے - وہ گویا دہلی کی زبان پر فخر کرتے تھے* یہ خیال غلط غالباً پہلے پہل پروفیسر آزاد مرحوم کو پیدا ہوا تھا - اور اسی بنا پر اُنہوں نے (غالباً) میر صاحب کو مرزا صاحب پر تفضیل دینے کی کوشش فرمائی مگر پھر بھی مزاج میں انصاف تھا - مرزا صاحب کے کمالات کا بھی کچھ نہ کچھ اعتراف فرمایا - مولوی حالی صاحب کا دیباچہ دیوان آبِ حیات کے بعد کی تصنیف ہے - گویا وہ نقش اوّل تھا - اور یہ نقش ثانی - اُس سے بڑھ کر آب و تاب دکھلائی - اور میر صاحب کو مرزا

گلزارِ نسیم

* پس میر صاحب کو دہلوی اور مرزا صاحب کو لکھنوی سمجھ کر مولوی حالی صاحب نے غالباً (حضرت غالب مرحوم کے خیال کے خلاف) میر کو مرزا پر تفضیل دی - حالانکہ واقعہ معکوس ہے مرزا صاحب دہلی کی پیدائش ہیں - مگر بجز دو چار لفظوں کے اُن کی زبان مستند لکھنؤ کی زبان ہے جس کی سند تمام لکھنؤ اور محلات شاہی تک میں لی جاتی تھی ۱۲ مؤلف حقیر

صاحب پر خوب خوب تفضیل دی۔ (بقول غالب مرحوم) ؎

پہلے اس دل پر بھلا لگتا تھا داغ + زخم لیکن داغ سے بڑھ کر کھلا

حالانکہ میر صاحب کے قول مذکورہ کی تشریح جو میر مہدی حسن صاحب احسن مؤلف واقعات انیس نے فرمائی ہے۔ واقفان راز جانتے ہیں۔ کہ وہ صحیح ہے۔ جس کو میں اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھ آیا ہوں۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ میر صاحب فیض آباد کی بافیض زبان پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ جہاں کی وہ پیدائش تھے۔ اور جہاں اوّل اوّل زبان اردو کی درستی شروع ہوئی۔ اور جس کی تکمیل لکھنؤ میں آخر کار ہوئی۔ بہرحال مولوی حالی صاحب یادگار غالب کے صفحہ ۲۸ و ۳۰۸ پر یہ لکھتے ہیں "۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم کی خواہش سے مرزا غالب نے ۳ بند اردو مرثیہ کے لکھے چونکہ اس کوچہ میں قدم نہ رکھا تھا۔ اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی۔ جس کو لوگ حد کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا مشکل سے مسدس کے ۳ بند لکھے۔ جس میں کا پہلا بند ہم کو یاد ہے۔ یہاں نقل کیا جاتا ہے ع ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو الخ "۔ یہ وہی بند ہے۔ جو میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ پھر مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "یہ بند مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دئے۔ اور صاف لکھ بھیجا۔ کہ یہ تین بند محض امتثال امر کے لئے لکھے ہیں۔ ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے۔ جنہوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔ اُن کا قول تھا۔ کہ "ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا"۔ اس عبارت کو خواجہ حالی صاحب اگر یوں لکھتے۔ تو شاید زیادہ مناسب و موزوں ہوتی۔ انیس و دبیر جیسے مرثیہ گو نہ ہوئے نہ آئندہ ہونگے۔ مگر بصیغہ واحد (بجائے جمع) لکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے کسی ایک صاحب کو لکھا تھا پھر کچھ

غالب

سوچ کر دُوسرے صاحب کو بھی لکھ دیا۔ کہ کسی انیسی یا دبیری کی دلشکنی نہ ہو (ناسخ مرحوم)

زاہد کا دل نہ خاطر میخوار توڑئیے ✣ سو بار توبہ کیجئے سو بار توڑئیے

مشکل یہ آپڑی تھی۔ کہ اگر وہ اس مقام پر صرف میر صاحب کو لکھتے۔ تو یہ مقولہ حضرت غالب کا بہت مشہور ہو چکا تھا۔ کہ مرثیہ گوئی حق دبیر کا ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ صریح خلاف واقع ہوتا۔ اور اگر محض مرزا صاحب کا ہی نام لکھتے۔ تو اُن کا دل نہ مانتا۔ کیونکہ اپنے دیوان کے دیباچہ میں تو وہ ہر پہلو سے میر صاحب کو ترجیح دے چکے تھے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے۔ کہ بعض چیزوں کے میر صاحب اور بعض کے مرزا صاحب موجد ہیں۔ خیر یہاں تک بھی مرزا صاحب کے طرفدار صبر کر لیتے۔ اور یہ ممکن بھی ہے۔ کہ مرزا غالب مرزا دبیر کو عام رنگوں میں افضل سمجھتے رہے ہوں۔ اور میر انیس مرحوم کو اُن کے رنگ خاص میں اچھا سمجھا ہو۔ گو ہم رنگ ہونے کے خیال سے مرزا کے رنگ بلیغ و دقیق کو وہ زیادہ پسند کرتے ہوں۔ مگر اب یہ بھی سُنئے۔ کہ حیات انیس و واقعات انیس کے مؤلف کیا فرماتے ہیں۔ پہلے مَیں واقعات انیس (احسن صاحب) کی عبارت لکھتا ہُوں۔ (ملاحظہ ہو واقعات انیس صفحہ ۹۱) "مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہُوئی۔ اور مرزا صاحب نے غزل سُننے کا شوق ظاہر کیا۔ تو میر انیس مرحوم نے صنف غزل کا ابتذال ظاہر کر کے اکثر سلاموں کے مطلع اور شعر سُنائے۔ جو تغزل کے رنگ میں صنف غزل سے بدرجہا بلند و مضمون خیز تھے۔ اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کر دی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا۔ کہ غالب سا شاعر غالب بھی مرثیہ کی فکر کر کے دیکھ لے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار گذار ہے۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیہ کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں۔ اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کئے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ جو خط ہے۔ اُس کی عبارت یہ ہے۔ کہ امتثال امر سے مجبور تھا صرف تین بند کہکر جو غور کیا۔ تو مرثیہ کا ہیکو ہے۔ واسوخت معلوم ہوتا ہے۔

واقعات انیس میں غالب

اصل بات تو یہ ہے۔ کہ یہ آپ ہی کا کام[۱] ہے"۔ مَیں تمام طرفداران میر انیس صاحب کی طرف سے میر احسن صاحب کو مبارکباد دینے کو طیار تھا۔ کہ اُن کی تحریر سے ایک تفضیلیہ دبیر یہ غالب سا شاعر یکتا اُن کے زور قلم سے انیسیہ ہی ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ بغیر شیر یٹی رکھے ہوئے میر صاحب کا شاگرد بھی ہو گیا۔ کہ ۳۱ بند اصلاح کو بھیجے۔ مگر افسوس کہ یہ بحث اخباروں میں چھڑ گئی[۲]۔ اور مولوی حالی صاحب نے یہ استدلال تاریخی کیا۔ کہ سنہ ۱۸۳۰ء میں مرزا غالب مرحوم کا لکھنؤ و کلکتہ جانا خود مرزا غالب کے خطوط اردوے معلّٰی سے ثابت ہے۔ اور یہ زمانہ نصیر الدین حیدر شاہ دویم اودھ کا تھا اور خود میر احسن صاحب کی تحریر سے ثابت ہے۔ کہ میر انیس صاحب اُس وقت تک فیض آباد میں تھے۔ اور اُن کی شہرت بھی نہ تھی۔ وہ تو مدّت کے بعد (عہد امجد علی شاہ شاہ چہارم اودھ میں) لکھنؤ میں آئے ہیں۔ پھر مرزا غالب میر انیس صاحب سے لکھنؤ میں کیونکر مل سکتے تھے۔ وہ تو شعراء لکھنؤ میں سے صرف میر ضمیر صاحب اور شیخ ناسخ مرحوم سے ملے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم کی اُس زمانہ میں ضرور شہرت ہو جانا فسانہ عجائب سے ظاہر ہے۔ مگر اُن سے بھی مرزا غالب کا ملنا کسی روایت یا تحریر سے نہیں معلوم ہوتا۔ مگر یہ خواجہ حالی صاحب کا تحر۔ برغر ماننا شاید اُن کی ناواقفی کی بنا پر ہے۔ مَیں خواجہ صاحب سے عرض کرتا ہوں۔ کہ جب میر ضمیر صاحب سے غالب مرحوم کا ملنا آپ کو قبول ہے۔ تو پھر مرزا دبیر سے نہ ملنا آپ کیوں خیال فرماتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب کی خدمت میں مرزا صاحب ہر روز بلاناغہ صبح و شام حاضر ہوا کرتے تھے۔

---

[۱] اس موقع پر ذرا "آپ" کے ساتھ "ہی" کو دیکھئے۔ یا تو وہ محض دبیر کا حق تھا۔ یا انیس ہی کا کام رہ گیا۔ واہ حضرت احسن احسنت ہے۔

[۲] میرے پاس ریاض الاخبار لکھنؤ کے ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء و ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء کے پرچے موجود ہیں۔ مگر تمام عبارتیں اس لئے نہیں لکھتا۔ کہ کتاب بطول ہو جائیگی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور وہ مرزا کو اپنے تاج کمال کا طرۂ طرار سمجھتے تھے۔ پس یہ ممکن ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب خود ملیں۔ اور ایک ایسے شاگرد کو جو قابل فخر ہو۔ ایک صاحب کمال (غالب) سے نہ ملائیں۔ ڈپٹی عباس بیگ صاحب مرحوم کی زبانی بھی سُنا گیا ہے۔ کہ مرزا دبیر سے مرزا غالب ملے تھے۔ جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں٭ +

اس موقع پر کہ غالب و انیس و دبیر مرحومین کا ذکر خیر ہو رہا ہے۔ اور میر احسن صاحب مرزا غالب مرحوم کو گویا شاگرد انیس مرحوم قرار دے چکے ہیں۔ (گو وہ ریاض الاخبار میں اُس قول سے عود کر آئے ہیں۔ مگر وہ ایک پرچہ اخبار تھا۔ اُن کی کتاب واقعات انیس میں تو وہی مضمون درج ہے) میں یہ بھی لکھنا فرض مؤرخی سمجھتا ہوں۔ کہ مرزا غالب مرحوم نے عود ہندی کے ایک رقعہ میں میر انیس مرحوم کے ایک مشہور شعر پر اعتراض کیا ہے۔ اگر واقعی وہ شاگرد انیس مرحوم ہوتے۔ تو غالباً ایسا اعتراض نہ کرتے۔ ملاحظہ ہو عود ہندی میں رقعہ نمبر ۱۲۷ صفحہ ۱۳۳ جو خواجہ غلام غوث صاحب بے خبر کے نام مرزا غالب (مرحوم) نے لکھا ہے۔

جناب میر انیس کے شعر پر حضرت غالب (رح) کا اعتراض

اُس میں میر صاحب کی یہ بیت مشہور

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا + برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

لکھکر مرزا غالب مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ "مصرع آخر حیرت آور ہے۔ کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے۔ پھر یاد نہ ہونا اور حافظ پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلام ادق جس کا حفظ دشوار ہو شاید کوئی قسم اقسام کلام میں سے ہو۔ ہاں کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں۔ سو کلام مغلق اور کلام سہل ممتنع ضد یک دیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق کیونکر ہو سکیگا۔ اور حافظہ میں محفوظ نہ رہنا کلام مغلق اور ادق کی صفت کیونکر ٹھیریگی۔ ہاں مغلق عسیر الفہم ہوگا۔ پڑھا نہ جائیگا معنی سمجھ میں نہ آئینگے۔ سہل ممتنع کی

٭ میں بادب خدمت عالی خواجہ حالی صاحب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ آپ نے مرزا صاحب کو ہمارے مرزا صاحب سے ملا ہوا سمجھیں۔ آپکا دل مرزا دبیر سے ملے یا نہ ملے۔ مگر غالب مرحوم کا دل دبیر سے ملا ہوا ہے۔ اور مرثیہ گویوں میں وہ سب سے بہتر دبیر کو سمجھتے ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

صفت وہ تھی۔ جو فقیر اُوپر لکھ آیا۔ اس شعر سے کچھ علاقہ نہیں" ٭ اور اُوپر سہل ممتنع کی تعریف اسی رقعہ میں مرزا غالب مرحوم یہ لکھ چکے ہیں "سہل ممتنع اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں۔ کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے۔ اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صنف پر مشتمل ہیں۔ اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوہ کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کریگا۔ تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائیگا" ٭

اب بے بضاعت مؤلف کتاب عرض کرتا ہے۔ کہ جن صاحبوں نے مثل میر احسن صاحب و مولوی اشہری صاحب میر انیس مرحوم کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اُن کا فرض تھا۔ کہ مرزا غالب مرحوم کا یہ اعتراض لکھ کر اگر اس کو غلط سمجھتے تو جواب لکھتے۔ مگر وہ دونوں شہسواران واقعہ نگاری اپنے اپنے اشہب قلم کی باگیں اُٹھائے ہوئے ان مقامات سے منہ پھرائے ہوئے گذر گئے۔ مَیں نے یہ اعتراض لکھا ہے۔ اگر جواب نہ لکھوں۔ تو میرے اُن احباب کو شکایت ہوگی۔ جو میر صاحب کے معتقد ہیں۔ اور یہ امر واقعہ نگاری کے بھی خلاف ہے۔ کہ مَیں اس مقام کو یونہیں چھوڑ جاؤں۔ حالانکہ میرے خیال میں حضرت غالب مرحوم نے میر صاحب کی بیت کے جو معنی لئے ہیں۔ وہ خلاف مقصود شاعر ہیں۔ میرا یہ دعوےٰ نہیں۔ کہ مَیں غالب مرحوم کا جواب لکھتا ہوں۔ یہ تو چھوٹا مُنہ اور بڑی بات کا مصداق ہے۔ میری سمجھ میں جو آتا ہے۔ وہ لکھتا ہوں۔ اگر مَیں غلط مطلب سمجھا ہوں۔ تو ناظرین معاف فرما کر رہبری فرمائیں۔ آئندہ (ایڈیشن) چھپنے پر درستی کر دونگا ٭

میرے نزدیک میر صاحب کی مراد اس موقع پر کلام ادق سے کلام مغلق نہیں ہے۔ بلکہ ادق کے لفظی معنی لیجئے۔ بہت باریک کلام۔ اُن کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا کلام جس میں نازک خیالیاں ہیں۔ باایں ہمہ سہل ممتنع ہے۔ دقیق کلام کی یہ صفت ہے۔ کہ جو

جواب اعتراض

کلام غور و فکر کے بعد سمجھ میں آئے۔ علم معانی و بیان کی کتابوں کی جن صاحبوں نے سیر فرمائی ہے۔ اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ جو کلام غور و فکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ وہ زیادہ لطف دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ لکھی ہے۔ کہ جو نعمت و دولت کوشش و محنت سے آدمی کو ملتی ہے۔ اُس میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ پس جس کلام میں نازک خیالات نظم ہوں۔ اور آدمی محنت کر کے اُس کے معنی حل کرے۔ اُس سے زیادہ دل و دماغ کو راحت اور رُوح کو فرحت حاصل ہوگی +

دُوسرے مصرع **برسوں پڑھے** الخ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شاعر میری طرز خاص میں محنت کر کے برسوں کہے۔ جب بھی تو میرا طرز تصنیف اُس کو نہیں آسکتا۔ یہ بھی شاعر کا ایک کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہ اُس کے طرز میں کہنے سے اور لوگ عاجز ہوں۔ جیساکہ گلستان سعدی کی ایسی نثر کسی سے نہیں لکھی گئی۔ اگر کچھ تھوڑا سا اُس کا رنگ ہے۔ تو رقعات عالمگیری میں ہے۔ یہی معنی میر صاحب کے طرفدار اور شاگرد بھی اس مصرع کے لیتے ہیں۔ جیساکہ اکثر دبیریوں اور انیسیوں کی بحث میں مَیں نے سُنا ہے۔ **سہل ممتنع** کلام کی نسبت میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ سب کلام تو کسی شاعر کا بھی **سہل ممتنع** نہیں ہے۔ اور تھوڑا بہت **سہل ممتنع** کلام ہر اُستاد کے یہاں پایا جاتا ہے۔ بیشک حضرت غالب کا بھی کچھ کلام سہل ممتنع ہے۔ اور کچھ کلام ادق ہے۔ اور یہی حال میر انیس و مرزا دبیر کا بھی ہے۔ اس زمانے کے بعض شعرائے لکھنؤ کو بھی یہی خیال ہوگیا ہے۔ کہ ہم جو کہتے ہیں۔ وہ اکثر سہل ممتنع ہے۔ لکھنؤ میں اسے تین برس پہلے اس کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ مَیں نے ایک سلام میں (جو ایک بڑی مجلس میں راجہ کے بازار میں پڑھا تھا) یہ شعر داخل سلام کر کے بعض معاصرین کو متنبہ و مطلع کیا تھا ؎

ہر کوئی کہتا ہے۔ سہل ممتنع کہتا ہوں مَیں + ہم تو کچھ بھی کہ نہیں سکتے۔ یہ مشکل امر ہے

اب مَیں آخیر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جو تین بند مرثیہ غالب کے اُوپر مَیں نے لکھے

ہیں، وہ نظر غور سے دیکھ کر ناظرین فیصلہ دیں۔ کہ دبیر کی بندش اور طرز بیان و زبان کی اُس میں جھلک ہے یا انیس کی۔ میرے نزدیک دبیر مرحوم کے طرز سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور یہ امر بھی مرزا غالب کے تفضیلیہ دبیریہ ہونے پر دال ہے (کہ انہوں نے مرثیہ طرز غالب دبیر میں کہا) صفیر۔ ریاض۔ حالی۔ احسن چار صاحبوں کے اقوال مرزا غالب مرحوم کی نسبت میں لکھ چکا۔ اب میں مولوی اشہری صاحب کی کتاب حیات انیس سے بھی حضرت غالب کا تھوڑا سا حال لکھ دوں۔ یہ بھی گویا احسن صاحب کے قدم بقدم چلے ہیں۔ حیات انیس کے صفحہ ۶۶ پر مرثیہ گوئی کیلئے غالب مرحوم کا صرف میر انیس صاحب کو ہی منتخب کرنا تحریر فرماتے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے "اسی طرح دلی کے تمام زبان آور میر انیس کے دلدادہ پائے گئے۔ مرزا غالب ایسے لاثانی قدرت کلام پر میر انیس کا دم بھرتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ میر انیس کے مقابلہ میں دوسرے کا مرثیہ کہنا میرا نہیں نہیں بلکہ خود مرثیہ کا منہ چڑھانا ہے۔* اور آج تک دلی اور لکھنؤ میں میر انیس کی مرثیہ گوئی کو معجزہ کلام مانا جاتا ہے"

حیات انیس جناب اشہری

افسوس کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے مولوی امجد علی صاحب اشہری نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ ورنہ میں اُن سے عرض کرتا۔ کہ بیشک دلی و لکھنؤ کیا بلکہ تمام ہندوستان میں (میر صاحب کے) مرثیہ کو معجزہ کلام ہی مانا جاتا ہے۔ اور میں بھی مانتا ہوں۔ مگر دبیر و انیس دونوں کی مرثیہ گوئی کو۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا۔ کہ دوسرے کا مرثیہ کہنا مرثیہ کا منہ چڑھانا ہے۔ یہ کیا مرزا غالب مرحوم نے آپ سے خواب میں آکر کہدیا۔ آپ مولوی حالی صاحب سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ کہ انہوں نے تو مقولہ غالب

* اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ میر انیس مرحوم کی دوسرے مرثیہ گو نقل کرتے ہیں۔ اور بگڑتے ہیں۔ جس طرح کوئی کسی کا منہ چڑھاتا ہے۔ اور خود بگڑتا ہے۔ یہ فقرہ ذرا غور سے دیکھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً اُس قول کے مقابل میں کہ "مرثیہ صرف دبیر کا حق ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا" ۱۲ مؤلف حقیر۔

میں دبیر و انیس دونوں کا نام لیا تھا۔ اور آپ نے ایک بزرگ کا نام لیا۔ اور وہ بھی ایسی طرز سے کہ گویا دوسرے صاحب منہ چڑھاتے تھے۔ واہ جناب۔ (آتش مرحوم) ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب ✦ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا*

اس موقع پر حیات انیس کا ذکر آگیا ہے۔ اور امید ہے۔ کہ بعض ناظرین حیات انیس حیات دبیر کے ساتھ اُس کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس لئے چند مضامین حیات انیس کی یہاں تنقید بھی کر دوں۔ وہ مضامین نمبر وار ذیل میں عرض کرتا ہوں:۔

تنقید حیات انیس

(۱) حیات انیس کے صفحہ ۳ پر مولوی اشہری صاحب نظم میں میر صاحب کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا ✦ بڑی شکوہ سے دکھلائی ہیئت گفتار
انیس کو فردوسی سخن پایا ✦ دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار

اس مقام پر دو باتیں مولوی اشہری صاحب نے فرمائیں۔ (۱) تو یہ کہ ع دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا۔ (۲) انیس کو فردوسی اور دبیر کو نظامی قرار دیا۔ یہ دعوے اُس وقت شاید صحیح ہوتا جب مولوی صاحب کسی روایت سے ثابت کر دیتے۔ کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے مقابلہ پر کوشش کی۔ پس جس طرح فردوسی کو بحیثیت زمانہ نظامی پر سبقت ہے میر صاحب کو مرزا صاحب پر ہوتی۔ یہاں معاملہ بالعکس ہے۔ میں اس کتاب میں کئی مقام پر ثابت کر چکا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی شاعری و مرثیہ گوئی و شہرت مرثیہ گوئی میر صاحب پر قریباً بیس سال مقدم ہے۔ ازبسکہ دبیر مرحوم انیس مغفور پر مقدم ہیں۔ جس طرح فردوسی

* میں نے مرزا غالب مرحوم کے بیان میں یہ مختلف تحریریں ایک ہی زمانے کے چند صاحبوں کی اس لئے لکھ دیں کہ ناظرین واقف ہو جائیں کہ اس زمانے میں دروغ کو کس قدر فروغ ہوتا جاتا ہے۔ اور مجھے یہ بھی خیال گذرا کہ جب یہی کثرت ہوتی جا رہی ہے۔ تو شاید کوئی صاحب آئندہ ایسے بھی دلیر پیدا ہوں۔ جو یہ لکھ دیں۔ کہ مرزا غالب مغفور میر انیس مرحوم کو مرثیہ گوئی میں کامل اور مرزا دبیر مرحوم کو ایسا ناقص سمجھتے تھے کہ گویا اُن کے نزدیک دبیر مرثیہ کہنا ہی نہ جانتے تھے۔ کیونکہ تنزل کی جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو آئندہ اور گر جانا کیا دشوار ہے ۱۲ مؤلف حقیر

سقوط عین کا

نظامی پر متقدم ہیں۔ اس لئے یہ دعوے غلط قرار پایا۔ غالباً اسی وجہ سے مولوی صاحب نے
اس مقابلہ پر نظم میں بھی ایک سکندری (ٹھوکر) کھائی۔ جس کو عروض داں شعرا سمجھ گئے ہونگے۔
یعنی اس مصرع میں (دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار) مرصع کا عین تقطیع سے گر گیا۔ یہ خدا
کی قدرت سمجھئے۔ عین کا تقطیع سے گرنا تمام شعرا کے نزدیک عین خطا ہے۔ اور یہ غلطی کثر
وہی شعرا کرتے ہیں۔ جو عروض سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بعض ناواقف آدمی دو چار شعر
فارسی و اردو کے سند ابیش کیا کرتے ہیں۔ کہ دیکھئے ان اشعار میں بھی عین گرتا ہے۔
اُن کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ اوّل تو ممکن ہے۔ کہ کاتبوں نے کچھ کا کچھ لکھ دیا ہو*
دُوسرے اگر بالفرض کسی ایرانی سے بھی عین گر گیا۔ تو وہ اُس شاعر کی ضرور خطا ہے۔
اور خطا اگر صد بار رست آید خطا ست کے ذیل و مصداق میں آتا ہے۔ اور بالخصوص
اردو میں تو سودا و میر کے وقت سے آج تک تمام اساتذہ دہلی و لکھنؤ کے نزدیک عین
گرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے خلاف رائے رکھتے ہوں۔ تو ان تمام اساتذہ
مشاہیر سودا۔ میر۔ انشا۔ مصحفی۔ ذوق۔ غالب۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش۔ وزیر۔
رشک۔ صبا۔ برق۔ دبیر۔ انیس۔ اسیر۔ منیر۔ داغ۔ امیر۔ جلال۔ تسلیم۔
ظہیر میں سے کسی ایک صاحب کا یا ان کے کسی معاصر اُستاد کا یہ قول دکھا دیں۔ کہ عین کا
گرنا جائز ہے۔ تو میں مان لونگا۔ ایسے اشعار کو میں یوں نہیں مانتا۔ کہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔
(اور جن صاحبوں کو مطبعوں سے کام پڑا ہے۔ وہ میری تائید فرمائینگے) کہ کتاب چھپ چھپ کر
دیکھ دیکھ کر ہم دیتے ہیں۔ مگر کچھ کاپی نویس صاحب غلط لکھ دیتے ہیں۔ کچھ مصلح سنگ

* مثلاً بعض حضرات حالانا ظاہر یہی کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں بہ تم دمش ہر شک یاقت را۔ کہ سازم علاج عقل فرتوت را۔ اس میں عقل کا عین تقطیع سے گرتا ہے۔ مگر دراصل مصرع ثانی صحیح یوں ہے کہ ع سازم جوان عقل فرتوت را۔ دلیل یہ ہے۔ کہ جوان و فرتوت میں ایک تو صنعت تضاد ہے۔ دُوسرے علاج ساختن ایرانیوں کا محاورہ نہیں ہے اور جوان ساختن محاورہ ہے۔ اسی طرح اور بھی چند شعروں میں غالباً کاتب نے غلطی کر دی ہے۔ ورنہ ایسے ایسے کامل شعرا سے ایسی سخت غلطی کر بیٹھنی امید نہیں ہے کہ افتادن عین عین خطا ست مشہور جملہ ہے + ۱۲ مؤلف عفی عنہ

اصلاح فرماتے ہیں ۔ اور چھپنے پر ایسی سینکڑوں غلطیاں نظر آتی ہیں ۔ کہ کچھ کا کچھ لکھا ہوا ہے ۔ کہیں قافیہ بدل دیا ہے ۔ کہیں عین تقطیع سے گر گیا ہے ۔ مصنّف یا مؤلف بیچارہ کس کس سے کہتا پھرے ۔ کہ میں نے یُوں لکھا تھا ۔ غلط چھپا ہے ۔ غلط نامہ بھی چھپواتے ہیں ۔ تو بھی کسی کتاب کے ساتھ وہ ورق لگایا جاتا ہے ۔ کسی کے ساتھ نہیں ۔ المختصر ایسی صریح غلطیاں جن سے مصنّف و مؤلف کی شان علم و معلومات ارفع و اعلےٰ ہے ضرور کاتبوں کی بدولت ہوتی ہیں ۔ اور انہیں کی طرف منسوب کرنا لازم ہے ÷

(۲) صفحہ ۲۹ میں مرزا دبیر و میر انیس کا جو ایک مجلس شاہی میں یکے بعد دیگرے پڑھنا (مثل میر احسن صاحب کے) لکھا ہے ۔ وہ بھی غلط ہے ۔ میں نے لکھنؤ کے بڈّھے بڈّھے آدمیوں سے تحقیق کر لیا ۔ واقعی دبیر و انیس ایک مجلس میں ایک کے بعد دوسرے کبھی نہیں پڑھے[1] اس بحث کو میں آو یزنقید و واقعات انیس میں مفصّل لکھ آیا ہوں ÷

(۳) صفحہ ۱۲۷ پر لکھا ہے ۔ کہ رباعی کے ایجاد کا فخر عرب کو حاصل ہے ۔ اُس کے بعد فارسی میں اُس کی تقلید کی گئی ۔ یہ بھی صحیح نہیں ۔ رباعی دراصل ایرانیوں کی ایجاد ہے ۔ عرب کا اس میں کوئی حق (ایجاد) نہیں ہے ۔ مرزا صاحب سے اس بحث کو کوئی تعلق خاص نہیں ہے ۔ مگر یہ اس لئے لکھ دیا ہے ۔ کہ کوئی صاحب غلطی میں نہ پڑیں ۔[2]

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست ÷ وگر خاموش بنشینم گناہ ست

(۴) صفحہ ۲۶۵ پر فرماتے ہیں ۔ کہ "مرزا دبیر کا رنگ" ۔ "بعض مقامات پر

---

[1] اگر میں مرزا صاحب کی طرفداری کرتا تو لکھ دیتا ۔ کہ مرزا صاحب کو شہرت ہو چکی تھی جب میر صاحب فیض آباد سے لکھنؤ میں آئے تھے ۔ (یا ذکر ہر جگہ پہلے پڑھتا ہے ۔ لہذا) میر صاحب پہلے پڑھے مرزا صاحب بعد کو پڑھے ۔ مگر ایسا لکھنا فرض مؤرخی کے خلاف ہوتا ۔ مجھے جو امر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ میر و مرزا دونوں ایک دوسرے کا ادب کرتے تھے ۔ اور اگر کبھی کبھی ایک کے بعد دوسرے کو پڑھوانا بھی چاہتا تھا تو صاف انکار کر دیتے تھے ۔ اور کبھی نہیں پڑھتے تھے ÷ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

[2] صاحب حدائق البلاغہ نے بھی رباعی کا موجد ایرانیوں کو بتایا ہے ÷ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

دبیر و انیس ایک مجلس میں نہیں پڑھے

جہاں میر صاحب کی شوکت کلام آورد کے پنجہ میں پھنس گئی ہے - میر صاحب کے کلام میں بھی
مرزا دبیر کا رنگ آگیا ہے" - اس کی نسبت اتنا ہی کہنا کافی ہے - کہ مرزا صاحب کے کلام کا
ایک رنگ نہیں ہے جس کو کوئی شخص دبیر کا رنگ کہہ سکے - نہ دبیر کی ایسی آمد کسی دوسرے
شاعر یا مرثیہ گو کی طبیعت میں ہے - پس آورد کے پنجہ میں شوکت کلام پھنس کر دبیر کا رنگ پیدا
ہونا کب ممکن ہے - دبیر کے کلام میں زیادہ آمد ہونے کا ثبوت - اُن کا کثرت سے - اور پھر
عمدہ کلام ہونا ہے - جس میں سے بیس جلدیں مطبوعہ دفتر ماتم کی ہیں - کوئی صاحب اگر دبیر
سے زیادہ کسی نامور شاعر کو کثیر الکلام سمجھتے ہیں - تو دبیر کے کلام موجودہ کے برابر اُن کا کلام
ہمیں دکھا دیں - اور کلام کا زیادہ ہونا اور اُس کے ساتھ اچھا ہونا یہ ضرور دلیل آمد کی ہے
جب آمد طبیعت میں نہ ہوگی - تو اس کثرت سے اور اچھا کلام شاعر کب کہہ سکتا ہے - اس سے
یہ غرض نہیں - کہ مرزا کے کلام میں آورد نام کو نہیں ہے - آورد بھی ہے مگر کم - اور اور
معاصرین کے مقابل میں بہت کم ہے - مگر اس موقع پر میں مولوی اشہری صاحب کو قابل
معافی سمجھتا ہوں - کیونکہ انہوں نے مرزا مرحوم کی تمام تصانیف پر بغور نظر نہیں کی ہے
اور اس امر کو میں اُن کے کمال کی دلیل سمجھتا ہوں - کہ انہوں نے صفحہ ۴۹ پر صاف لفظوں
میں اس کا اعتراف کیا ہے - جہاں مولوی شبلی صاحب کا یہ قول نقل فرمایا ہے - کہ "میر
انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کے یہاں محاسن شاعری بہت کم ہیں" وہیں حاشیہ پر تردید
لکھ دیا ہے - کہ "جب تک دونوں کے مجامع کلام پر نظر نہ ڈالی جائے - اور بات بات کو
دوسرے کے مقابلہ میں نہ دیکھا جائے - مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا" - اس سے ظاہر ہے کہ
مولوی اشہری صاحب کو ان دونوں بزرگوں کے تمام کلام کو غور سے دیکھنے اور مقابلہ کرنے کا
موقع نہیں ملا تھا - اور وہ دل سے مرزا مرحوم کے کمالات مٹانے میں ساعی و سرگرم (مولوی
شبلی صاحب کی طرح) نہ تھے - اس کے سوا اور بھی بہت سی باتیں حیات انیس میں کارآمد
لکھی ہیں - اور سخن فہمی کی داد دی ہے - یہ دوسری بات ہے - کہ کوئی بات ہی اُن کو

مولوی اشہری صاحب قابل معافی ہیں

مولوی اشہری صاحب حیات انیس کی مدح

حالات واقع معلوم ہوئی ہو۔ یا کسی خاص رنگ کو اُن کی طبیعت نے زیادہ پسند کیا۔ اور اس سے کوئی شخص بھی خالی نہیں ہے۔ میں نے بھی سب حالات چشم دید نہیں لکھے۔ کوشش ضرور کی ہے۔ کہ صحیح حالات دستیاب ہوں۔ اور ممکن ہے۔ کہ کہیں کہیں کوئی صاحب میری رائے سے مخالف ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اس مخالفت میں اُن کی رائے صواب پر ہو۔ اور میں غلطی پر ہوں ؀

فصل ۱ حضرت فرقانی مرحوم

(۱۱) مولوی سید احمد حسن صاحب فرقانی مرحوم رئیس میرٹھ۔ یہ وہ بزرگوار ہیں۔ کہ جن پر ہندوستان کو اس طرح فخر کرنا چاہئے۔ کہ جیسے ایرانی آج کل قاآنی پر فخر کرتے ہیں۔ فارسی و اُردو زبانوں میں یہ جیسا لاجواب شعر کہتے تھے۔ ایسا ہی مطلب شعر (خوب) سمجھتے تھے۔ ان کے سخن شناس و قدردان ہندوستان میں دبیر و غالب تھے۔ اور اُن دونوں کے کلام کے سمجھنے اور پرکھنے والے یہ بزرگوار تھے۔ چنانچہ خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ صحیح المذاق سامع اس زمانے میں کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ میں نے جب کبھی ان دونوں صاحبوں کو اپنا کلام سُنایا۔ تو ایسی داد ملی۔ کہ دل نے مزہ اُٹھایا۔ جن شعروں پر مجھے ناز تھا۔ انہیں کو ان صاحبوں نے زیادہ پسند فرمایا۔٭ اور یہ فرماکر دل بڑھایا۔ کہ میر فرقانی آپ کا کلام لاثانی ہے ؀

یہ بزرگوار مرزا صاحب کی شان میں فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ایم کہ بر آسماں دبیری ہست ؀ ندیدہ ایم بروئے زمیں ترا ثانی

میں نے اس موقع پر ان بزرگوار کا حال بہت مختصر اس وجہ سے لکھا ہے۔ کہ کہیں نہیں دُوسرے

٭ اس سے اتحاد مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت فرقانی مرحوم کے شاگرد رشید اور بھانجے سید محمد مرتضےٰ صاحب بزمی مرحوم تیر ثابت کے قدردان تھے۔ جن کے انتقال کو بھی دس بارہ برس سے زیادہ نہیں گذرے ہیں۔ لسان الملک میرٹھ سے ان کا بوجھ نکلتا تھا۔ ملک کے اہل کمال جانتے ہیں کہ وہ کیسے کامل تھے میرے سفرنامہ غذیات حالیات جرجر کا نام "قول ثابت" ہے لسان الملک میں لاجواب ریویو لکھا ہے۔ کبھی کبھی میرا کلام بھی لسان الملک میں چھپا رہتا تھا ۱۲ مؤلف عفیٰ عنہ۔

موقعوں پر بھی ان کا کوئی قول یا کلام منظوم میں نقل کر چکا ہوں۔ علاوہ اس کے ان کا کلیات ان کے علم دوست ذیعلم فرزند منشی سید کرار حسین صاحب روحانی دام مجدہ جنرل سپرنٹنڈنٹ گورکھپور نے نہایت خوشخط چھپوا کر شائع فرما دیا ہے۔ اور اُس میں مرزا صاحب کی مدح و ثنا نظماً و نثراً بہت کچھ مرقوم ہے۔ اور وہ نظم و نثر حضرت فرقانی کے کمالات و حالات واقعی کا بھی آئینہ یا مرقع ہے۔

(۱۱) منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مرحوم۔ یہ بزرگوار بھی دبیر و انیس دونوں کے مداح خواں اور قدرداں تھے۔ خود کامل تھے۔ اس لئے کاملوں کو پہچانتے تھے۔ چنانچہ جناب فاضل لکھنوی سلمہ اللہ نے اپنے ایک قابل قدر مضمون میں جو ماہ جولائی ۱۹۱۰ء کے پرچہ "زمانہ" کانپور میں چھپا ہے۔ حضرت اسیر کے حال میں حسب ذیل لکھا ہے "اسیر کی انصاف پسندی۔ بعض لوگوں نے اسیر سے دریافت کیا۔ کہ انیس و دبیر میں کون اچھا ہے۔ اور کیا ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت ہے۔ اس کا جواب اسیر نے یہ دیا۔ کہ دونوں اُستاد ہیں۔ اور میں ایک کو دوسرے پر علانیہ ترجیح نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں خود مرثیہ گوئی میں مہارت نہیں رکھتا۔ لیکن اُس روز سے اسیر کو مرثیہ گوئی کی طرف مخفی توجہ ہوئی۔ اور تین برس کامل انہوں نے معمولی اوقات میں مرثئے کہے۔ تین برس میں اسیر نے کئی سو مرثئے کہے۔ اور ایک روز اپنے اُن احباب و اشخاص سے کہا۔ کہ تین برس کی محنت شاقہ کے بعد کچھ رنگ میر انیس و مرزا دبیر کا پیدا ہوا ہے۔ اور اس کیلئے مدتیں درکار ہیں۔ پھر اسیر نے مرثیہ نہیں کہا۔ اور جو مرثئے کہے تھے۔ اُن کو نہ کہیں پڑھا۔ اور نہ چھپوایا۔ دو سو مرثئے ابتک قلمی موجود ہیں"۔ پھر فاضل صاحب لکھتے ہیں "کہ غالب مغفور کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے بھی مرثیہ گوئی کے لئے انیس و دبیر ہی کو منتخب کیا تھا۔ اور جب ان سے ایک مجتہد صاحب نے مرثیہ کی فرمائش کی۔ تو انہوں نے صاف صاف کہدیا۔ کہ یہ کام میر و مرزا کا ہے۔ درحقیقت کسی کامل فن کو خود پسند و مغرور نہ ہونا

فصل ۱۱ حضرت اسیر منصف

قول اسیر درباب عدم ترجیح دبیر و انیس

حضرت اسیر غالب و دبیر و انیس

چاہئے۔ اخلاق اور انصاف پسندی خوب شے ہے۔ اسیر عمر بھر پابند وضع و تہذیب رہے ہے۔ اور کبھی بے جا ادّعائے سخنوری نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کسی کامل فن اُستاد کی تحقیر کی۔" یہاں تک فاضل صاحب کی تحقیق و عبارت تھی۔ اب میں عرض کرتا ہوں۔ کہ درحقیقت اسیر مرحوم خلیق۔ منکسر۔ کامل۔ انصاف پسند شاعر تھے۔ مگر یہ جو فرمایا۔ کہ میں خود مرثیہ گوئی میں مہارت نہیں رکھتا۔ یہ اُن مرحوم کا محض انکسار تھا۔ کیونکہ میں نے لکھنؤ کے بُڈّھے بُڈّھے معتبر آدمیوں سے سُنا ہے (کہ جن میں سے ایک میرے نانا میر ظہیر مرحوم تھے) کہ اسیر مرحوم اوّل اوّل میر ضمیر مغفور کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ تخلص (اسیر) بھی اُسی رعایت سے میر ضمیر صاحب نے رکھا۔ جناب اسیر نے سلام کہا۔ میر ضمیر مرحوم نے بنایا۔ پھر ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ میر صاحب ممدوح نے عُذر کیا۔ کہ میں غزل کہنا اور غزل پر اصلاح دینا اب چھوڑ چکا ہوں۔ چلو تمہاری غزل پر اپنے اُستاد میاں مصحفی سے اصلاح دلوا دوں۔ میر ضمیر صاحب کے ساتھ اسیر پہنچے۔ میاں مصحفی کو جب غزل سُنائی۔ تو اُن کو شک ہوا۔ کہ ایسی غزل ایک مبتدی کی نہیں ہو سکتی۔ اور پُوچھا۔ یہ غزل تم نے خود کہی ہے۔ اسیر نے اثبات میں جواب دے کر کہا۔ کہ اب پھر میں ایسی غزل کہہ سکتا ہوں۔ چنانچہ میاں مصحفی نے طرح کا مصرع پڑھا۔ اور خود بھی فکر کی۔ میاں مصحفی نے جتنی دیر میں گیارہ شعر کہے۔ اسیر نے نو شعر کہے۔ جن کو دیکھ کر مصحفی پھڑک گئے۔ یہ حکایت مشہور خود فاضل صاحب نے بھی لکھی ہے۔ مگر میر ضمیر مرحوم کی ہمراہی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید انہوں نے یونہی سُنا ہو گا۔ اُس دن سے سلام و مرثیہ پر میر ضمیر صاحب سے اور غزل پر میاں مصحفی سے اسیر اصلاح لیتے تھے۔ تین برس بعد مصحفی مر گئے۔ اسیر نے پھر غزل کسی کو نہیں دکھائی۔ یہ مشہور و مقبول مرثیہ جو لکھنؤ کے بعض سوز خواں پڑھا کرتے ہیں۔ "جب تھوڑی رات قتل کے میداں میں رہ گئی" جناب اسیر مرحوم کا کہا ہے۔ اور جو لوگ مرثیہ خود کہتے ہیں۔ وہ جان سکتے ہیں۔ کہ وہ مرثیہ

مہارت جناب اسیر در مرثیہ میں

اسیر غزل میں مصحفی کے شاگرد ہیں

تین برس میں (خصوصاً ایسے شخص سے جس کو فرائض منصبی سے بھی فرصت کم ہو) تصنیف نہیں ہو سکتے۔ واضح ہو۔ کہ میر ضمیر صاحب کی شاگردی اسیر مرحوم کے واسطے سرمایۂ افتخار ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب طرز موجودہ مرثیہ کے موجد اور دبیر و انیس اور تمام مرثیہ گویان مالبعد اُن کے شاگرد یا خوشہ چیں و مقلد ہیں۔ بہر حال دبیر و انیس کے باب میں جو فیصلہ حضرت اسیرؒ نے کیا۔ وہ اُن کی سخن شناسی کی دلیل ہے۔ اور تمام یا اکثر اہل کمال کا تب سب کا یہی عقیدہ تھا۔ کہ دبیر و انیس میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ میں جناب مفتی صاحب طاب ثراہ کا گویا فتوےٰ لکھ چکا ہوں[1]۔ اب میں فاضل صاحب کے اسی مضمون مذکورہ میں سے ایک واقعہ متعلق حضرت اسیر کو اور بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے ہمارے ممدوح (ہیرو[2]) کو تھوڑا تعلق ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے۔ اُسیر اگر کبھی نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔ تو نہایت لطف اور تحقیق کے ساتھ۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ نواب مرزا آغا جید صاحب جو حضرت اسیر کے شاگرد بھی تھے مع چند احباب کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور حضرت اسیر بھی موجود تھے۔ کمرہ میں کچھ قطعات و رباعیات وغیرہ بطور آرائش چوکھٹے میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے اپنے اُستاد کو ایک فارسی رباعی کی طرف توجہ دلائی۔ اور کہا۔ کہ آپ نے اس رباعی کو ملاحظہ فرمایا۔ شاعر نے کیا نازک خیالی کی ہے۔ رباعی حسب ذیل ہے۔

دُنیا خوابیست کش عدم تعبیر ست   صید اجل ست گر جوان و پیر ست
ہم زیر زمیں پر ست و ہم روئے زمیں   ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر ست

(حاشیہ: ضمیر صاحب سخن میں شاگردی اسیر مرحوم سرمایۂ افتخار ہے)

(حاشیہ: اسیر کی نازک و لطیف نکتہ چینی)

(حاشیہ: رباعی فارسی)

---

[1] افسوس کہ غالبؔ مفتی صاحبؒ۔ اسیرؒ وغیرہ ایسے ایسے کاملان فن کو جن کا مثل و نظیر ہندوستان کیا شائد روئے زمین پر ملے۔ مولوی شبلی صاحب محض اس جرم میں بد مذاق کا خطاب دیتے ہیں۔ کہ وہ دبیر کو مقابل انیس کا کیوں سمجھتے رہے۔ اور دبیر کو کیوں ناقص و مرجوح نہیں کہا۔ ملاحظہ ہو موازنہ کی پہلی ہی بسم اللہ پہلا صفحہ۔

[2] ہیرو کا ترجمہ مضوع شائد ٹھیک ہو مگر یہ نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے ممدوح لکھا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اسیرنے اس رباعی کو غور سے دیکھا۔ اور چُپ ہو رہے۔ نواب صاحب نے پھر کہا۔ فرمائیے۔ یہ رباعی کیسی ہے۔ یہ پھر سکوت میں رہے۔ اور بعد اصرار کہا۔ کہ اس رباعی کی داد مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ یہ سُنتے ہی نواب صاحب متحیر ہوئے۔ اور دریافت کیا۔ کہ اس میں کیا غلطی ہے۔ ہمیں بھی اس سے مطلع کیجئے۔ اسیرنے کہا۔ رباعی کے عمدہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن آخری مصرع میں اگر صفحہ کی جگہ ورق ہوتا۔ تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ اس لئے کہ صفحہ سے مراد ایک رُخ سے ہے۔ اور ورق سے مراد دونوں رُخ سے ہے۔ اور جب صفحۂ زمین میں دونوں طرف تصویریں (آبادئ انسان) ہیں۔ تو وہ صفحہ نہیں بلکہ ورق ہوا۔ اسیر کے اس خیال کو حاضرین نے پسند کیا۔ اور داد دی۔ میں بھی حضرت اسیر مرحوم کو غائبانہ داد دیتے کہ ناظرین کتاب سے کہتا ہوں۔ کہ اب دبیر کی رباعی کو سُنئے جس کا مضمون اس سے کچھ ملتا جلتا ہوا ہے :۔

رباعی دبیر کا وارد اعتراض سے پاک ہونا

بالائے زمیں زندوں کی تعمیریں ہیں ۔۔۔ مُردوں کی بزیر خاک جاگیریں ہیں
عبرت کے مرقع کا ہے اک صفحۂ زمیں ۔۔۔ دونوں طرف اس ورق پہ تصویریں ہیں

میں یہ تو نہیں کہ سکتا۔ کہ حضرت اسیر کو وہ باریک اعتراض اس رباعی اردو سُننے کے بعد سُوجھا۔ مگر اتنا ضرور عرض کرونگا۔ کہ جو دقیق اعتراض اُس فارسی کی رباعی پر وارد ہوتا تھا۔ وہ اس اردو کی رباعی پر عائد نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اعتراض دقیق دبیر مرحوم کے خیال میں ضرور تھا۔ اسی لئے ورق پر دونوں طرف تصویریں ہونا فرمایا۔ دُوسری خوبی اس رباعی اردو میں یہ ہے۔ کہ عبرت کے مرقع کا ایک صفحہ زمین کو فرمایا۔ کیونکہ اسی طرف کے رہنے والوں کو عبرت لینے کی ضرورت ہے۔ کہ جو لوگ زندہ ہیں۔ وہ عبرت حاصل کریں۔ مُردوں کو عبرت سے سبق لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کہ وہ مر چکے ہیں۔ ایسے ایسے نازک خیال اللہ مرزا مرحوم کے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اور میر انیس مغفور آفتاب و ماہتاب کہلاتے تھے۔ یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ فارسی رباعی کے

چاروں مصرعوں کا ترجمہ اردو رباعی کے چاروں مصرع نہیں ہیں۔ بلکہ اردو کی رباعی کے پہلے اور دوسرے مصرع کا مضمون (فارسی رباعی کے مصرع اول و دوم سے) مختلف اور گویا مصرع چہارم کی شرح ہے۔ جس سے مضمون بخوبی سننے والے کے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ دوسرا کمال مرزا مرحوم کا ہے +

فصل ۱۳ (جناب منشی امیر مینائی)

(۱۳) استاذی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سنا ہے کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں تمام شعرائے عجم پر دو ایرانی شاعروں کو ترجیح دیتا ہوں۔ (۱) فردوسی (۲) جامی۔ اور اُن کے اس شعر میں بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ؎

اُچھل پڑے گا مضمون تو یہ فردوسی + اُٹھا یہ لطف کہ جامی بھی گر پڑے بیہوش

اور دبیر و انیس کو فردوسی و جامی پر بھی ترجیح و تفضیل دیتا ہوں +

جناب منیر مرحوم ۱۴

(۱۴) منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیر۔ یہ وہ پہلوان سخن ہیں۔ کہ (جناب شیخ ناسخ کے شاگردوں میں) جن کی معلومات شاعری کی دھاک ہے جن پابندیوں اور صحت کے ساتھ قصیدہ و غزل انہوں نے فرمائی۔ کم شاعروں نے کہی ہوگی۔ جس کثرت سے لوگوں کو ان سے فیض پہنچا بہت کم شاعروں سے پہنچا ہوگا۔ یہ بزرگوار ہمیشہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ دبیر سا عالی دماغ۔ بلند خیال۔ صاحب معلومات ہر رنگ میں کہنے والا شاعر آج تک نہیں گذرا۔ اور مرثیوں پر انہوں نے فخریہ مرزا صاحب سے اصلاح لی تھی۔ اور اکثر اصناف نظم بالخصوص مثنوی میں مرزا صاحب کی نصیحت پر عمل فرماتے تھے۔ اور جن پابندیوں کے ساتھ وہ غزل کہتے تھے مثنوی و مرثیہ میں اُن کا خیال (محض مرزا مرحوم کے اتباع سے) نہیں رکھتے تھے۔ کہ مرزا مرحوم کی نصیحت تھی۔ کہ جو شاعر نظم میں واقعات لکھنا چاہے۔ وہ کثرت سے الفاظ استعمال کرے۔ زبان اردو پہلے ہی سے وسیع نہیں ہے۔ اس میں الفاظ متروک کی لے بڑھا کے۔ اس کو اور تنگ بنانا کلام کو بے نمک کرنا ہے۔ چنانچہ مثنوی

معراج المضامین اور دوسری مثنوی جو اُن کی کلیات میں ہے۔ میرے اس قول پر دلیل و شاہد عدل ہیں +

(۱۴) مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ دام فضلہ واقبالہ۔ جو ایشیائی علوم کے ساتھ مغربی علوم میں بھی رتبہ اعلےٰ رکھتے ہیں۔ اور جن کی سخن فہمی ضرب المثل ہے۔ شعرا میں سب سے زیادہ میر۔ غالب۔ دبیر۔ انیس کے خاص طور پر قدردان اور مدح خواں ہیں۔ گویا ان بزرگواروں کو جسم شاعری کے عناصر اربع سمجھتے ہیں۔ اور اکثر فرماتے ہیں کہ اگر اردو میں بلینک ورس (نظم غیر مقفّٰی) کا رواج ہوتا۔ تو سب سے زیادہ دو شاعر کامیاب ہوتے۔ (۱) غالب۔ (۲) دبیر۔ اور دبیر غالباً غالب سے زیادہ کامیاب ہوتے +

جناب حامد سلمہ اللہ و ابقاہ

ازبسکہ ۱۴ کے عدد کو میں متبرک سمجھتا ہوں۔ اس لئے یہ ۱۴ نام اور شعراء و اہل علم کے نام میں نے لکھ دئے ہیں۔ ورنہ مرزا مرحوم کے کمالات کے قریباً تمام اہل کمال اہل علم قائل ہیں۔ جس قدر جس شخص کی معلومات بڑھی ہوتی ہے۔ اُسی قدر مرزا صاحب کے جواہرات کی وہ زیادہ قدر کرتا ہے +

باب دوازدہم۔ متنبّی عرب کے مشہور شاعر کے بعض کلام سے بعض کلامِ دبیر کا مقابلہ

فصل متنبی کا مختصر حال

شعرائے عرب میں متنبّی ایک بہت بڑا بلیغ و فصیح شاعر گذرا ہے۔ اس کا نام و نشان ابوالطیّب احمد بن حسین ابن عبدالصمد الجعفی الکندی الکوفی ہے۔ یہ کوفہ کے محلہ کندہ میں تین سو تین ہجری (۳۰۳ھ) میں پیدا ہُوا۔ ایسا بلیغ و فصیح شاعر تھا۔ کہ بعض آدمی کہتے ہیں۔ کہ اس نے نبوّت کا دعوے کر دیا تھا۔ اور دلیل و معجزہ نبوّت

میں اپنے اشعار آبدار کو پیش کیا تھا۔ بنی کلب وغیرہ کا گروہ کثیر اس کا تابع بھی ہوگیا۔ مگر لولو نائب اخشیدیہ نے اس پر چڑھائی کرکے شکست دی۔ اور اس کو قید کیا۔ اور دعوئے نبوت سے توبہ کرنے کے بعد چھوڑا۔ اسی سبب سے لوگ اس کو متنبی (نبی بننے والا) کہتے ہیں۔ قاضی القضات ابن خلکان نے (وفیات الاعیان میں) اس کی بہت مدح وثنا کی ہے۔ اور اپنے اُستاد کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ اس کے دیوان کی چالیس شرحیں لکھی جاچکی ہیں۔ یہ شرف کسی اور شاعر کے دیوان کو نصیب نہیں ہُوا۔ یہ شعر میں صاحب بخت بلند اور لغت کا امام ہے۔ آخر ماہ رمضان تین سو چون ہجری (۳۵۴ھ) میں ۵۱ برس کی عمر پاکر فاتک ابن ابو جہل اسدی کے ہاتھ سے مع اپنے بیٹے اور غلام کے دریائے دجلہ کے کنارے پر قتل ہُوا۔ گویا عرب کا مجسم علم شعر جہل کے ہاتھ سے غرق دریائے عدم ہُوا۔ بجز جناب سید رضیؒ (جامع خطب نہج البلاغہ جو اس کے کچھ بعد پائے جاتے ہیں) عرب میں اور کوئی اس کے زمانے میں یا اس کے بعد مثل اس کے شاعر نہیں ہُوا۔ میں متنبی کے چند اشعار اور اُس کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کے چند شعر ایسے پیش کرتا ہُوں۔ جن کے مضامین میں کچھ مشابہت ہے۔ یا دونوں جانب قریب قریب ہو کر گذرے ہیں۔ ہرچند ایک قدرتی فرق اختلاف زبان عرب و ہند کا اور دوسرا مرتبہ حمد و چین کا حائل ہے۔ اختلاف زبان کے ساتھ ہی رسم و رواج۔ آب و ہوا و مناظر قدرت کے اختلافات ہیں۔ جن کی بُنیاد پر شاعری کی خیالی عمارت بنائی جاتی ہے۔ پس ان اختلافات کے سبب سے پُورا پُورا مقابلہ تو ناممکن ہے۔ علاوہ ان کے ایک باریک فرق غور کرنے سے اور بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ متنبی نے یہ اشعار اُس زمانے (چوتھی صدی ہجری) میں کہے ہیں۔ کہ جب زبان عربی میں تمام علوم و فنون کے ترجمے ہو کر زبان مذکورہ درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ برخلاف اس کے کہ اُردو میں آج تک تمام علوم و فنون نہیں آئے۔ اُن

متنبی و دبیر
میں فرق

زمانے کا تو کیا ذکر کہ جب کا یہ کلام مرزا مرحوم کا ہے (جس کو کم سے کم ساٹھ ستّر سال اور زیادہ سے زیادہ سو برس سمجھنا چاہئے۔ کہ سنہ ۱۲۴۳ ہجری سے مرزا صاحب کی شاعری شروع ہوتی ہے)۔ بااین ہمہ دیکھئے۔ مرزا مرحوم کی طبع رنگین و خداداد نے کیا کیا پھول کھلائے ہیں۔ دریائے مضامین بہائے ہیں۔ مگر جس طرح یہ **فرق زبان** مرزا مرحوم کے حق میں مضر ہے۔ اُس سے بڑھ کر **دُوسرا فرق مرتبہ ممدوحین** کا اُن کے حق میں مفید ہے۔ **متنبّی** کے اکثر ممدوحین ایسے ہیں۔ جن پر وہ مدح و ثنا نہیں پھبتی۔ بلکہ بعض جگہ خود شارحوں نے یہ احتمال کیا ہے۔ کہ متنبّی نے بظاہر مدح بباطن قدح کی ہے۔ اور کہیں کہیں اُنہیں ممدوحوں کی متنبّی (دُوسرے موقع پر) خود بھی صاف صاف ہجو لکھتا ہے۔ جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ اوّل مدح کہی ہوگی۔ جب انعام خاطر خواہ نہ پایا۔ تو ہجو کہدی۔ مگر مرزا مرحوم کے ممدوحین محمدؐ و آلِ محمدؐ اُس سے زیادہ مدح کے قابل ہیں۔ جو دل سے اُنہوں نے نظم کی ہے۔ بعض موقع پر بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب محمدؐ و آلِ محمدؐ یا اُن کے سچّے مددگار و اصحاب (شہدائے کربلا) کی شان و مرتبہ پر خیال کیا جاتا ہے۔ تو وہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے مرزا مرحوم کی تمام مدح و ثنا کم سے کم ہر خوش عقیدہ مسلمان کے نزدیک حق بجانب ہے۔ اور حق بات میں اہلِ حق کو زیادہ مزہ آتا ہے +

ازبسکہ آج کل عربی ہندوستان میں بہت کم رہ گئی ہے (اور جو باقی ہے۔ وہ بھی سفر کرتی جاتی ہے۔ اور شاید جو ریل ہندوستان سے ایران ہو کر بعض ممالک عرب میں بننے والی ہے۔ اس کے بن جانے پر اسی میں سوار ہو کر سفر کر جائے) اس لئے ہر شعر متنبّی کے ساتھ اُس کا اردو میں خلاصہ مطلب بھی مَیں نے لکھ دیا ہے۔ کہ اردو خوان ناظرین لطف اُٹھائیں۔ جہاں کہیں میری کم علمی کے سبب مجھ سے غلطی ہوگئی ہو۔ ناظرین عربی خوان و عربی دان مجھے آگاہ فرمائیں۔ مَیں انشاء اللہ دوبارہ کتاب چھپنے پر درستی کر دونگا۔ ہر چند مرزا مرحوم کے بعض کلام کا مقابلہ بعض کلام شعرائے جاہلیت سے بھی مَیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر

نہ آج کل میرے پاس وہ کتاب (سبعۂ معلّقہ) موجود ہے نہ مجھے فرصت ہے +

مرزا صاحب کے کلام کا مقابلہ اُن شعرائے سبعۂ معلقہ کے کلام سے ان وجوہ (ذیل) پر میرے خیال میں انسب ہوتا +

انسب ہونا سبعۂ معلقہ سے مرزا مرحوم کا مقابلہ

(۱) جس طرح شعرائے ایام جاہلیت کے زمانے میں عرب میں علوم و فنون نہ تھے - اُسی طرح مرزا صاحب کے زمانے میں بھی بالخصوص اردو میں قطعی علوم و فنون نہ ترجمہ ہوئے تھے +

(۲) جس طرح وہ شعرا فطرتی شاعر تھے - مرزا مرحوم بھی قدرتی شاعر تھے +

(۳) جس طرح وہ شعرا کھڑے کھڑے بیس تیس شعر کا قصیدہ کہدیتے تھے - مرزا مرحوم بھی دو چار گھنٹہ میں سو ڈیڑھ سو بند (۳۰۰ یا ۴۰۰ شعر) کا مرثیہ کہدیتے تھے +

(۴) خود مرزا مرحوم فرماتے ہیں :-

موزوں ہو شانِ مصحفِ ناطق کی اس نمط (یعنی طرح)	سحبان کے عنایتِ سبحان ہے یہ فقط
مکّے کے شاعروں کا ہُن دعوےٰ کردں غلط	حسّان سے لوں غلامیٔ حسنِ بیاں کا خط

میزانِ عرش میں مرے مضمون تُل گئے
اب سبعۂ معلّقہ کعبے سے کھُل گئے

مگر اکثر ناظرین اگر ایسے مقابلہ کو پسند فرمائینگے - تو انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں سبعۂ معلقہ کے بعض اشعار بھی کلام دبیر کے مقابلہ پر مَیں پیش کرونگا - بشرطیکہ زندہ رہا - اور اگر مر گیا اور ملک نے اس روش کو پسند کیا - تو اور کوئی خدا کا بندہ اس کام کو انجام دے لیگا +

فصل ۲ اجتماعِ نقیضین

ا - متنبّی کہتا ہے - مُتَفَرِّقُ الطَّعْمَیْنِ مُجْتَمِعُ الْقُوٰی فَکَاَنَّہُ السَّرَّاءُ وَالضَّرَّاءُ - میرا ممدوح (ابوعلی ہارون ابن عبداللہ) دو مختلف مزے رکھنے والا تمام قوتوں کا جامع (قوی ہیکل یا اولوالعزم) ہے - گویا وہ نرمی و سختی یا خوشحالی و بدحالی کا سبب ہے - یعنی دوستوں کے حق میں مفید اور دشمنوں کے واسطے بلائے جان و مضر ہے +

مرزا صاحب حضرت قاسم بن حسنؑ کی زبانی رجز میں فرماتے ہیں - (ٹیپ ملاحظہ ہو) :-

آٹھوں پہر لگائی ہے چورنگ بار ہا — ہم بے خطا ہیں تیر بھی اپنے ہیں بے خطا
چلہ نشیں کماں کے گوشے ہیں ہے قضا — نیزہ ہے اپنا زہر اُگلنے میں اژدہا

پر زہر سے عیاں اثر لطف و قہر ہے
مومن کو زہر مہرہ ہے کافر کو زہر ہے

مطلب یہ ہے۔ کہ نیزہ سے دوست کی مدد کر کے دشمن کو فی النّار کر دیتے ہیں۔ اس لئے دوست خدا کو یہ زہر مہرہ ہُوا۔ کہ دشمن کے زہر (ضرر) کو دفع کیا۔ اور دشمن خدا کے واسطے زہر ہے۔ الفاظ زہر و زہر مہرہ کی خوبی پر خیال فرمائیے۔ کہ بظاہر ملتے جلتے ہُوئے ہیں۔ مگر ایک دُوسرے کی ضد ہیں۔ متنبّی کے شعر میں متفرق الطعین و مستجمع جمیع قوے کا ثبوت سرّاء و ضرّاء سے ہے۔ مرزا مرحوم کے کلام میں صرف متفرق الطعین کا ثبوت ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی زہر و زہر مہرہ کا اثر متضاد ہونے کے علاوہ (زہر و زہر مہرہ میں) جو لطافت لفظی ہے۔ وہ اعلےٰ درجہ کی ہے۔ جیسا کہ میں نے اُوپر اشارہ کیا ہے +

سخاوت

۴۔ متنبّی۔ یَا اَیُّهَا الْمَجْدُ ی عَلَیْهِ رُوْحَهٗ ۔ اِذْلَیْسَ یَاتِیْهِ لَهَا اِسْتِجْدَاءُ
تیری جان (اے ممدوح) گویا تجھے سائلوں نے دے رکھی ہے کہ کوئی تجھ سے نہیں مانگتا۔ ورنہ تو ایسا سخی ہے۔ کہ سائل مانگتا۔ تو جان بھی اپنی دیدیتا +

مرزا مرحوم امام حسینؑ کی مدح سخاوت میں فرماتے ہیں۔ (رباعی)۔

محتاجوں کو اغنیا نے زر بخشا ہے — درماندوں کے آرام کو گھر بخشا ہے
احمدؐ کے نواسے کی سخاوت دیکھو — دشمن کو رہِ دوست میں سر بخشا ہے

ایک دُوسرے مقام پر ایک مرثیہ میں اسی مضمون کو پھر نظم فرمایا ہے ؎

حق عاشقی حق کا ادا شہ نے کر دیا — دشمن کو راہِ دوست میں خوش ہو کے سر دیا

ذی علم ناظرین! ملاحظہ فرمائیے۔ متنبّی تو اتنا ہی کہہ کے چپ ہو گیا۔ کہ سائل مانگتا تو جان بھی دیدیتا۔ اور وہ اس کے سوا کہتا ہی کیا؟ مگر مرزا مرحوم نے کیا نتیجہ اور اچھی تعریف

اپنے ممدوح (امام حسینؑ) کی فرمائی۔ کہ دوست کی راہ میں سر بھی دیا تو کس کو؟ دشمن کو۔ اور پھر کیونکر دیا؟ خوش ہو کر۔ اللہ اللہ بات بات میں کس قدر بلاغت کے نکات ہیں۔ جتنا غور فرمائیے لطف مضمون بڑھتا جاتا ہے۔ کلام بلیغ کی یہی صفت ہے۔

۳۔ متنبیؔ۔ لَمْ تَحْكِ نَائِلَكَ السَّحَابُ وَاِنَّمَا۔ حُمَّتْ بِهٖ فَصَبِيْبُهَا الرُّحَضَاءُ۔ تیری بخشش کے مقابل ابر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تیری عطا و بخشش دیکھ کر اُس کو تپ چڑھ گئی ہے۔ یہ پانی نہیں برستا۔ اُس کا پسینہ ٹپک رہا ہے۔ ابر و بحر کو سخاوکرم سے تشبیہ دینے کا رواج غالباً قدیم زمانے سے ہر زبان کی (لٹریچر) ادب میں پایا جاتا ہے۔ متنبیؔ نے بھی اور شعرائے عرب کی طرح اس کو خوب خوب نظم کیا ہے۔ ایک دُوسرے قصیدہ مدح سیف الدولہ میں وہ اپنی شمشیر زبان کے یُوں جوہر دکھاتا ہے۔

تَجِفُّ الْاَرْضُ مِنْ هٰذَا الرَّبَابِ وَتَخْلُقُ مَا كَسَاهَا مِنْ ثِيَابِ

بادل برسنے کے تھوڑے دنوں بعد زمین خشک ہو جائیگی۔ اور جو جامۂ نو نباتات کو اُس نے پہنایا ہے۔ وہ پُرانا ہو جائیگا۔

وَمَا يَنْفَكُّ مِنْكَ الدَّهْرُ رَطْبًا وَلَا يَنْفَكُّ غَيْثُكَ فِي انْسِكَابِ

مگر تیرا سحاب کرم ہمیشہ برستا رہیگا۔ اور اس کا سلسلۂ فیض و احسان دُنیا سے منقطع نہ ہوگا انصاف یہ ہے۔ کہ یہ مضمون متنبیؔ نے نہایت بلیغ نظم کیا ہے۔ اب اس کے بعد ہم ذرا دبیر مرحوم کو دیکھئے۔ کس پایہ کا مضمون ادا فرماتے ہیں۔ (رباعی)

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر حیدرؑ کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا۔ کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر

ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ جب ابر نیساں برستا ہے۔ تو موتی پیدا ہوتے ہیں۔ پس وہ بھی موتی دیتا ہے مگر رو رو کر۔ اور میرا ممدوح تاجدار ہل اتیٰ ہنس ہنس کر بخشتا ہے۔ پس ابر نیساں کو اس سے کیا نسبت ہے۔ یہ مضمون

مقابلہ شمع سحاب

قسّام ازل نے مرزا مرحوم کے حصّہ میں رکھا تھا۔ میرے علم میں دُوسرے شاعر کے خیال میں نہیں آیا۔ کسی نے آج تک نظم نہیں کیا +

۴۔ متنبّی سیف الدّولہ کے لشکر کے غبار کی نسبت کہتا ہے ؎

کَاَنَّ نُجُومُ اللَّیلِ خَافَتْ مَغَارَہٗ　　فَمَدَّتْ عَلَیھَا مِنْ عَجَاجَتِہٖ حُجُبَا

لشکر کی کثرت سے رات کے ستارے ایسے ڈرے۔ کہ اُنھوں نے غبار لشکر سے اپنے اُوپر گویا پردے تان لئے۔ کہ لڑائی کا خوفناک سماں اُن کو نظر نہ آئے۔ واقعی کیسا بلیغ یہ مضمون متنبّی نے باندھا ہے۔ اور یہ مضمون شاعروں میں اکثر پامال ہوتا رہا ہے۔ فردوسی و نظامی نے بھی غبار سم اسپان کے مضمون کو خوب خوب باندھا ہے۔ اور دونوں بزرگوار قریب قریب یکساں فرما گئے ہیں :۔

(فردوسی)

زبس گرد میداں کہ برشد بدشت
زمیں شش شد و آسماں ہشت گشت

(نظامی)

ز سُمّ ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

دونوں کا مفہوم یہ ہے۔ کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اتنی گرد اڑی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک طبقہ زمین کا اڑکر آسمان میں جا لگا۔ اگرچہ ان شعروں میں رعب و خوف کا کوئی مضمون مثل شعر متنبّی کے نہیں ہے۔ مگر ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ اپنے رنگ میں یہ پھول بھی خوشنما ہیں +

مرزا مرحوم کے ممدوح امام عالی مقام ہیں۔ اُن کے گھوڑے کے سم سے جو گرد اڑی وہ بھی خاص اور اعلےٰ ہونی چاہئے۔ (کہ اُن کا گھوڑا خاتم المرسلین محمد مصطفےٰ صلعم کا اسپ خاص ہے۔ وہ فرماتے ہیں) :۔

تقسیم سُرمہ گردِ سواری نے کر دیا　　شیشہ فلک کا کحل جواہر سے بھر دیا

دیکھئے۔ شیشہ فلک ایک مشہور استعارہ ہے۔ کہ آسمان شیشہ کی طرح نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ سم اسپ امامؑ سے جو گرد اُٹھی۔ وہ بمنزلہ کحل الجواہر (سرمہ جواہرات) تھی۔ اُس سے

شیشہ خالی آسمان کا بھر گیا۔

شجاعت

۵۔ متنبی ؎ اِذَا مَا سِرْتَ فِی آثَارِ قَوْمٍ۔ تَخَاذَلَتِ الْجَمَاجِمُ وَالرِّقَابُ

سیف الدولہ کی مدح شجاعت میں کہتا ہے۔ کہ جب تو کسی قوم کے پیروں کے کھوجوں پر جاتا ہے (تعاقب کرتا ہے)۔ تو اُن کی کھوپریاں اور گردنیں ایک دوسرے کو چھوڑ دیتی ہیں۔ کہ تیری تلوار کھوپریوں کو گردنوں سے اُڑا دیتی ہے۔ پس دونوں میں جدائی ہو جاتی ہے متنبی نے محض تعاقب سے دشمنوں کی کھوپریاں گردنوں سے جدا ہو جانی بیان کی ہیں جس سے ہیبت و شجاعت کا خلاف عقل مبالغہ خیال میں گذرتا ہے۔ اب دیکھئے مرزا مرحوم شمشیر حسینی کی صفائی اور دشمنوں کے سر اُڑانے کو کس صفائی سے بیان کرتے ہیں ؎

تیغ نگ کی طرح۔ جدھر یہ پلٹ گئی گردن۔ سر آگے سینک کے پیچھے کو ہٹ گئی

اس میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ جب تلوار سے سر کٹتا ہے۔ تو واقعی ایک ہچکولا ایسا ہی آتا ہے۔ کہ جس سے گردن پیچھے کو سرک جاتی ہے۔ اس شعر میں تلوار سے سر اُڑنے کی تصویر کھینچ دی ہے۔

فصل ۱۳ موت

۶۔ متنبی۔ خواہر سیف الدولہ کے مرثئے میں کہتا ہے ؎

غَدَرْتَ یَا مَوْتُ کَمْ اَفْنَیْتَ مِنْ عَدَدٍ بِمَنْ اَصَبْتَ وَکَمْ اَسْکَتَّ مِنْ لَجَبٍ

اے موت! تو نے غدر و بے وفائی کی۔ کہ نام تو ایک (عورت) کے مارنے کا کیا۔ اور بہت سے آدمیوں کو جو اُس کے دم سے زندہ تھے مار ڈالا۔ حقیقت میں ایک نیک نفس فیض رساں کے مرنے سے بہت آدمی جو اُس سے وابستہ ہوتے ہیں گویا مر جاتے ہیں۔ مرزا مرحوم ہمشکل محبوب خدا شاہزادہ علی اکبرؑ کے مرثئے میں اُن کی ماں کی زبانی کہتے ہیں ؎

کوئی نہ رہا کنبے میں میرے علی اکبرؑ سب مر گئے۔ اک مرنے سے تیرے علی اکبرؑ

یعنی تیری موت میرے حق میں تمام کنبہ کی موت ہو گئی۔ میں سمجھتی تھی۔ کہ میرا کوئی

رشتہ دار نہ رہا۔

کثرت لشکر

۷۔ متنبّی سیف الدولہ کے لشکر کی کثرت یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

وَلَا تَعۡبُرُ الرِّیۡحُ فِی جَوِّہٖ ۔۔۔ اِذَا لَمۡ تَخُطَّ الۡقَنَا وَتَثِبۡ

لشکر میں یہ نیزوں کی کثرت تھی۔ کہ ہوا بھی میدان جنگ میں نہیں گذر سکتی تھی جبتک کہ وہ نیزوں پر سے ہو کر نہ کود پھاند جاتی تھی۔

مرزا مرحوم نے اپنے لاجواب مرثیہ حال مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی میں دوستداران اہلبیت اطہار کی کثرت کو (جو خون ناحق امام حسینؑ کا بدلہ لینے کو ۶۶ھ کے قریب مختار کے لشکر میں جمع ہوئے تھے) یوں نظم کیا ہے۔ ؎

کوچوں میں یہ ہجوم خلائق کا حال تھا ۔۔۔ سائے کو ساتھ لیکے گذرنا محال تھا

ظاہر ہے۔ کہ ہجوم لشکر میں ایک شخص کا سایہ چند آدمیوں پر پڑیگا۔ اس صورت میں جس شخص کا سایہ ہے۔ اُس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ایسے سچے مضامین نکالنا کہ جن سے بظاہر مبالغہ کی شان نکلے۔ واقعی عالی دماغ شعرا کا کام ہے۔

مدح بعض اعضائے ممدوح

۸۔ متنبّی کہتا ہے ؎ مَظۡلُوۡمَۃُ الۡقَدِّ فِیۡ تَشۡبِیۡھِہٖ غُصُنًا۔ مَظۡلُوۡمَۃُ الرِّیۡقِ فِیۡ تَشۡبِیۡھِہٖ ضَرَبًا۔ اگر اُس کے قد کو نزاکت میں شاخ سے اور آب دہن کو شیرینی میں شہد سفید سے تشبیہ دیں۔ تو یہ گویا ظلم ہے۔ کہ قد اور آب دہن نزاکت شیرینی میں شاخ و شہد سفید سے کہیں بڑھی ہوئی ہیں متنبّی نے قد اور آب دہن کی مدح کی

---

* ایک دوسرے مرثیہ غیر تقسیمی میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے۔ امام حسینؑ کی مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت روضۂ رسول خدا میں اُن حضرتؑ کا جانا اور وہاں ارواح انبیاؑ و اشراف مدینہ و ملائکہ کا ہجوم ہونا بیان فرمایا ہے اس موقع پر فرماتے ہیں ؎ فردوسیوں کا در پہ ہجوم اس قدر ہوا۔ رضواں جنا بہشت کی بوجب گذر ہوا پھر اُسی مرثیہ میں کثرت کا حال بیان فرماتے ہیں ؎ کثرت یہ تھی رواق شہ دیں پناہ میں۔ سُرمہ نگاہ ہو گئی پس پس کے راہ میں۔ یہ مضامین ہر شاعر کو نہیں سوجھتے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہے۔ اور خوب کی ہے٭

مرزا مرحوم کا کلام میں صرف لب حضرت عباسؑ کی تعریف میں پیش کرتا ہوں۔ مگر دیکھئے۔ کس قدر اچھی اور سچی تعریف ہے۔ باانیہمہ تمام شعرا سے الگ۔

شیریں رقموں میں رقم اس لب کی جدا ہے — اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے — یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے

چوسا ہے یہ لب مثلِ رطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا۔ کس روز؟ علیؑ نے

۹۔ متنبی اپنے ممدوح غیث ابن علی عجلی کی سخاوت و شجاعت کی یوں مدح سرائی کرتا ہے ؎ عُمْرُ الْعَدُوِّ اِذَا لَاقَاهُ فِیْ رَهَجٍ۔ اَقَلُّ مِنْ عُمْرِ مَا یَحْوِیْ اِذَا وَهَبَا۔ غبار جنگ میں جب دشمن اُس کے مقابلہ پڑ جاتا ہے۔ تو اُس کی عمر ممدوح کے مال سے بھی جبکہ وہ مال بخشنے لگے کوتاہ و کمتر ہو جاتی ہے۔ یعنی جیسے بخشش کے وقت ممدوح کے ہاتھ میں مال نہیں ٹھہرتا۔ اُسی طرح میدان جنگ میں دشمن کی عمر بھی نہیں ٹھیرتی ٭

شجاعت و سخاوت

مرزا مرحوم امام حسینؑ کی بہادری و بخشش کی یوں ساتھ ساتھ تعریف فرماتے ہیں۔ موقع یہ ہے۔ کہ امام ممدوح جہاد فرمانے کو میدان جنگ میں آرہے ہیں۔ دشمن کی فوج میں گھبراہٹ اور انتشار پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک ایسے پیاسے شیر کا مقابلہ ہے۔ جس کا مثل و نظیر بہادری میں خدا نے اپنی خدائی میں نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بھی

٭ مرزا مرحوم گیسو و روے اور لب اور دہن اور دانتوں کے ساتھ ساتھ یوں مدح کرتے ہیں:۔ گیسوئے رسا روے کتابی کے قریں ہے۔ قرآن کا حافظ پر جبریلِ امیں ہے ٭ لب موج دہن کوثرِ فردوسِ بریں ہے۔ دانتوں سے لطافت کا جہاں زیرِ نگیں ہے ٭ دندان و دہن کے لئے تشبیہیں ملی ہیں کلیاں سمنِ خلد کی کوثر میں کھلی ہیں ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

غور فرمائیے۔ کہ متنبیؔ نے صرف سخاوت و شجاعت کو سراہا ہے۔ رعب و ہیبت ممدوح کا اُس کے شعر میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ مرزا مرحوم کا شعر اس پہلو کو بھی لئے ہوئے ہے۔ جو لازمۂ شجاعت ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

درہم ہیں یوں پرے کہ قرار اب محال ہے ۔۔۔ دِرہم کا شہ کے دستِ کرم میں جو حال ہے

یعنی جس طرح درہم (روپیہ) امام کریم کے ہاتھ میں آکر بے قرار رہتا ہے جب تک وہ جناب کسی کو بخش نہ دیں۔ اسی طرح دشمن کی فوج کے پرے پریشان اور درہم و برہم ہو رہے ہیں۔ اور ڈر رہے ہیں۔ کہ دیکھئے۔ اب لڑائی میں جان رہتی ہے یا جاتی ہے۔ ع واقعی جان کا کھٹکا بھی بُرا کھٹکا ہے۔

۱۰۔ محض سخاوت ممدوح کے باب میں متنبیؔ کہتا ہے۔

وَكُلَّمَا لَقِيَا الدِّيْنَارُ صَاحِبَهُ ۔۔۔ فِي مِلْكِهِ افْتَرَقَا مِنْ قَبْلِ يَصْطَحِبَا

جب اُس کی مِلک میں دو دینار آجاتے ہیں۔ تو وہ ملنے سے پہلے متفرق ہو جاتے ہیں۔ کہ ممدوح سائلوں کو دے ڈالتا ہے۔

مرزا مرحوم جناب امیرؑ کی سخاوت میں کہتے ہیں۔

مُٹھی میں یوں قرار زر و سیم ہے محال ۔۔۔ جیسے کبھی ہتیلی پہ پیدا نہ ہوئیں بال

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح عادتاً ہتیلی پر بالوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ اُسی طرح ان کے ہاتھ میں روپیہ اشرفی ٹھیرنا ناممکن ہے۔ یہ ایسے بخشنے والے ہیں۔

۱۱۔ متنبیؔ اپنے ممدوح کی بہادری کو یوں سراہتا ہے۔

اِنَّ الْمَنِيَّةَ لَوْلَاقَتْهُمْ وَقَفَتْ ۔۔۔ خَرْقَاءَ تَتَّهِمُ الْاِقْدَامَ وَالْهَرَبَا

موت بھی اُس کے سامنے (میدان جنگ میں) آجائے۔ تو حیران و ششدر کھڑی رہ جائے کہ آگے بڑھونگی۔ تو ماری جاؤنگی۔ پیچھے ہٹونگی۔ تو پکڑی جاؤنگی۔ دُوسرا شعر متنبیؔ کا ممدوح کی تلوار کی مدح میں یہ ہے۔ ماشارکتہ منیتہ فی مھجۃ

سخاوت

فصل ۴ مدح شجاعت اور تلوار

اور تلوار

اِلَّا وَ شَفْرَتُہٗ عَلٰی یَدِہَا یَدٗ ۔ موت خونریزی میں تیری تلوار کی شریک نہیں ہوتی۔ مگر تلوار کی تیزی کا ہاتھ موت کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تیری تلوار موت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور واقعی جب تلوار کاٹیگی۔ جب ہی موت آئیگی۔ پس تلوار کا ہاتھ موت کے ہاتھ پر رہا۔ یہ عجب بلیغ مضمون ہے۔ تیسرا شعر متنبی کا میں اور لکھنا چاہتا ہوں۔ جس میں وہ خود اپنی تلوار کی مدح کرتا ہے۔ یا اپنی شیخی بگھارتا ہے۔

یُسَابِقُ سَیْفِیْ مُنَایَا الْعِبَادِ اِلَیْہِمْ کَاَنَّہُمَا فِیْ رِہَانٍ

میری تلوار اور مقتولوں کی موت شرط باندھ کر ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں۔ مگر میری تلوار موت سے پہلے اُن تک پہنچ جاتی ہے +

ناظرین باتمکین!! اب جہاد امام حسینؑ کے موقع پر شمشیر حسینی کی مدح میں مرزا مرحوم کے چند شعر سن لیجئے:-

(۱) میان سے تلوار نکل رہی ہے۔ اُس موقع پر کہتے ہیں۔

کل اُس کو نہ رن میں نہ بیابان میں آئی | یہ میان سے نکلی اور اجل میان میں آئی

(۲) پھر اسی مضمون کے قریب قریب دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں۔

پھل دونوں دیکھ دیکھ کے چلائے رمز داں | لو پر تو ہیں عیاں ملک الموت ہیں کہاں
بولی اجلؔ وہ گوشہ نشین نیام ہیں | اس وقت ذوالفقار کے قائم مقام ہیں

(۳) اور سنئے۔

طاؤس ذوالفقار تڑپ کر عیاں ہوا | اُڑ اُڑ کے ہر زمیں کا طبق آسماں ہوا
چلائی عافیت میں رہوں کس مکان میں | مڑکر یہ تیغ بولی۔ کہ چھپ جا میان میں
(۴) سائے کو مڑ کے حکم دیا رہ نہ جائیو | آنگلی اجل کی پکڑے ہوئے لیتا آئیو
(۵) دم تن سے نہ نکلا کہ وہ چھپنے کی گھڑی تھی | ڈر سے نہ اجل آئی۔ کہ تلوار کھڑی تھی

واقعی مرزا مرحوم جس طرف جاتے ہیں۔ دریا مضامین کے بہا جاتے ہیں۔ کیا دماغ پایا ہے۔

خر گوش

۱۲۔ متنبّی کہتا ہے ۔ ؎ وَلَمَّا قَلَّتِ الْاِبْلُ امْتَطَیْنَا۔ اِلٰی ابْنِ سُلَیْمَانَ الْخُطُوْبَا ۔ جب مفلسی کی بدولت اُونٹ ہمارے پاس کم ہو گئے ۔ تو ہم زمانے کی مصیبتوں کو شتر بنا کر پسر ابو سلیمان کی طرف چلے ۔ واہ کیا عمدہ استعارہ ہے ؎

مرزا مرحوم ایک بے سروسامان عاشق امام حسینؑ کی کیفیت نظم فرماتے ہیں جس نے بعد شہادت امام مظلوم یہ خبر سُنی ہے ۔ کہ سر امام حسینؑ یزید نے اپنی جہالت و شقاوت سے ایک کنوئیں میں قید کر رکھا ہے ۔ یہ شخص اپنے وطن مالوفہ کوفہ سے اکیلا شام کو اس ارادے سے جا رہا ہے ۔ کہ کسی تدبیر سے اپنے آقائے مظلوم کا سر اُس کنوئیں سے نکال کر لاؤنگا ۔ اور یہیں کوفہ (نجف) میں جناب امیرؑ کے جسم اقدس کے قریب دفن کرونگا ۔ (کہتے ہیں) :۔

گھر سے چلا دمشق کو وہ مردِ باوفا ۔ توفیق زادِ راہ ہُوئی شوق رہ نما
رزقِ لطیف گلشن فردوس کی ہوا ۔ اور آبلے کے پردے میں کوثر بزیرِ پا

زانو و سر کو پیٹتا تھا ہر مقام میں
یعنی برہنہ پا گئے سجّاد شام میں

۱۳۔ نکہت باغ کا یہ مضمون جو میں ذیل میں لکھتا ہوں ۔ شاید پہلے پہل متنبّی کو سُوجھا ہے ۔ مجھے یہ مضمون بہت ہی پسند ہے ۔ ؎

وَمَا رِیْحُ الرِّیَاضِ بِھَا وَلٰکِنْ ۔ کَسَاھَا دَفْنُھُمْ فِی التُّرْبِ طِیْبًا

یہ جو باغوں میں خوشبو (پھیلی ہُوئی) ہے ۔ وہ باغوں (کے پھولوں) کی نہیں ہے ۔ بلکہ اُن (مُردوں) کے مٹّی میں دفن ہونے نے باغوں کو خوشبوؤں کا لباس پہنا دیا ہے ۔ ناظرین عالی دماغ کی خدمت میں میں اس موقع پر ایک نظم کا گلدستہ پیش کرتا ہوں ۔ جس میں کچھ پھول جناب مرزا غالب مرحوم کے حدیقہ نظم کے اور بعض گل شگفتہ مرزا دبیر مغفور کے گلزار طبع کے اور بعض استادی حضرت اوج مدظلہٗ کے بوستان طبع کے ہیں ۔ خدا کی

مسافرت میں سواری زملنے

باغ میں پھول اور اُن میں خوشبو اور نیک مقبل ان

شان ہے۔ کہ مضمون کا ماحصل ایک ہی ہے۔ مگر الفاظ کے رنگ اور خوشبوے بیان کے اثر نئے نئے لطف پیدا کرتے ہیں[1]

۱۔ مرزا غالب مرحوم:۔ سب کہاں۔ کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں ✦ خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں ✦

۲۔ مرزا دبیر مغفور:۔ نشو و نما سرو قد خرّاں نے کئے۔ جبکہ۔ پائمال ✦ تب خاک سے نمود ہوا۔ ایک نونہال ✦ ریحاں۔ کسی حسین کی فہرست خط و خال ✦ نرگس کسی کی چشم تو سنبل کسی کے بال ✦ جب لاکھ گل رخوں کا رسالہ نہاں ہوا ✦ اک لالہ۔ داغدار زمیں (چمن) سے عیاں ہوا ✦

۳۔ حضرت اوج مدظلہ:۔ کیسی رنگا رنگ شکلیں ہونگی اے جوشِ بہار ✦ مٹ کے جو گلگونۂ رخسارِ گلشن ہوگئیں[2] ✦

---

[1] ایک شعر حضرت میر تقی میر مرحوم کا بھی اسی مضمون کا نکل آیا۔ یہ غالب کے درجۂ دبیر و اوج مدظلہ سب کے اوپر ہونا چاہئے تھا۔ مگر مجبوری ہے۔ کہ بعد کو دستیاب ہوا۔ اس لئے حاشیہ پر لکھ دیتا ہوں ؎ کو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن ✦ خاک سے یکساں ہوئے ہوں گے ہیں ہاں کیا کیا آشنا ✦ اب دو چار مستند اُستادوں کے اشعار اکٹھے ہوگئے جو اپنے اپنے رنگ میں یکتا اور اپنے عہد میں بے مثل ہیں ✦ ۱۲ مؤلف بے بضاعت۔

[2] متنبی نے صرف خوشبو کی نسبت خیال کیا تھا۔ کہ جو باغوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ نیک نہاد مُردوں کی ہے۔ کہ جو زیر زمیں دفن ہیں۔ ان شعرائے ہند نے پھولوں کی نسبت بھی خیال ادا فرمایا ہے۔ مگر سبحان اللہ کس خوبصورتی سے کس لطافت اور سلاست و فصاحت سے مضمون کو ترقی دی ہے۔ مجھ بے بضاعت کو جہاں تک ایرانی شاعروں کے کلام دیکھنے کا موقع ملا (اور وہ بہت کم ملا) اُن کے یہاں ایسا مضمون خوشبوؤں یا پھولوں کی نسبت نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ ہر عمارت اور زمین کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ اگر غور کرو۔ تو کیسے کیسے صاحبان ملک و مال و یوسف جمال خاک کا پیوند ہوگئے۔ ہر جگہ انہیں کی خاک مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے چنانچہ عمر خیام کی لاجواب رباعی حسب ذیل ہے۔ خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانی ست ✦ زلف صنمی و عارض جانانی ست ✦ ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی ست ✦ انگشت وزیری و سر سلطانی ست ✦ سعدی شیرازی فرماتے ہیں ؎ زدم تیشہ یکے روز بر تل خاک ✦ بگوش آمدم نالہ دردناک ✦ کہ زنہار اگر مردی۔ آہستہ تر ✦ کہ چشم و بنا گوش و روے ست و سر* ✦

*۔ بے بضاعت ثابت نے بھی ان سب اُستادوں کی تقلید میں کچھ خاک چھانی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎ جن کی خاک پاتھی عطرِ گل عرق جن کا گلاب ✦ کیوں فلک وہ صورتیں مٹی میں پنہاں ہوگئیں ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

۱۴ المتنبی اپنے ممدوح کافور حبشی والئ مصر کی مدح میں کہتا ہے ؎

اِذَا اَتَتْهَا الرِّيَاحُ النُّكْبُ مِنْ بَلَدٍ   فَمَا تَهُبُّ بِهَا اِلَّا بِتَرْتِيْبِ

جب اُس کے شہر میں چوبائی ہوا کسی شہر سے آتی ہے۔ تو اُس کی ہیبت کے سبب سے سیدھی (باقاعدہ) چلنے لگتی ہے ؂

مرزا مرحوم جناب حسنین علیہم السلام کی مدح میں کہتے ہیں ؎

اک ذرّہ خلاف ان کے زمیں کر نہیں سکتی
دم بھر بھی ہوا خبر کا دم بھر نہیں سکتی

اس میں "دم بھر" اور "دم بھر نہیں سکتی" (ان الفاظ) میں جو لطافت و دلچسپی ہے۔ اُس کی تعریف سے زبان قاصر ہے۔ دل ہی لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر کس کا؟ اُن لوگوں کا جن کو لطف زبان حاصل ہے۔ جب تک زبان پر شاعر کو اعلیٰ درجہ کی قدرت نہ حاصل ہو۔ ایسے الفاظ خیال ہی میں نہیں آتے۔ سچ کہتے ہیں۔ کہ شاعر کے دیوان بھر میں ایک غزل یا قصیدہ اور اُس میں ایک شعر اور شعر میں ایک لفظ ہوا کرتا ہے ؂

۱۵ المتنبی اُسی کافور کی مدح میں کہتا ہے ؎

وَلَا تُجَاوِزُهَا شَمْسٌ اِذَا شَرَقَتْ   اِلَّا وَمِنْهُ لَهَا اِذْنٌ بِتَغْرِيْبِ

طلوع ہونے کے بعد مصر سے آفتاب نہیں گذرتا جب تک ممدوح (کافور) سے اذن غروب نہ حاصل کر لے۔ اس شعر میں ممدوح کی کمال عظمت (فرضی) بیان کی ہے ؂

مرزا مرحوم جناب عباسؑ ابن جناب امیرؑ کی زبانی (رجز میں) کہتے ہیں (پہلوان مقابل کا نام مرحب بن عبد القمر ہے۔ جب وہ رجز پڑھ چکا۔ تو جناب عباسؑ اُس کے جواب میں رجز خواں اور گہر فشاں ہیں) ؎

عبد القمر نحس کا تو داغ جگر ہے
میں چاند علیؑ کا ہوں ارے یہ بھی خبر ہے
خورشید پرستی سے تری کیا مجھے ڈر ہے
قبضے میں طناب فلک شمس و قمر ہے
جب قبلے کو ہم نے رخ امید پھرایا

بیان قوت ممدوح

عظمت ممدوح

مشرق کی طرف شام کو خورشید پھر۔ آیا

طناب فلک قبضہ اقتدار میں ہونے کے دعوے کو کس خوبصورتی سے دلیل معجزہ رجعت شمس سے ثابت فرمایا ہے۔ اور یہ (بات) کہ رجعت شمس جناب امیرؑ کے واسطے ہوئی مسلمانوں میں ایک اظہر من الشمس بات ہے۔ رُخ امید قبلے کی طرف پھرانے کے بھی دو معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ (۱) نماز کے واسطے متوجہ ہوئے۔ (۲) خدا سے دعائے رجعت شمس کی۔ یہ بیت ذوقافتین بھی ہے۔ (۱) خورشید و امید باہم قافیہ ہیں (۲) پھر ایا اور پھر آیا۔ اور پھر ایا اور پھر آیا میں تجنیس خطی کی صنعت بھی ہے اتنی صنعتوں پر اس قدر بے تکلف و بے ساختہ نظم۔ یہ خدا کی قدرت و بخشش اور دین کا حصّہ ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۶۔ ابوایوب احمد بن عمران کی مدح میں متنبّی کا شعر ہے۔

رَعَدُ الْفَوَارِسَ مِنْكَ فِي أَبْدَانِهَا   أَجْرَى مِنَ الْعَسَلَانِ فِي قَنَوَاتِهَا

سواروں کے نیزے اتنے نہیں ہلتے۔ جتنے تیرے رعب و خوف سے اُن کے بدن لرزتے ہیں +

مرزا دبیر فرماتے ہیں۔

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند   تھا تیروں کو رعشہ قدم پیر کی مانند

اس شعر کی لطافت و بلاغت میں اعتراض مولوی شبلی صاحب کے جواب میں ایک جگہ اسی کتاب میں بیان کرچکا ہوں۔ ناظرین اُس موقع پر ملاحظہ فرماسکتے ہیں +

۱۷۔ مساور بن محمّد رومی کی مدح میں متنبّی کا شعر ہے۔

يَخْطُو الْقَتِيلَ إِلَى الْقَتِيلِ أَمَامَهُ   رَبُّ الْجَوَادِ وَخَلْفَهُ الْمَبْطُوحُ

کشتوں کی کثرت سے میدان جنگ میں ممدوح کا گھوڑا ایک کشتہ کے بعد دوسرے

فصل ۵ رعب و دہشت

میدان جنگ کثرت کشتگان

پر قدم رکھتا ہے۔ اور اُس کے سوار کے پیچھے بھی ایک کُشتہ پڑا ہے ⁎

مرزا مرحوم ذوالفقار آبدار اور راہوار فرزند احمد مختار (امام حسینؑ) کی کیفیت میدان کارزار میں بیان فرماتے ہیں۔ ؎

صف روندتا تھا گوند کے رہوار برق دار	برسا رہی تھی خون کا مینہ تیغ آبدار
کیلیں نہیں۔ وہ نعل ہلالی میں آشکار	پر دشت تھا یہ گل کہ نہ تھی گشت کی بہار

رن میں جھڑی لگائی تھی تیغ بلند نے
باندھے تھے مینہ کے کھلنے کو تارے سمند نے

۱۸۔ سیف الدولہ کو عید قربان کی تہنیت (متنبّی) دیتا ہے۔ ؎

هَنِيْئًا لَكَ الْعِيْدَ الَّذِيْ اَنْتَ عِيْدُهٗ	وَعِيْدٌ لِمَنْ سَمّٰى وَضَحّٰى وَعَيَّدَا

تجھ کو وہ عید مبارک ہو جس کی تو خود عید ہے۔ اور تو اُس شخص کی عید ہے۔ جس نے عید منائی۔ اور خدا کا نام لیا اور قربانی کی ⁎

مرزا مرحوم نے ایک مرثیہ میں ایک روایت نظم فرمائی ہے۔ کہ عہد جناب رسالت مآب صلعم (روحی لہ الفدا) میں ایک ایسی عید آئی۔ کہ حسنین (علیہما السلام) کے پاس نئے لباس نہ تھے۔ اور محلّہ کے بچّوں کو نئے نئے کپڑے سلواتے اور رنگواتے ہُوئے دیکھ کر یہ دونوں شاہزادے اپنی والدہ ماجدہ جناب فاطمہؑ کے پاس آئے۔ اُس وقت کی (ماں بیٹوں کے لاڈ پیار کی) تصویر مرزا صاحب یُوں کھینچتے ہیں :۔

ن پر خون تو برسات تھا اور تو کچھ گشت کی بہا

تہنیت عید

[۱] گل۔ کیچڑ۔ گیلی مٹی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کہ ذوالفقار نے دشمنوں کے قتل کرنے میں اتنا خون بہایا تھا۔ کہ برسات معلوم ہوتی تھی۔ رہوار بجلی کی طرح (صفین) کو ند کو ند کر روند رہا تھا۔ مگر کیچڑ کے سبب سے اُس کے پھرنے کی بہار نہ تھی۔ کیلیں جو نعلوں میں تھیں۔ وہ ستارے معلوم ہوتے تھے۔ گویا مینہ کھلنے کے لئے گھوڑے نے تارے باندھے تھے۔ ہندوستان میں یہ ٹوٹکہ مشہور ہے۔ کہ مینہ کے کھلنے کو تارے باندھے جاتے ہیں ⁎ ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

القصہ سُن کے چار طرف عید کی خبر آئے حضور فاطمہؑ سبطینؑ نامور
باہیں گلے میں ایک نے ڈالیں اِدھر اُدھر اک سینے سے لپٹ گیا جلدی جھکا کے سر
بولا۔ بڑا۔ ہمیں پہ بہت مہربان ہیں
چھوٹا۔ پکارا۔ واہ مری اماں جان ہیں

اب ماں کا جواب سُنئے۔ جواب کی شان دیکھئے۔ ایسا جواب ہو۔ جس سے ماں کی محبّت لفظ لفظ سے ٹپکتی ہو۔ اور دونوں بچّوں کے ساتھ یکساں محبّت ثابت ہو کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو:۔

ماں بولی ہم تو دونوں کے قربان جاتے ہیں اتنا نہ چاہو تم۔ مجھے وسواس آتے ہیں
حاسد کے چشم زخم سے ہم ہول کھاتے ہیں سب سے چھپا کے تم کو گلے سے لگاتے ہیں
خاصانِ حق کے خاص ہو۔ نیکوں کے نیک ہو
مثلِ نگاہ۔ تم مری آنکھوں میں ایک ہو

اولاد کو عام طور پر نورِ چشم کہتے ہیں۔ دونوں فرزندوں کا اپنی آنکھوں میں ہم مرتبہ ہونا کس لطافت سے بیان فرمایا ہے۔ کہ آدمی کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ مگر نگاہ ایک ہی ہوتی ہے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ تم دونوں نورِ چشم میری دو آنکھیں ہو۔ مگر نگاہ کی طرح میں (دونوں کو) ایک سمجھتی ہوں۔ تم میں سے کسی کے ساتھ محبّت کم یا زیادہ نہیں ہے۔

اب یہ شاہزادے اپنے نئے لباس طلب کرتے ہیں۔ اس کی تصویر دیکھئے:۔

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ خوش بیاں ارشاد اب یہ کیجئے اے فخرِ دو جہاں
کل عید ہے؟ جواب دیا فاطمہؑ نے ہاں یہ بولے پھر لباس۔ غلاموں کا ہے کہاں
سامان اب تلک نہیں عیش و سرور کے
کیا کل نہ عید ہوئیگی گھر میں حضور کے

یہ واضح رہے۔ کہ جناب فاطمہؑ کی والدہ ماجدہ (جناب امّ المومنین خدیجہؑ) کی دولت

(باتفاق مؤرخین) لاکھوں روپیہ کی تھی۔ جو اُن معظمہ کے بعد (بجز حصّہ شوہری کہ حق جناب رسول خداؐ کا تھا) جناب فاطمہ زہراؑ کے قبضہ میں آئی ہوگی۔ مگر اشاعت اسلام میں جناب فاطمہؑ نے حسب منشائے جناب رسالت مآب صلعم سب صرف فرمادی۔ بہت سے نئے مسلمان (اہل صُفّہ وغیرہ) ایسے تھے جن کے پاس نہ کھانے کو کھانا نہ اوڑھنے بچھانے پہننے کو کپڑہ تھا۔ اُن میں جو لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ وہ اکثر اسی مال سے خرچ ہوا۔ خود محمدؐ وآلِ محمدؑ اپنے واسطے نہ بچاتے تھے۔ سب محتاجوں کو دیدیتے تھے۔ اس سبب سے اکثر فقر وفاقہ میں مبتلا رہتے تھے۔ اسی سبب سے حضور صلعم فرماتے ہیں۔ الفقر فخری۔ یہ فقر وفاقہ میرا فخر ہے۔ میری عزت بڑھاتا ہے۔ پس جناب فاطمہؑ جن کے پاس اُس عید کو حسنؑ وحسینؑ کے واسطے نئے کپڑے نہیں ہیں۔ کس طرح اپنے پیاروں کو جواب دیتی ہیں۔ آخر ماں کا دل ہے۔ بچوں کی عُسرت کا کہاں تک اثر نہ ہوگا۔ رنج میں تسلّی دینے کی شان دیکھئے:۔

قربان جاؤں عید سے فاقہ کشوں کو کیا
عسرت پہ اپنی۔ روکے یہ معصومہؑ نے کہا

آلِ نبیؐ کی عید ہے خوشنودیٔ خدا
اہل دول کے واسطے ہے عید کا مزا

زہرا و چاند عید کا پیاروں کی دید ہے
جب تم گلے سے لپٹے یہ سمجھی کہ عید ہے

صرف یہ آخر الذکر بیپ متنبّی کے شعر کے جواب میں پیش کرنا منظور تھا۔ مگر سلسلہ کلام کے واسطے اُوپر کے بند اور واقعہ لکھنا پڑا۔ آگے چل کر جب نئی پوشاک جناب فاطمہؑ نے اپنے فرزندوں کو پہنائی ہے۔ اُس موقع پر (مرزا مرحوم) فرماتے ہیں ؎

اک عید صدقے دُوسری قربان ہوگئی
پوشاک سے شہزادوں کی یہ شان ہوگئی

اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ ایک عید عیدالفطر کہلاتی ہے۔ اور فطرہ ایک خاص قسم کا صدقہ ہے۔ پس عیدالفطر کو صدقہ کے لفظ سے مناسبت قدرتی ہے۔ اور

دُوسری عید (عیداضحےٰ) کا تو نام ہی عید قرباں ہے۔ کہ اُس روز جانور قربانی کیا جاتا ہے۔ رعایت لفظی ایسی چسپاں ہو۔ تو لطف صنعت ہے۔ اب اِس مصرع کی شان دیکھئے "کہ عید صدقے دُوسری قربان ہوگئی"۔

۱۹۔ علی ابن ابراہیم تنوخی کی مدح میں متنبّی کا شعر ہے۔

كَاَنَّ الْهَامَ فِى الْهَيْجَا عُيُونٌ — وَقَدْ طُبِعَتْ سُيُوفُكَ مِنْ رُقَادٍ

گویا دشمنوں کے سر رزم گاہ میں آنکھوں کی طرح ہیں۔ اُن میں تیری تلواریں نیند کی مانند داخل ہوتی ہیں۔ دُوسرے مقام پر متنبّی کہتا ہے۔

كَاَنَّ عَلَى الْجَمَاجِمِ مِنْهُ نَارًا — وَاَيْدِى الْقَوْمِ اَجْنِحَةُ الْفَرَاشِ

دشمنوں کے سروں پر اُس کی تلوار گویا آگ ہے۔ اور دشمنوں کے ہاتھ پر پروانہ کی طرح کٹ کٹ کر اُس پر گر رہے ہیں۔

مرزا مرحوم شمشیر حسینی کی مدح میں سیف زبانی فرماتے ہیں:۔ (۱)

چلّے کو دو کیا تو کماں سے لپٹ گئی — کیا جانے دل میں جا کے کماں سے لپٹ گئی

چسپید گی تیغ سے ۔ دل عذر کیا کرے
ناخن سے کوئی گوشت کو کیونکر جدا کرے

(۲) ایک پہلوان کی لڑائی میں جب امام حسینؑ نے ضرب لگائی کہتے ہیں۔

ماتھے پہ لگی تیغ جناب شہِ عادل — مضمون کی طرح خط جبیں میں ہوئی داخل

(۳) تیسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

جو تیغ کی آتش پہ گرا پھر وہ کماں تھا — گرنے میں تو اسپند تھا اُٹھنے میں دُھواں تھا

۲۰۔ محمد بن بشّار تمیمی کے رفیقوں کی مدح میں متنبّی کا شعر ہے۔

ثِقَالٌ اِذَا لَاقَوْا خِفَافٌ اِذَا دُعُوا — كَثِيرٌ اِذَا شَدُّوا قَلِيلٌ اِذَا عُدُّوا

جب وہ دشمنوں سے مقابلہ آرا ہوتے ہیں۔ تو ثقیل ہیں (کہ سخت حملہ کرتے ہیں) جب لڑائی

کے لئے بُلائے جاتے ہیں۔ تو تُنک ہیں۔ کہ فوراً آجاتے ہیں۔ جب وہ بشدّت دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں۔ تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔ اور گنتی کرو۔ تو تھوڑے سے ہیں +

مرزا مرحوم امام حسینؑ کے جان نثار شیر دل ہمراہیوں کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

ہمت میں ایک ۔ لاکھ جواں سے زیاد تھا کم اُن کے آگے لشکرِ ابن زیاد تھا

۲۱ متنبّی اپنے ممدوح کی آمد کی ہیبت و جلال کو یوں سراہتا ہے ؎

وَتُلْقِی وَمَا تَدْرِی الْبَنَانُ سِلَاحَهَا لِکَثْرَةِ اِیْمَاءٍ اِلَیْهِ اِذَا یَبْدُو

جب وہ برآمد ہوتا ہے ۔ تو لوگ اُس کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے (اُنگلیوں) ہاتھوں سے ہتیار گر پڑتے ہیں۔ اور محویت میں اُن کو خبر نہیں ہوتی +

۱۔ مرزا مرحوم شاہزادہ علی اکبر شبیہ پیغمبرؐ کی برآمدگی واہ میدان جنگ کے موقع پر کہتے ہیں ؎

نورِ نظرِ شاہ جو گھر سے نکل آیا حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

۲۔ جب جناب حرؔ دلاور میدان رزم میں جہاد کو آئے ہیں۔ اُس وقت کہتے ہیں۔ کہ لشکریان یزید کی یہ کیفیت ہوئی۔ ؎

میداں سے پاؤں اُٹھ گئے اور خود گر گئے مارا طمانچہ خوف نے مُنہ سب کے پھر گئے

۳۔ تیسرے موقع پر فوج مخالف کی گھبراہٹ یوں بیان کرتے ہیں ؎

گھبرا کے تا تأسف جو عدو کرتے تھے رن میں انگشت کی جا تیغ کو رکھتے تھے دہن میں

۲۲ متنبّی کافور والئے مصر کی مدح میں مضمون خیالی کا دریا بہاتا ہے ؎

کَیْفَ لَا یُتْرَکُ الطَّرِیْقُ لِسَیْلٍ ضَیِّقٍ عَنْ اَتِیِّهِ کُلُّ وَادٍ

اُس سیل کے واسطے کیونکر راہ نہ چھوڑی جائے۔ جس کی کثرت آمد آب سے ہر نالہ اور کھال تنگ ہو۔ کہ وہ سیل نالوں میں نہ سما سکے +

مرزا مرحوم اُس موقع پر کہ جب حضرت عباسؑ نے دشمنوں کو للکار کر گھوڑے کی باگ اُٹھائی ہے۔ اور حملہ کر کے دریا پر جانا چاہا ہے۔ کہتے ہیں (حضرت عباسؑ کی زبانی)

برآمدگی ممدوح و جلال

سیل حملہ

دریا کی طرح اپنی طبیعت نہیں رکتی جاری ہوئی جب حق کی مشیت نہیں رکتی

۴۲۔ سیف الدولہ کے مدحیہ قصیدہ سے میں متنبّی شاعرانہ خودستائی کرتا ہے ؎

وَلِی فِیکَ مَالَمْ یَقُلْ قَائِلٌ وَمَالَمْ یَسِرْ قَمَرٌ حَیْثُ سَارَا

جیسے قصیدے میں نے تیری مدح میں کہے۔ کسی نے نہیں کہے۔ اور خوبی میں جہاں وہ پہنچ گئے۔ وہاں چاند بھی نہیں پہنچا +

مرزا مرحوم تفاخر شاعرانہ فرماتے ہیں ؎

ہم فن مرے شاکی جو نہ ہوں روٹھے زمیں پر پہنچادوں سخن کو میں ابھی عرش بریں پر

۴۳۔ متنبّی سیف الدولہ کی مدح میں کہتا ہے ؎

اَلصَّوْمُ وَالْفِطْرُ وَالْاَعْیَادُ وَالْعُصُرُ مُنِیْرَۃٌ بِکَ حَتّٰی الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

روزہ۔ فطر۔ عیدین اور زمانے یہاں تک کہ چاند سورج بھی تجھ سے روشن ہیں +

مرزا مرحوم ہمشکل پیغمبرؐ شاہزادہ علی اکبرؑ کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

ایمن میں طور۔ طور میں یہ برق طور ہیں گردن میں سر ہیں، سر میں یہ عقل و شعور ہیں
سینے میں دل ہیں۔ دل میں نشاط و سرور ہیں چہرے میں آنکھ۔ آنکھ میں تل۔ تل میں نور ہیں
گلشن میں پھول۔ پھول میں بو۔ بو میں عطر ہیں
روزوں میں عید۔ عیدوں میں یہ عید فطر ہیں

اللہ اللہ کس قدر مضامین کی بہتات ہے۔ جدھر آتے ہیں۔ دریا بہا جاتے ہیں۔ کیا بحر دفاع طبیعت پائی ہے۔ ناظرین!! خیر ایک بند اور بھی سُن لیجئے۔ جس مرثیئے کے یہ بند ہیں۔ وہ نہ ابتک عام طور پر تقسیم ہوا ہے نہ چھپا ہے۔ جس کا مطلع مشہور یہ ہے
ع کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے ؎

سینہ کو دل۔ دلوں کو سرور ان کا چاہیئے ایمن کو طور۔ طور کو نور ان کا چاہیئے
جلوہ کلیم کو۔ سر طور ان کا چاہیئے سب کو خدا۔ خدا کو ظہور ان کا چاہیئے

شعر عربی
مدح و مدح

برحق نمونۂ جبروتِ خدا یہ ہیں
بندے ہیں۔ پر دلیلِ ثبوتِ خدا یہ ہیں

۲۵۔ متنبّی کا یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ چہرہ کی زردی اور اُس کے ساتھ اُس پر قطرہائے اشک کا تقاطر اور ان دونوں باتوں کی تشبیہ تامہ ملاحظہ ہو ؎

فَکَاَنَّھَا وَالدَّمْعُ یَقْطُرُ فَوْقَھَا ذَھَبٌ بِسِمْطَیْ لُؤْلُؤٍ قَدْ رُصِّعَا

اُس کے چہرۂ زرد (سنہری) پر جو متواتر آنسو ٹپکتے تھے وہ موتی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ موتیوں کی لڑی سونے میں جڑی ہوئی ہے۔

سبحان اللہ کس قدر دلچسپ و خوشنما تشبیہ ہے۔

مرزا مرحوم جناب عباسؑ کے اُس رُخِ انور کی مدح فرماتے ہیں۔ جس پر پسینہ (گرمی سے) آ رہا ہے۔ برابر پسینہ کے قطرے گر رہے ہیں۔ یہ مضمون تشبیہ بھی کس قدر بلیغ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

مُنہ غرقِ عرق دیکھ کے خورشید ہوا تر ابرو سے ٹپکتا ہے نرا تیغ کا جوہر
آنکھوں کا عرق روغنِ بادام سے بہتر عارض کا پسینہ ہے گلابِ گُلِ احمر
قطرے رُخِ گل رنگ پہ ڈھلتے ہوئے دیکھو
عطرِ گُلِ خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

اس بند میں فرماتے ہیں۔ کہ چہرہ ممدوح پر جو پسینہ آ رہا ہے۔ تو اُس سے خورشید تر یعنی شرمندہ و غرق عرق ہے۔ اور ابرو (جو ہمشکل شمشیر ہے) سے گویا تیغ کا جوہر ٹپک رہا ہے۔ آنکھوں سے جو پسینہ بہ کر آتا ہے۔ وہ روغن بادام سے بہتر ہے۔ شعرا آنکھ کو بادام سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ یہاں روغن بادام عرق چشم کو فرمایا۔ بات میں سے بات نکالی۔ پھر فرماتے ہیں۔ عارض کا پسینہ گویا گلاب ہے۔ اور گلاب گل سرخ کا کھنچا ہوا ہے۔ قطرے روئے گل رنگ (سرخ) پر ڈھل رہے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ

گل خورشید سے عطر نکل رہا ہے متنبّی کے یہاں زرد چہرے پر سفید آنسوؤں کے نقاط کا مذکور تھا۔ یہاں چہرۂ گل رنگ پر پسینہ کا بیان ہے +

۲۶۔ متنبّی عبرت عالم کے باب میں کہتا ہے۔ ؎

أَیْنَ الْأَکَاسِرَۃُ الْجَبَابِرَۃُ الْأُوْلیٰ　　کَنَزُوا الْکُنُوْزَ فَمَا بَقِیْنَ وَلَا بَقُوْا

کہاں ہیں وہ زبردست بادشاہ جنہوں نے خزانے گاڑے تھے۔ نہ وہ خزانے رہے نہ وہ خود رہے۔ ؎ وَتَوَلَّوْا بِغُصَّۃٍ مِنْہُ وَاِنْ سَرَّ بَعْضُہُمْ اَحْیَانًا۔ سب نے زمانے سے ناراضی کی حالت میں پشت پھیری۔ اگرچہ کبھی کبھی کسی کو زمانے نے خوش بھی کر دیا (مگر وہ خوشی ناقابلِ اعتبار ہے۔ زمانے کا مآل وانجام ملال ہے) +

عبرتِ عالم (حاشیہ)

مرزا مرحوم عبرت عالم میں فرماتے ہیں :-

غور کر (حاشیہ)

عبرت ہے روز و شب کی دو رنگی پہ کر نظر　　اس دوش پر جنازہ ہے اُس دوش پر علم
دُولھا جوان پسر کو بناتا ہے اک پدر　　مرتے پہ نوجواں کے کوئی پیٹتا ہے سر

دُنیا کی جو ہوس ہے وہ فانی ہے خاک ہے
عُقبےٰ کی فکر کر کہ وہ باقی ہے پاک ہے

جز حیف کیا جہان سے سلیمانؑ لیگئے　　یوسفؑ بھی زیر خاک سب ارمان لیگئے
شاہانِ دہر کون سا سامان لے گئے　　سب کچھ وہ لیگئے کہ جو ایمان لیگئے

کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا
کن یوسفوں کو غرق نہ اس چاہ نے کیا

بہادر کا رعب (حاشیہ)

۲۷۔ متنبّی کہتا ہے۔ ؎ بَعَثُوا الرُّعْبَ فِیْ قُلُوْبِ الْاَعَادِیْ۔ فَکَانَ الْقِتَالُ قَبْلَ التَّلَاقِیْ۔ اُن بہادروں نے لڑائی لڑنے سے پہلے ہی اپنا رعب دشمنوں کے دلوں میں ڈال دیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ مقابلہ ہوا نہیں۔ اور لڑائی ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ رعب و دہشت سے ایسے مبہوت ہو گئے کہ

اُڑا بھی نہ سکے ۔

مرزا مرحوم شجاع ازلی حسینؑ ابن علیؑ کی رعب و ہیبت کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے پہلوان امام دلیر و شجاع ازلی کو دیکھ کر اپنے مقام سے کچھ بڑھے تو۔ مگر رعب و ہیبت حضور کے سبب سے پاس آنے کا یارا نہ تھا ۔؎

رطب اللساں رجز میں ابھی تھے امامِ پاک | جو رستمانِ شام بڑھے ہو کے خشمناک
مشّاقِ کشتیوں میں ملے بازوؤں پہ خاک | مُردوں میں جنکی ساکھ دلیروں میں جنکی دھاک

پر قربِ ذوالجناح نہ جراٗت کا جوش تھا
پہلے سُموں سے اس نے جو روندا وہ ہوش تھا

الله الله کیا بات فرمائی۔ کہ گھوڑے نے سب سے پہلے دشمنوں کے ہوش کو روند ڈالا۔ اب کیا کسی کو جراٗت و ہمّت آگے بڑھنے کی ہو سکتی تھی!

۲۸ متنبّی نے گھوڑوں کی تعریف میں کہا ہے۔ ؎ خافیات الالوانِ قد نسج النقع علیھا براقعاً و جلالا۔ وہ گھوڑے دشمنوں کو ایسے حال میں آ کر مار لیتے ہیں۔ کہ کثرت غبار کے سبب سے اُن کے رنگ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ خبر نہیں پڑتی کہ نقرہ ہیں یا مشکی یا سبزہ وغیرہ وغیرہ ۔

متنبّی نے تو غبار کی وجہ سے گھوڑے کے رنگ نہ ظاہر ہونے کا خیال باندھا ہے۔ مگر اب مرزا مرحوم کی نازک خیالی (مضمون) کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ اسپ امام حسینؑ کی مدح میں فرماتے ہیں :۔

طے کرتا ہے اک دم میں یہ دُنیا کی حدیں سب | کیسی وہ حدیں آپ سے باہر ہے یہ مرکب
خالی ہے رکابوں کی طرح چلنے میں قالب | نقرہ ہے نہ سبزہ ہے نہ ابلق ہے نہ اشہب

نام اس کا تصوّر میں گذرتا نہیں کوئی
شوخی کے سبب رنگ ٹھہرتا نہیں کوئی

شوخی گھوڑے میں اس قدر ہے۔ کہ رنگ بھی نہیں ٹھیرتا۔ اللہ اللہ کیسی نازک خیالی ہے اور کس قدر مضمون عالی ہے۔ ذرا لفظ شوخی کو دیکھئے۔ رنگ کے لئے کس قدر مناسب ہے۔ اس رنگ میں ایک بند اور بھی لکھ دوں :-

جاں آنکھوں کے مردم نے بچھائے ہیں تہ خاک	پرواز میں شہباز تجلّی جو ہے بے باک
مہندی سے ابھی لال بھبوکا تھے سُم پاک	توسن ہے وہ چالاک کہ سکتے میں ہیں افلاک

جولاں جو ہوا ایک صبا رہ گیا پیچھے
بڑھتے ہی قدم رنگ حنا رہ گیا پیچھے

گھوڑے کے سموں میں مہندی لگانے کا ایشیائی ملکوں میں دستور ہے۔ مصنف فرماتے ہیں۔ کہ ابھی تو سم لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ ابھی رنگ ندارد ہو گیا۔ وجہ اس کی سرعت اسپ ہے۔ کہ اس تیزی سے جاتا ہے۔ کہ رنگ حنا بھی نظر نہیں آتا۔ وہ بھی سرعت فرس کے سبب سے پیچھے رہ گیا۔ واقعی جب بہت تیز گھوڑا دوڑیگا۔ تو رنگ کب نظر آئیگا معمولی بات ہے۔ مگر ہر ایک شاعر کو نہیں سوجھتی۔ اگر اردو شعرا کے الفاظ مستعملہ جدیدہ کی فرہنگ (مغربی ملکوں کی طرح) طیار کی جائے۔ تو غالباً الفاظ "لال بھبوکا" بھی مرثیوں میں پہلے پہل مرزا مرحوم کا نظم کرنا ثابت ہوگا +

نیزہ بازی

۲۹۔ متنبی نیزہ کی صفائی اور تیز دستی ممدوح کو سراہتا ہے۔ ؎

وَکَمْ عَیْنِ قِرْنٍ حَدَّقَتْ لِنِزَالِهٖ فَلَمْ تُغْضِ اِلَّا السِّنَانُ لَهَا کُحْلُ

اُس کے ہمسروں کی آنکھوں نے لڑائی میں اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ مگر پلک جھپکنے سے پہلے ہی نیزۂ ممدوح کی آنی سرمہ کی سلائی بن کر اُن کی آنکھوں میں در آئی +

مرزا مرحوم شاہزادہ علی اکبرؑ کے نیزے کی صفائی و تیز دستی بیان کرتے ہیں :-

پہنچا وہیں نیزہ تھے ابن شہ عالی	گر برچھیوں والوں نے ذرا آنکھ نکالی
پتلی صفت نقطۂ شک صاف اُٹھالی	بالکل ورق چشم عدو کر دیا خالی

چمک

اللہ رے صفا آنکھ سے دیکھی نہ جھلک بھی
پُتلی تو سناں لے گئی جھپکی نہ پلک بھی

سبحان اللہ۔ بندش کی صفائی گویا زبان حال سے گواہی دے رہی ہے۔ کہ اسی عجلت و صفائی سے شاہزادہ ممدوح نے نیزہ بازی فرمائی ہوگی۔ دبیر کے الفاظ خود مضمون کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ جو اِن کے کلام میں بتانے کی احتیاج کم پڑتی ہے +

اہل عرفان کی شان

۱۱۰۔ متنبّی بعض اہل عرفان کی شان میں رطب اللّسان ہے۔ ؎

هَانَ عَلٰی قَلْبِهِ الزَّمَانُ فَمَا یَبِیْنُ فِیْهِ غَمٌّ وَّلَا جَذَلٌ

زمانہ اُس کے دل کے سامنے خوار ہے۔ شادی اور غم اُس کی نظر میں بے اعتبار و ناپائدار ہیں۔ وہ نہ غم سے غمگین ہوتا ہے۔ نہ شادی و خوشی سے مسرور +

مرزا مرحوم اہل عرفان کے سرتاج یعنی اصحاب باوفاے امام حسینؑ کی مدح میں عذب البیان ہیں۔ ؎

سمجھے ہیں نامرادیٔ دُنیا کو یہ مُراد غم ان کے دل میں شاد ہے۔ دل ان کا غم میں شاد

ناظرین!! ذرا غور سے اس مضمون کی پاکیزگی پر خیال فرمائیے۔ عجب بات کہ گئے ہیں۔ کہ دُنیا کی نامرادی ہی کو انھوں نے مُراد سمجھ لیا ہے۔ ان کا دل تو غم میں شاد رہتا ہے۔ اور غم ان کے دل میں آکر شاد ہوتا ہے متنبّی کے مضمون سے یہ مضمون اُسی قدر اعلےٰ ہے۔ جس قدر مرزا مرحوم کے ممدوح متنبّی کے ممدوح سے بہتر ہیں +

فصل ۸ مقابلۂ شرک و توحید و ایمان و کفر

۱۱۱۔ متنبّی سیف الدّولہ کی مدح میں کہتا ہے۔ ؎

وَلَسْتَ مَلِیْکًا هَازِمًا لِنَظِیْرِهٖ وَلٰکِنَّکَ التَّوْحِیْدُ لِلشِّرْکِ هَازِمٌ

تو نے جو دمستق عیسائی بادشاہ روم کو شکست دی۔ یہ ایک بادشاہ کا دُوسرے ہمسر بادشاہ کو شکست دینا نہیں ہے۔ بلکہ تو بمنزلہ توحید ہے۔ جس سے خود بخود شرک بھاگ جاتا ہے + انصاف یہ ہے۔ کہ یہ مضمون متنبّی نے اعلےٰ درجہ کا

کہا ہے ۔ مرزا مرحوم نے سیف خدا جناب عباسؑ کی طولانی لڑائی اور بدمقابل پہلوان کی مقابلہ آرائی نظم فرما کر جب اُس کو جناب ممدوح نے فی النار کیا ہے۔ اُس موقع پر نظم فرمایا ہے :-

ایماں نے اُچھل کر کہا وہ کفر کو مارا ۔۔۔ قدرت نے پکارا کہ یہ ہے زور ہمارا
حیدرؑ سے نبیؐ بولے یہ ہے فخر تمہارا ۔۔۔ حیدرؑ نے کہا یہ مری آنکھوں کا ہے تارا
پروانۂ شمع رُخ تاباں ہوئیں زہراؑ
محسنؑ کو لئے گود میں قرباں ہوئیں زہراؑ

نکات بلاغت

ناظرین !! ذرا اس بند کی بلاغت کے نکتوں پر غور فرمائیے ۔ (۱) خود ایمان کا یہ کہنا کہ کفر کو مارا ۔ (۲) اُچھل کر کہنا ۔ کہ خوشی میں قدرتاً آدمی اُچھل پڑتا ہے ۔ (۳) "وہ کفر کو مارا" ایسی خوشی کے موقع پر "وہ" بھی ضرور کہتے ہیں ۔ یعنی عموماً "وہ مارا" کہتے ہیں۔ (۴) قدرت (نیچر) کا یہ ارشاد کہ یہ سب ہمارا زور ہے ۔ حقیقت میں جو کچھ دُنیا میں ہو رہا ہے ۔ خدا کی قدرت سے ہو رہا ہے ۔ (۵) اب زبان قدرت کے بعد زبان جناب رسالتؐ سے مدح کی ۔ کہ اُن جناب نے جناب امیرؑ سے مدح وثنا ان الفاظ میں فرمائی۔ کہ یہ فرزند تمہارا فخر ہے ۔ جیسے تم شجاع تھے ویسا ہی یہ ہے ۔ لڑائی میں تم میری مدد کرتے تھے ۔ اس نے میرے فرزند حسینؑ کی مدد کی ۔ (۶) رسالتؐ کے بعد امامت کی باری آئی ۔ جناب امیرؑ نے تعریف کی ۔ کہ میری آنکھوں کا تارا ہے ۔ (۷) پھر صدیقہ کبریٰ جناب فاطمہؑ نے اُس محبت کا برتاؤ کیا ۔ جو مائیں اپنے بچوں سے کرتی ہیں ۔ جناب عباسؑ ہرچند اُن کے حقیقی فرزند نہیں ہیں ۔ مگر اُن کے فرزند حسینؑ مظلوم پر جان نثار کر رہے ہیں ۔ اس لئے جناب فاطمہؑ قربان ہوئیں ۔ جس طرح عورتیں اپنے بچوں پر قربان ہوتی ہیں ۔ (۸) پھر محسنؑ (فرزند حقیقی جناب فاطمہؑ) کو گود میں لئے ہوئے قربان ہوئیں گویا جناب عباسؑ کو اس جاں نثاری و کارگذاری کے سبب سے اپنے فرزند (محسن) سے

سبھی کچھ بڑھ کر سمجھ رہے ہیں۔ دیکھئے کیا کیا پہلو بلاغت کے نکالے ہیں ٭

۳۲ متنبّی محبّت محبوب کی مدح میں گہر افشاں ہے۔ ؎

إِذَا أَقْدَمْتُ عَلَى الْأَهْوَالِ شَيَّعَنِي قَلْبٌ إِذَا شِئْتُ أَنْ يَسْلَاكُمْ خَانَا

جب میں خوف (جنگ وغیرہ) کے مقامات کی طرف بڑھتا ہوں۔ اُس وقت تو میرا دل میرے ساتھ رہتا ہے (ٹھکانے رہتا ہے۔ کچھ ہراس نہیں ہوتا)۔ مگر جب میں اُس سے یہ چاہوں۔ کہ وہ تم سے جدا ہو جائے۔ تو (خیانت کرتا ہے) میرا کہنا نہیں مانتا ٭

مرزا مرحوم امام حسینؑ کے سچّے عاشق جان نثار جناب حبیبؓ ابن مظاہر اسدی (صحابی رسول خدا صلعم) کی زبانی سچّی مدح کی یوں تصویر کھینچتے ہیں (حبیبؓ بڑھاپے میں کوفہ سے بمشکل نکل کر اپنے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے آقا کی خدمت میں لڑنے اور مرنے کو آئے ہیں۔ امام مظلومؑ اُن کی ضعیفی پر خیال فرما کر فرماتے ہیں۔ کہ تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ حبیبؓ اصرار کر رہے ہیں۔ کہ کبھی نہ جاؤنگا۔ اگر جاؤنگا۔ تو پھر رسولؐ خدا کو قیامت میں کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ اُس موقع پر حبیبؓ اپنی محبّت اور جوشِ عقیدت کو گویا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں) :۔

گر اہلِ جفا قطع کریں ہات ہمارے پروانہ صفت لاش پھرے گرد تمھارے
سر کٹ کے نہ ہو پائے مبارک سے کنارے دل شوق ہو تو شبّیرؑ ہی شبّیرؑ پکارے
گر ہات جدا۔ بندے کے ہوں کٹنے پہ سر کے
دامن سے خداوند کے۔ پیوند ہوں مر کے

ناظرین! اگرچہ متنبّی کے مصرع اوّل کا ہم مضمون کوئی مصرع بند مرزا مرحوم میں نہیں ہے۔ مگر یہ دیکھئے۔ کہ متنبّی کے دُوسرے مصرع کا ہم خیال جو مضمون مرزا صاحب نے باندھا ہے۔ اُس میں کس قدر لطافت و بلاغت ہے۔ اور کیسی وسعت دی ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ مرزا مرحوم نے بالارادہ متنبّی کا جواب نہیں لکھا۔ جو سب مضمون ملتا جُلتا قدر

محبّت

مضمون قریب قریب ہے۔ اُسی پر غور فرمائیے۔ اور لطف اُٹھائیے۔ یہ پھول سخت محنت سے ایک گلدستہ میں بندھے ہیں +

ثبوت ثابت قدمی میدان جنگ

۳۳۔ متنبی نے اپنے ممدوح کی ثابت قدمی کی مدح میں کہا ہے۔

وَاَنْتَ الْفَارِسُ الْقَوَّالُ صَبْرًا   وَقَدْ فَنِیَ التَّکَلُّمُ وَالصَّهِیْلُ

جب کہ شدت جنگ کے سبب سے لوگوں کا بولنا اور گھوڑوں کا ہنہنانا بند ہو جائے۔ اور میدان میں بالکل سناٹا چھا جائے۔ اُس وقت سخت میں بھی تو ایک ثابت قدم شہسوار ہے اور دُوسروں کو بھی صبر (ثبات قدم) سکھانیوالا +

مرزا مرحوم جناب حبیبؓ ابن مظاہر صحابی رسول اللہ صلعم کی ضعیفی اور ثابت قدمی یوں (میدان جنگ میں) بیان کرتے ہیں:۔

ثابت قدم ایسا کوئی پیروں میں کہاں ہے   ثابت قدمی پاؤں سے رعشے میں عیاں ہے

سر ہلتا ہے پر ہر کف یار ن میں جمی ہے
جنبش میں ہے لَو۔ شمع کو ثابت قدمی ہے

میدان جنگ میں عظمت ممدوح

۳۴۔ متنبی میدان جنگ میں اپنے ممدوح کی عظمت بیان کرتا ہے۔

یَحِیْدُ الرُّمْحُ عَنْكَ وَفِیْهِ قَصْدٌ   وَیَقْصُرُ اَنْ یَّنَالَ وَفِیْهِ طُوْلُ

نیزہ باوصفیکہ مستقیم ہے۔ مگر تیری عظمت وہیبت وشرف کی وجہ سے تیری طرف لوٹ پڑتا ہے۔ اور اتنا طویل ہونے پر بھی تجھ تک پہنچنے میں کوتاہی کرتا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ بہادر تو بہادر۔ اُن کے ہتیار بھی تیرا ادب کرتے ہیں یا ڈرتے ہیں +

مرزا مرحوم شمشیر حسینیؑ کی تعریف میں فرماتے ہیں۔ (اُوپر بیان کر چکے ہیں۔ کہ امامؑ کو خدا کی طرف سے الہام ہوا۔ کہ جہاد کرد)۔

واں تو یہ وحی جنگ بڑھی آسماں سے   یاں تیغ پیشوائی کو نکلی میاں سے
نعمت پہ جیسے شکر الٰہی زباں سے   حضرت کے دست بوس ہوئی لاکھ شاں سے

سایہ بڑھا ہُوا۔ یہ ادب سے رُکی ہوئی
سب سے کھچی ہُوئی۔ سُوئے مولا جُھکی ہُوئی

ناظرین باتمکین!! ذرا اس بند (مذکورہ) پر خیال فرمائیے۔ اُدھر دل میں جہاد کا الہام ہُوا۔ اِدھر اُس کی پیشوائی کو تلوار میان سے نکلی۔ اس کی بالکل نئی تشبیہ دیکھئے۔ یہ تلوار کوئی معمولی آدمی کی تلوار نہیں ہے۔ امام عصرؑ (نائب رسولؐ) کی تلوار ہے۔ اُس کے لئے معمولی تشبیہ بھی خلاف شان ہوگی۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ یُوں بے ساختہ فوراً نکلی۔ جیسے خاصان خدا کی زبان سے نعمت ملنے پر شکر کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ (۲) تلوار کے ہاتھ میں آنے کو دست بوس امام ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ کہ مذہبی پیشوا (امام عصرؑ) کے ہاتھ چُومنے کا دستور ہے۔ (۳) پھر فرماتے ہیں۔ سایہ بڑھا ہوُا۔ (ظاہر ہے۔ کہ قریب عصر امام حسینؑ کے جہاد کی نوبت پہنچی تھی۔ تیسرے پہر کو سایہ آپ سے آپ بڑھ جاتا ہے) اور خود تلوار ادب سے رُکی ہوئی تھی۔ (۴) سب سے کھچی ہُوئی۔ اس میں خوبیٔ زبان ہے۔ تلوار جب میان سے کھچی تو کھچی ہُوئی تو اُس کو کہینگے۔ مگر یہاں کھچی ہُوئی کے دُوسرے معنی ہیں کشیدہ کے جس طرح فارسی میں دو معنی ہیں۔ اسی طرح کھچی ہُوئی بھی (اردو میں) ذومعنین ہے۔ ایک تو وہی جو مَیں اُوپر بیان کرچکا (میان سے کھچی ہُوئی یا سرمیداں کھچی ہُوئی)۔ دُوسرے سب سے آزردہ اور خفا۔ کیونکہ اُمتی اپنے نبیؐ کے نواسے کو قتل کررہے ہیں۔ اس لئے سبھوں سے یہ تلوار ناراض ہے۔ (۵) (پھر کہتے ہیں) مگر حضرت امام حسینؑ کی طرف خرط ادب سے جُھکی ہُوئی تھی۔ تلوار جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اُس کی طرف جُھکی ہُوئی ہوتی ہے۔ سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے +

۳۵ متنبی اپنے ممدوح کی ہیبت و رعب کی مدح و ثنا کرتا ہے۔ ؎

ہیبت و دبدبہ

اتاك يكاد الرأس يجحد عنقهٗ ۔۔۔ وتنقدّ تحت الذعر منه المفاصل

تیرے پاس (دُوسرے بادشاہ کا) ایلچی ایسے حال میں آیا۔ کہ قریب تھا کہ اُس کا سر اُس کی

گردن سے انکار کرے۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ تیری ہیبت اور رعب سے سفیر ایسا سہما جاتا تھا۔ کہ گویا وہ دل میں سمجھتا تھا۔ کہ اب سر گردن سے جدا ہوتا ہے) ۔ اور ڈر کے مارے تمام جوڑ بند اُس کے چکنا چور ہوئے جاتے تھے ۔

مرزا مرحوم ایک پہلوان کی لڑائی میں جو اشجع عالم امام حسینؑ سے لڑنے کو میدان جنگ میں آیا ہے ۔ یوں بیان فرماتے ہیں ۔ (اُس پر جو ہیبت امام حسینؑ نے لڑائی میں اثر کیا ہے ۔ اُس اضطراب کی مختصر تصویر ہے) :-

سہما یہ ترکش اُس کا کہ سب تیر گر پڑے کانپا یہ پھل کہ جوہر شمشیر گر پڑے

حقیقت میں جب مدمقابل کی ہیبت دل پر چھا گئی ۔ تو اُدھر ترکش سے تیر گر پڑے اِدھر تلوار بیکار ہو گئی ۔ گویا تلوار کے جوہر گر پڑے ۔ اب وہ کیا حملہ کر سکے ۔

۳۶ ۔ متنبیؔ کا شعر ہے ۔ ع مَا لِمَنْ يَنْصِبُ الْحَبَائِلَ فِي الْأَرْضِ وَمَرْجَاهُ أَنْ يَصِيدَ الْهِلَالَا ۔ اُس شخص کو کیا فائدہ ہو گا ۔ جو زمین پر اس امید سے جال بچھائے ۔ کہ چاند کو پھانس لے ۔ بھلا چاند جال میں کب پھنس سکتا ہے ۔ یہ شعر سیف الدولہ کی شان میں (متنبیؔ نے) اُس زمانے میں کہا تھا ۔ کہ جب سیف الدولہ اور رُوم کے عیسائی بادشاہ میں لڑائی ہو رہی تھی ممکن ہے ۔ کہ اُس بادشاہ نے سیف الدولہ کی گرفتاری کی تدبیر کی ہو ۔ اور ناکام رہا ہو ۔ اُسی کی طرف متنبیؔ اشارہ کرتا ہے ۔ کہ تو بمنزلہ ہلال کے ہے ۔ تجھے دشمن کب اسیر کر سکتا ہے ۔ دبیرؔ اُس موقع پر کہ "جب آمد امام حسینؑ سے فوج مخالف میں ہل چل پڑی ہوئی ہے" کہتے ہیں :-

ناگاہ یہ بولا پسر سعد کہ یارو جاں باز ہو تو بازی ہمت کو نہ ہارو
ہاں شمر کو آواز دو ۔ خولی کو پکارو سب مل کے کسی حیلے کا اب جال سنوارو

وہ بولے کہ خود پھندے میں پڑ جائیگا ظالم
یہ نورِ خدا ۔ جال میں کب آئے گا ظالم

فصل ۵ ۔ ممدوح کی شان کو دشمن کی اسیری سے بالا تر دکھانا

کب جال میں ٹھہریگا یہ دریائے سخا ہے   یہ طائرِ رنگِ چمنِ آلِ عبا[2] ہے
یہ نکہتِ عطرِ گلِ تسلیم و رضا ہے   یہ ظلِّ خدا۔ ظلِّ خدا ظلِّ خدا ہے

کیونکر یہ فریبِ سپہِ شام میں آئے
اندام نہیں سائے کے جو دام میں آئے

دنیا و دین

۳۷ متنبی اپنے ممدوح کی شان میں کہتا ہے۔ ~ قَابِضًا کَفُّهُ الْیَمِیْنَ وَلَوْشَاءَ حَازَهَا بِالشِّمَالِ ۔ وہ دُنیا کو اپنی دہنی مٹھی میں لئے ہوئے ہے۔ اور اگر چاہے۔ تو بائیں میں لے لے۔ (دُنیا بالکل اُس کے قبضہ میں ہے)۔ دُوسرے مقام پر کہتا ہے ~ یَا رَاحِلاً کُلُّ مَنْ یُّوَدِّعُہٗ ۔ مُوَدِّعٌ دِیْنَہٗ وَدُنْیَاہُ ۔ اے سفر کرنے والے جو کوئی تجھ کو رخصت کرتا ہے۔ وہ گویا اپنی تمام دین و دُنیا کو رخصت کرتا ہے۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ تو گویا تمام دین و دُنیا ہے) متنبی کا ممدوح ایک معمولی دُنیا دار دولت مند ہے۔ اس لئے یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ جو ممدوح کی دولت و عظمت کے مٹنے کے ساتھ گویا مٹ گیا۔ اب ایسا بدنما (بعض طبیعتوں کو) معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے تانبے کے برتن پر سے خوش نما قلعی اُڑ جانے کے بعد وہ برتن رہ جاتا ہے۔ دبیر کے ممدوح ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بزرگانِ دین میں سے ایک معزز امام زادے بھی ہیں اور شہید راہ خدا بھی ہیں۔ اس لئے وہ بھی زندہ ہیں۔ اُن کا ذکر مدح و ثنا بھی زندہ ہے۔ چنانچہ مرزا مرحوم جناب ابوالفضل افضل الشہداء

[2] ناظرین!! دیکھئے۔ کن کن چیزوں سے استعارہ فرمایا ہے۔ دیا۔ طائر رنگ نکہت عطر رضا ظل خدا۔ ان میں سے کوئی چیز جال میں نہیں پھنس سکتی ظل اللہ اگرچہ دنیا کے بادشاہوں کو بھی دنیا دار کہتے ہیں۔ مگر حقیقی ظل اللہ چہاردہ معصومین ہیں پس امام حسینؑ کو ظل اللہ کہنا ایک پاکیزہ اور سچا مضمون ہے مضمون کے ساتھ لفظوں کی لطافت و فصاحت کو دیکھئے۔ کہ اندام اور دام میں جو مناسبت ہے لفظ آخر الذکر اول الذکر کا ایک جز معلوم ہوتا ہے۔ بصنعت شبہ اشتقاق ہے۔ جو دل کو پیاری معلوم ہوتی ہے۔ جو بزرگوار ایک سرے سے تمام صنعتوں کو تکلف یا تکلیف سمجھتے ہیں ان سے پوچھئے کہ اندام و دام کی جگہ کوئی دُوسرا لفظ لانے سے کیا یہ لطف زبان حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہرگز نہیں ہو سکتا ۱۲ مولف بے بضاعت ثابت۔

عباسؑ علمدار کی شان میں کہتے ہیں۔ (یہ ملحوظ خاطر رہے۔ کہ جناب عباسؑ کے دونوں شانے جہاد میں جدا ہوئے ہیں ٭۔ اُس کے بعد بھی وہ جناب برابر جہاد فرمایا کئے۔ اور دونوں رکابوں سے برابر دشمنوں کو ٹھکراتے رہے۔ اور مشک پانی کی بھری ہوئی گود میں تھی۔ یعنی تسمہ مشک کو دانتوں سے مضبوط تھام رکھا تھا۔ ایسے شجاع خدا کی خدائی میں بہت کم گذرے ہیں)۔

گردوں ہے بلا گرد و قدم بوس زمیں ہے
اک ہات میں دُنیا ہے اور اک ہات میں دیں ہے

دُوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

دُنیائے دنی ان کا نشاں کفِ پا ہے
لیکن وہ نشاں ہے جو کفِ پا سے جُدا ہے

عقبےٰ کی جو تعریف سُنا کرتے ہو کیا ہے
وہ اک رہِ باریک ہے یہ راہ نُما ہے

لو سُن لو۔ خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے
بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

۳۳۸ متنبّی اپنے ایک شعر میں لباس و حسن کی یوں مدح کرتا ہے۔

لَبِسْنَ الْوَشْیَ لَا مُتَجَمِّلَاتٍ
وَلٰکِنْ کَیْ یَصُنَّ بِہِ الْجَمَالَا

اُن حسین عورتوں نے ابریشمی منقش جامے زینت کے واسطے نہیں پہنے۔ بلکہ حسن و جمال چھپانے کو پہنے ہیں۔ دُوسرے موقع پر کہا ہے۔

اَمَّا الثِّیَابُ فَتَعْرٰی مِنْ مَحَاسِنِہٖ
اِذَا نَضَاھَا وَیُکْسٰی الْحُسْنَ عُرْیَانَا

جب وہ اپنے جسم سے لباس اُتار دیتا ہے۔ تو لباس کی خوبیاں جاتی رہتی ہیں۔ کیونکہ اُس کے بدن سے لباس کو شرف و حسن تھا۔ اور جب وہ برہنہ ہوتا ہے۔ تو (قدرتی) حسن کے لباس میں ہوتا ہے۔

مرزا مرحوم اُس موقع پر کہتے ہیں۔ جب جناب زینبؑ خاتون نے اپنے بیٹوں کو لباس

بلکہ

٭ ان ہاتھوں کا کیا کہنا جو راہ خدا میں شہید ہوئے ہیں۔ جو کچھ ان کی مدح میں مبالغہ کیا جائے۔ کم ہے ۔ ۱۲۔ بے بضاعت ثابت۔

آخری پہنایا ہے۔ کہ اب وہ لڑنے اور مرنے کو جاتے ہیں۔ ؎

پہنایا جامہ زیبوں کو اپنے لباس جنگ پوشاک یوں بدن پہ کھلے جیسے گل پہ رنگ

۳۹- متنبی کا شعر ہے ؎ وَلَمَّا اِلْتَقَیْنَا وَالنَّوٰی وَرَقِیْبُنَا۔ غَفُوْلَانِ عَنَّا ظَلْتُ اَبْکِیْ وَتَبْسِمُ۔ فَلَمْ اَرَ بَدْرًا ضَاحِکًا قَبْلَ وَجْھِھَا وَلَمْ تَرَ قَبْلِیْ مَیِّتًا یَتَکَلَّمُ۔ جب میں اور میری معشوقہ ملی۔ تو فراق و رقیب دونوں بے خبر ہو رہے تھے۔ میں تو رو رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ میں نے تو ماہ تمام کو چہرہ معشوقہ سے پہلے ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا اور اُس نے مجھ سے پہلے کسی مُردے کو باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا +

دبیر مرحوم اُس موقع پر کہتے ہیں۔ جب مادر علی اکبرؑ لاشہ علی اکبرؑ کو دیکھ کر بین کر رہی ہیں :-

یوں مُردے کے ماتھے کو چمکتے نہیں دیکھا پھولوں کو خزاں ہو کے مہکتے نہیں دیکھا

باقی مصرع حسب ذیل ہیں

اس حُسن کے منکے کو ڈھلکتے نہیں دیکھا یوں زلفوں کو بل کھا کے لٹکتے نہیں دیکھا

تھا زیست میں کیا حُسن جو اس آن نہیں ہے

رو کر کہا زینبؑ نے فقط جان نہیں ہے

۴۰- متنبی کا شعر ہے ؎ هَوِّنْ عَلٰی بَصَرٍ مَاشَقَّ مَنْظَرُهٗ۔ فَاِنَّمَا یَقْظَاتُ الْعَیْنِ کَالْحُلُمِ۔ تو اپنی بصارت پر آسان کر لے جو دیکھنا اُس کو ناگوار ہو۔ کیونکہ آنکھ کی بیداریاں خواب کی طرح ہیں +

مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ (رباعی) :-

آج آئے ہیں۔ کل کوچ کی طیاری ہے غفلت میں کٹی عُمر یہ ہشیاری ہے

دُنیا ہے عجب مقام حیرت۔ نہ کھلا یہ عالم خواب ہے۔ کہ بیداری ہے

حُسن

بنظر عام
بنظر اختصار

اسم متنبّی کا شعر ہے۔ ؎ مَازِلتَ تضرِبُهُم دِرَاکًا فِی الذُّریٰ۔ ضَرباً کَاَنَّ السَّیفَ فِیهِ اثنَانَ۔ تو اُن کے اُوپر کے حصۂ جسم میں پے در پے تلواریں مارتا رہا۔ گویا ہر بار اُن پر دو تلواریں پڑتی تھیں۔ سیف الدّولہ کی مدح میں یہ قصیدہ ہے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک تو تیری تلوار سیف تھی۔ دُوسرے تو خود (اسم با مسمّٰی) سیف تھا پس ہر ضرب پر گویا دوسری تلوار پڑتی تھی۔

مرزا مرحوم ضعیف العمر بہادر صحابی حبیبؓ ابن مظاہر اسدی کی جنگ میں کہتے ہیں۔ ؎

تھا ضرب کے عالم میں عجب حسن کا عالم　　اک سمت خم تیغ کا وہ بل وہ خم و چم
اور ایک طرف آپ کا وہ پیکر پر خم　　ہر مُوئے بدن جوہر شمشیر کا ہمدم
جس صف پہ جُھکے ساتھ چلی تیغ ولی کی
غُل تھا کہ یہ شمشیر دو پیکر ہے علیؑ کی

ناظرین!! اس موقع کا ایک بند اور بھی سُن لیجے:۔

طیّار کس آہن سے یہ شمشیر ہوئی تھی　　اعجاز نُما۔ اُلفت شبیرؑ ہوئی تھی
کیا جنگ میں سیدھی کمر پیر ہوئی تھی　　اللہ کی قدرت سے کماں تیر ہوئی تھی
اس طنطنے سے پیروں کو تنتے نہیں دیکھا
نیزہ کسی تلوار کو بنتے نہیں دیکھا

باب سیزدہم کلام بعض شعرائے ایران و کلام مرزا دبیر مرحوم

فردوسی طوسی رح کے بعض مقامات سے بعض مقامات مرزا مرحوم کا مقابلہ کر کے میں دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ اُردُو کا فردوسی کس پایہ کا شاعر ہے۔

(۱) فردوسی کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ واقعہ کو اس طرز سے بیان کرتے ہیں۔ کہ اکثر آنکھوں کے سامنے نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ اور جزئیات کو خوب ادا فرماتے ہیں۔

فصل ۱ فردوسی

مثلاً جب سہراب نے کیکاؤس کے خیمے کی میخیں اپنے نیزے سے اکھاڑ کر پھینکی ہیں۔ فردوسی نے اُس کی تصویر (شاہنامہ میں) یوں کھینچی ہے۔

ازاں پس بجنبید از جائے خویش | بہ نزدیک پردہ سرا رفت پیش
خم آورد پشت و سنان (طویل) ستیخ | بزد و تُند و برکند ہفتاد میخ
سراپردہ یک بہرہ آمد ز پائے | زہر سو برآمد دم کرہ نائے

اس واقعہ میں حسب ذیل جزئیات بیان کئے ہیں۔ (۱) سہراب (جوش میں) اپنی بگ سے کُود کر پردہ سرائے کے پاس آیا۔ (۲) اپنی پیٹھ جھکائی۔ اور پیٹھ کے ساتھ ہی لانبا برچھا خم کیا۔ (۳) اور زور سے مارا۔ (۴) ستّر میخیں اُکھاڑ لیں۔ (۵) وہ خیمہ یکایک ایک طرف سے گرا۔ (۶) بلاجے بجنے لگے۔ فردوسی نے کمال یہ کیا ہے۔ کہ ایسے مختصر لفظوں میں (نظم میں) تصویر کھینچدی۔ جو دُوسرا شخص شاید نثر میں بھی اس خوبی و اختصار سے نہ بیان کر سکے۔ اب مرزا مرحوم کو دیکھئے۔ وہ کس قدر مختصر لفظوں میں جزئیات واقعہ بیان کر کے تصویر کھینچتے ہیں:۔

(الف) دو پہلوان شاہزادہ علی اکبرؑ کے مقابلہ کو میدان جنگ میں آئے ہیں۔ اور جب وہ اپنے وار کر چکے۔ تو اب جناب علی اکبرؑ کی باری آئی۔

گھوڑے کی عناں باندھ لی اکبرؑ نے کمر سے | زانو کے تلے تیغ و سپر رکھ لی ہنر سے
اور دونوں کی گردن لی اِدھر اور اُدھر سے | سر ایک کا ٹکرانے لگے ایک کے سر سے

اکبرؑ کے تصرف میں خدائی نظر آئی
جنگل میں پہاڑوں کی لڑائی نظر آئی

اس میں (۱) یہ بیان کیا۔ کہ گھوڑے کی لگام کمر سے باندھ لی۔ کہ لڑائی میں نہ اُلجھ جائے (۲) پھر تلوار اور ڈھال زانو کے نیچے ہنر سے رکھ لی۔ (۳) پھر دونوں کی گردنیں اِدھر اُدھر سے ایکر (۴) ٹکرایا۔ اُن کے تن و توش کو۔ اس تشبیہ میں بیان فرمایا۔ کہ (۵) گویا

جنگل میں پہاڑ لڑ رہے تھے ٭

(ب) مرزا مرحوم نے ایک مرثیہ میں شاہزادہ علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی پیدائش کا حال لکھ کر لکھا ہے۔ کہ اُس زمانے کے اکثر مسلمان اشتیاق میں تھے۔ کہ امام حسینؑ انکو باہر لائیں۔ تاکہ ہم محبوب خدا صلعم کی زیارت سے سرفراز ہوں۔ اور اکثر جناب فضہ سے آ آکر پوچھ جاتے تھے۔ کہ کس روز گھر سے وہ شاہزادے باہر برآمد ہونگے۔ ایک روز اہلبیتؑ کی طرف سے مشتاقوں کو اعلان دیا گیا۔ ؎

کل رب غدا کے گھر سے مراد اپنی پائینگے
مسجد میں شاہِ دین علی اکبرؑ کو لائینگے

جو شخص مشتاق ہو۔ زیارت کرے۔ نماز صبح کے وقت حاضر ہو۔ اس واقعہ کو آئندہ مرزا صاحب یوں خلعت نظم پہناتے ہیں:۔

ناگاہ خواب شب سے کھلی چشم آفتاب
مسجد میں پہلے صبح سے۔ در آئے شیخ و شاب
مجمع تھا آستانِ حرم پر بھی بے حساب
محراب در سے نکلے امامِ فلک جناب
آقا کے بر میں اکبرؑ یوسف جمال تھا
آغوشِ آفتاب میں روشن ہلال تھا

پہلوئے راست کو حسنؑ مجتبےٰ رواں
پہلوئے چپ میں ماہ بنی ہاشمی عیاں
آگے دعائیں پڑھتے مدینے کے نوجواں
بندے نگاہبان اور اللہ مہرباں
شہزادہ جس طرف رُخ روشن سے پھر پڑا
رستے میں ایک۔ ایک پَغش کھلکے گر پڑا

شہر مدینہ مصر کا بازار ہوگیا
یوسفؑ ہزار جان سے خریدار ہوگیا

(۱) اوّل تو صبح ہونے کو ایک نئے طرز سے بیان کیا ہے۔ کہ آفتاب کی آنکھ رات کی نیند سے کھُلی (۲) صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے مشتاق مسلمانوں کا مسجد میں ہجوم ہوگیا۔ (۳) مسجد کا تو یہ حال تھا بہت سے آدمی اہلبیتؑ کے در دولت پر جمع تھے۔ کہ ہم یہیں سے زیارت کر لینگے۔٭

مشتاقوں کے اشتیاق کی صورت تھی۔ (۴) امام حسینؑ گھر سے برآمد ہوئے۔ ازبسکہ مسجد کو عارض ہیں۔ اس لئے استعارہ بھی اُسی قسم کا کیا۔ کہ محراب در سے امام نکلے۔ (۵) مگر کس شان سے کہ علی اکبرؑ کو اپنی گود میں لئے ہوئے۔ لطفِ تشبیہ کو ذرا دیکھئے۔ کہ سورج کی گود میں (ہلال) پہلی یا دُوسری تاریخ کا چاند تھا۔ (۶) اب جانے کی شان و شکوہ ملاحظہ فرمائیے۔ کہ دہنی طرف بڑے چچا امام حسنؑ۔ بائیں طرف چھوٹے چچا جناب عباسؑ۔ آگے آگے مدینہ کے خوش عقیدہ نوجوان مسلمان جا رہے ہیں۔ (۷) اب اس موقع پر یہ کمال دیکھئے۔ کہ حسن و جمال کی تجلّی کو یُوں بیان کرتے ہیں۔ کہ جس طرف شاہزادے کا رُوئے روشن پھرا۔ گویا نُور کی بجلی گری۔ کہ ایک دُوسرے پر غش کھا کر گر پڑا۔ (۸) شہر مدینہ منوّرہ اُس وقت گویا مصر کا بازار تھا۔ مگر بازارِ مصر میں تو لوگ حضرت یوسفؑ کے خریدار تھے یہاں خود حضرت یوسفؑ ہزار جان سے ہمشکل محبوب خداؐ کے گاہک ہو گئے۔

(ج) ایک مشہور و لاجواب مرثیے میں مرزا مرحوم نے یہ مضمون نظم فرمایا ہے۔ کہ جب اپنے برادرِ جری حضرت عباسؑ کو روزِ عاشور جناب امام حسینؑ نے اپنی فوج کا علم بخشا ہے تو عون و محمد پسران جناب زینبؑ کو (جو جعفر طیّار کے پوتے اور حیدر کرارؑ کے نواسے تھے۔ اور اپنے دادا اور نانا کے مقدّس رشتہ کے خیال سے دل میں یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ وہ دونوں بزرگوار علمدار رسول خداصلعم تھے۔ ہم اُن کے ورثہ دار ہیں۔ یہ علم ہمیں دونوں میں سے کسی ایک کو ملیگا۔ اور) جو کم عمر تھے۔ ایک قسم کا خیال و ملال ہُوا۔ دیکھئے مرزا صاحب اس مضمون کو بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہتے۔ کہ افسوس ہم کو علم نہ ملا۔ بلکہ ایک نئی مگر سچی بات یہ کہتے ہیں۔ کہ علمدار سب فوج سے آگے ہوتا ہے۔ اکثر جنگ میں اوّل وہی کام آتا ہے۔ اگر آج علمدار ہوتے تو سب سے پہلے شربت شہادت پیتے۔ اب اس شرف سے محروم رہ گئے محض علم نہ ملنے کا خیال ایک خود غرضی کا (بظاہر) خیال تھا۔ اس کو کس عمدگی سے شربت شہادت بدل کر عمدہ بنا دیا ہے تخیل کا لطف و کمال یہی ہے (کہتے ہیں) :-

اک گوشے میں کھڑے تھے جھکائے گردنوں کو خم ۔۔۔ پر ننھے دل کے عون و محمد ملک حشم

تھی فکر یہ۔ کہ فدیۂ اوّل ہوئے نہ۔ ہم　　ہوتے ہیں آگے فوج کے سب حاملِ علم
سبقت نصیبِ حضرت عباسؑ ہوگئی
تھی اس پہلے مرنے کی۔ اب یاس ہوگئی

جاسوس نے عمر کے جو دیکھا یہ ماجرا　　جاکر کہا عمر سے۔ خداوند کچھ سنا؟
بولا وہ کیا؟ کہا کہ مبارک کرے خدا　　واں تفرقہ سپاہ حسینی میں پڑ گیا
منصب جو اپنے جد کا نہ پایا۔ خفا ہوئے
جعفر کے پوتے فوج خدا سے جدا ہوئے

کچھ کم نہیں نسب میں یہ سیفِ خدا سے ہیں　　عباسؑ ہیں علیؑ کے خلف بے نوا سے ہیں
لبریز دل حمیت و مہر و وفا سے ہیں　　ہفتم سے سب کے ساتھ یہ بھوکے بھی پیاسے ہیں
اب ہوگیا یقین کہ ظفر یاب ہم ہوئے
شیر خداؑ کے بیٹے سے دو شیر کم ہوئے

گردن اٹھا کے کہنے لگا شمر بدشعور　　ہاں سچ تو ہے بگڑے ہیں الگ سب سے وہ غیور
اس نے کہا کہ ان کا ملا لینا ہے ضرور　　تجھ کو ہے جوڑ توڑ کا اپنے بڑا غرور
ہاں ہدیۂ یزید کو زینبؑ کے لال لا
دو لختِ دل حسینؑ کے دل سے نکال لا

پر سر کے بل دلیروں کی خدمت میں جائیو　　مرتے ہیں بات پر نہ اجل سے ڈرائیو
منت سے عاجزی سے خوشامد سے لائیو　　غصے کے وقت آنکھ نہ ان سے ملائیو
صحبت رہی ہے فاطمہؑ کے نورِعین کی
دیکھی ہیں آنکھیں کھول کے آنکھیں حسینؑ کی

لے کشتیاں بھی میووں کی اور سرو جام بھی　　آداب عرض کیجیو اور یہ پیام بھی
ہوتا ہے پیشوائی کو حاضر غلام بھی　　کوفہ تمہاری ملک ہے اور ملک شام بھی

نقّارے بج رہے ہیں سلامی کے واسطے
سردار مستعد ہیں غلامی کے واسطے

روٹھے ہیں اک علم پہ یہ شاہِ انامؑ سے
لے جاتو چار پانچ علم فوجِ شام سے
سمجھا سُجھا کے اِن کو جُدا کر امامؑ سے
بھڑکا چراغ نور کے حُسنِ کلام سے
آئینگے بھانجے جو نشۂ دیںؑ سے چھوٹ کر
ہم سے ملینگے اور بھی پھول ان کے ٹوٹ کر

سینے پہ ہات رکھ کے پکارا وہ بدشیم
یہ بھی ہے کوئی کام۔ ابھی لائے اُن کو ہم
اچّھے سے اچّھے اُس نے چُنے جلد دو علم
پٹکوں میں جن کے لفظ جواہر تھے یک قلم
دو کشتیاں لیں ایک میں تو سرد جام تھے
اور ایک میں چُنے ہوئے میوے تمام تھے

آگے گمان بد ہوا پیچھے یہ بدگماں
تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیاں
رعشے کی ہر قدم تھی ندا جُھک یہاں وہاں
آیا وہاں کھڑے تھے یہ دونوں خضرِ جہاں
دونوں کی آنکھ شمر پہ جو یک بیک پڑی
نخوت پسینہ بن کے جبیں سے ٹپک پڑی

خم ہو کے نیم قد۔ یہ کیا شمرِ لعیں نے کلام
اے وارثانِ حیدرؑ و جعفرؑ مرا سلام
یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام
واللہ۔ واہ۔ تم پہ ہے جرأت کا اختتام
یہ بانکپن نظر میں کُھبا۔ جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

حیراں ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا
تم کو نہ حاملِ علمِ مصطفٰے کیا
منصب تمہارا بھائی کو اپنے عطا کیا
لشکر سے اُن کے آپ اُٹھ آئے بجا کیا
سمجھیں نہ جب بزرگ۔ تو خُردوں کو چارا کیا

اُلفت خدا کی دین ہے۔ اِس میں اجارا کیا

ناظرین!! دیکھئے (۱) تو مرزا مرحوم نے یہ بیان فرمایا۔ کہ حضرت عباسؑ کو علم ملنے کی مسرت میں عون و محمدؑ (بھانجوں) نے نہ دیکھی۔ (۲) پھر ایک گوشہ میں اس فکر و افسوس میں کھڑے ہوئے کہ ہم کو علم نہ ملا جو سب سے پہلے شہید ہوتے۔ (۳) وہاں فوج مخالف کے جاسوس نے یہ حال دیکھ کر خیال کیا۔ کہ یہ بچے امام حسینؑ سے (علم نہ ملنے کے سبب سے) رُوٹھ گئے۔ (۴) سردار لشکر عمر ابن سعد سے جا کہا۔ کہ مبارک ہو۔ امام حسینؑ کی فوج میں تفرقہ پڑ گیا۔ اب ہم کو ضرور فتح ہوگی۔ (۵) جاسوس کا طرز بیان اُسی طریق کا ہے۔ جیسے خبردار خوشامدانہ لہجہ میں سردار لشکر سے عرض کیا کرتے ہیں۔ (۶) شمر جو ایک بڑا چالاک و مکار آدمی ہے۔ اُس نے یہ سُن کر گردن اُٹھا کر دیکھا (اس طرز کو دیکھئے) اور خبردار کے کلام کی تائید کی۔ کہ ہاں واقعی وہ غیرتمند (دونوں) صاحبزادے سب سے الگ کھڑے ہوئے ہیں۔ (۷) ابن سعد بولا۔ کہ ان کو ملا لینا ضرور ہے۔ اور یہ جوڑ توڑ تیرا ہی کام ہے۔ تو ہی جا۔ اس موقع پر یہ مصرع کتنا پاکیزہ و مؤثر ہے۔ کہ ع دو لختِ دلِ حسینؑ کے دل سے نکال لا۔ مگر نہایت مؤدب (سر کے بھل) اُن کی خدمت میں جانا۔ یہ بچے بڑے دلیر ہیں۔ ان کو موت سے نہ ڈرانا۔ کہ یہ بات پر مرتے ہیں۔ موت کو کیا سمجھتے ہیں۔ بہت چاپلوسی۔ خوشامد۔ عاجزی کرنا۔ یہ بچے معمولی بچے نہیں ہیں۔ بلکہ امام حسینؑ کی صحبت میں پلے ہیں۔ اس مصرع کی شان کو دیکھئے ع دیکھی ہیں آنکھیں کھول کے آنکھیں حسینؑ کی۔ (۸) میووں کی کشتیاں اور ٹھنڈا پانی لے جا۔ اور میری طرف سے کہنا۔ کہ غلام بھی پیشوائی کو ابھی حاضر ہوتا ہے۔ ہم سے ملو گے۔ تو بس تمام مُلکِ عرب تمہاری مِلک ہو جائیگی۔ اس موقع پر یہ مصرع ع "سردار مستعد ہیں غلامی کے واسطے" کیسا شاندار ہو گیا ہے۔ شاعر جانتا ہے۔ کہ اس کے اُوپر مصرع لگانا کتنا مشکل تھا۔ مگر مرزا مرحوم کی مضمون آفرین طبیعت نے کہاں سے مصرع پیدا کیا ع نقارے سکے رہتے ہیں سلامی کے واسطے۔ (۹) چار پانچ علم بھی لے جا۔ اور جس طرح ہو۔ سمجھا بُجھا کر ان کو

امام حسینؑ سے جُدا کر۔ سمجھانا بُجھانا روزمرہ ہے۔ اُس کے ساتھ چراغ نُور بھڑکانا لاتے ہیں۔ بُجھانا چراغ کے واسطے بھی بولا جاتا ہے۔ صنعت ایہام اس بے تکلفی سے ہو جب لطف ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ امام حسینؑ کے یہ بھانجے ہم سے مل جائینگے۔ تو پھر او ربھی اُن کے عزیز ورفیق غالباً مل جائیں۔ اس مضمون کو مرزا مرحوم کس رنگین پیرایہ میں ادا فرماتے ہیں کہ ع ہم سے ملینگے اور بھی پھُول ان کے لوٹ کر۔ (۱۰) اب شمرلعین کے جواب کے ادا کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ ع سینے پہ ہات رکھ کے پکارا وہ بدشیم۔ ایشیائی ملکوں خصوصاً عرب عجم میں تعمیل حکم کرنیوالا ضرور سینے پر ہاتھ رکھکر افسر کو جواب تعمیلی دیتا ہے۔ ویسا ہی شمر نے بھی کیا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ع یہ بھی ہے کوئی کام ابھی لائے اُن کو ہم۔ گویا اپنے ذہن میں یہ مکّار سمجھا ہوا تھا۔ کہ یہ صاحب زادے ہم سے مل جائینگے۔ کشتیاں اور پانی اور علم لیکر یہ روانہ ہوا۔ (۱۱) ع آگے گمان بدہوئے پیچھے یہ بدگماں۔ گمان بد اور بدگمان کے الفاظ کی تاثیر کو دیکھئے۔ گویا شمر یہ امر اپنے دل میں طے کر چکا ہے۔ کہ ضرور میں ان صاحبزادوں کو پھانس لاؤنگا۔ مگر یہ خبر نہ تھی۔ کہ تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیان میں ہے۔ شمر پورا مکّار ہے (اور اُن شیروں کے پاس جاتا ہے۔ جو اپنی جان پر کھیلے ہوئے ہیں)۔ اور مکّار آدمی ضرور بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ تمام بدن میں رعشہ پڑ رہا ہے۔ (۱۲) وہاں پہنچا۔ جہاں یہ دونوں خضرؑ کھڑے تھے۔ دیکھئے۔ اس موقع پر قمر نہیں کہا خضر کہا۔ اس میں رعایت یہ ہے۔ کہ خضر کا کام ہدایت کرنا ہے۔ وہ دُوسرے کے بہکانے میں کب آسکتے ہیں۔ اُن دونوں شیروں نے جو تیز نظر سے دشمن کو دیکھا۔ تو ع نخوت جبیں سے بن کے پسینہ ٹپک پڑی۔ بہادروں کے سامنے سب مصنوعی غرور مکّار آدمی کا جاتا رہتا ہے۔ (۱۳) اب شمر کے خوشامدانہ ملنے کی تصویر دیکھئے۔ نیم قد خم ہو کر کہا سلام اے حیدرؑ و جعفرؑ کے وارثو میرا سلام۔ میں اُوپر لکھ چکا ہوں۔ کہ حیدرؑ و جعفرؑ دونوں بزرگوار لشکر اسلام کے جرار علمدار تھے۔ گویا سلام ہی سے تمہید مطلب شروع کر دی۔ کہ علم کے مستحق تم ہو۔ ماں کی طرف سے

امام حسینؑ سے جُدا کر۔ سمجھانا بُجھانا روزمرّہ ہے۔ اُس کے ساتھ چراغ نُور بھڑکانا لائے ہیں۔ بُجھانا چراغ کے واسطے بھی بولا جاتا ہے۔ صنعت ایہام اس بے تکلفی سے ہو جب لطف ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ امام حسینؑ کے یہ بھانجے ہم سے مل جائینگے۔ تو پھر اور بھی اُن کے عزیز و رفیق غالباً مل جائیں۔ اس مضمون کو مرزا مرحوم کس رنگین پیرایہ میں ادا فرماتے ہیں کہ ع ہم سے ملینگے اور بھی پھول ان کے لوٹ کر۔ (۱۰) اب شمرؔ کے جواب کے ادا کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ ع سینے پہ ہات رکھ کے پُکارا وہ بدشیم۔ ایشیائی ملکوں خصوصاً عرب و عجم میں تعمیل حکم کرنیوالا ضرور سینے پر ہاتھ رکھکر افسر کو جواب تعمیلی دیتا ہے۔ ویسا ہی شمر نے بھی کیا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ع یہ بھی ہے کوئی کام ابھی لائے اُن کو ہم۔ گویا اپنے ذہن میں یہ مکّار سمجھا ہُوا تھا کہ یہ صاحبزادے ہم سے مل جائینگے۔ کشتیاں اور پانی اور علم لیکر یہ روانہ ہُوا۔ (۱۱) ع آگے گمان بد ہُوا پیچھے یہ بدگماں۔ گمان بد اور بدگمان کے الفاظ کی تاثیر کو دیکھئے۔ گویا شمر یہ امر اپنے دل میں طے کر چکا ہے۔ کہ ضرور میں ان صاحبزادوں کو پھانس لاؤنگا۔ مگر یہ خبر نہ تھی۔ کہ تدبیر کے اُلٹنے کو تقدیر درمیان میں ہے۔ شمر پورا مکّار ہے (اور اُن شیروں کے پاس جاتا ہے۔ جو اپنی جان پر کھیلے ہُوئے ہیں)۔ اور یہ مکّار آدمی ضرور بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ تمام بدن میں رعشہ پڑ رہا ہے۔ (۱۲) وہاں پہنچا۔ جہاں یہ دونوں خضرؑ کھڑے تھے۔ دیکھئے۔ اس موقع پر قمر نہیں کہا خضر کہا۔ اس میں رعایت یہ ہے۔ کہ خضر کا کام ہدایت کرنا ہے۔ وہ دُوسرے کے بہکانے میں کب آسکتے ہیں۔ اُن دونوں شیروں نے جو تیز نظر سے دشمن کو دیکھا۔ تو ع نخوت جبیں سے بن کے پسینہ ٹپک پڑی۔ بہادروں کے سامنے سب مصنوعی غرور مکّار آدمی کا جاتا رہتا ہے۔ (۱۳) اب شمر کے خوشامدانہ ملنے کی تصویر دیکھئے۔ خم قد خم ہو کر کہا۔ اے حیدرؑ و جعفرؑ کے وارثو میرا سلام۔ میں اُوپر لکھ چکا ہُوں۔ کہ حیدرؑ و جعفرؑ دونوں بزرگوار لشکر اسلام کے جرّار علمدار تھے۔ گویا سلام ہی سے تمہید مطلب شروع کر دی۔ کہ علم کے مستحق تم ہو۔ ماں کی طرف سے

بھی تمہارا حق ہے باپ کی جانب سے بھی۔ سلام کے بعد کہتا ہے۔ ؎

یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام   واللہ۔ واہ۔ تم پہ ہے جرأت کا اختتام

الفاظ کی نشست کو ملاحظہ فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سونے کی انگوٹھی پر کسی کامل حادہ کار نے فیروزہ کا نگ جڑ دیا ہے۔ اب یہاں خاص بانکوں۔ جوان مردوں۔ وضعداروں کے الفاظ نظم کر دئے ہیں۔ ؎

یہ بانکپن نظر میں کھبا۔ جی میں گڑ گیا   سگ دلوں پہ آپ کی غیرت کا پڑ گیا

اب تعریف و خوشامد کے بعد تعجب کے لہجہ میں کہتا ہے۔ کہ ہم سب حیران ہیں۔ یہ آپ کے ماموں (امام حسینؑ) نے کیا کیا۔ کہ آپ کا منصب اپنے بھائی کو دیدیا۔ (۱۴) آپ اُن کے لشکر سے چلے آئے۔ یہ بہت مناسب و بجا کیا۔ محبت تو خدا کی دین ہے۔ (خاص روزمرہ ہے) اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ اور جب بزرگ ہی حق نہ سمجھیں۔ تو خردوں کو کیا چارہ ہے۔ دیکھئے ایسی ذرا ذرا سی باتیں نظم کی ہیں۔ جو گویا رات دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ کہ ان کو نظم کرے۔ دریا تو موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر غوطہ لگا کر عمدہ موتی نکالنا ہر غوّاص و شناور کا نہ کام ہے نہ ممکن ہے۔ ؎

رشک بےجا ہے گر رقیب کرے   یہ تو جس کو خدا نصیب کرے[※]

بدیعِ منوچہری

(۲) منوچہری جو متقدمین ایرانیوں میں بہت کامل شاعر ہے۔ ایک باغ کی مدح میں کہتا ہے:۔

آں قطرۂ باراں بیں از ابر چکیدہ   گشتہ سرِ ہر برگ ازاں قطرہ باتار

آویختہ چوں ریشۂ دستارچۂ سبز   سیمیں گرہے بر سرِ ہر ریشۂ دستار

※ اس موقع کی پوری گفتگو جو عمر اور صاحبزادہ میں ہوئی ہے۔ حقیر نے شرح و بسط کے ساتھ جلد دوم (حیاتِ دبیرؒ) میں لکھی ہے۔ انشاء اللہ ناظرین کتاب دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔ یہاں زیادہ بخیال طوالت نہیں لکھ سکتا۔ ۱۲ مؤلف ہیچدان۔

مرزا مرحوم ایک مرثیہ میں ایک مرد مومن کا خواب بیان کرتے ہیں[1]۔ کہ جس نے ایک باغ (عالم رویا میں) دیکھا ہے:۔

شبنم کا عجب لطف ہے ہر برگ چمن پر — سجّادے پہ۔ ہے ٹوٹ گیا سبحہ گوہر
ہر شاخ ہے معراج بہار گل احمر — جس طرح سناں پر ہے پسر فاطمہ کا سر

ہر غنچہ ہے۔ دفتر۔ غم شاہ دوسرا کا
ہر۔ لالہ ہے۔ محضر۔ گل زخم شہدا کا

(۳) حکیم سنائیؒ جو فرقہ صوفیہ میں صاحب احترام بزرگ سمجھے جاتے ہیں اور جن کی نظم تاثیر کے لحاظ سے اکثر شعرائے کاملین سے بہتر ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔

قطعہ

با ہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں — بیشتر گمرہ و کمتر برہ اند
آں چناں زی کہ چو میری برہی — نہ چناں زی کہ چو میری برہند

کیا اچھی نصیحت ہے۔ کہ اگرچہ دنیا میں گمراہ زیادہ اور راہ راست پر بہت کم لوگ ہیں۔ مگر تو سب کے ساتھ اس طرح بسر کر۔ کہ جب مر جائے۔ تو اُن کے عذاب سے تجھ کو نجات مل جائے۔ نہ کہ تیرے مرنے سے اُن کو (تیرے پنجۂ ظلم سے) نجات ملے۔

مرزا مرحوم کہتے ہیں:۔

رباعی

جو چاہیں بزرگوار ارشاد کریں — ہم کاہے کو گھر حیا کا برباد کریں
اس واسطے بھولا ہوں بدی سب کی دبیرؔ — مر جاؤں تو نیکی سے مجھے یاد کریں[2]

---

[1] اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے ع ناجی بخدا فرقہ اثنا عشری ہے۔ دفتر ماتم کی نویں جلد میں یہ مرثیہ چھپ چکا ہے۔

[2] مرزا مرحوم نے اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا ہے۔ اور سب کی بدی کو بھلا دینا اعلےٰ درجے کی خوش خلقی ہے۔ دوسرے سے بدی کرنیکا تو یہاں ذکر ہی کیا ہے۔ یہ بلاغت کے نکات ہیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

حکیم سنائی
شعر مع
معاشرت

اس موقع پر یہ لکھنا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ کہ سب سے پہلے جناب امیرؑ نے یہ مضمون ادا فرمایا ہے۔ اگر حکیم سنائیؒ اور مرزا دبیر کے پیش نظر نہج البلاغہ کا یہ مضمون تھا۔ تو یہ کہا جائیگا۔ کہ اُن دونوں بزرگوں نے تبرکاً یہ مضمون (باب مدینۂ علم سے) لیا ہے۔ اور ایک صاحب نے اس مضمون کے ذریعہ سے فارسی کی اور دُوسرے نے اُردو کی عزت بڑھائی ہے۔ ورنہ توارد سمجھا جائیگا۔ مگر یہ توارد اس مصرع جناب نفیس مرحوم کا مصداق ہے ع مصرع بھی جو لڑ جائے تو موتی کی لڑی ہے۔ بہرحال وہ فقرہ یہ٭ ہے خَالِطُوا النَّاسَ مُخَالَطَةً اِنْ مُتُّم مَعَهَا بَكَوْا عَلَيْكُمْ وَاِنْ عِشْتُم حَنُّوا اِلَيْكُمْ۔ یعنی تم اس طرح آدمیوں میں مل جُل کر بسر کرو۔ کہ اگر تم مرجاؤ۔ تو وہ تمکو یاد کر کے روئیں۔ اور زندہ رہو۔ تو تم سے ملنے کی خواہش رکھیں +

مضمون نہج البلاغہ

(۳) حکیم سنائیؒ فرماتے ہیں:۔

از پے ردو قبول عام خود را خر مکن ۔۔۔ زاں کہ نبود کار عامہ خرخری یا فرفری

گو دُرا دارند باور در خدائے عامیان ۔۔۔ نوحؑ را باور ندارند از پئے پیغمبری

اہل دنیا کا رد و قبول

فرماتے ہیں۔ کہ عام لوگوں کے رد و قبول کا کیا اعتبار ہے۔ ان میں نیک و بد۔ اچھے بُرے کے پہچاننے کی تمیز ہی نہیں۔ یہ جاہل گائے کی تو پُوجا کرتے ہیں (جیسے گوسالہ پرستی حضرت موسےؑ کی امت نے کی تھی) مگر جلیل القدر اولو العزم جناب نوحؑ کو پیغمبر خدا ہی نہیں مانا۔ جب اہل دُنیا کی بدتمیزی کا یہ حال ہے تو تو رد و قبول عوام کے واسطے بیوقوف نہ بن +

مرزا دبیر رحؒ کہتے ہیں۔ (رباعی)

بُلبل یہ زمانہ ایک گُل کا نہ ہُوا ۔۔۔ محکوم ائمہؑ و رُسلؑ کا نہ ہُوا

ہندوں کو ہمیشہ خیال یکتائی ہے ۔۔۔ اللہ پہ اتفاق کُل کا نہ ہُوا

٭ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ کتاب مراسلات و کلمات جناب امیرؑ صفحہ ۱۴۵ جس کو علامہ جناب مفتی محمد عبداللہ (مفتئ مسلمہ) نے مع شرح ترجمہ کیا ہے + ۱۲ مؤلفہ حقیر۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اہل دُنیا نے رسولوں اور ائمۂ اطہار کی تو پیروی کی ہی نہیں۔ اور یہ جو نفوس قدسیہ اپنے اپنے عہد میں بے مثل و نظیر (معصوم) تھے۔ اُن کو تو یکتا مانا ہی نہیں۔ پھر بندے کس بنا پر اپنے آپ کو یکتا سمجھتے ہیں۔ آگے ترقی یہ کی۔ کہ پیغمبر و امام تو درکنار خدا کے یکتا ہی کو سب اہل عالم نے نہیں مانا۔ نہ آج مانتے ہیں۔ بہتیرے زبان و دل سے منکر ہیں۔ بہت سے زبان سے کہتے ہیں۔ مگر دل سے منکر خدا ہیں۔ یہ اہل دُنیا کا رنگ ہے +

فصل ۳ — عمر خیام — شکایت فلک

(۵) عمر خیّام (رباعی)

اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم آزادم کن کہ لائقِ بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نا اہل است من نیز چنان اہل و خردمند نیم

کہتا ہے۔ کہ اے آسمان میں تیری گردش سے ناخوش رہتا ہوں۔ مجھے اپنے پنجۂ ظلم سے چھوڑ دے۔ کہ میں تیری اسیری کے قابل نہیں ہوں۔ اگر تو بے عقل اور نالائق آدمیوں سے ہی راضی اور خوش رہتا ہے۔ تو میں بھی کچھ ایسا عقلمند اور قابل نہیں ہوں۔ مجھے بھی بے عقل و نالائق سمجھ کر چھوڑ دے +

مرزا مرحوم کہتے ہیں:— (رباعی)

زردار نہیں اور طلب زر بھی نہیں میں بے سر و پا کسی کا ہمسر بھی نہیں
پھر خاک میں مجھ کو کیوں ملاتا ہے فلک میں کون ہوں خاک کے برابر بھی نہیں

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ میں نہ تو خود مالدار ہوں نہ طالب مال۔ نہ میرے سر میں کسی کی ہمسری کا سودا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی طبیعت مقابلہ کو ناپسند کرتی تھی۔ پھر مجھے آسمان خاک میں کیوں ملاتا ہے۔ میں تو خاک کے برابر بھی نہیں ہوں۔ یہ مرزا مرحوم کی خاکساری اُن کے بوترابی ہونے کو ثابت کرتی ہے۔ اور اشارہ ہے۔ کہ خاک میں اُس کو آسمان ملائے جو خاک کے برابر ہو۔ کہ ہر جنس اپنی جنس میں ملتی ہے۔ جیسے کہ مثل "الجنس یمیل الی الجنس" مشہور ہے۔ سبحان اللہ۔ ایک رباعی میں اور اتنا بڑا بلیغ مضمون نظم فرمایا ہے +

(۶) خیّام (رباعی)

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند | درکشفِ دقیقہ شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نہ بروند بروں | گفتند فسانۂ و درخواب شدند

مرزا مرحوم (رباعی)

آج آئے ہیں۔ کل کوچ کی طیاری ہے | غفلت میں کٹی عمر۔ یہ ہشیاری ہے
دُنیا ہے عجب مقامِ حیرت۔ نہ کھُلا | یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

بند مسدس

یاں روز اک طلسم بنا اور بگڑ گیا | یاں کل نہالِ تازہ جما۔ آج اُکھڑ گیا
یاں شب کی شب بسا جو مسافر اُجڑ گیا | نام خزاں کا سکّہ زرِ گل پہ پڑ گیا

سنے دن نہ سن حساب کا کچھ ہیر پھیر ہے
ناقے کسے کھڑے ہیں سواری کی دیر ہے

(۷)۔ (۱) منطقی رازی۔
توگفتی خنگ صاحب تا فتن کرد | فگند ابر نعل زریں در بیاباں

(۲) انوری۔ دیدم اندر سواد طرّہ شب | گوشوار فلک زگوشۂ بام
گفتم آں نعل خنگِ دستور است | قرّۃ العین و فخر آل نظام

(۳) ظہیر فاریابی۔ نعل سمند شاہ جہانست کاسماں | ہر ماہ بر سرش نہد از بہر افتخار

مرزا دبیر مرحوم۔ سن لو نسب یہ رخش بڑا قوم دار ہے | تخم مراد ابلق لیل و نہار ہے
کھیت اس کا صحن قدرتِ پروردگار ہے | یہ شیر خوار دایۂ ابرِ بہار ہے
مالک ہے ماہِ نو سے یہ چرخ بلند کا | پہلے فلک پہ نال گرا ہے سمند کا

مرزا مرحوم کی طباعی اور بات میں سے بات نکالنے کو دیکھئے۔ نعل جو عین سے ہے۔ وہ تو گھوڑے کا

حاشیہ: عبرت و بے ثباتی

حاشیہ: مضمون نعل اسپ کی تشبیہ ہلال کے ساتھ منطقی رازی و انوری و ظہیر فاریابی

* یہ بند جس مرثیہ کا ہے وہ ابھی تک طبع نہیں ہوا۔ صرف چند تلامذہ مرزا صاحب کے پاس محفوظ ہے حقیر کے پاس بھی جو نانا مرحوم سے مجھے پہنچا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

نعل مراد ہے۔ مگر یہاں نال الف سے چاہے مراد لیجے۔ چاہے (نعل) عین ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کا نال کاٹ کر زمین میں گاڑا جاتا ہے۔ روزمرہ میں بولتے ہیں۔ ہمارا وہاں کیا نال گڑا ہے (مطلب یہ ہے۔ کہ جس جگہ آدمی کا نال گڑتا ہے۔ اُس مقام سے اُس کو محبت ہوتی ہے۔ اور اکثر آدمی کا نال اُس کے مملوکہ مکان میں گاڑا جاتا ہے۔ اور مولد کا تعلق ہمیشہ آدمی سے رہتا ہے۔ پس اس موقع پر مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ عقاب اسپ جناب علی اکبر کو آسمان سے یہ تعلق ہے۔ کہ ماہِ نو جس کو لوگ سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس گھوڑے کے نال گڑنے کا نشان ہے۔ اس میں صنعت ایہام ہے۔ دُوسری صورت میں نعل سے وہی نعل آہنی مراد ہے۔ جس کو اکثر شعرا کہتے آئے ہیں +

(۸) میر معزّی۔ مردم بشہر خویش ندارد بسے خطر + گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا
انوری۔ بشہر خویش دروں بے خطر بود مردم + بکان خویش دروں بے بہا بود گوہر
واقعی آدمی کی قدر اکثر اُس کے وطن میں کچھ نہیں ہوتی۔ جس طرح موتی جب تک دریا میں رہتا ہے۔ کچھ قیمت نہیں پاتا۔ سفر میں آدمی کی قدر ہے۔ اور موتی سمندر سے نکل کر قیمت پاتا ہے +

فصل ہم فائدہ نمبر ۸ میر معزّی انوری

دبیر مرحوم (رباعی)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل پختہ جو ثمر ہُوا چمن سے نکلا

ناظرین۔ دیکھئے۔ کس قدر مضمون کو ترقی دی ہے۔ یہ رباعی مرزا صاحب نے عظیم آباد پٹنہ پہنچ کر کہی تھی۔ جیسا کہ میں مفصّل اپنے مقام پر لکھ آیا ہُوں* +

نمبر ۹ انوری

(۹) انوری (پیغمبر سخن) درجہانی و از جہان بیشی + ہمچو معنی کہ در بیاں باشد
(الف) دبیرؒ۔ قاتل کو جام دیتے ہیں تعذیر کے عوض + رہتے ہیں یہ خدا کی عبادت میں بے غرض
جوہر ہے لعل حضرت زہراؑ کا سب عرض + یہ خاص سب عوام۔ یہ دُرماں ہیں سب مرض

*۔ فارسی کی الف لیلہ جو ناصر الدین شاہ قاچار (شہید) کے زمانہ کی تالیف ہے اُس میں ملک الکلام سروش کے یہ دو شعر لکھے ہیں جو اسی مضمون کے ہیں۔ قدر مردم غریبی کند + داد خویش مرد را بند ست + گر سنگ اندروں جبگو ہر + کس چہ داند کہ قیمتش چند ست ۔ ۲۔ مؤلّف حقیر۔

سب سایہ ہیں یہ جان نبی بے گمان ہے

سایہ نہ جان ہیں ہے نہ سایہ میں جان ہے

انوری اپنے ممدوح کو کہتا ہے کہ تو جہان میں ہے۔ مگر تمام جہان سے فضیلت میں زیادہ ہے، جیسے معنی الفاظ میں ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بیان میں معنی نہ ہوں۔ تو وہ مہمل ہوگا۔ انوری نے عجب بلیغ مضمون ادا کیا ہے۔ کہ ممدوح باوصفیکہ جہان میں شامل ہے۔ مگر پھر سب سے الگ اور افضل و اعلےٰ ہے۔ ایسے ایسے اعلےٰ مضامین کی بدولت انوری پیغمبرِ سخن مانا گیا ہے۔

مرزا مرحوم فرماتے ہیں۔ کہ میرے ممدوح (امام حسین علیہ السّلام) بمنزلہ جوہر ہیں۔ جوہر اُس کو کہتے ہیں۔ جو بالذّات قائم ہو۔ اور سب بنی آدم بمنزلہ عرض ہیں۔ کہ عرض جوہر کے دم سے قائم رہتا ہے۔ شیعوں کے اعتقاد میں امام عصر اور صوفیوں کے عقیدے میں غوث بنی نوع انسان میں سب سے افضل و اعلےٰ ہیں۔ اور تمام دُنیا اُسی کے دم سے قائم ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ کہ عوام سایہ کی طرح ہیں۔ اور امامؑ بمنزلہ جان ہیں۔ اور جان بھی کس کی؟ نبی آخر الزماںؐ (روحی لہ الفدا) کی۔ پھر اس پر ترقّی یہ کی۔ کہ نہ سایہ میں جان ہوتی ہے نہ جان میں سایہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نہ عام لوگ امامؑ کے درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ نہ امامؑ عوام میں شامل و داخل ہیں۔

(ب) دوسرے مرثیہ میں مرزا صاحب جناب عبّاسؑ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

دُنیائے دُنی ان کا نشاں کفِ پا ہے لیکن وہ نشاں ہے جو کفِ پا سے جُدا ہے

دُنیا انہیں کے دم سے قائم ہوئی۔ انہیں کے نور سے پیدا ہوئی۔ جیسے نشانِ قدم قدم سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ دُنیا سے یوں الگ تھلگ رہتے ہیں جیسے نشان قدم قدم سے جدا ہے۔ انوری مضمون آفریں شاعر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں اس کا نام اُسی طرح آتا ہے جیسے ایک شاعر شاعرانہ تفاخر سے اپنے متقدم شاعر کو یاد کرتا ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں:۔

(رباعی)

اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے　　آ۔ دیکھ کہ یہ در معانی کیا ہے
یاں گُل ہے چراغ انوری کا بالکل　　اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے

اس میں اشارہ ہے۔ کہ شعرائے ایران تو مضمون آفرینی میں میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ ہندوستانی کیا مقابل ہونگے۔ انوریؔ کی نسبت ایک مقام پر اُنہوں نے یہ بھی افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ بادشاہوں کی تو اُس نے کثرت سے مدح کی۔ کہ اُس کا کلیات (مدح سے) بھرا پڑا ہے۔ مگر خاصان خدا کی شان میں قصائد وغیرہ نہ کہے۔ چنانچہ ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

اندھیر ہے جو مجھ سے مقابل ہو انوری　　شاہوں کی اُس نے کی ہے فقط مدح گستری
حیدرؑ کی منقبت۔ نہ ہے نعت پیمبری　　کس بات پر حسینؑ کے ذاکر سے ہمسری؟

(۱۰) سعدی شیرازی ؎ زمغرورِ دُنیا رہ دیں مجو + خدا بینی از خویشتن بیں مجو +
مرزا مرحوم ؎ نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا ملا + بندہ جدا ہُوا جو خودی سے خدا ملا +

(۱۱) سلمان ساوجی ؎

در دُرجِ دُرِ عقیق لبت نقد جاں نہاد　　جنس نفیس بود بجائے نہاں نہاد
قُفلے ز لعل بر درِ آں درج زد لبت　　خالت ز عنبر آمد و مہرے بر آں نہاد
باریک تر ز مو کمرت را دقیقۂ　　ناگاہ در دل آمد و آمش میاں نہاد
دبیرؔ گیسوئے رساروئے کتابی کے قریں ہے　　قرآں کا حافظ پرِ جبریلِ امیں ہے
لب موج۔ دہن کوثر فردوس بریں ہے　　دانتوں سے لطافت کا جہاں زیرِ نگیں ہے

دندان و دہن کے لئے تشبیہیں بھلی ہیں
کلیاں سمن خلد کی۔ کوثر میں کھلی ہیں

مدح خال و رخ

مذمت غرور در سعدی
فصل ۵
مدح ساز رخ سلمان ساوجی

لو قدرت داور کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو   خالِ رخ انور کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو
اک نقطہ میں دفتر کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو   خورشید میں اختر کو نہ دیکھا ہو تو دیکھو
ہے قرب۔ نیا روئے ضیا بار کے آگے
قنبر تو نہیں حیدرؑ کرار کے آگے

قنبر حبشی تھے۔ اور خال سیاہ ہوتا ہے۔ رُوئے ممدوح انور روشن ہے ان وجوہ سے یہ تشبیہ اعلیٰ درجہ کی ہے +

ایک مرثیہ میں دختر فغفور چین کی کمر کی نسبت یہ بند ہے :۔
تعریف کمر میں شعرا کے تھے یہ اقوال   یہ بال کی ہے کھال و یا کھال یہ اک بال
میزان نزاکت میں جو تولو۔ تو کھُلے حال   موئے مژہ موسے بھی کم تھی کئی مثقال
اُس موے کمر ہی کی زباں سے یہ کھُلا پیچ
عالم ہمہ افسانہ ما دار دو ما ہیچ

محبت خواجوؒ و حافظؒ

(۱۲) خواجوؒ کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او + با شیر در دل آمد و با جاں بدر شود۔
حافظ شیرازیؒ عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم + با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود۔
مرزا مرحوم مدح ہند بنت عبد اللہ عامر صحابی میں (یہ دوستدار اہلبیتؑ زوجہ یزید تھی) کہتے ہیں :۔
حق کی نگہِ مہر سے سرمہ جو یہ پایا   مادر نے وضو کر کے سدا دودھ پلایا
تقدیر نے گہوارۂ عفّت میں جھُلایا   ٹوپی کی جگہ سر پہ ید اللہ کا سایا
افزود توانائی بھی ایک ایک گھڑی تھی
حیدرؑ کی ولا ہند کی گھُٹّی میں پڑی تھی
ناظرین۔ دیکھئے۔ گھٹی میں پڑنے کے روزمرّہ کو کیسے موقع پر صرف فرمایا ہے +

(۱۳) حافظؒ شیراز۔ از حدیث سخن عشق ندیدم خوشتر ٭ یادگاری کہ دریں گنبد دوّار بماند۔

دبیرؒ۔ جس دن تلک آباد یہ ویرانہ رہیگا ٭ عباسؑ کی الفت کا بھی افسانہ رہیگا۔

(۱۴) حافظؒ۔ تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن ٭ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔

دبیرؒ۔ مصرع کے عوض آپ سے طوبےٰ نہیں لیتا — لو جنّت لعلےٰ بھی بہ ادنےٰ نہیں لیتا

اب پُوچھئے کیا مانگتا ہے کیا نہیں لیتا — مَیں نام زباں سے کسی شئے کا نہیں لیتا

جز نقدِ رضا۔ کچھ مجھے منظُور نہیں ہے

خادم ترا مدّاح ہے مزدُور نہیں ہے

حافظؒ کے شعر میں تو خفیف سا شائبہ بھی ہے۔ کہ خواجہ خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے وہ پرورش کریگا۔ مگر مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ مَیں صرف رضا چاہتا ہُوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ کہ دل سے مدّاح ہُوں۔ کوئی مزدور نہیں ہُوں ٭

(۱۵) ابن یمین۔ منگر کہ دل ابن یمیں پرخوں شد ٭ بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد۔

مصحف بکف و چشم برہ روے بدوست ٭ با پیک اجل غمزہ زناں بیروں شد۔

سبحان اللہ مومن کی موت کی گویا تصویر کھینچ دی ہے ٭

مرزا مرحوم (رباعی)

رحمت کا۔ تری۔ اُمیدوار۔ آیا ہُوں — مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہُوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے بیدل — تابُوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہُوں

ناظرین!! اس مضمون کی یا اس سے بہتر کوئی رباعی میری سماعت میں ابتک نہیں آئی۔ اب چاہے اس کو میری بے بضاعتی و کم علمی سمجھئے۔ چاہے مرزا صاحب سے حسن عقیدت خیال فرمائیے۔ مگر مَیں اس کو لاجواب سمجھتا ہُوں ٭

(۱۶) امیر خسرو کا لاجواب شعر ہے۔

بوے خوشم ایداز تو۔ در جیب — گل داری یا ہمیں ست بوئیت

تعریف محبت حافظ رح

سفر آخرت ابن یمین

اے محبوب خوشبو آ رہی ہے - یہ تیری جیب میں کوئی پھول ہے - یا تیری ہی (جسم کی) خوشبو ہے - کیسا عمدہ مضمون تعجب کے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے - تعریف نہیں ہو سکتی۔

دُوسرے موقع پر یہی بزرگوار فرماتے ہیں ؎

چہ گرد ست این کہ می خیزد کہ باجاں ہم نشیں آمد　　کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ بر زمیں آمد

(الف) مرزا مرحوم زہیر ابن قین کے مرثیہ میں اُس موقع پر فرماتے ہیں جب جناب علی اکبرؑ حضرت امام حسینؑ کے حکم سے اُن کے خیمے پر اُن کے بُلانے کو گئے ہیں - اور زہیر مع مصاحبین کے بیٹھے ہُوئے ہیں :-

محفل شمیم عطر عرق سے مہک گئی　　خیمے میں ایک نور کی بجلی چمک گئی
پڑھ پڑھ کے سب نے صلِّ علیٰ کی یہ گفتگو　　آتی ہے کس طرف سے رسولؐ خدا کی بُو
کہنے لگا غلام زُہیرؑ آ کے رُو برو　　چل جلد پیشوائی کو اب اے زہیر تُو
گیسُو ہیں - دونوں کاندھوں کے اُوپر پڑے ہوئے
دروازے پر حبیبؐ خدا ہیں کھڑے ہوئے

یہ امام زادۂ عالی وقار سر سے پاؤں تک حبیب خدا اشرف انبیا محمد مصطفےٰؐ کی گویا تصویر ہے - اُس مشابہت کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے - اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وّ آلِ محمدٍ ؛

(ب) ایک عورت (خورشید بانو) نے ایک راہرو شخص کے پاس سر امام حسینؑ رومال میں لپٹا ہُوا دیکھا ہے - اُس موقع پر کہتے ہیں - ؎

ہے چاند اس کے ہات میں یا آسمان پر!!　　آنکھیں فلک پہ اور یہ سخن تھا زبان پر

(ج) جناب شاہزادہ علی اکبرؑ گھر سے باہر نکلے ہیں میدان شہادت کو جاتے ہیں - اُس موقع پر مرزا مرحوم فرماتے ہیں - ؎

نورِ نظر شاہ جو گھر سے نکل آیا
حیراں ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

(۱۷) ایران کے مشہور مرثیہ گو شاعر ملا محتشم کا مشہور و مقبول شعر ہے:۔

روزے کہ شد بہ نیزہ سر آں بزرگوار — خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

اس میں شاعر نے آفتاب کا سر برہنہ نکلنا بیان کیا ہے۔ اور اُس کی وجہ بیان کی ہے۔ اب مرزا صاحب کی حسنِ تعلیل اور لطفِ تخیل کو دیکھئے:۔

تھی لبسکہ صبح قتلِ شہنشاہِ نامدار — اہلِ حرم تھے جیب دریدہ اور اشکبار
تارِ شعاع سے بھی ہوتا تھا۔ آشکار — خورشید نے کیا ہے گریباں کو تار تار

پو پھٹتے ہی رسولؐ کا دامان پھٹ گیا
زہراؑ کے بھی کفن کا گریبان پھٹ گیا

(۱۸) ملا ظہوریؒ اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

مروّت کردہ شب ہا بر تو سیر بام و در لازم — نمی باشد چراغے خانۂ بے دستگاہاں را

مطلب یہ ہے۔ کہ تو جو کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اور لوگوں کے دروازہ پر جاتا ہے۔ یہ تیری مروّت کی دلیل ہے۔ کہ مفلسوں کے جھونپڑوں میں چراغ نہیں ہوتا تیرے چہرہ کی روشنی اُن کے لئے چراغ بن جاتی ہے +

مرزا دبیر مرحوم کے ممدوح بادشاہانِ دُنیا سے اعلےٰ ہیں۔ اس لئے انکی تخیل بھی دُنیا کے چراغ سے روشنی نہیں لیتی۔ بلکہ وہ چاند سُورج سے کام لیتے ہیں اور چاند سُورج بھی دُنیا کے نہیں بلکہ جنّت کے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

سورج ہے نہ دن خلد میں نے چاند نہ شب ہے — شمس و قمرِ عدن یہ فرخندہ نسب ہے*

(۱۹) صائب فرماتے ہیں۔ ؎

بر تواضعہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست — پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

مطلب یہ ہے۔ کہ دشمن گو بظاہر تواضع کرے۔ مگر اُس پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ اس

* یہ شعر حضرت عباسؑ ماہ بنی ہاشم کی مدح میں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

فصل ۶ آفتاب کا طلوع ملا محتشم

ممدوح کے چراغ ملا ظہوری

صائب تواضع دشمن

صورت میں نقصان پہنچیگا جیسے سیل (بہیا) دیوار کی پابوس ہوتی ہے۔ اور اُس کو جڑ تک سے گرا دیتی ہے +

مرزا دبیر مرحوم کا مضمون دُوسرا ہے۔ مگر اس سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ میں دشمن سے بھی خلاف مروّت برتاؤ نہیں کرتا ہُوں۔ اُن کا شعر یہ ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو — مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو*

دیکھئے ہوا غبار کی دشمن ہے۔ کہ اُس کو اُڑا کر پریشان کر دیتی ہے۔ مگر غبار اُس کی تعظیم کو اُٹھتا ہے۔ یعنی جب ہوا تیز چلتی ہے۔ تو غبار زمین سے اُٹھتا ہے +

(۳۰) مرزا صائب کا مشہور و لاجواب شعر ہے۔ ؎

صائب بیکسی

دوست دشمن میشود صائب بوقت بیکسی — خون زخم آہواں پے می برد صیّاد را

بیکسی کا وقت بُرا ہوتا ہے۔ دوست بھی دشمن بن جاتا ہے۔ چنانچہ صیّاد جب ہرن کو زخمی کرتا ہے۔ اور اُس کا خون زمین پر ٹپکتا ہے۔ تو اُسی نشان خون پر صیاد چلا جاتا ہے۔ اور آخر کار جہاں ہرن ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اُس کو گرفتار اور ذبح کر دیتا ہے +

مرزا مرحوم زبانی جناب زینبؑ ذیل کی بیت فرماتے ہیں۔ وہ معظمہ جب جناب امام حسینؑ کی لاش پر پہنچی ہیں اور سر اقدس کو بدن پر نہ پایا۔ تو بَین کرتی ہیں ؎

خواہر تری غربت پہ فدا ہو گئی بھیّا — تنہائی میں گردن بھی جُدا ہو گئی بھیا

* نہج البلاغہ مطبوعہ مصر شرح مفتی محمد عبدہ کے صفحہ ۲۰۹ پر یہ ہدایت جناب امیرؑ کی ہے۔ اَحْبِبْ حَبِیْبَکَ ھَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ بَغِیْضَکَ یَوْمًا مَّا وَ اَبْغِضْ بَغِیْضَکَ ھَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ حَبِیْبَکَ یَوْمًا مَّا۔ اپنے دوست سے خلق و مدارات کے ساتھ دوستی کر۔ شاید کسی دن تیرا دشمن ہو جائے (تو تیری مدارات کو یاد رکھے) اور اپنے دشمن سے خلق و مدارات کا پہلو لئے ہُوئے دُشمنی کر۔ شاید کسی دن وہ تیرا دوست ہو جائے۔ اس مضمون اقدس سے مرزا صاحب کا مضمون مستنبط معلوم ہوتا ہے۔ عجب مروت و دُور اندیشی کا خیال ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہر مومن کو یقین کے قلم سے لوح دل پر یہ مضمون لکھ کر اس پر عامل ہونا چاہئے تاکہ دین و دُنیا کی بھلائی حاصل ہو + ۱۲ کف حقیر۔

گردن سی شے تنہائی میں جسم سے جُدا ہو گئی۔ اور سب دوست تو علیحدہ ہُوئے ہی تھے گردن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ بلاغت کی شان سے اختصار بھی ہے۔ جس مضمون کو مرزا صائب نے ایک شعر میں کہا تھا۔ اُس کو مرزا صاحب نے ایک مصرع میں ادا کر دیا۔ یہ مرزا مرحوم کا کمال بھی قابلِ داد ہے +

ناظرین!! مَیں اس مضمون کو اس لئے طُول دینا نہیں چاہتا۔ کہ میرے بعض احباب مانع ہیں۔ اور اُن کی یہ رائے ہے۔ کہ زمانہ ایسے مضامین کی قدر کرنے پر طیّار نہیں ہے۔ ورنہ بہت سا مصالح ایسے مضامین متقابلہ کا فراہم کر چکا ہُوں۔ اگر ان مضامین کی ملک میں قدر ہُوئی۔ اور ناظرین نے نظرِ پسند سے دیکھا۔ اور فرمائش کی۔ تو انشاء اللہ آئندہ کتاب کے دوبارہ چھپنے پر اس سے زیادہ ایسے اشعار پیش کر دُونگا۔ ورنہ خیر +

باب چہاردہم۔ کلام بعض شعراء ہند و کلام مرزا مرحوم

فصل ۱ کلام شعرائے ہند و کلام دبیر

اس باب میں چند ایسے شعر لکھتا ہُوں۔ کہ جن کا مضمون قریب قریب ہے۔ تا کہ ناظرین کو معلوم ہو سکے۔ کہ مرزا صاحب اگر کسی معمولی مضمون کو بھی کہتے ہیں۔ تو ایک نہ ایک لفظ یا بات ایسی کہتے ہیں۔ کہ وہ مضمون گویا نیا ہو جاتا ہے۔ ازبسکہ گروہ شعرا میں میر تقی میر مرحوم بہت بڑے قابلِ تعظیم اُستاد مانے جاتے ہیں۔ اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔ کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں۔ اس لئے مَیں تبرّکاً میر صاحب سے اس باب کو شروع کرتا ہُوں +

انتخاب میر و ابیات نسیم لکھنوی

(۱) میر مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

میرے تغیرِ رنگ پر مت جا ۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

نسیم لکھنوی

نسیم لکھنوی گلزارِ نسیم میں کہتے ہیں۔ ؎

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

مرزا مرحوم شیریں کنیز امام حسینؑ کی پریشانی کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ ؎

اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا پوشاک بدلنا بھی۔ غرض۔ چھوڑ دیا تھا

تغیر رنگ کے مضمون کو مرزا صاحب ایک اور مرثیۂ حال جناب سکینہ میں بالکل نئے طرز پر فرماتے ہیں۔ ناظرین! دیکھئے لفظوں میں سے مضمون یوں پیدا کرتے ہیں۔

وہ رُخ کہ رُوحِ فاطمہؑ جس پر پڑھے درُود رنگ اُس کا حادثہ سے بدلتا تھا زُود زُود

زردی کبھی عیاں تھی سفیدی کبھی نمُود تھا سرخ اشک سرخ سے نیلی سے تھا کبود

نیرنگ بے پدر کو زمانہ دکھاتا تھا
اک رنگ منہ پہ آتا تھا اک رنگ جاتا تھا

چھٹا مصرع اس لئے لاجواب ہے۔ کہ اس میں پوری مثل نظم فرما دی ہے۔ ع اک رنگ منہ پہ آتا تھا اک رنگ جاتا تھا۔ انتہائی تشویش و اضطراب و مصیبت میں آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے اور اُس حالت کو یوں ہیں بولتے ہیں۔ کثرت سے بولنے کے سبب اب یہ مثل ہو گئی ہے مثل کو چاروں مصرعوں میں چار رنگوں {زرد۔ سفید۔ سرخ۔ کبود (نیلا)} کو بیان کر کے اصل کر دکھایا ہے۔ شاعری کی معراج کمال یہ ہے۔ کہ ایسے مثل میں سے مضمون پیدا ہو۔

نسیم لکھنوی
پانچ انگلیاں
اور پنجتن پاک

(۲) نسیم لکھنوی کی گلزار نسیم لاجواب مثنوی میں یہ مشہور شعر قلم کی نسبت نعت و منقبت میں ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ؎

پانچ اُنگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنجتنؑ ہے

مرزا صاحب کے بیت مندرجہ تحت میں قلم کا مضمون نہیں ہے۔ پانچ انگلیوں اور پنجتنؑ پاک کا مضمون ہے۔ مگر بالکل نیا۔ اُس سے بالکل علیحدہ۔ یہ علم نہیں کہ مرزا مرحوم کا شعر مقدم ہے یا نسیم آنجہانی کا۔ ؎

پانچ اُنگلیوں سے ہم نے چُنا ایک بات کو بس پنجتنؑ کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

ہاتھ پھیلانا سوال کرنے کے معنی پر اردو کا روزمرہ ہے۔ یعنی پانچ اُنگلیاں خدا نے اس لئے بنائی ہیں۔ کہ ہم پنجتن ؑ سے سائل ہوں۔ اور کسی دروازہ پر نہ جائیں۔ کسی سے نہ مانگیں۔ اللہ اللہ کیا زور تخئیل ہے۔ کتنا معقول شاعرانہ استدلال ہے۔ جس کو شعر احسن تعلیل کہتے ہیں ؞

(۳) جناب میر تقی میر مرحوم فرماتے ہیں:۔ (قطعہ)

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو ۔۔۔ جاہ و ثروت کا میسّر سر و ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ مَیں ذلت و خواری کے سبب ۔۔۔ کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

مرزا صاحب کہتے ہیں:۔ (رباعی)

سر کو سرگشتہ بہر ساماں نہ کیا ۔۔۔ دل کو پئے جمع زر۔ پریشاں نہ کیا
ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں ۔۔۔ احساں کیا جو ہم پر احساں نہ کیا

ناظرین! دیکھئے مضمون کو الفاظ کی خوبی۔ بندش کی چُستی و صفائی۔ زبان کی لطافت بیان کی متانت نے کس اوج پر پہنچا دیا ہے۔ سر کے ساتھ سرگشتہ اور پھر اُس کے برابر سامان کا لفظ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سر و ساماں بولتے ہیں۔ اُسی کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ پھر دل کو روپیہ جمع کرنے کے واسطے پریشان کرنا کیا عمدہ بات ہے۔ جمع و پریشان باہم ضدین ہیں۔ صنعت تضاد اور اس بے تکلفی کے ساتھ ہے۔ کہ یہاں جمع و پریشان کے سوا دُوسرے لفظ ہی نہیں لا سکتے۔ پھر چرخ کا شکریہ بھی ہے۔ تو نئے انداز کا۔ کہ ہم پر تو نے یہی احسان کیا۔ کہ کوئی احسان نہ کیا۔ تو احسان کرتا۔ تو سر و سامان اور مال فراہم ہوتا۔ اُس سے سر کو سرگشتگی اور دل کو پریشانی ہوتی۔ بے زری اور مفلسی کی بدولت ان تمام مصیبتوں سے بچے۔ کیسی بے تکلف نظم ہے۔ طبیعت کی روانی اور شاعر کے قدرتی شاعر ہونے کا انہیں باتوں سے پتہ چلتا ہے ؞

(۴) جناب میر تقی میر مغفور کے مشہور بہتر نشتروں میں سے شعر تحت

ایک لاجواب نشتر ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

سب لگئے ہوش و صبر و تاب و تواں لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

اب مرزا دبیر مرحوم کی رباعی سُنئیے :۔

عابدؑ کہتے تھے آسرے ٹوٹ گئے باغِ چمنِ فاطمہؑ سب لوٹ گئے
خواب و خورش و تاب و تواں صبر و قرار سب ہم سے چھٹے جب سے پدر چھوٹ گئے

حق یہ ہے۔ کہ میر تقی مرحوم کا شعر نشتر ہے۔ مرزا مرحوم کی رباعی خنجر ہے۔ جس میں درد بڑھا ہُوا ہے۔ شاید اس کا یہ سبب ہو۔ کہ اہل بیتؑ کی مصیبتیں تمام دُنیا کی ہر قسم کی مصیبتوں سے بدرجہا بڑھی ہُوئی ہیں۔ پس اُن کے بیان میں بھی (شاعر مقبول کی زبانی) وہی اثر ظاہر ہو گیا +

(۵) خاقانی ہند ذوق دہلوی نے ایک لاجواب مطلع کہا ہے وہ یہ ہے

تو جان ہے ہماری گر جان ہے تو سب کچھ ایمان کی کہینگے ایمان ہے تو سب کچھ

واقعی بقول صفیر بلگرامی سب کچھ کا تعلق بس جان و ایمان دونوں ہی چیزوں سے ہو سکتا ہے

دبیر الملک جناب غالب ایک نئی ادا سے اس کے قریب قریب فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ اُس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

واقعی بقول خواجہ حالی صاحب اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) اگر جان عزیز رکھونگا تو وہ (بُت) ایمان لے لیگا۔ (۲) اُس پر جان قربان کرنا عین ایمان عاشق کا ہے

حضرت دبیر مرحوم کے محبوب و ممدوح دُنیا کے معشوقوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ وہ اپنے محبوب حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں۔ ؎

ایمان کو یہ جانتے تھے جان سے پیارا اور حضرت شبیرؑ کو ایمان سے پیارا

جان سے بڑھ کر ایمان اور ایمان سے زیادہ خدا کے پیارے امام حسینؑ کو سمجھنا ایسا

خاقانی ہند ذوق ۔ محبوب د جان و ایمان دبیر الملک غالب

اعلےٰ مضمون ہے۔ جس کی داد صرف اہل ایمان دے سکتے ہیں۔

(۶) پرانی روشوں کے ناسخ اور زبان کو باقاعدہ بنانیوالے جناب ناسخ مرحوم فرماتے ہیں۔

ماہ نو ہے مثل ابرو لیکن اُس کا رو نہیں　　ماہ کامل صورت رو ہے۔ مگر ابرو نہیں

اب مرزا مرحوم کی فکر و دماغ کو ملاحظہ فرمائیے۔ کس قدر مضامین کس بہیا خوبیاں سے نظم فرمائے گئے ہیں:۔

(۱) اس رخ کے مقابل کوئی اب رو نہیں رکھتا　　آئینہ کے رو ہے فقط۔ ابرو نہیں رکھتا
خوش رنگ ہے لالہ پہ یہ خوشبو نہیں رکھتا　　بو رکھتا ہے گل ان کی سی۔ پر خو نہیں رکھتا
دنداں ہیں صدف کے۔ لب خنداں نہیں دیکھے
غنچے کے دہن ہے دُرِ دنداں نہیں دیکھے

(۲) ایضاً

رو دار ہے خورشید پر ابرو نہیں رکھتا　　ابرو مہ نو رکھتا ہے پہ رو نہیں رکھتا
قد رکھتا ہے طوبےٰ پہ یہ گیسو نہیں رکھتا　　سنبل کے ہیں گیسو۔ قدِ دلجو نہیں رکھتا
گر آنکھ ہے نرگس کی تو بینائی نہیں ہے
غنچے کے دہن ہے تو یہ گویائی نہیں ہے

ایک دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں:۔

بو ہے گلِ جنت میں یہ رخسار نہیں ہے　　ایمن میں تجلّی ہے یہ دیدار نہیں ہے
قد رکھتا ہے طوبےٰ پہ یہ رفتار نہیں ہے　　شیریں لبِ کوثر ہے پہ گفتار نہیں ہے
آئینہ میں رو ہے یہ خطِ سبز کہاں ہے
غنچے کے دہن ہے نہ زباں ہے نہ بیاں ہے

اس سے معلوم ہوگا۔ کہ مرزا صاحب جس مضمون کو لیتے ہیں۔ اُس کے تمام پہلو اس خوبی سے

بیان فرماتے ہیں۔ کہ پھر کوئی مضمون آئندہ کسی شاعر کے لئے گویا باقی نہیں چھوڑتے۔ یہ جامعیت دُوسرے شعرا کے کلام میں کم نظر آتی ہے

مصافحۂ مرزا غالب مرحوم و مرزا دبیر مغفور

فصل ۲ دبیر و غالب میں مناسبتیں

مرزا غالب اور مرزا دبیر میں بہت سی مناسبتیں حالات و کلام میں مجھے نظر آتی ہیں۔ اور ایک دُوسرے کا قدردان و مداح تھا۔ ہمارے زمانہ کے مبصر سخن عالم علوم مشرقیہ و مغربیہ دستگیر اہل کمال جناب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر لکھنؤ کا یہ ارشاد کہ "اگر بلینک ورس (غیر مقفےٰ نظم) کا ہندوستان کے شاعروں میں (مثل شعرا یورپ کے) رواج ہوتا۔ تو سب سے بڑھ کر یہی دونوں شاعر (غالب و دبیر) کامیاب ہوتے۔ اور ان دونوں میں بھی غالباً دبیر کو زیادہ کامیابی ہوتی۔ مجھے بہت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اب مَیں ذیل میں چند مناسبتیں لکھتا ہُوں:۔

مناسبت قومی تخلص و خطاب

(۱) دونوں شاعر مغل ہیں۔ ایک کا تخلص دبیر دُوسرے کا خطاب دبیر الملک ہے +

دو بڑے شہر و ولادت نسبت و وفات

(۲) مرزا غالب اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہُوئے۔ دہلی میں جاکر رہے اور دفن ہُوئے۔ اسی طرح مرزا دبیر دہلی میں پیدا ہُوئے۔ لکھنؤ میں رہے اور پیوند زمین ہُوئے۔ ان دونوں شاعروں کی وجہ سے ہندوستان کے دو بڑے بڑے شہروں کو فخر و مباہات ہے +

عمر و تاریخ وفات شاعر ہر دو

(۳) مرزا غالب آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ ہجری کو پیدا ہُوئے۔ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ ہجری (۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء) کو تہتر برس اور قریباً چار مہینہ کی عمر پاکر (بقول جناب خواجہ حالی صاحب) انتقال فرمایا۔ غریب تاریخ وفات اور ۱۲۸۵ "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات ہے۔ مرزا دبیرؒ کی پیدائش ۱۱ جمادی الاول سنہ ۱۲۱۸ھ

کی ہے۔ وفات۔ ۳ محرم ۱۲۹۲ھ ہجری کو ہوئی۔ تہتر برس ۸ مہینے ۱۹ دن کی عمر پائی[1]
بخت دبیر سے سال ولادت اور آیۂ وَوَجَدَکَ عَائِلاً فَاَغنیٰ سے سال ہجری
وفات نکلتے ہیں۔ جو مؤلف حقیر نے نکالے ہیں +

(۴) مرزا غالب مرحوم انتہا درجہ کے رند مزاج سُنے جاتے ہیں۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مرزا دبیر مغفور بدرجۂ کمال متقی و پرہیزگار تھے۔ ع

خدا بخشے۔ ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں

غرض یہ ہے۔ کہ دونوں بزرگوار اپنے اپنے رنگ میں یکتے تھے +

(۵) **جلوہ خضر و سرور ریاض** کے حوالہ سے میں اُوپر لکھ چکا ہوں۔ کہ مرزا غالب مرزا دبیر مرحوم کے قدردان و مدّاح تھے۔ اور یہ فرماتے تھے۔ کہ مرثیہ گوئی حق دبیر کا ہے۔ دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ اسی طرح تحقیق طور پر مجھے معلوم ہؤا ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کی صحبت میں جب مرزا غالب مرحوم کا ذکر خیر ہوتا تھا۔ اور اُن کا کچھ کلام پڑھا جاتا تھا۔ تو مرزا صاحب ایک ایک شعر کی تعریف و تشریح فرما کر بعض مرتبہ گھنٹوں وجد فرماتے تھے۔ اور اکثر فرماتے تھے۔ کہ ایسا قدرتی عالی دماغ شاعر ہندوستان تو کیا ایران و عرب میں بھی شاید ہی نکلے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء جب مرزا عباس بیگ مرحوم اودھ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو کر آئے اور لکھنؤ میں رہے۔ تو یہ بزرگوار[2] مرزا غالب مرحوم کے حقیقی بھانجے اور مرزا دبیر مغفور کے

[1] دبیر مغفور نے غالب مرحوم سے تقریباً چھ مہینے زیادہ عمر پائی۔ یہ قدرتی اشارہ ہے کہ وہ دینا رو کی طرح نہ تھے بلکہ بخت یا بخت گیا شاعر مقبول تھے۔

[2] یہ حالات کچھ میں نے اپنا نانا مرحوم سے کچھ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے سُن کر لکھتا ہوں۔ میں خود بھی ڈپٹی عباس بیگ کی خدمت میں اپنے نانا مرحوم کے ساتھ بارہا گیا ہوں۔ ۱۰ محرم کی مجلسوں میں جو ۸ بجے سے ۱۲ بجے رات تک ہوتی تھی اپنے نانا کی پیش خوانی میں کبھی کبھی سلام بھی میں نے پڑھا ہے۔ افسوس کیا صحبتیں تھیں اور کیا صورتیں تھیں + ۲ مؤلف حقیر۔

معتقد خاص تھے۔ شعر کہتے بھی تھے (غالباً اپنے ماموں کے شاگرد تھے) اور جیسا کہتے تھے اُس سے بہتر شعر کے حسن و قبح کو سمجھتے تھے۔ اکثر مرزا صاحب کے روبرو مرزا غالب مرحوم کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اور مرزا صاحب حسب مذکورہ داد دیتے تھے۔ ان کے نام جو خطوط مرزا غالب مرحوم بھیجتے تھے۔ افسوس کہ وہ نہ عودِ ہندی نہ اردوے معلّٰی میں چھپے۔ اُنھیں خطوں میں برابر مرزا دبیر کو سلام اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہوا فقرہ بطور پیام وہ ضرور تحریر فرماتے تھے۔ ان کے فرزند مرزا فیاض بیگ مرحوم حاتم تخلّص (جو منصف بھی ہو گئے تھے) جناب استاذی حضرت اوج مدظلہٗ کے شاگرد تھے۔ جن کے بعض سلام دفتر ماتم میں چھپے ہیں[۱]۔

فیاض بیگ حاتم مرحوم

خواجہ حالی صاحب یادگار غالب میں سیّد اکبر مرزا صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اس شعر غالب مغفور پر ؎

یادگار غالب سے حکایت

ہیچ از کسے نخواستہ الا گریستن مزدِ شفاعت وصل صبر و خوں بہا[۳]

مصرع لگائے تھے۔ مگر اُن کو خود پسند نہ آئے۔ اور یہ کہا۔ کہ جس رتبہ کا یہ شعر ہے۔ ویسے مصرع نہیں لگ سکتے"۔ ہر چند مَیں نے لکھنؤ میں جناب مرزا اوج قبلہ یا نانا مرحوم یا اور کسی اور بزرگ سے یہ روایت نہیں سُنی۔ مگر مرزا دبیر مرحوم کی عادات و خلاق کی رُو سے مَیں کہتا ہوں۔ کہ یہ حکایت بالکل سچی ہے۔ درحقیقت یہ شعر بڑے پایہ کا ہے۔ اور مرزا دبیر ایسے ہی قدر دان اور صاف گو تھے۔ اگر اس پایہ کے مصرع نہ لگ سکے ہونگے۔ تو ضرور صاف صاف کہدیا ہوگا۔ کہ یہ صاف گوئی بھی کامل کی دلیل کمال ہے۔ کہ وہ اپنے عجز طبیعت کے بیان میں کبھی نہیں شرماتا[۲]۔

---

[۱] مَیں نے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ جا کر ان خطوط حضرت غالب مرحوم کو ان کے خاندان میں تلاش کیا۔ مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔ ورنہ ان خطوں سے بہت سی باتیں حیات دبیر کے اندراج کے قابل معلوم ہوتیں۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] دیکھئے معیار میں جناب شیخ نصیر الدین محقق نے جس موقع پر فوائد علم عروض کو بیان فرمایا ہے۔ وہاں لکھتے ہیں کہ علم عروض کے پڑھنے سے شخص [illegible] بیان فرما دیا ۱۲ مؤلف

دقیق و سلیس ہر قسم کا کلام

(۶) جس طرح مرزا غالب مغفور کا کلام متضاد دقیق و سلیس دونوں قسم کا موجود ہے۔ اُسی طرح مرزا دبیر مبرور کا دونوں طرح کا کلام موجود ہے۔ جب وہ دقیق کلام کہتے ہیں۔ تو بڑے بڑے عالم گھنٹوں سوچا کرتے ہیں۔ اور ایسے ویسے کج پسندیہ تو سمجھتے ہی نہیں۔ بلکہ اُس کو مہمل بتا دیتے ہیں۔ المرء یقیس علیٰ نفسہٖ (ہر شخص اپنے نفس پر قیاس کرتا ہے) کی مثل کو اصل کر دکھاتے ہیں۔ اور جب وہ سلیس کلام کہتے ہیں۔ تو اُس سے بڑھ کر نظم تو نظم دُوسرا نثر بھی ایسی عام فہم نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ دونوں طرح کے نمونے میں نے دونوں جلدوں (بالخصوص جلد دوئم) میں بکثرت پیش کر دئے ہیں۔

کلام

مصیبت میں شکایت

(۷) مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گذرے غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

انتہا کی شوخی و بیباکی اس شعر میں ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت ہی افلاس اور تنگی و مصیبت کے وقت دل مجروح سے (یہ شعر) نکلا ہے۔ اسی کے قریب قریب فارسی میں بھی (مگر مہذب طرز میں) فرماتے ہیں۔ ؎

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت ٭

اب مرزا دبیر مغفور کے شعر کو دیکھئے۔ کہ اصل مضمون تو یہی ہے۔ مگر کس قدر مہذب طرز میں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شوخی و بیباکی کا شائبہ بھی نہیں۔ جناب فاطمہ صغرےٰ اپنی نانی ام المومنین جناب ام سلمہ سے اپنی مصیبتیں بیان کرتے کرتے فرماتے ہیں۔ ؎

دن زیست کے باقی ہیں سو رو رو کے بھرونگی مرتے ہوئے دُنیا کا میں کیا یاد کرونگی

٭ اس شعر کا ماخذ شاید یہ شعر امام زین العابدینؑ کا ہو جبکو وہ جناب شام کے رستے میں پڑھتے اور اونٹوں کی مہار کھینچے جاتے تھے۔ اقاد ذلیلا فی دمشق کانی۔ عبد من الزنج غاب عنہ نصیر۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ میں اس ذلت سے مقید ہوں جیسے کوئی زنگبار کا غلام ہو غلام بھی ایسا کہ جس کا آقا سر پر سے اُٹھ گیا ہو۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

دونوں اُستادوں کے (اُردو کے) شعروں میں جو باریک فرق ہے۔ وہ ہونا چاہئے۔ یعنی غالب مرحوم نے غزل میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ اس لئے ویسے الفاظ ہیں۔ جو غزل کی شوخی و بیباکی کے مناسب حال ہیں۔ مرزا دبیر مرحوم نے مرثیہ میں یہ مضمون ادا کیا۔ وہ ایسے الفاظ متین لائے۔ جو مصیبت زدہ کی زبانی لانے لازم تھے۔ پھر اُس پر طرّہ یہ کہ خاص عورتوں کے محاورے و روزمرّہ کا خیال رکھا۔ کہ "دن زیست کے رو رو کے بھرنا" شریف عورتیں ہی زیادہ تر بولتی ہیں۔ یہ وہ نکات شاعری ہیں۔ جن کو شاعر اہل زبان خوب سمجھ سکتے ہیں +

(۸) غالب مرحوم۔ بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ + لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر۔

دبیر مغفور۔ گو گوہرِ سخن کا مرے جوہری نہیں + یوسفؑ کا کیا ضرر ہے اگر مشتری نہیں۔

غالب مرحوم تو کہتے ہیں۔ کہ جب کبھی لائق خریدار ملتا ہے۔ تو کلام کے ساتھ میں خود بھی بک جاتا ہوں۔ مگر دبیر فرماتے ہیں۔ میرے گوہرِ مضمون کا کوئی مشتری ہی نہیں۔ پھر بھی کچھ پروا نہیں۔ اور عزّتِ کلام میں کمی و فرق نہیں آسکتا۔ جیسے حضرت یوسفؑ کے خریدار نہ ہونے سے اُن کے حسن و عظمت کا کچھ نقصان نہیں +

(۹) مرزا غالب اپنی بے سروسامانی پر اِن لفظوں میں شکرِ خدا کرتے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

مرزا دبیر الفاظ ذیل میں اپنا استغنا ظاہر کرتے ہیں۔

مدّاح ہوں میں امامِ بے سر کا دبیر — سامان کیسا۔ کہ سر بھی درکار نہیں

(۱۰) حضرت غالب اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں "میں بھی تمہارا ہمدرد ہوں۔ منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو میری وہ پھوپھی کہ میں بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ گویا نو آدمی میرے مرے۔ ۳ پھوپھیاں ۳ چچا ایک باپ ایک دادی ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں یہ جانتا تھا۔ کہ ۹ آدمی زندہ ہیں۔ اُس کے مرنے سے میں نے جانا۔ کہ ۹ آدمی مر گئے +

یہی خیال جناب دبیر مرثیہ میں لاش علی اکبرؑ پر اُن کی والدہ کی زبانی ظاہر کرتے ہیں مگر صرف ایک بیت میں۔ یہ اختصار بھی قابل داد و لائق دید ہے۔

کوئی نہ رہا کنبہ میں میرے علی اکبرؑ
سب مر گئے اک مرنے سے تیرے علی اکبرؑ

(۱۱) غالب مرحوم فرماتے ہیں۔

قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب
ندیدہ کہ سوئے قبلہ پشت محراب ست

مرزا دبیر سراپائے ممدوح کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

دیکھا جو مہِ نو نے اس ابرو کے شرف کو
کعبہ کی طرف پشت کی۔ رُخ ان کی طرف کو

اور خاص محراب کی کجی کا مضمون بھی مرزا دبیرؒ کا دیکھنے سُننے کے قابل ہے۔

شکوہ بے جا ہے کج نہادوں کا دبیر
مسجد میں بھی رُو بقبلہ محراب نہیں

مطلب یہ ہے۔ کہ جس کی بُنیاد ہی ٹیڑھی ہو۔ وہ کبھی سیدھا نہیں ہو سکتا۔ جیسے محراب مسجد کہ اُسکی نیو ہی ٹیڑھی (کج) اُٹھائی گئی ہے۔ پس اُس کا مُنہ قبلہ کی طرف کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہی حال کج نہاد آدمیوں کا ہے۔

(۱۲) مرزا غالب مرحوم فارسی کے ایک مخمّس میں فرماتے ہیں۔

رسمیست خسروانہ کہ شاہاں بروز بار
گیرند کار خویش ز دستور و پیشکار
دستور حق نبیؐ و خداوند۔ دستیار
میگویم و ہر آئینہ گویم ہزار بار
کار خدا بعرصۂ محشر کند علیؑ

ان کا تو ادّعا ہے۔ کہ قیامت میں خدا کا کام جناب امیرؑ کرینگے۔ مگر مرزا دبیرؔ مغفور ذیل کی رباعی میں فرماتے ہیں۔ کہ وہ جناب دُنیا میں بھی خدا کا کام کرتے ہیں۔

حل عقدوں کو شاہ ہل اتے کرتے ہیں
حق بندگیٔ حق کا ادا کرتے ہیں
مارا بھی۔ جلایا بھی۔ نصیری کو دبیر
بندے ہیں مگر کار خدا کرتے ہیں

(۱۳) جناب غالبؒ خاصان خدا کی شان میں ایک فارسی کے قصیدہ میں فرماتے

محراب
ابروئے ممدوح

خاصان خدا
کی شان عالی

ہیں۔ سہ

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند پاے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
(سالکان طریقت)

ہرچہ در دیدہ عیانست۔ نگاہش دارند ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند

قطرۂ را کہ ہر کہ آئینہ گہر خواہد بست صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

(۱) یعنی خاصان خدا۔ سالکان طریقہ رضا جب راہ چلتے چلتے اپنے تلووں میں چھالے دیکھتے ہیں۔ تو وہ اپنے پاؤں کو ثریا سے اعلےٰ سمجھتے ہیں۔ (۲) آنکھوں میں ظاہر بظاہر جو دیکھتے ہیں۔ اُس کی لم کو پہنچ جاتے ہیں اور محفوظ رکھتے ہیں۔ دل میں جو کچھ ارادہ ہے۔ وہ چہرہ انسان کو دیکھ کر معلوم کر لیتے ہیں۔ (۳) جو قطرہ آئندہ **موتی** بنیگا۔ اُس کو چہرۂ دریا پر اس طرح دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے کسی کے منہ پر آبلہ ہو۔ اور وہ صاف نظر آئے ✦ یہ خدا کے خاص مقرب بندوں کی **شان** ہے سبحان اللہ کس لطافت و فصاحت سے بیان فرمایا ہے۔ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور کس قدر بلیغ مضامین ہیں۔ اللہ اللہ ✦ اب **مرزا دبیر** مغفور کی اردو کی نظم دیکھئے۔ وہ **خاصان خدا** کے اختیارات کے ساتھ ساتھ اُن کی **مجبوری** کی شان بھی دکھاتے ہیں۔ مگر اُس مجبوری میں اُن کی **عظمت** نمایاں ہے۔ یہ دُوسرا کمال ہے **معصوم** کی مدح شاید اس سے بہتر ہو سکے :۔

قدرت یہ ہے کہ غیب کے اسرار دیکھ لیں اپنے محل سے **خلد** کا گلزار دیکھ لیں
چیونٹی کی یہ اندھیرے میں رفتار دیکھ لیں آنکھوں میں نبض مردم بیمار دیکھ لیں
قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی
لیکن نہ ہے۔ نہ ہوئیگی۔ طاقت گناہ کی

یہ بند امام حسینؑ کی مدح و منقبت میں فرمایا ہے۔ اس کے دُوسرے مصرع میں اُس واقعہ مشہور کی طرف اشارہ ہے۔ کہ امام مظلوم و معصوم نے اپنے خدا پرست صحابیوں کو روز عاشورا ۶۱ھ صبح کی نماز کے بعد اُن کے جنت میں مکانات رفیع دکھائے تھے۔ جس سے اُن کا جوش ایمان زیادہ ہو گیا تھا۔ کس خوبی سے اختیارات بیان کر گئے ہیں۔ کہ ہر چیز پر اُن کو قادر مطلق نے قدرت بخشی ہے

مگر گناہ کرنے کی اُن میں طاقت وقوت نہیں ہے۔ وہ اُن کا اختیار تھا۔ یہ (**عصمت**) گویا جبر ہے۔ کیا اردو میں ایسی نظم او رجگہ آپ کو مل سکتی ہے؟

(۱۴) **مرزا غالب** مرحوم کا یہ مشہور شعر مجھے بہت پسند ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب اُن کے مخالفین اُن کے بعض **دقیق** کلام کو سُن کر کہتے تھے۔ کہ یہ **بے معنی** ہے۔ اُس وقت مستغنی المزاج مرزا صاحب یہ شعر پڑھ کر اپنی جان چھڑاتے تھے۔ ؎

ملا کا طالب نہیں

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اُس قدر تو نہیں۔ مگر کبھی کبھی بعض کلام مرزا دبیر مغفور کو بھی سنکر اُن کے کم علم حریف کہتے تھے۔ کہ اس کلام میں معنی پہنائے جائیں۔ جب معنی ہوں۔ مرزا صاحب موصوف اُن کو ذیل کے بند میں جواب دیکر اپنی **استغنا** کی شان دکھلاتے ہیں:۔

طالب نہیں صلہ کا امیر و فقیر سے دل ہے غنی ولائے جناب **امیرؑ** سے

ترجیح ہے عطارد گردوں سریر سے معجز بیاں ہوں قدرت ربّ قدیر سے

سایہ میں **بُوتراب** کے یہ خاکسار ہے

کیسا **ہُما**۔ فلک کے بھی سایہ سے عار ہے

مطلب یہ ہے۔ کہ مجھے نہ کسی امیر سے غرض ہے کہ وہ کچھ دے۔ نہ فقیر سے مطلب کہ وہ تعریف کرے۔ اپنے ممدوحؑ سے کام ہے۔ مشہور ہے۔ کہ ہما کا سایہ جس پر پڑجاتا ہے۔ وہ بادشاہ ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ کسی بادشاہ اور ہمائے بادشاہ گر کا تو کیا ذکر ہے۔ مجھے آسمان کے سایہ سے بھی عار ہے۔ بس سایۂ حضرت ابوترابؑ درکار ہے۔ یہ اُس استغنا کی تصویر ہے۔ جو مرزا مرحوم کی طبیعت میں تھا۔

عبادت خالص

(۱۵) **غالب** مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

مطلب یہ ہے۔ کہ بندہ جو کچھ خدا کی عبادت کرے۔ وہ اس **لالچ** سے نہ کرے۔ کہ اس کے صلہ

میں جنّت پاؤنگا - اس لئے بہتر ہے - کہ بہشت ہی کو لیکر دوزخ میں ڈال دو - تاکہ بہشت کی نعمتوں کی ہوس ہی دل میں نہ ہے - اگرچہ بظاہر مرزا غالب صاحب نے یہ مضمون طرز بے باکانہ میں ادا فرمایا ہے مگر مضمون شعر کا عارفانہ ہے - اس کا ماخذ جہاں تک میرا خیال ہے - جناب امیرؑ کا یہ ارشاد ہے - جو نہج البلاغہ مطبوعہ مصر کے صفحہ ۱۹۷ (کتاب مراسلات و کلمات حکمت حق) پر حسب ذیل درج ہے :- (۱) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَغْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ التُّجَّارِ وَ (۲) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَهْبَةً فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْعَبِيْدِ وَ (۳) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ شُكْرًا فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْاَحْرَارِ - خلاصہ اس کلام بلیغ کا یہ ہے - کہ عبادت کرنیوالوں کی تین قسمیں ہیں - (۱) ایک گروہ حصول ثواب کے واسطے عبادت خدا کرتا ہے - یہ سوداگروں کی سی عبادت ہے - کہ عبادت کا بدلا (ثواب) چاہتے ہیں - (۲) دوسرا فرقہ عابدوں کا خدا کے عذاب سے ڈر کر عبادت خدا کرتا ہے - یہ غلاموں کی عبادت ہے - (۳) تیسری جماعت ایسی ہے - جو خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے عبادت میں مصروف ہے - یہ آزادوں کی عبادت ہے - اس آخرالذکر عبادت کا کیا کہنا - جن کی عبادت محض خالصاً لوجہ اللہ ہے - یہ شان محمدؐ و آل محمدؐ کی عبادت کی ہے +

مضمون نہج البلاغہ

مرزا دبیر مرحوم اسی عبادت امام حسینؑ کی نسبت کہتے ہیں - ؎

خوف سقر - نہ شوق بہشت علا کا ہے
طالب وہ دو جہاں میں فقط اک خدا کا ہے

بحرین اور کلام بلیغ و فصیح کے بے بہا موتی

یعنی کلام دبیرؒ و انیسؒ کا مقابلہ

فصل ۳ کلام دبیرؒ و انیسؒ کا مقابلہ

قبل اس کے کہ میں چند نمبروں میں ان دونوں کاملوں کا کلام لکھوں یہ لکھنا واجب سمجھتا ہوں - کہ اکثر کلام میں ان دونوں اُستادوں کی روش بمصداق مصرع مشہور

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ الگ الگ نظر آتی ہے۔ میر صاحب کا زیادہ تر خیال و کمال یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلام عام فہم سلیس فصیح ہو۔ اور ہر بات کو خوب پھیلا کر بیان کیا جائے۔ مرزا صاحب کا جوہر یہ ہے۔ کہ بڑے سے بڑا مضمون تھوڑے (مختصر) لفظوں میں نظم ہو۔ کلام میں مضامین کی بارش ہو۔ تشبیہات و استعارات و ضائع سے زیور کلام مرصع ہو۔ بلاغت کے تمام اصول پر نظر رہے۔ اسی سبب سے اُن مرحوم کے اکثر کلام کو ملک کے اہل کمال نے بلیغ مانا ہے۔ مگر از بسکہ وہ مرحوم ہر رنگ میں کہتے ہیں۔ اور اُن کا دعوے بھی یہی ہے۔ کہ ؎

اک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

پس جب کبھی وہ فصیح و سلیس کلام نظم فرماتے ہیں۔ اور واقعات کو پھیلاتے ہیں۔ تو سلاست و فصاحت اُس پیمانہ پر نظر آتی ہے۔ جس کو عام لوگ میر صاحب کا خاص رنگ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جب کبھی جناب میر صاحب مضمون آفرینی پر کمر باندھتے ہیں۔ تو مضامین تازہ کے دریا بہا جاتے ہیں۔ بلاغت کی داد دیتے ہیں۔ جس کو اہل سخن دبیر کا خاص رنگ سمجھے ہوئے ہیں۔ پس جہاں کہیں بمصداق آیہ کریمہ مرج البحرین یلتقیان یہ دونوں عظیم الشان دریا ملے ہیں۔ اُسی مقام بحرین سے یہ چند بے بہا موتی میں نے چن لئے ہیں۔ جو خدمت ناظرین میں پیش کش کرتا ہوں۔

یہ بھی کہدوں۔ کہ بعض معاصرین کی طرح میں نے یہ نہیں کیا۔ کہ ایک کا چست۔ دوسرے کا سست کلام تلاش کر کے درج کیا ہو۔ خاص کر میر صاحب کا وہ چیدہ و چست کلام لیا ہے۔ جس کو میر احسن صاحب مؤلف واقعات انیس یا مولوی اشہری صاحب صاحب حیات انیس۔ یا مولوی شبلی صاحب یا میرے عنایت فرما لالہ سری رام صاحب دہلوی ایم۔ اے مؤلف تذکرہ لاجواب خم خانہ جاوید نے انتخاب

عام طرز کلام دبیر و انیس میں فرق

کلام انیس جو انتخاب

فرمایا ہے۔ پس اُس کلام (میر صاحب) کا چیدہ و عمدہ ہونا یقینی ہے۔ اُس کے مقابلہ پر کلام مرزا مرحوم کا انتخاب ہے۔ جو مجھ ایسے بے بضاعت و کم فرصت نے کیا ہے پس اس بنا پر ممکن ہے۔ کہ کوئی مرزا صاحب کے معتقد مجھ سے کشیدہ ہو جائیں۔ تو مَیں اُن حضرات سے عذر خواہ ہُوں۔ اور میری کم فرصتی و بے لیاقتی غالباً میری سفارش کریگی۔ اور کہیگی۔ العذر عند کرام النّاس مقبول۔ یہ بھی عرض کردوں۔ کہ یہ کتاب مرزا صاحب کی لائف ہے۔ پس اس میں کلام انیس مرحوم بمنزلہ مہمان ہے۔ اور مہمان کی خاطر داری واجبات سے ہے۔ اس لئے ہر جگہ مَیں نے اوّل کلام میر صاحب کو لکھا۔ مرزا صاحب کو میر صاحب سے انس قلبی تھا جس کا ثبوت تاریخ وفات انیس (مصنفہ دبیر) سے بھی ملتا ہے۔ پس اس خیال سے مجھے امید ہے۔ کہ مرزا صاحب کی رُوح بھی عمدہ کلام میر صاحب اوّل لکھ دینے سے خوش ہوگی۔ اور بھی کوئی صاحب تلامذہ یا معتقدین میں سے غالباً مجھ پر اس باب میں بھی عتاب نہ فرمائینگے۔ مَیں اس سے بہت زیادہ کلام ہر قسم و ہر موقع کا دونوں صاحبوں کا لکھ سکتا تھا۔ مگر یہ کتاب بہت بڑی ہو جاتی۔ اس لئے ان اہم نمونوں پر کفایت کرتا ہُوں۔ اگر زندہ رہا۔ اور کچھ سخن سنج آئندہ مجھ سے فرمائش کرینگے۔ تو ایک مستقل کتاب اس باب میں علیحدہ انشاء اللہ شائع کردُونگا۔

مناجات و استغنا

فصل ۳ مناجات و استغناء (رباعیات)

انیس رح	دبیر رح
(۱) عزت رہے یار و آشنا کے آگے	قطرہ کو رہین بحر مواج نہ کر
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے	شرمندۂ اہل دولت و تاج نہ کر
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں	یا رب قسم رُوح یداللہ تجھے
یہ ہات اُٹھیں جب تو خدا کے آگے	اُس ہات کو اس ہات کا محتاج نہ کر

آخری وقت خدا کا سامنا

آخری وقت خدا کا سامنا

انیسؒ

(۲) آخر ہے حیات کوچ کرتا ہوں میں
رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں
اللہ سے لَو لگی ہوئی ہے میری
اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں

دبیرؒ

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

لکھنؤ کی شان دار مجلسیں

لکھنؤ کی شان دار مجلسیں

حقیر کو اُن بعض مجالس عزا کی زیارت و شرکت کا فخر حاصل ہے جن میں مرزا صاحب یا میر صاحب پڑھتے تھے حقیقت میں سامعین کی وہ کثرت ہوتی تھی کہ بعض آدمیوں کو زانو بدلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ سننے کو آتے تھے۔ دونوں کامل اس کثرت سامعین مجلس کی تصویر حسب ذیل رباعیوں میں کھینچتے ہیں:۔

انیسؒ

(۳) امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
ماشاءاللہ چشم بد دُور۔ انیس
مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

دبیرؒ

ہاں مجھ کو بچھانا تھا ضرور آنکھوں کا
اس پردے میں تھا یہ سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ
آنکھوں کے عوض بچھاؤں نور آنکھوں کا*

(۴) دُنیا بے حقیقت ہے

دُنیا بے حقیقت ہے

(ایک ردیف و یکساں قافیئے)

* نور آنکھوں کا کلام ہے جو نورِ چشم کی طرح آدمی کو عزیز ہوتا ہے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بس کلام سناؤں۔

دبیرؒ	انیسؒ
کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا باقی سامانِ عیش فانی نکلا چاہا تھا کہ ہات دھوئیں دُنیا سے دبیر اتنا بھی نہ اِس کوئیں میں پانی نکلا کھانے کا ذائقہ زبان تک ہے پیٹ میں پہنچکر پلاؤ۔ زردہ اور جوار سب یکساں ہے۔ دُوسرے معنی مصرعِ اوّل کے یہ ہوئے۔ کہ طعام لذیذ کی بس زبانی تعریف ہوتی ہے۔ اور کچھ حاصل نہیں	راحت کا مزہ عدوِ جانی نکلا دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا پیاسے رہے آکے چاہ دُنیا پر انیس نکلا بھی۔ کبھی تو شور پانی نکلا جتنی کوشش راحت اُٹھانے کے لئے کی تھی اُتنا ہی جد وجہد میں رنج اُٹھایا۔ کبھی کسی کام میں کامیابی بھی ہُوئی۔ تو ناقص طور پر ہُوئی۔ آخرِ کار نامراد دُنیا سے چلے +

باقی ہر چیز فانی ہے۔ دُنیا عجب مقام ہے۔ یہاں رہ کر اگر کوئی تارک دُنیا بھی ہونا چاہے۔ تو نبھ نہیں سکتی۔ اور دُنیا کو چھوڑ بھی نہیں سکتا +

حضرت حُرؑ

(۵) حال خبر مآل حضرت حُرؑ

ردیف دونوں رباعیوں کی ایک ہے مگر قافئے جدا جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

دبیرؒ	انیسؒ
حُر کو کیا بختِ کبریا نے بخشا یہ نام اُسے بختِ رسا نے بخشا جب عُذر گنہ کرتا تھا کہتے تھے حسینؑ مَیں نے بخشا مرے خُدا نے بخشا	جب حُر کا گنہ شاہِ اُممؑ نے بخشا قطرے کو شرف بحرِ کرم نے بخشا گردُوں سے ندا آئی کہ اے سبطِ نبیؐ تُو نے جسے بخشا اُسے ہم نے بخشا

رباعیاں دونوں اپنی اپنی طرز میں اچھّی ہیں۔ میر صاحب نے گویا خود زبان قدرت سے حضرتِ حُرؑ کو معافی کی سند دلوادی ہے۔ مرزا صاحب نے حُر کے نام میں سے ایک بات نکالی۔ کہ یہ نام بختِ رسا

نے بخشا جس کے معنی ہی آزاد کے ہیں۔ چوتھے مصرع میں کمال کر دیا ہے۔ کہ پُورا محاورہ نظم فرما دیا ہے۔ جب کوئی عُذر تقصیر کرتا ہے۔ تو جواب میں معافی دینے والا یہی کہتا ہے۔ مَیں نے بخشا مرے خدا نے بخشا۔ اس کو نثر کرنا چاہو۔ تو نہیں ہو سکتی۔ یہی لفظ رہینگے۔ اس کو **سہل ممتنع** کہتے ہیں۔ کہ دیکھنے میں تو آسان ہے۔ جواب کہنا ہو۔ تو نہیں کہ سکتے +

(۶) فکر موت و مابعد موت

موت و مابعد موت

قافیے یکساں ہیں مگر ردیف مختلف مضمون مِلتا جُلتا ہے۔ دونوں رباعیاں دونوں کاملوں کے آخر عمر کے تبرکات سے معلوم ہوتی ہیں

انیسؒ	دبیرؒ
درد و الم ممات کیونکر گذرے	برزخ* کی صعوبات کٹے گی کیونکر
یہ چند نفس حیات کیونکر گذرے	تنہائی میں اوقات کٹے گی کیونکر
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیسؒ	غفلت میں دبیرؒ صبح پیری ہوئی شام
اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گذرے	دن رات ہُوا۔ رات کٹے گی کیونکر

(۷) موت سب جھگڑے فیصل کر دیتی ہے

موت سب جھگڑے فیصل کر دیتی ہے

ناظرین! مَیں آپ کی دعوت میں دو قسم کے طعام لذیذ پیش کرتا ہُوں۔ ایک بقول ادیب لاثانی جناب **مفتی میر عباس صاحب** اعلے اللہ مقامہ (کلام انیسؒ) شیریں اور دُوسرا (کلام دبیرؒ) **نمکین ہے**۔ ذیل کی رباعیوں کا مطلب وہی معلوم ہوتا ہے۔ جو اُوپر مَیں لکھ چُکا ہُوں۔ کہ مرنے سے سب جھگڑے جاتے رہینگے۔ مگر دونوں کاملوں نے ان دونوں رباعیوں میں ایک صنعت خاص رکھی ہے۔ جو **شاعر** کو ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ چوتھا **شگفتہ قافیہ** نہیں مل سکتا +

*برزخ بعد موت کے قیام قیامت تک کا سخت زمانہ ہے جسکو بحث تشویش و تردد کا زمانہ ائمہ اطہار نے فرمایا ہے + مؤلف

انیس رح	دبیر رح
وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا	مَیں لاکھ کہوں طبع سمجھنے کی نہیں
کشتی وہ ہُوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا	نافہم سے تُو جھ کو اُلجھنے کی نہیں
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس	ہستی کوتاہ۔ قصۂ حرص و دراز
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا	بے موت کے گُتھّی یہ سُلجھنے کی نہیں

(۸) معراج حضور سرورِ کائنات صلعم رُوحی فداہٗ

معراج

انیس رح	دبیر رح
دُنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں	معراج نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں
کس راز سے یہ خلق کے آگاہ نہیں	ہے نُور کا تڑکا شب تاریک نہیں
باریک ہے ذکرِ قُربِ معراجِ رسولؐ	قوسین کے قرب سے یہ ثابت ہے دبیر
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں	اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں

دونوں کاملوں نے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ میر صاحب کی رباعی میں ایک دقیق ولطیف اشارہ آیۂ فَاَوحیٰ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَا اَوْحیٰ کی طرف ہے۔ جس کی نسبت اپنے مقام پر لکھا ہو چکا ہے۔ کہ معراج کے باب میں ہے۔ اور جس کے ظاہری معنی یہ ہیں۔ کہ خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی فرمائی جو وحی فرمائی۔ اُس کو گویا عام لوگوں سے بیان نہیں فرماتا۔ میر صاحب کہتے ہیں۔ کہ یہ راہ ایسی باریک ہے جس میں سخن کو بھی راہ نہیں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ کیا تکلم ہوا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں (قاب قوسین او ادنےٰ کی مشہور آیت کی طرف اشارہ کر کے) کہ اس قرب (دو کمان) سے یہ ثابت ہوا۔ کہ اور کوئی بندہ اتنا مقرب خدا نہیں ہے۔ دُوسرے ایک لطیف معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ اللہ کے نزدیک اتنا کوئی صاحب عزت نہیں۔ یہ روزمرہ ہے۔ کہ اُس شخص کے نزدیک جتنا زید ہے اتنا اور کوئی نہیں یعنی دُوسرے کو یہ پایہ واعتبار وعزت ووثوق حاصل نہیں۔

(۹) پیری وطیاری سفرِ آخرت و بے ثباتیٔ دُنیا

سفر آخرت

انیسؔ

اب خواب سے چونک وقتِ بیداری ہے — لے زادِ سفر کُوچ کی طیاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر یاں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

دبیرؔ

آج آئے ہیں کل کُوچ کی طیاری ہے — غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دُنیا ہے عجب مقامِ حیرت نہ کھُلا — یہ عالمِ خواب ہے کہ بیداری ہے

ایضاً

اب نامِ خدا زباں پر جاری کر — غافل دمِ آخری تو ہشیاری کر
بالوں کی سیاہی پہ سفیدی آئی — لے صبح ہُوئی کُوچ کی طیاری کر

(۱۰) عبرت عالم

عبرت

انیسؔ	دبیرؔ
وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ	دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا
جو اَوج پہ تھے زیرِ زمیں آج ہیں وہ	کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
قرآں لاکھ لکھنے کے وقت جو کرتے تھے	برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زرّیں
اک سُورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ	تربت پہ نہ اُن کی شامیانہ دیکھا

(۱۱) مرنا ضرور ہے

مرنا ضرور ہے

انیسؔ	دبیرؔ
گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے	گر چاہتا ہے جینے کی خاطر۔ مرنا
پیمانۂ عمر ایک دن۔ بھرنا ہے	ہو کر شہِ مظلومؑ کا زائر مرنا

ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے
غافل تجھے اک روز سفر کرنا ہے

کوئی بھی رہا ہے درمیانِ دُنیا
اوّل مرنا دبیر آخر مرنا

(۱۲) بے ثباتی عالم

بے ثباتی عالم

انیسؒ

دُنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس باد مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

دبیرؒ

دُنیا زنداں ہے جائے آرام نہیں
گہوارہ۔ بجز گردش ایام نہیں
آنکھوں میں سفیدی و سیاہی کی طرح
جھپکی جو پلک۔ صبح نہیں۔ شام نہیں

(۱۳) عصائے پیری

عصائے پیری ۱۴

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے
ہنگام یخ و برگ و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے

پیری سے جو دال قد میں خم اور ہُوا
دم تیز روِ ملک عدم اور ہُوا
سمجھو نہ عصا۔ سُوئے عدم جانے کو
دو پاؤں تو تھے۔ ایک قدم اور ہُوا

(۱۴) شاعرانہ خود ستائی (قافیہ و ردیف کی مطابقت)

تفاخر شاعرانہ

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
مَیں باعث نغمۂ سنجی بلبل ہُوں
کھولے نہ کبھی مُنہ جو زباں بند کروں

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلّاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن
کھُل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

(۱۵) عزمِ زیارت عتباتِ عالیات

عزمِ زیارت

انیسؒ

اب ہند کی ظلمت سے نکلتا ہوں مَیں
توفیق رفیق ہے تو چلتا ہوں مَیں
تقدیر نے بیڑیاں تو کاٹی ہیں انیسؒ
کیوں رُک گئے پاؤں ہات ملتا ہوں مَیں[۱]

دبیرؒ

گل ہو نہ ۔ چراغ عمر جلتے جلتے[۲]
ہوجائے نہ چھاؤں دھوپ ڈھلتے ڈھلتے
چلنا ہے تو چل جلد زیارت کو دبیرؒ
آ جائے نہ موت راہ چلتے چلتے

(۱۶) خاکساری کی طرح

خاکساری

انیسؒ

دل کو مرے شغل غمگُساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردُوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

دبیرؒ

بندوں پہ کرم ۔ حضرتِ باری کا ہے
مقدُور کسے شُکر گذاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہالِ خاکساری کا ہے

(۱۷) معرفت

معرفت

انیسؒ

گلشن میں پھرُوں کہ سیر صحرا دیکھُوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھُوں
ہر سُو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہُوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھُوں

دبیرؒ

خار و گل و بوستان و صحرا دیکھے
نیرنگ شب و روز کے کیا کیا دیکھے
اب قبرِ حسینؑ چل کے تُو دیکھ دبیرؒ
دُنیا دیکھی اور اہل دُنیا دیکھے

---

[۱] پاؤں ۔ ہات میں صنعت تضاد ہے ۔ مگر محض ۔ بے تکلف ۔ ایسی بے تکلف صنعت قابل داد ہے۔ اور اس صورت میں اثر کلام کا بڑھ جاتا ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] ناظرین! دیکھئے ۔ دوہرے دوہرے قافیئے کس بے ساختہ پن سے آئے ہیں ۔ اتنا قابُو زبان پر ہو۔ جب بے تکلف قافیہ (شاعر) لاسکتا ہے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

قبر

(۱۸) قبر

انیسؒ

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

دبیرؒ

گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھ کو — ڈھانپا جو کفن سے منہ۔ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش[۱] — جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

ایضاً

مر کر بھی نہ چین زیرِ افلاک ملا — اک تار کفن نہ گرد سے پاک ملا
اے خانہ خراب قبر! تیری خاطر — کھویا سبھی جو نقد جان کو تو کیا خاک ملا[۲]

(۱۹) قافیہ و ردیف یکساں مگر مضمون ایک دوسرے کے معکوس

اب میں ذیل کی دو رباعیاں دونوں کاملوں کی ایسی لکھتا ہوں۔ جن کا قافیہ و ردیف تو یکساں ہے مگر مضمون ایک دوسرے کے خلاف ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جو اپنے کمال کا دعوے کرتا ہے۔ اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ خالی اور ناقص ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ جو اہل جوہر ہیں۔ وہی اپنے کمال کا اظہار اور اس پردہ اظہار کمال میں شکر نعمت پروردگار کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ۔ فَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ کا مفہوم ہے۔ (کہ جب خدا تجھے نعمت دے۔ تو شکریہ وغیرہ کے ذریعہ سے اس کا اظہار کر) جو ناقص ہیں۔ وہ دعوے ہی کیا کر سکتے ہیں +

۱؎ قبر کی تلاش سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ بعض آدمی مدینہ منورہ یا کربلائے معلےٰ یا نجف اشرف یا مشہد مقدس میں قبر ملنے کی آرزو دل میں لے جاتے ہیں۔ اور جہاں کی مٹی ہوتی ہے۔ وہیں ملتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

۲؎ یہ رباعی نہ اب تک تقسیم ہوئی ہے نہ چھپی ہے۔ جناب استاذی حضرت اوج مد ظلہ نے کلام محفوظ میں سے بخشی ہے + ۱۲ مؤلف

دبیرؒ	انیسؒ
گنجینہ جسے ربِّ ہدا۔ دیتا ہے وہ دادِ عطیّۂ خدا۔ دیتا ہے خاموش حبابوں کے ہیں ظرف خالی دریا میں ہیں موتی۔ وہ صدا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ ظرف حباب خالی ہے۔ اس لئے وہ کچھ آواز نہیں دیتا۔ دریا میں موتی ہوتے ہیں وہ شور کرتا ہے ٭	رتبہ جسے دُنیا میں خدا۔ دیتا ہے وہ دل میں فروتنی کو جا۔ دیتا ہے کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ۔ اپنی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے مطلب ظاہر ہے۔ کہ خالی برتن کو بجاؤ۔ تو خوب آواز دیگا ٭

اظہار کمال

(۴۲) قبر

دو دو رباعیاں ایک ہی مضمون و یکساں قافیہ و ردیف میں دونوں کاملوں کی بالمقابل دیکھئے اور لطف سخن اٹھائیے

دبیرؒ	انیسؒ
اِک دن پیوندِ خاک ہونا ہوگا تنہا۔ تنہا لحد میں سونا ہوگا اِس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیرؒ جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا	آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا تنہائی میں آہ کون ہوئیگا انیسؒ ہم ہوئینگے اور قبر کا کونا ہوگا
بیدار نصیب کو جو ہونا ہوگا تو دامنِ کربلا میں سونا ہوگا ہم پاؤں فلک پہ بھی نہ رکھینگے دبیرؒ گر خاکِ شفا اپنا بچھونا ہوگا	فردوس ہر اک قبر کا کونا ہوگا مخمل ہمیں خاک کا بچھونا ہوگا راحت دُنیا میں غیر ممکن ہے انیسؒ آرام سے ہاں لحد میں سونا ہوگا

٭ پہلی رباعیاں دونوں کاملوں کی لاجواب ہیں۔ انیس تخلص نے جان ڈال دی ہے۔ کیا عمدہ تنہائی قبر کی تصویر کھینچی ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں تنہا کے مکرر آنے نے مصرع کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مضمون کیسا نفیس ہے۔ کہ "اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر۔ جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا"۔ واقعی قبر میں خاک ہی اوڑھنا ہی بچھونا ہے۔ طاب اللہ رمسہما ٭ ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۲۱) مدح شیریں سخنی

انیسؒ

کس مُنہ سے کہوں لائقِ تحسیں ہُوں مَیں
کیا لُطف جو گُل کہے کہ رنگیں ہُوں مَیں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہُوں مَیں

دبیرؒ

شیریں سخنی پہ مُوردِ تحسیں ہُوں
واللہ نہ عیب ہیں نہ نکتہ چیں ہُوں
سکتے میں ہے میرے سخن شیریں سے
شکر کا ہے کیا مُنہ جو کہے شیریں ہُوں[۱]

(۲۲) اہل بیت محمد مصطفےؐ کی تباہی

دشمن جو یزید ستم ایجاد ہُوا
محبُوبِ خدا کا باغ برباد ہُوا
افسوس ہے۔ کربلا میں گھر زہراؑ کا
ایسا اُجڑا کہ پھر نہ آباد ہُوا

باراں سے ہر اک خشک شجر سبز ہُوا
جو نخل چھٹا زیادہ تر سبز ہُوا
پر باغیوں نے گلشن شاداب بتُول[۲]
ایسا کاٹا کہ پھر نہ سرسبز ہُوا

(۲۳) زندہ درگور ہونے کو دونوں کامل طرح یکساں فاقیہ زبن بیان فرماتے ہیں

کس جسم پہ بل کروں کہ شہزور ہُوں مَیں
دیکھو کہ ضعیف صُورت مور ہُوں مَیں
تن پر یہ پڑی ہے گرد بازار کساد
ثابت ہوتا ہے زندہ درگور ہُوں مَیں

شیریں سخنی کے فن میں شہزور ہُوں مَیں
پر بخت یہ کہتا ہے ارے شور ہُوں مَیں
اِس ہند میں طوطی قفس کی مانند
خوبی سے زباں کی زندہ درگور ہُوں مَیں

۱۔ اس مصرع کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ شکر کو خدا نے قوت ناطقہ ہی نہیں بخشی پھر وہ دعویٰ کیونکر کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شکر کا کیا منہ یعنی کیا تاب طاقت ہے ریہ روزمرہ ہے کہ کہتے ہیں اس شخص کا کیا منہ ہے جو ایسا دعوے کرے۔

۲۔ انیسؒ دبیرؒ کی رباعیوں میں ایک باریک فرق ہے وہ یہ کہ میر صاحب تو محض واقعہ کربلا کو باعث بربادی بتلاتے ہیں مرزا صاحب تخصیص نہیں کرتے* بلکہ فرماتے ہیں کہ باغیوں نے ایسا کاٹا کہ پھر باغ فاطمہؑ برخلاف تمام باغوں کے سرسبز نہ ہوا اس میں تمام ائمہ طاہرینؑ جو مصائب گزرے وہ سب آ گئے گویا بیان وسیع ہو گیا

(۲۴) تعریف اشک عزا

انیسؒ	دبیرؒ
مجلس میں عجب بہار چشمِ تر ہے	اشکِ غمِ شبیرؑ دُرِ یکتا ہے
ہر لختِ جگر رشکِ گلِ احمر ہے	ہر دیدۂ حق بیں سے یہ دُر پیدا ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی	بے اشکِ عزا آبروئے چشم ہے خاک
بے قدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے	پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

(۲۵) غدر ۱۸۵۷ء

حال غدر ۱۸۵۷ء میں ایک ایک رباعی یکساں قافیوں اور ردیف میں دونوں کاملوں کے کلام میں ملتی ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ باغیوں کی عملداری میں میر صاحب گھبرا رہے ہیں۔ مرزا صاحب تسکین دے رہے ہیں:۔

افسوس زمانے کا عجب طور ہُوا	کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہُوا
کیوں چرخِ کہن۔ نیا یہ کیا دَور ہُوا	گہ عدل گیے ظلم گیے جَور ہُوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیسؔ	اللہ وہی ہے تُو نہ مضطر ہو دبیرؔ
اب یاں کی زمیں اَور فلک اَور ہُوا	کیا غم جو زمیں اَور فلک اَور ہُوا

(۲۶) مرثیوں میں سے قریب المضمون بند

پہلے اِس سے کہ ذیل کے بند لکھوں یہ عرض کر دُوں۔ کہ مضمونِ ذیل کے مُوجد ملّا محتشم علیہ الرحمہ ہیں۔ اُن کا یہ مشہور و مقبول شعر ہے۔؎

روزے کہ شد بہ نیزہ سرِ آں بزرگوار   خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

انیسؒ

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب   نِکلا تھا خُوں ملے ہُوئے چہرے پہ آفتاب

تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

دبیرؔ

تھی بسکہ صبح قتلِ شہنشاہِ نامدار — اہلِ حرم تھے جیب دریدہ اور اشکبار
تارِ شعاع سے یہی ہوتا تھا آشکار — خورشید نے کیا ہے گریباں کو تار تار
پَو پھٹتے ہی۔ رسولؐ کا دامان پھٹ گیا
زہراؑ کے بھی کفن کا گریبان پھٹ گیا

ایضاً

چاروں طرف تھا بسکہ ہجوم سپاہِ شام — گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
بالکل اُلٹ دئے تھے حبابوں نے اپنے جام — ماتم یہ تھا۔ کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام
دریا جو دُور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
مُنہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

(۲۷) راکب و مرکب

راکب و مرکب

حضرت امام حسینؑ سردار و جناب عباسؑ علمدار اور دونوں حضرات ؑ کے وفادار گھوڑوں کی ساتھ ساتھ مدح وثنا دونوں کاملوں نے فرمائی ہے قابل دید و لائق داد ہے۔

انیسؔ

تھا زینِ فرس رحلِ نو قرآں شہ والا
وہ تختِ ہوا تھا تو سلیمانؑ شہ والا
وہ دوشِ صبا بوئے گلستاں شہ والا
وہ برجِ شرف نیّرِ تاباں شہ والا

دبیرؔ

مرکب تو ہے یہ راکب ذی شاں بھی ہو ایسا
طور ایسا ہو۔ تو موسئ عمراں بھی ہو ایسا
اورنگ ہو ایسا تو سلیماںؑ بھی ہو ایسا
اس شاں کی ہو رحل تو قرآں بھی ہو ایسا

بو گل کی نسیم سحری لے کے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لے کے چلی ہے

آہو بھی مکیں۔ شیرِ حجازی ہو تو ایسا
غازی ہو تو ایسا ہو۔ جو تازی ہو تو ایسا

غرور

(۲۸) غرور و تکبر کی مذمت دونوں کاملوں کی زبانی سُنئے :۔

انیسؒ

بد اصل تکبُّر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں جُھکے رہتے ہیں اکثر

دبیرؒ

یہ جوشِ غرور اہلِ ہنر میں نہیں ہوتا
پانی میں ہے کف۔ آبِ گہر میں نہیں ہوتا

جنگی پہلوان

(۲۹) ایک ایک پہلوان لشکرِ یزید کی مختصر تصویریں دونوں اُستادوں کے یہاں دیکھئے :۔

میر صاحبؒ

سر طبلک معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ
غدّار و سلحِ شور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ
حیراں شبِ ظلمات ہو نیرگی رنگ
پہلے سے یہ کالا تھا منہ اُس دشمنِ رب کا
بن جائے توا عکس سے آئینہ طلب کا

لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قبر سا کالا
شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا
قد دیو کے قامت سے بلندی میں دوبالا
دانتوں کی کبودی دہن مار کا چھالا
شیر اُس کی صدا سُن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا رن کی۔ وہ بدبو تھی دہن میں

مرزا صاحبؒ

سر تا بقدم زہر زباں سانپ دہن غار
شعلہ تھی نگہ۔ آنکھ تھی تنوّر شرر بار
نخوت تھی وہ تیوری میں کہ تھے اپنے بھی بیزار
تلوار دھرے چہرے پہ خود بینیٔ غدّار
اشقر یہ وہ ناری تھا کہ شعلہ پہ دھواں تھا
یا ریت کا پشتہ تھا کہ جادو سے رواں تھا

فولاد کے قلعہ میں چھپائے ہوئے سر کو
باندھے ہوئے زنجیر کے پٹکے سے کمر کو
دو چلتوں میں وسواس سے پنہاں کئے بر کو
اندھیر کی نیّت میں لئے منہ پہ سپر کو
لڑنے میں کماں چھوٹتی تھی ساتھ سے اُس کے
آرام نہ تھا چرخ کو بھی ہاتھ سے اُس کے

(۳۰) گھوڑے کے نعلوں اور کیلوں کی تشبیہات

گھوڑے کے نعل اور کیلیں

دبیرؒ	انیسؒ
نعلوں کو دبائے ہُوئے کیلوں کی ضیا ہے	دیکھی ہے سموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی
پامال ستاروں نے ہلالوں کو کیا ہے	اک جا ہیں ستارے بھی۔ قمر بھی۔ مہِ نو بھی

(۳۱) رجز کا ایک ایک بند جو دونوں کاملوں نے ایک ہی قافیہ و ردیف میں فرمائے ہیں:-

رجز

دبیرؒ	انیسؒ
ہل جائیں پہاڑوں کو ہتیلی سے جو ریلیں	یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
اس فاتے میں دو انگلیوں پر عرش کو لیلیں	کیا ڈر انہیں بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں
چوگان سر گردوں سے زمیں پر ابھی کھیلیں	کوفہ تو ہے کیا شام کو اور رُوم کو لیلیں
پر حکمِ خدا یہ ہے۔ کہ اندوہ بھی جھیلیں	اُلٹیں صفتِ کاہ اگر کوہ کو ریلیں
لڑنے میں بھی اپنی ہی فقط نفس کُشی ہے	چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق اُلٹیں
بخشی گئی اُمّت یہ قیامت کی خُوشی* ہے	یوں اُلٹیں۔ کہ جس طرح ہوا سے ورق اُلٹیں

(۳۲) شاہزادی سکینہ (چار سالہ) سے امام حسینؑ چلتے وقت گویا وصیّت فرماتے ہیں:-

وصیّت وقت رخصت

دبیرؒ	انیسؒ
سینے پہ مرے سوچکیں۔ اب خاک پہ سونا	دُنیا ہے یہ۔ شادی ہے کبھی اور کبھی آرام
آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا	راحت کی کبھی صبح۔ مصیبت کی کبھی شام
گو قہر ہے اس سن میں جُدا باپ سے ہونا	یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
لاشہ مرا تڑپیگا۔ بہت مجھ کو نہ رونا	وہ دن گئے گنتی تھیں جو اس سینے پہ آرام
گر چاہو۔ مری رُوح ہو۔ ناشاد۔ سکینہ	ضد کرکے نہ اب باپ کو رو دیا کرو بی بی
تو غم میں مرے کیجیو۔ فریاد۔ سکینہ	جب ہم نہ ہوں۔ تم خاک پہ سویا کرو بی بی

* قیامت کی خوشی کے ایک تو یہ معنی ہیں کہ انتہا درجہ کی یہ خوشی ہے۔ دوسرے یہ کہ قیامت کو اُمّت بخشی جائیگی۔ کہ ہمارے صبر شہادت

اضطراب و اضطرار

(۳۳) شہادت امام حسین ؑ کے قریب جناب زینب ؑ گھر سے نکلی ہیں :-

انیس ؒ

پردہ اُلٹ کے بنت علیؑ نکلیں ننگے سر
لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھیں سر کو پیٹ کر
اے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
امّاں قدم اب اُٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہنچا دو لاش تک مرے ہاتھوں کو تھام کے

دبیر ؒ

چلتی ہیں جلد اور زمیں سوجھتی نہیں
دھڑکا یہ ہے کہ ذبح نہ ہو جائیں شاہِ دیں
آنکھیں کہیں خیال کہیں اور دل کہیں
یاں لڑکھڑائیں اور وہاں مُنہ کے بَل گریں
بو سونگھتی ہیں خون کے تھالے جو ملتے ہیں
دل کی طرح سے کانوں کے بُندے بھی ہلتے ہیں

فصل ۱۶ گزارش ممدوح

(۳۴) ممدوح سے گزارش

جب حکم ہو۔ کہ مانگ لے۔ کیا مانگتا ہے تُو؟
رگڑ کر کہوں قدم پہ۔ کہ دُنیا میں آبرُو
ارشاد ہو۔ کہ اور بھی ہے کوئی آرزُو
اُس دم کروں یہ عرض۔ کہ یا شاہِ نیک خُو
سب کچھ ہے اختیار شہِ مشرقین میں
مسکن جناں میں قبر جوارِ حسینؑ میں

مصرع کے عوض آپ سے طوبےٰ نہیں لیتا
لو جنّتِ اعلےٰ بھی یہ ادنےٰ نہیں لیتا
اب پُوچھئے کیا مانگتا ہے؟ کیا نہیں لیتا
مَیں نام زباں سے کسی شے کا نہیں لیتا
جُز نقدِ رضا کچھ مجھے منظور نہیں ہے
خادم ترا مدّاح ہے مزدُور نہیں ہے

عرفان ہر چند میر صاحب کا خیال بھی اچھا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا خلوص دیکھئے۔ کس پایۂ عرفان پر پہنچا ہُوا ہے۔ یہ وہ نکتے ہیں جن کے سبب دبیرؔ مانے جاتے ہیں :-

ایضاً

سب کچھ جزا ہے اختیارِ شہِ مشرقین میں
اور بوقتِ ممات میں قبر جوارِ حسینؑ میں

ایضاً

آنکھیں رضاؑ کے روضے میں دل کاظمینؑ میں
قالب نجف میں رُوح رواقِ حسینؑ میں*

* اس موقع پر بھی مرزا مرحوم نے دعا تعیین کی ہے بلکہ دلی تمنا بیان کردی ہے چنانچہ اُوپر کے چاروں مصرع میں سے اک جوان اور ہزار تمنا ہے اکرم

(۳۵) زلف و رُوئے اقدس کی مدح میں دو دو بند دونوں مدّاحوں کے سُنئیے :۔

زلف و رُخ

انیسؒ

پیدا ہے زلف و رُوئے منوّر سے شانِ رب
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطفِ عید اور شبِ قدر میں ہے کب
ہے دو طرف دو چین و ختا بیچ میں حلب
رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

پہلو میں دن کے رات رہے شانِ کارساز
یوسفؑ جو دیکھے تو جھکائے سرِ نیاز
افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز
زیبا ہیں گورے رُخ پہ غضب گیسوے دراز
اب تو نظر پہ یہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت ہے دن تو کم نہ ہُوا۔ رات بڑھ گئی

دبیرؒ

لاریب جُرم ہے جو کہیں چاند رُخ کو ہم
ہے چاند میں تو جِرم یہ بے جرم لَا جَرَم
رُخ ہے وہ صبح۔ شمس ہیں جس کے شہ اُمم
گیسُو وہ شب کہ قدرِ شبِ قدر جس سے کم
گیسو و رُخ تو قدرتِ داور دکھاتے ہیں
ہر وقت شام۔ صبح۔ برابر دکھاتے ہیں

شرح بزرگیٔ رُخ و کاکل دراز ہے
نسبت سے صبح و شام کو یہ امتیاز ہے
قصر نماز گو کہ سفر میں جواز ہے
پر واں بھی صبح و شام کی پوری نماز ہے*
عقدے فضائل رُخ و کاکل کے وا کئے
دونوں فریضے وقتِ فضیلت ادا کئے

(۳۶) گرمی روزِ عاشور کا بیان

گرمی

انیسؒ

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا
وہ دوپہر اُس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا

دبیرؒ

وہ دھوپ کہ مرغانِ ہوا کرتے ہیں نالا
بس ہاتھ دھرا قبضے پہ اور پڑ گیا چھالا

*۔ رُخ کو صبح سے اور گیسو کو شام سے تو عام شعرا تشبیہ دیتے ہیں یہاں دو کالم نے بھی دی۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے۔ بات میں سے بات کیا نکالی ہے۔ کہ صبح کی دو رکعتیں ہیں اور شام (مغرب) کی تین رکعتیں ہیں۔ جو سفر میں بھی قصر (کم) نہیں ہوتیں۔ اور نمازیں (عشا و ظہرین کی) سفر میں قصر (کم) ہو کر

جو چار چار رکعت دو ہی دو رہ جاتی ہیں۔ اسکی حسن تعلیل کتنی معقول ہے۔ کہ صبح و شام کو زلف و رُخ و امام سے نسبت ہے۔ اس لئے یہ بندگی حاصل

ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا
اور تن پہ حرارت سے وہ ہتیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں
وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے
اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دو دو دام ہیں منہ آب میں ڈالے
ریتی پہ دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی بھی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

بریاں ہوا۔ دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا
اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھاڑ ہے جسمِ شہِ دیں پر
نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا
بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا
پر اوجِ امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس بڑی ہے

گرمی اور شاعرانہ تخیلات

(۳۷) دوسرے بحر کے دونوں صاحبوں کے مرثیوں سے تین تین بند گرمی کے بیان میں شاعرانہ تخیلات

انیس رح

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتا تھا دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں
گرداب پہ تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

دبیر رح

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب
گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب
خطِ غبار سے ہے لپی۔ ابر ہی سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں
مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی
رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی

منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ۔ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا۔ دھوپ سے پانی فرات کا

دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدت ہے موج موج میں تیر شباب کی
فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر ہے مردم آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
نزد امتی ہے شہر دل میں زاہد وضو کریں

(۳۸) اعلےٰ و ادنےٰ یا حق و باطل کا مقابلہ

اعلیٰ و ادنےٰ یا حق و باطل کا مقابلہ

کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو۔ اُسے موسیٰؑ نہیں کہتے
ہر ہات کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

ساماں ہے کوئی۔ صاحب ایماں نہیں ہوتا
ہر اہل عصا۔ موسیٰؑ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماںؑ نہیں ہوتا
آئینہ گر اسکندر دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشّہ کا ہُما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خُدا ہو نہیں جاتا

(۳۹) امام حسینؑ کی مظلومی و بیکسی کا سماں (سین)

فصل، بیکسی کا سماں

انیس رحؒ

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

دبیر رحؒ

موتنو بیکس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ

ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اُس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجہ نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے
ہے جبیں چاند سی پُر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بکمر زخمی ہے
تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آ جاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سرِ پاک جھکا جاتا ہے
گردِ زہرا و علی گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امامِ دوجہاں گرتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور ایک سر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسینؑ
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسینؑ
دل شکستہ جگر افگار ہے مظلوم حسینؑ
نیزے کاری ہیں لگے زخم پہ شمشیروں کے
نیزوں کے زخموں میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

سینہ زخمی ہے بدن زخمی کلیجا زخمی
انگلیاں زخمی ہیں اور ساعد زیبا زخمی
ہونٹ زخمی ہیں گلا زخمی ہے ماتھا زخمی
نام کس عضو کا لوں میں ہے سراپا زخمی
ایسے زخمی کو تو کافر بھی پلائیں پانی
حیف سید سے مسلمان چھپائیں پانی

دل کا یہ حال ہے پژمردہ ہوا جاتا ہے
ایک دریا ہے کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کئی بار غش آ جاتا ہے
کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے
تیر ایک ایک جگر میں جو قریب دل ہے
سانس کی آمد و شد سینے میں کیا مشکل ہے

تن سے گر کھینچتے ہیں ایک بھی پیکاں شبیرؑ
اتنے عرصے میں لگاتے ہیں عدو سیکڑوں تیر
کھا کے تیروں کو اگر کرتے ہیں قصدِ تکبیر
پاس سے نیزے لگاتے ہیں دہن پر بے پیر

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اُٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں
کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلا کر
بہر حق پانی کا اِک جام پلا دو لا کر
اہل کیں کہتے ہیں یہ تیغ ستم چمکا کر
آب شمشیر پیو۔ برچھیوں کے پھل کھا کر
یہ سخن سُن کے بھی غُصّہ نہیں فرماتے ہیں
یاس سے سُوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے ہیں

ایک پیکاں جو سینے سے گذر جاتا ہے
خُون کے روکنے کو دُوسرا تیر آتا ہے
کیا رحیمی ہے کہ غُصّہ نہیں آتا ہے ذرا
کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں اُمّت پہ فدا
کیا تحمّل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکرِ خدا
کیا شجاعت ہے کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا
تیر بھی نیزے بھی سینے پہ لئے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی اُمّت کو دئے جاتے ہیں

(۴۰) مناجات اور عاشق و معشوق میں راز و نیاز کی باتیں

عاشق و معشوق کے راز و نیاز

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربّ غفور	[illegible]	تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں مجھے بے جرم و خطا تینوں سے چوُر	//	ہات اُمّت پہ اُٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں۔ کہ محمدؐ کا نواسا ہُوں مَیں	//	پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسا ہُوں مَیں
روزِ عاشور لُٹا جب کہ گلستانِ حسینؑ	[illegible]	غم سے بھائی کے ہوا چاک گریبانِ حسینؑ
قتل اکبرؑ سے ملے خاک میں ارمانِ حسینؑ	//	جز اجل کوئی نہ تھا رن میں نگہبانِ حسینؑ
حق سے کہتے تھے۔ نہیں رنج تباہی مجھ کو	//	صبر دے پیاروں کی فرقت میں الٰہی مجھ کو
اب نہ قاسمؑ مرا جیتا ہے نہ اکبرؑ باقی	//	نہ علمدار سلامت ہے نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی	//	اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی
قتل اصغرؑ ہو مرا سر بھی جُدا ہو جائے	//	اس امانت سے بھی شبیرؑ ادا ہو جائے

ناظرین باتوقیر! مضامین کی خوبی کے ساتھ ساتھ دونوں بزرگواروں کے یہاں سلاست وصفائی بندش بھی دیکھنے جاتی ہے۔ دونوں باکمالوں نے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ مضامین کے دریا بہا دئے ہیں ۱۲ مؤلف

یا خدا تجھ پہ میں صدقے مرا لشکر بھی نثار
دل فدا۔ جاں فدا۔ رُوح فدا۔ سر بھی نثار
علی اکبرؑ بھی نثار اور علی اصغرؑ بھی نثار
تجھ پہ باقرؑ بھی فدا۔ عابدؑ مضطر بھی نثار
مَیں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لُٹا یا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہات پڑے ہیں اکبرؑ
ہے وہ عباسؑ دلاور۔ وہ حسنؑ کا دلبر
ایک اک پیارے کو قرباں کیا گِن گِن کر
کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور
تو نے دولت تھی جو مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی

قتل عباسؑ ہُوئے مَیں نے کہا شکر ترا
پر کمر ہو گئی خم اس میں گنہ میرا کیا
نکلا اکبرؑ کا بھی دم آنسو نہ میرا نکلا
کی بدی نانا کی اُمّت نے نہ بد مَیں نے کہا
یہ بھی بندے ہیں ترے مَیں بھی ترا بندہ ہوں
دشتِ غربت میں پریشاں ہُوں پراگندہ ہوں

تُو نے بچپن میں مرے ناز اُٹھائے یا رب
وہ عنایت کیا جو مَیں نے کیا تجھ سے طلب
تیرا محبوبؐ بنا عید کو میرا مرکب
روزہ رکھا تو چھپا مہر۔ نمایاں ہُوئی شب
بھوک میں خلد کے میووں سے مجھے شاد کیا
خواہشِ بچّہ آہُو سے بھی آزاد کیا

تُو نے بچپن میں کھلائے ثمرِ خلد بریں
اب اگر تیسرا فاقہ ہے۔ نہیں کچھ مَیں حزیں
چُوسی چھُٹپن میں زبانِ نبیؐ عرش نشیں
آج اگر پینے کو پانی نہیں۔ تو خیر۔ نہیں
ایک دن حلق تھا اور فاطمہؑ کے شیر کی دھار
آج راضی ہُوں گلے پر چلے شمشیر کی دھار

اب اگر یہ بھی تری مصلحت اے ربِ قدیر
ہو رواں پیاس میں اب حلق پہ میرے شمشیر
میرے مولا بسر و چشم ہے حاضر شبیرؑ
حکم حاکم میں یہ طاقت ہے کروں مَیں تاخیر
جلد گردن پہ رواں خنجرِ بُرّاں ہوئے
اے خوشا وہ جو تری راہ میں قرباں ہوئے

تو شہنشاہِ شہنشاہوں کا ہے بار خدا
ہیں برابر تری [illegible] میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشق جاں باز ہے البتّہ جدا
اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پہ تیغ رہے سینے پہ جلّاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

مصرع اول	شاعر	مصرع ثانی
غم نہیں کچھ بھی مجھے بیکس و بے یار ہوں میں	[illegible]	تو مددگار رہے [illegible] سب ناچار ہوں میں
زیرِ شمشیر گلا رکھنے کو طیار ہوں میں	"	وقتِ مشکل بھی عنایت کا طلبگار ہوں میں
تیرے سجدے میں یہ سر تن سے جدا ہو جائے	"	عہدِ طفلی کا جو وعدہ ہے وفا ہو جائے
دُرِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا	دبیرؔ	لیگئے ہیں نذر کو داغِ غمِ احمدؐ زہراؑ
سرخرو ہے ترے دربار میں بابا میرا	"	دل کے ٹکڑے کئے سب قمر بھائی نے کئے تجھ پہ فدا
آج شبیرؑ بھی ان سب کے مقابل ہو جائے	"	سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے
سختیاں مرگ کی کر اپنے کرم سے آساں	انیسؔ	لب پہ تکبیر ہو جب حلق پہ خنجر ہو رواں
دل میں ہو یاد تری۔ بند ہو جس وقت زباں	"	دم بھروں تیرا ہی جس وقت نکلنے لگے جاں
بعد جہلم جو مجھے قبر میسر ہوئے	"	زخمی تن کو نہ فشار لے مرے داور ہوئے
سر مراکٹ کے یقیں ہے ٹوٹے گو جائے	دبیرؔ	پھر یہ محتاج بھلا نذر تری کیا لائے
تیر اصغر کو مگر ہاتوں سے اب کھلوائے	"	درجہ صبر جو باقی ہے۔ وہ سب ہات آئے
پیش کش لاشۂ اصغر ہی بھلا لائے حسینؑ	"	ہات خالی ترے دربار میں کیا آئے حسینؑ
رحم کر رحم کہ شرمندہ ہوں لے بار خدا	انیسؔ	بندگی کا تری حق تھا وہ ادا ہو نہ سکا
خوفِ محشر سے بدن کا نپتا ہے سر تا پا	"	ہوگی اعمال کی پرسش تو کہونگا میں کیا
کوئی تحفہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ	"	ہات خالی ترے دربار میں آتا ہے حسینؑ
سب مرے نور نظر قتل ہوئے پیشِ نگاہ	دبیرؔ	بندے نے شکر کیا یا کہا اِنّا لِلّٰہ
جب کہ ہو مرضئ معبود سے بندہ آگاہ	"	پھر ستم پر جو ستم ہو نہ کرے منہ سے آہ*
آگے کہتا تھا نہ عریاں سرِ خواہر دیکھوں	"	پر جو تو خوش ہو تو زینبؑ کو کھلے سر دیکھوں
تقویت دل کو کرم سے ہو ترے ربِّ جہاں	انیسؔ	نہیں مایوس کہ رحمت ہے تری بے پایاں

*۔ شعر آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ خدا اپنے خاص بندوں کی شان میں فرماتا ہے بندے نہیں چاہتے۔ مگر جو خدا چاہتا ہے ۲۴ ابیات بے بضاعت ۔

مشکلیں بندوں کی کر دیتا ہے دم میں آساں — انیسؒ — شکر الطاف و عنایات میں قاصر ہے زباں
عاصیوں سے بھی محبت نہیں کم کرتا ہے — " — جُرم وہ کرتے ہیں تُو لطف و کرم کرتا ہے[1]

اِک طرف قید رسن میں ہوں حرم بیچارے — دبیرؒ — اِک طرف آگ سے جلتے ہوں یہ خیمے سارے
اِک طرف شمر سکینہ کو طمانچہ مارے — " — ظلم کُنبہ پہ یہ ہوں اور میں کروں نظّارے
جب کہیں آل نبیؐ مجھ سے کہ امداد کرو — " — میں کہوں اُن سے کہ اللہ کو تم یاد کرو

میں تری راہ میں مظلومی سے ہوتا ہوں فدا — انیسؒ — ہے تو آگاہ کہ دو دن کا ہوں بھوکا پیاسا
چاہتا ہوں میں یہی اپنی شہادت کا صِلا — " — مغفرت اُمّت عاصی کی ہو۔ یا بارِ خدا
ہے گوارا مجھے جو مجھ پہ اذیت ہوئے — " — ان کو دُنیا میں بھی عقبےٰ میں بھی راحت ہوئے

قتل اکبرؑ تو مرا ہو چکا اے ربِّ غفور — دبیرؒ — اب اگر تجھ کو نہ ہو نسل امامت منظور
ذبح عابدؑ کو کروں آپ میں بانوؑ کے حضور — " — میں خلیل اور وہ ذبیح آج سے ہوئے مشہور
ہات رُک جائے گلے پر تو قلم ہات کروں — " — ہات سے ذبح کروں لب سے مناجات کروں

بندہ پرورا میں ہوں اک عبد غریب و احقر — " — بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزل ملک عدم میں تو مرا ہو رہبر — " — نہ تو اس راہ سے آگاہ۔ نہ منزل کی خبر
شوق بھی رعب بھی مجھکو تری درگاہ کا ہے[2] — " — سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

تین دن تڑپا ہے یاں پیاس کی شدت سے حسینؑ — " — اب ہو سیراب ترے قلزم رحمت سے حسینؑ
ڈر نہ جائے ملک الموت کی ہیبت سے حسینؑ — " — یا خدا کانپتا ہے قبر کی وحشت سے حسینؑ
آج تک ساتھ رہا بیٹے کا اور بھائی کا — " — سخت اندیشہ ہے اب قبر کی تنہائی کا
وحشتِ قبر۔ نکیرین کا ڈر یا اللہ — " — گھر نیا۔ لوگ نئے۔ اور میں ناواقف۔ آہ

---

[1] سبحان اللہ کیسی پاکیزہ زبان ہے اور کیا بندش کی صفائی ہے + مؤلف حقیر۔

[2] دیکھئے عبدیت کے ساتھ عشق الٰہی کی شان کس خوبصورتی سے دکھائی ہے۔ اِدھر تو شوق لقائے پروردگار ہے۔ اُدھر اُس کا رعب غالب ہے۔ بس یہی تو ہر شاعر کو نہیں سُوجھتی +

سہل ہو راہ صراط اور ہو امت ہمراہ	دبیرؔ	دنیا خورشید قیامت سے قیامت میں پناہ
آگ سے خیمے جلیں دھوپ سے دلدار جلیں	"	پر دمِ حشر نہ دوزخ میں گنہگار جلیں
اب یہ حسرت ہے کہ قاتل جو چڑھے سینہ پر	"	کہیو نانا سے کہ اُس وقت وہ لیں میری خبر
جب مرا شوکھا گلا ہوئے بزیرِ خنجر	"	بھیجیو فاطمہؑ کو آکے رکھیں گود میں سر
مشکل آساں مری حیدرؑ کرار کریں	"	شمر تو ذبح کرے اور علیؑ پیار کریں
ناگہاں آئی یہ آواز خدا ائے کونین	"	بس مرے بندۂ بیکس مرے مظلوم حسینؑ
شکوہ کرتا ہے تو آج بصد شیون و شین	"	تجھ کو شرم آتی ہے اے فاطمہؑ کے نورِ عین
تشنہ کامی میں نہیں کام لبِ دریا سے	"	آفریں اے مرے چوبیس پہر کے پیاسے
عرض کرتے تھے یہ خالق سے شہ بندہ نواز	انیسؔ	یک بیک عالمِ بالا سے یہ آئی آواز
اے مرے شبیر کے فرزندِ نبیؐ کے دمساز	"	تجھ سے ہم خوش ہیں پذیرا ہے ترا عجز و نیاز
مرد ہے عاشقِ کامل ہے وفادار ہے تو	"	جو کہا وہ ہی کیا۔ صادق الاقرار ہے تو
اے حسینؑ اپنی ہی قدرت کی میں کھاتا ہوں قسم	دبیرؔ	تیرے غمخواروں کو محشر میں نہ کچھ ہوئیگا غم
سختی موت غلاموں پہ ترے ہوئیگی کم	"	قبر ہے تعزیہ داروں کو ترے باغِ ارم
تو عبث موت کی سختی سے ہراساں ہے حسینؑ	"	ملک الموت ترا تابع فرماں ہے حسینؑ
تو بھی مقبول ہے اور تیری عبادت بھی قبول	انیسؔ	یہ اطاعت بھی ہے مقبول یہ طاعت بھی قبول
عاجزی بھی تری مقبول شہادت بھی قبول	"	تری خاطر سے ہمیں بخششِ امت بھی قبول
ہم نے خیلِ شہدا کا تجھے سردار کیا	"	امتِ احمدؐ مختار کا مختار کیا
بس یہی ہے ملک الموت کے آنیکا مآل	دبیرؔ	کہ تری روح کا واجب ہے اُسے استقبال
بے ترے حکم ہلانے کا نہیں وہ پر و بال	"	سب خدائی تری محکوم ہے زہراؑ کے لال
راہ حق میں تجھے ثابت قدمی ہے شبیرؑ	"	مرے دربار میں کس شے کی کمی ہے شبیرؑ

نوٹ: کیسی بے تکلف سلیس نظم ہے۔ جس سے نثر بھی شرمندہ ہے + المؤلف حقیر۔

مصرعِ اوّل		مصرعِ ثانی
دوستداروں کا ترے گلشنِ جنّت ہے مقام	انیسؒ	تا ابد سایۂ طوبےٰ میں کریں گے آرام
ہونگے محشور ترے ساتھ محب تیرے تمام	〃	تجھ پہ جو روئینگے آنچ اُن پہ ہے دوزخ کی حرام
غم نہ کھا اہلِ جناں تیرے محب سارے ہیں	〃	تو بھی پیارا ترے پیارے بھی ہمیں پیارے ہیں
واہ کس مرتبہ خوش۔ خالقِ اکبر کو کیا	دبیرؒ	وعدہ اپنا ہی تھا پر صدقے بہتّر کو کیا
مرحبا۔ ہم سے نہ پیارا علی اکبرؑ کو کیا	〃	پیش کش کے لئے تجویز اب اصغرؑ کو کیا
نذر مقبول ہے آؤ ہمیں دے جاؤ حسینؑ	〃	میرے دربار سے جو چاہو سو لے جاؤ حسینؑ
ہیں ہر اک رنج سے محفوظ ترے تعزیہ دار	انیسؒ	سختیِ مرگ نہ اُن پر ہے نہ ایذائے فشار
دمِ مردن نظر آئیگا علیؑ کا دیدار	〃	قبر میں گلشنِ فردوس کی دیکھیں گے بہار
دارِ دُنیا ہی میں جو کچھ ہے انہیں ایذا ہے	〃	آنکھ جب بند ہوئی۔ پھر درِ جنّت وا ہے*
حُلّے فردوس کے بانٹیگا تو ہی روزِ جزا	دبیرؒ	پر کفن تیرے ہی مُردے کو نہیں ملنے کا
بلکہ پامال ترا لاشۂ بے سر ہوگا	〃	وحشتِ قبر سے اے سبطِ نبیؐ تجھکو کیا
خاک سے لاشۂ مجروح اُٹھائیگا خدا	〃	پہلوئے عرش میں پاس اپنے جگہ دیگا خدا
تجھ سا عابد ہے کوئی اور نہ کوئی ہوگا	انیسؒ	نیزہ کھا کر نہ کسی نے کبھی یوں شکر کیا
طاعتِ خلق سے اک سجدہ ہے افضل تیرا	〃	عرشِ اعظم پہ ملائک تری کرتے ہیں ثنا
سارا گھر میری محبت میں فدا تو نے کیا	〃	بندگی کا تھا جو کچھ حق وہ ادا تو نے کیا
عرش کو تھامے ہوئے رہیو تو تا روزِ شمار	دبیرؒ	کیجیو اپنے محبّوں کے لئے استغفار
اپنے نانا کی بھی اُمت کے تمہیں ہو مختار	〃	چاہو جنّت دو انہیں چاہو کرو داخلِ نار
جز خدا اور کوئی کیا تری عزّت جانے	〃	ہم نے مالک کیا تم جانو اور اُمّت جانے
حشر تک روئیگا مظلومی پہ تیری عالم	انیسؒ	تیرا ماتم نہیں ہونے کا جہاں سے کبھی کم
روضۂ پاک کو تیرے یہ شرف بخشیں گے ہم	〃	جمع سب تیری زیارت کو ملک ہونگے بہم

* اے سبحان اللہ۔ آنکھ بند ہوئی اور درِ جنت کھلا کیا ساتھ ساتھ کس سلاست و فصاحت سے ادا فرمایا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

پر زمیں عرش سے رُتبے میں سوا ہوئیگی	انیسؒ	خاک تربت کی تری خاکِ شفا ہوئیگی
بولے شہ سُن کے یہ فرمان خدا کا مضموں	دبیرؒ	سب تری بندہ نوازی ہے پَیں کس لائق ہُوں
خوں بہا کیسا۔ مجھے تو نہیں کچھ دعوئے خُوں	"	کیا مرا رتبہ۔ جو مختار ہی محشر میں ہُوں
بس یہ کافی ہے کہ مقبول شہادت ہوئے	"	تُو رضامند ہو اور بخشش اُمّت ہوئے

(۱۴۱) حال شیریں کنیز آزاد کردہ جناب امام حسین علیہ السّلام

مشہور ہے۔ کہ یہ شیریں جناب شہر بانُو کی کنیز تھیں۔ کہ ان کو جناب شہر بانُو اور جناب امام حسینؑ نے آزاد کر دیا تھا۔ (ہر چند روایت ضعیف ہے۔ مگر سب نامی مرثیہ گویوں نے نظم کی ہے) ۔دبیرؒ و انیسؒ کے دو مرثیوں سے جو ایک بحر کے ہیں۔ چند بند لکھتا ہُوں۔ جس سے دونوں اُستادوں کے واقعہ نگاری کے جوہر ناظرین کو نظر آئیں۔ موقع یہ ہے کہ شیریں راہ شام میں رہتی ہے۔ اُس کو کسی نے خبر دی ہے۔ کہ امام حسینؑ مع اہل و عیال و رفقا آتے ہیں۔ وہ دعوت کی طیاریاں کر رہی ہے اور خوش ہو رہی ہے۔ کہ میرے آقا فرزند رسول صلعم میرے مہمان ہونگے :۔

انیسؒ	دبیرؒ
یہ کہکے اُس نے فرش کیا۔ گھر میں سر بسر	مصروفِ اہتمام ہُوئی پھر وہ باوفا
مؤمن کے دل کی طرح مصفّا ہُوا وہ گھر	جھاڑا۔ بُہارا۔ گھر کو۔ کیا فرش جا بجا
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر	مانندِ سنگ فرش فلک ہو گئے جبہ سا
تکیوں کو صاف کر کے لگایا اِدھر اُدھر	آ بیٹھے دُور دُور ادب سے جدا جدا
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نُور ہے	کیا فرش تھا کہ عرش کو جائے سخن نہ تھی
یہ آمدِ امامِ زمن کا ظہور ہے	پیشانی سخی کی طرح اک شکن نہ تھی

انیسؔ

مکان

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبرؑ کے واسطے
جھولے کی جا۔ یہ ہے علی اصغرؑ کے واسطے
یہ گھر ہے شاہ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشیں پہ امام زمن رہیں
حجرہ ہے اس لئے ہے۔ کہ دُولھا دُلھن رہیں

سازوسامان

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی
تحفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہر شکر کبھی سر جُھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزند فاطمہؑ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امامؑ
بھر بھر کے آب سرد کے رکھدو ہوا میں جام
لبریز آب گرم کے کردو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤنگی
ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دُھلاؤنگی

دبیرؔ

مکان

بیت الحرم وہ گھر تھا کہ تھی آمد حرم
ہر سنگ فرش تھا حجر الاسود حرم[۱]
آئینوں سے حلب تھا تو گلدستوں سے ارم
ہر شے قرینے سے نہ زیادہ کہیں نہ کم
نظارۂ حسینؑ کے ارماں دکھا دیے
پلکوں کی چلمن آنکھوں کے پردے لگا دیے

سازوسامان

مسند بچھائی بہر شہنشاہ مشرقین
تکیہ پر ہما کے لگائے بزیب و زین
کیا جانتی تھی۔ ہوگا یہاں ماتم حسینؑ
سُن پایا تھا صغیر ہے بانو کا نورِ عین
دالان میں درست کیا گاہوارے کو
بولی میں خود جُھلاؤنگی۔ بی بی کے پیارے کو

گھر کو بنا سنوار چکی جب وہ نیک نام
حُجرے میں پھر سلیقے سے کھانے چُنے تمام
شربت صراحیوں میں بھرا دھو سارے جام
ہے ہے نہ یہ خبر تھی کہ پیاسے مُوئے امامؑ
میوے چُنے طبقوں میں اکبرؑ کے واسطے
کوزوں میں دُودھ بھر دیا اصغرؑ کے واسطے

---

[۱] بیت الحرم خانہ کعبہ اور حجر الاسود اُس قابل التعظیم پتھر سے مراد ہے جسکو خانہ کعبہ میں بوسہ دیتے ہیں۔ حرم سے مصرع اوّل میں اہل و عیال امام حسینؑ مراد ہیں۔ اور مصرع ثانی میں حرم کعبہ کے معنی پر ہے۔ اختلاف علمیت سے ایطا نہیں رہا +

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار
اب کیجیو زیارت سلطان نامدار
ہے باغ فاطمہؑ پہ عجب حسن کی بہار
رشک ریاض خلد ہے ایک ایک گل عذار
سب نونہال گلشن دیں لاجواب ہیں
قد سرو باغ خلد ہیں رخ آفتاب ہیں

ہمسائیوں سے شیریں کہ رہی ہے
شمشاد بوستانِ پیمبر کو دیکھیو
سرور ریاض حضرت شبّر کو دیکھیو
کیا نوجواں ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو
سب ایک سمت تم علی اکبرؑ کو دیکھیو
ہوگا کبھی یہ حسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اُس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اُسے صد و سی سال برقرار
نامِ خدا ہے شادی کے قابل وہ گل عذار
بہنیں فدا ہیں۔ باپ تصدّق ہیں۔ ماں نثار
سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیّر تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیرے کا چاند ہے

ہمسائیاں کھڑی ہوئیں ہر سو کہ ہم بھی آئیں
دن رات مانگتے تھے اسی روز کی دعائیں
پلکوں سے گھر کو جھاڑیں تو فرش آنکھوں سے بچھائیں
صدقے کیا تھا جو سر و سامان کہو وہ لائیں
پوچھو تو اغنیا سے یہ دولت بھی پائی ہے
ائے حسینؑ اب ترے گھر میں خدائی ہے

ہمسائیاں شیریں سے کہ رہی ہیں
آیا ہے جن کی شان میں قرآں وہ آتے ہیں
کعبہ کے ہیں جو قبلۂ ایماں وہ آتے ہیں
جن کے گدا ہیں قیصر و خاقاں وہ آتے ہیں
فطرُس ہے جن کا بندۂ احساں وہ آتے ہیں
شیریں! خدا کے پیاروں کے پیارے حسینؑ ہیں
مالک ہمارے اور تمہارے حسینؑ ہیں

تم سے سفارشوں کے ہیں امیدوار ہم
پائیں سلامِ حضرتِ زینبؑ کی بار ہم
دیکھیں تمہاری بی بی کا عزّ و وقار ہم
ایران کی شاہزادی ہے کیسی نثار ہم
ہمسائے کے حقوق ادا آج کیجیو
ہم کو بلا کے رتبۂ معراج دیجیو*

* ہمسائیوں سے باتیں کرنیں دونوں کمالوں نے کمال کیا ہے۔ دبیر صاحب نے کس عمدگی سے باتیں نظم فرمائی ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں باتیں کر رہی

ہیں مرزا مرحوم نے ایک بڑا بلاغت کا حق ادا کیا ہے۔ وہ یہ کہ شیریں سے عورتوں نے جو باتیں کی ہیں۔ وہ صرف زنان اہل بیت کی نسبت ہیں عورتوں کی

انیسؒ

شیریں ہمسائیوں سے کہ رہی ہے
اب خیریت سے گذریگا اٹھارھواں جو سال
شادی کرینگی بیٹے کی بانوئے خوش خصال
زینبؑ کو اُس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال
ہردم یہی دُعا ہے کہ دُولھا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و رُوم سے
شادی "خدا جو چاہے" تو ہوئیگی دھُوم سے
پر ہاتھ جوڑتی ہُوں کہ تنہا ہی آئیو
پردہ نہ دخترانِ علیؑ کا بھلائیو
یارب ہنسی خوشی مرے سب میہماں رہیں

دبیرؒ

شیریں ہمسائیوں کو جواب دیتی ہے
اُس نے کہا "مَیں سعی کو حاضر ہوں عذر کیا"
پر بیبری بیبیوں کا چلن سب سے ہے جُدا
ارماں امیر زادیوں کو کوفہ میں رہا
مہمان کسی کے گھر نہ گئیں بنتِ مرتضاؑ
تُم سب کا اشتیاق زیارت سُنا دُنگی
زینبؑ کا حکم ہوگا۔ تو بیشک بُلاؤنگی
لڑکوں کو اپنے ساتھ خدارا نہ لائیو
مجھ کو عتابِ آلِ نبیؐ سے بچائیو
مَیں دم بدم فدا رہُوں وُہ مہرباں رہیں

انیسؒ شیریں کی شوہر سے باتیں دبیرؒ

جب ڈھل گئی اُسے انہیں باتوں میں دوپہر
شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکوسیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر
اُترے کہاں کسی سے مفصّل سُنی خبر
بستی سے ساتھ لیکے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تُو پیشوائی کو*

ان کی جناب ہے۔ اے اللہ کی جناب
ذرّہ ذرا سی مہر سے بنتا ہے آفتاب
جن کو وہ چاہیں مُہرِ سلیماںؑ ہو دستیاب
خاصہ حضور کے لئے طیار کر شتاب
دیوار سے اب آنکھ کی تقدیر لڑتی ہے
لے سُن، وہ چوبِ طبل مقامی پہ پڑتی ہے

وہ بولی قابل اُن کے نہ کھانا ہے نے مکاں
ہر طرح سرفراز کرینگے شہِ زماں
جا پیشوائے خلق کی تُو پیشوائی کو*

فرش اُن کا عرش ہے تو غذا میوۂ جناں
سامان تھوڑا تھوڑا ئیں کرتی ہُوں سب یہاں
لونڈی کے گھر میں آتے ہیں عدہ وفائی کو

* یہ مصرع "جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو" دونوں بزرگوار وں کے یہاں توارد ہوگیا ہے معلوم نہیں پہلے کس نے فرمایا۔ نہ یہ خبر کہ ایک کے مصرع کی دوسرے کو خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ مرزا صاحب کے بند کو کیا انقلاب کلام میر صاحب نے مقدم مؤخر کر دیا ہے میر صاحب نے تو یہ خیال نظم فرمایا ہے۔ کہ جب دوپہر ...

باسمہ سبحانہ ونحمدہ ونصلی ونسلم

باب پانزدہم ۔ طرز کلام دبیر کا مقابلہ کلام ملٹن شاعر سے

مضمون عطیہ مخدومی و محسنی نواب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ ۔ المتخلص بہ حامد

جناب سید صاحب مخدوم و مکرم بندہ جناب سید افضل حسین صاحب ثابت زاد لطفہ و محبتہ تسلیم +

حسب الحکم حضرت دبیرؔ کے کلام کا موازنہ کرتا ہوں ۔ لیکن صرف ایک مشہور انگریزی شاعر کے کلام سے +

جناب میر صاحب ۔ میری رائے میں ایک عمر چاہئے ۔ جس نے برسوں کلام کو پڑھا ہو ۔ اور وہ بھی ایک شاعر کے کلام کو وہ اُس شاعر کے کلام پر لکھ سکتا ہے* ۔ مثلاً جن صاحبوں نے یورپ میں شکسپیر کی سوانح عمری لکھی ہے ۔ اور اُس کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔ اُنھوں نے اپنی عمریں صرف کر دی ہیں ۔ اور عمریں بھی وہ عمریں جو کروڑوں کی عمروں سے بڑی تھیں ۔ ایسی ہی مثالیں میرے پیش نظر ہیں ۔ کہ جب کسی نے حضرت انیسؒ (سے زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے) کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے ۔ تو میں نے یہ جواب دیا ہے ۔ کہ یوں تو حضرت انیسؒ کی نسبت کچھ لنڈن میں لکھا تھا ۔ اور وہ چھپا بھی تھا ۔ لیکن جو لکھنے کا حق ہے ۔ اُس کے لئے کم سے کم دس برس درکار ہیں ۔ اور پھر کوئی کام اور نہ ہو ۔ میر انیس کا کلام ہو ۔ اور میں ہوں

---

* واقعی یہ مضمون جس سخت جانکاہ حضرت سے علالت میں جناب حامد دام نیازلنے قریباً دو مہینے تک اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر ڈوس کے مقام لکھا ہے اُسکی قدر وہی بزرگوار فرماسکتے ہیں جنکو تصنیف و تالیف کا موقع ملا ہے ۔ خدا جناب ممدوح کو جزائے خیر دے ۔ کہ یہ اُن کا بہت بڑا احسان مجھ پر ہے

فصل ۱ خط جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ مقابلہ کی دقت و محنت مثال سوانح عمری حضرت انیسؒ

تو کچھ لکھوں - فرصت معلوم - اور بالفرض محال فرصت ملی بھی - تو ہائے تندرستی تجھ کو کہاں سے لاؤں - میرے لئے فرصت اور تندرستی دونوں موہوم چیزیں ہیں - جو نہ کبھی نصیب ہوئیں اور نہ ہوں - گویا یہ نعمتیں میرے لئے پیدا ہی نہیں ہوئیں - لیکن بفضلہ طبیعت بے چین پائی ہے - معمولی بیماری میں کبھی بیکار نہیں بیٹھا جاتا - ع ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے - میری تمام عمر علالت میں بسر ہوئی ہے - بچپن سے دائم المرض ہوں - کئی طولانی بیماریوں سے شفا پاکر آخر کار ذیابیطس کا شکار ہو گیا ہوں - ۱۴ برس سے اس مرض میں مبتلا ہوں بقول خود ؎

ہوئی مدت کہ حامد ناک میں دم ہے علالت سے + نہ اچھا ہی میں ہوتا ہوں نکلتا ہے نہ دم میرا

یہ تندرستی کی حالت ہے - اور اس حالت میں کسب معاش کی فکر - احبا کا خیال - قوم کی غمخواری جیساکہ اس شعر میں کہہ چکا ہوں - شعر

کسب معاش و فکر احبا و ملک و قوم + بیماریوں میں ہم یہ بصد جہان کے ہیں

عزیزوں اور دوستوں کا داغ - بقول حامد دل افگار ؎

یاد کس کس یارِ رفتہ کو کریں + گنتی گنوانے کو باقی ہم رہے ہے

خاندان کا خیال - ملک کا رونا - نفاق - حسد - بغض - کینہ - غیبت - تہمت - مکاری - دغابازی - جھوٹ - فریب - بے ایمانی وغیرہ وغیرہ عیبوں کا بازار گرم ہے - ظاہر کچھ - باطن کچھ - منہ پر تعریف - پیٹھ پیچھے برائی* - بقول خود ؎

سچ ہے کہ جن کے ظاہر و باطن میں فرق ہو + ایسوں کے قول و فعل کا پھر اعتبار کیا

آپس میں وہ پھوٹ کہ خدا کی پناہ - ہندو مسلمانوں کے آئے دن وہ جھگڑے - جو کبھی اس سے قبل نہ آنکھوں سے دیکھے نہ کانوں نے سنے - مسلمانوں کی تباہی پر دل خون ہوا جاتا ہے - ملک کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے - کہاں تک سمع خراشی کروں - المختصر میرا یہ حال ہے - جو اس شعر میں نظم کیا ہے - ؎

ملک کا حال

مجموعی مضمون

مختصر حال

*بقول دبیر مرحوم ؎ صحبت میں کچھ وغیبت میں کچھ وقت زد و گشت پہ کچھ ہیں سامنے صفت منہ پہ میں کچھ پشت پہ کچھ ہیں یہ حالت حقیر -

کچھ نشاں صدموں کے ہیں کچھ حسرتوں کے داغ ہیں + ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں ہائے اب وہ دل کہاں

یا بقول جناب استاذی مولانا (سید علی نقی صاحب) صفی لکھنوی یوں کہو ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے + آشیاں اُجڑا کیا ۔ ہم ناتواں دیکھا کئے

میری عمر کا بہت بڑا اور بہترین حصّہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے اور قانون پڑھنے میں صرف ہوا ہے ۔ ہندوستان میں تھوڑی سی عربی ۔ فارسی ۔ انگریزی پڑھ کر اپریل ۱۸۸۰ء میں جب میری عمر تخمیناً ۱۸ سال کی ہوگی انگلستان روانہ ہوا ۔ اور وہاں ساڑھے پانچ برس قیام کیا ۔ اس عرصہ میں علاوہ بیرسٹری پاس کرنے اور تھوڑی سی لاطینی و فرنچ پڑھنے کے ایک آدھ رسالہ اور متعدد مضامین لکھے ۔ انگریزی میں پوپ (Pope) اور گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے چند اشعار کی تضمین کی ۔ اور ایک مضمون انگریزی نظم میں لکھا جس کا نام **الوداع لندن** رکھا ۔ اس وقت تک زبان انگریزی میں کئی سو مضامین قلم سے نکلے ہیں ۔ انگریزی نثر و نظم میں جو کچھ لکھا ہے ۔ اُس میں سے بہت کچھ مختلف اوقات میں شائع ہو چکا ہے ۔ باقی چھپے یا نہ چھپے ۔ ع نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا ۔ **لنڈن** کے زمانہ قیام میں **ملٹن** اور **شکسپیر** کا کلام پروفیسر **مل** سے پڑھا ہے ۔ اور شعر پڑھنے کے اصول اور طریقے جس کو انگریزی میں **ریسٹیشن** (Recitation) کہتے ہیں ۔ پروفیسر **ہارٹلی** (Hartley) سے سیکھے ہیں ۔ کوئی فن خواہ وہ کتنا ہی آسان اور ادنےٰ کیوں نہ ہو ۔ نہیں آتا ۔ جب تک کہ طبیعت کو اُس سے خاص مناسبت نہ ہو ۔ اور عمر بھر اُس کے حاصل کرنے میں صرف نہ کی جائے ۔ پروفیسر **مل** نے عمر بھر کلام **ملٹن** اور شکسپیر پڑھا اور پڑھایا ۔ ملٹن اور شکسپیر پر وہ ایسے فدا تھے ۔ کہ کسی اور شاعر کا کلام پسند ہی نہ آتا تھا ۔ سچ ہے جب کوئی شخص ایک مدّت تک کسی شاعر یا نثّار کا کلام بار بار پڑھتا اور غور کرتا رہتا ہے ۔ تو اُس کو پھر اور کسی شاعر و نثار کا کلام پسند نہیں آتا ۔ یہ مثال بعینہٖ ایسی ہے ۔ کہ جب کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جاتا ہے ۔ تو اُس کو سوا اپنے معشوق کے

قیام لندن
شکسپیر و ملٹن
شعرخوانی کے اصول

اور کوئی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثل مشہور ہے۔ کہ لیلی را بچشم مجنوں باید دید۔ رند نے اِس مضمون کو خوب نظم کیا ہے۔ ؎

دید لیلی کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور + میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

عربی کی مثل مشہور ہے۔ حُبُّ الشَّیٔ یُعمِی وَیُصِمُّ۔ محبّت کسی چیز کی اندھا اور بہرا کر دیتی ہے

جب مَیں پروفیسر سے ملٹن اور شکسپیر پڑھتا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر قریب ستّر برس کے ہوگی۔ پڑھانے میں وجد کی حالت طاری ہوتی تھی۔ کُرسی سے اُچھل اُچھل پڑتے تھے۔ کھڑے ہو جاتے تھے۔ رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا۔ چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ گالوں کی جھریاں کافور ہو جاتی تھیں۔ بڈھا چہرہ جوان نظر آتا تھا۔ سر کے سفید بال (ڈاڑھی نہیں تھی) چہرے کی سُرخی کے ساتھ عجب سماں دکھاتی تھی۔ مَیں اُن کی حالت پر متحیّر رہ جاتا تھا + پروفیسر ہارٹلی صاحب ہر مقام کو خُوب ہی ادا کرتے تھے۔ اور آواز سے اور صُورت سے گویا بولتی ہُوئی تصویر بن جاتے تھے۔ ہاتھ سے زیادہ بتانے کو منع کرتے تھے*۔ وہ شعر کے پڑھنے میں نیچر (قدرت) کی پیروی کرتے تھے۔ یعنی ہر حالت۔ غُصّہ۔ محبّت۔ رنج۔ غم۔ حزن و اندوہ۔ خوشی۔ شجاعت۔ تہوّر۔ تعجب۔ حیرت۔ فکر وغیرہ وغیرہ کو کما حقہ ادا کرتے تھے۔ اور اس طرح پر کہ تصنّع بالکل نہ معلوم ہوتا تھا +

پروفیسر ہارٹلی کی عمر اُس وقت ۷۲ برس کی ہوگی۔ تمام عمر سوا شعر پڑھنے اور شعر پڑھنا سکھانے کے کوئی کام نہیں کیا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ ۲۴ گھنٹے روز صرف ہوتے ہیں۔ یہ بات برسوں کی مشق کے بغیر نہیں حاصل ہوتی۔ کہ جو مضامین نظم میں پڑھے جائیں۔ اُن کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو۔ کہ جو کیفیتیں منظوم ہیں۔ وہ پڑھنے والے

پروفیسر ہارٹلی کا حال

زیادہ بتانا منع تھا

شعر پڑھنے کی خوبی

* یہی خیال مرزا دبیر مرحوم کا تھا۔ وہ ہاتھ سے زیادہ بتانے کے بالکل مخالف تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ بس جتنا ہاتھ باتیں کرنے میں اُٹھتا ہے اُتنا ہی اُٹھانا چاہئے۔ اور جتنا تم باتوں میں اشارے چشم و ابرو وغیرہ کے کرتے ہو۔ اتنے ہی مرثیہ پڑھنے میں کیا کرو۔ فی زمانا مرثیہ پڑھنے میں تانگی سے امر تعزیہ بڑھ گئی ہے۔ کہ بعض آدمی اُسکو رقص منبری کہتے ہیں۔ ذاکروں کو اس کی احتیاط ضرور چاہئے ۱۲ ثابت مؤلف۔

پر گذر رہی ہیں۔ اور اُن کے اظہار میں کسی قسم کی بناوٹ معلوم نہ ہو*۔ جیسے ایک مہذب آدمی اپنی
تقریر میں بہت کم ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح شعر کے پڑھنے میں بھی اس امر کا لحاظ رکھنا
چاہئے۔ یہ لکھتے لکھتے مجھ کو ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں پروفیسر ہارٹلی سے لیڈی کلیرا
ویرڈے ویر (Lady Clara Vere de Vere) کا پڑھنا سیکھتا تھا
جو لارڈ ٹینیسن (Lord Tennyson) مشہور شاعر انگلستان کی مشہور نظم ہے
اس نظم میں ایک مصرع ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے "وہ شیر جو تمہارے پرانے پتھر کے
پھاٹک پر ہے"۔ اُستاد نے فرمایا۔ کہ اگر پھاٹک کی طرف اُنگلی سے اشارہ کریں۔ تو
بہتر ہے۔ اور یہ فرما کر مصرع کا اعادہ کیا۔ اور اُنگلی کو ذرا گشت دے کر (جب مصرع کا
اعادہ کیا تھا) پھاٹک کو بتلایا۔ اُسی وقت اُنگلی پھاٹک پر پہنچی۔ جس وقت لفظ
پھاٹک مُنہ سے نکلا۔ اور اس طرح کہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا بالکل قصد ہی نہ تھا۔
جب مَیں نے بتایا۔ تو کبھی اُنگلی پہلے پہنچی۔ اور کبھی لفظ پھاٹک پہلے زبان سے
نکلا۔ تھوڑے دنوں کی مشق کے بعد اُنگلی اُس وقت پہنچتی تھی۔ جب لفظ پھاٹک مُنہ سے
نکلتا تھا۔ لیکن بناوٹ ظاہر ہوتی تھی۔ الغرض قریب ایک ماہ کی مشق کے بعد یہ بات
میسّر ہوئی۔ کہ اُنگلی اُسی وقت پھاٹک کو بتاتی تھی۔ (اور بلا قصد و تصنّع بتاتی تھی) کہ
جب لفظ پھاٹک مُنہ سے نکلتا تھا +

بغیر بناوٹ کے

بڑی مشکل اُس وقت پڑتی ہے۔ کہ جب ایک مصرع میں متناقض الفاظ قریب قریب

*۔ اس موقع پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آگیا۔ ایک مجلس عزا میں ایک صاحب مرثیہ منبر پر پڑھ رہے تھے۔ وہ اچھے پڑھنے والے ذاکر تھے مگر حد سے زیادہ بتاتے تھے۔ پہلوان کی لڑائی کا موقع تھا۔ اتفاقاً یہ مصرع آگیا کہ ع آیا تھا بھبکتا ہوا دبکتا ہوا بھاگا۔ وہ ذاکر پہلے تو بھبکے اور پھر منبر پر اس طرح دبکے کہ تمام جسم اپنا سمیٹ کر پیچھے کو ہٹے گویا بالکل گھٹ گئے۔ بن گئے۔ تمام مجلس بے اختیار ہنس پڑی۔ یا وجودیکہ وہ پڑھ رہے تھے مجلس میں ہنسی رکتی نہ تھی۔ لوگ مُنہ پر رومال رکھ رکھ کر ہنستے تھے۔ یہاں تک کہ حال شہادت پڑھے مگر رقت نہ ہوئی۔ لوگوں کو وہی خیال ذہن نشین رہا۔ مطلب اس حکایت لکھنے سے یہ ہے۔ کہ ذاکر اتنا نہ بتائے کہ مجلس کی رقت اُٹھ جائے۔ + ثابت۔

ہوں۔ جیسے رنج و خوشی تکلیف و آرام۔ محبّت و عداوت۔ نفرت و رغبت وغیرہ وغیرہ۔ اُس وقت لفظ رنج کو حُزن کی آواز سے پڑھنا اور پھر فوراً آواز و صورت بدلنا جس سے خوشی ظاہر ہو۔ اور اس طرح بدلنا کہ گویا بلا قصد خود بخود آواز و صورت بدل گئی۔ محبت و رغبت اُس آواز سے ادا ہو۔ جس سے محبّت ٹپکے۔ اور پھر فوراً آواز میں وہ تغیّر پیدا ہو۔ کہ جس سے عداوت و نفرت برسے۔ کسی[✻] اُستاد کامل کے پڑھنے میں ان مقامات کا وہ لطف ملتا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ حق مغفرت کرے حضرت **نفیس**ؒ یاد آ گئے۔ دو تین واقعات سُنئے۔ خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔ لیکن قبل اس کے ایک دو باتیں اور عرض کرنے کی اجازت مانگتا ہُوں +

نفیس مرحوم

جب حضرت **انیس**ؒ نے انتقال فرمایا۔ اُس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ مَیں نے کبھی حضرت انیسؒ کو پڑھتے نہیں سُنا۔ لیکن یہ سُنا ہے۔ کہ بے مثل پڑھتے تھے۔ ویسا پڑھنے والا ہندوستان میں پیدا نہیں ہُوا۔ مَیں نے جناب **مونس** کو بھی نہیں سُنا۔ لیکن جناب انس و نفیس کو سُنا۔ اور انگلستان سے واپس آنے کے بعد سُنا۔ انسؒ خُوب ہی پڑھتے تھے۔ خصوصاً **بَین** +

انیس مرحوم کا پڑھنا

ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ جناب میر **نفیس** مرحوم ۲۵ **رجب** کی مجلس دلآرام کی بارہ دری (واقعہ محلہ چوپٹیاں لکھنؤ) میں پڑھ رہے ہیں۔ ہزارہا آدمی جمع ہیں۔ مَیں بھی شریک ہُوں۔ **تعریف** کے نعرے بلند ہیں۔ ایک مقام آیا۔ میر **نفیس**ؒ نے مرثیہ کو نیچا کر لیا۔ اس طرح کہ گویا خود ہی نیچا ہو گیا۔ **بیت** پڑھی اور **خوب کھینچ** کر پڑھی۔ **بیت** نے **خوب رنگ**

(۱) بیت اول کا حال میر نفیس

✻ جو صاحب ذاکر ہوں یا اسپیچ دینے والے یا شاعر یا واعظ وغیرہ۔ وہ ان مقامات کو بغور دیکھیں عجب نکات بیان فرما ہے میں حقیر نے بھی کم سنی میں کئی برس تک مرثیہ پڑھنا اور مختلف مقامات کو مختلف آوازوں و لہجوں اور اشارات سے ادا کرنا باقاعدہ اپنے نانا مرحوم (میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی) سے سیکھا ہے۔ جو اس فن خاص میں یکتا تھے۔ انیس و دبیر و انس و مونس و سلیس و نفیس و عشق علیہ الرحمہ سب اساتذہ اُن کے پڑھنے کے مدّاح تھے۔ اس لئے اس تحریک کا تمسکر تا ہوں + ۲ مؤلف حقیر۔

دیا۔ دوسرے بند کے شروع میں تلوار کھینچنے کا ذکر تھا۔ جناب نفیس داہنے ہاتھ کو بائیں طرف لیگئے۔ اس طرح کہ گویا ہاتھ بلا ارادہ اُدھر چلا گیا۔ پھر تلوار کھینچی۔ اور اِس خوبصورتی سے کھینچی۔ کہ دل پھڑک گئے۔ اگر مرثیہ نیچا نہ ہوتا۔ تو یہ بانکپن اور صفائی ممکن نہ تھی +

حکایت دوم۔ ایک اور مجلس اسی دلآرام کی بارہ دری میں پڑھ رہے ہیں۔ مرثیہ خوب رنگ دے رہا ہے۔ سامعین پر عجب حالت طاری ہے۔ وہ بند گھوڑے کی تعریف میں ہیں۔ ایک مقام پر میر صاحب کچھ رُکے (میں منبر کے قریب تھا۔ میں نے دُور سے۔ قریب سے۔ وسط مجلس سے جناب میر صاحب کو سُنا ہے۔ تاکہ پڑھنے کا کما حقہٗ اندازہ کر سکوں) ٹھیرے۔ دم لیا۔ خوب گہری سانس بھری۔ پوری سانس کھینچ کر ہونٹوں پر لائے۔ یہ تمام باتیں اس حُسن وخوبی سے ادا ہوئیں۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح کہ معلوم نہ ہوں۔ پھر جناب میر صاحب نے نہایت زور اور تیزی سے پڑھا "وہ اُڑ گیا"۔ گھوڑے کا اُڑنا آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اگر وہ "وہ اُڑ گیا"، کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے۔ تو خاک لُطف نہ آتا +

ایک واقعہ اور سُن لیجئے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جناب نفیس صاحب کی آواز بعد گھنٹوں کے پڑھنے کے جب خستہ ہو جاتی تھی۔ اور وہ مرثیہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ایسی آواز نکالتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ آواز الگ کسی خزانہ میں محفوظ تھی۔ اور اس سے ابتک کام نہیں لیا گیا۔ لندن کے بعض کاملین میں بھی میں نے یہ صفت دیکھی ہے +

حکایت سوم۔ ایک مرتبہ ۲۵ رجب ۱۳۱۰ھ کو دلآرام کی بارہ دری میں میر صاحب کو میں نے سُنا۔ پڑھے اور خوب پڑھے۔ جب مجلس ختم ہوئی۔ جناب میر صاحب کے پاس میں گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ اُن کے کلام اور پڑھنے کی تعریف کرتا

رہا جب رخصت ہوُا۔ جناب میر صاحب کو عجب حسرت بھری نگاہوں سے میں نے دیکھا۔ میرے ساتھ چند میرے عنایت فرما تھے۔ اُن سے میں نے راہ میں آہ سرد بھر کر کہا۔ کہ افسوس آج میر صاحب کو آخر مرتبہ سُنا۔ اب سُننا میسّر نہ ہوگا۔ اس حالت ضعف و پیرانہ سالی میں پڑھے۔ اور لاجواب پڑھے۔ لیکن جب مرثیہ ختم کرنے کو تھے۔ اُس وقت کوشش کی۔ اور زور لگایا۔ کہ وہ آواز جس سے معلوم ہو۔ کہ ابتک کام نہیں لیا گیا ہے۔ اور بالکل تازہ آواز ہے۔ نکلے۔ لیکن ضعف و نقاہت کی وجہ سے وہ آواز صرف ایک دو منٹ کیلئے نکلی۔ گویا نہ نکلی ✤

افسوس ہزار افسوس ایسا ہی ہوُا۔ پھر جناب میر صاحب نے کوئی مجلس نہیں پڑھی۔ چند ماہ بعد ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۵ مارچ ۱۹۰۱ء کو انتقال فرمایا۔[1] اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ✤

تاریخ انتقال میر نفیس مرحوم

ہائے۔ نفیس کہاں۔ وحید کہاں۔ اُنس کہاں۔ مونس کہاں۔ انیس کہاں۔ دبیر کہاں۔ وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا۔ جس میں یہ لوگ ڈھلتے تھے ✤ جناب میر صاحب! یہ سرگذشت نوشن چکے۔ سمع خراشی کی۔ لیکن ابھی اور سمع خراشی کرونگا۔ میں اُن لوگوں میں ہوُں۔ جو تعداد کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ خوبیوں کو دیکھتے ہیں۔ جو یہ نہیں دیکھتے۔ کہ عمر بھر میں شاعر نے کے دیوان کہے۔ بلکہ یہ کہ کس قدر اچھے شعر کہے۔ ایک عربی شاعر کا قول ہے۔ کہ جس نے عمر بھر میں تین شعر کہدئے وہ شاعر ہے۔

مختصر مگر اچھا کلام

---

[1] حقیر ثابت نے چند تاریخیں کہی تھیں جو اُس زمانے کے اکثر اخبارون نے چھاپی تھیں۔ ایک باعی میں تاریخ تھی جس میں ثناخوان علیؑ سے پورے ۱۳۱۸ھ نکلتے تھے۔ شاید پورا مصرع یہ ہے۔ رضواں بجناں گفت ثناخوان علیؑ ✤

[2] مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر فخر کرتے ہیں کہ جناب میر خورشید علی صاحب نفیس اُن کی نسبت فرماتے تھے۔ کہ تم اپنا کلام سُنا کر مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اور مجلس میں آپکا تشریف رکھنا برابر دو ہزار سامعین کے جو سخن فہم ہوں سمجھتا ہوں ✤ ۱۲ ثابت

میری رائے میں اگر ایک شعر بھی کہدیا۔ تو میں اُس کو شاعر کہونگا۔* اور مجھ کو اس سے بھی بحث نہیں۔ کہ کتنی دیر میں کہا۔ میں نتیجۂ فکر کو دیکھتا ہوں۔ خواہ وہ کتنی ہی دیر میں ہو۔ یا جلد ہو۔ اور اگر جلد بھی ہو۔ تو اور قابل تعریف ہے۔ لارڈ بائرن (Lord Byron) کی اکثر نظمیں ایسی ہیں۔ کہ نظر ثانی کی نوبت نہیں پہنچی۔ لیکن اُن کی عمدگی میں کلام نہیں۔ گرے (Gray) کی ایلیجی (Elegy) جس میں کل چونسٹھ ۶۴ اشعار ہیں۔ اگر میرا حافظ غلطی نہیں کرتا ہے۔ (میں اُس جگہ سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ جہاں کوئی کتاب میرے پاس نہیں ہے) مدت مدید غالباً بارہ برس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہر مصرع جزو زبان انگریزی ہو گیا ہے۔ اور جب تک انگریزی زبان روئے زمین پر رہیگی۔ اُس کے ساتھ وابستہ رہیگا۔ گرے کا اگر اور کلام نہ ہوتا۔ اور صرف یہی ایلیجی (Elegy) ہوتی۔ تو انگریزی مبصرین کی یہ رائے ہے۔ کہ ہم گرے (Gray) کو بہترین شعرا میں شمار کرتے۔ جیسا اب شمار کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بالاتر +

بیریل آف سر جان مور (Burial of sir John moore) میں کل سولہ شعر ہیں۔ چارلس ولف (Charles Wolfe) نے جس نے ۱۸۲۳ء میں ۳۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ نظم کہی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ سوا اس نظم کے اور کوئی نظم اس شاعر کی دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ نظم بہت مشہور ہے۔ اور محض اسی نظم کی وجہ سے ولف (Wolf) شاعر سمجھا جاتا ہے +

تعریف اچھے شعر کی

اچھا شعر کس کو کہتے ہیں۔ اس بحث میں پڑنا میرا مقصود نہیں۔ مجھ کو اس قدر

* عالیجناب مولانا و سیدنا دی آنریبل مسٹر جسٹس مولوی سید کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے جو عربی لٹریچر میں بے نظیر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ نیز علوم قدیمہ و جدیدہ بلکہ جامعیت فضل و کمالات میں بجز عالیجناب شمس العلما سحبۃ الافاضل نواب مولوی سید امداد امام صاحب قبلہ رئیس نیورہ اور معاصرات پٹنہ اپنا ہمسر نہیں رکھتے۔ جنکی دوستی پر حکیم مسٹر حامد علی خاں صاحب کو فخر ہے۔ مسٹر موصوف کا یہ شعر سنکر ارشاد فرمایا کہ "میں ایک شاعر سمجھتا ہوں"۔ وہ شعر یہ ہے۔ جہاں خدا کے سوا اور کچھ نہیں حاضر۔ وہاں پہ جا کے ٹھہرتا ہے سلسلہ دل کا + ۱۲ ثابت۔

بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ مضمون شعر کو میں خوبصورت زندہ جسم سمجھتا ہوں۔ اور الفاظ کو اچھا لباس۔ اگر مضمون نہیں تو محض الفاظ سے لطف پیدا نہیں ہوتا۔ حسن ذاتی نہیں تو لباس حسن پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر مضمون اچھا نہیں۔ تو الفاظ کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں مضمون کو اچھا نہیں بنا سکتے +

شعر کے متعلق میں اپنے خیالات اپنے الفاظ میں نہیں بیان کرتا۔ بلکہ حضرت حالی مدظلہ العالی کے بے مثل الفاظ میں مقدمہ شعر و شاعری میں (جو دیوان حالی کے شروع میں ہے) فرماتے ہیں "کھانے کی اصل خوبی یہ ہے۔ کہ لذیذ ہو۔ مفید ہو۔ جزو بدن بننے کے لائق ہو۔ بو باس اور رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے۔ تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے شعر کی اصل خوبی یہ ہے۔ کہ سحر کن ہو۔ مؤثر ہو۔ لفظاً اور معناً سانچے میں ڈھلا ہو۔ اور اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اُس میں پائی جائے۔ تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اُس کی کچھ ضرورت نہیں"۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۷۲) جیسے مرزا دبیر صاحب (اُس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہے ؎ پرچم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) فرماتے ہیں ؎

مقولہ جناب حالی

تلوار کا پھل پھول گیا شہ کے سخن سے + قبضہ نے ملی آنکھ کف نور فگن سے
یوں نکلا نیام کمر شاہ زمن سے + جیسے سخن حق کسی عارف کے دہن سے

پہلے مصرع میں پھل۔ پھول۔ دوسرے میں آنکھ۔ کف۔ یہ لفظی رعایتیں ہیں۔ لیکن سبحان اللہ۔ کس حسن سے "پھول گیا" بمعنی خوش ہوا قبضے کی شکل آنکھ سے مشابہ ہے۔ اور پھر کف نور فگن سے آنکھ ملنا۔ سبحان اللہ۔ تیسرے اور چوتھے مصرع میں تمثیل کا لطف بیان نہیں ہو سکتا۔ سخن فہموں کے دلوں سے پوچھئے*+

*امام عصر (نائب رسول) کی تلوار جہاد میں نکلی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ کہ جیسے کلمہ حق کسی عارف کے دہن سے نکلے۔ یہ تشبیہ نہ عام

اہل سیف کیلئے ہو سکتی ہے نہ عام تلوار کے لئے۔ خاندان رسالت کیلئے ہر جگہ مقام اثر کا خیال رکھنا اور ایسی مرج کرنا جو دوسروں کیلئے موزوں

بقول [illegible] شاعری کی خوبی یہ ہے [illegible] ہو۔ جو [illegible] بھرا ہوا ہو۔ اور اصلیت

مبنی ہو۔ اس مضمون کو کیا کیا اچھی طرح انگریزی شاعروں نے بیان کیا ہے۔ چند اقوال یاد آ گئے۔ عرض کرتا ہوں۔ حتے الامکان ترجمہ میں خیالات و الفاظ کی پابندی کرونگا +

رابرٹسن کا مقولہ تخیل

فریڈرک ڈبلیو رابرٹسن صاحب (Fredrick W. Robertoon) لکھتے ہیں "جذبات کی زبان کا نام شاعری ہے۔ وہ انجنیشن یعنی تخئیل کی تصنیف ہے جس کو صنعت جامہ ہستی سے آراستہ کرتی ہے" +

کیمبل کا قول

کیمبل (Campbell) کا قول ہے "اصلیت کی فصاحت کو شاعری کہتے ہیں" +

رچیٹر کا قول

رچیٹر (Richter) کی رائے ہے "بہت سے نازک اور پاکیزہ جذبات جو مثل فرشتوں کے وجود کے ہماری باطنی دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو جسمانی لباس میں نمایاں نہیں ہوتے۔ اور بہت سے خوب صورت اور خوش رنگ پھول ایسے ہیں۔ جن کے بیج نہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ نظم ایجاد ہوئی جس کی بدولت وہ وجود جامہ ہستی میں نظر آتے ہیں۔ اور اُن پھولوں کی بُو سے ہمارے دماغ تر و تازہ ہوتے ہیں" +

سٹرلنگ کا مقولہ

اسٹرلنگ (Sterling) کا قول ہے "شاعری فی نفسہٖ ایک قوت اور مسرت ہے۔ اس کی حالت یکساں ہے۔ خواہ بنی نوع انسان اس کو اپنے سر کا تاج بنائیں۔ یا اس کو تن تنہا کسی جادو کے بنے ہوئے مکان میں چھوڑ دیں" +

کولیرج کا قول

کولیرج (Coleridge) کہتا ہے۔ کہ "بہر کار شاعری سے مجھ کو بڑے بڑے انعام ملے ہیں۔ شاعری نے میرے زخموں پر مرہم لگایا ہے۔ میری خوشیوں کو زیادہ کیا ہے۔ اور اُن پر صیقل کی ہے۔ گوشۂ تنہائی کو عزیز کیا ہے۔ اور یہ صفت مجھ میں شاعری ہی کی بدولت ہے۔ کہ جو کچھ اپنے قریب یا دُور دیکھتا ہوں

اُس میں اچھائی۔ بہتری اور خوبصورتی نظر آتی ہے"۔

قول شیلی

شیلی (Shelley) کہتا ہے۔ کہ "شاعری دُنیا کے پوشیدہ حسن کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیتی ہے۔ اور ہم اُن خط و خال اور نقش و نگار کو دیکھتے ہیں۔ جو آنکھ سے اوجھل تھے"۔

شیکسپیر

حضرت شکسپیر (Shakespear) فرماتے ہیں "دیوانہ۔ عاشق۔ شاعر قوّت متخیلہ سے مرکّب ہیں۔ ایک کو اُس قدر شیطان نظر آتے ہیں۔ جن کی وسیع دوزخ میں گنجائش نہیں۔ اس کو مجنون کہتے ہیں۔ عاشق ایسا ہی دیوانہ ہے۔ جس کو ہیلن کا حسن ابروے مصر میں نظر آتا ہے۔

شاعر کی آنکھ ایک دیوانی گردش میں عرش سے زمین اور زمین* سے عرش تک دیکھتی ہے۔ اور جو ہیں اجنیش یعنی تخیّل اُن اشیا کو پیدا کرتا ہے۔ جن کی شکلیں معلوم نہ تھیں۔ شاعر کا قلم اُن کو لباس ہستی پہناتا ہے۔ اور عدم کو وجود کر دکھاتا ہے"۔

ڈاکٹر جانسن

ڈاکٹر جانسن (Johnson) فرماتے ہیں "شاعر کے لئے کوئی شے فضول نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ خوبصورت تحیّر خیز یعنی اعلےٰ سے اعلےٰ اور ادنےٰ سے ادنےٰ چیزیں ہیں قوت متخلیہ اُن سب سے واقف ہے۔ باغوں میں درخت اور پودے۔ جنگلوں میں حیوانات۔ زمین میں معدنیات۔ آسمان کے شہاب۔ شاعر کے دماغ میں لاانتہاہی قسم کے خیالات جمع کرتے ہیں۔ ہر خیال اخلاقی یا مذہبی صداقت کی تصریح یا زینت ہے۔ اور جس کی معلومات وسیع ہیں وہ مختلف سین کو مختلف طرح سے بیان کرسکیگا۔ اور اُس کے ناظرین دُور کے

---

* حضرت دبیرؔ فرماتے ہیں پستی سے مراد ہن سوے اوج ہے بتیاح۔ ہمراہ کواکب ہیں لئے ہاتھ میں مصباح۔ ظاہر ہے مراقفل در عرش کی مفتاح۔ جبریلؑ جو بتلاتے ہیں سو لکھتا ہے مدّاح ٭ ثابت۔

کتابوں اور غیر متر قبہ تعلیم مضامین سے محظوظ اور مستفیض ہونگے +

بیلی

بیلی (Bailey) شاعر نے شاعری پر ایک مبسوط النظم لکھی ہے ـ جس میں وہ بیان کرتا ہے ـ کہ شاعر خیالات پیدا نہیں کرتے ـ بلکہ خیالات شاعروں میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں ※ ـ جیسے جنگلوں میں قدرت خدا سے خودرو پھول یا درخت ـ شاعر کا جسم اور اُس کی رُوح نیچر سے وابستہ ہے ـ اور اُس کے دل پر کائنات کی صُورتیں جلی حرفوں سے مُنقّش ہیں ـ شاعر عشق کی سی گراں بہا شے اور بڑے بڑے اُصولوں کا خزانہ دل میں رکھتے ہیں ـ اور اُن کو نہایت خوبی اور حُسن سے بیان کرتے ہیں ـ اور سب کی جڑ عشق ہے ـ شاعری کتابوں میں مقیّد نہیں ہے ـ وہ قوّت وہ رُوح جس کی تجھ کو تلاش ہے ـ تیرے ہی آس پاس ہے ـ تجھی میں تو ہے ـ اور پھر ہر جگہ موجود ہے +

جو صفتیں شاعر و شاعری کی اُوپر نہایت مختصر طور سے بیان کی گئی ہیں ـ وہ بقول رچرڈسن (Richardson) ملٹن اور ملٹن کے کلام اور خصوصاً پیری ڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں پائی جاتی ہیں ـ رچرڈسن کہتا ہے ـ نظم جس کا نام ہے ـ وہ تو ملٹن کی پیری ڈائز لاسٹ میں ہے +

واقعات نہایت ہی کم ہیں ـ اور وسعت بیان نے اُن کو اللہ اللہ کیا کر دکھایا ہے ـ نئے نئے عالم ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا کر دئے ہیں ـ اور نیچر کے کیسے کیسے مشاہدات ـ جن سے قدرت خدا نظر آتی ہے ـ نیچر کی تصویر اس سے بہتر پہلے کسی

※ حقیر ثابت کا یہ خیال ہے ـ کہ جو خیالات خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ـ اُن کو آمد ـ اور جو شاعر فکر و غور کے بعد پیدا کرتا ہے ـ اُن کو آورد کہتے ہیں ـ یہی مضامین آمد و آورد میں فرق ہے ـ مضامین آمد کا مرتبہ مضامین آورد سے بہت اعلیٰ ہے ـ ہاں بعض اُستادوں کے مضامین آورد میں بھی آمد کی شان پیدا ہو جاتی ہے ـ اس کو کثرت مشق کا نتیجہ یا خداداد طبیعت کا جوش یا جو چاہئے کہئے + ۱۲ مؤلف حقیر ـ

شاعر نے نہیں کھینچی۔ نیچر کے سانچے میں خیالات ڈھلے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ انسان کی ہر دل عزیزی کی تصویر اُس سے بہتر کھینچی گئی ہے۔ جو بہترین مصوّروں نے اپنی تصویروں اور مورتوں میں کھینچی ہے۔ اور یہ تمام اعلےٰ خیالات نہایت مؤثر اور دل فریب طرز میں ادا کئے گئے ہیں۔ ناظرین کے دل خوشی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ کھچتے ہیں۔ متاثر ہوتے ہیں۔ نرم ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ نقوش جو شاعر دل پر جمانا چاہتا ہے۔ بخوبی جم جائیں۔ اس نظم سے فوّارۂ علم و پارسائی و نیکی جاری ہے۔ اور دریائے اطمینان قلب۔ جمیعت خاطر۔ شادمانی و مسرّت موج زن ہے۔ یہ منظر اُنہیں ناظرین کو نظر آتے ہیں۔ جو مفہوم شاعر پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ اور اُس کی نظم کے راگ کو بغور سُنتے ہیں۔*

ملٹن اور ڈرائڈن رابرٹ براوننگ

میرا قصد یہ ہے۔ کہ مَیں تعمیل ارشاد اس طرح کروں۔ کہ میں ملٹن کے کلام سے کچھ مقابلہ کروں۔ میرے نزدیک دو اَور بھی شاعر انگریزی زبان میں ہیں۔ جن سے موازنہ ہوسکتا ہے۔ ایک ڈرائڈن (Dryden) جو ۹ دسمبر ۱۶۳۱ء میں پیدا ہوُا۔ اور ۸ نومبر ۱۷۰۰ء کو انتقال کرگیا۔ اور مُتأخرین میں رابرٹ براوننگ (Robert Browning) جو ۷ مئی ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوُا۔ اور جس نے ۱۲ دسمبر ۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ اتنی فرصت نہیں۔ کہ مَیں ڈرائیڈن اور رابرٹ براوننگ سے مقابلہ کرسکوں۔ لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ڈرائیڈن کا نمبر متقدمین میں ملٹن کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ اور زندگی میں تو ملٹن سے زیادہ سمجھا

---

* شعر گوئی کی موج حقیر نے اس رباعی میں نظم کی ہے۔ (رباعی) مضمون سے فکر جب ہم آغوش ہُوئی + یاد دُنیا دوں فراموش ہُوئی + ساکت جو ہُوئی زباں۔ مٹا سوز و گداز + جلنے سے بچی شمع جو خاموش ہُوئی + ہر چند سادہ کے اقوال کے ساتھ اس کو بیان کرنا ضروری نہیں ہے مگر یہ فائدہ مزید شعر گوئی کا میرے خیال میں تھا۔ اُس کو بھی ناظرین کی خدمت میں موقع پر پیش کردیا + ۱۳ ثابت۔

جاتا تھا۔ اور رابرٹ براوننگ اُنیسویں صدی کے شعرا میں نہایت ممتاز ہے۔ اور اپنے ہم عصر الفریڈ ٹینیسن (Alfred Tennyson) جیسے فصیح اور شیریں زبان شاعر کے ہم عنان (جس کی پیدائش ۶ر اگست ۱۸۰۹ء اور وفات ۶ر اکتوبر ۱۸۹۲ء میں ہوئی) اُنیسویں صدی کے آخری دور شاعری کے میدان کو باہم تقسیم کرتا ہے۔ ملٹن اور ڈرائیڈن نثار بھی تھے۔ خصوصاً ملٹن بہت زبردست نثار سمجھا جاتا ہے۔ جناب مرزا دبیر کی نثر نہیں نے دیکھی۔ اور نہ کبھی سُنا۔ کہ جناب مرزا صاحب نے نثر میں کچھ فرمایا ہے[1]۔ البتہ یہ معتبر ذریعہ سے سُنا ہے۔ کہ دو دیوان اُردو جناب مرزا صاحب کے ہیں۔ لیکن اُن کے شائع ہونے کی جناب مرزا صاحب نے ممانعت فرمادی ہے۔ ملٹن ۹ دسمبر ۱۶۰۸ء کو پیدا ہُوا۔ اور ۸ نومبر ۱۶۷۴ء کو مرگیا۔ تمام عمر افلاس و پریشانی میں بسر ہوئی[2]۔ خصوصاً اُس وقت کی تکلیفوں کی انتہا نہیں۔ کہ جب پیریڈائز لاسٹ (Paradise Lost) کہا ہے۔ جس سے ملٹن کا نام صفحۂ روزگار پر ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ڈرائیڈن سے باکمال شاعر نے ملٹن کی تعریف

مختصر حالات ملٹن

---

[1] جہاں تک مجھکو علم ہے۔ مرزا صاحب جس کسی کو خط لکھتے تھے فارسی میں لکھتے تھے۔ اردو میں اُنکا صرف ایک رقعہ میں نے دیکھا ہے۔ جو نانا مرحوم کے نام اُنہوں نے تحریر فرمایا تھا۔ وہ صحیح نثر ایسی تھی جیسے باتیں کرتے ہیں۔ ایک کتاب بھی مرزا صاحب کی تصنیف مطبع یوسفی دہلی میں چھپی ہے جس کا نام ابواب المصائب ہے۔ اور جو ۱۲۰۵ھ ہجری عہد شاہ زمان اودھ نصیر الدین حیدر مرحوم کی تصنیف ہے۔ اسکی عبارت فسانہ عجائب کے رنگ پر مقفٰی مسجع تو نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ روانی نہیں ہے جو مرزا غالب مرحوم کے رقعات عود ہندی و اردوے معلیٰ میں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے۔ کہ عہد نصیر الدین حیدر تک مرزا غالب مرحوم بھی فارسی میں خط لکھتے تھے۔ اُس زمانے میں خلد آشیاں مغفور نے اتنی سلیس اردو لکھدی ہے اس لئے قابل مدح ہے۔ ورنہ معمولی اردو ہے۔ آخر کتاب میں مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ صرف ایک ہفتہ میں یہ کتاب تصنیف کی ہے ✦ ثابت

[2] شاعر کی پریشانی و افلاس کے ذکر میں مجھے جناب مشیر مرحوم یاد آگئے۔ فرماتے ہیں ۔ رزاقی جناب الٰہی کے میں فدا ✦ کھانا تو ملتا ہے۔ پینا مگر گیا ✦ حسرت میں ولولوں کی چڑھائی اُتر گئی ✦ افسوس نامراد جوانی گذر گئی ✦ ثابت ۔

میں چند اشعار کہے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے۔ ایک مصرع کا ترجمہ ایک ہی مصرع میں کیا ہے۔

تین شاعر تین دوروں میں مگر پیدا ہوئے — جو گریس اٹلی کا حسن اور انگلستان کا ہوئے
قوت تخیل میں اوّل ہی سبقت لے گیا — دُوسرا شوکت میں فائق تیسرا دونوں میں تھا
قوت نیچر کہیں آگے چلے ممکن نہ تھا — پہلے دو شاعر ملا کر تیسرا پیدا کیا

مدح ملٹن زبانی ڈرائیڈن

اوّل سے مراد ہومر یونان کا۔ دُوسرے سے ورجل اٹلی کا۔ تیسرے سے ملٹن انگلستان کا شاعر ہے +

کلام ملٹن بہت ہے سب سے عمدہ کلام پیراڈائز لاسٹ ہے

ملٹن کا کلام بہت ہے۔ لیکن جس نظم پر اُس کے کمال اور شہرت کا دارومدار ہے۔ وہ پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) ہے۔ یہ تمام عمر کی فکر کا نتیجہ ہے۔ افلاس۔ کسب معاش۔ عدم فرصت نے اس خیال کو عرصہ تک پُورا نہ ہونے دیا۔ لیکن یہ خیال دل سے کبھی محو نہ ہؤا۔ آخر کار ۱۶۵۸ء میں یہ نظم شروع ہُوئی۔ اور ۱۶۶۵ء میں ختم۔ دُوسری نظم پیراڈائز ریگینڈ (Paradise Regained) اسی سلسلہ میں لکھی ہے۔ ملٹن کے سامنے جب اِن دونوں نظموں کا ذکر آتا تھا۔ اور کوئی پیراڈائز ری گینڈ کو کمتر بیان کرتا تھا۔ تو ملٹن اُس کے سُننے کی تاب نہ لاسکتا تھا حالانکہ حق بات تو یہ ہے۔ کہ پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) کہیں پیراڈائز ری گینڈ (Paradise Regained) پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں نظمیں بلینک ورس میں لکھی گئی ہیں۔ اور ملٹن انگریزی شعرا میں سب سے اوّل شاعر ہے۔ جس نے بلینک ورس کو ایپک (Epic) نظم میں صرف کیا ہے۔ ایپک نظم اُس نظم کو کہتے ہیں۔ جس میں کسی واقعہ کو مسلسل بیان کریں۔ اور واقعہ بلندی خیالات پر مبنی ہو۔ اور جس میں کارنامے کسی ہیرو (ممدوح) کے منظوم ہوں +

بلینک ورس و ایپک

پیرے ڈائز لاسٹ ۱۲ باب میں منقسم ہے۔ خدا کے حکم کی نافرمانی اور حضرت آدمؑ کے خلد سے نکلے جانے کا حال ہے۔ یہ نظم اُس حالت میں کہی ہے۔ کہ جب

ملٹن اندھا ہوگیا ہے۔ افلاس اور دیگر پریشانیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ جان کے خطرے سے رہائی پاکر اور خطروں میں مقیّد ہے۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ نظمیں لکھوا رہا ہے۔ کہ جن کی وجہ سے روئے زمین کے شاعروں میں (جو ہوئے یا آئندہ ہونگے) ہمیشہ ممتاز اور سرفراز سمجھا جائیگا۔ نظم کا لکھنے والا نہیں ملتا۔ کوئی لڑکا نہیں۔ تین لڑکیاں ہیں۔ لیکن وہ اس نظم کی قدر کیا جانیں۔ لکھوانے میں لڑکیوں کی گھرکیاں کھانا پڑتی ہیں*

فلسفۂ بعض بزرگان دیگر لاسٹ ورلڈ حالت افلاس ملٹن

یہ واقعہ مَیں نے محض اس غرض سے لکھا ہے۔ کہ ہمارے ملک کے کاملین پریشانیوں اور افلاس سے دل تنگ نہ ہوں۔ کاملین کی کچھ یونہیں گذری ہے۔ ہومر (Homer) کو دیکھئے۔ کہ جس پر یونان بلکہ روئے زمین ناز کرتا ہے۔ وہ نابینا ہوگیا ہے۔ اور افلاس کا یہ حال ہے۔ کہ دربدر بھیک مانگ کر بسر اوقات کرتا ہے۔ لیکن فکر شعر سے غافل نہیں*۔ سچ ہے۔ یہ وہ آگ ہے۔ جس کو نہ افلاس نہ جانکاہ فکریں سرد کرسکتی ہیں۔ اس مضمون میں خاص خاص مثالیں پیش کرنا جن سے موازنۂ ملٹن و دبیر ہو میرا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ کل کلام پر موافق اپنی سیر کے اجمالاً لیکن گہری نظر ڈالونگا*

ہومر کا افلاس

فصل ۳

ملٹن کی نسبت کہا گیا ہے۔ کہ اُس کی نظم کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ عالموں اور فاضلوں کے لئے ہے۔ وہ ناظرین جو انجیل اور دیگر پرانی کتابوں سے واقف ہیں۔ اُس سے پورا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ جن کو اس قسم کی تعلیم نہیں ہوئی ہے۔ اُن کو نصف سے زیادہ ملٹن کی تصنیف کے حُسن نظر نہیں آتے۔ ایسے خیالات ادا کئے ہیں اور ایسے الفاظ میں بھی ادا کئے ہیں۔ جو عام فہم نہیں ہیں۔ اور جن کے

ملٹن کی خصوصیت

* حقیر نے ایک مرثیہ میں (موج نظر ہیں) کہا ہے سہ عجیب مست عروس سخن میرخ شبو ہے۔ نہ یاسمن میں نہ نسترن میں خوشبو ہے۔ سرور اس کا کوئی پوچھے دل ملول سے۔ دماغ جن کے بسے میں سخن کے پھولوں سے ۱۲ ثابت حقیر۔

لئے خاص قابلیت اور علم درکار ہے۔ اُس کے کلام میں سلاست و دشواری دونوں موجود ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے خواہ الفاظ کے لحاظ سے۔ کبھی سادہ اور عام فہم مضامین سادہ سادہ الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ اور کبھی نہایت دقیق اور مشکل مضامین مغلق اور غیر مانوس الفاظ میں ہیں۔ ملٹن پیراڈائز لاسٹ میں موقع پاکر اپنی علمی لیاقت وفضیلت کو "جس کی کوئی انتہا نہیں" ظاہر کرتا ہے۔ قوّت متخیلہ۔ بلندی خیالات۔ کمال علم کو تاریخ اور واقعات کے ساتھ عجیب لطف سے آمیزش دیتا ہے۔ ملٹن آدمؑ و حوّاؑ کی تصویر میں اس طرح رنگ بھرتا ہے۔ کہ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ بہشت کے رہنے والے ہیں اور اُس کے قابل ہیں۔ باوصف اس کے اُن میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ کہ جن کو ہم بحیثیت انسان کے سمجھ سکیں اور اُن کی خوشی وغم میں حصّہ لے سکیں۔ ملٹن نے ان تصویروں کے کھینچنے اور رنگ بھرنے میں کمال دکھایا ہے۔ کہیں اختصار مزہ دیتا ہے کہیں وسعت بیان۔ جس کی سرحد وہم وخیال کی دُوربین سے نظر نہیں آتی۔ ملٹن کے یہاں وہ اختصار قابل مدح وثنا ہے۔ جہاں اُن واقعات کی جو انجیل میں درج ہیں پابندی کرتا ہے۔ اور اُس نے جہاں قوّت متخیلہ سے کام لیا ہے۔ وہاں دوزخ و بہشت کے وہ منظر دکھائے ہیں اور معانی وبیان کے دریا بہائے ہیں۔ کہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ سب سے مشکل حصّہ ملٹن کی نظم کا وہ ہے۔ کہ جہاں ملٹن ایسے دو شخصوں کی تصویریں کھینچتا ہے۔ کہ جن کی حالت سب بنی انسان سے جُدا ہے۔ اور جن میں وہ جذبات اور محسوسات پائے جاتے ہیں۔ جن کو خود وہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس تصویر کا اس طرح کھینچنا ملٹن ہی کا کام تھا +

کہیں اختصار کہیں وسعت بیان

یہ چند خصوصیتیں جو نہایت مختصر طور سے مَیں نے بیان کی ہیں۔ ملٹن کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور میری رائے کی تائید وسند میں ہزارہا کاملین کی رائیں

انگریزی میں موجود ہیں +

وہی خصوصیتیں حضرت دبیرؒ کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ (۱) بعض کلام ادق ہے[1] چنانچہ جناب مرحوم اس مرثیہ میں (قرآن مبین سورۂ یک آیہ ہے کس کا) فرماتے ہیں۔ ؎

یعنی کہ ہے اللہ احد ارحم و رحماں ۔۔۔ دانندہ و بینندہ و ہر مخفی و نہاں
جبار ہے قہار ہے قادر ہے قوی ہے ۔۔۔ تواب ہے وہاب ہے عادل ہے سخی ہے
اُس کے یم قدرت کے گہر حد سے فزوں ہیں ۔۔۔ ہم سب گہر یک صدف کن فیکوں ہیں
قدوس ہے سبوح ہے خالق ہے صمد ہے ۔۔۔ خلاق تن و روح ہے رازق ہے احد ہے
حیران بدایت[2] سے نہایت میں خرد ہے ۔۔۔ واقف نہ ازل اُس سے نہ آگاہ ابد ہے
اقلیم ابد کشور پائندہ ہے اُس کا
جو اُس کے سوا ہے بخدا بندہ ہے اُس کا

(۲) کلام سلیس بھی ہے رسلاست کے دل دادہ اس منظر کو ملاحظہ فرمائیں۔ زبان کی صفائی۔ سراپا۔ حزن و اندوہ و رنج کی تصویریں کن کن دل خراش لفظوں میں کھینچی ہیں۔ کہ پتھر کا دل بھی موم سے زیادہ نرم ہو جائے۔ جب میں اس مرثیہ کے بندوں کو پڑھتا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں۔ کہ لکھتے وقت جناب مرزا صاحب کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خون کے آنسو بے اختیار جاری ہیں۔ دل بیتاب ہے۔ دل کو سنبھالتا جاتا ہوں۔

---

[1] مرزا صاحب کا ادق کلام بہت مشہور ہے چنانچہ جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ سے ادیب لاثانی نے اُن کے ایک بیت کی شرح ایک سائل عظیم آبادی کے جواب میں کئی صفحوں میں تحریر فرمائی ہے جسکو میں اس کتاب میں ایک جگہ مع اصل اردو لکھ چکا ہوں بعض اصحاب یہی سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب کا اکثر کلام دقیق ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دقیق و سلیس اُنکا ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ اور سلیس کلام دقیق سے بدرجہا زیادہ ہے۔ ثابت۔

[2] بدایت کے معنی ابتدا اور نہایت سے مراد انتہا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا کی ابتدا و انتہا سے عقل عاجز و حیران ہے ۔ ۱۲ ثابت حقیر

آنکھوں سے آنسو پُوچھتا جاتا ہُوں۔ اور اس مرثیہ کے بند منتخب کرتا جاتا ہُوں۔ رائے زنی نہیں کرتا۔ انتخابات خود میری رائے کو ظاہر کر دینگے۔

حالِ علیؑ اصغر شیر خوار

حالِ علی اصغرؑ کلام دبیر

بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے — بچّے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دُودھ ہے۔ نہ پانی کے ملنے کی آس ہے — پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں مَیں دوہائی حسینؑ کی
پُتلی پھری ہے آج مرے نُورِ عین کی

فریاد یا علیؑ۔ مَیں کدھر جاؤں یا علیؑ — اِن داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علیؑ
کس طرح ان کی سانس کو ٹھہراؤں یا علیؑ — پانی کا قحط ہے مَیں کہاں پاؤں یا علیؑ
پچھلے کو آنکھ کھولی تھی۔ اب کھولتے نہیں
روتے نہیں ہُمکتے نہیں۔ بولتے نہیں

اک دم بھی ہائے۔ غم سے نہیں انفراغ ہے — تازہ ابھی جوانئ اکبرؑ کا داغ ہے
لَو پھر گئی ہے کان کی۔ گُل یہ چراغ ہے — کیا لوٹنے کو موت کے میرا ہی باغ ہے
کیا خاک میں مِلانے کو میرے ہی پیارے ہیں؟
کہدو اجل سے یہ تو علیؑ کے ستارے ہیں

(ماں کے ارمان)

ماں کے ارمان

مَیں کہتی تھی نجف میں انہیں لیکے جاؤنگی — شاہِ نجف کا ان کو مُجاور بناؤنگی
اُنگلی پکڑ کے۔ گِردِ لحد کے پھراؤنگی — ہے ہے انہیں کو قبر میں اب مَیں سُلاؤنگی

ماں کی مرادیں بیان فرما کر بیت لکھی ہے۔

سُنّت کے طوق پڑھ چکے۔ پروان چڑھ چکے — یٰسین کا وقت آگیا* قرآن پڑھ چکے

* عام اہلِ اسلام میں جب جان نکلنے کو ہوتی ہے۔ تو آسانی جاں کندنی کے خیال سے سورۂ یٰسین پڑھا جاتا ہے۔ اس مناسبت

اب کس کی بامراد بڑھاؤ نگی ہنسلیاں ہے ہے کرخت ہوگئیں یہ نرم اُنگلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پتلیاں لے لے کے اُلٹی سانس گراتے ہیں بجلیاں
باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
مُنہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

اچھی عادتیں

رونا نہ جانتے تھے سدا مُسکراتے تھے پھیلا کے ہاتھ گود میں سب کی یہ آتے تھے
خاطر سے میری جھولے میں سو لیٹ جاتے تھے جاتی تھی میں جدھر یہ اُدھر مُنہ پھراتے تھے
کس کی نظر لگی؟ کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاؤ پیار اب نہ رہا۔ آنکھ پھر گئی

کم سن بہن اپنے چھوٹے بھائی کو یوں بہلاتی ہے :-

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے ہاتھوں میں لیکے اُنکے کھلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سُناتی ہے من جاؤ بھائی جان سکینہ مناتی ہے
کڑھتی ہیں اماں۔ آنکھ کو تم کھولتے نہیں
اللہ۔ ہم پکارتے ہیں۔ بولتے نہیں

(واقعات کا مرقع)

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم سہلا رہے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر "ڈھلا ہوا" رکھتے ہیں دم بدم چھاتی پہ ہاتھ رکھکے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو۔ کو دیکھتے ہیں۔ تو مُنہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بُلاؤ۔ امامؑ کو لاؤ خدا کے واسطے لاؤ۔ امامؑ کو
اس بے زباں کا حال سُناؤ۔ امامؑ کو نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ۔ امامؑ کو

اچھی عادتیں

کم سن بہن کا بہلانا

واقعات کا مرقع

اکبرؑ کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو۔ وہ ابھی ہونگے راہ میں

حضرتؑ کے گوش حق نیوش میں بیبیوں کی آواز اُس وقت پہنچی ہے۔ کہ علی اکبرؑ کی لاش مقتل میں لٹا رہے تھے۔ حضرتؑ نوجوان بیٹے کی لاش سے یہ فرما کر رخصت ہوئے "۔ اکبرؑ! تمہاری لاش کا خالق نگاہبان"۔

حضرتؑ لٹا رہے تھے وہاں لاشۂ جواں　　خیمے سے جو بلند ہوئی بیووں کی فغاں
بولے کہ چین بھائی کو بن بھائی کے کہاں　　اکبرؑ تمہاری لاش کا خالق نگاہباں

ہم خیمہ گہ میں جاتے ہیں۔ اصغرؑ بلاتے ہیں
اُن کو بھی لا کے پاس تمہارے سُلاتے ہیں

خیمے میں حضرتؑ تشریف لائے۔ کس طرح؟

خیمے میں امام حسینؑ کا آنا

مُنہ پر جوان بیٹے کا تازہ لہو لگائے　　ماتم سرا میں گنج شہیداں سے شاہ آئے
جھولے پہ ہاتھ پکڑے ہوئے اہل بیت لائے　　بچّے کے ہاتھ پاؤں ہلا کر اُنہیں دکھائے

رو کر کہا۔ کہ سانس فقط آشکار ہے
سو اِس کا کیا حساب کہ دم کا شمار ہے

(تصویر)

بیٹھے سرہانے جھولے کے شبیرؑ سر جھکائے　　اصغرؑ کے کان سے لب معجز نما ملائے
چپکے سے کچھ کہا کہ وہ سُنتے ہی مُسکرائے　　سُوئے حسینؑ ہاتھ بھی بیساختہ بڑھائے

بولی سکینہؑ بابا نے مشکل کشائی کی
امّاں۔ مبارک۔ آنکھ کھُلی میرے بھائی کی

بچّوں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔ حضرت سکینہ (۴ سال کی دختر) سے نہ رہا گیا۔ بول اُٹھیں "۔ امّاں۔ مبارک۔ آنکھ کھُلی میرے بھائی کی"۔

ہاتھوں پہ لے چلے جو اُسے شاہ اتقیا	بانو پکاریں۔ لونڈی کو صاحب اجلالیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا	بولیں خدا نے سب کی دُعا سے کرم کیا

لب پر تبسّم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں
ہم تم۔ کوئی نہیں۔ انہیں بابا ہی پیارے ہیں

ٹیپ کا یہ مصرع کیا قیامت ہے "لب پر تبسّم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں"٭

زینبؑ نے پوچھا شاہ سے اے فخر کائنات	کیا آپ نے کہا؟ کہ جو چونکا یہ نیک ذات
شہ بولے ان کے دادا ہیں حلّال مشکلات	اس بے زباں کے کان میں میں نے کہی یہ بات

چلتے ہو؟ پہلوئے علی اکبرؑ میں سونے کو
آتے ہو؟ میرے شیعوں پہ قربان ہونے کو

جھولے سے اُٹھ کے قتل کے میداں کو دیکھئے	کیا لعل و دُر ہیں گنجِ شہیداں کو دیکھئے
لوٹے ہوئے علیؑ کے گلستاں کو دیکھئے	خنجر کے پھل کو۔ غنچۂ پیکاں کو دیکھئے

یہ سُن کے۔ میری گود میں جھولے سے آئے ہیں
مقتل کو شوقِ تیر میں۔ مُنہ کو پھرائے ہیں

یہ حضرت بانو (مادر علی اصغرؑ) نے سُن لیا۔

بانو پکاریں ان پہ تو سب رحم کھائینگے	بچّہ سمجھ کے پانی بھی دشمن پلائینگے
شہ بولے جو نصیب میں ہوگا وہ پائینگے	پہلے اُنہیں کے آگے اِنہیں لیکے جائینگے

ربط رحم سے خیالات

٭لب پر تبسم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں۔ واقعہ کی ایسی تصویر مختصر و دلچسپ مانی و بہزاد بھی تو نہیں کھینچ سکتے دیکھئے جس موقع پہ واقعات کو مرزا مرحوم طول دینا چاہتے ہیں کس قدر پھیلاتے ہیں۔ اصل واقعہ صرف اسقدر تھا کہ علی اصغرؑ پیاس سے جھولے میں بیتاب ہوئے۔ امام مظلوم بیبیوں کے شور کی آواز سنکر خیمہ میں آئے کچھ پڑھا۔ کان میں کچھ کہا۔ اور علی اصغرؑ کو ہاتھوں پر اٹھا کر میدان کو لیگئے۔ اتنے سے مضمون کو مصنف خیالات کے ذریعہ سے کس قدر پھیلاتے ہیں۔ اور کیسے کیسے پہلو اور بات میں سے بات نکالتے جاتے ہیں۔ جن خیالات کی طرف عام آدمی تو کیا عام شاعر کے بھی ذہن نہیں جاتے ۔۔ ثابت حقیر۔

خاطر سے اِن کی۔ پانی کے سائل بھی ہوئینگے
انجام کار یہ ہے۔ کہ ہم ان کو روئیں گے

جب حضرت بانوؑ نے یہ سُنا۔ بیتاب ہوگئیں۔

بانوؑ نے دی قسم۔ کہ یہ فرمائیے نہیں
گذری میں ایسے پانی سے لیجائیے نہیں
اب دل مرا۔ نہ مانیگا۔ سمجھائیے نہیں
اصغر کو دیجئے۔ مجھے۔ رُلوائیے نہیں

شہ بولے۔ جھولے میں جو یہ مرجائیں کیا کرو
بہتر یہی ہے۔ راہ خدا میں فدا کرو

حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں:۔

اب تو ضرور جائینگے یہ رن میں جائینگے
پانی اگر ملیگا تو ان کو پلائینگے
جیتا خدا جو لائیگا ہم لے کے آئینگے
پر عمر ہی جو کم ہے تو کیونکر بڑھائینگے

بندے کا کچھ نہ زور۔ نہ کچھ اختیار ہے
مُختار موت و زیست کا پروردگار ہے

امام حسینؑ کا سمجھانا

حضرت بانو ماں ہیں۔ ماں کی محبّت اللہ اللہ۔ لیکن امام صابر سمجھا رہے ہیں سمجھانے کے اثر کی تصویر دبیرؒ یوں کھینچتے ہیں:۔

ماں بیٹے کی رخصت

سمجھانے پر حسینؑ کے۔ بانوؑ نے رو دیا
دیکھا فلک کو یاس سے اور سر جُھکا لیا
لیکر بلائیں بیٹےؑ کی پھر یہ بیاں کیا
واری سدھارو۔ خیر۔ جو مرضئ کبریا

دیکھوں۔ پھر آج گود میں کب تمکو لیتی ہُوں
اللہ و پنجتنؑ کی ضمانت میں دیتی ہُوں

المختصر

اصغر کو لے چلے جو شہنشاہ بحر و بر
مُڑ مُڑ کے اُس نے کُنبے پہ حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہاتھ ماتھے پہ رکھا جھکا کے سر
بانوُ پکاریں پھیر کے مُنہ کو اِدھر اُدھر

لوگو مرا کلیجا نکلتا ہے تھام لو
اصغر سدھارتے ہیں جہاں سے سلام لو

تصویر

تصویر
ہاتھوں پہ لے کے اُس کو چلے شاہ کربلا — اور ساتھ ساتھ گود کو کھوئے ہوئے قضا
لکھا ہے۔ دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا — اصغر پہ ماں نے ڈال دی اُجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرۂ پُر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا ماہتاب پر

حضرت علی اصغرؑ کو لے تو چلے۔ مگر غیرت اس خاندان پر ختم ہے۔ سوال کی عادت نہیں۔ پانی کا سوال ننھے سے بچے کے لئے کیونکر مُنہ سے نکلیگا۔ یہ سوچتے جاتے ہیں۔ دبیرؔ اس حالت کو یوں نظم کرتے ہیں :۔

خیالات راہ کی تصویر
ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفٰے — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہونگا کیا ؟
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت بھی گر کرونگا۔ تو وہ دینگے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سُنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

ایسے خیالات دل میں آتے جاتے ہیں۔ کہ

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

سوال نہ ہو سکا۔ آخرش آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں۔ اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں۔ اور پھر صراحت فرماتے ہیں۔ ع پانی کے تم سبھوں سے یہ امیدوار ہیں ملاحظ

ہو" یہ امیدوار ہیں"۔ لیکن یہ تو بعد کو فرمایا ہے۔ پہلے اس سے بچّے کی بے قراری کی تصویر بوجہ پیاس کے یُوں کھینچی ہے:۔

بچّے کی بیقراری

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چُپ ہُوئے گہوارے میں پھوپھی نے جھُلایا نہ چُپ ہُوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھِلایا نہ چُپ ہُوئے رو رو کے سارے گھر کو رُلایا نہ چُپ ہُوئے

واں اشکبار تھے۔ تو یہاں بے قرار ہیں
پانی کے تم سبھوں سے یہ اُمّید وار ہیں

دبیرؒ کا قلم رفتہ رفتہ اصل مُدّعا کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرتؑ کی زبان پر یہ الفاظ آہی گئے:۔

[illegible]

گر مَیں بقولِ شِمر و عُمر ہُوں گناہ گار یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
ششماہا۔ بے زباں۔ نبی زادہ۔ شیر خوار ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار

سن ہے جو کم۔ تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے۔ اور یہ مظلوم زادہ ہے

اس کی ماں کا دُودھ بوجہ پیاس کے خشک ہوگیا ہے۔ اُس کو کنایۃً یُوں بیان کیا ہے:۔ **ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار**۔ اور علی اصغرؑ کے سِن اور اُن کے بے خطا ہونے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

علی اصغرؑ کا کم سن اور بے خطا ہونا

جز شیر اور کچھ نہیں اِن کی غذا ابھی نے گھٹنیوں چلے ہیں نہ مکتب ہُوا ابھی
بابا کا نام بھی نہیں مُنہ سے لیا ابھی یہ تو ہر ایک دین میں ہیں بے خطا ابھی

کیا کام اِن سے بُغض ہے تم کو اگر مِرا
جانو خدا کا بندہ نہ سمجھو پسر مِرا

معصوم بچّہ سمجھ کر اس پر رحم کھاؤ۔ یہ پیاسا معصوم بچّہ کون ہے:۔

یہ کون بے زباں ہے؟ تمہیں کچھ خیال ہے دُرِّ نجف ہے۔ بانوئے بیکس کا لال ہے

لومان لو۔ تمہیں قسم ذوالجلال ہے یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؑ کا تم سے طلبگار آب ہے

دیدو۔ کہ اِس میں ناموری ہے ثواب ہے

یہ فرما کر۔ حضرتؑ نے :۔

بین کا نشتر

پھر ہونٹ بے زباں کے چُومے جھکا کے سر رو کر کہا جو کہنا تھا۔ وہ کہ چکا پدر

باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر سُوکھی زبان تم بھی دکھا دو۔ نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے

تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت امام حسینؑ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ (یہ **گوشہ** ملاحظہ ہو) :۔

حسرت نیت

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانگ کی کماں

ترکش سے چُن کے کھینچ لیا تیرِ جاں ستاں جوڑا کمان تاک کے حلقوم بے زباں

چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے

گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

تصویر شہادت (بےمثل)

کیا سِن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا سُوکھے گلے میں خوں بھرا۔ دم اٹک گیا

تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا ٹوپی گری زمیں پہ۔ منکا ڈھلک گیا

ننھی کلائیوں میں تشنّج سے بل پڑے

ہچکی جو آئی مُنہ سے انگوٹھے نکل پڑے

مُنہ آسماں سے شہ نے پھرایا کہ کیا ہُوا دیکھا نشانہ تیر کا وہ بے خطا ہُوا

یعنی دو دھار حلق سے تیرِ جفا ہُوا بچّہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہُوا

آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں

آگے تو دُودھ اُگلتے تھے اب خوں اُگلتے ہیں

پھر حضرتؑ فوج کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے :-

اس نے کہا تھا کیا؟ جو بھلا تم نے مارا تیر — تم سے کلام کرتا تھا میں۔ یا کہ یہ صغیر

اور فرمایا۔ع "تم نے ہمارے لانے کی بھی کچھ حیا نہ کی"۔

اس کا جواب ہی کیا تھا۔ وہ شقی۔

ہنس ہنس کے سب حسینؑ کے رونے پہ ہٹ گئے — شہ نے وہ آہ کی۔ کہ دو عالم اُلٹ گئے

بچّے کے دم نکلنے کی حالت دبیرؔ یوں تحریر کرتے ہیں :-

اصغر ہمک ہمک کے پدر سے لپٹ گئے — ننھّے سے ہاتھ پاؤں لرز کر سمٹ گئے

ہونٹوں پہ شہ کے ہونٹ ملے اور گذر گئے

اک بوسہ مسکرا کے لیا اور مر گئے

باپ کی اُس وقت کی حالت نہایت مختصر الفاظ میں بیان کی ہے۔ یہ خیال پیشِ نظر رہے۔ کہ امام حسینؑ امام ہیں۔ شانِ امامت کو ملحوظ رکھ کر باپ کی بے قراری کی تصویر کھینچتے ہیں :-

شانِ امامت کا لحاظ اور مصیبت کی تصویر

لاشے کے مُنہ کو دیکھ کے کہنے لگے یہ شاہ — بیچارگی کا وقت ہے اصغر! خدا گواہ

ماں۔ بہنیں گھر میں۔ باپ پہ یاں نرغۂ سیاہ — یہ ریگ گرم۔ اور یہ بدن نرم۔ آہ آہ

دل ساتھ نکلا پڑتا ہے۔ کیونکر جدا کروں

سونپوں کسے؟ لٹاؤں کہاں؟ آہ کیا کروں؟

تمام اعزّہ و اقارب و اصحاب حضرتؑ کے کام آچکے ہیں۔ سوائے امام حسینؑ کے کوئی باقی نہیں۔ حضرتؑ خود بنفسِ نفیس ارادۂ جنگ فرماتے ہیں۔ عنانِ توسنِ قلم میدان کی طرف پھیرتے ہی دبیرؔ کی زبان و خیالات کا کچھ اور عالم ہو گیا۔ ملاحظہ ہو :-

جنگی سامان

اتنے میں بہرِ جنگ بڑھی فوجِ اشقیا — شہزادیوں نے خیمۂ عصمت کا رُخ کیا*

* اس موقع پر چھلا نشتہ میں فاضل مضمون نویس نے چند بند اس مضمون کے چھوڑ دئے ہیں۔ کہ خیمہ سے سیدانیاں مع مادرِ علی اصغر نکل پڑی ہیں اور قبرِ علی اصغر پر جو امام حسینؑ نے اُسی وقت بنائی تھی نالہ و زاری کی ہے۔ وہ بین قیامت کے بین ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

شہ سے ہلالِ زین کو ملی بدر کی ضیا
پہنچا زبانِ تیغ سے بھی حکمِ کبریا
قربان ذوالجناح شہِ دیں پناہ پر
غُصّہ تو پیچھے آیا۔ یہ پہلے سپاہ پر

اِس بند کی ٹیپ پر نظر رہے:۔

محشر کے زلزلے نے عناں آ کے تھام لی
نُصرت کے ولولے نے رکاب امامؑ لی
چابک زنِ فلک نے کرن کی لگام لی
شامی تو کیا ہیں روز نے بھی راہِ شام لی
حیرت کی شکل خوف سے جنّ و ملک بنے
دو پاؤں۔ بھاگنے کو۔ زمین و فلک بنے

شجاعِ عربی سے اعرابی

ضربِ شمشیرِ حسینیؑ

ضربِ شمشیر حسینی

بُو کی طرح دماغوں میں آئی۔ چلی گئی
مثلِ ہَوا سروں میں سمائی۔ چلی گئی
مانند شعلہ باگ اُٹھائی۔ چلی گئی
آندھی کی طرح آگ لگائی۔ چلی گئی
سینے میں صاف آتی تھی۔ اور صاف جاتی تھی
انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

شاعرانہ مدحِ شمشیر

ظلمت میں آنے جانے کو آبِ حیات تھی
اور روشنی میں نیّرِ اعظم کی ذات تھی
اندھیر کرنے کو یہ قیامت کی رات تھی
مُنہ سے نکلنا اس کیلئے ایک بات تھی
رن میں تو کافروں کے فقط حلق پر پھری
پر شہروں میں زبانوں پہ مثلِ خبر پھری

اس رنگ کے بعد مرزا صاحب دُوسرا (سین) رنگ دکھاتے ہیں۔ زبان اور خیالات کا رُخ اب بدل گیا:۔

اشتیاقِ شہادت و وصالِ خدا

ناگاہ شوقِ خلد کے گلزار کا ہُوا
اور حوصلہ بزرگوں کے دیدار کا ہُوا
ارمان ذوالجلال کے دربار کا ہُوا
سر کو خیال ہدیۂ غفّار کا ہُوا

حضرتؑ نے جب تلوار کو نیام میں رکھ لیا۔ع سبطِ نبیؐ پہ نرغۂ اہلِ جفا ہُوا۔ اور ع زہراؑ کا چاند فوج کے بادل میں گھر گیا۔ حضرت امامؑ نرغے میں گھر گئے ہیں۔ع ناگہ بلا کی طرح گرا لشکرِ جفا۔ اور ستمگر چاروں طرف سے حملہ کر رہے ہیں:۔

گھوڑے سے گرنے کی تصویر

نیزے لگے جو سینے میں تھرّا کے رہ گئے   بیٹھا جو تیر ماتھے پہ تیورا کے رہ گئے
شکرِ خدا زباں سے فرما کے رہ گئے   گرنے لگے تو ہاتھوں کو لٹکا کے رہ گئے
اکبرؑ نہ تھے جلو میں نہ عبّاسؑ پاس تھے
مظلومؑ بیچ میں تھا۔ عدو آس پاس تھے

حضرتؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے ہیں۔ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں۔ع
سجدے میں سر جھکا دیا ہاتھوں کو ٹیک کر

شمر کا آنا

بوجہ خوفِ طوالت بند چھوڑتا جاتا ہُوں۔ شمر (قاتلِ امام حسینؑ) آیا ہے:۔

آیا سرہانے تیغ بکف شمرِ رُوسیاہ   بولا گلا کہ مَیں ہُوں پیمبرؐ کی بوسہ گاہ
دل نے کہا یہ سینہ ہے گنجینۂ الٰہ   بیٹھا وہ اُس جگہ کہ نہیں جائے شرحِ آہ
اِس ظلمِ نَو سے چرخِ کہن کانپنے لگا
ایسا حسینؑ تڑپے کہ رَن کانپنے لگا

بعدہ حضرت زینبؑ کی بے تابی و بے قراری چند بند میں بیان کی ہے۔ــــ

اے آسماں کہاں ہے حسینؑ فلک جناب   اے آفتاب کیا ہُوا زہراؑ کا ماہ تاب
کہہ اے فرات! پیاسوں کا سُلطاں کدھر گیا   اے کربلا بتا ترا مہماں کدھر گیا
بھیجوں کسے تلاش کو۔ سب میرے مر گئے   آنکھیں بہن کی ڈھونڈھتی ہیں تم کدھر گئے

حضرت زینبؑ کی کیفیت اضطراب

حضرت زینبؑ کا یہ حال تھا:۔

چھریاں سی پھر رہی تھیں دلِ پاش پاش پر   اک آہ آسماں پہ تھی ایک لاش پر

نہیں معلوم یہ مرثیہ کس سنہ میں کہا ہے۔ حالت کلابتہ مقطع سے چلتا ہے۔ــــ

زمانۂ تصنیف میں مصنف کی حالت

ہر چند طبع پر ہے ہجوم غم و ملال شکوہ مگر کسی کا نہیں شکر ذوالجلال
برعکس ہے کوئی۔ تو کوئی برخلاف ہے آئینۂ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے*

ملٹن و دبیر میں ایک خصوصیت

مضامین عالی

ملٹن اور دبیرؔ میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اور وہ خصوصیت بلندی مضامین کی ہے۔ جس کی چند مثالیں دبیرؒ کے کلام سے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اُگتا ہے تخم عفو جہاں وہ زمیں دکھا۔ (اس مرثیہ میں جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا) +

(۲) بے پردہ رُخ قہر الٰہی نظر آیا۔ (اس مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) +

(۳) لعل سم توسن سے شرارے ہُوئے روشن + رن برج فلک بن گیا۔ تارے ہُوئے روشن۔ (اُسی مرثیہ "میں" برہم ہیں صفیں' الخ میں) +

(۴) روکا شہ دیں نے فرس حور لقا کو + ٹھہرالیا سرتاج سلیمانؑ نے ہَوا کو (اُسی مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں الخ) +

(۵) اس حسن کا شعلہ نہ کبھی طور سے نکلا + ظلمت سے سکندر بھی نہ اس نور سے نکلا۔ (ایضاً) +

(۶) جانے میں رسولوں کی دُعا آنے میں تاثیر۔ (اُس مرثیہ میں جس کا مشہور مطلع یہ ہے سہ مقتل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد) +

(۷) اس رخش کے مُنہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا + چلنے میں یہ سُرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا۔ (مرثیۂ "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلادے" میں ہے) +

زمانۂ تصنیف

* جہاں تک میں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب مرحوم نے اُس زمانے میں کہا تھا۔ کہ جب لوگوں نے ان سے اور میر ضمیر صاحب ان کے اُستاد سے بگڑوادی تھی۔ میر ضمیر صاحب کے تمام شاگرد اور طرفدار مرزا صاحب کے مٹانے پر تلے ہُوئے تھے۔ غالباً یہ محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کا عہد تھا۔ چنانچہ مقطع میں اُس کا اشارہ فرمایا ہے ع برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے۔ اس زمانہ تک میر انیس صاحب (مرحوم) لکھنؤ میں فیض آباد سے تشریف لائے تھے نہ اُنکی شہرت ہُوئی تھی۔ لہٰذا اس برعکسی کو انیسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اُس وقت تک انیسیے پیدا ہی نہ ہُوئے تھے + ۱۲ ثابت حقیر۔

(۸) طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ ہے + رویت ہلالِ نعل کی اس پر گواہ ہے۔ (اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع مشہور یہ ہے ؎ جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہُوا) +

(۹) ذیل کا بند اس مرثیہ میں ہے ؎ برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد :۔

چہرہ چمنِ قدرتِ خلاقِ دو عالم　　خورشید ہے اس باغ کا اک قطرۂ شبنم
عیسٰیؑ ہے سخن ہونٹ طہارت میں ہیں مریمؑ　　اور رُوحِ مسیحا لب جاں بخش کا اک دم
ہر صنعتِ حق اک رخِ روشن سے عیاں ہے
جاں قالبِ آئینہ میں اس رُو سے رواں ہے

(۱۰) اور دور نے قمر کو اُلٹ کر رمق کیا۔ (اس مرثیہ "گلگونہ شفق جو ملا حورِ صبح نے" میں ہے) +

(۱۱) اس مرثیہ میں "سرسبز ہو یارب سخن اس ہیچ مداں کا" جناب پیغمبر آخر الزماںؐ کی نعت میں فرماتے ہیں "خود آیۂ رحمت ہے سخن وحیِ خدا ہے"۔ اور دُوسرے مقام پر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۲) شیرازۂ خُلد فلک۔ قالب قرآں + اُستادِ دبستانِ ازل نائب یزداں۔ پھر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۳) ہے ترجمہ قرآنِ مبیں کا دہن ان کا + انوارِ الٰہی کا ہے مشرق بدن ان کا + کل دفترِ الہام ہے اک جزوِ تن ان کا +

(۱۴) مرثیہ مذکورہ میں فرماتے ہیں :۔

امید زباں قطع ہے خوبیٔ بیاں سے　　دندانے ہیں دانتوں کے جدا تیغ زباں✲ سے

(۱۵) اس مرثیہ میں "گلگونہ رخسار فلک گرد ہے رن کی" فرماتے ہیں۔ ع سمٹی سپر ایسی کہ ہتیلی کا بنی تل +

✲ عبداللہ عامر بڈھے صحابی اپنے بڑھاپے کی حالت یوں بیان کرتے ہیں۔ عربوں کو اپنی فصاحت زبان پر ایسا ناز تھا کہ وہ تمام دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ عبداللہ کو بڑھاپے کے سبب جو زبانِ بیان کا نقصان پہنچا ہے اسکو حضور صلعم (رُوحی لہ الفدا) سے عرض کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ دانت گر گئے۔ خوبیٔ بیاں جاتی رہی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۶) اک سونے کا نگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر۔ اس مرثیہ میں ع "برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد" ہے +

علم۔ وسعت نظر۔ بلندئ خیالات۔ قدرت۔ حکومت الفاظ وبیان پر یہ صفتیں جو ملٹن کے کلام میں ہیں۔ جناب مرزا صاحب کے کلام میں بھی ہیں علاوہ ان خصوصیتوں کے جو ملٹن اور مرزا کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور جن کا بیان مختصر طور پر ابھی کیا گیا ہے۔ ایک دو باتیں جو مرزا صاحب سے مخصوص ہیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہیں :-

(۱) چہرہ یا رزم یا بزم یا سراپا وغیرہ میں مبکی مضامین پیدا کرتے ہیں۔ لڑائی ہو رہی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے گرد اڑ رہی ہے۔ اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎ یہ گرد اڑی رن میں کہ پانی نکل آیا۔ رن میں پانی نکل آنا آہ کیسا دلخراش مضمون ہے۔ فوج حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لئے بڑھی۔ علی اصغر اُس وقت شہید ہو چکے ہیں۔ حضرتؑ مقابلۂ فوج کو تن تنہا بڑھتے ہیں۔ قبل اس کے کہ تیغ کھینچیں ؎ اصغر کو شہ نے پہلوئے اکبرؑ میں رکھ دیا۔ ہائے دو جانگداز واقعہ نظم کر دئے۔ اور یاد دلا دئے۔ ایک حضرت علی اکبرؑ کی شہادت۔ ایک علی اصغرؑ کی شہادت۔ اور پھر ننھے بھائی کو نوجوان بھائی کے پاس سُلا دینا +

اس مرثیہ میں (برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) حضرت امام حسینؑ کے سراپا کی تعریف لکھتے لکھتے ایک بند میں فرماتے ہیں ؎

سرِ عرش کا دستار گلابی کے تصدق | خون شہدا ریش خضابی کے تصدق
ہر جزو بدن پُر نُے ہے ہر عضو جُدا ہے | دفتر میں شہادت کے مگر چہرہ لکھا ہے

ذرا سی تلاش سے ایسے مضامین بکثرت ملینگے۔ مصنف آب حیات حضرت آزاد مرحوم لکھتے ہیں "مرزا دبیر صاحب شوکت الفاظ مضامین کی آمد۔ اس میں جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنایہ الم ناک و دل گداز انداز جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں میں بادشاہ تھے" +

علم، وسعت نظر، حکومت الفاظ پر

خصوصیتیں مرزا میں

مبکی مضامین

پروفیسر آزاد مرحوم کی زبانی دبیر مغفور کی مدح

روایات

(۲) روایتیں اکثر نظم فرماتے ہیں[1]۔ مثلاً اس مرثیہ میں "قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا" واقعۂ خُمِ غدیر نظم کیا ہے سینکڑوں اشعار نظم کر ڈالے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں حدیثوں کی طرف اشارہ ہے ع اک ضرب نہ اُس کی نہ دو عالم کی عبادت[2]۔ حضرت جبرئیلؑ آئے ہیں۔ اور پیغام خداوند متعال پہنچایا۔ حضرت پیغمبرؐ نے تمام ہمراہیوں کو جمع فرمایا۔ کُل بیابان بھر گیا۔ حضرت نے خطبۂ فصیح و بلیغ ارشاد فرمایا۔ اور مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ فرمایا۔ ان واقعات کو اس مرثیہ (ع قرآن مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں بیان کیا ہے۔ حمدِ خداوند متعال۔ نعتِ پیغمبرؐ۔ مدحِ حیدرِ کرّارؑ کے گوشے اس مرثئے میں نکالے ہیں۔ موقع پر ترجمہ کا حسن دکھایا ہے سہ ہم دونوں کو اک نور سے حق نے کیا خلقت[3]۔ سہ میں جس کا ہوں مولا تو علیؑ اُس کا ہے مولا[4]۔

اس مرثیۂ سہ "سرسبز ہو یا رب سخنِ اس ہیچداں کا" میں بھی ایک روایت نظم کی ہے۔ عبداللہ بن عامر (صحابی) کا خدمت حضرت پیغمبرؐ میں حاضر ہونا اور اولاد کی التجا کرنا۔ آنحضرتؐ کا دعا فرمانا۔ اور رہشد کا پیدا ہونا۔ یزید سے شادی ہونا۔ حضرت امام حسینؑ کا

---

[1] اس سے فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اہل مجلس کی (حالات تاریخی وغیرہ کی) معلومات بڑھتی ہے۔ اور روز مرہ معمولی واقعۂ کربلا کے چند حالات بار بار سُننے سے جو بعض شاعروں کے مرثیہ میں آدمی اُکتا جاتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں وہ حال سامع و ناظر کا نہیں ہوتا زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ ثابت۔

[2] ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَۃِ الثَّقَلَیْن کی طرف اشارہ ہے۔ حامد اس حدیث کو دوسرے موقع پر نظم فرمایا ہے سہ حق نے کہا کہ حرب علی میری حرب ہے۔ افضل عبادت دو جہاں سے یہ ضرب ہے ۔ ثابت۔

[3] حدیث متواتر اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ کا گویا ترجمہ ہے۔ اس حدیث کا تواتر دیکھنا ہو۔ تو عبقات الانوار کی جلد حدیث نور دیکھو ۔ ثابت۔

[4] حدیث متواتر مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ الخ کی بابت جلد اوّل و دوم عبقات الانوار دیکھنے کے قابل ہے۔ خدا کی قدرت۔ اسلام کی عظمت۔ علماء اسلام کی تصنیفات کی کثرت۔ ایمان کی حقیقت نظر آتی ہے ۔ ۱۲ ثابت حقیر۔

مع بہتر اعزہ و اصحاب کے شہید ہونا۔ اہلبیت طاہرینؑ کا کربلا سے شام کو قید ہو کر جانا۔ ہندہ کو خبر پہنچنا اُس کا رنج و الم وغیرہ وغیرہ بیان کئے ہیں۔ اس مرثیہ میں بھی ایک گوشہ پیدا کر کے ہندہ کی گفتگو لکھتے ہیں۔ اور جو مُوازنہ وہ درمیان حاکم شام (یزید) اور امام حسینؑ کے کرتی ہے۔ اُس کی تصویر یُوں کھینچی ہے بہت سے بند ہیں۔ مَیں چند بند پر اکتفا کرتا ہُوں :۔

وہ تخت نشیں دوزخ اسفل کا مکیں ہے
یہ گوشہ نشیں مُہر نبوت کا نگیں ہے
وہ غول ہے یہ خضر ہے وہ شک یہ یقیں ہے
وہ سنگ زمیں یہ گہر عرش نشیں ہے
زُنّار ہے وہ گردن ارباب خطا کا
اور نام خدا سبحہ ہے یہ دست خدا کا

وہ عار ہے یہ فخر ہے وہ ننگ ہے یہ نام
شیطاں کا وہ وسواس یہ رحمان کا الہام
وہ درد یہ تسکیں وہ ایذا ہے یہ آرام
وہ دیر ہے یہ کعبہ ہے وہ کفر یہ اسلام
وہ جہل میں بوجہل یہ دانش میں نبیؐ ہے
وہ بخل میں قارون یہ بخشش میں علیؑ ہے

یہ بندۂ معبود ہے وہ بندۂ زر ہے
یہ طور کا شعلہ وہ جہنم کا شرر ہے
وہ نحس ہے یہ نیک وہ عقرب یہ قمر ہے
وہ ناخنِ پا کفر کا یہ دین کا سر ہے
یہ خیر ہے وہ شر۔ یہ نکوئی وہ بدی ہے
وہ بُت ہے بلاشک یہ خلیل احدی ہے

وہ نار۔ یہ فردوس۔ وہ زقوم۔ یہ طوبا
وہ زخم۔ یہ مرہم۔ وہ مرض اور یہ عیسیٰ
وہ سحر۔ یہ اعجاز۔ وہ فرعون۔ یہ موسیٰؑ
وہ قہر۔ یہ رحمت۔ وہ نجاست یہ تقویٰ

مقابلہ عاشقانہ اخلاق امام حسینؑ و یزید پلید

بریں

خاک شفا

٭ اُنہیں محترم صحابی عبداللہ ابن عامر کی بیٹی یہ ہندہ ہے۔ جس نے اہل بیتؑ میں پرورش پائی ہے اُن کے قدر و مرتبہ سے خوب واقف ہے۔ اس لئے امام حسین علیہ السلام و یزید کا وہ مقابلہ الفاظ مندرجہ متن میں کرتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہر صحفِ معبود کی صحت یہ فقط ہے[1]
وہ حرف غلط۔ لفظ غلط۔ فرد غلط ہے

وہ زہرِ ہلاہل۔ یہ مجھے آبِ بقا ہے وہ ہے مرض الموت۔ یہ تعویذِ شفا ہے
وہ رہزنِ اسلام ہے۔ یہ راہ نما ہے وہ سایۂ آسیب ہے۔ یہ ظلِ خدا ہے
نخوت ہے اگر ملک پہ اُس اہلِ جفا کو
مل جاتے ہیں یاں دونو جہاں ایک گدا کو[2]

ان بندوں سے مرزا کے تقابل کی قوت بھی ظاہر ہوتی ہے +

(ھ) ایک صفت مرزا کے کلام میں اور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مرثیہ کا چہرہ نہایت زبردست پرزور اور باشوکت ہوتا ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

فصل ۵
مرثیہ کا چہرہ

گلگونۂ رخسارِ فلک۔ گرد ہے رن کی ہر خار میں خوشبو ہے بہشتوں کے چمن کی
خورشید نقیبانہ لئے چوب کرن کی کہتا ہے کہ آمد ہے شہنشاہ زمن کی
مانند براق نبویؐ رخش ہے رو میں
روح القدس آتے ہیں خوزادے کی جلو میں

رخشندہ ہے رن۔ مہرِ درخشاں کی ہے آمد امیں ہوا ابنؑ۔ موسئی عمراں کی ہے آمد
جن پڑھتے ہیں کلمہ۔ کہ سلیماںؑ کی ہے آمد سجدے میں ہیں سب قبلۂ ایماں کی ہے آمد

[1] اس بند کا چوتھا مصرع دفترِ ماتم میں یوں ہے ع وہ خوف ہے۔ یہ امن وہ یاس اور یہ تمنا۔ اور اس بیت میں بڑا دقیق و بلیغ مضمون لکھتے ہیں کتاب خدا (قرآن) اور عترت (ائمۂ اطہارؑ) کو جناب رسولِ خداؐ نے اپنا یادگار چھوڑا ہے۔ حدیثِ ثقلین مشہور ہے۔ اس میں اشارہ ہے۔ کہ ہر کتاب آسمانی کی صحت صرف امام زماںؑ کے دم سے ہے۔ کیونکہ وہ اور کتابِ خدا ہمیشہ ساتھ ساتھ رہینگے + ثابت۔

[2] دفترِ ماتم میں ٹیپ اس طرح پر ہے رستے نے بدر کی نے شمس کی تنویر کو دیکھے۔ کوئی مری آنکھوں سے تو شبیرؑ کو دیکھے۔ مگر حقیر کے پاس قلمی پرانے مرثیہ میں یہی ٹیپ مرقوم ہے۔ جو غالباً ۰، برس پہلے کا قلمی ہے + ثابت۔

پریوں کے پرے قاف میں بیہوش پڑے ہیں
پر خوف سے بالائے بدن بال کھڑے ہیں

دبدبۂ آمد

رن میں خلفِ ضیغمِ داور کی ہے آمد زخشندے ہیں ذرّے شہِ خاور کی ہے آمد
اعدا میں ہرن شیر دلاور کی ہے آمد دریائے تہوّر کے شناور کی ہے آمد
بالائے زمیں گرد سواری کی نہیں ہے
پردے میں بلا گردِ زمیں ۔ چرخ بریں ہے

رن نور ۔ زمیں نور ۔ جہاں نور ہُوا ہے ظلمت کا طبق نور سے معمور ہُوا ہے
دریا صفتِ تختۂ بلّور ہُوا ہے اب سوکھ کے کانٹا شجرِ طور ہُوا ہے
عالم ہے ستاروں کا جو کانٹوں کی چمک پر
ہنستی ہے زمیں ذرّوں کے دانتوں سے فلک پر

کیا یُمن تجلّئ ورودِ شہِ دیں ہے روشن ہے فلک پر کہ زمیں عرش بریں ہے
جو ذرّہ ہے ۔ خورشید کی مسند پہ مکیں ہے نکہت وہ ہے جو صحنِ جناں رن کی زمیں ہے
اس مہر سے ذرّوں کی جو تقدیر لڑی ہے
دن کو گلِ خورشید پر آج اوس پڑی ہے

محشر ہے عیاں ہیبتِ سلطانِ زمن سے یک لخت رواں روح ہے عدا کے بدن سے
شیروں کو تعرّض نہیں صحرا میں ہرن سے شاہیں کے پر جلتے ہیں اب کبکِ چمن سے
یہ مصحفِ رُخ بلبلوں کے پیش نظر ہے
ہر باغ میں سیپارۂ گُل زیر و زبر ہے

باراں ہے نہ رعد ہے نہ برق فلک پر یہ اشک ہے وہ نالہ یہ آہ دلِ مضطر
نے ماہ نہ خورشید نہ گردوں ہے نہ اختر وہ داغ وہ رعشہ وہ دھواں اور وہ اخگر

الیاس و خضر کو ہوس ... سیر نہیں ہے

سیاروں پہ ثابت ہے کہ اب خیر نہیں ہے

اطلس کے بچھونے پہ فلک کو نہیں آرام اس مرتبہ لوٹا ہے کہ نیلا ہے سب اندام
سیاروں پہ ثابت ہوئی اب گردش ایام خورشید سحر کیلئے اب حشر کی ہے شام
اک دم قدم گاوِ زمیں جم نہیں سکتے
گردش میں ہیں قطبین۔ فلک تھم نہیں سکتے

عدلِ شہِ والا کا چراغ اب ہُوا روشن فانوس پئے شمع بگولے کا ہے دامن
ہے ایک جگہ باز و کبوتر کا نشیمن بجلی ابھی جل جائے جو دیکھے سوئے خرمن
اللہ رے اثر معدلت شاہ زماں کا
دل سوز شرر پنبہ کا ہے۔ ماہ کتاں کا

ذرّوں کی نگاہوں میں سماتا نہیں گردوں کیا دب گیا ہے سر کو اٹھاتا نہیں گردوں
کس سمت بھٹکتا ہُوا جاتا نہیں گردوں پر امن کا گوشہ کہیں پاتا نہیں گردوں
گردش مہ و خورشید کو گردوں پہ نہیں ہے
یہ پتلیاں پھرتی ہیں دم باز پسیں ہے

شیروں کا نہ بیشہ ہے نہ آہو کا ختن آج مچھلی کا نہ دریا ہے نہ بلبل کا چمن آج
لعلوں کا بدخشاں ہے نہ موتی کا عدن آج مصر و حلب و زنگ ہے نے روم و یمن آج
رہ جائینگے خود برق کے پر کالے بھی جل کر
بہ جائینگے تلواروں کے جوہر بھی پگھل کر

کہتی ہے زمیں گنبد گردوں سے ٹھہر جا ہستی سے ہے پیغام اجل رن سے گذر جا
شہرہ جو سُنا رخش فلک سیر کا ہر جا دل پھٹ گیا۔ بادل کا نہ پھر رعد بھی گرجا
بجلی کی تڑپ اور کڑک آج کہاں ہے
بن بن کے شرر نعل تگاور میں نہاں ہے

نے لعل یمن میں ہے نہ دریا میں گہر ہے — آنسو ہے یہ سوکھا ہوا۔ وہ خون جگر ہے
اس دم شجر دہر میں جو شاخ شجر ہے — وہ شاخ ہے آہو کی نہ گل ہے نہ ثمر ہے
گل چینوں کے رخ۔ گلشن ہستی سے مڑے ہیں
صیادوں کے۔ بلبل کی طرح۔ ہوش اڑے ہیں

رن میں ہے عجب دبدبۂ خسرو عادل — شمشیر ہر اک نشتر جوہر سے ہے بسمل
جوڑے ہوئے ہاتھوں کو ادب سے ہے جلاجل — سمٹی سپر ایسی کہ ہتھیلی کا بنی تل
تیغیں ہیں نیاموں میں مگر آب نہیں ہے
ناوک ہیں ملے چلوں سے پر تاب نہیں ہے

نعت

یا یہ بند (نعت) :-

سرسبز ہو یارب سخن اس ہیچمداں کا — ہر بیت عزا قطعہ بنے۔ باغ جناں کا
فوارہ چھٹے کوثر معنی و بیاں کا — کلمہ پڑھے بلبل ہری طوطی زباں کا
ذکر اس کے سخن کا ہے جو فخر فصحا ہے
خود آیۂ رحمت ہے۔ سخن وحی خدا ہے

وہ کون؟ رسول جز و کل خطبۂ ایماں — سرتاج فصیحان عرب آیۂ عرفاں
شیرازۂ نہ جلد فلک۔ قالب قرآں — استاد دبستان ازل۔ نائب یزداں
جانے وہ شرف ان کا جو قرآن کو جانے
قرآن سے پہلے انہیں بھیجا ہے خدا نے

سبحان

علم ان کا جو ہے فرش پہ وہ عرش بریں پر — اس علم سے احمدؐ کا قدم ہے سر دیں پر
روشن ہے جلال نبوی اہل یقیں پر — حق عرش پہ مداح ہے انسان زمیں پر
ہر رمز ہے آئینہ دل خیر امم پر
دو نقطوں کی مانند دو عالم ہیں قدم پر

مہمان جو گیا عرشِ معلّٰے پہ تو کیا تھا مشتاق نبیؐ کے لب و لہجہ کا خدا تھا
خالق نے سخن ان کیلئے خلق کیا تھا شیریں سخن ایسا نہ رسولوں میں ہُوا تھا
الہام کا رُتبہ سخنِ پاک سے جانا
قرآن کو قرآں دہنِ پاک سے جانا

سلطانِ کلام فصحا ہے سخن اِن کا ہے ترجمہ قرآن مبیں کا دہن اِن کا
انوار الٰہی کا ہے مشرق بدن اِن کا کُل دفتر الہام ہے اک جزوِ تن اِن کا
عاجز فصحا کو کیا۔ تقریر قوی نے
کلمہ جو پڑھایا۔ تو کلام نبوی نے

منقبت جناب فاطمہؑ

پایہ (منقبت جناب فاطمہؑ) :-

بلقیس پاسباں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟ مریمؑ درود خواں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟
دہلیز آسماں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟ شانِ خدا عیاں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟
کُرسی زمیں سے لیتی ہے گوشے پناہ کے
بیٹھا ہے عرش سائے میں اِس بارگاہ کے

حوران ہشت خلد ہیں اک اہتمام کو دار السّلام در پہ کھڑا ہے سلام کو
سجدہ یہیں حلال ہے بیت الحرام کو سُورج نثار صبح کو ہے۔ چاند شام کو
دیکھا کریں۔ کھڑے ہُوئے اس آستان کو
یاں بیٹھنے کا حکم نہیں آسمان کو

صحرائے لامکاں کی فضا اس سے تنگ ہے جنّت کا نام۔ اس کی بزرگی کا ننگ ہے
فضل خدا کے سایہ کا ہر سُو یہ ڈھنگ ہے یاں دُھوپ میں بھی کاغذ ابری کا رنگ ہے
زائر کو اس حریم کے عیش و نشاط ہے
اس کا بچھونا۔ رحمتِ حق کی بساط ہے

عفت پکارتی ہے مقامِ حجاب ہے　　شیعو! جناب فاطمہؑ کی یہ جناب ہے
حوّاؑ و آسیہ* کا یہ باہم خطاب ہے　　زہراؑ کے رعب و دبدبے زہرہ آب ہے
جاری ہے مُنہ سے جاریہ فاطمہؑ ہیں ہم
مخدومۂ کائنات کی یہ۔ خادمہ ہیں ہم

ہر خشت روضہ۔ دفتر حکمت کی فرد ہے　　موقوف یاں زمانے کا ہر گرم و سرد ہے
گرمی کا نے بخار نہ کُلفت کی گرد ہے　　پر صاحبِ رواق کے پہلو میں درد ہے
ہم۔ تُم۔ یہ جانتے ہیں۔ کہ سوتی ہیں فاطمہؑ
اس کی خبر نہیں ہے۔ کہ روتی ہیں فاطمہؑ

مزار

شانِ خدا ہے صلِّ علےٰ شانِ فاطمہؑ　　حیدرؑ کی جانماز ہے دامانِ فاطمہؑ
روزہ ہر ایک روز ہے مہمانِ فاطمہؑ　　کہتی ہے عیدِ فطر مَیں قربانِ فاطمہؑ
بہرِ نماز قوّت کی تقلیل کرتی ہیں
تسبیح حق میں آپ کو تہلیل کرتی ہیں

بیہوش ہیں فضائلِ زہراؑ سے عقل و ہوش　　خود بے لباس اور خلائق کی پردہ پوش
عسرت سے بے حواس مگر یادِ حق کا ہوش　　فاقے سے چہرہ خشک ہے دریادلی کا جوش
مستغنی المزاج ہیں عالم نواز ہیں
زیور سے مثل ذات خدا بے نیاز ہیں

دیکھو مرثیہ ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ یا یہ مرثیہ:

برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد　　ہر مورچہ لرزاں ہے سلیماںؑ کی ہے آمد
فرعونیوں پر موسیٰ عمراںؑ کی ہے آمد　　تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد

جبر و دبدبۂ آمد

*حوّاؑ زوجہ جناب آدمؑ اور آسیہ فرعون کی زوجہ تھیں جنھوں نے جناب موسیٰؑ کو گویا پرورش فرمایا تھا جاریہ کنیز و خادمہ کے معنی پر ہے
جاری و جاریہ کی رعایت و تجنیس لفظی ظاہر ہے + ۱۲ ثابت۔

جن سیر کو نکلے تھے پرستے سے مڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماںؑ کے اُڑے ہیں

رن میں پسرِ فاتحِ خیبر کی ہے آمد — صف گرتی ہے صف پر شہِ صفدر کی ہے آمد
تاجِ شرف و فخرِ سکندر کی ہے آمد — شاہِ شہدا سبطِ پیمبرؐ کی ہے آمد
پیشانیٔ جن و ملک اب فرشِ زمیں ہے
چترِ سرِ اقدس پرِ جبریلِ امیں[۱] ہے

خورشید ہے دن کو مہِ نو شرم سے گھٹ کر — اغلب ہے کہ سیدھا فلکِ کج ہو اُلٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی چھٹ کر — اک سونے کا تانگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے
سیارے ہیں کیا شہرِ بدر چاند ہوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیر دو سر۔ ایک — قہر و اجل و رعب شہ جن و بشر۔ ایک
مولا کی سپر اور فلکِ ہفت سپر۔ ایک — افضالِ خدا۔ اور نظرِ فیض اثر۔ ایک
ہیبت ہے یہ بندہ کی دیا خوفِ خدا ہے
سر خود سے دل سینے سے۔ جاں تن سے جدا ہے

نے چرخ ہے۔ نے پشت نہ کہسار نہ قلزم — وہ سکتہ ہے وہ گردوہ رعشہ وہ تلاطم[۲]
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم — جس طرح سے آندھی میں خلاخوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

---

[۱] دفترِ ماتم میں یہ بند نہیں ہے۔ مگر ایک اور قلمی مرثیہ میں ہے۔ جو میرے پاس پُرانا لکھا ہوا ہے۔ اور جلد ہرائی لو لکھنؤ میں ہے۔ مگر اُس میں چھاپ غلط ہے۔ میں نے قلمی مرثیہ سے صحیح لکھ دی ہے۔ ثابت۔

[۲] لف و نشر مرتب ہے۔ ثابت۔

دیتی ہے فقط بے خبری کی خبر آمد یاں شور وہاں غل اِدھر آمد اُدھر آمد
بالائے سرِ آفت ہے تو پیش نظر آمد اب سینے میں دم کی نہ در آمد نہ بر آمد
ہر تن کو ہے دشوار بچانا دل و جاں کا
آنا شہِ والا کا ہے جانا دل و جاں کا

ہے بسکہ دماغ اوج پہ نورِ شہ دیں سے آوازِ انا العرش کی پیدا ہے زمیں سے
ہر جا ہے نیا فرش فرشتوں کی جبیں سے الفت ہے قدم گاہ شہِ عرش نشیں سے
سائے کے اگر پاؤں پھسل جائیں بجا ہے
پانی کے عوض نور کا چھڑکاؤ ہوا ہے

گدازِ دل

مرزا کے کلام میں گداز ہے۔ مرثیت ہے۔ مرثیہ خواں چند بند پڑھ کر مجلس کا مآل نکال لیتے ہیں۔ مجلس کو رُلاتے ہیں محرّم الحرام میں ایسے مرثیے بہت کام دیتے ہیں۔ مصنّف آبِ حیات لکھتے ہیں "حُسنِ قبول اور فیضِ تاثیر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر روتے رُلاتے ہیں کامیاب ہوتا تھا۔ اور یہی اس کام کی علّتِ غائی ہے"۔

صنائع

مرزا کے کلام میں صنعتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً طباق۔ تقابل۔ تضاد و مطابقت۔ تطبیق (جس کی شاخ مقابلہ ہے)۔ ایہام تضاد۔ ایہام تناسب۔ مراعات النظیر۔ توفیق تناسب۔ ایتلاف۔ مشاکلہ۔ مزاوجہ۔ ارصاد۔ عکس۔ رجوع۔ لف ونشر۔ جمع۔ تفریق۔ تقسیم۔ تجرید۔ مبالغہ۔ مذہب کلامی۔ حسنِ تعلیل۔ تاکید المدح بما یشبہ الذّم۔ تاکید الذّم بما یشبہ المدح۔ استتباع۔ توجیہ۔ الہزلُ الّذی یُرادُ بہ الجدّ۔ تجاہلِ عارفانہ۔ قول بالموجب۔ تعجب۔ اعتراض۔ تجنیس مقلوب۔ ردّ العجز۔ لزوم مالا یلزم (جن کی شاخیں) بے نقط۔

بالنقط۔ تحت النقط۔ فوق النقط (ہیں)۔ اور سجع ترصیع۔ ذوالقافتین۔ متلوّن۔ سیاق الاعداد وغیرہ وغیرہ ہیں +

مرزا صاحب بہت پرگو تھے۔ مرثیوں کی تعداد صحیح تو کہیں دیکھی نہیں۔ لیکن سیکڑوں بلا مبالغہ ہیں۔ اس بات کا تو (افسوس) کسی کو خیال بھی نہ آیا ہوگا۔ کہ تحقیق کرے۔ کہ مرزا صاحب نے یا ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ انیس۔ مونس۔ انس۔ نفیس۔ اوج (مدظلہ)۔ وحید۔ رشید۔ عارف (مدظلہما) وغیرہ نے کس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انگریزی کے ہر کامل کی نسبت معلوم ہے۔ مثلاً (۱) ملٹن نے قریب آٹھ ہزار کے (۲) برگ و گلیڈاسٹن نے بھی اسی قدر (۳) شکسپیر نے سولہ ہزار۔ (میں حافظہ سے کام لے رہا ہوں)۔ اسی طرح اور نثار اور شاعروں کی نسبت لکھا ہے۔ جملہ معترضہ ذرا طولانی ہو گیا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب نہایت مستعد اور پرگو مرثیہ گو تھے۔ ایک کربلا کے واقعہ کو ہزار طرح سے باندھا ہے۔ جو شاعر دنیا میں مشہور ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم یا کتاب سے مشہور ہیں۔ ایک کتاب یا نظم میں ایک مضمون بیان ہوا۔ اور پھر خاتمہ ہے۔ اور یہاں دیکھئے۔ کہ وہی ایک مضمون ہے۔ اور سیکڑوں مرثیوں میں نئی نئی طرح سے بندھتا چلا آتا ہے۔ اور ختم ہی نہیں ہوتا۔ بیابان کربلا کی دھوپ کی شدت لو اور گرمی کے ساتھ دشمنوں کی فوج کی کثرت ان کی شقاوت۔ بیرحمی۔ سنگدلی۔ بیوفائی۔ حرص۔ طمع زر۔ وعدہ خلافی۔ ظلم و تعدی۔ بزدلی۔ بیحیائی۔ احسان فراموشی۔ کفران نعمت۔ ہتک اسلام۔ ناخدا ترسی۔ بخل۔ جہل۔ کج فہمی۔ الغرض جہان بھر کی برائیاں ایک طرف۔ دوسری طرف صبر و شکر و تسلیم و رضا۔ تحمل و حلم۔ استقلال و ثابت قدمی۔ شجاعت۔

پرگوئی

الفاظ مستعملہ مرزا وغیرہ

ایک واقعہ کربلا ہزار طرح سے باندھا شان سخن سرائی

زہد و عبادت ۔ تقوےٰ و ورع حُسن خلق ۔ مروّت ۔ مُراعات ۔ عدالت ۔ عفو ۔ حیا ۔ احسان ۔ جود و سخا ۔ دینداری ۔ خدا ترسی ۔ خدا پرستی ۔ عزّت اسلام ۔ اعلائے کلمۃ الحق ۔ غرضیکہ جملہ صفات حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے ساتھ تین روز کی بھوک پیاس کے صدمے ۔ اعزّہ و احباب کو میدان جنگ میں بھیجنا ۔ اُن کی لاشیں اُٹھانا ۔ اہل حرم کو سمجھانا ۔ اپنی قلیل فوج کو جس کی تعداد بہتّر (مشہور) ہے آراستہ کرنا عرب کے آداب جنگ کے موافق ایک ایک کو قتال کے واسطے بھیجنا ۔ وہ شجاعت و بہادری دکھلانا کہ جس کے بیان سے زبان قاصر ہے غنیم کی کثرت فوج کے لحاظ سے کہ عقب خیمہ گاہ سے حملہ نہ ہو خندق کھودنا ۔ رسالت پناہ کے کُنبہ کی حُرمت کا ہر مصیبت میں سب سے زیادہ خیال ہونا ۔ اُس سے بالاتر رضائے خالق کا لحاظ کہ استقلال و صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے ۔ یہ ہر بات ایسی تھی ۔ جو رسول خدا کے نواسہ اور خدا کے برگزیدہ بندہ ہونے کو کما حقّہ ثابت کرتی تھی ۔ حُرؓ کا عفو تقصیر ۔ اُن کا شہید ہونا ۔ اہلبیتؑ کے خیموں کی تاراجی ۔ اُن کی اسیری اور شام کو جانا ۔ امام زین العابدینؑ کا تپ میں مبتلا ہونا ۔ نہ دوا ہے نہ غذا ۔ پانی تک میسّر نہیں ۔ پھر اُن کی اسیری اور دمشق کے قیدخانے کے مصائب ۔ ہتک حرمت ۔ یہ بڑے بیٹے پر گذری ۔ اِن سے چھوٹے جناب علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی پیاس ۔ نوجوان بیٹا جہاد کر کے واپس آتا ہے ۔ کیسا جہاد ؟ کہ اس پیاس اور دھوپ میں تن تنہا نے ہزاروں لاکھوں سے مقابلہ و مقاتلہ کر کے اپنے اُس قول کو ثابت کر دیا " اُقَاتِلُکُمْ بِالسَّیْفِ اَحْمِیْ عَنْ اَبِیْ ۔ ضَرْبُ غُلَامٍ ہَاشِمِیٍّ عَرَبِیٍّ تَاللّٰہِ لَا یَحْکُمُ فِیْنَا ابْنُ الدَّعِیِّ ۔ اَطْعَنُکُمْ بِالرُّمْحِ حَتّٰی یَنْثَنِیْ ۔ اپنے والد ماجد کی حمایت و نصرت میں اس طرح تم کو قتل کرونگا ۔ اور ایسی شمشیر زنی

اور نیزہ بازی کے جوہر دکھاؤنگا۔ کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔ کہ کسی ہاشمی قبیلہ کے لڑکے (نوجوان) سے مقابلہ ہُوا تھا۔ واللہ ہم اہل بیت رسول خداؐ پر حرام زادہ حاکم نہیں ہوسکتا"۔ اب واپس آکر باپ سے پانی مانگتے ہیں۔ حسینؑ نے کس بے بسی کے عالم میں فرمایا ہے۔ کہ اپنی زبان میرے مُنہ میں دو۔ شاید تسکین ہو۔ بیٹے نے تعمیل حکم کی۔ مگر فوراً زبان نکال لی۔ عرض کرتے ہیں۔ بابا!! آپ کی زبان تو میری زبان سے زیادہ خشک ہے۔ **الغرض** روز عاشورا (۶۱ھ) کی وہ دوپہر تھی۔ کہ دُنیا کے تمام رذائل و فضائل کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ حضرت حالی مدظلہ العالی نے ایسے دل کش اور پُراثر الفاظ میں حالات روز عاشور کی تصویر اپنے دیوان کے مقدمۂ شعر و سخن میں کھینچی ہے۔ جس کو نقل کئے بغیر دل نہیں مانتا:۔

حضرت حالی و معرکۂ کربلا

"فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلےٰ اور اشرف اور کیا ہوسکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسا جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جُھکنا چاہئے تھا۔ اور جس کو اُن سے بے انتہا اُمیدیں ہونی چاہئیں تھیں۔ وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستان عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں۔ صغیر سن بچّے اور سارا کُنبہ ہمراہ ہے۔ مدینے سے کُوفے تک مہینوں کی راہ طے کر دی ہے۔ جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے۔ اُن میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ کر چل دیئے ہیں※۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا اور رسولؐ کو درمیان دے کر نُصرت و یاری کے وعدے

※ان الفاظ سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ مدینہ سے جو لوگ ہمراہ چلے تھے۔ وہ جُدا ہوگئے۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہُوا۔ مدینہ سے جو وفادار چلے تھے۔ اُن میں سے بجز ایک شتربان کے اور سب کے سب کربلا میں امام حسینؑ پر صدقے ہُوئے۔ جرأت سے لڑے۔ نام نمود سے شہید ہُوئے۔ جو لوگ رستے میں جابجا سے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ ضرور امام حسینؑ کو چھوڑ کر چلتے پھرتے نظر آئے۔ غالباً مولوی حالی مدظلہ العالی کا بھی یہی مطلب ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

پر بُلایا تھا۔ وہ اُن کو آکر یک قلم منحرف و برگشتہ پاتا ہے۔ اور تمام اُمیدیں مبدّل بہ یاس ہوگئی ہیں۔ با ایں ہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اپنے اِرادہ پر ثابت قدم ہے۔ جس شخص کے تسلّط کو وہ ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھ کر اُس کی بیعت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اُسی طرح قائم ہے۔ دشمنوں نے کھانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے۔ اور دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے۔ گدھے اور اُونٹ تک اُس سے سیراب ہوتے ہیں۔ مگر اُس کا سارا کُنبہ تین روز سے پیاسا ہے۔ اُس کے ننّھے ننّھے بچّے پانی کی ایک ایک بُوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے۔ کہ وہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ با ایں ہمہ وہ اپنے ارادہ پر اُسی طرح ثابت قدم ہے۔ کسی سختی اور کسی مصیبت سے اُس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔

اُس کے یار و مددگار کُل ستّر اور ڈو بہتّر آدمی ہیں۔ اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہے۔ لڑنے میں اپنا اور سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمے اور اسباب کا لُٹنا۔ باقی ماندوں کا اسیر ہونا۔ عورتوں کی بے پردگی اور بادیہ پیمائی یہ سب آفتیں گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ مگر وہ اِن سب کو گوارا کرتا ہے۔ اور بہتر سمجھتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اور اُس کی حکومت کو تسلیم کر لے۔ وہ اپنے بھائی بیٹے۔ بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ مسلّح اور آراستہ کر کے ایک ایک کو ہزاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج رہا ہے۔ اُن کے بازو تلواروں سے کٹتے۔ اُن کے کلیجے برچھیوں سے چھدتے۔ اور اُن کی چھاتیاں تیروں سے چھِنتی دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھ کر لاتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے* خیمے میں

* امام حسینؑ نے صرف ایک دودھ پیتے ہوئے بچّے (علی اصغر) کی لاش دفن کی ہے۔ جو نہ معلوم کس طرح موقع مل گیا تھا۔

عورتوں کے کہرام سے ہر وقت ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی۔ بیٹی اور بہنوں کی دل خراش صدائیں دل میں ناسور ڈال رہی ہیں۔ چھ مہینے کا شیر خوار بچّہ ایک بے رحم کا تیر کھاکر گود میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اُس کے حلق سے خون کا فوّارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے ہیں۔ اور بچّہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سب کے بعد اپنی باری آتی ہے۔ اور پھر اہل بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے۔ اور مصائب وآفات کی گھنگور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی چیز اُس کے عزم واستقلال میں تزلزل پیدا نہیں کرسکتی۔ کہ وہ کوہ راسخ کی طرح اپنے ارادے پر ثابت قدم ہے۔ اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور نواسے کے خون کی پیاسی ہے۔ جو چند نفوس کے مقابلے کے لئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لیکر آئے ہیں۔ اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں۔ کہ جو ایذائیں اور تکلیفیں آدمؑ سے تا این دم کسی ذی رُوح نے کسی ذی رُوح کو نہیں دیں۔ وہ سب اپنے نبیؐ کے دلبند اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کی جائیں۔ جو حرص وطمع کے نشے میں دین۔ ایمان۔ رحم۔ انصاف۔ آدمیت۔ ہمدردی اور تمام فضائل انسانی سے دست بردار ہو کر خدا کا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۷۷) ورنہ کسی اور عزیز یا رفیق کی لاش دفن کرنیکی مہلت نہ ملی تھی۔ ازبسکہ مولوی الطاف حسین صاحب حالی مدظلہ العالی مرثیوں کی سُنی سُنائی باتیں لکھ رہے ہیں۔ شاید اسی واقعہ دفن علی اصغرؑ کا انکو خیال رہا۔ اور سب شہداء کی لاشوں کا دفن کرنا تحریر فرما گئے۔ ورنہ میرے علم میں کسی مستند مرثیہ گو نے بھی بجز علی اصغرؑ کے اور کسی شہید کا دفن کرنا امام حسینؑ کی نسبت نظم نہیں کیا ہے۔ شاید کسی کم علم مرثیہ گو نے کسی مرثیہ میں سب شہیدوں کا دفن کرنا (امام حسینؑ کی نسبت) لکھ دیا ہو۔ اور وہی مولوی حالی صاحب مدظلہ نے سُن کر نقل فرما دیا۔ ورنہ مولوی صاحب موصوف کی معلومات کی وسعت کا مجھے اعتراف ہے۔ یہ بات نیک نیتی سے ناظرین کی آگاہی کے لئے لکھ دی ہے۔ مولوی صاحب کی غلطی کی گرفت کی نیت سے نہیں لکھی گئی۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

گھر ڈھانے یعنی خاندانِ نبوّت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر طیّار اور کمر بستہ ہیں۔ نہ وہ اُن کو بد دُعا دیتا ہے۔ نہ اُن کی شکایت کرتا ہے۔ نہ اُن پر غُصّے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوےٰ کرتے ہیں اُن کو جتاتا ہے۔ اور اُن کے فرائض جو خاندانِ نبوّت کے ساتھ اُن کو بجالانے چاہئیں اُنہیں یاد دلاتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ اُمنگ ہے۔ کہ سب سے پہلے مَیں اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے۔ کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی۔ بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دُوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو طیّار اور میدانِ جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں[۱] کی یہ تمنّا ہے۔ کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزُو ہے۔ کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے مَیں بنوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے۔ کہ اپنے بچّوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کرے۔ بھائی اِس فکر میں گھُلا جاتا ہے۔ کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے۔ تو بہن کو کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ چچا گو خود بھی تین دن کی پیاس سے بے قرار ہے۔ مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لیکن پیاری بھتیجی کی بیقراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا[۲]۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہُوا دریا میں گھوڑا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے۔ دل قابُو سے باہر ہُوا جاتا ہے۔

[۱] بھانجوں سے مراد عون و محمد پسران عبداللہ بن جعفر طیّار ہیں۔ جو حضرت زینبؑ ہمشیرہ امام حسینؑ کے باوفا بہادر مشہورِ عالم فرزند ہیں۔ اور بھتیجے سے یہاں قاسم بن حسنؑ مراد ہیں۔ حالانکہ حضرت قاسمؑ کے اور بھائی بھی شہید ہُوئے ہیں۔ وہ بھی بھتیجے امام حسینؑ کے ہیں۔ اسی طرح دو بھانجے اور بھی امام حسینؑ کے معرکۂ کربلا میں شہید ہُوئے۔ جو حضرت مسلم بن عقیل کے دو فرزند تھے۔ یہ دو فرزند غالباً اُن کے علاوہ تھے جو کوفہ میں شہید ہُوئے حضرت مسلمؑ کو امام حسین کی بہن بھی منسوب تھیں۔ اُنہیں کے یہ دو فرزند تھے۔ اس رشتہ سے بھانجے ہُوئے ۔ثابت۔

[۲] حضرت عباسؑ بن علیؑ سے مراد ہے۔ جو امام حسینؑ کے بھائی اور وفادار، علمدارِ فوج اور ایک لاثانی شجاع تھے ۔ثابت۔

دو چُلّو پانی میں پیاس بُجھتی ہے۔ مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی۔ کہ ننھے ننھے بچّوں کی پیاس بُجھنے سے پہلے اپنی پیاس بُجھالے۔ وہ مشکیزہ بھر کر اُسی طرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے۔ تاکہ جلدی جاکر بچّوں کے خشک حلق میں پانی چوائے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ اس پر بھی اُس کو اپنے بازوؤں کا کچھ خیال نہیں اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے۔ کہ مُبادا پانی ضائع ہو جائے۔ اور بچّے پیاسے رہ جائیں۔ وہ سب حربے اپنے اُوپر لیتا ہے۔ مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا جب تک کہ زخموں سے چُور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا ؞

بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی۔ اور مُنہ سے سانس تک نہیں نکالتی* صرف اس خیال سے کہ جس مربّی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں۔ اُس کے دل پر میل نہ آئے۔ اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اُس کی اور اُس کی اولاد کی خیر مناتی ہیں۔ اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی ؞

*بعض ناواقفوں کو ایسے مضامین مرثیوں میں دیکھ کر یا سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ ماں نے کس دل سے کہا ہوگا۔ کہ میرا بیٹا قتل ہو جائے۔ مگر امام حُسینؑ کی جان کسی طرح بچ جائے۔ مگر جو لوگ امام حسینؑ کے عزیزوں اور رفیقوں کی وفاداری کو جانتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی ہُوا ہے۔ ہر بی بی اپنے فرزند کو امام حسینؑ پر گویا نثار کرتی تھی۔ اور شکر خدا بجالاتی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علی اکبرؑ ہم شکل پیغمبرؐ کی والدہ ماجدہ نے اُن کو امام حسینؑ پر نثار کر دیا۔ اسی بنا پر جناب مرزا صاحب مرحوم نے اُن مخطمہ کی زبانی ایک مرثیہ میں یہ خیال نظم فرمایا ہے۔ کہ ع اکبرؑ سے جس گذری مرے والی کو لے آؤ۔ ازبسکہ مولوی شبلی صاحب اس نکتہ سے ناواقف تھے (جس سے مولوی حالی صاحب واقف ہیں)۔ اُنھوں نے مرزا صاحب پر اعتراض جڑ دیا۔ مَیں نے اس کا مفصّل ومدلّل جواب مولوی شبلی صاحب کو دیا ہے۔ جو اپنے موقع پر اس کتاب میں درج ہے۔ وہ مقام ناظرین کے ملاحظہ کے قابل ہے ؞ ۱۲ مؤلف حقیر۔

دو صغیر سن بھائی جو صرف اس قصور پر کہ نبیؐ کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم
کے حکم سے واجب القتل ٹھیرے ہیں۔ جلاد دونوں کے سر پر تلوار تولے کھڑا ہے۔
بڑا بھائی منتیں کرتا ہے۔ کہ پہلے میرا سر اُتار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے۔ کہ پہلے
مجھ پر وار کر۔ ایک[2] خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبیؐ کے نواسے سے
لڑنے کو آیا ہے۔ باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُس کو ہر طرح دولت وجاہ
ومنصب کی توقع ہے۔ اور اُن کا ساتھ چھوڑنے میں جان اور مال اور خاندان کی
تباہی کا یقین واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہُوا ہے۔ وہاں کوئی ترغیب یا تقریب
ایسی نہیں۔ جو اُس کا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حبِّ جاہ و ثروت سے ہٹا کر
رحم و ہمدردی و دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اُس کو ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے۔
کہ جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اُتارئے۔ عورتوں اور
بچوں کو اسیر کر کے لے چلئے۔ اور حاکم سے چل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔
دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا۔ جس کے لالچ میں وہ ان
تمام فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے۔ بلکہ بخلاف اس
کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ بااین ہمہ وہ ان تمام
دُنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈال کر اُن ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق
کی نُصرت میں اپنی جان دینے کو فوزِ عظیم جانتا ہے۔ اور سب سے پہلے خاندانِ نبوت

---

[1] جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کے دونوں یتیم بچوں سے مراد ہے۔ جو مسلمؑ امام حسینؑ کے نائب و چچازاد بھائی تھے۔ اور جو کوفے میں امام حسینؑ کے حکم سے آئے۔ اور کوفیوں سے بیعت امام حسینؑ لیکر چند روز ٹھیرے تھے کہ کوفی ان سے پھر گئے اور وہ شہید ہوئے۔ یہ دونوں یتیم اوّل قید ہوئے۔ داروغہ مجلس نے جو نیک نہاد مسلمان تھا ان بچوں کو چھوڑ دیا کہ مدینہ چلے جائیں۔ یہ بچے پھر گرفتار ہو کر قتل ہوئے ۱۲ ثابت۔

[2] یہ خدا کا بندہ حُر ریاحی ہے۔ جو ایک ہزار یا اس سے زیادہ سواروں کا سردار اور نہایت بہادر اور صاف اور سچا شخص تھا فوج یزید سے دلیرانہ نکل کر امام حسینؑ سے ملا۔ اور سب سے پہلے شہید ہُوا ۱۲ ثابت۔

پر اپنی جان فدا کرتا ہے*۔ چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزندِ نبیؐ کے ہمراہ ہیں۔ اور جو ایک ٹڈی دَل کے مقابلے میں اِس قدر قلیل ہیں۔ کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اُس کے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اُس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چُرا چُرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لئے اُس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دُنیا کی کوئی بھلائی نہیں سُوجھتی۔ بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُس کی رفاقت کی بدولت بھُوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے۔ جو اُس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق اُن کی گردن میں اور دوستی اور اخلاص کی زنجیر اُن کے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع اُن کے اس تعلّق کو قطع نہیں کر سکتی۔ ہر وقت یہ آرزو ہے۔ کہ کب اذنِ جنگ ملے۔ اور کب خاندانِ نبوّت پر اپنی جانیں قربان کریں۔ اور کب اس فرض سے سُبک دوش ہوں"۔

مرزا صاحب نے یہ مضامین سیکڑوں طرح سے سیکڑوں مرثیوں میں باندھے ہیں۔ اور نئی نئی طرح سے باندھے ہیں۔ بقول آتش مرحوم ؎

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی ✤ جب سُنائی نئی سُنائی بات

یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مضامین کی آمد کا چشمہ برابر جاری ہے۔ اور اس طرح کہ اُسکو

* حر کے لفظی معنی آزاد کے ہیں۔ اس زمانہ کے لوگ آزادی آزادی پکارتے ہیں۔ مگر اکثر آزاد کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی پابندی سے آزاد ہوں۔ حالانکہ آزاد کے یہ معنی ہیں کہ بد اخلاقیوں سے الگ تھلگ رہے۔ حق کا حامی باطل کا دشمن ہو۔ میں نے ایک رباعی کہی ہے۔ جو مناسب موقع سمجھ کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ (رباعی) دل میں تھا اثر ہدایت ہادی کا ✤ غم قتل کا تھا نہ خانہ بربادی کا ✤ نکلا دوزخ سے سیدھا جنّت میں گیا ✤ کیا لطف اُٹھایا حُر نے آزادی کا ✤ خدا ہر شخص کو حضرت حُر کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے ✤ ۱۲ ثابت رضوی۔

نہ ضعیفی۔ نہ نقاہت۔ نہ انقلاباتِ زمانہ کوئی شئے خشک نہیں کرسکتی۔ (اس آگ کو موت ہی ٹھنڈا کرتی ہے۔ بس) بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت کی آمد کے ساتھ میدان واقعات وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایا طبع کی روانی بند ہی نہیں ہوتی۔ قید و نظم اور کمی واقعات سے زور بڑھتا ہی جاتا ہے ÷

بحورِ منتخبہ دبیر اعلیٰ اللہ مقامہٗ اکثریت

جناب مرزا صاحب کی طبع نے اکثر حسب ذیل بحروں میں غوّاضی کی ہے:-

۱- بحر ہزج۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن۔ لے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے ÷

۲- بحر مضارع۔ مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن۔ یا رب مجھے مرقعِ خلدِ بریں دکھا ÷

۳- بحر رمل۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ ÷

۴- بحر مجتث۔ مفاعلن۔ فعلاتن مفاعلن فعلن۔ رواں نہرِ لبن کو جو شیرخوار ہوا ÷

ایسے ہی بحروں میں مرثئے زیادہ* رنگ دیتے ہیں۔ جب ہم ایک مختصر سی نظم ایک بحر میں کہتے ہیں۔ تو دوسری نظم کے لئے اُس بحر میں مضامین در کنار الفاظ بھی نہیں ملتے۔ اور یہاں سیکڑوں مرثئے موجود ہیں۔ اللہ اللہ ÷

ثبت شہادت امام حسینؑ و اصحاب امام ممدوحؑ

حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ہمراہیوں سے وہ سبق حاصل ہوتے ہیں۔ کہ جو دین و دُنیا میں صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (جن کا مزار شریف اجمیر میں ہے) کیا خوب فرماتے ہیں ؎

*خصوصاً تحت لفظ مرثیہ پڑھنے میں یہ بحریں زیادہ سامعین پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور سوز میں بھی دو بحروں سے ان کا زور کم نہیں ہے۔ مگر سوز میں بعض اور بحریں بھی زیادہ مؤثر ہیں۔ جن میں اکثر افسردہ دلگداز کے مرثئے پوربی و پنجابی زبان میں ہیں۔ اور مرثیت کے لحاظ سے وہ مرثئے دبیر و انیس سے بہتر ہیں ۱۲ ثابت حقیر۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ ۔۔۔ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دستِ یزید ۔۔۔ حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

یہ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمامؑ اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکۂ کربلا میں ظاہر ہوئے۔ وہ مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے نہیں تھے۔[1] امامؑ نے امامت سے (جو بیشک مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے ہے) کام نہیں لیا۔ اور پھر امامؑ تو ایک ہی تھے۔ امامؑ کے عزیز و اصحاب گو اعلیٰ درجہ کے ظاہری و باطنی فضائل سے آراستہ و پیراستہ تھے لیکن معصوم تو نہ تھے۔ یہ تمام سبق ہماری ہدایت کیلئے ہیں اور بہترین نمونے پیروی کے ہیں۔[2] حضرت امام حسین علیہ السلام مذہب حقہ کیلئے لڑتے تھے۔ اور لڑائی بھی ایسی حالت میں جس میں شکست اور اپنی اور اپنے تمام اعزا کی شہادت اور گھر بار کا تاراج ہونا یقینی تھا +

وہ کام فوق قوت بشری نہیں تھے

مرزا صاحب کے آفتاب نظم سے روشن ترین شعاعیں اُس وقت نکلتی ہیں۔ اور مرزا کی طبیعت کا بحر ذخار اُس وقت جوش پر آتا ہے۔ اور جوار بھاٹہ کی انتہا کا پتہ اُس وقت ملتا ہے۔ جب وہ مدح اہل بیت فرماتے ہیں۔ اس مرثیہ (ع قرآن مبین سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں فرماتے ہیں (شان جناب امیر علیہ السلام میں):۔

یہ قبلۂ دیں۔ حور و ملک جبّۂ تسلیم ۔۔۔ یہ صدر نشیں ہفت فلک یک قد تعظیم
یہ فرق مبیں شوکت حق افسر و دیہیم ۔۔۔ یہ جسم یقیں۔ علم خدا جامۂ تکریم

[1] انسانیت وہ چیز ہے۔ کہ اگر اُس کے اعلیٰ درجہ پر آدمی فائز ہو۔ تو فرشتوں سے بہتر ہے۔ پس یہ تمام امام حسینؑ کے ساتھی اعلیٰ درجہ انسانی پر فائز تھے۔ اس لئے ان سے ایسے کام ظاہر ہوئے جو ایک ادنےٰ درجہ کے انسان کو بظاہر مافوق طاقت بشری معلوم ہوتے ہیں + ۱۲ بے بضاعت مؤلف۔

[2] پس میر انیس اور مرزا صاحب کے مرثیوں سے جو خوش اخلاقی کا سبق انسان حاصل کر سکتا ہے۔ شائد دوسری (اردو کی) کسی کتاب اخلاق سے حاصل کر سکے اور انسان کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ ان کربلائیوں کے مصائب پڑھ کر اُس کو اپنی مصیبت ہیچ دپوچ نظر آتی ہے۔ اور اس طرح اپنی مصیبت پر صابر و مستقل ہو جاتا ہے + ثابت۔

مناقب میں جوشِ طبیعت

پیمائش پوشاکِ شرف ہاتھ سے کب ہو — نہ دو رُبعہ افلاک جہاں ایک وجب ہو[1]

آتا نہ اگر رُوئے زمیں پر قدمِ پاک — جائز نہ کبھی ہوتی تیمم کے لئے خاک

گر ہیچ میں ہوتا نہ سرِ سیّدِ لولاک — بے پاؤں کبھی گرد زمیں پھرتے نہ افلاک

پر ضعف سے ہلتا نہ فرشتوں میں کسی کا — ہوتا نہ رقم نام ۔ پرِ ملک پہ ۔ جو علیؑ کا[2]

اس طرز کے بہت سے بند ہیں۔ یہ امر کہ مدح اہلِ بیت میں جناب مرزا صاحب کا کلام بہت پُر زور اور جوش سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس مرثیہ (سر سبز ہو یا رب سخن اس ہیچمداں کا) کے چند بندوں سے بھی پورا پورا (جو جناب امام حسینؑ کی مدح میں اوپر نقل ہو چکے) ثابت ہوتا ہے۔

فصل ۲ ظرافت

کلام میں ظرافت نہیں ہے۔ بیشک مرثیہ میں ظرافت کا موقع نہیں ہے۔ لیکن تاہم گوشے پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً جب کوئی پہلوان مقابلہ پر آتا ہے، اور اس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اس وقت ظرافت کے پہلو نکل سکتے ہیں[3]+

۱؎ یہ بند مرزا صاحب کے دقیق کلام میں سے ہے۔ چاروں مصرع ذو قافیتین ہیں۔ ایک قافیہ دین نشین مبین یقین کا ہے۔ دوسرا تسلیم و تعظیم و دیہیم تکریم کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جناب امیر قبلۂ دین ہیں اور حمد و ملک بمنزلہ پیشانی تسلیم ہیں۔ پیشانی تسلیم کا قبلہ کی طرف سجدہ میں جھکنا لازمی و قدرتی ہے۔ جناب ممدوح صدر نشین ہیں۔ سات فلک گویا قد تعظیم ہیں۔ صدر نشین کی تعظیم وہ ضرور کریں گے جو تعظیم کیلئے بنے ہیں۔ یہ جناب سرِ روشن ہیں جن کے فلک بمنزلہ افسر دیہیم ہیں۔ اور یقین کے جسم ہیں۔ اُن خدا کا علم گویا جامۂ تکریم ہے۔ ان کے شرف کی پوشاک کی پیمائش کیونکر ہو سکے۔ کہ آسمانوں کے نو گز ان کی شرف کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک بالشت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فضائل علیؑ بیشمار ہیں+ ثابت

۲؎ ظرافت آمیز کلام مرزا مرحوم کا الگ ہے۔ اور اسی طرح ہجو بھی مرزا مرحوم نے فرمائی۔ مگر کسی کی صرف قاتلان اہلبیت کی۔ نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کے کتب خانہ میں کچھ شعر میری نظر سے اب سے ۳۰ برس پہلے گزرے تھے جن میں ظرافت کے نمک کے ساتھ رجیں بھی غضب کی تھیں۔ مگر پھر وہ طباق کا طباق مرزا صاحب کے شاگرد شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم نے اس طرح لیلیا جیسے کسی کے منہ سے کوئی بات چھین لے۔ پہلوان کے سراپا میں ظرافت کا پہلو نادر ہے۔ ذرا غور طلب ہے کیونکہ ایک مجلس میں ایک صاحب کے ایک مصرع پڑھنے پر (منبر سامنے) تمام مجلس ہنس پڑی تھی۔ اس کا خیال سامعین کے دل سے آخر مجلس تک گیا ہی نہیں۔ رقت نہ ہوئی اور ذل مجلس عزا کا الجھا جاتا ہے۔ وہ مصرع یہ ہے "آیا اچھلتا کودتا بکتا ہوا بکا" اُن ذاکر صاحب نے اس کو بہت بتایا تھا پہلے وہ کہہ چکے

مرثیہ و تسلسل

تمام مرثیہ از مطلع تا مقطع دست و گریباں ہو۔ یہ بات اُن مرثیوں میں جو میں نے دیکھے ہیں نہیں پائی گئی[1]۔

مصرع سے مصرع۔ بند سے بند۔ بات سے بات مرثیہ میں از ابتدا تا انتہا پیدا ہوتی چلی جائے۔ اِس امر کا لحاظ اُن مرثیوں میں نہیں پایا گیا[2]۔

سلاست یعنی سلیس اور عام فہم الفاظ سے عالی و نازک خیالات ادا کرنا۔ اسکی بھی کمی پائی گئی[3]۔

---

[1] و [2] و [3] یہ بات کہ مرثیہ میں ایشیائی قصّوں یا مثنوی کی طرح سلسلہ ہو۔ بحث طلب ہے۔ مَیں اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر عرض کر چکا ہوں۔ کہ عربی۔ فارسی۔ اردو کے عام اساتذہ کے مرثیوں میں ایسا تسلسل نہیں ہے۔ بلکہ کسی میں غزل کی شان ہے کسی میں قصیدہ کی آن بان ہے۔ مثال کے طور پر ایک عرب دوسرے عجم تیسرے اُردو کے سب سے اعلےٰ شاعر کا مرثیہ لے لیجئے۔ عربوں میں دعبل خزاعی کا وہ مقبول و مشہور مرثیہ پڑھئے۔ جو دعبل نے امام رضا علیہ السلام کی مجلس حضوری میں پڑھا جس کے چند شعر اوّل کے ملاحظہ ہوں۔ یہ مرثیہ دعبل بہت مقبول و مشہور ہے۔ بحار الانوار کی دسویں جلد میں بھی یہ مرثیہ ہے مگر میرے پاس وہ اصل کتاب مستطاب موجود نہیں ہے۔ اُس کا ترجمہ اردو مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ ہے۔ اُس کے صفحہ ۲۰ سے یہ مرثیہ لکھتا ہوں:۔

نمونۂ مرثیہ عربی از دعبل

مرثیۂ دعبل

(۱) أَفَاطِمُ لَوْ خِلْتِ الْحُسَيْنَ مُجَدَّلًا ۔۔۔ وَقَدْ مَاتَ عَطْشَانًا بِشَطِّ فُرَاتِ

اے (جناب) فاطمہ اگر تم دیکھتیں (امام) حسینؑ کو خاک پر پڑا ہوا جس وقت کہ کنارِ فرات پر پیاسے قتل ہوئے تھے۔

(۲) إِذًا لَلَطَمْتِ الْخَدَّ فَاطِمُ عِنْدَهُ ۔۔۔ وَأَجْرَيْتِ دَمْعَ الْعَيْنِ فِي الْوَجَنَاتِ

اُس وقت تم اپنا منہ پیٹتیں اور آنسو چشم ہائے مبارک کے رخسار اقدس پر بہاتیں۔

(۳) أَفَاطِمُ قُومِي يَا ابْنَةَ الْخَيْرِ وَانْدُبِي ۔۔۔ نُجُومُ سَمٰوَاتٍ بِأَرْضِ فَلَاةِ

اے فاطمہؑ! اے خیر البشر کی بیٹی!! اُٹھو اور نوحہ کرو۔ کہ آسمان کے تارے جنگل کی خاک پر پڑے ہوئے ہیں۔

یہ تین شعر ہوئے۔ اور یہ تینوں اشعار کسی قدر مسلسل ہیں۔ کہ شاعر نے اوّل امام حسینؑ کے (بعد قتل) بے گور و کفن زمین پر

فسانۂ عجائب کے مرثیہ گویوں کے تخلص

جب مرزا دبیرؔ نے مرثیہ کے میدان میں قدم رکھا اُسوقت حسبِ ذیل مرثیہ گو تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ فسانۂ عجائب میں لکھتے ہیں:۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) پڑے رہنے کو بیان کیا۔ پھر اُن کے عزیزوں اور رفیقوں کا اُسی طرح بے گور و کفن جنگل میں پڑا ہونا (اشارۃً) بیان فرمایا۔ اب چوتھا شعر سُنئے:۔

قبورٌ بِکُوفَانِ وَاُخرٰی بِطِیْبَۃٍ　　وَاُخرٰی بِفَخٍّ نَالَہَا صَلَوَاتِ

اہلبیتؑ کی قبریں متفرق ہیں۔ کچھ کوفے میں ہیں۔ کچھ مدینہ منوّرہ میں بعض مقام فخ میں ہیں۔ اُن پر درود نازل ہو۔

اب اس شعر میں دعبل نے وہ سلسلہ شہدائے کربلا کا قائم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ فرمایا۔ کہ اہلبیتؑ ایسے پریشان ہوئے۔ کہ اُن کی قبریں بھی ایک جگہ نہ ہوئیں۔ بعض کوفے میں مدفون ہیں۔ کوفہ میں جناب میثمؑ اور مسلمؑ ابن عقیلؑ اور اُن کے دو فرزندوں کی قبروں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور مدینہ منوّرہ میں جناب رسالت مآب صلعم کی لختِ جگر جناب سیدہؑ و جناب امام حسنؑ و امام زین العابدینؑ و امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ مدفون ہیں۔ اُن کی قبورِ مقدسہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور مقام فخ میں حسینؑ بن علیؑ بن حسنؑ کی قبر ہے +

ناظرین! دیکھئے وہ تسلسل کہاں قائم رہا۔ کربلا کے شہدا کا ذکر کرتے کرتے دعبل رحمہ اللہ کوفہ۔ مدینہ منوّرہ و مقام فخ کی قبروں کا بیان فرمانے لگے۔ زیادہ اشعار اس مرثیہ کے طول کے خیال سے میں نہیں لکھتا +

بارہ بند محتشم

اچھّا اب مَیں ملا محتشم کاشی رحؔ کے چہاردہ بند مقبول میں سے دو بند لکھتا ہوں۔ یہ بات کہ ملا محتشم تمام ایرانیوں میں بے مثل مرثیہ گو ہیں۔ بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ جس پایہ کے عربوں میں دعبلؒ ہیں۔ اُسی مرتبہ کے محتشم عجموں میں ہیں۔ اور یہ چودہ بند ایسے لاجواب ہیں۔ جن کی نسبت مشہور ہے۔ کہ آج تک کسی سے اس نظم کا جواب نہ ہوسکا۔ ملا محتشم کا کلیات (جس میں سے یہ دو بند لکھتا ہوں) مجھے مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی سلمہ اللہ و القاہ سے ملا۔ جو صاحب نجوم السّماء کے فرزند ارجمند اور ایک کامل ادیب شاعر باخبر ہیں۔ آن کی اس عنایت و محبّت کا شکریہ ادا کرتا ہوں:۔

کشتی شکست خوردۂ طوفانِ کربلا　　در خاک و خوں طپیدۂ میدانِ کربلا

گر چشم روزگار برو زار میگریست　　خوں میگذشت از سر ایوانِ کربلا

نگرفت دست دہر گلابے بغیر اشک　　زاں گل کہ شد شگفتہ بہ بستانِ کربلا

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق فصیح۔ مرد مسکین بصورت گدا۔ بطالع سکندر۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا سنا ظم خوب و بسیر مرغوب"

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) اُوپر کے تینوں شعروں پر غور کرنے سے پایا جاتا ہے۔ کہ شاعر بعد شہادت کے واقعہ کو لکھ رہے ہیں۔ اچھا اب چوتھا شعر سُنئے۔ جس میں شہادت کے ماقبل واقعہ کو لکھا ہے:۔

(۴) در آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں   خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا

اب اِس شعر میں کوفیوں کی بیوفائی کا بیان فرمادیا۔ کہ جنہوں نے مہمان کربلا کو پانی بھی نہ دیا۔ پھر فرماتے ہیں:۔

(۵) بودند دیو ودد ہمہ سیراب و می مکید   خاتم۔ زقحط آب سلیمان کربلا

یہ شعر ضرور شعر ۴ سے دست و گریباں ہے۔ اور نیچے کا شعر گو اس سے متعلق ہے۔ مگر واقعہ مابعد شہادت کا منظوم فرمایا ہے:۔

(۶) زاں تشنگان ہنوز لبعیّوق می رسد   فریاد العطش ز بیابان کربلا

(۷) آہ از دمیکہ لشکر اعدا نہ کرد شرم   کردند رو بہ خیمۂ سلطان کربلا

اب پھر اس ساتویں شعر میں خیام اہلبیتؑ کے غارت ہونیکا بیان فرمادیا۔ اسی طرح بیت میں جو حسب ذیل ہے:۔

آں دم فلک بر آتش غیرت سپند شد   کز خوف خصم در حرم افغاں بلند شد

یہ دوسرے نمبر کا بند تھا۔ اب ایک بند بارھویں نمبر کا بھی لکھے دیتا ہوں:۔

(۱) اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردۂ   وز کیں چہا دریں ستم آباد کردۂ

(۲) بر طعنت ایں بس ست کہ با عترت رسولؐ   بیداد کردہ خصم و تو امداد کردۂ

یہاں تک آسمان کا شکوہ ظلم و بیداد تھا۔ اب مصنّف علام یکایک عبیداللہ بن زیاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں:۔

(۳) اے زادۂ زیاد نکردست ہیچ گہ   نمرود ایں عمل کہ تو شدّاد کردۂ

(۴) کام یزید دادۂ از کشتن حسینؑ   بنگر۔ کرا بقتل کہ۔ دل شاد کردۂ

(۵) بہر خسے کہ بار درخت شقاوت ست   در باغ دیں چہ باگل و شمشاد کردۂ

(۶) با دشمنان دیں نتواں کرد آنچہ تو   با مصطفٰےؐ و حیدرؑ و اولاد کردۂ

بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔" ایسے بڑے بڑے صاحب کمال تھے۔ مگر ویر نے ثابت کر دکھایا۔ کہ اُن کے لئے گنجائش ہی نہ تھی۔ بلکہ خاص جگہ خالی تھی۔ یا یُوں کہو۔

ناسخ کے زمانہ میں بھی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰۳)

بیداد

(۷) حلقے کہ سودہ لعل لب خود نبیؐ بر آں — آزردہ اش بہ خنجر فولاد کردہ

ترسم ترا دمیکہ بہ محشر درآورند — از آتشِ تو دود بہ محشر برآورند

یہ تو عرب وعجم کے اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ کے مرثیہ گویوں کی نظمیں حقیر نے پیش کیں۔ اب ہندوستان میں آئیے۔ اردو کے شاعروں میں میرؔ و سوداؔ لاجواب مانے جاتے ہیں۔ یہ مصرع جناب شیخ ناسخ کا مثل کی طرح زبانوں پر ہے ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ اور سودا کی اُستادی کے لئے یہ لکھ دینا کافی ہے۔ کہ میر ایسے عالی دماغ شاعر نے اُن کو پُورا شاعر مانا۔ اور شعرائے مابعد بھی اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جناب ناسخ مرحوم فرماتے ہیں:۔

کب ہماری طبع سے ہوتا ہے سودا کا جواب — ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

اور جناب مرزا دبیر مرحوم فرماتے ہیں۔ ع سودا کے مرثئے کا تو ممکن نہیں جواب۔ اب ان میرؔ و سوداؔ کے مرثیوں کو دیکھئے۔ کہ یہ کس قدر تسلسل کا مرثئے میں خیال رکھتے ہیں +

حضرت میرؔ کا تو صرف ایک مربع مرثیہ آج ملتا ہے۔ وہ بھی جناب **سودا** کی بدولت۔ کہ انہوں نے اعتراضات کرکے اُس کو لکھا ہے۔ اور وہ کلیات سودا میں صفحہ ۴۸۸ پر (دیوان مرثیہ میں) چھپا ہے۔ اور وہ مرثیہ مربع یہ ہے:۔

شانِ مرثیہ (میرؔ)

(۱) دلوں پر مومنوں کے حالت عجب ہے — مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے — حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے

(۲) مومنوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے — ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی ہائے ویلا مچی ہے — کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

(۳) کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا — وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا — قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

(۴) ہے چاروں طرف ہو رہا شور محشر — زمین آسماں ہو رہا ہے تل اوپر

مرزا صاحب فرشتہ صفات تھے

کہ مرزا صاحب نے جگہ پیدا کرلی +

جناب مرزا دبیر صاحب انسان کے جامہ میں فرشتہ تھے۔ زہد و ورع۔

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

حسینِ علیؑ پر چلایا ہے خنجر | ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

اُوپر کے دو بندوں میں تو شہادت کی رات کا ذکر فرمایا تھا۔ یکایک روز عاشور بعد عصر شہادت کا حال تیسرے اور اور چوتھے بند میں نظم کرگئے۔ اب فرمائیے۔ وہ سلسلہ بندی مثنوی کی ایسی کہاں ہے +

مرثیہ سودا

اب خود حضرت سودا کے مرثیے کو لیجئے۔ اور مرثیہ بھی وہ مرثیہ جو چوٹی کا ہے۔ سوز میں بھی پڑھا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ کلیات سودا میں صفحہ ۵۷۵ پر درج ہے :۔

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے | انصاف سے جواب دو حیدرؑ کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھے پیمبرؐ کے واسطے | یا ظالموں کی بُرّش خنجر کے واسطے

چار بند انھیں اسلحہ (تیر۔ تلوار۔ نیزہ۔ تبر۔ کارد) کی نسبت لکھ کر فرماتے ہیں :۔

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی بَیر | ان کی سی پر قساوت قلبی نکی ہیں سیر
پینے دیں آب انس سے لے تا بوحش و طیر | مانع ہوں ابن ساقی کوثر کے واسطے

بند مذکورہ میں اس بات کو بیان فرمایا تھا۔ کہ اہلبیت اطہار کو کلمہ گویوں نے پانی بھی نہ پینے دیا۔ اب ذیل کے بند میں مصنف علام ایک دُوسرے واقعہ جاں سوز آتش زنی خیام کو بیان فرماتے ہیں :۔

اُمت ہو وہ کہ خانہ دیں کی ہو پاسباں | یا لُوٹ لیوے اپنے پیمبرؐ کا خانماں
آتش برائے پخت و پز آئی تھی درجہاں | یا دینے کو وہ فاطمہؓ کے گھر کے واسطے

اب پھر مصنف مرحوم تمام شہدائے کربلا کی شہادت ذیل کے دو بندوں میں لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ پہلے کا ہے۔ اور واقعہ اول الذکر (آتش زنی خیام) مابعد کا واقعہ ہے :۔

راوی لکھے ہے خرد و کلاں رن میں جب مُوا | نیزے سے اور تیر سے سب کا لہو چُوا
شہزادہ طفل اصغر معصوم تک ہُوا | طعمہ عُقاب تیر ستمگر کے واسطے

تقوےٰ و پرہیزگاری۔ جود و سخا۔ ایثار و ہمدردی وغیرہ کا اُن پر خاتمہ تھا۔ ایسے پاکیزہ نفس کی سوانح عمری لکھنا ایک واجب کفائی تھا۔ جس کو بحمد اللہ آپنے ادا کیا۔ اور نہایت محنت سے +

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

تنہا پھر اُس زمیں پہ رہا شاہِ کربلا　　اُس کا بھی تیغ ظلم سے آخر کٹا گلا

بعد اِس ستم کے خیمہ ہؤا مُوردِ بلا　　غارت گروں کے ہاتھ سے زیور کے واسطے

اب پھر تاراجی خیام اہلبیتؑ کا حال بیان فرماتے ہیں۔ مگر اِس بند میں کمال کیا ہے۔ واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے:

خیموں میں جب دھنسے وہ لعیں چھاتیاں تنے　　بیٹی چھُپی تھی ماں کنے۔ ماں بیٹی کے کنے

کیا ہووے اُن غریبوں پہ جن پر یہ آبنے　　جز۔ یہ کہ دیں خدا و پیمبرؐ کے واسطے

المختصر عرب۔ عجم اردو کے جتنے شاعر کامل مرزا صاحب کے قبل گذرے ہیں۔ اُن میں سے مرثیہ میں تسلسل کا ہونا کسی ایک نے بھی لازم نہیں سمجھا۔ بنی نوع انسان کی طبیعتوں کا مذاق بھی مختلف ہے۔ کوئی تو تسلسل واقعات وحکایات تضیعے کو پسند کرتا ہے۔ کسی کو ایک حال سلسلہ وار سُننا اجیرن ہوجاتا ہے +

مرثیہ میں مثنوی و قصہ کا ایسا تسلسل لازمی نہیں

بہرحال مرزا صاحب کے مرثیوں میں بھی مثنوی اور ایشیائی قصّوں کی ایسی سلسلہ بندی عام طور پر نہیں ہے۔ بلکہ اکثر قصائد کی شان غالب ہے۔ اور جب وہ ایک واقعہ بیان کرتے کرتے دُوسری بات چھیڑ دیتے ہیں۔ تو تشبیب وگریز کا لطف آتا ہے۔ اور نہایت خوبی سے ایک واقعہ کا دُوسرے واقعہ سے پیوند لگاتے ہیں۔ مگر اب مشکل یہ آپڑی ہے۔ کہ اُن کی اصلی ترتیب بھی موجودہ مطبوعہ مرثیوں میں قائم نہیں رہی ہے۔ نسّاخ کے جواب میں مرزا محمد رضا معجز مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب (تطہیر الاوساخ) میں کیا اچھّی بات فرمائی ہے۔ کہ اکثر مرثیہ پڑھنے والے ایک مرثیہ کے بند دُوسرے میں شامل کرلیتے تھے۔ اکثر بند اختصار کی ضرورت سے کم کردیتے تھے۔ اُنہیں لوگوں کے بستوں کے مرثئے چھپنے کو پہنچے اور چھپے۔ خصوصاً اُن مرثیوں میں (علاوہ زیادہ غلط ہونیکے) یہ عیب زیادہ دیکھا گیا۔ جو مطبع منشی نول کشور آنجہانی میں چھپے ہیں۔ اور مرزا صاحب پر کچھ منحصر نہیں۔ یہ بے ربطی جناب میر انیس مرحوم کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ زمانہ جانتا ہے۔ کہ میر صاحب مغفور تسلسل کا بہت

حضرت انیسؒ کے کمال کا اعتراف

اس مضمون کو پڑھ کر کوئی صاحب شاید یہ فرمائیں یا دل میں خیال کریں۔ کہ موازنہ دبیرؒ و انیسؒ نہ کیا۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ اس مضمون کا یہ مقصد نہ تھا۔ کہ موازنہ کیا جائے۔ لیکن مجھ کو **حضرت انیس مرحوم** سے بھی اس قدر عقیدت ہے۔ کہ مَیں یہ کہے بغیر اس مضمون کو ختم نہیں کر سکتا۔ کہ میری رائے میں جتنے قلم کے **بہترین مصوّر** روئے زمین پر گذرے ہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) خیال فرماتے ہیں۔ اور یہ بات اُن کے مشہور کمالات میں سے قابل مدح ہے۔ مگر کاتبوں سے سب مجبور ہیں۔ ہمارے مخدوم و مکرم جناب **مسٹر** نواب حامد علی خاں صاحب نے یہ خط مجھے مقام ڈومس (نزد سورت) سے لکھ کر ارسال فرمایا تھا۔ ڈومس میں جناب ممدوح اپنے علاج و تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مقیم تھے۔ وہیں چند کتابیں ساتھ لے گئے تھے۔ اُن میں ہی مطبع نولکشوری آں جہانی کی مطبوعہ ایک یادو جلد (مراثی دبیر) بھی تھی۔ اُن مرثیوں کی نسبت یہ کہنا (کہ از مطلع تا مقطع دست و گریباں نہیں ہیں) بالکل صحیح ہے۔ دفتر ماتم کی جلدوں میں اس قدر بے ربطی نہیں ہے۔ مگر (بقول مجھ مرحوم) ذاکروں کے تصرف سے اُس کے مطبوعہ مرثیے بھی بہت کم بچے ہیں۔ پھر بھی بعض مرثیے مطلع سے مقطع تک دست و گریباں ہیں۔ اور مصرع سے مصرع اور بند سے بند چسپاں ہے۔

سلاست یعنی عام فہم الفاظ

اور بات میں سے بات نکلتی چلی گئی ہے۔ اب رہی یہ **بحث کہ سلاست** کم ہے۔ اور عموماً عام فہم الفاظ نہیں ہیں۔ یہ بات بھی ذرا **غور** طلب ہے۔ اور مولوی **شبلی** صاحب کے جوابات میں مَیں اس کو مفصل لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا کہونگا۔ کہ **مرزا** صاحب نے جس زمانہ (قبل غدر ۱۸۵۷ء) میں وہ اکثر مرثیے کہے ہیں۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ میں عربی۔ فارسی کے **الفاظ** بہت بولے جاتے تھے۔ اور جب عام طور پر بولے جاتے تھے۔ تو وہ عام فہم بھی تھے۔ آج نہیں بولے جاتے۔ تو عام فہم بھی نہ رہے۔ پس سچ یہ ہے۔ کہ وہ الفاظ آج تو واقعی عام فہم نہیں ہیں۔ مگر اُس زمانے میں لکھنؤ میں عام فہم و سلیس تھے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہئے۔ کہ بلاغت کے لئے کلام کا مقتضائے حال کے موافق ہونا ضروری ہے۔ پس جس جس موقع پر مرزا صاحب امام حسینؑ یا اُن کے اہلبیتؑ یا اصحاب کی زبانی کوئی کلام لکھتے ہیں۔ وہاں وہی الفاظ لاتے ہیں۔ جو اہل علم کی زبانوں پر جاری ہیں۔ اور یہی شان بلاغت کی ہے۔ اُس موقع پر اگر عام لوگوں کے عام فہم الفاظ بولیں۔ تو وہ نظم پایۂ بلاغت سے گر جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ کچھ **کلام** مرزا مرحوم ضرور **دقیق** ہے ۱۲ **ثابت بے بضاعت**۔

مثل ہومر۔ ورجل۔ ڈینٹی۔ فردوسی۔ کالی داس۔ شکسپیر۔ حضرت انیس کے پہلو بہ پہلو کرسی نظم پر جلوہ افروز ہیں +

خاکسار داربن

حامد علی

از سمر لاج ڈومس۔ نزد سورت۔ ۲۰ ر اپریل ۱۹۱۲ء

باب شانزدہم۔ آفتاب میں بڑے بڑے داغ

فصل ۱، آفتاب میں داغ

اِس زمانے کی تحقیقات میں آفتاب میں بڑے بڑے داغ دُوربینوں سے نظر آئے ہیں۔ اور حال کے نجومیوں نے مان لیا ہے۔ کہ **آفتاب** میں دھبے ہیں۔ مولوی **شبلی** صاحب کو **شمس العلماء** کا روشن خطاب ملا۔ اس سبب سے وہ **آفتاب** ہُوئے۔ تو اُن میں بھی **داغوں** کا ہونا لازمی ہوگیا۔ پس پس جو جو **داغ** اُن میں یعنی اُن کی کتاب **موازنۂ انیس و دبیر** میں نظر آتے ہیں۔ مَیں نے اُن کو **سات قسم** پر منقسم کیا ہے۔ نمبروار الگ الگ ہر قسم کو بیان کرونگا:۔

(۱) ناواقفی یا نافہمی کا داغ

ناواقفی یا نافہمی کا داغ

ناظرین! مجھ کو یہ لکھتے ہُوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ دُوسری قوموں کا یہ حال و کمال ہے۔ کہ جب وہ ہمارے حالات وخیالات کو بیان کرتے ہیں۔ تو اکثر جزئیات تک نہایت صحیح بیان فرماتے ہیں۔ مَیں اگر اس موقع پر علماء و حکمائے یُورپ کا (تمثیلاً) بیان کروں۔ تو شاید آپ یہ فرمائینگے۔ کہ ابھی یُورپ کے علم و فضل کا مقابلہ ہندوستان نہیں کرسکتا۔ لہٰذا مَیں ایک شریف عالم بنگالی کا نام لیتا ہُوں۔ وہ کون؟ مسٹر (بابو) شیاما چرن سرکار دیکھئے؟ شرع محمدی کے کیسے کیسے باریک و مشکل مسائل پر

نوٹ لکھ کر پانی کر دیا ہے۔ کیسے کیسے ہمارے عقائد و رواج بیان فرماتے ہیں۔ خدا کی شان نظر آتی ہے۔ ہندو صاحبوں میں ایسے ایسے اہل علم بہت سے ہیں۔ مَیں نے تمثیلاً صرف ایک صاحب کا نام لیا ہے ٭ اب ہمارے مولوی **شبلی** صاحب کی معلومات کو ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) جن کے بزرگ نہ معلوم کے سو برس سے نسلاً بعد نسلٍ مسلمان چلے آتے ہیں۔ (۲) اور ایک بڑے دار العلم (ندوۃ العلما) کے ممبر ہیں۔ (۳) برسوں سے لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔ (۴) تمام رُوم و شام و حجاز وغیرہ (گویا) دیکھے ہُوئے۔ (۵) بڑی بڑی مشہور کتابوں کے مصنّف و مؤلّف۔ **باایں ہمہ اُن کی معلومات کی** یہ کیفیت ہے۔ کہ

(۱) موازنہ کے صفحہ ۲۲۷ میں (میر انیسؒ مرحوم پر اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہُوئے) فرماتے ہیں۔ کہ "اکثر جگہ (میر صاحب کے کلام میں) شائگاں قافیے ہیں۔ چنانچہ **نسّاخ** نے بہت سے اِس قسم کے شعر نقل کئے ہیں۔ مجیب {**مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم** جنہوں نے تمام اعتراضات (متعلقہ دبیر و انیس) کے نسّاخ کو معقول جواب دئے ہیں} نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ وہ یُوں نہیں۔ یُوں ہیں۔ مثلاً اِس بند میں

ناگاہ بڑھی فوج ہُوا جنگ کا ساماں اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ **شہ مرداں**
شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیروں کا باراں تلوار علم کر کے کھایا **شہ مرداں**

شہ مرداں مکرر آیا ہے۔ **مجیب صاحب** کہتے ہیں۔ کہ دُوسرے مصرع میں شہ مرداں کی بجائے **شہ ذی شاں** تھا۔ غلط نویسوں نے "ذیشاں" کا "شہ مرداں" بنا دیا۔ لیکن اِس قسم کی **تاویلات** پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اور اگر اِس کو **وسعت** دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوٰے کیا جا سکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا۔ اِس شعر میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے۔ کیونکہ

مبرنیں؟ وا ایلھا

شہ مرداں

شہ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں۔ اس لئے قافیہ مکرر نہیں"۔ یہاں مَیں نے مولوی صاحب کا ارشاد اُنہیں کے الفاظ میں لکھ دیا۔ ہر چند ذرا طول ہُوا۔ اب مَیں ادب سے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہُوں۔ کہ (غدر ہو جانے کے بعد جو آج کل ایران میں ہو رہا ہے) ایران کے ایک سرے سے چلئے۔ بلوچستان و پنجاب ہوتے ہُوئے تمام ممالک متحدہ و متوسط و بنگال و بمبئی و راجپوتانہ و مدراس وغیرہ کی سیر فرمائیے۔ شیعوں اور صوفیوں کے بچے بچے سے پُوچھئے۔ اگر ایک بچہ بھی کہہ دے۔ کہ شہ مرداں امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ تو مَیں مان لُونگا۔ کہ آپ نے درست فرمایا۔ افسوس ہزار افسوس ایسے مشہور لفظ کی تحقیق میں ایسی ٹھوکر کھائی۔ جنابِ امیرؑ۔ شاہِ مرداںؑ۔ شیرِ خداؑ۔ شاہِ نجفؑ۔ یہ تو ایسے مشہور القاب ہیں۔ کہ بجز امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السّلام کے کسی دُوسرے امام یا بزرگ کو کہتے ہی نہیں۔ کسی ایرانی کا مشہور شعر ہے۔ ؎

شاہِ مرداںؑ۔ شیرِ یزداںؑ۔ قوّتِ پروردگار لا فتیٰ اِلّا علیؑ لا سیف اِلّا ذو الفقار

ناظرین! جو بزرگوار شاہِ مرداں کے مفہوم کو نہ سمجھیں۔ وہ زبان اُردو بھلا کیا جانیں۔ اور دبیرؒ و انیسؒ کے کلام میں کیونکر انصاف فرما سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی افسوس ہے۔ کہ ایسے کامل میر انیسؒ مرحوم کی شان میں اسی موازنہ میں صفحہ ۲۲۸ پر بحث ایطا میں فرماتے ہیں۔ کہ "جہاں واقعی قافیہ تنگ ہے۔ وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں۔ جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں۔ اور جن کو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے"۔ اس عبارت اور نیز عبارت مندرجہ بالا کا یہ صاف مفہوم ہے۔ کہ میر صاحب بے دھڑک ایطا قافیہ لاتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ ایطا اور جناب میر انیس مرحوم۔ واللہ اُن کے ادنےٰ شاگردوں کے شاگرد بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ لاکھ کثیر الکلام شاعر ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ کہ شاگ

شہ مرداں کوئی شیعہ یا صوفی امام حسینؑ کو نہیں کہتا

نسبت ایطا بجناب انیس صحیح نہیں

قافیہ بے دھڑک لے آئے۔ حضرت یہ بڑا عیب ہے۔ اور کمال عجز شاعر کا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ روزمرہ ہے۔ کہ اُس شخص کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ یعنی عاجز ہوگیا۔ اور یہ محاورہ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں اسی موقع پر آتا ہے۔ جناب مفتی میر عباس صاحب طاب ثراہ کی مشہور و مطبوع مثنوی خطاب فاصل کا ایک مصرع یاد آگیا (جو مولوی امام بخش صاحب صہبائی کی مثنوی دمغ الباطل کے جواب میں ہے)۔ ع چہ کند قافیہ بر او شد تنگ۔ اور یہ کیا فرمایا۔ کہ ایسی تاویلات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جہاں اعتراض ہو۔ آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا۔ جب کہ یہ ظاہر ہے۔ کہ مطبعوں میں عموماً کتابیں غلط چھپتی ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن شریف جو مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اُس میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ صحّت کے برابر انتظام والتزام کئے جاتے ہیں۔ تو دبیرؒ و انیسؒ کے یا اور کسی شاعر یا مصنّف کے کلام کا غلط چھپنا کیوں نہیں مانا جائیگا۔ اس کو تاویل نہیں کہہ سکتے۔ یہ حقیقت حال ہے۔ دیکھئے مرزا دبیر مرحوم کے جو چند مرثئے دو جلدوں میں منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں چھپے ہیں۔ اور بار بار چھپتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک ایسا مرثیہ لے لیجے۔ جو دفتر ماتم میں بھی چھپا ہے۔ اور دونوں کو ملائیے۔ تو (دونوں میں) زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ ہزاروں لفظ بدلے ہُوئے ملینگے۔ بیسیوں بندوں کی کمی بیشی پائیگا۔ پھر کیا کوئی بے درد یہ کہدیگا۔ کہ دبیر کے معتقدوں نے دفتر ماتم میں وہ الفاظ بدل دئے۔ وہ بند بڑھا دئے ہیں۔ حالانکہ دفتر ماتم کی جلدوں میں بھی غلطی چھاپہ کی ہے۔ مگر اتنی نہیں ہے +

مطبعوں کی غلطیاں

مراثی دبیر مطبوعہ مطبع اودھ اخبار و دفتر ماتم

بہرحال جب ان دبیر و انیس کے مرثیوں کا غلط چھپنا پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے۔ تو جو لفظ صحیح قلمی مرثیوں میں ہے۔ اور واقف راز بتائیں۔ تو اُس کو ماننا پڑیگا۔ اس موقع پر واقعی میر صاحب نے ایک جگہ شہ ذی شاں اور دُوسری جگہ شہ مرداں فرمایا ہے۔ اور مجیب اوّل نے صحیح جواب دیا ہے۔ مولوی شبلی صاحب کا خیال (کہ ایک جگہ شہ مرداں سے

امام حسینؑ مراد ہیں) بے حقیقت و غلط ہے۔ اور یہ غلطی مولوی صاحب موصوف کی پہلی غلطی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اِس سے پہلے المامون میں جناب امام رضاؑ کو امام ہفتم لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ شیعہ و صوفی تو درکنار وہ تمام سُنّی مسلمان بھی جو تھوڑا بہت معلومات کا چسکہ رکھتے ہیں۔ امام رضاءؑ کو امام ہشتم جانتے ہیں۔ اور اِن جناب کا لقب امام ضامن و ثامن[1] مشہور ہے۔ یہ فاش غلطی (آخرالذکر) وقت پر مرزا عابد علی بیگ صاحب قزلباش مرحوم نے گرفت فرما کر اپنے ریویو میں درج فرمادی ہے۔ جو میرے پاس مطبوعہ اُنہیں کا عطیہ خاص موجود ہے +

المامون اور امام رضاؑ کو امام ہفتم لکھنا

(۲) موازنہ کے صفحہ ۳۰ پر بذیل اعتراضات میر انیس مرحوم مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں "؎ واللہ اُس سے زور عیاں لاتعُدّ ہُوا + قتل اُس کے ہاتھ سے پسر عبد وُدّ ہُوا + عبد وَدّ۔ لاتعُدّ کا قافیہ نہیں ہوسکتا" مَیں کہتا ہُوں۔ کیوں نہیں ہوسکتا! مولوی شبلی صاحب شاید یہ سمجھے ہُوئے ہیں۔ کہ عبد وُدّ ہی صحیح ہے۔ واؤ کو پیش ہے۔ اور لاتعُدّ میں حرف آخر کے ماقبل (عین) کو زبر ہے۔ یہ خیال مولوی صاحب کا غلط ہے۔ لُغۃً تو وُدّ بالضم اور وَدّ بالفتح دونوں صحیح ہیں۔ وَدّ ایک بُت کا نام ہے۔ جیساکہ جوہری نے لکھا ہے۔ مگر اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ جب دونوں طرح صحیح ہے۔ تو فصیح کون ہے۔ اس کے واسطے وہ کتاب فیصلہ کریگی جس کو کتاب اللہ کہتے ہیں۔ واضح ہو۔ کہ قرآن شریف کے ۲۹ ویں پارے سورۂ نوح میں قریب نصف یہ آیت موجود ہے۔ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا پس وَدّ کو بالفتح نظم کرنا شاعر کے کمال معلومات کی اور معترض کا اعتراض کرنا کمال ناواقفی کی دلیل ہے[2]۔

اعتراض نمبر ۲

جواب لاتعدو دو قافیہ صحیح ہے

سند از قرآن

[1] ثامن کے معنی آٹھویں کے ہیں۔ یہ آٹھویں امام ہیں۔ اس لئے امام ضامن و ثامن مشہور ہیں +

[2] میر کرم فرما یادگار حضرت انیسؒ جناب نفیس مرحوم میر علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ و ابقاہ نے اس موقع کو سُنکر فرمایا۔ کہ یہ بیت میر انیس مغفور کی نہیں بلکہ الحاقی ہے۔ اس لئے مَیں نے لکھ دیا ہے کہ شاعر کے کمال معلومات کی دلیل ہے جس کسی نے یہ بیت کہی وہ واقف تھا اور معترض ناواقف ہیں +

اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کا اس پر معترض ہونا اُن کے دامن علم وتحقیق پر ایک ایسا بدنما دھبّہ ہے۔ جو اُن کے یا اُن کے کسی معتقد کے مٹائے نہیں مٹ سکتا +

مولوی شبلی صاحب کا قول

(۳) موازنہ کے صفحہ ۱۸ پر مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ (۱) اگر یہ پتہ لگ سکتا۔ کہ دبیر و انیس میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا۔ اور خاص خاص مرثیے اور خاص خاص بند جو دونوں کے یہاں قریب المعنی ہیں۔ اوّل کس نے کہے۔ توشاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس کہ مجھ کو باوجود بہت جدّوجہد کے اس بارے میں کچھ کامیابی نہیں ہُوئی۔ (۲) پھر آگے بڑھ کر لکھتے ہیں۔ کہ زمانے کی تقدیم وتاخیر نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا۔ کہ ایجاد کا فخر کس کو حاصل ہے۔ اور کس نے کس سے اثر لیا ہے۔ (۳) میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں۔ کہ اُن کے حریف اُن کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً سہ لگا رہا ہُوں مضامین نو کے پھر انبار + خبر کرو مری خرمن کے خوشہ چینوں کو۔ سہ لو اسنجیوں نے تری اے انیس + ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا۔ سہ ملتی نہیں ذردان معانی سے نجات + سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے + ان چوٹوں کو سُن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے۔ یعنی یہ نہیں کہتے۔ کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔ بلکہ صرف تبرّے کرتے ہیں۔ کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں سہ شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہُوں + ہر مرثیہ میں مُوجد طرز جدید ہُوں۔ سہ ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے + یعنی بری ہُوں سرقۂ مضمونِ غیر سے + اس سے (۴) اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ میر انیس مرزا دبیر صاحب کے مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ورنہ مرزا صاحب ضرور اس کا اشارہ کرتے۔ (۵) اس کے ساتھ جب بعض

دبیر برابر کا جواب نہیں دیتے

مرثیوں سے صاف ثابت ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے ہیں۔ تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ مقابلہ و ہم طرحی و مسابقت کی کوشش مرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میر انیس نے اسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎ بھلا ترددّ بے جا سے اُس میں کیا حاصل + اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو۔ اور پھر صفحہ ۲۶۶ پر مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر نے میر انیس پر کہیں سرقہ کی تعریض نہیں کی ہے

جواب

اب میں کہتا ہوں۔ کہ جناب مولوی صاحب آپ جدّ و جہد کے ساتھ اگر لکھنؤ وغیرہ میں بڈھے بڈھے ذی علم آدمیوں سے دریافت فرماتے۔ تو ضرور آپ کو معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا صاحب کو میر صاحب سے بہت عرصہ پہلے لکھنؤ میں شہرت ہو چکی تھی۔ اور وہ اُستاد مان لئے گئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا صاحب کے مقابلے پر بڑے بڑے کامل شاعر برسوں کوشش کرتے رہے۔ مگر ملک نے اُن کو مرزا صاحب کا مدّمقابل نہیں مانا۔ جیسے جناب امانت مرحوم۔ جناب عشق مغفور۔ اختر[1] مرحوم۔ جناب منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر مبرور۔ شہرت مرحوم[2]۔ یہ سب شاعر بجز شہرت مرحوم کے جن کا حال مجھے معلوم نہیں ہے اپنی اپنی طرز میں کامل تھے۔ معلومات بھی سب کی اعلےٰ درجہ کی تھی۔ زمانہ بھی موافق تھا۔ مگر دبیرؔ کے مقابلے پر مرثیہ گو نہیں مانے گئے۔ میر انیسؔ صاحب کا یہ بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے مقابلہ فرمایا۔ اور کامیاب ہوئے۔ ملک نے مان لیا۔ کہ دبیرؔ و انیسؔ آسمان مرثیت کے دو آفتاب ہیں + مرزا صاحب کو

تنقید میر شہرت و دبیر

---

[1] آغا محمد تقی خاں مرحوم مرزا صاحب کے ایک شاگرد تھے بعد کو انہوں نے برسر منبر کہا تھا۔ کہ میں مرزا صاحب کا شاگرد نہیں ہوں انہیں کا یہ بے نقط مرثیہ ہے ؎ ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہُوا +

[2] شہرت میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد تھے جنہوں نے برسوں کوشش کی کہ مجھے ملک مرزا دبیر کا ہمسر مان لے۔ میر ضمیر صاحب نے بھی ان کیلئے کوشش کی مگر ناکام رہے۔ کہ آج جیسے نام بھی شہرت مرحوم کا کوئی نہیں جانتا۔ شہرت ہونا تو درکنار رہا

عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر میں شہرت ہو جانے اور میر صاحب کے مشہور نہ ہونے کی بڑی دلیل فسانہ عجائب کی وہ عبارت ہے۔ جو میں (اپنی) اس کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھ چکا ہوں۔ اور یہاں پھر لکھونگا۔ کہ ناظرین کو ورق گردانی کی تکلیف نہ ہو۔ (کیونکہ فسانہ عجائب غازی الدین حیدر کے عہد میں شروع اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تمام ہوا)۔ وہ عبارت یہ ہے "مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع۔ بصورت گدا۔ بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ اور سلام کا دیوان کثیر فرمایا"۔ دیکھئے۔ اس عبارت میں گویا میر خلیق صاحب کا نام نامی اور مرزا دبیر کا اسم سامی ہے۔ مگر میر انیس صاحب کا تخلص نہیں ہے۔ اور ہوتا کہاں سے۔ وہ تو بقول مشہور جس کو مصنف واقعات انیس نے بھی لکھا ہے۔ اُس وقت فیض آباد میں تھے۔ اور فسانۂ عجائب کی تصنیف کے زمانے کے قریباً ۳ یا ۵ ۲ سال بعد عہد سلطنت امجد علی شاہ مرحوم میں (جو ۱۲۵۸ھ ہجری سے شروع ہوتا ہے) لکھنؤ آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے ہیں۔ صاحب واقعات انیس لکھتے ہیں۔ کہ خود میر انیس مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اُس وقت دو صاحب اِس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے۔ دُوسرے مرزا سلامت علی دبیر (مرحوم)۔ میر مداری صاحب اگر وہی بزرگ ہیں۔ جن کا شہرت تخلص تھا۔ جب تو اُن کا حال اِس کتاب میں آچکا ہے۔ ورنہ آج لکھنؤ میں کوئی نہیں بتاتا۔ کہ ان کا کیا تخلص تھا۔ عہد امجد علی شاہ مرحوم میں میر صاحب لکھنؤ میں آئے۔ اور مرثئے کہے۔ اور پڑھے۔ اُس کے بعد شہرت ہوئی۔ اور عہد مذکور میں مرزا صاحب کو

فسانۂ عجائب

عہد امجد علی شاہ میں ... میر مداری صاحب ... شہرت تخلص ...

شاگرد دبیر

اس قدر شہرت ہو چکی تھی۔ کہ اُن کے شاگردوں تک کے شاگرد اُس زمانہ کے تذکرہ سراپا سخن
میں نظر آتے ہیں* چنانچہ شاہزادہ دہلی خورشید قدر کو مصنف نے صفحہ ۲۴ پر لکھا ہے
"شاہزادہ خورشید قدر قیصر تخلص بن آسمان قدر ابن محمد خرّم بخت ابن مرزا جہاندار شاہ
کو شورہ سخن گوہر علی مشیر مرثیہ گو سے اتفاقاً ہوتا ہے۔ کہ بسبب سیر و تصنیف کتاب
تاریخ فکرِ شعر کمتر کرتے ہیں" اور مشیر مرحوم ایسے مشہور مرثیہ گو دبیر سے گو شاگرد مرزا صاحب
ہیں۔ جو آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ الحاصل جب یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ
مرزا صاحب کو میر صاحب سے پچیس تیس برس پہلے اس قدر شہرت ہو چکی تھی۔ تو مولوی
شبلی صاحب کا (جو بڑے محقق و مؤرخ سمجھے جاتے ہیں) یہ لکھنا کہ اُن کو باوجود بہت
سی جدّ و جہد کے پتہ نہ لگا۔ کہ دبیر و انیس میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم
رکھا۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ مولوی صاحب اگر پتہ لگاتے۔ تو اُن کو ضرور
معلوم ہو جاتا۔ اور خاص کر مرزا صاحب کے باب میں تو دو کتابیں شمس الضحے و تنقید
آبِ حیات بھی اب سے تیس چالیس برس پہلے کی چھپی ہوئی جا بجا ملتی ہیں۔ وہ دیکھ سکتے
تھے۔ مگر انہوں نے تو پہلے ہی سے مرزا صاحب کے گھٹانے پر کمر ہمت چست باندھ
لی تھی (جیسا کہ اُن کی اور میری کتاب پڑھنے سے منصف مزاج آدمی کو معلوم ہوگا)۔
پھر وہ ایسی کتابوں کو کیوں دیکھتے۔ اور جب مرزا صاحب کی شہرت مقدّم قابل یقین
ثابت ہو چکی۔ تو ہر شخص منصف مزاج یہی فیصلہ کریگا۔ کہ مقابلہ کی کوشش میر صاحب
کی طرف سے ہوئی۔ کیونکہ مشہور شخص کے مقابلہ کی ہر شخص فطرۃً کوشش کرتا ہے۔
غیر مشہور کے مقابلہ کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اب یہ بھی سن لیجئے۔ کہ میرا کام محض
مولوی صاحب کی غلطیوں کا دکھانا نہیں ہے۔ بلکہ امر واقعی جو مجھے معلوم ہوا ہے۔

اوّل مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی

* سراپا سخن عہد امجد علی شاہ میں شروع ہوا۔ عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ختم و مکمل ہوا۔ اس تذکرہ میں جناب میر انیس مرحوم کا ذکر خیر نہیں ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر

اس کا چھپانا میں شانِ سخن وری کے خلاف اور گناہِ اصلاحی سمجھتا ہوں۔ مجھے معتمد اور معتبر لکھنؤ کے بزرگوں سے یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ اوّل اوّل میر صاحب نے مرزا صاحب کے مشہور مشہور مرثیوں کے جواب کہے[1]۔ پھر مرزا صاحب نے (جبکہ میر صاحب کی شہرت عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ہوگئی۔ تو) میر صاحب کے بعض مرثیوں کے جواب لکھے۔ جن میں سے شاید دو تین مرثیے نکلے ہیں۔ باقی ایسے مرثیے حسب وصیت جناب مرحوم اُستاذی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ کے پاس محفوظ ہیں *

اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مرزا صاحب کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا یہ ارشاد (کہ وہ مرثیے تبرّے کرتے ہیں) بھی غلط ہے[2]۔ مرزا صاحب صرف دشمنانِ اہل بیت پر تبرّے کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) کسی مدّاح اہل بیت یا اُس کے کلام پر وہ تبرّا نہیں کرتے[3]۔ ہاں ڈنکے کی چوٹ یہ ضرور کہتے ہیں۔ کہ میں موجد ہوں۔ میرے مضامین دُوسرے شعرا لیتے

---

[1] چنانچہ بعض مرثیوں کے مطلع بھی ملتے جلتے ہیں مثلاً مرثیہ دبیر۔ جب قیدیوں کو راہ میں ماہ صفر ہوا۔ (انیس) جب قیدیوں کو خانہ زنداں میں شب ہوئی۔ (دبیر) جب بے نشان شہ کی مولا کی جماعت رن میں۔ (انیس) جبکہ خاموش ہوئی شمع امامت رن میں۔ (دبیر) زنجیر جہنم سے جب آزاد ہوا۔ (انیس) دوزخ سے جب آزاد کیا حر کو خدا نے۔ سنا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ مرثیہ۔ دست خدا کا قوت بازو حسین ہے بہت مشہور و مقبول تھا جب میر انیس صاحب لکھنؤ میں آئے یہ حال داخل کربلا ہوا موسیٰ نے یہ مرثیہ فرمایا۔ جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا ۱۲ مؤلف۔

[2] یہاں تبرّا کے لفظ پر حضرت ذوق دہلوی کی ایک اصلاح یاد آئی جو لکھنؤ میں مخدومی پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے کی زبانی (حکایت) سُنی تھی۔ وہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک عزادار نے عشرہ محرم میں سبیل رکھی اُس پر مصرع لکھا تھا۔ تبرّا کر اسے پی لو یہ نذر حضرت ہے۔ اتفاقاً جناب ذوق بھی اُدھر سے گذرے۔ وہ صاحب جناب ذوق کے بھی ملنے والے تھے۔ ان سے کہا دیکھئے۔ یہ مصرع میں نے کہا ہے۔ کچھ عیب ہو تو فرما دیجیے گا جناب ذوق نے کہا عیب تو کچھ بھی نہیں مگر میری رائے مانو تو یوں مصرع لکھدو۔ تبرّک کا ہے پی لو یہ نذر حضرت ہے۔ پھر خود ہی یہ بھی کہا کہ تم یہ سمجھنا کہ ذوق سُنّی ہے لفظ تبرّا سے بُرا مانا ہوا ہے نہیں بات نہیں ہے۔ یہ نذر و نیاز کی چیز ہے۔ یہاں تبرّک کا ہی لفظ ہونا چاہئے سبحان اللہ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ خوب اصلاح دی ہے ۱۲ مؤلف حقیر

[3] مولوی شبلی صاحب نے تبرّا کو بجائے برأت استعمال فرمایا۔ گو لغتہً یہ صحیح ہو۔ مگر اردو کی زبان پر تبرّے ایک خاص معنی پر بولا جاتا ہے یعنی کسی شخص سے بیزار ہونا اور عام لوگوں نے تو اس کے مفہوم کو اور بھی سخت کر دیا ہے جس کی تشریح کا یہ محل و موقع نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے لفظ تبرّا بے محل استعمال

ہیں۔ افسوس مولوی شبلی صاحب کو دفتر ماتم کی مطبوعہ تینوں جلدوں میں بھی ایسے اشعار نہ ملے۔ صرف وہی شعر ملے۔ اُن میں سے بھی شعر ثانی غلط لکھ دیا۔ صحیح مجھ سے سُنئے۔ اور یوں ہیں (صحیح) چھپا بھی ہے۔

ہے مجھ کو استفادہ حدیثوں کی سیر سے ✦ واللہ ننگ و عار ہے مضمونِ غیر سے

احادیث وسیر کے کیا معنی (کیونکہ سیرت کی جمع سِیَر بکسر اوّل وفتح ثانی ہے۔ بفتح اوّل و سکون ثانی نہیں ہے۔ جو غیر کا قافیہ ہو سکے۔ اب ایسے اشعار سُنئے۔ جن میں اُنھوں نے صاف صاف دعوے فرمایا ہے۔ کہ میرے کلام سے دُوسرے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور دُوسروں کا بازار سرد ہے۔ اور مَیں مُوجد اور دُوسرے خوشہ چیں ومقلّد ہیں:۔

(۱) مضمون نئے کرتا ہُوں ایجاد ہمیشہ ✦ کہتا ہے سخن حضرت اُستاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیرِ خداداد ہمیشہ ✦ بھولے سے بتادوں تو رہے یاد ہمیشہ
بے لُطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں* آتی ✦ پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

(۲) اور لیجئے:۔

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ ومعانی ✦ ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی ✦ ہے زورِ سخن شور پہ موجوں کی زبانی
قطرے سے مگر بحث میں مَیں صرف نہیں ہُوں ✦ دریا ہُوں سخن کا مَیں تنگ ظرف نہیں ہُوں

پہلے مصرع میں صاف صاف دعوے کرتے ہیں۔ کہ میرے الفاظ اور میرے مضمون وقف ہیں۔ جن کو سب لیتے ہیں۔ جو شاعر کے الفاظ ومضامین لیگا۔ وہ سرقہ نہیں کریگا

* تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے صفحہ ۲۳۲ پر موازنہ میں خود یہ بند لکھا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے۔ اور کس طرح برابر کا جواب دیتے صاف تو کہ رہے ہیں ع کہتا ہے سخن حضرت اُستاد ہمیشہ۔ جب سخن کے اُستاد ہوئے تو اہلِ سخن کے بھی اُستاد ہوئے۔ مولوی صاحب نے اعتراض یہ فرمایا ہے کہ جو چیز خداداد ہے۔ اُس کے لئے ہمیشہ کی قید حشو محض ہے۔ مَیں کہتا ہُوں کہ مرزا صاحب کا مطلب ہے۔ کہ تاثیر خداداد میرے کلام سے کبھی الگ نہیں ہوتی۔ اب مولوی صاحب خیال فرمائیں کہ اُن کا اعتراض حشو محض ہے یا نہیں ✦ ۱۲ مؤلف حقیر۔

صاف دعوے ایجاد و تعریض سرقہ

شرح کلام مرزا صاحب

تو اور کون سارق ہوگا - پھر اُس کے ساتھ تشبیہ و تمثیل کی شان شرافت کا پہلو لئے ہوئے دیکھئے کہ میٹھے پانی کو (دریا کے) سب ہی پیتے ہیں - مطلب یہ ہے - کہ دُوسرے مجھ سے مضامین والفاظ لینے پر مجبور ہیں - اُن کا وہاں تک ذہن ہی نہیں پہنچتا - پھر وہ میرے کلام سے سرقہ نہ کریں - تو کیا کریں - تیسرے مصرع میں کہتے ہیں - کہ عروض وغیرہ باقاعدہ پڑھا ہُوا ہُوں - اس لئے ہر بحر میں نظم کرتا ہُوں - اُن شاعروں کی طرح نہیں ہُوں - جو چند مشہور بحروں کے سوا اور بحروں میں کہنے سے (ناواقفیت عروض کے سبب سے) مجبور ہیں - کہ ٹھوکریں کھاتے ہیں - (بعض حروف) عین یا ہ وغیرہ گر جاتے ہیں - اور اُن کو خبر نہیں ہوتی - مصرع تقطیع سے باہر ہو جاتا ہے - وہ آگاہ نہیں ہوتے - افسوس یہ ہے - کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ بند بھی موازنہ میں لکھا ہے + مگر مطلب شائد نہیں سمجھے ہیں - جو (چوتھے مصرع کی نسبت) فرماتے ہیں - کہ مقصد یہ ہے - کہ زور سخن شور پر ہے - لیکن اس بات کو مَیں نہیں کہتا - بلکہ موج کی زبان کہتی ہے - یہ قطرۂ ناچیز عرض کرتا ہے - کہ زور سخن موجوں کی زبانی شور پر ہونے سے مرزا صاحب کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے - کہ موجیں - یعنی مصرع خود پکارتے ہیں - کہ ہم حیثیت و زور دار ہیں - مضمون زبان حال سے آواز دے رہے ہیں - کہ ہم نئے ہیں - الفاظ اپنی شان دکھا رہے ہیں - کہ ہم کو اب تک کسی اور شاعر اردو نے نہیں باندھا -

چنانچہ وہ اسی مضمون کو دُوسرے مرثیہ مابعد میں بھی فرماتے ہیں - ؎

اب فخر کے بیان سے چپ ہو گئے ہیں ہم ۔۔۔ مصرع پکارتے ہیں کہ سُن لو نئے ہیں ہم*

مولوی صاحب کا یہ بھی ارشاد و ایراد ہے - کہ بحث میں صرف ہونا کون سا محاورہ ہے - مَیں کہتا ہُوں - یہ ہم لکھنؤ والوں کا محاورہ ہے - اعظم گڈھ کا اگر محاورہ نہ ہو - تو ہمیں کیا - اور ہو تو ہمیں کیا - (بقول میر مرحوم) ؎

* ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں - جتنے ہمہ داں ہیں وہ میرے مرتبہ داں ہیں - یہ نظم وہ دیکھیں جو فصیحان جہاں ہیں مصرع نہیں - نہیں یہ فصاحت کی رواں ہیں - یہیں موجوں سے مراد مصرعوں سے ہے ۱۲ مؤلف حقیر -

گفتگو ہم سے ریختہ میں نہ کر   یہ ہماری زبان ہے شبلی

صرف ہونا بجائے مصروف ہونے کے پہلے بھی بولتے تھے۔ اور آج بھی بولتے ہیں جس طرح "رنگ فق سے ہوگیا" اور "رنگ فق ہوگیا" دونوں طرح بولتے تھے۔ اور لسّان خ نے جناب میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض جڑ دیا ع رنگ رخ کفار رعب ہوگیا فق سے۔ اور مولوی شبلی صاحب نے بھی انہیں کے حوالہ سے لکھ دیا۔ کہ محاورہ نہیں۔ حالانکہ لسّان خ نے اُس کو محاورہ عوام بتایا ہے۔ پس مولوی صاحب نے یہ دوسری ٹھوکر کھائی۔ اور اس کے ساتھ ہی صرف ہونے کو بھی محاورہ نہ ہونا وہ سمجھے۔ حالانکہ لسّان خ نے بھی ایسا ہی اعتراض کیا تھا۔ جناب مجو مرحوم نے اُن کو جواب دے دیا تھا۔ کہ محاورہ ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کے پندرہ [15] روپے ہمارے پاس سے صرف ہوگئے۔ پس جس طرح یہاں "صرف ہوگئے" "مصروف ہوگئے" کی جگہ پر بولتے ہیں۔ اُسی طرح "صرف ہوگئے" "کسی کام میں مصروف ہونیکے" معنی پر بھی بولتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب کے ماننے والے خصوصاً نئے تعلیم یافتہ اُس وقت تک شاید نہ مانینگے۔ جب تک میں یہ محاورہ کسی اور شاعر کے کلام میں نہ دکھاؤں ہرچند دبیرؔ کے کلام سے اور شعرا سند لیتے ہیں۔ پھر دبیرؔ کے واسطے دوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ مگر خیر نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ ہم دوسرے مستند شاعر کا شعر بھی سن لیجئے۔ اور وہ دوسرا شاعر بھی مرزا صاحب کے پہلے کا نہیں (جس کو سُن کر آپ یہ کہدیں۔ کہ مرزا صاحب کے پہلے محاورہ ہوگا۔ مرزا صاحب کے وقت میں ترک ہوگیا تھا) بلکہ مرزا صاحب کا معاصر و مستند شاعر لیجئے۔ جس کو تمام ملک مستند مانتا ہے۔ وہ کون؟ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیرؔ مرحوم۔ وہ اپنی مستند و معتبر مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں۔

صرف ہونا محاورہ ہے۔ اس کی سند

✱ میر صاحب کا اصل مصرع یہ ہے "یہ ہماری زبان ہے پیارے"۔ مگر مولوی صاحب شاید عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ انکا تخلص نام لکھ دیا۔ اور اُن کی بزرگی کا خیال رکھا۔ پیارے کا لفظ نہیں لکھا ۱۲ مولف حقیر۔

مگر تھے صرف فیضان و عنایت کیا کرتے تھے عالم کی ہدایت

کیوں مولوی صاحب سچ فرمائیگا۔ کیسی ہندی کی چندی میں نے سمجھائی ہے +

(۳) اور لیجئے :۔

خلاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن کُھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

اس سے بڑھ کر کوئی تعریف ہو سکتی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ کہ میں نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہوں ۔ اُنہیں کو میرے معاصر و مد مقابل شعرا اڑا لیتے ہیں ۔ میں شعر کہنا چھوڑ دوں ۔ تو اُن کی قلعی کھل جائے ۔ اُن کے کلام میں پھر ایک بھی مضمون نظر نہ آئے ۔ فرمائیے ۔ یہ سرقہ کی تعریض صاف صاف ہے یا نہیں ۔ اگر اب بھی آپ کی تسکین نہیں ہوئی ۔ تو

(۴) یہ اور سہی

بڑھتا ہوں صف نظم میں ہٹنا نہیں آتا سب آتا ہے مضمون اُلٹنا نہیں آتا

اس کا یہی مطلب ہے یا اور کچھ ۔ کہ میرے معاصر میرا مضمون اُلٹ لیتے ہیں اپنی سرقہ کرتے ہیں ۔ اور مال مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر (ذرا تغیر و تبدل کر کے) لوگوں کے سامنے (بازار سخن میں) لاتے ہیں ۔ میرا یہ شیوہ نہیں ہے ۔ کیونکہ میری طبیعت خلاق عالم نے ایسی نہیں بنائی ہے ۔ میں خود مضمون پیدا کرتا ہوں +

اگر اب بھی آپ کو کچھ کلام ہے ۔ کہ مرزا برابر کا جواب نہیں دیتے ۔ تو اور بھی سُن لیجئے :۔

(۵) منصف ہو تو دعوے نہ کرے لاف زنی کا سگ ہے مرے نام پہ شیریں سخنی کا

یہ صاف صاف ادعائے شاعرانہ ہے ۔ کہ میرے سامنے دوسرا شاعر شیریں سخنی کا دم نہیں مار سکتا +

اس کے ساتھ یہ دعوے اور بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

(۶) کس طرز کو رونق ہو اس انداز کے آگے جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

شاعر اپنے کلام کو اعجاز اور دُوسرے کے کلام کو افسون و جادو بتا رہا ہے +

اور بھی کھلم کھلا چوٹ دیکھئے۔ ڈنکہ کی چوٹ کہتے ہیں:۔

(۷) سرقہ ہے کہ تالیف ہے مضمون کہن کے — یہ سبب ہے زکوٰۃ اپنے زر نقد سخن کی

کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ میرے مضامین جو معاصرین چُراتے ہیں۔ وہ گویا میری خیرات کھاتے ہیں +

اب بھی اگر جناب کی تسکین نہیں ہُوئی ہے۔ تو اور سُنئے:۔

(۸) جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں — اُن مرثیوں گویوں کو سلام اپنا ہے

اس سے بڑھ کر کون سا دعوےٰ ہو سکتا ہے (کہ صاف صاف کہہ رہے ہیں) کہ ہمارے معاصرین بند کے بند ہمارے اُڑا لیتے ہیں۔ ہم بجائے اس کے کہ سرقہ کا استغاثہ کریں ان کو سلام الزامی کر لیتے ہیں +

سب سے بڑھ کر صاف صاف یہ فرماتے ہیں:۔

(۹) دُزدانِ مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید — تُو مجتہدِ نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

کہتے ہیں۔ کہ مَیں مجتہد ہُوں۔ اجتہاد و کوشش و دماغ سوزی سے بات میں سے بات نکالتا ہُوں۔ معاصرین میری تقلید کرتے ہیں۔ وہ مضمون چُراتے ہیں۔ تو (اے نفس) چُرانے دے۔ منع نہ کر۔ کہ مقلّد کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کہ اُس میں مادّہ اجتہاد ہی نہیں ہے۔ اب تقلید نہ کرے۔ تو اُس کا کام کیونکر چلے +

یہ نو نمبر مَیں نے لکھ دئے ہیں۔ کہ ۹ کے عدد میں ایک خاص صفت یکرنگی کی ہے۔ کہ ہر عدد سے ضرب کھا کر حاصل ضرب میں سے گویا نو ہی حاصل ہوتے ہیں۔ ورنہ مرزا مرحوم نے ایسی شاعرانہ چوٹیں بہت کی ہیں۔ اور سُنئے۔ انہوں نے اپنے منکران کمال کی بھی جا بجا خبر لی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے — انصاف تو کہتا ہے خداوند یو میں ہے

کھلم کھلا چوٹ

اور سُنئے

صاف صاف توبیض

منکروں کی بھی جابجا خبر لی

اور یہ بھی کہا ہے۔

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے
میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے

ایک لطیفہ جو میں نے ایک صاحب سے سُنا تھا یاد آگیا۔ میر و مرزا کے زمانے میں کچھ اور بھی مرثیہ گو شاعر ایسے تھے۔ کہ ان کے مقابلہ میں مرثئے کہتے تھے اور چوٹیں کرتے تھے۔ اور میر و مرزا کی چوٹوں کی شان نزول اپنی ذات ستودہ صفات کو سمجھتے تھے سُنا ہے۔ کہ اُنھیں بزرگواروں میں سے ایک صاحب میر محب علی صاحب مرحوم سلیس تخلص اکبرآباد میں مدرّس تھے۔ جو علم کے ساتھ زبان و طبیعت بھی سلیس و سلیم رکھتے تھے*۔ اُن کو یہ خیال تھا۔ کہ میر انیس کا میں مدمقابل ہوں۔ جب یہ سلام اُن تک پہنچا۔ تو یہ مقطع پڑھ کر "نوا سنجیوں نے تری الخ" خیال کیا۔ کہ میں اکثر چوٹیں کرتا رہتا ہوں۔ میر صاحب نے یہ چوٹ مجھی پر کی ہے۔ فوراً وہ سلام میر صاحب کا (جس کا مقطع یہ ہے ؎ نوا سنجیوں نے تری اے انیس۔ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا) تضمین کر کے ڈاک میں میر صاحب کے پاس لکھ کر بھیج دیا۔ مقطع پر یُوں مصرع لگائے تھے۔

نہ مونسؒ کی باتیں تھیں ایسی نفیسؒ
نہ تھی اُنسؒ کی نظم اتنی سلیس
یہ سچ ہے بقول انیسؒ اے سلیسؒ
نوا سنجیوں نے تری اے انیسؒ

ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

جب میر صاحب کو یہ خمسہ پہنچا۔ ایک نظر دیکھ کر چپ ہو گئے۔ وہ کوہ حلم و وقار ایسی ایسی باتوں کی کب پروا کرتے تھے۔

لطیفہ میر محب علی سلیس مرحوم

---

* ان سلیس مرحوم کا میں نے ایک مطبوعہ مرثیہ دیکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ زندہ ہیں ابد تک شہدا راہ خدا کے۔ جس میں اُس معجزہ مشہور کو نظم کیا ہے جو اُن کے زمانے میں ہوا تھا۔ کہ ایک آدمی افسر حالت نجاست میں شراب پی کر روضۂ امام حسینؑ میں جاتا تھا۔ کہ ایک طمانچہ لگا منہ سیاہ ہو گیا۔ اُن کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا کہتے تھے۔ مگر دبیر و انیس کی بات اُنکے دم کے ساتھ تھی۔ مولوی مرزا خادم حسین صاحب شمیم انیس کے شاگرد آگرہ میں سمجھے جاتے ہیں اور تذکرہ خم خانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۴۶۲ پر سلیس مرحوم کے فرزند میر محمد جعفر صاحب آسان تخلص حلم کا ذکر خیر ہے۔ ۱۲ مولف

بلاغت دبیر سے انکار

(۴۳) صفحہ ۲۶ میں بلاغت کی بحث میں مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ
"یہ وہ چیزیں ہیں۔ کہ جہاں دبیر و انیس کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں۔ مرزا صاحب
کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں۔ لیکن بلاغت کا تو شائبہ
نہیں پایا جاتا" یہ فقرہ کہ "گو تمام اوصاف پائے جاتے ہوں" اس دُوراندیشی سے
غالباً لکھا ہے۔ کہ اس ناپرسی اردو کے زمانے میں اوّل تو کون اتنی محنت گوارا کریگا۔ کہ ہر قسم کی
مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے نکال کر پیش کرے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے (جیسا کہ حقیر نے
ہر قسم کا کلام محنت کر کے اکٹھا کیا* اور ناظرین کے سامنے پیش کر دیا)۔ تو اُس وقت کہنے کو
ہوگا۔ کہ ہم نے تو ایسا فقرہ پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ فرمایا۔ کہ **تمام اوصاف
شاعری** ہی کا تو دُوسرا نام گویا **بلاغت** ہے۔ اب مَیں اس کو خدا کی شان کہوں۔ یا
توفیق جبری۔ کہ خود صفحہ ۲۷۹ پر پہنچکر مولوی صاحب نے رنگ ہی بدل دیا۔ شہادت **علی اصغر
شیرخوار** کے واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں۔ کہ اس واقعہ کو میر ضمیر صاحب سے لیکر آج تک نئے
نئے پیرایوں میں لوگوں نے ادا کیا۔ میر انیس صاحب نے مختلف مرثیوں میں یہ واقعہ لکھا۔
اور یہ واقعہ (تمام) واقعات کربلا میں نہایت دردانگیز ہے۔ **مگر مرزا دبیر نے جس
بلاغت سے یہ مضمون ادا کیا ہے۔ اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے۔ وہ
میر انیس صاحب یا اور کسی سے آج تک ادا نہ ہوسکا۔** ناظرین! خدا کی
قدرت کا تماشا دیکھئے۔ یا تو مرزا دبیر ایسے تھے۔ کہ اُن کے کلام میں کہیں بلاغت کا شائبہ
نہ تھا۔ بلاغت چھو نہ گئی تھی۔ یا ایک ایسے واقعہ کے بیان میں وہ ایسی بلاغت اور دردانگیز
سماں دکھاتے ہیں۔ کہ جو نہ اور کسی شاعر ماقبل و مابعد سے ہوسکا نہ میر انیس صاحب سے۔
پھر وہ مرثیہ بھی دیکھئے۔ کوئی آخری زمانہ کا مرثیہ نہیں ہے۔ بلکہ درمیانی حصہ عمر کی تصنیف۔
اور اُس عہد محمد علی شاہ مرحوم کی تصنیف ہے۔ کہ جس زمانہ تک میر انیس صاحب لکھنؤ میں

شہادت علی اصغر دبیر مرحوم کا اعتراف مولوی شبلی صاحب بنسبت بلاغت دبیر

*۔ ملاحظہ ہو جلد ثانی اس کتاب کی جس میں ہر قسم کا کلام تفصیل سے حقیر نے جمع کیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

تشریف ہی نہ لائے تھے۔ اُن کی شہرت ہونا تو کیسا۔ جو کوئی شخص یہ کہ سکے۔ کہ میر صاحب کا طرز مرزا مرحوم نے اُڑا لیا۔ اور پھر یہ بھی مولوی صاحب خیال نہیں فرماتے۔ کہ جو شخص تمام واقعات میں سے زیادہ اہم اور نازک واقعہ کو سب سے بہتر نظم کر دیگا۔ اُس کو دُوسرے مرثیوں میں اور حالات (جو اہمیت و نزاکت میں اُن سے کم ہیں) نظم کرنے میں کون امر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ وہی مرثیہ ہے۔ جس کے چند بند مَیں لبطور نمونہ ایک جگہ اس کتاب میں پیش کر چکا ہُوں۔ اور جس کا مطلع یہ ہے*۔ ؎ بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ ملک کے اس عام مقولہ کو مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی و دلیل سے باطل کرنا چاہا ہے۔ کہ **کلام میر صاحب میں فصاحت اور کلام مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے**۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ یہ مقولہ غلط ہے۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت کو حریف قرار دینا اجتماع نقیضین ہے۔ کہ بلاغت کا جزو فصاحت ہے۔ مرزا کے کلام میں فصاحت نام کو نہیں۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مقولہ اہل ملک کا مطلب یا تو مولوی صاحب خود غلط سمجھے ہُوئے ہیں۔ یا دُوسروں کو غلط سمجھاتے ہیں۔ یہ تو کوئی بھی (بجز مولوی شبلی صاحب کے) نہیں کہتا۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں فصاحت چھو نہیں گئی۔ فصاحت نام کو نہیں۔ ضرور فصاحت بھی ہے۔ اور اُس کے ساتھ بلاغت بھی۔ کہ مرزا مرحوم کا اکثر کلام بلیغ اور بعض کلام محض فصیح ہے۔ اور بیشک فصاحت بلاغت کی تابع اور جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ **مؤرخ اودھ** صاحب بوستان اودھ بھی (شعرائے اودھ کے حال میں جہاں دبیر و انیس کا حال لکھا ہے) یہی لکھتے ہیں۔ (اس کتاب فارسی کا ترجمہ اردو بہارستان اودھ کے نام سے چھپا ہے۔ اصل کتاب فارسی ایک ہندو صاحب ذیعلم تعلقہ دار سندیلہ کی تصنیف ہے۔ جو لکھنؤ میں معزز عہدے پر

کلام دبیر میں بلاغت زیادہ ہے

تاریخ نویسان اودھ در بلاغت دبیر

---

* مخدومی جناب مسٹر نواب حامد علیخاں صاحب حامد (بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ) نے جو مضمون بمقابلہ ملٹن و دبیر کا لکھا ہے۔ اُس میں بھی اس مرثیہ کے کچھ بند لکھے ہیں۔ جو قابل دید ہیں ۱۲ مؤلف حقیر۔

زمانہ شاہی میں ممتاز تھے۔ یہ لکھتے ہیں) کہ حضرت دبیرؔ نے میدان بلاغت میں علم یکتائی بلند کیا تھا۔ حضرت انیسؔ نے ساحت فصاحت میں انا ولاغیری کا ڈنکہ بجایا تھا۔ اب طرفداران مولوی شبلی صاحب! ذرا آپ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ خود (مولوی شبلی صاحب کی) کتاب موازنہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب بلاغت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ثبوت بیّن اس کا یہ ہے۔ کہ صفحہ ۱۳ پر وہ لکھتے ہیں کہ "ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے"۔ تمام اہل بلاغت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے۔ کہ بلیغ کا اطلاق جملہ پر ہوتا ہے۔ لفظ پر نہیں ہوتا۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہ سکتے۔ مختصر المعانی کے شروع ہی میں صاحب تلخیص کی عبارت اور یہ بحث درج ہے۔* اور بھی تمام کتابوں میں (معانی و بیان کے) یہ مسئلہ اسی طرح ہے۔ ناظرین انصاف گزین! اب تو آپ کے خیال شریف میں آگیا۔ کہ مولوی شبلی صاحب گو اور علوم میں علامہ زبان ہی ثابت ہوں۔ مگر علم ادب (اردو) و معانی و بیان تو وہ بالکل نہیں جانتے۔ یہ وجہ ہے۔ جو دبیرؔ کے کلام میں بلاغت کے وہ قائل نہیں ہیں +

مولوی شبلی صاحب کی بلاغت سے ناواقفی ذرا دیکھئے

مجھے مولوی شبلی صاحب سے کوئی پرخاش نہیں ہے! اور ایک حد تک اُنکی انشاپردازی کی مَیں داد دیتا ہوں۔ اور اس کا بھی معترف ہوں۔ کہ موازنہ میں بھی بہت سی کارآمد و مفید باتیں

مولوی شبلی صاحب کی منصف

*صاحب تلخیص المفتاح جس کی شرح (مختصر المعانی ہے) لکھتے ہیں "اَلْفَصَاحَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْمُفْرَدُ وَالْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ وَالْبَلَاغَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْاَخِیْرَانِ فَقَطْ۔ اس کے نقرہ آخر کی شرح میں صاحب مختصر المعانی ملا سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں "اَیِ الْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ دُوْنَ الْمُفْرَدِ اِذْ لَمْ یُسْمَعْ کَلِمَۃٌ بَلِیْغَۃٌ"۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ فصاحت کا اطلاق کلمہ۔ کلام۔ متکلم تینوں پر ہوتا ہے کہتے ہیں یہ کلمہ فصیح ہے۔ یہ کلام فصیح ہے۔ یہ متکلم فصیح ہے۔ مگر بلاغت کا تعلق صرف کلام و متکلم سے ہے۔ کلمہ سے نہیں ہے۔ کبھی نہیں سُنا کہ یہ کلمہ (لفظ) بلیغ ہے۔ افسوس ملا تفتازانی آج زندہ نہ ہوئے۔ ورنہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں اُنکو لیجا کر سنوا دیتا "ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے"۔ اسی طرح صاحب شجرۃ الامانی لکھتے ہیں "لفظ فصیح اطلاق میکنند بر کلمہ و کلام و متکلم ہر سہ۔ و اطلاق بلیغ بر کلام و متکلم صحیح بود۔ و بر کلمہ غیر صحیح" + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

تلبیس عبارت میں انھوں نے بیان کی ہیں۔ باایں ہمہ جو مرزا مرحوم کی حق تلفی انہوں نے کی ہے۔ اس کا ایک زمانے کو اور مجھ کو بھی ایک زمانے میں بہت افسوس تھا۔ مگر سوانح مولانا رُوم کے صفحہ ۵ کی عبارت دیکھ کر تسکین ہوگئی۔ اور معلوم ہوگیا۔ کہ وہ میر صاحب کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔ اس لئے بے سبب جتن کئے۔ کیونکہ انھوں نے میر صاحب کو اپنا ہیرو سمجھا ہے۔ وہ صفحہ ۵ کی عبارت مولوی شبلی صاحب کی یہ ہے۔ "مولانا رُوم کے دیوان پر ریویو کرتے ہُوئے ہمارا فرض تھا۔ کہ ان کے معاصرین سعدی و عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا۔ تینوں بزرگوں کی غزلوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں۔ اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی اُن کو ترجیح دی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے"۔ اب رہی یہ بات کہ میر انیس صاحب کو مولوی صاحب اپنا ہیرو سمجھ رہے ہیں۔ یہ تمام کتاب موازنہ سے اور بالخصوص اس فقرہ سے جو ٹائٹل پیج پر درج ہے "میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و دبیر* کا موازنہ"۔ ثابت ہے۔ پس اُنہوں نے کچھ تو معانی و بیان کی ناواقفی کے سبب سے دھوکہ کھایا۔ کچھ اپنی طبیعت کے سبب سے میر صاحب کو اپنا ہیرو (موضوع یا ممدوح) سمجھ کر مرزا صاحب پر ترجیح دی۔ اور مرزا صاحب کو ناقص بنانے کی کوشش کی۔ ورنہ جو شخص موازنہ لکھے۔ اُس کا یہ فرض یہ ہے۔ کہ دونوں مصنفوں کا ہر قسم کا کلام دکھائے۔ اگر مولوی صاحب ایسا کرنا چاہتے۔ تو اُن کو ہر موقع پر مرزا صاحب کا کلام مطبوعہ (جو کلام میر صاحب سے کئی گونہ زیادہ ہے) مل جاتا۔ اور جس جس طرح میر صاحب کی کمزوریاں اور غلطیاں (عام اس سے کہ وہ غلط ہوں یا صحیح) قبول کر کے کثیر الکلامی کا عذر کیا ہے۔ مرزا نے مظلوم کیو اسطے

میر صاحب کو اپنا ہیرو سمجھ

*اس موقع پر اسم میر انیس صاحب کے قریب قریب بغیر لفظ مرزا کے صرف دبیر کا لفظ لانا بھی مرزا صاحب کے معتقدوں کو سخت ناگوار ہُوا ہے۔

بھی عذر کرتے۔ مگر افسوس کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور بجائے اس کے مرزا صاحب کے حق میں سخت زبانی سے کام لیا۔ اور سفیہانہ و عامیانہ وغیرہ وغیرہ الفاظ مرزا صاحب کی شان میں استعمال کئے۔ جو مرزا صاحب کی شان سے تو کیا خود مولوی صاحب کی شان سے بھی بہت بعید ہیں۔ جن کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔ ازبسکہ طول ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب میں مولوی صاحب کی عبارت اعتراض کو ذرا مختصر کر کے لکھونگا۔ اور جواب میں بھی اختصار کا خیال رکھونگا +

سخت زبانی

(۵) دبیر ؎ یوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار۔ رشتہ میں جیسے دانہ تسبیح آبدار +

فصل ۵ مقابلہ کلام

انیس۔ گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن۔ جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن + صفحہ ۲۸۵ پر دونوں شعروں کو (بالمقابل) لکھ کر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "تسبیح کے دانے رشتے میں بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے یہاں آبدار کا لفظ محض فضول و بیکار ہے" + میں کہتا ہوں۔ کہ جس طرح اہلبیت اطہار ایک کے بعد دوسرے رسّی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی تشبیہ تامہ تسبیح سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تشبیہ بھی مرزا صاحب کے یہاں موجود ہے۔ وہ (فرماتے ہیں) جناب رسول خدا صلعم سے خطاب کر کے عرض کرتے ہیں۔ ؎

اعتراض

جواب

فریاد کہ پیاسے ہوئے مقتول تمہارے گلدستہ کی مانند بندھے پھول تمہارے

مگر تشبیہ گلدستہ کی تسبیح کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ گلدستہ میں ایک ہی جگہ پھولوں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ سے (یکے بعد دیگرے) وہ نہیں بندھے ہوتے۔ اب یہ بھی سننے کہ تشبیہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ جزئیات میں بھی مطابقت ہو۔ بہادر کو

تشریح و تشبیہ گلدستہ و تسبیح

ہوں جیسے تسیر کے۔ پس گلدستہ
کی تشبیہ بھی صحیح ہے۔ اور تسبیح کے دانوں کا ڈورے میں پرویا ہونا عین بندھنا ہے۔
کہ وہ سب ڈورے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ڈورہ ٹوٹ جائے تو دانے بکھر جائیں۔

لفظ آبدار

مولوی صاحب یہ کیا آپنے فرمایا۔ کہ آبدار کا لفظ محض فضول و بیکار ہے۔ کیا آپ
کے فرمانے سے بیکار و فضول ہو جائیگا۔ تسبیح عقیق البحر کی ہو یا خاک شفا یا زیتون یا
لکڑی کی۔ عام طور پر دانوں پر آب اور جلا ہوتی ہے۔ اس کے قطع نظر آبدار کی یہاں یُوں
ضرورت ہے۔ کہ اہلبیتؑ اطہار کو مصنّف نے ایسی تسبیح سے تشبیہ دی ہے۔ جو آبدار
ہو۔ آب کے معنی عزّت کے بھی ہیں۔ یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ راہ خدا میں اسیر ہونے سے
اہلبیتؑ کی خداداد عزّت میں فرق نہیں آیا۔ وہ ویسے ہی صاحب عزّت اب بھی ہیں۔
تسبیح کے دانوں پر بھی آپنے اعتراض جما دیا۔ اور آبدار ہونا آپ کو ناگوار گذرا۔ سُنئے
جناب! یہ تسبیح کسی زاہد ریائی کی نہیں ہے۔ جس کی شان میں ایک ایرانی شاعر کہتا ہے ؎

زاہد چہ بلائی تو کہ ہر دانۂ تسبیح — از خوف تو سوراخ بسوراخ گریزد

یہاں دانہ ہائے تسبیح میں ایک تلمیح لطیف اہل بیتؑ کے گریہ و زاری سے بھی ہے۔
جب آپ کو ہمارے ساتویں اور آٹھویں امام کا حال معلوم نہیں۔ تو آپ ہمارے
خصوصیّات کو کیا سمجھینگے۔ وہ تلمیح یہ ہے۔ کہ جس طرح تسبیح کے دانوں کے دل فگار
ہوتے ہیں۔ اہلبیتؑ اطہار کے مقدّس قلوب بھی محض خدا کے واسطے فگار تھے۔
مولوی صاحب نے اس موقع پر پُورا بند مرزا صاحب کا نہیں لکھا۔ جس سے اُن کی
قوت دماغی کا زور اور تخئیل کا کمال معلوم ہوتا۔ خیر۔ ناظرین! پُورا بند مجھ سے سُنئے:۔

یُوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار — رشتے میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار
اور سب کے پیش پیش امام فلک وقار — عابدؑ کی یہ دلیل امامت تھی آشکار

کلام کی خوبیاں

اب غور سے باقی خوبیاں بند کی دیکھئے۔ تسبیح میں امام ہوتا ہے۔ جس کو پیش اور پیش امام اور امام کہتے ہیں۔ خواجہ وزیر صاحب کا مشہور مصرع ہے۔ ع شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں۔ مرزا صاحب کا کمال دیکھئے۔ امام پیش امام پیش رسب الفاظ نہایت بے تکلفی سے نظم فرما گئے۔ پھر تسبیح کے ذکر میں عابدؑ کا لفظ دیکھئے۔ جو خاص لقب مشہور امامؑ چہارم کا ہے۔ اُس کے ساتھ دلیل کی لطیف لفظ ملاحظہ فرمائیے۔ دلیل کے معنی راہ نما کے بھی ہیں۔ امام زین العابدینؑ کی تشبیہ امام سے اور باقی اہلبیتؑ کی تشبیہ تسبیح کے دانوں سے دے کر ایسا بلیغ مضمون ادا فرمایا ہے۔ کہ سبحان اللہ جسکی داد صرف وہ پاک دل دانا دے سکتے ہیں۔ جن کے دل بے جا طرفداری سے پاک دھاتے اور خدا کی یاد سے بھرے ہوئے ہیں۔ مَیں میر صاحب کا بھی پورا بند لکھ دیتا۔ مگر اس وقت میرے پاس وہ مرثیہ نہیں ہے جس میں یہ بند ہے۔ مَیں میر صاحب کے کلام کی بھی دل سے داد دیتا ہوں۔ کہ اپنے رنگ میں وہ تشبیہ بھی اچھی ہے۔ اور دونوں کاملوں کے کلام "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست" کے مصداق ہیں۔ مرزا صاحب کو مولوی شبلی صاحب نے بے جا گھٹا دیا تھا۔ اس لئے مجھے اتنا انہیں سمجھانا پڑا +

(۴) صفحہ ۲۸۴ پر مولوی شبلی صاحب نے یہ دونوں شعر دونوں صاحبوں کے لکھے ہیں:۔

تقابل کلام میر و مرزا میں شبلی صاحب کی جنبہ داریاں

انیسؒ	دبیرؒ
اک گھٹا چھاگئی ڈھالوں سے ستمگاروں کی	گرد عباسؑ کے کثرت تھی ستمگاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی	منہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی

اور پھر شان و تحکم کو دکھایا اور مرزا مرحوم کو ان لفظوں میں گھٹایا ہے۔ کہ میر انیس کے شعر سے اس کو کچھ نسبت نہیں۔ صفائی و برجستگی کے علاوہ چمکنے کے جملہ فعلیہ نے جو [illegible]

نہیں پیدا ہو سکتی ؟ برق کے لفظی معنی چمکنے کے بھی ہیں - یہی تو کمالِ اختصار شانِ بلاغت دکھا رہا ہے - (سے مینہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی) کہ ایک ہی مصرع میں دونوں حالتیں مینہ برسنے اور بجلی چمکنے کی پیدا ہو گئی ہیں*- قبلہ! اس آپ کے تحکم کو کوئی منصف مزاج نہیں مان سکتا - حق یہ ہے - کہ دونوں شعر اچھے ہیں - ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہے + **مولوی صاحب نے** اس کے ساتھ مرزا صاحب کا ایک اور شعر دوسرے بحر کا لکھ دیا ہے - وہ یہ ہے - ؎

یک نشد دو شد

رن میں جو گھرا ابرِ غلیظ اہلِ سقر کا — بجلی سا کڑکنے لگا کڑکیت عُمر کا

اور پھر لکھا ہے - کہ "یہ شعر بالکل بھدا اور بدترکیب ہے"+

جواب

مَیں کہتا ہُوں - کہ جناب! اضداجس کا دماغ شاعری کے کام کا بنا تا ہے - وہی اِن باریکیوں کو سمجھ سکتا ہے - اور جس دماغ و طبیعت میں یہ مادّہ و قوّت ہی نہیں - اُسے ایسے ایسے اعتراض سُوجھتے ہیں - بیت آخر الذکر میں کوئی سبب ثقالت و تنافر کا نہیں ہے - مضمون بھی اعلےٰ درجہ کا ہے - جب زیادہ گھرا ہُوا بادل ہو - تو اُس کو ابرِ غلیظ ہی بولتے ہیں - اب فرمائیے - اُن قاتلانِ امام حسینؑ کے واسطے غلیظ کا لفظ کیسا مناسب و موزوں ہے - اور ابرِ غلیظ میں بجلی کے چمکنے کی بہار ہوتی ہے - اور کڑکیت کا کا میدانِ جنگ میں کڑکنا - اور بجلی کا چمکنا اور کڑکنا - یہ سب کیسی عمدہ تشبیہیں اور استعارے اور کیسے دلچسپ محاورے ہیں - آپ کے فرمانے سے مَیں اِس بیت کو بھدا اور بدترکیب کب مان سکتا ہُوں - البتہ کچھ تُو نہیں سا برائے نام آپ کے مذاق کے خلاف ہے - سو اِس کا علاج نہ مرزا صاحب کے پاس تھا - نہ میرے پاس ہے - **بقول شاعر**

*بارش میں ہر بوند کی شکل مثلِ تیر کے معلوم ہوتی ہے - اور اُس میں بجلی کا شعلہ جوالہ بعینہٖ ایسا نظر آتا ہے - کہ جیسے چمکدار تلوار کو سرعت سے پھرایا جائے کیسی عمدہ تصویر شعر میں پیدا ہو گئی ہے - اور لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ گیا ہے - کہ سبحان اللہ پھر اُس کے ساتھ صفائی بندش کی سونے پر سہاگہ - ہے ۱۲ مؤلف حقیر -

خاطر یک دو کس از از تو شود شاد بس ست — زندگانی بہوائے ہمہ کس نتواں کرد

(۷) صفحہ ۲۸۳ پر بالمقابل میر و مرزا کے یہ دو شعر لکھے ہیں :-

میر صاحب	مرزا صاحب
یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے	یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے	جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں

اور تحکم فرمایا ہے۔ کہ "بندش کی صفائی و برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ **صاحب مکان** کی تخصیص بیکار ہے۔ زلزلہ آتا ہے۔ تو ہر شخص مکان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ جسم رعشہ دار کی ترکیب نا مانوس ہے۔ اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ صرف اُن لوگوں کی رُوحیں نکلیں۔ جن کے جسم رعشہ دار تھے"۔

اب مرزا صاحب کے بعد میر صاحب پر مولوی صاحب ڈھلے اور جھکے ہیں۔ فرماتے ہیں "میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہیں۔ سر کا لفظ بالکل حشو بلکہ موقع کے لحاظ سے بالکل **غلط** ہے۔ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ نہ سر سے اسکو کوئی خصوصیت ہے"۔

مَیں مختصر لفظوں میں عرض کرتا ہوں۔ کہ **ناظرین!** اوّل مرزا صاحب کا پورا بند سُنئے۔ جس کو کتر بیونت کر کے مولوی صاحب نے غارت کرنا چاہا ہے۔

ابرو کی شکل تھی خمِ **شمشیر** سے عیاں	چلتے ہی رن میں بندھ گیا **بھونچال** کا سماں
یوں جسمِ **رعشہ دار** سے جانیں ہوئیں رواں	جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں
حیرت سے بعضے خاک کا پیوند ہو گئے	واں تو **نصیب** سو گئے یاں پاؤں سو گئے

ابرو بھون کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ تلوار میں بھون کی شکل تھی۔ تلوار کے چلنے میں رن میں بھونچال کا سماں بندھ گیا۔ بھونچال میں ہر چیز کانپتی ہے۔ دشمنوں کے جسم بھی بھونچال اور خوف سے کانپ رہے تھے۔ جانیں اس طرح بھاگیں۔ کہ جیسے زلزلے میں مکان کو چھوڑ کر

قول شبلی صاحب

مرزا صاحب پر اعتراض جسم رعشہ دار

میر صاحب پر اعتراض

جواب اعتراض مرزا صاحب

تشریح بھون اور بھونچال کی

صاحب مکان یعنی اُس کے موجودہ آدمی بھاگ جاتے ہیں۔ صاحب مکان سے وہی لوگ مراد ہیں۔ جو اُس مکان میں ہوں۔ پھر خدا جانے۔ صاحب مکان کی تخصیص میں کیا حرج ہے۔ جو مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تخصیص بیکار ہے۔ جو شخص مکان کو چھوڑ کر زلزلے میں بھاگتا ہے۔ اُسی کو مرزا صاحب صاحب مکان کہ رہے ہیں۔ اور بندش کی صفائی اور برجستگی کی داد وہ اردو کے شعراء دے سکتے ہیں۔ جو اہل زبان یا زبان دان ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جسم رعشہ دار سے جان نکلنے کی تشبیہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہلتے ہوئے مکان سے ساکنان مکان کا بھاگ کر مکان کو سونا کر جانا بعینہ ایسا ہے۔ کہ جیسے جان اپنے مکان یعنی جسم کو چھوڑ کر روانہ ہو جائے۔ روان کا لفظ بھی نہایت لطیف ہے۔ کہ روان کے معنی جان کے بھی ہیں۔ اور ماہران علم طب واقف ہیں۔ کہ مرنے کے وقت ہر شخص کو رعشہ لاحق ہوتا ہے۔ کہ رعشہ موت کی علامت ہے۔ ایک شعر میں کتنی خوبیاں ہیں۔ اور بھونچال سے شدّت جدال و قتال اور میدان جنگ کا تہ و بالا ہونا نکلتا ہے* جسم رعشہ دار کی ترکیب بھی ہرگز نامانوس نہیں ہے۔ رات دن بولتے ہیں۔ اور بیشک اُن لوگوں کی روحیں فوراً نکل کر بھاگیں۔ جو (بزدلی) بھونچال اور خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ ایک جماعت تو یہ کانپنے والوں کی ہوئی۔ دوسری اُن حیرت زدہ آدمیوں کی حالت بیان کی ہے۔ جو حیرت سے خاک کا پیوند و زمین گیر ہو گئے۔ اُن کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ کہ اُدھر تو نصیب سو گئے۔ اِدھر پاؤں سو گئے۔ پاؤں سو جانا روزمرہ ہے۔ سُن ہو جانے کے معنی پر بولتے ہیں۔ دیکھئے ایک بند میں کتنا بڑا مضمون باندھ دیا ہے۔ یہ کمال بلاغت نہیں تو کیا ہے؟ اب میر صاحب پر جو آپ نے عنایت فرمائی ہے۔ اُس کا جواب سُن لیجئے۔ سر کا لفظ نہ حشو ہے نہ غلط۔ بلکہ موقع کے لحاظ سے بہت ضروری و صحیح ہے۔ میر صاحب کی مراد یہ ہے۔ کہ جب تلوار نے جسم پر سے سر (دشمن کا) اُڑا دیا۔ تو رُوح کے طائر جو سر اور بدن میں پھڑک رہے تھے۔ وہ اس طرح فوراً سر اور بدن کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

جواب اعتراض بر میر صاحب

روح

کہ جیسے ہر انسان بھونچال میں اپنا مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگتا ہے۔ روح کا گھر آدمی کا تمام جسم ہے ع سر میں بھی روح رہتی ہے دھڑ میں بھی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ کس فلسفہ کی بنا پر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ روح سر میں نہیں رہتی۔ نہ مضامین شاعرانہ کی بنا کسی فلسفہ خاص پر قائم ہے۔ نہ شاعر اس بات پر مجبور ہے۔ کہ جو فلسفی کہے۔ اُس کے خلاف نہ کہہ سکے*۔ اگر فلسفی کے اقوال کی بنا پر شاعروں کے کلام کی تنقید کی جائے۔ تو کوئی شاعر نقص سے خالی نہ رہیگا۔ اس بحث کو اگر آپ مجھ سے نہیں سُننا چاہتے۔ تو جناب مفتی میر عباس صاحب شوستری اعلے اللہ مقامہ سے سُنئے۔ کہ اُن جناب کا یہی ارشاد میں اس کتاب میں ایک جگہ نقل کر چکا ہوں۔ مولوی صاحب! یہ بھی آپ نے اُلٹی کہی۔ کہ روح سر میں نہیں رہتی۔ سر تمام جسم میں سردار ہے۔ پس فیصلہ تو ہر امر کا وہی کرتا ہے۔ اور خیر سلا (خیر و صلاح) سے حکماء میں آج تک روح کی بابت اتفاق ہی نہیں ہوا ہے۔ کہ وہ در اصل کیا چیز ہے۔ اور کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ شاعر تو مشاہدہ کا قائل ہے۔ جب سر کٹنے کے بعد وہ سر اور دھڑ کو الگ الگ پھڑکتا ہوا دیکھتا ہے۔ تو یہی سمجھتا ہے۔ کہ روح دونوں مقاموں میں تھی۔ اب بھاگ رہی ہے سبحان اللہ کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ جس کو مولوی شبلی صاحب نہیں سمجھتے۔ اور زبردستی لفظ سر کو حشو اور غلط بتاتے ہیں۔ اور اس فہم عالی پر دبیرؔ و انیسؔ میں موازنہ فرماتے ہیں۔ اُن کے کلام کو تو سمجھتے ہی نہیں۔ اُن کے کلام میں موازنہ و محاکمہ کیا کر سکتے ہیں +

اعتراض

(۸) صفحہ ۲۸۴ پر ایک ایک مصرع حسب ذیل دونوں بزرگواروں کا لکھا ہے:۔

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

اصل اصول مضامین شعر

* تحقیقات جدیدہ فلسفہ سے کبھی کبھی پُرانی تحقیق رد ہو جاتی ہے جیسے کہ آجکل فلسفہ جدیدہ نے بعض مضامین فلسفہ قدیم کو غلط ثابت کیا ہے اگر شعرا کے کلام اگر فلسفیوں کے کلام کے تابع ہوں تو آئے دن غلط ثابت ہوا کریں شعرا کے کلام اکثر عام خیالات کے موافق ہوتے ہیں شاعر کو اس سے بحث نہیں کہ وہ خیال غلط ہے یا صحیح + ۱۲ مؤلف حقیر

میر صاحب کا مصرع توڑ مروڑ کے (یعنی الفاظ بدل کر) دکھایا ہے۔ جس کو مَیں آئندہ سلسلہ کلام میں بیان کرونگا۔ اوّل یہ سُنئے۔ کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں مصرعوں کی شُستگی و برجستگی و صفائی میں جو فرق ہے۔ وہ ایک بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے"۔ مَیں افسوس سے

جواب

عرض کرتا ہُوں۔ کہ بچّہ تو کیا آپ ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر آپ کو موازنہ و مقابلہ ہی منظور تھا۔ تو کم سے کم ایک ایک شعر تو لکھتے۔ مصرع کا کیا موازنہ۔ ایک مصرع جب تک دُوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر نہ پڑھا جائے۔ اُس کا حسن و قبح نہیں معلوم ہو سکتا۔ بلکہ عربی میں (کہ جس شاعری کے تابع فارسی و اُردو کی شاعری ہے) تو یہاں تک جائز ہے۔ کہ شاعر ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر کے ایک جزو مصرع اوّل میں دُوسرا مصرع ثانی میں لے آئے۔ جیسا کہ جناب امیرؑ کے اس شعر میں ہے۔ ؎

وردالیوم ناصحابینذر الناّ ۔۔۔ سَ جیوش کالبحر ذی الامواج

اس شعر میں لفظ "النّاس" کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ "النّا" مصرع اوّل میں اور حرف "س" مصرع ثانی میں آیا ہے۔ فارسی و اردو میں اتنی آزادی تو نہیں ہے۔ مگر ہاں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دُوسرے میں لانا یہاں بھی جائز و رائج ہے۔ گو ہمیشہ اور ہر شاعر ایسا نہیں کرتا*۔ بہرحال دونوں مصرعوں کے پڑھنے سے مطلب بھی صاف سمجھ میں آتا ہے۔ اور حسن و قبح بھی کھلتا ہے۔ اس لئے اوّل میں دونوں صاحبوں کے پُورے پُورے صحیح شعر لکھتا ہُوں۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ کہ میر صاحب کے شعر کو مولوی صاحب توڑ مروڑ کر مقابلہ و موازنہ کو لائے ہیں:۔

*بالخصوص خاندان جناب شیخ ناسخ مرحوم میں، اس کی بہت احتیاط رکھی جاتی ہے۔ اور اب دو ر بعض شعرا اردو بھی خیال رکھتے ہیں۔ مگر ذوق و مومن و غالب و دبیر و انیس کے یہاں کہیں کہیں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دُوسرے میں ملتی ہے۔ وہ اساتذہ اس کے جواز کے شاید حامی تھے۔ اب جتنی پابندیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اُتنی ہی اردو کی شاعری گھٹتی جاتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

تشریح

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں
آیہ نہ آیا مثل علیؑ مدح جود میں	سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں

میر صاحب کی بیت کا تو یہ مطلب ہے۔ کہ جناب امیرؑ نے وہ بے بہا انگوٹھی نماز پڑھتے میں سائل کو دے دی۔ جس کی قیمت تمام ملک حجاز میں کوئی شخص نہیں دے سکا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جب جناب امیرؑ حالت رکوع میں سائل کو انگوٹھی عطا فرما چکے۔ تو ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی انگوٹھیاں (کسی نے رکوع میں کسی نے سجدے میں) دینا شروع کیں۔ مگر جس طرح آیہ (اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ) آیا تھا۔ اور خدا نے سخاوت جناب امیرؑ کو سراہا تھا۔ اُن منافقوں کی شان میں کوئی حرفِ مدح قرآن میں نہ آیا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دیکھو ریاکاری بُری چیز ہے۔ دکھاوے کا دینا کچھ کام نہیں آتا۔ اعمال ریائی بیکار جاتے ہیں*۔ دونوں بزرگوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔ میر صاحب نے نہایت سلاست و فصاحت سے اپنا مطلب ادا فرمایا ہے۔ مرزا صاحب نے شان بلاغت دکھائی ہے۔ آیہ ایک جگہ آیت کے معنی پر لائے۔ دوسری جگہ آیا صیغہ ماضی ہے۔ تجنیس لفظی کی یہ صنعت ہے۔ دوسری صنعت شبہ اشتقاق کی یہ ہے۔ کہ جود و سجود ایک دوسرے

لطیفہ

*حکایت لطیفہ۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں آغا احمد علی خاں مرحوم کے مکان پر زمانۂ چہلم کی ایک مجلس میں میر محمد شاہ صاحب مرحوم محدث مشہور و مقبول یہی روایت برسر منبر بیان فرما رہے تھے کہ اوروں نے بھی انگوٹھیاں دیں۔ مگر بجز جناب امیرؑ کے اور کسی کی مدح خدا نے قرآن میں نہ کی۔ ایک کشمیری (نقال) بولا کہ حضت (حضرت) وہ اوروں کی انگوٹھیاں ملمع کی ہونگی۔ سب مجلس ہنس پڑی۔ ملمع کے لفظ پر اور اس کے معنے تلمیح پر خیال فرمایئے۔ لکھنؤ کے معمولی آدمیوں کی یہ ذہانت تھی یہ سب علم کی برکت تھی جو شاہی زمانے کا اثر چلا آتا تھا۔ ریاکاری کی تصویر روشن گویا لفظ ملمع دکھا رہا ہے۔ کہ وہ دیکھنے کو اُوپر سے کچھ ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ یہی ریا کا نقشہ ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

سے بظاہر مشتق معلوم ہوتے ہیں۔ (سجود کا سین اُڑا دو۔ تو جود رہ جائے)۔ حالانکہ در اصل یہ دو لفظ جدا جدا ہیں۔ جود سخاوت کے معنی پر ہے۔ اور سجود سجدہ کے معنی پر ہے۔ الحاصل دونوں صاحبوں کی ٹیپیں اچھی ہیں (خدا جزائے خیر دے)۔ اور ایک کو دُوسرے پر ترجیح نہیں۔

؎ ہر گلے را رنگ و بُوئے دیگر ست +

اعتراض مولوی شبلی صاحب

(۹) صفحہ ۲۸۴ پر مولوی صاحب نے دونوں صاحبوں کی حسب ذیل ایک ایک بیت لکھی ہے:۔

انیسؒ

سب نشۂ غرور جوانی اُتر گیا
تلوار تھی۔ کہ حلق سے پانی اُتر گیا

دبیرؒ

کس آب و تاب سے یہ سر فوج پر گئی
پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اُتر گئی

ریویو جواب

اس کے بعد مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "دونوں شعروں کا فرق بھی ظاہر ہے"۔ مَیں کہتا ہُوں۔ دونوں شعر اچھے ہیں۔ کچھ بھی ایسا فرق نہیں۔ جس کی بنا پر ایک شعر کو دُوسرے پر ترجیح دی جائے۔ میر صاحب کے یہاں صاف صاف لفظوں میں مضمون بیان ہُوا ہے۔ مرزا صاحب کی بیت میں آب و تاب میں رعایت لفظی ہے۔ کہ آب پانی کے معنی پر بھی آتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں پانی کے ساتھ گھونٹ کی لفظ بھی ہے۔ اور یہ بھی روزمرّہ ہے۔ کہ پانی کا گھونٹ گلے سے اُتر گیا۔ زبان بھی دونوں کی فصیح۔ حسن بیان بھی قابل تعریف ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۸۵ پر جو اشعار بالمقابل دونوں بزرگواروں کے لکھے ہیں۔ وہ یہاں بخوف طوالت مَیں نہیں لکھتا۔ کہ دونوں کے اشعار اچھے ہیں۔ البتّہ یہ لکھنا میرا فرض ہے۔ کہ مولوی صاحب نے ایک شعر مرزا صاحب کا اپنی خوش فہمی یا اور کسی سبب سے غلط لکھ دیا ہے۔ وہ شعر یُوں لکھا ہے۔ ؎ روشن پدر کا زور ہے دُنیا و دین پر ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر۔ صحیح یُوں ہے ؎

صحت

روشن پدر کا زور ہے دُنیا پہ دین پر ششدر تھے جبرئیلؑ کٹے جب کہ تین پر

کیونکہ "دنیا و دین" میں جب عطف واقع ہوگا۔ تو پھر اعلان نون کا ناجائز ہوگا۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا درمیانی زمانہ شاعری کا ہے۔ ابتدائی کلام میں اُن کے یہاں کہیں کہیں بحالت عطف واضافت اعلان نون ضرور ہے۔ جیسا کہ میں ایک جگہ مفصل لکھ چکا ہوں۔ مگر جس زمانہ کا یہ مرثیہ ہے۔ اُس زمانہ میں وہ اس قاعدہ کی پابندی کر چکے تھے۔ اس لئے جس طرح میں نے عرض کیا۔ اُسی طرح صحیح ہے۔ اور اسی طرح دفتر ماتم کی آٹھویں جلد میں (صحیح) چھپا بھی ہے۔

(۱۰) صفحہ ۲۸۲ پر حسب ذیل میرؔ و مرزاؔ کی ایک ایک بیت مولوی صاحب نے لکھی ہے:۔

میر صاحب	مرزا صاحب
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی	چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زمین پر
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی	گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

اُس کے بعد لکھا ہے۔ کہ "مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے۔ اس کے علاوہ ایک اُنگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کھونچہ دینا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے۔"

میں کہتا ہوں۔ چیرنا اردو میں شق کرنے کے معنی پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضور صلعم (روحی لہ الفدا) نے ایک اُنگلی کے اشارہ سے چاند کو چیر یعنی شق کیا تھا۔ مولوی صاحب اب کیا ارشاد فرمایا۔ کہ ایک اُنگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ آپ مہربانی فرما کر ایک گیلا پاڑیا ایک گیلی چپاتی لائیے۔ (جو توے پر ڈالنے سے پہلے گیلی ہوتی ہے) ایک اُنگلی سے ایک بچہ بھی اُس کو چیر دیگا۔ اس کو چیرنا ہی کہینگے۔ کھونچہ دینا کوئی اہل زبان ہرگز نہیں کہ سکتا۔ آپ کی زبان دانی کی قلعی اسی ایک لفظ میں کھل گئی۔ کھونچہ دینا اس موقع پر کیا کہیں بھی نہیں بولتے۔ یہ بالکل آپ خلاف روزمرہ بولے ہیں۔ کھونچہ تو لباس۔ دامن وغیرہ میں جو ازخود لگ جاتا ہے۔ اُس کو بولتے ہیں۔ کھونچہ کوئی لگاتا نہیں

ڈھال کی تشبیہ آسمان سے۔ اعتراض مولوی شبلی صاحب

جواب اعتراض مولوی شبلی صاحب اور محاورہ کی غلطی

کھونچہ دینا محاورہ نہیں ہے

کھونچ ہمیشہ لازمی آتا ہے۔ متعدی آتا ہی نہیں۔ اور جو اُنگلی اور برچھی وغیرہ سے لگاتے ہیں اُس کو کوچہ بولتے ہیں۔ وہ دُوسرا لفظ ہے۔ سند میں جناب **مشیر لکھنوی** علیہ الرحمہ کا مصرع پیش کرتا ہوں ؎ **کیا پھولی تافتاں پہ کوچہ لگایا ہے** ٭ جو بزرگوار **کھونچہ اور کوچہ کے فرق و محل استعمال و لازمی و متعدی ہونے کو نہیں سمجھتے** ۔ وہ دبیر و انیس میں کیا انصاف کر سکتے ہیں۔ شجاعان ازلی (خاصان خدا) کی یہ خداداد طاقت کا بیان ہے۔ کہ وہ اس طرح آسمان کی ڈھال ایک اُنگلی سے چیر سکتے ہیں جیسے ایک بچہ پاپڑ اور چپاتی کو چیر سکتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہُوا۔ کہ پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے۔ یہ آپ کی زبردستی اور سینہ زوری ہے۔ ہرگز مصرع مذکور بدترکیب نہیں۔ اور ڈھال کی تشبیہات آفتاب اور آسمان دونوں کے ساتھ صحیح ہیں۔ کہ ڈھال بھی گول ہے۔ آسمان و آفتاب بھی گول نظر آتے ہیں۔ **لیکن آسمان کے ساتھ تشبیہ میں چار وجہ شبہ ہیں۔ (۱ و ۲) آسمان کی گلائی (گولائی) خم کے ساتھ۔ (۳) آسمان کے** ستاروں سے ڈھال کے پھولوں کی تشبیہ۔ (۴) رنگ کے اعتبار سے۔ کہ آسمان بھی ازرق (نیلا) رنگ ہے۔ جو قریباً ڈھال کا رنگ ہے۔ اور **آفتاب کے ساتھ** اُس کی تشبیہ صرف ظاہری گولائی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آفتاب کی درصل کروی شکل ہے مگر بظاہر مثل سپر کے گول نظر آتا ہے۔ اس لئے تشبیہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ تشبیہ کے واسطے

کوچہ لگانا اور کوچہ دینا محاورہ ہے مشیر لکھنوی

تشبیہ آسمان چار وجہ

٭ اس موقع پر مجھے خیال آیا۔ کہ مولوی شبلی صاحب کھونچے اور کوچے کے بارے میں شاید یہ کہتے اور مشیر مرحوم کی نظیر کو نہ مانیں۔ اس لئے میں دونوں لفظوں کو فرہنگ آصفیہ جناب سید احمد صاحب دہلوی سے لکھ دُوں۔ جو ایک مستند دہلوی اہل زبان کی تالیف جدید و معتمد ہے۔ (۱) فرہنگ آصفیہ جلد سوم مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۰۰۔ کوچا۔ اسم مذکر بھالا کا کسی نوکدار چیز یا تلوار وغیرہ کا زخم تھوڑا سا جو آرپار نہ ہُوا ہو۔ (کوچا دینا) (ہندی) فعل متعدی چبھونا۔ نیزہ وغیرہ کی نوک گھسیڑنا۔ گودنا۔ کچوکنا۔ (۲) صفحہ ۲۳۶۔ کھونچا۔ (۵) اسم مذکر بڑی کھونچ۔ (کھونچ) ہندی مؤنث اسم کیل یا کانٹے وغیرہ سے جو اُلجھ کر کپڑہ پھٹ جائے اُس پھٹی ہُوئی جگہ کو کھونچ کہتے ہیں۔ کھونچ آنا یا لگنا فعل لازم ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

فرہنگ آصفیہ

ہر اعتبار و ہر صورت سے مشابہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اب آپ کے فہم عالی میں آیا۔ کہ مرزا مرحوم کا کلام کس قدر بلاغت کے پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جس بلاغت کو آپ کہتے ہیں کلام دبیر میں نام کو نہیں ہے۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس +

فصل ۱۱ نیزوں کی لچک اور رعشہ

(۱۱) اسی صفحہ ۲۸۲ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کا ایک مصرع اور مرزا صاحب کا شعر لکھ کر دکھایا ہے:۔

انیسؔ	دبیرؔ رح
چلنے میں نیزے کانپتے تھے شل پائے پیر	دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند

ایراد مولوی شبلی صاحب

پھر فرماتے ہیں۔ کہ "میر صاحب کا مصرع فصیح و صاف ہے۔ ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے۔ وہ "رعشہ" کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزے دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزے چلانے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا۔ نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزے کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا"+

جواب رعشہ دینرہ

اب میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب! یہ عذر بھی آپ کا نہیں چل سکتا۔ مرزا صاحب کے مصرع اوّل میں بھاگنے کی لفظ موجود ہے۔ یعنی ع دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند۔ اور اُن جوانوں کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے اُن کو

قدم پیر کی مانند رعشہ تھا۔ اوّل تو تیر کی مانند بھاگنا خاص روزمرہ ہے۔ دوسرے جب بھاگتے تھے۔ تو جنبش و حرکت وغیرہ جتنے لوازم بھاگنے کے ہیں۔ وہ سب سامع سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ کودن نہ ہو۔ پھر یہ کیا اعتراض فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے نیزے کی جنبش و حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اور کس طرح ذکر کرتے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ تو مرزا صاحب کا کیا قصور ہے۔ ؎

فہم سخن تا نکند مستمع قوت طبع از متکلم مجوئے

اور یہ جو ارشاد ہُوا ہے۔ کہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اوّل تو یہ ادّعا بھی غلط ہے۔ کیونکہ رعشہ ہوگا۔ تو بغیر چلنے کے بھی کانپینگے۔ دوم جب بھاگنے کا ذکر کر دیا۔ تو چلنا تو خود بخود آگیا۔ اور جب آدمی بھاگینگے۔ تو اُن کے ہاتھ میں نیزے ضرور ہلتے ہُوئے جائینگے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ کہ نیزوں کو قدم پیر کی مانند رعشہ تھا جب چلنے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ تو بھاگنے میں زیادہ ہوگی۔ بہرحال میر صاحب کا مصرع بھی اچھا ہے۔ مرزا صاحب کی بیت بھی اچھی ہے۔ میری سمجھ میں کسی کلام کو اس موقع پر (دُوسرے کلام پر) ترجیح نہیں ہے۔ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ اور دونوں فصیح ہیں۔ بندش بھی دونوں کی اچھی ہے۔ اور جو تصویر "کانپتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ وہ ہی "رعشہ" سے اور "بھاگتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ پھر کیونکر ایک کو دُوسرے پر ترجیح ہو سکتی ہے +

(۱۲) پھر اسی صفحہ ۲۸۲ پر اپنی عادت کے موافق دونوں صاحبوں کے (ایک ایک مصرع) حسب ذیل دو مصرع مولوی صاحب مقابلۃً لکھتے ہیں:۔

انیس	دبیر
ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش	چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں

اور لکھتے ہیں "جلاجل کے دونوں حصّے جو بجانے میں مل جاتے ہیں۔ اس کی تعبیر دونوں

اپیل مولوی شبلی صاحب

بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جلاجل چلّا کر الاماں کہتا تھا۔ اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں۔ کہ حضرت امام حسینؑ کا رُعب اس قدر غالب ہُوا۔ کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہوگیا۔ رُعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے جب مل جاتے ہیں۔ تو پھر جب تک جدا نہ ہوں۔ آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ وہ ہاتھ جوڑ کر بالکل چُپ ہوگیا"۔

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ میر صاحب کے مصرع کی جو تعریف مولوی صاحب نے فرمائی۔ وہ صحیح بلکہ کچھ کم ہے۔ مجھے اس میں کلام نہیں ہے۔ مگر مرزا صاحب کے مصرع کی نسبت یہ ارشاد کہ "چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں" میرے نزدیک مولوی صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ جلاجل (یعنی جھانجھ) کے دونوں حصّے دونوں ہاتھوں سے مشابہ ہیں۔ اور جب وہ بجنے کے شروع میں ملینگے تو بالکل ہاتھ ملنے کی صورت پیدا ہوگی۔ اُس کے بعد آواز نکلیگی۔ پس مرزا صاحب کا یہ فرمانا کہ ع چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں بہت درست ہے۔ کیونکہ جو شخص الاماں کہتا ہے وہ اپنے فعل پر ضرور نادم ہوتا ہے۔ اور ندامت کے وقت آدمی دستِ افسوس ملتا ہے۔ اسی طرح جلاجل کفِ افسوس مل مل کر الاماں پکارتے تھے۔ دیکھئے کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ اور کتنا بڑا مضمون کتنے مختصر مصرع میں نظم ہے۔ جس کو خود بھی مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تشبیہ صحیح ہے۔ مگر پھر بھی خواہ مخواہ اپنی خوش فہمی یا نہ جانے کس سبب سے اعتراض فرماتے ہیں۔ ع اے فراست اسے کیا کہتے ہیں۔ ایسے ایسے فضول اعتراض فرما کر مرزا صاحب کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے۔ کہ فہمیدہ و سنجیدہ شخص ایسے بیجا اعتراضوں کو دیکھ کر مولوی صاحب کو ناقص و نافہم کا خطاب دیتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کی دلیل کمال

تشریح جلاجل

گردانتے ہیں۔ بقول متنبی ؎

واذا اتتک مذمتی من ناقص　　فھی الشھادۃ لی بانی کامل[1]

واضح ہو۔ کہ یہ دونوں مصرع دونوں بزرگواروں کے دو مختلف حالات کے (اور دو مختلف بحروں کے) ہیں۔ اس لئے بھی یہ موازنہ ناقص ہے۔ اس موقع پر میں دونوں بزرگوں کے پورے پورے بند لکھتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے۔ کہ دونوں کامل دو جدا گانہ موقعوں کی تصویریں کھینچ رہے ہیں +

رعایت لفظی و میر صاحب

میر صاحب کا بند تو خود مولوی صاحب نے صفحہ ۲۳۱ پر موازنہ میں اس تمہید سے لکھا ہے۔ کہ "اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت امام حسینؑ کا تمہیدی فقرہ سُن کر تمام لشکر میں جب سناٹا چھا گیا ہے۔ تو اس موقع پر لکھتے ہیں":۔

یہ صدا سُنتے ہی خود رُک گیا قرنا کا خروش　　تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش　　کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا اُن کو سرود دل کا بھی ناساز ہوا　　رعب فرزند نبیؐ سرمۂ آواز ہوا

تشریح و تردید

مولوی صاحب اس موقع پر اس کلام کو اوچھا اور بے اثر بتلاتے ہیں[2]۔ گو مرزا صاحب کی شان میں انہوں نے سفیہانہ و عامیانہ وغیرہ وغیرہ اوچھے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ مگر میں اس موقع پر بھی یہ نہ کہونگا۔ کہ معترض کا اوچھا پن اعتراض سے ٹپکتا ہے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہوگا۔ کہ اگر لفظیں بامعنی نہ ہوتیں۔ اور محض لفظی رعایت کے خیال سے

[1] متنبی کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ جب کوئی ناقص میری مذمت کرتا ہوا تجھے ملے۔ تو سمجھ لے کہ میں کامل ہوں۔ وہی اس کا بیان میرے کمال کی شہادت ہے۔ کہ اگر میں کامل نہ ہوتا۔ تو ناقص میری مذمت نہ کرتا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] ذرا اس طرز خرام تکلم کو دیکھئے۔ اُوپر دبیر کے مقابلہ میں انیس کے کلام کو اچھا بتایا۔ اب یہاں اُنہی کے کلام انیس کو اوچھا اور بے اثر بتلا کر خاک میں ملانا چاہا۔ مگر مولوی شبلی صاحب کے یا اور کسی مدعی سخن کے مٹانے سے دبیر و انیس نہیں مٹ سکتے۔ نہ اُن کا کلام خاک میں مل سکتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

رعایت لفظی سے حسن کلام

ٹھوس دی جاتیں۔ تو ادچھا اور بے اثر کلام ہو جاتا۔ اب رعایت لفظی سے ماشاءاللہ حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ کلام سے اثر ہرگز زائل نہیں ہُوا ہے۔ ایسے ہی ایسے غلط اعتراضوں کی وجہ سے کوئی طرفدار میر انیس مرحوم بھی مولوی صاحب کا شکر گذار نہیں۔ اور وہ لوگ بھی موازنہ کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ؎

شنیدم کہ مردان راہ خدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست جنگ*

خیر اب مرزا صاحب کا پُورا بند بھی سُنئے۔ میر صاحب نے تو اُس موقع کی تصویر کھینچی تھی۔ کہ جب رجز امام حسینؑ کے وقت لشکر شام نے باجوں کا بجانا موقوف کیا تھا۔ برخلاف اس کے مرزا مرحوم اُس موقع کا نظارہ (سین) دکھاتے ہیں۔ کہ جب قاتلان امام حسینؑ لڑائی پر آمادہ ہُوئے۔ جنگ کی طیاری شروع کی۔ علم کھولے۔ باجے بجائے۔ (وہ بند یہ ہے)

ناگہ عمرؔ کے قصد پہ قرنا نے کی فغاں ۔۔۔ بیداد کی گواہی کو ہر سُو اُٹھے نشاں
چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں ۔۔۔ نقّارے سینے پیٹتے آگے ہُوئے رواں
دی بوق نے ندا کہ دم شور و شین ہے ۔۔۔ زہراؑ سے کہدو۔ نوبتِ قتلِ حسینؑ ہے

دیکھئے۔ اِس بلیغ و لطیف پیرایہ میں طیاری جنگ کو نظم فرمایا ہے۔ کہ قرنا جو بجی۔ تو اُس نے سردار لشکر (عمر ابن سعد) کے اس ارادہ پر کہ فرزند رسولؐ کو قتل کریگا گویا فغاں کی۔ اس گواہی دینے کو کہ آل رسولؐ پر بیداد و ظلم ہو رہا ہے۔ نشان اُٹھے۔ جلاجل جو بجے۔ تو یہ ثابت ہُوا کہ

*۔ چنانچہ مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے (اڈیٹر اخبار زمیندار پنجاب) اپنے پرچہ دکن ریویو سنہ ۱۹۰۶ء میں شاکی ہیں۔ کہ معترفین انیسؔ کی طرف سے بھی مولوی شبلی صاحب کو داد نہ ملی۔ اور یہ امر سکوت سخن شناس ہو کر موازنہ کی قدر شکنی کا باعث ہو گیا۔ اور اسکو وہ شیعی دُنیا کے ایک فرقہ کی عدم اعتدال سے بڑھی ہُوئی عصبیت لکھتے ہیں۔ اُنکا غصہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر ذرا موازنہ کی کم تاخیاں درجہ اعتدال سے اور ناحق کوشیاں بھی تو دیکھیں۔ پھر تو وہ متعصب لکھتے ہیں اور خود منصف بنتے ہیں۔ مگر کیا یہی انصاف ہے۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ جب اُن کا پیمانہ چھوٹا ہے۔ تو پرکھنے والے کو وہ کوئی الزام دینے کے مستحق نہیں ہیں ۔ ۲ مؤلف حقیر

یہ ظالم لشکر پر دست ندامت و تاسف مل مل کر الامان پکار رہے ہیں۔ نقارے پر جو چوب پڑ رہی تھی اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ سینے پیٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بوق میں سے یہ آواز نکلتی تھی۔ کہ شور و شین کا وقت ہے۔ کہ نبیؐ کا نواسا امت کے ہاتھ سے پیاسا قتل ہوتا ہے۔ اور بوق گویا زبان حال و زبان اشارہ سے کہ رہا تھا۔ کہ اب جناب فاطمہ زہراؑ سے کہدو۔ کہ گویا یہ نوبت قتل حسینؑ کی بج رہی ہے۔ کہ قتل بادشاہ مخالف پر نوبت فتح بجانیکا دستور ہے۔ اس مصرع کے ایک تو یہ معنی ہوئے۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اور سب انصار اور عزیز تو شہید ہو چکے۔ اب امام حسینؑ کے قتل ہونے کی باری ہے۔ نوبت کا لفظ ان معنی پر بھی اردوئے معلیٰ میں بولا جاتا ہے۔ کہ اس کام کی اب نوبت آگئی یا اب نوبت ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے۔ کہ اس میں اثر اور مرثیت کس قدر زیادہ ہے۔ ایسے بلیغ و مؤثر کلام کو (کاٹ چھانٹ کر) مولوی صاحب بدنما کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ یا خود ان بلاغت کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ یا جان بوجھ کر تجاہل عارفانہ فرماتے ہیں۔ مگر سخن شناس کب ان کی باتوں میں آتے ہیں۔ سہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش ‏ ‏ ‏ من انداز قدت را مے شناسم

(۱۳) صفحہ ۲۶۲ پر مولوی صاحب مرزا صاحب پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے یہ (اعتراض عجیب) خلاف بلاغت کی ایک مثال تحریر کرتے ہیں:۔

مثال ۷۔ حضرت سکینہؑ کو قید خانہ میں غش آگیا ہے۔ اُن کی ماں حضرت شہربانوؑ کو خیال ہوا۔ کہ مر گئیں۔ انہوں نے نوحہ شروع کیا۔ حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

زینبؑ نے رو کے بانوئے مغموم سے کہا ‏ ‏ ‏ بے آس ہو نہ بھابھی ہے غش میں یہ مہ لقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا ‏ ‏ ‏ اب اس کے رفع غش کی یہ اس وقت ہے دوا
اے عاشق حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی ‏ ‏ ‏ سب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی"

خلافِ آدمیت

پھر مولوی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ "تسکین اور تسلی دینے میں یہ کہنا کہ خیر مر گئی تو کیا کر دگی "جو اللہ کی رضا" کس قدر ناموزوں اور خلافِ آدمیت ہے"۔

جواب

میں بادب مولوی شبلی صاحب کی خدمتِ میمون و مبارک میں گزارش کرتا ہوں کہ شاید آپ نے اب تک وہ کتابیں نہیں دیکھیں جن میں حقیقی انسانوں یعنی محمدؐ و آلِ محمدؐ اور اور اُن کے سچے پیرووں کے اخلاق و عادات درج ہیں۔ کہ جن (محمدؐ و آلِ محمدؐ) کی شان میں خدا نے قرآن میں سورۂ ہل اتیٰ نازل فرمایا ہے۔ کہ جس کو سورۂ دہر اور سورۂ انسان بھی کہتے ہیں۔ ورنہ اللہ کی رضا کے بیان کو آپ کبھی خلافِ آدمیت نہ فرماتے۔ اگر اور ایسی عربی و فارسی کی کتابیں جو ہزاروں کی تعداد میں عام اہلِ اسلام (سُنّی و شیعہ) نے اُن کے اخلاق میں لکھی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھی تھیں۔ تو کم سے کم وہ اُردو ہی کی کتابیں دیکھ لیتے۔ جو زمانۂ حال میں ائمۂ اطہارؑ کے حال میں (بطور سوانح عمری) لکھی گئی ہیں۔ میں ایک کم قیمت اُردو کی کتاب کا نام لیتا ہوں۔ یہ کتاب مولوی سید مظہر حسین صاحب قبلہ سہارنپوری مدرس اوّل علوم مشرقی ایم۔ بی سکول لدھیانہ نے تصنیف فرمائی ہے۔ اور لاہور کے مطبع مفید عام میں مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب لاہور لوہاری منڈی نے چھپوا کر مشتہر کی ہے۔ کشف الحقائق فی احوال جعفر الصادق اس کا نام ہے قیمت شائد ۶/ یا اس کے قریب قریب ہو گی۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۶۵ و ۶۶ پر عبارت ذیل ملاحظہ فرمائیے۔ جس سے عادات آلِ محمدؐ کا پتہ چلتا ہے[*]:-

اخلاقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ

کشف الحقائق رضائے امام جعفر صادقؑ بر رضائے الٰہی

اعمشؔ (راوی) کہتا ہے۔ کہ میں حاضرِ خدمت (امام جعفر صادقؑ) ہوا۔ آقازادوں (فرزندانِ امام جعفر صادقؑ میں) سے ایک مریض تھے۔ اُنہیں کی عیادت منظور تھی۔ دیکھا ہیں کہ حضرت حزین و ملول دردولت پر کھڑے ہیں۔ پس اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر وہاں توقف ہوا ہوگا۔ پھر جو باہر تشریف لائے۔ تو حالت بدل گئی

اخلاقِ اہلِ بیتِ اطہارؑ

[*] اصل روایت دیکھنا ہو۔ تو بحار الانوار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ مقام ملاحظہ فرمائیے + ۱۲ ثابت۔

تھی۔ (یعنی) آثار حزن و ملال اب چہرۂ مبارک پر نہ رہے تھے۔ ہم کو گمان ہؤا۔ کہ اب لڑکے کو آرام ہے۔ عرض کی۔ صاحب زادے کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا۔ اُس نے قضا کی۔ عرض کی زندگی میں پریشانی تھی۔ انتقال پر رنج و ملال نہیں۔ فرمایا۔ ہم اہلبیتؑ کا یہی قاعدہ ہے۔ کہ نزول بلا سے پہلے مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ بلا جب نازل ہو گئی۔ تو قضائے خدا پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کو تسلیم کر لیتے ہیں[1]"+

اِس ارشاد فیض بنیاد سے آپ کو ثابت ہو گیا ہو گا۔ کہ اہل بیت محمد مصطفےٰ صلعم کا یہ عام طریقہ تھا۔ کہ نزول بلا سے پہلے تو مضطرب ہوتے تھے۔ مگر بلا نازل ہونے کے ساتھ ہی قضائے خدا پر راضی ہو جاتے تھے۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے۔ اسی عادت کو اس موقع پر مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی دکھایا ہے۔ کہ (گویا) وہ معظمہ فرما رہی ہیں۔ کہ بھا بھی بے آس نہ ہو۔ سکینہ غش میں ہے۔ اچھی ہو جائیگی۔ اور اگر واقعی مر گئی ہے۔ تو ہم اہلبیتؑ کے شیوۂ اخلاقی کے موافق تمکو صبر کرنا چاہئے۔ جو اللہ کی رضا وہی مصلحت ہے۔ اُسی پر ہم راضی ہیں۔ پھر یہ اضطراب کیوں[2]؟ یہی باتیں تو مرزا صاحب کی کثرت معلومات پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اُن کے تاج کمال کی طرۂ طرار ہیں۔ کہ وہ جناب حالات اہلبیت اطہارؑ میں اکثر وہی خیالات ظاہر فرماتے ہیں۔ جو اُن کی شان کے شایاں ہیں۔ اور جن پر اُن حضرات کے صحیح تاریخی حالات شاہد

تسلیم و رضا

کثرت معلومات

جناب منشی امیر مینائی

[1] ناظرین دیکھئے ہر فقرہ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ اردو میں ترجمہ ہونے پر جس کلام میں یہ اثر ہے کہ دل ہی میں (ہر فقرہ) گھر کرتا ہے۔ تو اصل کلام بلاغت نظام کیا اثر رکھتا ہو گا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی صوفی کا ایک شعر یاد آ گیا۔ لکھا جاتا ہے:
ہُوں بست عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و بکا کی۔ پر شیوہ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے۔ دیکھئے تسلیم و رضا کی کیا شان دکھائی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

عادل ہیں - عام آدمیوں کی عام عادات سے الگ کر کے خاصان خدا کی شان دکھلانا یہی تو مقتضائے بلاغت ہے - اور یہی درحقیقت (نیچرل) فطرتی رنگ ہے - اور جب خاصان خدا کے اخلاق و عادات ہمہ شما کی طرح دکھائے جائینگے - تو وہ رنگ دراصل خلاف فطرت و خلاف واقع ہوگا - ہرچند ہم میں اور گروہ صوفیہ میں مسائل توحید وغیرہ میں بہت بڑا اختلاف ہے - مگر یہ تسلیم و رضا کا مسئلہ علمائے صوفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے - جن لوگوں نے صوفیوں کے اخلاق کی کتابیں - اُن کے ملفوظات وغیرہ دیکھے ہیں - مجھے امید ہے - کہ وہ میرے کلام کی تائید فرمائینگے - اگر طول کتاب کا خوف نہ ہوتا تو مَیں اس موقع پر بعض کتب تصوّف سے بہت کچھ لکھتا - مجھے اِس موقع پر سخت تعجّب اور اُس سے بڑھ کر افسوس ہے - کہ مولوی شبلی صاحب نے مولانا رومؒ کی سوانح عمری لکھی جسکی تالیف کے وقت اور اُس سے پہلے صوفیوں کی غالباً بہت سی کتابیں دیکھی ہونگی - مگر یہ مسئلہ رضا و تسلیم کا اُن کی سمجھ میں نہ آیا - اور اِس (رضا و تسلیم) کو خلاف آدمیّت سمجھے حالانکہ یہ عین آدمیّت ہے - مگر ہر آدمی میں نہیں ہوتی - مرزا غالب نے سچ فرمایا ہے ؎

آدمیّت

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اور میر تقی میرؒ ان سے پہلے اور ان سے بہتر فرما گئے ہیں - ؎

**شیخ جی صاحب فرشتے ہوں تو ہوں
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں***

مولوی صاحب! آپ ایمان سے فرمائیگا - کہ آپ مرزا صاحب کے ایسے عارف کلام پر ایسا بیجا اعتراض فرماتے ہیں - اور "**خلاف آدمیّت**" کا ثقیل و ناموزوں لفظ

* اگرچہ دُوسرا مصرع محاورہ حال کے موافق یوں تبدیل ہو سکتا ہے ع آدمی ہونا بہت دشوار ہے - مگر مَیں نے میر صاحب کا تبرّک سمجھ کر (جُوں کا تُوں) لکھ دیا ہے - میر صاحب کے قریب قریب حافظ شیرازی بھی فرما گئے ہیں ؎ واعظ شہر کہ مردم ملکش میخوانند - قول ما نیز ہمیں ست کہ او آدم نیست - اگر اس بات کا ثبوت ہوتا - کہ میر صاحب کو حافظ شیراز کے شعر کا علم تھا - تو یوں کہنا مناسب ہوتا - کہ اُنہوں نے فارسی سے اردو میں ترجمہ فرما دیا - اب یہ کہنا مناسب ہے - کہ مضمون توارد ہو گیا + ۱۲ مؤلف حقیر -

لکھتے ہیں۔ کیا یہ آپ کی شان کے شایاں ہے؟ فرمائیے۔ یہ مقام دیکھ کر اُن کے معتقدوں کے دل کیسے پاش پاش ہو گئے ہونگے۔ مرزا صاحب کے کریمانہ اخلاق تمام ہندوستان میں مشہور اور زباں زد خاص و عام ہیں۔ کچھ دبیریوں پر منحصر نہیں۔ انیسیئے بھی اُن کو ایک فرشتہ خصال آدمی سمجھتے ہیں۔ آپ اُن کی شان میں ایسے گستاخانہ بے باکانہ الفاظ فرماتے ہیں۔ اور جب اُن کے شاگرد (مثل میر افضل علی صاحب ضو مصنف ردّ الموازنہ) جواب ترکی بہ ترکی دیتے ہیں۔ تو آپکے طرفدار مثل سابق اڈیٹر پرچہ دکن رویو ایسے بگڑتے ہیں۔ کہ ردّ الموازنہ کو بازاری آدمیوں کی گالیاں کہتے ہیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال نہیں دیکھتے۔ خیر آپ ندوۃ العلما کے ممبر اور معمّر اور اہل علم میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ مَیں جواب میں بھی کوئی لفظ خلافِ آدمیت کہنا نامناسب سمجھتا ہُوں۔ بقول میر انشا مرحوم

جو لُوچھئے تو بڑا آج کام مَیں نے کیا　　جب اُنے گالی دی جُھک کر سلام مَیں نے کیا *

(۱۴) صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳ پر مولوی صاحب نے مرزا صاحب کا یہ بند لکھ کر

حامی جو سلیمانؑ دو عالم منظر آئے　　مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤس تصوّر کی طرح دل میں در آئے　　شیشے میں پری زاد معانی اُتر آئے
یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے　　لعل اُگلو نگا مَیں طوطیِ سدرہ کے دہن سے

بے جا اعتراضوں کا طوفان مچا دیا ہے۔ کاش وہ کوئی معقول اعتراض فرماتے جسکو دیکھ کر کسی اہل فن کو فائدہ ہوتا۔ یا جواب اُس کا سُن کر کچھ معلومات بڑھتی۔ بالکل اٹکل پچّو اعتراض ہیں۔ اور وہ بھی سوالات کے پیرایہ میں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فہم عالی میں (مضمون دقیق) نہیں آیا۔ اور دُوسرے سے پُوچھنا اپنی کسر شان سمجھا۔ اعتراض کے پردے میں سوال یا سوال کی آڑ میں اعتراض فرماتے ہیں۔ وہ سوالات یا اعتراضات

اعتراضوں کا طوفان

اعتراض استفہامیہ مولوی شبلی صاحب

* خلاق المعانی کمال اصفہانی بھی اسی کے قریب قریب فرما گئے ہیں ؎ دوش بگذشتم و دشنام ہمیں داد مرا دو ستش کردم و بنہ اشست کہ من نشنیدم + ۱۲ مؤلف حقیر۔

حسب ذیل ہیں :-

(۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے۔ (۲) تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے۔ (۳) پھر اس کے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤس تصور دل میں اُترتا ہے۔ (۴) طاؤس دل میں نہیں اُترتا۔ (۵) اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے۔ تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے۔ طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے۔ (۶) ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے۔ شاعر لعل اُگلیگا۔ لیکن طائر سدرہ کے دہن سے اُگلیگا۔ اس کے کیا معنی؟ شائد اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے۔ یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے" +

جواب باصواب

اب ہر فقرہ کا جواب باصواب سُنئے :- (۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اوّل تو یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ الفاظ میں گہرا تعلق ہو۔ اور جب الفاظ میں تعلق خاص ہوتا ہے۔ تو اُس کو شعرا صنعت مراعات النظیر یا رعایت لفظی کہتے ہیں۔ میر صاحب مرحوم کے یہاں جابجا یہ گہرا رنگ دیکھ کر مولوی صاحب جابجا اعتراض جما چکے اور کلام کو بے اثر بتا چکے۔ اب مرزا صاحب کے یہاں وہی تعلق ڈھونڈتے ہیں۔ مولوی صاحب کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ اگر واقعی وہ ایسے تعلق کلام یا اُبھری ہوئی رعایت لفظی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انصاف سے موازنہ کرنے کو بیٹھے تھے۔ تو کہیں کم سے کم اتنا ہی لکھتے۔ کہ مرزا مرحوم کے یہاں یہ گہرا رنگ کم ہے۔ یا نہیں ہے۔ اب مجھ سے سُنئے مرزا صاحب نے صنعت رعایت لفظی کو کم برتا ہے۔ یا یُوں کہئے۔ کہ جب تک بے تکلفی سے کوئی مناسب لفظ نہیں آیا ہے۔ اُنہوں نے نہیں باندھا ہے۔ اس کی وجوہ مفصّل میں اسی کتاب میں دُوسرے موقع پر لکھ چکا ہُوں۔ اُن کو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ الفاظ میں رعایت و تعلّق ایسا باریک ہو۔ کہ غور کرنے

جناب سلیمان عنقا

سے وہ سمجھ میں آئے۔ یہاں بھی وہ باریک تعلق موجود ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ جن وانس و وحش وطیر کے بادشاہ تھے۔ عنقا کل طائروں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ حضرت سلیمانؑ کا مطیع ہے۔ اب ایک باریک نکتہ زبان دانی کا عرض کرتا ہوں۔ یہی وہ باتیں ہیں۔ جن سے لغت کی کتابیں خالی ہیں۔ اور جب تک اہل زبان نہ بتائیں۔ یہ باتیں نہیں آسکتیں[1]۔ عنقا کے معنی اس موقع پر اس طائر کے نہیں ہیں بلکہ یہاں عنقا کے معنی نایاب کے ہیں۔ یہ روزمرہ ہے۔ کہ وہ چیز آج کل عنقا ہے۔ یعنی نایاب ہے۔ پس اسی معنی پر مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ کہ جب سلیمان دو عالم (امام حسینؑ) میرے حامی ہوگئے۔ تو جو مضمون نایاب تھے۔ وہ پر جوڑ کر آئے۔ پر جوڑ کر آنے کے مضمون میں بھی ایک اعلےٰ درجہ کی بلاغت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ طائر ہمیشہ اپنے اصلی مقام و مسکن پر پر جوڑ کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ پر جوڑ کر آنے سے مطلب نہایت سرعت سے ہے۔ مولوی صاحب! میرے معروضہ کی تصدیق منظور ہو۔ تو کسی ایسے مقام پر تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے چلئے۔ جہاں کبوتر اڑتے ہوں۔ اور اپنی آنکھ سے کبوتروں کو ان کے مقام پر پر جوڑ کر آتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ مرزا مرحوم اس مضمون کو ادا کر رہے ہیں۔ کہ مضامین میرے گھر کو اپنا اصلی مسکن سمجھ کر آتے ہیں[2]۔ اب دوسری بات سنئے:۔

طاؤس تصور

(۲) (طاؤس تصور کی طرح دل میں در آئے)۔ طاؤس تصور ایک استعارہ لطیف ہے۔ یعنی مضامین دل میں اسی طرح بے تکلف آگئے۔ جیسے تصور آتا ہے۔ طاؤس ایک خوش رنگ خوش وضع طائر ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے استعارے

---

[1] میر تقی میر مرحوم انہیں باتوں کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ میرے اشعار سمجھنے کیلئے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی ضرورت ہے مطلب یہ تھا کہ وہ خاص روزمرے اور محاورے ہیں جن کو ہر جگہ کے آدمی نہیں جانتے ۱۲ مؤلف حقیر

[2] پر جوڑ کر آنے کے ایک معنی باادب آنیکے بھی ہوسکتے ہیں۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے بڑھ کر بلیغ مضمون کسی اور شاعر اردو کے یہاں بھی ہے۔ ایسے نادر مضامین و تشبیہات لانا مرزا مرحوم کا حصہ ہے ۱۲ مؤلف حقیر

شعر النظم کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ حمد میں حکیم فیضی کا مشہور شعر ہے ۔ ع

اے در تگ وپوئے تو ز آغاز ۔۔۔ طاؤس نظر بلند پرواز

طاؤس بھی رنگین ہوتا ہے مضمون بھی رنگین ہوتا ہے۔ اس لئے طاؤس تصور سے اُس کو استعارہ کرکے تشبیہ دی۔ جو کمال بلاغت کی دلیل ہے۔ طاؤس جس وقت باغ میں یا کسی اور مقام پر دیوار سے اُترتا ہے۔ تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ چوتھا مصرع بھی مولوی صاحب کی شمشیر اعتراض سے کیوں نہ چورنگ ہو گیا۔ اس پر بھی لگے ہاتھ کوئی اعتراض جما دیتے۔ اور وہ پریزاد حسین وفصیح مصرع یہ ہے۔ ع شیشے میں پریزاد معانی اُتر آئے۔ شعرا شیشہ کو دل سے (بوجہ نزاکت) تشبیہ دیتے ہیں۔ اور شیشے میں پری وجن کا اُترنا یہ بھی ایک مشہور بات ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ دل کے شیشے میں پریزاد مضامین اُتر آئے۔ اب سوالات (۵) تک کے جوابات ہو چکے۔ (۶) ٹیپ کو لیجئے جس کو مولوی صاحب اپنی خوش فہمی سے بے ربط بتا رہے ہیں۔ ٹیپ واقعی دقیق اور تفقہ طلب ہے۔ مگر واضح ہو۔ کہ یہ مرثئے اُس زمانے کی تصنیف ہیں۔ جب لکھنؤ دارالسّلطنت ہونے کی وجہ سے مرجع اہل علم و منبع کمال ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلسوں میں اکثر اہل علم نظر آتے تھے۔ جو عموماً علوم عقلیہ ونقلیہ مشرقیہ کے لباس وسلاح سے آراستہ ہوتے تھے۔ اِدھر خاندان اجتہاد کی نکہت علم وفضل وتقدس سے لکھنؤ مہک رہا تھا۔ اُدھر علمائے فرنگی محل نے اشاعت علوم وفنون سے اس کو دار العلم والعمل کا معزز خطاب دے رکھا تھا۔ لکھنؤ کا تو کیا ذکر ہے۔ اُس کے اردگرد کے بعض قصبہ اور گاؤں کا کیا جرول۔ کنتور۔ موہان۔ بلگرام۔ بدایوں۔ سندیلہ وغیرہ وغیرہ میں اہل علم واہل فہم کثرت سے تھے۔ کہ جن کا مرکز لکھنؤ تھا۔ ایسے دقیق اشعار کی لوگ توقیر کرتے تھے۔ اُن علم دوست حضرات کا گویا یہ سخن تکیہ تھا کہ اجی سیدھا سادہ کلام تو تک بندی ہے۔

علم لکھنؤ کی شان

خاندان اجتہاد

نظم کو تشبیہ و استعارہ کے لباس و زیور سے آراستہ کرو۔ بلیغ مضمون مختصر الفاظ میں لاؤ۔ اُس میں صنائع و بدائع بے تکلفی سے جابجا اپنا جلوہ دکھاتے ہوں جب لطف شاعری ہے۔ نہیں تو سیدھی سادی بات نثر ہی میں نہ کہدو۔ خیر اب میں مطلب سمجھنے کے واسطے آپ سے ایک مختصر و معتبر حدیث بیان کرنے کی اجازت مانگتا ہوں یہ حدیث شیخ صدوق علیہ الرحمہ* نے اپنی کتاب عیون اخبار الرضا میں لکھی ہے۔ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

شیخ صدوق و عیون اخبار الرضا

حدثنا احمد بن زیاد بن جعفر الهمدانی۔ قال حدثنا علی بن ابراهیم ابن هاشم۔ عن ابیه۔ عن عبد السلام بن صالح الهروی۔ قال سمعت دعبل بن علی الخزاعی۔ یقول انشدت مولای الرضاء قصیدتی۔ اولها مدارس ایات خلت من تلاوة۔ ومنزل وحی مقفر العرصات۔ فلما انتهیت الی قولی خروج امام لامحالة خارج۔ یقول علی اسم الله والبرکات۔ یمیز فینا کل حق و باطل و یجزی علی النعماء والنقمات۔ بکی الرضا علیه السلام بکاء شدیدا ثم رفع راسه الی۔ فقال یا خزاعی نطق روح القدس علی لسانك بهذین البیتین۔ فهل تدری من هذا الامام ومتی یقوم۔ فقلت لا۔ یا مولای الا انی سمعت بخروج امام منکم یطهر الارض من الفساد و یملاها عدلا۔ فقال یا دعبل الخ +

یہ بزرگوار چار راویوں کے ذریعہ سے یہ روایت دعبل خزاعی سے بیان فرماتے ہیں۔ جو (دعبل) امام رضاؑ کے مداح شاعر و معاصر ہیں۔ دعبل کہتے ہیں۔ میں نے اپنا یہ قصیدہ جس کا مطلع مدارس ایات الخ ہے۔ امام رضاؑ کی خدمت اقدس میں پڑھا۔

* شیخ صدوق شیعوں کے ایک معتبر عالم ہیں جنکا انتقال ۳۸۱ھ میں ہوا ہے تخمیناً تین سو کتابیں انکی تصنیف بتائی جاتی ہیں شیخ مفیدؒ انکے شاگرد تھے اور شیخ مفید کے شاگرد سید مرتضےٰ علم الہدےٰ اور سید رضی جامع نہج البلاغہ ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہاں تک کہ مَیں قصیدہ پڑھتے پڑھتے اِن دو شعروں پر پہنچا۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ضرور ہے۔ کہ ایک امامؑ ظاہر ہوں۔ جو خدا کے نام اور برکتوں پر کلام فرمائینگے۔ اور ہم میں سے ہر حق و باطل کو چھانٹ دینگے۔ اور (نعمات) نیکیوں کی جزا اور (نقمات) بُرائیوں کی سزا دینگے۔ یہ سُن کر حضرت (امام رضاؑ) بہت روئے۔ پھر میری طرف سر اُٹھا کر فرمایا۔ اے دعبل خزاعی اِن دونوں شعروں کے کہنے میں رُوح القدس (جبریلؑ) تیری زبان پر ناطق ہُوا ہے۔ تجھے معلوم ہے؟ یہ امام کون ہے۔ (دعبل) میں نے عرض کی۔ آقا مجھے خبر نہیں۔ مَیں نے تو بس اتنا سُنا تھا۔ کہ آپ اہلبیتؑ میں سے ایک امام ظاہر ہونگے۔ جو زمین کو فساد سے پاک کر دینگے۔ اور عدل و داد سے بھر دینگے۔ پھر حضرت (امام رضاؑ) نے پُوری کیفیت ظہور امام اثنا عشرؑ کی بیان فرمائی۔ جو باقی حدیث میں ہے۔ اور جس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔

روح القدس و شاعر اہلبیتؑ

تمہید تمام ہوئی۔ اسی قصّہ کی طرف (جو اُس زمانہ کے اہل علم میں مشہور تھا) مرزا صاحب نے اس مصرع میں اشارہ فرمایا ہے۔ (ع لعل اُگلونگا میں طوطی سدرہ کے دہن سے) سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے حضرت جبریلؑ کا مقام مشہور ہے۔ اس لئے حضرت جبرئیلؑ کو (جن کا نام رُوح القدس و رُوح الامین بھی ہے) طوطی سدرہ کہتے ہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہ ہے۔ کہ جبریلؑ مدّاحی محمدؐ و آلِ محمدؐ میں میری زبان پر ناطق و گویا ہونگے۔ ناظرین آپ کو اس موقع پر مولوی شبلی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کہ نہ وہ ایسے اُلٹے سُلٹے استفہامیہ اعتراض فرماتے۔ نہ مَیں اس طرح ہندی کی چندی کرکے سمجھاتا۔ ضرور مرزا صاحب کے کلام میں سے کچھ کلام ایسا دقیق و قصد طلب بھی ہے۔ اور مَیں اس کی بحث ایک مقام پر اسی کتاب میں کر چکا ہوں۔ اور کہہ چکا ہوں۔ کہ ہر ذی علم متکلم ناظم و ناثر کے کلام میں ضرور کچھ حصّہ دقیق کلام کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نہج البلاغہ ایسی لاجواب کتاب میں بھی ہے۔ اس سے مرزا

صاحب کے علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہی ایک دلیل اُن کے کمال کی ہے۔ اس بنا پر کوئی شخص مرزا صاحب کے کمالات کو مٹانا چاہے۔ تو نہیں مٹ سکتے۔ ایسے ایسے استفہامیہ اعتراضات مولوی شبلی صاحب نے اور بھی چند بندوں پر فرمائے ہیں۔ مگر میں ہندی کی چندی کہاں تک سمجھاؤں۔ کتاب زیادہ طولانی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض بند دوسرے مقام پر میں نے سمجھا دئے ہیں۔ اور یوں بھی اب ضرورت نہیں ہے۔ کہ میرے کرم فرما اُستاد بھائی منشی چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس مہابن ضلع متھرا نے موازنہ مولوی شبلی صاحب کے جواب میں ایک مستقل کتاب (المیزان) لکھی ہے۔ جو غالباً میری کتاب کے ساتھ ساتھ شائع ہوگی۔ کہ آج کل چھپ رہی ہے۔ جو صاحب چاہیں۔ اُس کتاب میں ان تمام بندوں کی شرح ملاحظہ فرمالیں۔ کتاب المیزان ایک محققانہ لاجواب کتاب ہے ۔

فصل ۲ دوسرا داغ زبان دانی کی غلطیاں تمہید

دوسرا داغ۔ زبان دانی کی غلطیاں

رباعی مؤلف حقیر

(۱) جو لوگ اہل زبان پہ مُنہ آتے ہیں — آجاتا ہے جو مُنہ میں وہ کہ جاتے ہیں
ثابت اُن کو سزا ابھی ملتی ہے ضرور — مُنہ آتے ہیں جب تو مُنہ کی بھی کھاتے ہیں

ایضاً

(۲) اہل جوہر کا مرتبہ عالی ہے — ہر بزم میں صدر ان کے لئے خالی ہے
ہیں سرگروہ نظم دبیرؔ اور انیسؔ — ان کی اردو زبان ٹکسالی ہے

میرے خیال میں مولوی شبلی صاحب نے سب سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ جا بجا موازنہ میں دبیرؔ و انیسؔ کی زبان پر بھی اعتراض فرمائے۔ یہ امر ہرگز اُن کو سزاوار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مولوی شبلی صاحب گویا سرحد بنگال کے قریب کے (ایک قصبہ کے) رہنے والے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ کی زبان مستند سے اُن کو اتنا ہی بُعد ہے۔ جتنا اُن کے وطن کو۔ تھوڑے دن وہ

علی گڑھ میں ضرور رہے ۔ مگر ہنوز دلّی دور ہے ۔ مرزا دبیر مرحوم کی پیدائش دہلی کی۔ پانچ سات برس کی عمر میں وہ دہلی سے اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ آئے ۔ پھر تمام عمر لکھنؤ میں رہے ۔ لکھنؤ سے راہئ جنّت ہُوئے ۔ اسی طرح میر انیس مغفور فیض آباد میں پیدا اور جوان ہُوئے ۔ آخر عہدِ شباب میں لکھنؤ آئے ۔ لکھنؤ سے فردوس بریں کو تشریف لیگئے ۔ ان کے بزرگ بھی اردو کے مستند شعرا تھے ۔ دہلی فیض آباد ۔ لکھنؤ یہ شہر اُس زمانے میں مرکز فیض و مرجع اہل کمال تھے ۔ وہاں کے رہنے والوں کی زبان سندی سمجھی جاتی ہے ۔ پھر ایک بیرونی کو کب یہ حق ہے ۔ کہ اُن کی زبان پر مُنہ آئے ۔ جو پنجابی وغیرہ آج کل اہل زبان یا زباندان ہونے کا دعوے کرتے ہیں ۔ وہ بھی تو ساتھ ساتھ یہی کہتے جاتے ہیں ۔ کہ تمام مستند گزشتہ شعرائے دہلی و لکھنؤ کو ہم اپنا سرتاج اور قابل تقلید اُستاد مانتے ہیں ۔ اگر کلام ہے تو اس میں ہے ۔ کہ اب بھی دہلی و لکھنؤ میں ویسے شعرا باقی ہیں یا نہیں ۔ کہ جن کی تقلید مثل سابق واجب ہو ۔ میں کہتا ہُوں اور میری دلی آرزو بھی یہی کہتی ہے ۔ کہ اب بھی ہیں ۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی امید ہے ۔

خیر ؎ کجا بودم اکنوں کجا آمدم ۔ زجا رفتم اما بجا آمدم +

اب وہ زبان کے متعلق غلطیاں مولوی شبلی صاحب کی غور و انصاف سے سُنئے :۔

(۱) صفحہ ۲۳ موازنہ میں میر انیس مرحوم کے اس مصرع پر ؎ اس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہوگئی شیریں ۔ اعتراض فرماتے ہیں ۔ کہ "خوش" چاہئے ۔ (مطلب یہ ہے کہ خوشی غلط ہے) ۔ ناظرین ! اب ذرا میری سُنئے ۔ دو گھڑی غم غلط کیجئے :۔

بات یہ ہے ۔ کہ خوشی ہونا اور خوش ہونا دونوں صحیح محاورے ہیں ۔ دہلی و لکھنؤ میں پہلے خوشی ہونا زیادہ بولا جاتا تھا ۔ لکھنؤ کی نظم لیجئے ۔ حضرت آتش فرماتے ہیں ؎

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد   خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اور دہلی کی نظیر درکار ہو۔ تو اصغر علی خاں صاحب نسیم دہلوی کا یہ پھڑکتا ہوا شعر سُنئے ؎

جس طرف دیکھئے دو[2] تین[3] پھڑکتے ہیں اسیر　　کیوں نہ صیاد خوشی ہو چمن آباد ہیں سب[1]

اب بھی کوئی صاحب نہ مانینگے۔ تو اُن کو نسیم کا یہ شعر سُننا پڑیگا ؎

نسیم دہلوی۔ ہم موجد باب فصاحت ہیں　　کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

یہ دو شعر اتفاقیہ اس وقت مجھے یاد آ گئے۔ لکھ دئے۔ ورنہ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ دبیر و انیس نے جس کثرت سے محاورے اور الفاظ نظم فرمائے ہیں۔ وہ غزل گو و قصیدہ گو شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ اور یہ دونوں بزرگوار خود مستند ہیں۔ ان کے واسطے دُوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا بھی ضرور نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کلام سے سند و نظیر لی جاتی ہے۔ بقول شیخ امان علی صاحب سحر لکھنوی ؎

بیرونیوں کو چاہئے تقلید لکھنؤ　　ہم خود سند ہیں ہم کو سند کیا ضرور ہے[2]

(۲) صفحہ ۲۷۰ پر یہ مصرع مرزا صاحب کا ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں" لکھکر مولوی صاحب فرماتے ہیں " چھوٹا مسافر مرزا صاحب کا ایجاد ہے"۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب کا ایجاد نہیں ہے۔ ٹکسالی زبان اردو کا سکہ پڑا ہوا لفظ ہے۔ اور چھوٹا مسافر۔ ننھا سا مسافر۔ چھوٹا سا مسافر یہ سب الفاظ تمام ہندوستان میں بولے جاتے ہیں۔ آزاد مرحوم نے آبِ حیات کے صفحہ ۳۲۳ پر

اعتراض مرزا صاحب پر

[1] آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں صفحہ ۳۰۲ پر کسی شخص لا معلوم الاسم کے اعتراضوں کی ذیل میں آتش مرحوم کا یہ شعر لکھکر لکھا ہے کہ خوش چاہئے۔ اس پر صفیر بلگرامی نے جلوہ خضر جلد دوئم میں صفحہ ۱۱۲ پر جواب دیا ہے کہ خوشی پھرنا بُرا محاورہ نہیں جیسے کہتے ہیں خوشی خوشی جاؤ۔ اردو میں مستعمل ہے چنانچہ نسیم دہلوی کہتے ہیں ؎ نہ زندگی سے خوشی ہوں نہ موت سے راضی۔ نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح۔ حقیر ثابت عرض کرتا ہے۔ کہ خوشی بجائے خوش اردو میں اس طرح مستعمل ہے۔ جیسے عربی میں زیدٌ عدلٌ بجائے زیدٌ عادلٌ کے۔ اور خوشی بجائے خوش کے آج تک اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ دہلی میں بھی غالباً بولا جاتا ہے۔ جس کی شہادت نسیم دہلوی کے دو شعر دیتے ہیں ۔۱۲ بے بضاعت ثابت۔

[2] جناب سرسید بھی اس نکتہ سے واقف تھے۔ چنانچہ امیر اللغات کے ریویو میں لکھتے ہیں کہ منشی امیر صاحب خود سند ہیں انکو دُوسروں کے کلام سے سند لانے کی ضرورت نہ تھی۔ ریس کی عبارت دوسرا نمبر کا ضمیمہ دیکھئے ۱۲ ثابت۔

ننّھا کو (خورد کے معنی پر) گجراتی لکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ چھوٹا (بھاشا) تمام ہندوستان کا لفظ ہے۔ اور ننّھا صرف (ایک حصہ ملک) گجرات کا۔ مگر اب یہ بھی ہندوستان میں رائج ہے۔ اس لیئے یہ بھی اردو ہے۔ اور اگر ایجاد مرزا صاحب سے آپ کی یہ مراد ہے۔ کہ شاعروں میں پہلے پہل مرزا مرحوم نے اس کو باندھا۔ تو ہر لفظ و محاورہ کو اوّل اوّل جس شاعر نے جس زبان میں نظم کیا ہوگا۔ وہ اُس کا موجد قرار پائیگا۔ اور ہر لفظ و محاورہ ضرور کسی نہ کسی شاعر نے پہلے پہل باندھا ہوگا۔ اس صورت میں یہ بات اُس شاعر کے کمال پر دال ہے۔ افسوس کہ آپ اس پر طعن فرماتے ہیں۔ منیرؔ مونس مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہنر کو عیب سمجھتے ہیں اس زمانے میں　　　ہزار شکر کہ ہم کچھ ہنر نہیں رکھتے

یورپ میں ایسے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈکر ہر نثار و شاعر مستند کے بیان میں لکھے جاتے ہیں۔ جو اُس نے اوّل اوّل نظم یا استعمال کئے ہوں۔ اور اُس کے تاج کمال کے طرّہ کے تار (گویا) سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں مولوی شبلی صاحب طعن فرماتے ہیں ع اے کمال۔ افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے +

اعتراض میر صاحب پر

(۳) صفحہ ۲۲۹ پر میر صاحب پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں ؎ گمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عبّاسؑ۔ گمتی انفار وارا ذل کی زبان ہے۔

جواب گمتی

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ یہ مولوی صاحب کی زبان اردو سے ناواقفی ہے۔ گمتی لکھنؤ کے محلات شاہی اور شریف زادیوں کی زبان کا لفظ ہے۔ گو عوام بھی اس کو بولتے ہیں۔ مگر محلات شاہی میں بولے جانے کی وجہ سے خصوصًا عورتوں کی زبانی جب شاعر نظم کریگا فصیح سمجھا جائیگا۔ میر صاحب نے کمال تو یہی کیا ہے۔ کہ ایک مستورہ کی زبانی نظم فرمایا ہے۔ ہائے شیخ علی حزینؒ تم کیا خوب اور سچ فرما گئے ہو ؎

کس زبان مرا نمی فہمد　　　بعزیزاں چہ التماس کنم

اب مَیں بادب مولوی شبلی صاحب سے پُوچھتا ہُوں۔ کہ حضرت یہ "انفار" کہاں کی

زبان ہے +

(۴) صفحہ ۲۳۲ پر موازنہ میں (مولوی صاحب) لکھتے ہیں۔ کہ "مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے کلام میں **مبتذل** الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎ ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎ ناڑہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا۔" **اب میں** کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب دیور اور ناڑہ کو مبتذل سمجھ گئے ہیں۔ **ہائے ناواقفی** بندہ پرور! **مبتذل** وہ لفظ ہوتی ہے۔ جس کو بازاری آدمی بولتے ہیں۔ اور ثقہ و شریف آدمی اُس کے بدل دُوسری لفظ بولیں۔ اور جب کسی زبان میں ایک معنی پر ایک ہی لفظ ہو۔ کہ اُس کو سب شریف و وضیع بولتے ہوں۔ تو اُس لفظ کو کوئی عاقل زباندان مبتذل نہیں کر سکتا۔ اب سُنئے۔ دیور اور جیٹھ یہ دونوں لفظ عورتوں کی زبان کے ہیں۔ جو تمام ہندوستان میں (تمام قوموں میں) بولے جاتے ہیں۔ دیور وہ ہے۔ جو عورت کے خاوند سے عمر میں چھوٹا بھائی ہو۔ جیٹھ* وہ ہے جو بڑا ہے۔ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اس لئے زوجہ امام حسینؑ جناب بانو فرماتی ہیں ؎ ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔ مرزا مرحوم نے کمال بلاغت سے اس موقع پر کام لیا ہے۔ کہ حضرت بانو کی زبانی وہی لفظ (دیور) باندھا۔ جو عورتیں بولتی ہیں۔ **مجھے سخت تعجب** ہے۔ کہ ایسے لفظ پر بھی مولوی صاحب نے اعتراض جڑ دیا۔ جو دہلی و لکھنؤ کے علاوہ اور بھی تمام ہندوستان کی عورتوں میں بولا جاتا ہے۔ اور کوئی دُوسرا لفظ ہی اس کا قائم مقام

اعتراض مرزا صاحب پر (مبتذل الفاظ)

جواب

مبتذل کیا چیز ہے

جواب

*۔ سرسید صاحب تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون "مذہب عام خلیفہ" میں فرماتے ہیں۔ کہ "یہ جو ہندی میں مشہور ہے۔ کہ جیٹھ کے بھروسے پیٹ" اسکی عادت اٹھا دیں بلکہ اپنا کام آپ کام کی نصیحت تعلیمات سے نصیحت پکڑیں۔ (خلاصہ از تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور ۱۳۱۳ھ کا صفحہ ۱۵۹)

اب دیکھئے مولوی شبلی صاحب دیور کے ساتھ جیٹھ کو اور اسکے ساتھ اس مثل کو بھی مبتذل قرار دیتے ہیں یا نہیں + ۱۲ ثابت ہیچمدان۔

(بالخصوص عورتوں کی زبان میں) نہیں ہے[1] - ہاں خوب یاد آیا - ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا - کہ بنگالہ میں اور اُس کی سرحد کے قریب عورتیں دیور کو دیورا کہتی ہیں - شاید مولوی صاحب نے اسی خیال سے اعتراض فرمایا ہوگا - کہ دیورا کیوں نہ باندھا - (واللہ اعلم) + اب دُوسری لفظ ناڑہ لیجئے - تمام محلات شاہی لکھنؤ کی مستورات اور تمام لکھنؤ کی شریف و وضیع کی عورتیں سالگرہ کا ناڑہ ہی پہلے بھی بولتی تھیں - اور آج بھی بولتی ہیں - اور لکھنؤ کے مرد بھی ناڑہ سالگرہ کا کہتے ہیں - یہ لفظ بھی مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی نظم فرما کر فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے - اس کے عوض بھی فصحائے لکھنؤ بالخصوص عورتوں کی زبان میں دُوسری لفظ ہی نہیں ہے[2] - واضح ہو - کہ لکھنؤ والے سالگرہ کا ناڑہ اور محرم کا ناڑہ بولتے ہیں - جناب شیخ ناسخ مرحوم فرماتے ہیں - ؎

جلد رنگ اے دیدۂ خوں بار اب تار نگاہ ہے محرم اُس پری پیکر کو ناڑا چاہئے[3]

اس کے ساتھ یہ بھی سُن لیجئے - کہ مولوی شبلی صاحب نے ناڑے کو کیوں مبتذل لفظ سمجھا -

---

[1] اس موقع پر یہ بھی لکھ دوں - کہ یہ جواب میں نے لفظ دیور کی نسبت دیا ہے - اور میری غرض یہ ہے - کہ دیور مبتذل لفظ نہیں ہے - ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مصرع اُس مرثیے میں نہیں ہے جو حضرت دبیرؔ کے پڑھنے کا جناب مرزا اوج مدظلہ کے پاس موجود ہے - اور وہ جناب مرحوم کے کاتب مرحوم کا قلمی ہے - جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے یہ حال مجھے معلوم ہوا - اس سے معلوم ہوتا ہے - کہ وہ بند کسی اور نے ادا کرکے لنگر ملا دیا - مگر میری غرض صرف اتنی ہے کہ دیور کا لفظ مبتذل نہیں ہے - یہ حاشیہ ناظرین کی اطلاع کیلئے لکھا گیا + ۱۲ مؤلف حقیر -

[2] واضح ہو کہ "لفظ" دہلی میں بالعموم مذکر بولا جاتا ہے - لکھنؤ کے اکثر خاندان مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں - خاندان جناب مرزا دبیر مرحوم میں یہ توسیع ہے - کہ دونوں طرح بولتے ہیں - اسی خیال سے میں نے اس کتاب میں کہیں مؤنث کہیں مذکر لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر -

[3] مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کے لائق و محقق مؤلف نے کتاب کو رکی جلد چہارم کے صفحہ ۵۲۴ پر ناڑہ کو کلاوہ کے معنی پر جہاں لکھا ہے وہاں یہی شعر جناب ناسخ مرحوم کا سند میں دیا ہے - جو اُن کی کمال معلومات زبان کی دلیل ہے - اور اُنکی کوشش قابل داد ہے - اچھی کتاب بہت محنت سے لکھی ہے - سالگرہ کا ناڑہ آج بھی لکھنؤ کے شاہی خاندانوں اور شرفا میں بولا جاتا ہے - مولوی شبلی صاحب یا جو صاحب چاہیں - اُن معزز و شریف خاندانوں میں تحقیق و تصدیق فرمالیں + ۱۲ ثابت بے بضاعت -

غالباً اُن کا خیال اس طرف گیا۔ کہ اکثر بیرونی ناڑہ آزار بند کو کہتے ہیں۔ سو واضح رہے۔ کہ لکھنؤ کے شرفا (جن کی زبان فصیح اردو سمجھی جاتی ہے) ہرگز آزار بند کے معنی پر ناڑہ نہیں بولتے۔ اور جو اہل دہات و قصبات پڑھے لکھے ہیں۔ وہ بھی ناڑہ آزار بند کے معنی پر نہیں بولتے۔ **ہائے اردو** آج یہ روز بد تجھ کو دیکھنا نصیب ہوا۔ کہ جاہل دیہاتیوں کی زبان کی بنا و خیال پر **تجھے** نشانہ تیر ملامت بنایا جاتا ہے۔ تیرے فصیح الفاظ کو مبتذل خطاب دیا جاتا ہے۔ دیکھئے کل کیا تیری قسمت کا لکھا پیش آئیگا۔ **اب ایک بات اور** مجھے کہنا ہے۔ وہ یہ کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ "مرزا صاحب واقعہ نگاری و معاملہ بندی میں میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں" دروغ بے فروغ ہے۔ ئیں روایت سے۔ درایت سے۔ تاریخ سے یہاں تک کہ خود میر انیس صاحب مرحوم کے قول (مندرجہ واقعات انیس) سے ثابت کر چکا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت میر صاحب سے مقدم ہے۔ اور برس چھ مہینہ مقدم نہیں۔ بلکہ ۲۵ پچیس ۳۰ تیس برس مقدم ہے۔ کہ اُس زمانے تک میر صاحب لکھنؤ آئے ہی نہ تھے۔ پھر مرزا صاحب کیا خواب و خیال میں اُن کی تقلید کر لیتے۔ خصوصاً اُن سیکڑوں (یا ہزاروں) مرثیوں میں جو اوّل اوّل (۳۰ برس کے اندر) اُنھوں نے کہے ہیں۔ اور میر صاحب کے لکھنؤ میں آنے پر بھی نہ کوئی منصف مزاج مرزا کو میر کا مقلّد کہہ سکتا ہے۔ نہ میر کو مرزا کا۔ ایک معاصر دوسرے کا مقلّد نہیں سمجھا جاتا خدا جانے مولوی صاحب کس ملک کی اصطلاح بولتے ہیں۔ جو مدِ مقابل کو مقلّد کہتے ہیں مقلّد کے لئے ضرور ہے۔ کہ یا تو اُس کا شاگرد یا متبع ہو۔ یا زمانہ مابعد میں ہو۔ جیسے ہمارے مولوی صاحب بے سر و پا بے سوچے سمجھے اعتراض فرماتے ہیں نسّاخ بنگالوی کے **مقلّد ہیں**۔ جیسا کہ اس زمانہ میں اُن کے اعتراضوں کو دیکھ دیکھ کر منصف مزاج لوگ کہہ رہے ہیں۔ یہ بالکل نئی اُپج ہے۔ جو مولوی صاحب مرزا مرحوم کو میر صاحب کا مقلّد بتاتے ہیں۔ آج تک کسی انیسئے نے بھی مرزا صاحب کو میر صاحب کا مقلّد نہ کہا تھا۔

میر صاحب کی تقلید کا الزام مرزا صاحب پر

دبیر ہو مبتذل الفاظ

علم دوست منصف مزاج ناظرین! مَیں چالیس سال سے برابر مرزا صاحب کا کلام دیکھتا رہتا ہوں۔ اور اب پانچ سال ہیں (جب سے حیات دبیر لکھنے کا عزم بالجزم کیا) اُن کا تمام کلام جس قدر مجھے ملا بہت نظر غور و انصاف سے مَیں نے دیکھا۔ مرزا صاحب بھی آخر بشر تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ اُن کے کلام میں بھی قبیح و عیب نظر آتے ہیں مگر مجھے ابتک اُن کے کلام میں ایک لفظ بھی ایسی نظر نہ آئی جس کو مبتذل کہا جا سکے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب ایسے متین و مہذّب و دیعلم شاعر پر ایسا (مبتذل الفاظ لانے کا) الزام لگاتے ہیں جس سے اُن کے کلام کو کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ ع اے عدالت اسے کیا کہتے ہیں ٭

اعتراض دبیر پر

(۵) صفحہ ۲۶۰ پر مرزا صاحب کا یہ شعر لکھ کر ؎

تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ اکبر سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

مولوی صاحب (غیر مہذّب الفاظ میں) اعتراض کرتے ہیں۔ کہ "تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" اس محاورے کے ابتذال سے قطع نظر کر کے یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال ہے۔ کہ کوئی شریف عورت یہ کہے۔ کہ مَیں اپنے بیٹے سے درگذری۔ میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو۔ پیدا کرو"۔ اب مَیں مولوی صاحب سے کہتا ہوں۔ کہ "تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" یہ ہرگز مبتذل روزمرّہ نہیں ہے۔ مگر آپ نے جو اُس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ کہ "میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو" یہ الفاظ غیر مہذّب ہیں اور جب کہ ان کی نسبت ایک امامؑ کی زوجہ کی طرف ہے (جو ایک امام کی والدہ ماجدہ بھی ہیں۔ جن کو ہم گروہ شیعہ ابنا دین و ایمان سمجھتے ہیں)۔ تو آپ کا ان کو یہ الفاظ میں مطلب ادا کرنا بیشک ہمارے گروہ کی دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر مَیں قانونی شکنجہ کا خیال اپنے ہم خیالوں کو نہیں دلانا چاہتا۔ الحمدللہ علی السّرّاء والضّرّاء٭ کہکر صبر کرتا ہوں

جواب

٭ خدا کا شکر ہے ہر سختی و نرمی پر ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور یہ کہتا ہوں۔ کہ "روٹی کھاؤ" "کھانا کھاؤ" "آپ کھانا نوش فرمائیے" "زہر مار کیجئے" سب کا مآل گو ایک ہو۔ مگر لفظوں کے اختلاف سے ان کے اثر میں تریاق و زہر کا ایسا فرق ہے۔ میرے بادشاہ (شوہر) کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ دوسرا جملہ ہے۔ "شوہر کو پیدا کرو" دوسرا لغو جملہ ہے۔ اب دوسری بات کا جواب باصواب سُنئے۔ مَیں قبل جواب دینے کے آپ کی توجہ ایک حدیث صحیح بخاری کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایک مشہور صحابی نے حضور صلعم سے عرض کیا تھا۔ کہ ع دوست دارم تراز این و زآں۔ لیک محبوب ترستے از جاں* ۔ جس کا جواب درگاہ حضور صلعم سے جو ملا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نہیں مجھے اپنے نفس سے بھی بڑھ کر دوست رکھیگا جب تو مومن ہو سکتا ہے۔ یہ سُن کر اُن بزرگوار نے بھی یہی کہا۔ کہ ہاں تمام چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اور اپنے نفس سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اب سمجھئے۔ کہ ہم لوگ امام حسین ؑ کو کیسا اور کیا سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بعد رسول اللہ صلعم امام زمانہ بالکل جانشین و قائم مقام رسول ؐ ہے۔ بس ایک وحی اُس کے پاس نہیں آتی۔ اور جو خصائص رسول ؐ ہیں۔ وہ اُن کو حاصل نہیں ہیں۔ باقی اُس بزرگوار کی وہی عزت وہی عصمت وہی عظمت ہے۔ جو رسول ؐ کی ہے۔ یہ تو مذہب شیعہ کی بنا پر گفتگو تھی۔ مذہب سنّت و جماعت کی رُو سے امام حسین ؑ نبی ؐ کے

حدیث صحیح بخاری

امام ؑ

---

* یہ مثنوی مطبوعہ خطاب فاصل (جناب مفتی صاحب طاب ثراہ) کا شعر ہے۔ جو تہ سال پہلے دیکھی تھی۔ اتفاقیہ یاد رہ گیا۔ ہو گی۔

حدیث صحیح بخاری چھاپہ دہلی جزو ۲۴ ص ۹۸۱ پر دیکھئے یہ ہے۔ حدثنا یحیی بن سلیمان۔ قال حدثنی ابن وھب قال اخبرنی حیوۃ قال حدثنی ابو عقیل زھرہ بن معبد انہ سمع جدہ عبد اللہ بن ھشام قال کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو اٰخذ بید عمر بن خطاب فقال لہ عمر یا رسول اللہ لانت احب الی من کل شئی الا نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا والذی نفسی بیدہ حتی اکون احب الیک من نفسک فقال لہ عمر فانہ الان واللہ لانت احب الی من نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الان یا عمر۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں مختلف لفظوں و بہت سے طریقوں سے آئی ہے۔ ماحصل سب کا یہی ہے کہ مومن وہی ہے جو حضور صلعم کو اپنی دولت۔ اولاد۔ آبرو۔ جان سب سے بڑھ کر دوست رکھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

واجب التعظیم نواسے ہیں۔ جن کی شان میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ "دمک دمی لحمک لحمی"۔ اے حسینؑ تیرا خون میرا خون ہے تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ مذہب حضرات صوفیہ کے مطابق ۶۰ھ ہجری کے غوث[۵۱] امام حسینؑ تھے۔ مختصر یہ کہ قریب قریب ہر عقیدہ کے مسلمان کی بنا پر حضرت امام حسینؑ سے جناب شہر بانوؑ کے دو رشتہ ہوئے (۱) رشتۂ زوجیت۔ (۲) رشتہ و تعلق آقائی۔ پس رشتۂ آقائی کی بنا پر ضرور ہے۔ کہ وہ امام حسینؑ کو اپنی اولاد۔ مال۔ آبرو۔ جان سب چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھیں۔ جب تو مومنہ ہیں ورنہ معاذ اللہ مومنہ نہیں۔ مرزا صاحب جناب شہر بانو (مادر امام زین العابدینؑ) کو اعلےٰ درجہ کی مومنۂ کاملہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان سے کہتے ہیں۔ ؎

تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

واقعہ کا خلاصہ بھی سُن لیجئے۔ حضرت علی اکبرؑ شہید ہو چکے ہیں۔ اُن کے ڈھونڈھنے کو لشکر مخالف میں ایک طرف خود جناب امام حسینؑ گئے تھے۔ دُوسری جانب ماہ بنی ہاشم جناب عبّاسؑ گئے تھے۔ امام حسینؑ ابھی واپس نہیں تشریف لائے۔ حضرت عبّاسؑ لاش کو ڈھونڈ کر جب لاش نہ ملی تو گھر چلے آئے۔ اور اہلبیتؑ کرام سے پُوچھا ع کیا لاشۂ اکبرؑ نہیں لائے شہ والا[۵۲]۔ اب نبیؐ زادیوں میں بڑی تشویش پھیلی۔ اور یہ اندیشہ و خیال ہوا کہ دشمنوں نے امام حسینؑ کو شاید قید کر لیا۔ جناب شہر بانوؑ نے اصرار کر کے (تلاش لاشۂ علی اکبرؑ کے واسطے) امام حسینؑ کو بھیجا تھا۔ اس لئے اُن کو زیادہ صدمہ ہوا۔ اس بنا پر وہ شاہزادی حضرت عبّاسؑ سے فرماتی ہیں۔ کہ "اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ"۔ اگر لاشۂ علی اکبرؑ

---

۵۱ حضرات صوفیہ غوث کو ویسا ہی قائم مقام پیغمبرؐ کا سمجھتے ہیں جیسا شیعہ امام عصرؑ کو۔ گویا غوث و امام میں صرف لفظی فرق ہے معنی میں دونوں ایک ہیں۔ ہمارے امام عصرؑ کا ایک لقب غوث بھی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۲ جس مرثیہ کا میں یہ خلاصہ اور یہ مصرع لکھ رہا ہوں۔ وہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔ اور اُس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے ۱۲ مؤلف حقیر۔

نہیں ملتا۔ تو خیر۔ امام حسینؑ تو زندہ آجائیں۔ آپ کو معلوم نہیں۔ کہ ان سب مخدرات عصمت نے اپنے اپنے بچوں کو اپنی سعادت اور اپنا فرض ایمانی سمجھ کر امام حسینؑ پر نثار کر دیا تھا۔ آپ مرزا دبیر مرحوم سے ہرگز یہ توقع نہ رکھیں۔ کہ وہ مادر امامؑ کی نسبت وہ خیال باندھینگے۔ جو عام عورتوں کے خیال کے موافق ہو ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ۔۔۔ گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

یہی خصوصیات اور حفظ مراتب خاندان رسالت کے خیالات ہیں۔ جن کی بدولت مرزا دبیر تمام مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں۔ آپ انہیں اچھی چیزوں کو بُرا کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ موازنہ میں جو میزان آپنے قائم کی ہے۔ اُسی میں اس قدر جھونک ہے۔ کہ ٹھیک وزن معلوم ہونا دشوار ہے۔ بلکہ نافہم کم علم آدمیوں کو تو دھوکا ہوتا ہے ✦

(۶) صفحہ ۲۲۹ پر موازنہ میں مولوی صاحب میر صاحب پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور اس پردہ میں نسّاخ کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔ (یعنی یہ لکھا ہے۔ کہ جو اعتراضات ہم نسّاخ نے چھوڑ دئے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ اُنہیں میں سے یہ اعتراض بھی ہے)۔

اعتراض بر صاحب

؎ بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے ۔ لفظ صفا پر ایراد ہے۔ کہ صاف کر دیا چاہئے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کیوں صاف کر دیا چاہئے۔ ضرور "صفا کر دیا" چاہئے

جواب

آپ پُوچھئے کیوں؟ مَیں عرض کرتا ہُوں۔ صفا پاک کے معنی پر ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بتوں کو توڑ کر کعبہ کو نجاست شرک سے پاک کر دیا۔ صفا کی رعایت لفظی کعبہ سے ہے۔ کہ صفا و مروہ دو مقام مشہور[1] کعبہ کے متعلق ہیں "صاف کر دیا" کہتے۔ تو یہ بات کب نصیب ہوتی۔

[1] از طلس کورس مطبوعہ مطبع صدیقی سنہ ۱۸۹ مرتبہ مولوی شبلی صاحب میں (سفرنامہ ناصر خسرو میں) صفحہ ۷۶ پر مکہ معظمہ کے بیان میں یہ فقرہ ہے "از مسجد حرام بر جانب مشرق بازارے بزرگ کشیدہ است۔ از جنوب سوئے شمال۔ در سر بازار از جانب جنوب کوہ ابو قبیس است۔ و دامن کوہ ابو قبیس صفا است"۔ اس سے میں کہ سکتا ہُوں۔ کہ صفا سے اسکول کے بچے تک واقف ہیں۔ پھر مَیں کیونکر کہوں کہ مروہ سے مدون کرنیوالے مولوی شبلی صاحب ناواقف ہونگے۔ ۱۲ مولف حقیر۔

صفا اور مولانا روم

اب رہی یہ بات کہ صفا پاک کے معنی پر صحیح و مستعمل بھی ہے یا نہیں۔ اس کی سند ہم آپ کو آپ ہی کی کتاب سوانح مولانا روم کے صفحہ ۷۴ سے دیتے ہیں ۔

کیا فائدہ غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

صفحہ مذکور پر آپ یہ شعر مثنوی شریف کا پڑھئے ۔

روزن دل گر گشا دست وصفا — میرسد بے واسطہ نور خدا

یہاں بھی صفا پاک کے معنی پر استعمال فرمایا ہے۔ میر صاحب مرحوم نے بھی اسی معنی پر نظم کیا ہے۔ اسی معنی پر فارسی و اردو میں بولا جاتا ہے۔ آپ کی ناواقفیت کی تو کوئی حد ہی نہیں +

اعتراض پروانگی پر جواب حکایت شیخ علی حزین و سودا

(۷) پھر اسی صفحہ ۲۲۹ میں یہ دوسرا اعتراض میر صاحب پر جڑا ہے ۔ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ پروانگی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں اعتراض غلط ہے۔ پروانگی اردو کا محاورہ ہے۔ اجازت وحکم کے معنی پر دن رات بولتے ہیں۔ اور قریباً تمام ہندوستان میں بولتے ہیں۔ مشہور ہے۔ کہ جب مرزا سودا جناب شیخ علی حزین کی خدمت میں پہنچے۔ تو شیخ نے مصرع پڑھا ۔ دریں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ مرزا سمجھے۔ کہ شیخ چاہتے ہیں مصرع لگاؤ۔ یہ (حاضر جواب) بولے ۔ع کہ پروانگی داد پروانہ را۔ شیخ نے پوچھا "پروانگی چہ" مرزا بولے "پروانگی بجائے اجازت و رخصت اہل ہند میگویند" شیخ بولے "بلے۔ خوش گفتی" شیخ حزین بیچارے تو ایرانی تھے۔ اگر اس محاورہ ہندی سے نابلد تھے۔ تو حق بجانب تھا۔ مگر تعجب ہے۔ کہ مولوی صاحب ہندی نژاد ہو کر ایسے [illegible] اعتراض کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی زبان دانی پر دبیر و انیس کے کلام [illegible] بنتے ہیں ۔ع العجب ثم العجب ثم العجب +

میر صاحب پر اعتراض حصول

(۸) اسی طرح صفحہ ۲۲۹ میں میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے ۔ع جو خوبیاں کہ چاہیں وہ سب حصول ہیں۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ "حاصل" کہنا چاہئے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ حاصل اور حصول دونوں اردو کے اور خاص کر لکھنؤ کے محاورے

ہیں۔ جیسے عربی میں زید عدلٌ میں بجائے عادل کے عدل بولا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں حصول حاصل کی جگہ بولا جاتا ہے۔ اگر آپ ناواقف ہیں۔ تو میرے ساتھ کسی لکھنؤ کی محفل یا مجلس میں چلئے۔ اور اپنے کانوں سے کان کھول کر سُن لیجئے۔ غالباً کوئی نہ کوئی یہ کہتا ہؤا مل جائیگا۔ کہ مولوی شبلی صاحب کوئی بیردنی شخص ہیں۔ سُنا ہے۔ کہ اُنہوں نے دبیر و انیس کے محاوروں پر بھی اعتراض کئے ہیں۔ کوئی اُن سے یہ تو کہے۔ کہ فضول اعتراض کرنے سے کیا حصول۔ بقول آتش مرحوم ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا   کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

یا بقول کسی ایرانی شاعر کے (جس کا نام و تخلص مجھے معلوم نہیں) ؎

درخانہ شو از بروں خبر دار   تا چیست فسانہ ات ببازار

فصل ۵ اتہام کا داغ

تیسرا داغ۔ اتہام کا

جسے انگریزی خواں اصحاب سفید جھوٹ بولتے ہیں۔ **ناظرین! دیکھئے۔** مولوی شبلی صاحب نے یہاں تک انصاف سے کام لیا ہے۔ کہ جو مرثیہ غلط سلط مطبع نولکشور صاحب آنجہانی میں چھپ چکے ہیں۔ اُنہیں کے غلط الفاظ اور غلط مصرعوں تک اپنے اعتراضوں کو وسیع نہیں رکھا۔ بلکہ سُنے سُنائے مصرعوں کو بھی مرزا مرحوم کے سر منڈھ دیا۔* چنانچہ

اعتراض نمبر ۱ صفحہ ۴۲ پر زیر قدم والدہ فردوس الخ

(۱) صفحہ ۴۲ پر موازنہ میں فرماتے ہیں "مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرع ہے۔ زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔ اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ زیر۔ قدم۔ والدہ۔ فردوس۔ بریں سب

---

* حالانکہ انکو لازم یہ تھا کہ جس کلام مرزا صاحب پر اعتراض کرتے۔ کم سے کم اُسکو دفتر ماتم میں تو دیکھ لیتے کہ ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ مرزا محمد رضا صاحب بعجز مرحوم تطہیر الاوساخ میں لکھ چکے ہیں اور زمانہ جانتا ہے کہ نولکشوری مطبوعہ جلدوں میں دبیر کے مرثیوں میں بہت کلام غیر شامل ہے۔ اور مرزا محمد رضا صاحب کی کتاب کا مولوی شبلی صاحب نے موازنہ میں حوالہ دیا ہے اور نقل قول فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ کتاب مولوی صاحب دیکھ چکے ہیں۔ مگر وہ کلام مرزا مرحوم کی طرف عائد کر کے اعتراض کئے۔ جو نولکشوری جلدوں میں بھی نہیں ملتا۔ دفتر ماتم میں تو قطعی نہیں ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہوا ہے۔ وہ اس قدر **بھدّا اور گراں** ہے۔ کہ زبان اس کا تحمّل نہیں کر سکتی *۔ شاید تم کو خیال ہو۔ کہ مصرع کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے۔ اس لئے ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں۔ ؎

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں   میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں

جواب

پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بھدّا پن اور ثقل نہیں ہے" + **میں عرض کرتا ہوں**۔ کہ اس کا جواب تو وقت پر ہی مولوی شبلی صاحب کو مل گیا۔ اور منصف مزاج سخن شناسوں نے لکھ دیا۔ کہ "ع زیر قدم والدہ فردوس بریں" میں کسی قسم کا ثقل یا بھدّا پن بالکل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو اصلاح سخن لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۷ء جس میں منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت (قابل اڈیٹر) نے مولوی صاحب کو معقول و دنداں شکن جواب دیا۔ اور صاف لکھا۔ کہ "مصرع مذکورہ میں کوئی ثقل کوئی سبب تنافر نہیں ہے۔ اور میر صاحب کے مصرع پیش کردہ (ع میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں) میں علاوہ چار اضافتوں کے یہ غرابت بھی ہے۔ کہ شباب کے مشہور معنی جوانی کے ہیں۔ سنتی ہے سامع کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور جوانی کے معنی لینے سے مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مصرع میں شباب کے معنی جوانوں کے ہیں۔ یہ شاب کی جمع ہے۔ مگر اس معنی پر شباب اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ اس لئے غریب ہے" اور یہ بھی لکھا ہے۔ "کہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو مصرع اوّل الذکر (دبیر) پر اس مصرع (انیس) کو ترجیح

اصلاح سخن لاہور

* ناظرین آپ کو ایمان کی جان اور انصاف کے سر کی قسم ہے۔ دو چار مرتبہ اس مصرع کو پڑھئے۔ بالکل ثقالت اور بھدّا پن نہیں ہے۔ مولوی صاحب ایسا بھدّا بتاتے ہیں۔ کہ ان کی زبان تحمّل نہیں کر سکتی۔ خدا جانے ان کی زبان کیسی ثقیل ہے مصرع ہرگز ثقیل نہیں ہے ۱۲ مؤلف حقیر

دی جائے۔ بلکہ عام فہم ہونے کے لحاظ سے دبیر کا مصرع قابل ترجیح ہے۔" خیر میری غرض میر صاحب کے مصرع پر اعتراض کرنے سے نہیں ہے {یہ خلاصہ منشی صاحب موصوف کی رائے کا ہے۔ جو ایک منصف مزاج بے تعلق آدمی ہیں۔ اور میں میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کو قابل تعظیم و تقلید سمجھتا ہوں۔ بلکہ میر صاحب کی تائید میں یہاں تک کہتا ہوں۔ کہ گو شباب جوانوں کے معنی پر اردو میں مستعمل نہ ہو۔ مگر جب کہ شباب اصل اصل حدیث کی بجنسہ لفظ ہے (الحسن والحسین سید ا شباب اھل الجنۃ الحدیث) تو میر صاحب کا خاص اس موقع پر نظم فرمانا قابل گرفت نہیں ہے} میری غرض اس موقع پر اس ذکر سے یہ ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ مصرع مرزا صاحب کی طرف منسوب کر کے اُن مرحوم پر اتہام کیا ہے۔ بیسوں[۳] جلدیں دفتر ماتم کی اور دونوں جلدیں مطبع نولکشوری کی (جو باوصفیکہ سر سے پاؤں تک غلط چھپی ہیں۔ کلام غیر بہت سا شامل ہے) دیکھ جائیے۔ آپ کو ہرگز یہ مصرع نہ ملیگا۔ اور ملے کیونکر۔ مرزا صاحب کا مصرع ہی نہیں ہے۔ حکیم قدیر الدولہ قدیر شاگرد رشید مرزا صاحب کا یہ مصرع ہے۔ جس مرثیہ میں یہ مصرع ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎

ارشاد مجھے آج یہ ہے لوح و قلم سے۔ یہ پورا مرثیہ میرے پاس موجود ہے۔ اس کا پورا بند یہ ہے (جس میں یہ مصرع بتغیر قافیہ ہے):۔

مادر کی اطاعت نہ کروں میں تو خطا ہے	زیر قدم والدہ فردوس علا ہے
زینب[۴] کا ادب والدہ صاحب سے سوا ہے	بیٹا[۵] مجھے اپنا پھوپھی اماں نے کیا ہے
تو جانتا ہے مجھ پہ جو احسان کئے ہیں	پالا بھی ہے اور بیٹے[۶] بھی قربان کئے ہیں*

قدیر الدولہ قدیر

* میں دیکھ رہا ہوں کہ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ کے مرثیے لوگ اپنی طرف منسوب کر کے پڑھتے ہیں۔ کوئی صاحب کسی دوسرے خاندان کے کسی صاحب کا نام لے دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ حیات دبیر کی تالیف سے فارغ ہو کر دو تین جلدیں تلامذہ مرزا صاحب کے مرثیوں کی چھپوا دونگا۔ بشرطیکہ حیات مستعار نے وفا کی۔ ورنہ خیر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ممکن ہے کہ پھر اور کوئی صاحب یہ کام کریں ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہ مصرع انیسیوں اور دبیریوں کی باہمی چوٹوں میں اکثر انیسئے میر صاحب کے اس مصرع کے مقابلہ میں ع "کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" پڑھا کرتے ہیں۔ اور واقف راز دبیریوں کے یہ جتانے پر کہ یہ مصرع ہی دبیر کا نہیں۔ شاگرد دبیر (قدیر) کا ہے۔ کیا آپ قدیر کے مقابلہ پر میر صاحب کو قائم کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے۔ تو مقابلہ کیجئے "چشم ما روشن الخ" انیسئے چپ ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے بلا تحقیق اوّل تو اس مصرع کو مرزا صاحب کا بتایا۔ نہ دفتر ماتم میں نہ ہر دو جلد مطبع نولکشوری میں ڈھونڈھا۔ دوسرے ثقیل بنایا۔ جو ثقیل نہیں۔ تیسرے فردوس علا کی جگہ فردوس بریں لکھ دیا۔ یک نہ شد دو شد سنتے تھے یہ سہ شد ہوئی۔ خدا جانے۔ مولوی صاحب کے دل میں مرزا صاحب کی طرف سے کیا بھرا ہوا ہے۔ جو فصیح وسلیس کلام بھی اُن کو ثقیل نظر آتا ہے۔ اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور اتہام کرنے پر بھی کامیاب نہیں ہوتے +

(۲) صفحہ ۵۵ و ۵۶ پر (موازنہ میں) میر صاحب کی یہ مشہور و منتخب بیت ؎

نکلا نہ منہ سے یہ کہ شہ مشرقین ہوں ۔۔۔ مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

یوں بتغیر الفاظ لکھی ہے ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں ۔۔۔ مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

خیر اس میں تو ایک باریک فرق ہے۔ جس کو باریک بیں اردو کے اہل زبان سمجھ سکتے ہیں۔* اور ممکن ہے۔ کہ مولوی صاحب کو چھاپہ میں یہ بیت یونہی ملی ہو۔ مگر اس کے بعد جو مولوی صاحب کے منہ سے مرزا مرحوم کے حق میں پھول جھڑے ہیں۔ وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے۔ ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں"

اعتراض اتہام ۲ فرمایا میں حسین الخ

* وہ باریک فرق یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں آیا۔ کہا ایک معنی پر مولوی شبلی صاحب نے لکھ دیا ہے۔ یہ ذرا مخل فصاحت ہے۔ ایسی پاس پاس ایک ہی لفظ ایک ہی معنی پر لانا بعض فصحا مخل فصاحت سمجھتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے۔ اُس کے فیصلے کے لئے دونوں کے صرف یہ دو مصرع کافی ہیں"۔

انصاف پسند اور انصاف پرست ناظرین! اس موقع پر تو میں مجبور ہو کر اتنا کہتا ہُوں۔ اور میرے نزدیک یہ کہے بغیر رہنا انصاف کا خُون کرنا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی بیجا طرفداری اور تنگ ظرفی جتانے کے واسطے (آپ صاحبوں کو بھی ایک موقع دکھا دینا کافی ہے۔ ذرا دیکھئے تو مولوی صاحب مرزا صاحب کی تنقیص کے واسطے کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں۔ شطرنج کی سی چالیں چلتے ہیں۔ اتہام سے بھی نہیں چُوکتے۔ پھر فرمائیے۔ ایسے بزرگوار کیا انصافانہ فیصلہ فرما سکتے ہیں؟ خدا جانے کس شاعر لامعلوم الاسم کا مصرع مرزا صاحب کے سر تھوپتے ہیں۔ اگر مقابلہ منظور ہے۔ تو اس بیت سے کریں (جو دفتر ماتم کی پانچویں جلد کے سب سے اوّل مرثیہ میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا)۔ وہ بیت یہ ہے ؎

جواب باصواب

مجروح تیر و خنجر و تیغ و سنیں ہیں ٭ اے عاشق حسینؑ ہمیں تو حسینؑ ہیں*

کہ اس بیت میں علاوہ سلاست بندش کے مظلومیت و مجروحیت کی دلکش تصویر لفظوں میں کھچی ہُوئی ہے۔ مجلس میں یہ ایک ٹیپ ایک مرثیہ کا کام کر جاتی ہے۔ سامعین سُن کر تڑپ جاتے ہیں۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے (وہ مصرع فرضی تو لکھ دیا جس کا دفتر ماتم میں کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ مگر) یہ بیت مقابلہ پر نہ لکھی۔ جو یقیناً مرزا صاحب کی ہے۔ مگر بقول بعض دبیریوں کے مولوی صاحب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ منظور تو اُن کو یہ تھا۔ کہ ہر پہلو سے مرزا صاحب

*مرزا صاحب نے اس مضمون کو بہت سے مرثیوں میں متعدد اسلوبوں سے نظم فرمایا ہے۔ چند اشعار ذیل میں لکھتا ہوں۔ (۱) ایک پہلوان بزید ازلی نے میدان جنگ میں پوچھا ہے ؎ تم کون ہو؟ فرمایا غریب الدیار ہوں۔ بیکس ہوں تنہا ہوں حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ (۲) واللہ ابن فاتح بدر و حنین ہوں۔ میں بیکس و غریب مسافر حسینؑ ہوں۔ (۳) مظلوم ہوں ناچار ہوں اور تشنہ جگر ہوں۔ تو زائر حیدرؑ ہے میں حیدرؑ کا پسر ہوں۔ (۴) ارشاد کیا شاہ نے بادیدۂ پرنم۔ عباس نہیں ہیں وہ حسینؑ ابن علیؑ ہوں۔ (۵) حضرتؑ نے کہا میں ہوں وہی بیکس و تنہا۔ مظلوم حسینؑ ابن علیؑ و بتولؑ زہراؑ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے کمالات کو مٹائیں۔ اور اُن کو مرجوح و مفضول بنائیں۔ پھر وہ واقعی اور اچھا کلام دبیر مقابلہ پر لکھ کر گیا اپنے تمام دعویوں پر پانی پھیر دیتے۔ **اس جرأت اور اس تحکّم پر** ہزار آفرین +

اعتراض تلوار کی معشوقانہ وضع پر ح ۱۷

(۳۳) صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱ پر میر صاحب کے تین شعر تلوار کی معشوقانہ وضع کی تعریف میں لکھے ہیں۔ جن میں سے اخیر کا اور سب سے بہتر شعر یہ ہے۔ ؎

سج اس کی ہے پسند جہاں کو سجی نہ ہو معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

اور پھر لکھا ہے۔ کہ بقول علامہ **ثعلبی** تلوار کی معشوقانہ (ایسی) مدح محاسن شاعری میں داخل ہے۔ پھر مرزا صاحب پر مولوی صاحب نے عنایت و توجہ مبذول فرمائی ہے۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ "**لیکن یہ بہت نازک موقع ہے** ۔ رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے۔ جہاں تک کلام کا اثر نہ جانے پائے۔ اور کلام میں **ابتذال** نہ آجائے۔ مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی۔ لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا۔ (تلوار کی تعریف)۔ ؎

جب خون میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی غُل یہ تھا۔ کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

جواب دینے سے پہلے مَیں کہتا ہوں۔ کہ ع آفریں باد بریں ہمّت مردانہ تو۔ واہ مولوی صاحب۔ نہ جانے کس مبتدی مبتذل شاعر کی ٹیپ ہے۔ یا آپ نے خود ہی فکر فرمائی۔ اور مرزا صاحب کے سر تھوپ دی ہے۔ نہ یہ دفتر ماتم میں کہیں ہے۔ نہ کسی کی زبانی آج تک سُنی۔ نہ مرزا صاحب کی متانت نظم کی شان کے شایاں ہے۔ مرزا صاحب کے نام پر یہ ٹیپ منسوب کر کے آپ نے طرفداران و تلامذہ مرزا صاحب کے خون میں ایسا جوش پیدا کر دیا۔ کہ صاحب ردّ الموازنہ کو جواب میں یہ لکھنا پڑا۔ کہ استغفر اللہ یہ ٹیپ نہ جانے کس **مسخرے** کی ہے۔ ہرگز مرزا صاحب کی نہیں۔ نہ مطبوعہ ہے۔ نہ ملحقات سے ہے۔ جب کلام مطبوعہ مرزا صاحب میں بھی یہ ٹیپ نہیں ہے۔ تو آپکو ہرگز نہ لکھنا چاہئے تھی۔ مَیں نے

بعض اصحاب کو یہ کہتے ہُوئے سُنا تھا۔ کہ مولوی صاحب نے کتاب موازنہ دبیر و انیس اُس زمانے میں لکھی۔ کہ جب شیعہ اور سُنّی گروہوں میں جابجا لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے یہ خیال فرمایا تھا۔ کہ شیعوں میں دبیریوں اور انیسیوں کا مباحثہ پہلے جوش پیدا کیا کرتا تھا۔ مناسب ہوگا۔ کہ ایک ایسی کتاب لکھ دو۔ کہ شیعوں میں پھر وہ جوش تازہ ہو جائے۔ اور سُنّیوں و شیعوں کی لڑائی اس طرح مٹ جائے۔ مگر اب اس تیس چالیس برس میں شیعوں کے خیالات ہی بدل گئے تھے۔ انیسیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اوّل نمبر پر میر صاحب ہیں دُوسرے نمبر پر مرزا صاحب۔ اسی طرح **دبیریوں** نے مرزا صاحب کو اوّل نمبر پر اور دُوسرے نمبر پر میر صاحب کو مان لیا تھا۔ اور یہ دونوں گروہوں نے تسلیم کر لیا۔ کہ کامل دونوں بزرگوار ہیں۔ کوئی رنگ اُن کے کلام میں کھُلتا ہُوا ہے۔ کوئی اِن کے کلام میں زیادہ دل کو لُبھاتا اور بہاتا ہے۔ اور بغیر دونوں کے کلام پڑھے ہُوئے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ممکن نہیں۔ کہ شیعوں کی کوئی ایسی بستی ہندوستان میں ہو۔ جہاں مجلس ہوتی ہو اور ان دونوں صاحبوں کا کلام (تحت لفظ یا سوز میں) نہ پڑھا جاتا ہو۔ اگر واقعی مولوی صاحب نے اُسی نیّت سے یہ کتاب لکھی تھی۔ (گو اب تک اصل نیّت کا قابل اطمینان پتہ نہیں چلا ہے) تو مَیں اس باب میں مولوی صاحب کو قابل مدح سمجھتا ہُوں۔ کہ واقعی اُن کی نیّت بخیر تھی۔ وہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں (سُنّی و شیعہ) کی لڑائیوں کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور ایک صاحب کو دُوسرے صاحب سے بہتر سمجھنا بھی کوئی ایسا امر نہیں۔ جو قابل الزام ہو۔ کیونکہ ایسی طبیعتیں بہت کم ہیں۔ جو ہر کامل کے اجزائے کمال کا اندازہ کرکے جس جس رنگ میں جو بڑھا ہُوا ہے۔ اُس کو صاف بتائے۔ دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی فیصلہ کر دے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھا ہُوا بتایا جاتا ہے۔ اگر مولوی صاحب نے بھی ایسا کیا۔ تو کیا بُرائی ہے۔ البتّہ یہ افسوس ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا مرحوم پر اتّہام بھی لگائے۔ اور مرزا صاحب کی طرف اُس کلام کو

منسوب کیا ہے۔ جو کسی صورت سے اُن کا نہیں ہو سکتا + مولوی صاحب کو اگر ایسا کلام مرزا صاحب کا (جس میں تلوار کی معشوقانہ مدح ہو) مقابلۃً دکھانا تھا۔ تو یہ بند لکھتے۔ جو دفترِ ماتم کی جلد دوم مرثیہ (آدم کا دادرس بنی آدم میں کون ہے) میں ہے۔ سہ

جس مورچے میں لیلیٰ تیغ دوسر گئی | چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
ہر سَر نے خاک اُڑائی اِدھر سے اُدھر گئی | پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا | جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا*

مگر افسوس مولوی صاحب نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور بجائے ایسے کسی بند کے پیش کرنے کے مرزا صاحب کی طرف اُس مبتذل شعر کو منسوب کر دیا۔ جو اُن کا نہیں ہے۔ نہ اُن کی متانت کلام کے شایاں ہے۔ ناظرین! آپ فرمائینگے۔ کہ مرزا صاحب کا کلام بہت ہے۔ مطبوعہ بیس جلدوں میں کہاں تک مولوی صاحب ڈھونڈتے۔ اس لئے اُنہوں نے یہ بند مقابلۃً نہ لکھا۔ مگر نہیں۔ یہ عذر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ایک دُوسرے موقع پر مولوی صاحب نے (رَدّ میں اور کلام کے ساتھ) صفحہ ۲۵۸ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھا ہے۔ پھر کیونکر مانا جا سکتا ہے۔ کہ یہ بند اُن کے خیال و یاد میں نہیں تھا۔ یہ جو بار بار مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا کہاں تک مَیں جواب دوں۔ اور کیونکر مولوی صاحب کے ذہن نشین کروں۔ کہ جناب میر صاحب سے مرزا صاحب کی تصنیف و شہرت مقدم ہے۔ اور نہ وہ میر صاحب کے نہ میر صاحب اُن کے مقلد ثابت ہوتے ہیں۔ دونو صاحب مجتہد نظم ہیں۔ اور مرزا صاحب کے ذکر میں مولوی صاحب کا لفظِ ابتذال لانا مولوی

---

* اس موقع پر بضیافت ناظرین کتاب میں ایک بند مرزا مرحوم کا لکھ کر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو تلوار کی معشوقانہ وضع کی مدح میں اُس مرثیہ میں ہے جو اب تک چھپا نہیں۔ اور حقیر کے پاس ہے۔ مطلع اُس مرثیہ کا یہ ہے۔ سہ اے آسمان زمینِ عدم میں نہاں ہو آج۔ سہ جنوں کی برق آہ تھی بن میں چمک گئی۔ فرہاد کاوہ تیشہ بنی کوہ تک گئی۔ شیریں کی تھی کلائی کھنچی اور مڑک گئی۔ لیلیٰ کی تھی کمر کہ چلی اور لچک گئی۔ گاہے دلوں کے پردہ سے منہ ڈھانکنے لگی۔ زخموں کے روزنوں سے کبھی جھانکنے لگی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

صاحب کی سخن فہمی کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب ایسے عالم جید شاعر کو ابتذال سے کیا کام۔ ابتذال کا کہیں نام اُن کے کلام میں نہیں ہے ۔

اعتراض ۴ در اہتمام

(۴) صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۷ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کے دو بند اور مرزا صاحب کے دو بند پردہ کے اہتمام کے باب میں لکھے ہیں۔ میں اس موقع پر صرف میر صاحب کے بند لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کے بند میں آئندہ قلمبند کرونگا۔ (میر صاحب) :۔

بیت الشرف خاص سے نکلے شہِ ابرار
رونق ہوئی ڈیوڑھی پہ گئی عترت اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے
آتا ہو اِدھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

یہ خیال رہے ۔ کہ میر صاحب نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت کا یہ حال لکھا ہے۔ دونوں بزرگوار دں کے بند لکھنے کے بعد مولوی صاحب گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں بزرگوں نے عورتوں کے پردے کے اہتمام کا سماں باندھا ہے۔ لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہے۔ کہ اس کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے ۔ روانی۔ شستگی۔ خوبی محاورہ۔ چستی بندش کے علاوہ بلاغت کے نکتوں پر لحاظ کرو۔ میر صاحب نے پردے کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔ جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے اظہار کے علاوہ اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں ۔

نقیبوں اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں۔ یا تھا تو اُس کو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی۔ پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے۔ لونڈیوں کے غُل مچانے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی"۔

جواب

اب مجھ کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب پر اتہام لگایا۔ مرزا صاحب مرحوم نے یہ کام بالکل نقیبوں اور دربانوں اور لونڈیوں کے سپرد ہرگز نہیں فرمایا۔ مولوی صاحب کی ہوشیاری داد دینے کے قابل ہے۔ بلکہ یوں کہنا بیجا نہ ہو گا۔ کہ اس عالم پیری میں ماشاء اللہ چشم بد دور حافظہ ایسا قوی ہے۔ کہ مرزا صاحب کا اوپر کا ایک بند کا بند اُڑا گئے۔ اس لئے کہ اگر تینوں بند لکھ دیتے۔ تو اُن کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ پہلے تو مجھ کو خیال ہوا۔ کہ شاید اُوپر کا ایک بند چھاپہ میں اُڑ گیا ہو۔ اور نہ چھپا ہو۔ مگر جب میں نے دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں یہ مرثیہ دیکھا ہے دستِ خدا کا قوتِ بازو حسینؑ ہے۔ اور صفحہ ۲۰۵ پر اُوپر کا بند بھی موجود پایا۔ تو مجھے سخت رنج ہوا۔ کہ افسوس ہمارے ملک کے ایک مشہور مصنف ایسی غلط بیانی سے کام لیں۔ اب تینوں بند مجھ سے سُنئے۔ اور ناظرین با انصاف و ایمان سے فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب نے بالکل اہتمام پردہ کا کس کے سپرد کیا ہے۔ اور اُوپر آپ میر صاحب کی نظم کی زیارت فرما چکے ہیں۔ یہ بھی غور فرمائیے۔ کہ ان بندوں میں آمد۔ صفائی بندش۔ روانی۔ آدابِ شاہی کی رعایت کس قدر ہے۔ یہ واضح ہے۔ کہ مرزا صاحب نے کربلا میں پہنچ کر اہل حرم کا سواریوں سے اُترنا نظم فرمایا ہے:-

ایک بند اُڑا گئے

آوازِ دورباش کا ناگاہ غُل اُٹھا
اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفیٰؐ
ڈیوڑھی سے برمحل وہ زینبؑ جو میں ملا
خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلاؑ

روکی قنات۔ اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر ... عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

دربان عصا اُٹھا کے بڑھے جانب یسار ... دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار ... آئے اُدھر سے اب کوئی جائے ہوشیار
آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں ... آہستہ بولو۔ دختر زہراؑ اترتی ہیں

عظمت جناب زینبؑ میں تاکید:۔

عفّت کے جتنے مرتبے خیر النساؑ نے پائے ... وہ ماں کے بعد دختر مشکل کشاؑ نے پائے
ہاں ہاں مسافرو! نہ کوئی غل مچانے پائے ... ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے
حسن ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو ... وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

ادب شاہانہ

اب غور فرمائیے۔ اوّل تو اہتمام پردہ جناب زینبؑ کو مرزا صاحب نے خود بنفس نفیس جناب امام حسینؑ سے متعلق فرمایا۔ کہ جو جناب ابوالفضل العبّاسؑ سے بدرجہا افضل ہیں۔ اور پھر مزید اہتمام یہ کہ قنات شاہزادہ علی اکبرؑ و شاہزادہ قاسمؑ نے روکی۔ اور حضرت عباسؑ نیزہ تان کر بہادرانہ شان سے پھرنے لگے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ دربان نقیب عصا اُٹھا کر شاہی قاعدہ سے دہنی اور بائیں طرف ہٹ گئے۔ اب جب غیر مرد دُور چلے گئے۔ تو اہلبیت اطہار کی لونڈیوں نے خیمہ کے دروازے پر آکر آواز دی۔ کہ ع آئے ادھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار۔ ہوشیار کی لفظ کو دیکھئے۔ کہ خاص ایسے موقع پر شاہی کنیزیں یہی لفظ بولتی ہیں۔ اور آواز تو لونڈیاں ہی دیتی ہیں حضرت عباسؑ یا اور کسی بزرگ خاندان کا یہ کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر صاحب نے بھی آواز دینے کو جناب عباسؑ سے منسوب نہیں فرمایا۔ بلکہ وہاں حضرت عباسؑ خادموں کو حکم فرماتے ہیں۔ کہ ع دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے* اور ظاہر ہے۔ کہ آواز مرد کی بہت

* میر صاحب نے آواز دینے کو فرّاشوں سے متعلق فرمایا ہے۔ اور مرزا صاحب نے کنیزوں سے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اہلبیت اطہار کی لونڈیاں مرتبہ میں فرّاشوں سے کہ جو غیر ہیں بدرجہا بہتر ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دُور جاتی ہے۔ مولوی صاحب! غالباً یہاں بھی آپ اپنی خوش فہمی سے یہی فرمائینگے کہ غُل مچانے اور چلانے سے ادب اور شائستگی نہیں پائی جاتی۔ آپ کو کیونکر سمجھاؤں۔ کہ جناب یہ عین شائستگی اور ادب ہے۔ جب شاہزادیاں اُترتی ہیں۔ تو لونڈیاں اسی طرح چلاتی ہیں۔ آپ نے زمانہ شاہی میں نہ دہلی کے قلعہ مبارک کو دیکھا۔ نہ لکھنؤ کے محلات شاہی کے قریب تک رسائی نصیب ہُوئی۔ میر صاحب نے مدینہ منورہ سے روانگی کا سماں باندھا ہے۔ وہاں قریب قریب اور بھی مکانات ہونگے۔ اس لئے اُنھوں نے یہ خیال نظم فرمایا۔ کہ ع لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے مرزا صاحب کربلا میں اُترنے کا سماں دکھاتے ہیں۔ وہاں آس پاس کوئی مکان کہاں تھا سنسان جنگل دریا کے کنارے تھا۔ اس لئے اُن کو ایسے خیال نظم کرنے کی حاجت نہ تھی مرزا صاحب کے بزرگ شاہان دہلی کے اتالیق اور میر منشی رہے تھے۔ خود اُنھوں نے زمانہ شاہی میں ہوش سنبھالا۔ بچپن ہی میں مرثیہ پڑھنے کی وجہ سے محلات شاہی لکھنؤ میں وہ بعزت و آبرو گئے۔ اور کئی شاہزادیاں اور شاہزادے اُن کے شاگرد و معتقد ہو گئے۔ کہ بعض اُن میں سے مرزا صاحب کو ابّا جان کہتی تھیں۔ اس شاہی پردہ کے سماں کو جس طرح مرزا صاحب نے دیکھا اور باندھا کیا دُوسرا شاعر (جس کو ایسے موقع نصیب نہ ہُوئے ہوں) باندھ سکتا ہے؟ یہ سچ ہے۔ کہ میری پیدائش بھی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے۔ مگر بعض باقیات الصالحات محلات شاہی اور شاہزادیاں جو لکھنؤ میں رہ گئی تھیں۔ مَیں نے اُن کی سواریوں کے اہتمام دیکھے ہیں۔ مرزا صاحب نے کمال کیا ہے کہ وہ سب سماں کھینچ کر دکھا دیا ہے۔ اور پھر اُس کے ساتھ اہل بیتؑ رسالت کی شان پردہ داری کو اُس اعلےٰ درجہ پر قائم فرمایا ہے۔ جس سے زیادہ ترقی خیال میں نہیں آسکتی۔ کہ جناب زینبؑ کے پردہ کا اہتمام خود امام حسینؑ سے بھی منسوب کیا۔ جس سے اُن معظّمہ کی عظمت و وقعت اُس اہتمام پردہ سے بدرجہا زیادہ ہے۔

جس کا اہتمام صرف حضرت عباسؑ سے متعلق ہے۔ اب آپ اپنے اُس فقرہ کو ذرا غور سے پڑھئے۔ کہ "مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں اور نقیبوں اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے"۔ اور مرزا صاحب کی چستی بندش۔ حسن بیان۔ لطف زبان۔ روانی۔ بے ساختہ پن کو اور اُس کے ساتھ مضامین کی بلاغت کو (بے جا طرفداری کی دوربین آنکھوں پر سے ہٹا کر) دیکھئے۔ اور اپنے اس فقرہ کو (جو قدردانان مرزا صاحب کے دلوں پر نشتر کا کام کر گیا ہے) پڑھئے۔ کہ "کلام میر صاحب کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے"۔ ہر چند سخت کلامی کا جواب سخت کلامی مشہور ہے۔ مگر میں مرزا دبیر جیسے فرشتہ خصال خوش اخلاق کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ جن کا یہ قول ہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو — مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اس لئے جواب میں بھی سخت کلامی نہیں کرتا۔ اور صرف اتنا کہتا ہوں۔ کہ جناب مولوی صاحب! جناب مومن دہلوی کے ایک مشہور مصرع پر میں نے مصرع لگایا ہے۔ آپ اس کو با آواز بلند نہیں تو زیر لب ہی پڑھ دیجئے ؎

یہ پہلا بند اس مجموعہ میں کیسا نکل آیا — ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(۵) صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱ پر ایک بند میر صاحب کا "ادنےٰ واعلےٰ کا مقابلہ" سرخی (ہیڈنگ) لکھ کر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ بند میر انیس کا مشہور ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بہت کوشش کی مختلف بحریں اختیار کیں۔ بہت سی نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈیں۔ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ ناظرین میں نے وہ بند مشہور میر صاحب کا بھی اور مرزا صاحب کا ایک بند بھی اُس موقع پر لکھ دیا ہے۔ جو باب مقابلہ کلام انیسؔ و دبیرؔ کا ہے۔ دونوں صاحبوں کے بندوں کے ابتدائی مصرعے یہاں لکھے دیتا ہوں۔ (انیسؔ) کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا۔

(دبیرؔ) ساماں سے کوئی صاحب یہاں نہیں ہوتا۔ دونوں بندوں کو مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اس کی تو بحث مجھ کو نہیں ہے۔ کہ کس کا بند بہتر ہے۔ مَیں مرزا کا بند بہتر بتاؤنگا۔ ممکن ہے کوئی صاحب میر صاحب کے بند کو افضل کہیں۔ مگر یہ کہنا مولوی صاحب کا (کہ جواب میں مرزا صاحب نے کوشش کی اور کہا) محض اتہام ہے۔ مَیں ثابت کرتا ہُوں کہ مرزا صاحب کا بند پہلے زمانے کا ہے۔ اور اگر میر صاحب نے بھی اُس زمانے میں فرمایا ہوگا۔ تو وہ مرزا صاحب تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ بند مرزا صاحب نے اُس مرثیہ مشہور میں کہا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ **سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل**۔ اور یہ مرثیہ میر ضمیر مرحوم کے اس مرثیہ کے بعد ہی (عہد محمد علی شاہ میں سنہ ۱۲۵۰ھ کے قریب قریب) کہا تھا ؎ **کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے**۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب کے مطلع سے مرزا مرحوم کا مطلع بھی ملتا جلتا ہُوا ہے۔ اور میر ضمیر صاحب نے اس مرثیہ آخرالذکر میں سنہ تصنیف مقطع میں کہدیا ہے۔ ؎

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبیؐ کے
سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجر نبویؐ کے

پس مرزا مرحوم کا مرثیہ بھی سنہ ۱۲۴۹ھ یا سنہ ۱۲۵۰ھ کا ہے۔ اور میر انیس صاحب (سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے عہد امجد علی شاہ شروع ہوتا ہے) سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں یا اُس کے بعد لکھنؤ میں آئے۔ بعد اُس کے اُن کے جا بجا لکھنؤ میں پڑھنے پر اُن کی شہرت ہُوئی۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ مرزا صاحب اُس نظم کا جواب لکھیں۔ جو یا تصنیف نہیں ہُوئی۔ یا اُن تک نہیں پہنچی۔ افسوس۔ مولوی صاحب کس یقین کے ساتھ لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بہت کوشش کی۔ مَیں نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب نے غلط بیانی میں بہت جرأت کی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہُوئے۔

فصل ۶ چوتھا داغ ہوشیاری

چوتھا داغ ہوشیاری کا

ناظرین! دیکھئے۔ مرزا صاحب کے کلام میں جو اصول مقررہ شاعری کے موافق حسن ہے۔ اُس کو کس کس اینچ پینچ سے مولوی صاحب قبیح وعیب ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں +

مبالغہ

(۱) مبالغہ جو ایشیائی ادب و شاعری کا ایک خداداد مسلّمہ حسن ہے۔ اُس کی نسبت صفحہ ۷۷ و ۷۸ میں ابو نواس شاعر کا یہ مصرع لکھ کر ؎ یا امین اللہ عش ابدا (اے خدا کے امین تو ہمیشہ زندہ رہ) ابن قدامہ کا قول نقد الشعرا سے نقل کیا ہے۔ کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے یہ مبالغہ معیوب ہے۔ آگے بڑھ کر فرماتے ہیں۔ کہ میر صاحب نے بھی یہی روش اختیار کی۔ لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی و اعتدال تھا۔ اس لئے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور یہی بات ہے۔ جس کی بنا پر اُن کے حریف کہتے ہیں۔ کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مَیں عرض کرتا ہُوں۔ کہ ایک ابن قدامہ کے قول کو لے کر ہم کیا چاٹیں۔ تمام عرب و عجم کی شاعری مبالغہ سے پٹی پڑی ہے۔ کم سے کم لاکھوں شاعروں میں سے کوئی دو چار ہی شاعر ہم کو ایسے بتا دیں۔ جو مبالغہ کو استعمال نہ کرتے ہوں۔ بعض صاحب بھاشا کی شاعری کو اس بنا پر سراہتے ہیں۔ کہ اُس میں تشبیہات و استعارات و مبالغہ نہیں ہوتا۔ بیشک بھاشا کی شاعری کو مَیں بھی ایک حد تک پسند کرتا ہُوں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہُوں۔ کہ جس طرح واقعہ کو سادہ سادہ صاف صاف بیان کر دینا ایک ہنر ہے۔ اُسی طرح بلکہ اُس سے بڑھ کر تشبیہات و استعارات و مبالغہ معقول و مقبول کے ساتھ بیان کرنا مستحسن ہے۔ جو لوگ بھاشا کی شاعری پر

بھاشا و سنسکرت

مٹے ہوئے ہیں۔ اُن کی یہ مثال سمجھئے۔ کہ ایک خوبصورت لونڈی پر جان دیتے ہیں۔ اور ایک حسین نازک اندام خوش لباس بی بی کو گویا چھوڑتے ہیں۔ وہ حسین بی بی کون ہے؟

سنسکرت

بھاشا کے مقابلہ پر سنسکرت علمی زبان کی شاعری ہے۔ جس میں تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ مبالغہ کی اسی طرح بہتات ہے۔ جس طرح عربی و فارسی میں افراط ہے۔

مبالغہ کی ضرورت و خوشنمائی

اور مبالغہ اس لئے خوش نما ہوتا ہے۔ کہ کلام میں زور آ جاتا ہے۔ اور سامع کا ذہن اُس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو زیادہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مبالغہ وغیرہ کی جس قدر چاہیں مذمت کریں۔ کہ ہر شخص کی زبان اُس کے اختیار میں ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ ایشیائی شاعری کا دارومدار تخئیل و مبالغہ و استعارہ و تشبیہ پر ہے۔ نظم پر کچھ منحصر نہیں۔ نثر کا بھی یہی حال ہے۔ اور اس سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔

مبالغہ متضمن انجیل شریف

جن کو کروڑوں آدمی خدا کی مقدس کتابیں سمجھ رہے ہیں۔ مَیں اس موقع پر انجیل کی ایک مشہور آیت پیش کرنا چاہتا ہُوں۔ اور مناسب سمجھتا ہُوں۔ کہ خود مولوی شبلی صاحب کی زبان سے کہواؤں (جو مبالغہ کو سلامت روی و اعتدال کے خلاف سمجھ رہے ہیں) تا کہ اس مصرع مشہور کا مصداق ہو جائے ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ وہ آیت مولوی صاحب نے سوانح مولانا روم کے صفحہ نمبر ۹ پر ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے "یہ مضمون کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے۔ اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں۔ اخلاق کا متداول مسئلہ ہے۔ انجیل میں اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ "اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر نہیں دیکھتا"۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ آدمی کی آنکھ میں شہتیر ہرگز نہیں سما سکتا۔ مگر غرض اس مبالغہ سے یہ ہے۔ کہ سامع یا ناظر کے دل پر اثر ہو۔ اور وہ سمجھے۔ کہ ہمارا بڑا عیب جو بمنزلہ شہتیر ہے۔ ہم کو نہیں دکھائی دیتا۔ دُوسروں کا ذرا سا عیب بہت بڑا معلوم ہوتا ہے"۔

قرآن شریف

اب دیکھئے۔ قرآن شریف کو جو ہم مسلمانوں کا دین و ایمان ہے۔ اُس میں ایک

آیت ہے - مُوتُوا بِغَیظِکُم جس کے ظاہری معنی یہ ہوئے - کہ تم اپنے غیظ و غصہ میں مر جاؤ - ظاہر ہے - کہ غصہ سے کوئی مر نہیں جاتا - مقصود صرف اثر پیدا کرنا ہے - کہ کیسا ہی سخت غصہ کرو - جو تم کو ہلاکت کے قریب پہنچا دے - پس مبالغہ کو خلاف واقع و کذب سمجھنا یا کہنا خود خلاف واقع و کذب کہنا ہے - اور جو لوگ کسی ایسی کتاب آسمانی کے قائل ہو کر ہر مبالغہ کو خلاف واقع و کذب وغیرہ کہتے ہیں - اُن کو یاد رہے - کہ اُن کا اعتراض بہت دُور تک پہنچتا ہے - البتہ شاعر کا سلیقہ اس میں ہے - کہ وہ مبالغہ کو عمدہ طریقہ سے استعمال کرے - ازبسکہ ہمارے مرزا مرحوم کے کلام میں یہ صنعت مبالغہ اور قوت تخئیل بہت بڑھی ہُوئی ہے - اس لئے مولوی صاحب نے مبالغہ و خیال بندی کو اس مکروہ پیرایہ میں اس کتاب موازنہ میں بیان فرمایا ہے - تخئیل سے بھی خدا کی کتاب خالی نہیں ہے - اس آیت کو لیجئے - طلعہا کانہ رؤس الشیاطین - جس کے ظاہری معنی یہ ہیں - کہ پھل اُس (زقوم) کے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر - یہ تخئیل نہیں تو اور کیا ہے - ورنہ شجر زقوم میں شیطانوں کے سر لٹکتے ہوئے کس نے دیکھے ہیں - اس کی مفصل و مدلل بحث جناب مفتی میر عباس صاحب طاب ثراہ نے کتاب مستطاب بناء الاسلام میں لکھی ہے - مَیں نے اس موقع پر اُس کا خلاصہ لکھ دیا - کہ یہ کتاب طولانی ہوتی جاتی ہے - ورنہ بہت کچھ لکھ سکتا تھا - تخئیل کی تعریف خود ہمارے شفیق مولوی شبلی صاحب نے بھی فرمائی ہے - مگر موازنہ میں وہ ایسی تعریف کرتے - تو غضب ہو جاتا - کہ مرزا دبیر اس صفت خاص میں جو شاعری کی جان ہے میر صاحب سے بہتر ثابت ہوتے - تخئیل کی تعریف مولوی صاحب نے سوانح مولانا روم کے صفحہ ۱۴۲ پر ان الفاظ میں فرمائی ہے "عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ (قیاس تمثیلی) ہے - استدلال تمثیلی کے لئے تخئیل کی بڑی ضرورت ہے - جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے - مولانا روم کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے - وہ یہی قوت تخئیل ہے" - مَیں کہتا

کلام دبیر و مبالغہ و تخئیل

تشبیہ

ہُوں۔ کہ کم سے کم (آنچہ برخود بپسندی بر دیگرے بپسند کی بنا پر) اگر اسی قوت تخیل کو کلام مرزا مرحوم سے موازنہ میں مولوی صاحب دکھا دیتے۔ تو بھی اُن کا موازنہ (شاید) میزان انصاف (عام لوگوں میں) سمجھا جاتا۔ آخر کیا وجہ کہ جو بات مولانا روم کے لئے طرہ تاج ہو۔ وہ مرزا مرحوم کے واسطے باعث فخر و دلیل کمال نہ ہو۔ اور سلامت ردی و اعتدال کے برعکس قرار دی جائے۔ ع اے عدالت اسے کیا کہتے ہیں؟

اعتراض ۳ پہلوان۔ کوہ گھوڑا۔ کبک دری

(۲) صفحہ ۲۸۳ پر میر صاحب کے دو مصرع (۱) گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا (۲) گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔ لکھ کر یہ لکھا ہے۔ کہ دیکھئے ہر موقع پر گھوڑے اور سوار کی تشبیہ کیسی اچھی نظم کی ہے۔ پھر عنان عنایت مرزا صاحب کی جانب (مولوی صاحب نے) معطوف فرمائی ہے۔ یہ بیت لکھ کر ؎

وہ رخش یہ یا دیو تھا اسوار پری پر   غل رن میں اُٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

فرماتے ہیں۔ کہ کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔ دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضائقہ نہیں۔ لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہے۔

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ مولوی صاحب! آپ نے بھی ملک **عرب** کی سیر کی ہے۔ کچھ حصہ **عراق** عرب کا مَیں نے بھی دیکھا ہے (جہاں کے عراقی گھوڑے مشہور ہیں)۔ **فرمائیے کیسے دُبلے۔ پتلے۔ خوبصورت گھوڑے** ہوتے ہیں۔ اُن کو **کبک دری** اور **پری** سے اور قوی ہیکل پہلوان سوار کو **دیو** اور **پہاڑ** سے تشبیہ دینا کیسی معقول **تشبیہ** (مع مبالغہ) ہے۔ اور جب گھوڑا کبک دری اور سوار کوہ ہُوا۔ تو ضرور یہ کہا جائیگا **کہ کبک دری پر کوہ** چڑھا مطلب یہ ہے۔ کہ کوہ پر کبک دری ہُوا کرتا ہے۔ مگر اُس موقع پر اُلٹی بات نظر آتی تھی۔ **آپ کے سر کی قسم** تشبیہ نہ بیہودہ ہے نہ مہمل۔ بلکہ **صنعت تضاد** ہے۔ جہاں تک جناب کا ذہن نہیں پہنچا۔ یہ ایشیائی ادب و شاعری کی جان ہے۔ آپ بیہودہ فرماتے ہیں۔ خدا سمجھے۔ مَیں نہ آپ کو بیہودہ نہ آپ کے ارشاد کو مہمل کہونگا۔

عرب و عجم و ہندی و اردو کے شاعروں کے کلام ایسی تشبیہات اور ایسے الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اگر یہی جرم ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے بھی ایسی تشبیہ مع مبالغہ نظم فرمائی۔ تو اس کا جواب نہیں ٭

(۳) لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایک مضمون نکال لینا ایشیائی ادب میں (ایک) کمال کی دلیل اور صنعت مقبول ہے۔ عکس اس صنعت کا نام ہے۔ جیسا کہ صنائع و بدائع کے بیان میں مَیں بیان کر چکا ہُوں۔ اس صنعت میں (۱) یہ آیت قرآن شریف کی پائی جاتی ہے۔ یُخرِجُ الحیّ من المیّت ویُخرِجُ المیّت من الحیّ ٭ اس میں حیّ و میّت کے اُلٹ پلٹ سے دُوسرا جملہ پیدا فرمایا ہے۔ (۲) ایک فقرہ امام حسنؑ کا مشہور اور کتبِ احادیث و تواریخ میں مسطور ہے۔ کہ جب اُن جناب کی سخاوت و بخشش کا شہرہ سُن کر معاویہ ابن ابوسفیان نے اُن کو ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ لا خیر فی الاسراف (فضول خرچی میں بہتری نہیں ہے)۔ تو آپ نے بلاغت و فصاحت کا کمال دکھایا۔ کہ انہیں الفاظ کو معکوس فرما کر اس جملہ کے برعکس مضمون جواب میں ادا فرمایا۔ وہ جملہ معکوسہ یہ ہے۔ لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْر (خیرات میں فضول خرچی نہیں ہے)۔ ایران و ہندوستان کی شاعری بھی محمدؐ و آل محمدؑ کے تصدق سے اِس پیاری صنعت سے خالی نہیں ہے۔ مَیں اس موقع پر صرف ہندوستان کے تینؔ مشہور شاعروں کے تینؔ شعر پیش کرتا ہُوں۔ جو اپنے اپنے رنگ و بندش و مضمون میں لاجواب ہیں۔ اور جن میں الفاظ کو اُلٹ پلٹ کے مضمون نکالا ہے۔ (۱) دبیر الملک حضرت غالب (۲) خاقانی ہند ذوق (۳) شاعر آل محمدؑ دبیر۔ مرزا غالب مرحوم کا (فارسی میں) اس صنعت میں مشہور شعر ہے۔ جو مجھے بہت

عکس و تبدیل

ارشاد جناب امام حسنؑ

٭ زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے خدا پیدا کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے ٭ ۱۲ مؤلف حقیر

جناب غالب

پسند ہے۔ وہ یہ ہے ۔؎

یار دشتنبو بدستم داد و دستم بو گرفت ٭ وہ چہ دستنبو کہ دستم بو زدستنبو گرفت

ازبسکہ ن ب کے پاس پاس آنے سے میم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جیساکہ انبیا۔ عنبر۔ منبر۔ انبار کو امبیا۔ عمبر۔ ممبر۔ امبار لوگ پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر ۵ جگہ پر دستمبو پڑھنے سے الفاظ کے (عکس و تبدیل سے) لطف پیدا ہوگیا جس کی خوبی صحیح المذاق سامع سمجھ سکتا ہے۔ دُوسرا شعر جناب ذوق کا (اُردو کا) سُنئے ۔؎

جناب ذوق

بے محبّت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے ٭ بے شکایت نہیں اے ذوق محبّت کے مزے

یہ شعر بھی اس صنعت میں اعلےٰ درجہ کا ہے۔ لفظوں کے اُلٹ پھیر نے لفظوں کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور حقیقت میں شکایت دوست کی کی جاتی ہے۔ دشمن سے کیا شکایت۔ جیسے کہ مَیں جناب شمس العلماء مولوی شبلی صاحب سے دوستانہ شکایت کر رہا ہوں۔ کہ اُنہوں نے جناب مرزا مرحوم کے شعر تحت کو جو اسی صنعت میں ان دو شعروں کی طرح لاجواب ہے۔ گورکھ دھندہ بتا دیا۔ وہ شعر یہ ہے ۔؎

حضرت جبرر ؟

انصاف کہاں ہے ہو کہ دل صاف نہیں ہے ٭ دل صاف کہاں ہے ہو کہ انصاف نہیں ہے

دیکھئے کتنا پاکیزہ اور سچّا مضمون انصاف و دل صاف کے الفاظ کو اُلٹ پلٹ کرکے نکالا ہے۔ جس کا مزہ زبان و دل سے لے رہے ہیں۔ وہ زبان و دل جو تعصب (بیجا طرفداری) سے پاک و صاف ہیں۔ مولوی صاحب اُس ہنر کو جو تمام شعرا کے لئے قابل تحسین ہے۔ مرزا مرحوم کے واسطے عیب و قابل نفرین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صفحہ ۲۹۴ پر فرماتے ہیں۔ کہ ”مرزا صاحب نے میر صاحب کے اس شعر کو (؎

عالم ہے یکسر کوئی دل صاف نہیں ہے ٭ اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے)

لفظوں کو اُلٹ پلٹ کیا ہے۔ لیکن کس بُری طرح سے کہ محض گورکھ دھندہ رہ گیا ہے“

مَیں کہتا ہُوں۔ واہ مولوی صاحب! اس جرأت اور اس دعوے پر آفرین

٭ مگر مجھے اب تک یہ شعر کلیات غالب مرحوم میں نہیں ملا۔ شاید ذوق کا نہ ہو۔ اور کسی کا ہو جو ۳۰ ثابت ہے۔

ہزار آفرین ہے۔ آپ ایسی صنعت کو ایک تو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں۔ دُوسرے میر صاحب کے اُلٹے ہُوئے لفظ۔ کیا آپ کو وحی ہُوئی ہے۔ کہ میر صاحب نے یہ شعر پہلے کہا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی الہام ہوگیا۔ کہ وہ مرزا صاحب نے سُنا بھی تھا۔ اگر واقعات کی بنا پر قیاس کو قائم فرمائیے۔ تو بالکل آپ کے دعوے کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ یعنی مرزا مرحوم کی شاعری و شہرت میر صاحب پر مقدّم ہے۔ غالباً یہ شعر بھی اُنہوں نے پہلے کہا ہوگا۔ اگر یہ قیاس صحیح نہ مانا جائے۔ تو یہ مانا جائیگا۔ کہ نہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا شعر سُنا نہ برعکس۔ آپ کس کس تدبیر و ترکیب سے مرزا صاحب کے حسن کلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ وہ کمال ہے۔ جو کسی کے مٹائے سے نہیں مٹ سکتا۔ اور اُس شاعر آلِ محمدؐ (دبیر) کی زبان فال (اور سچی پیشنگوئی) آج زمانے پر ثابت ہو رہی ہے (وہ فال زبان یہ شعر اُن کا ہے)۔ ع

مَیں ہُوں نہ ہُوں جہاں میں رُتبہ بڑھے مرا — انصاف ملکِ نظم میں کلمہ پڑھے مرا

واقعی آج ملک نظم میں خود انصاف کلمہ پڑھ رہا ہے۔ (دبیر) ع

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے — انصاف تو کہتا ہے خداوند یُوہیں ہے

اعتراض ۴ — فصیح و ثقیل — وعدہ خلافی

(۴) مولوی صاحب موازنہ کے صفحہ ۲۲ پر یہ دعوے کرتے ہُوئے (کہ میر انیس مرحوم مرزا دبیر مغفور سے زیادہ فصیح الفاظ لاتے ہیں۔ اور مرزا صاحب غریب و ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں) لکھتے ہیں۔ کہ ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ وعدہ تو یہ کیا تھا۔ کہ بالمقابل دونوں کاملوں کے شعر لکھینگے۔ مگر اس ہوشیاری اور وعدہ خلافی کی شان کو دیکھئے۔ کہ ایک ایک مصرع لکھ کر رہ گئے۔ ناظرین! آپ کو معلوم ہے۔ کہ مصرع کو کوئی شخص شعر نہیں کہتا۔ ہوشیاری یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایسا نہ ہو۔ دُوسرا مصرع مرزا صاحب کا زیادہ فصیح ہو۔ تو دعوے خاک میں مل جائے۔ مگر خدا کی شان دیکھئے۔ کہ جو مصرع پیش کئے ہیں۔ اُن میں بھی اتفاق سے کوئی مصرع ایسا نہیں ہے۔ کہ جو ایک

بزرگوار (کے مصرع) کو دُوسرے (کے مصرع) پر ترجیح دی جائے۔ نہ مرزا مرحوم کے مصرعوں میں کوئی لفظ غریب ثقیل ہے۔ میں وہ مصرع ذیل میں مع رائے لکھتا ہوں:۔

نمبر	مصرع	مختصر رائے
۱	میر صاحب سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں مرزا صاحب کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	میر صاحب کا مصرع غلط لکھا ہے۔ اصلی مصرع یہ ہے ع سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں مطلب جُدا جُدا ہے۔ اس لئے نہ موازنہ صحیح ہو سکتا ہے۔ نہ کسی کے یہاں کوئی لفظ ثقیل و غیر فصیح ہے۔ مفصل بحث دُوسرے موقع پر میں لکھ چکا ہوں +
۲	میر صاحب آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو مرزا صاحب آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو	الفاظ ہمیشہ وزن بحر کے تابع ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعوں کی بحریں مختلف ہیں۔ جو الفاظ جس بحر کے لئے مناسب تھے۔ وہ ہر ایک کامل لایا ہے۔ الفاظ دونوں کے فصیح ہیں۔ مرزا کے مصرع میں مردم کے دو معنی ہیں۔ (۱) گروہ انسان۔ (۲) پتلی کے۔ یہ مزید خوبی ہے +
۳	میر صاحب حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے مرزا صاحب رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں	اس میں بھی اختلاف بحر ہے۔ میر صاحب کے یہاں خواب و رویا کے الفاظ میں رعایت ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں ایک ہی لفظ رویا دو معنی پر آیا ہے۔ یہ صنعت ہے۔ ایک رویا بمعنی خواب دُوسرے گریہ کرنے کے معنی پر۔ الفاظ دونوں کے فصیح و سلیس ہیں +
۴	میر صاحب جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے مرزا صاحب جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں	دونوں مختلف البحر ہیں۔ اور ایک حرف بھی ثقیل نہیں۔ اس کی بحث مفصل میں نے دُوسرے موقع پر کی ہے۔ اور تمام بند لکھ کر کلام مرزا کی خوبیاں سمجھائی ہیں۔ میر صاحب کے مصرع کو بھی مولوی شبلی صاحب پڑھ سناتے۔ تو میں اس کی خوبیاں بھی یُوں ہی سمجھا دیتا +

(۵) مولوی شبلی صاحب نے صفحہ ۵۶ و ۵۷ و ۵۸ پر اور اس کے علاوہ موازنہ میں جابجا بلاغت وصنائع وبدائع اور واقعات کو تصویر کھینچ کر تقریر میں دکھانے کا بیان کیا ہے۔ جس کی تمام عبارت کے نقل کرنے میں طول ہوگا۔ اس لئے سب کا خلاصہ لکھتا ہوں (۱) استعارہ وتشبیہ اصل شاعری سے خارج ہیں۔ اگر بے تکلفی سے نیچرل (قدرتی) حالت میں آجائیں۔ تو زیور کا کام دیتے ہیں۔ (۲) صنائع وبدائع بھی اگر بے تکلفی سے آجائیں۔ تو حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ ورنہ شاعری ونثاری کا دیباچہ زوال ہیں۔ (۳) تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بلاغت سے تو متعلق ہیں۔ مگر شاعری سے نہیں۔ (۴) شاعری انسانی جذبات یا احساسات کا نام ہے * میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی یہ رائے کہ "تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بے تکلفی سے آئیں۔ ورنہ دیباچۂ زوال نظم ونثر ہیں" میرے نزدیک درست اور قابل قدر ہے۔ بیشک اگر بے تکلفی و متانت سے یہ چیزیں نہ آئینگی۔ تو دیباچہ زوال شعر وسخن ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ استعارے اور تشبیہوں وغیرہ کے لئے نیچرل رہنا ضرور ہے (فوق عادت بشری نہ ہوں)۔ اس کو مَیں نہیں مانتا۔ ورنہ تمام ایشیائی شاعری ونثاری بلکہ بات چیت کرنے سے بھی دست بردار ہونا پڑیگا۔ اور ایسی باتوں سے وہ کلام بھی بھرے پڑے ہیں۔ جن کو کروڑوں آدمی کلام خدا کہتے ہیں۔ جیسا کہ مَیں اسی کتاب میں ایک جگہ بحث کرچکا ہوں۔ اور بائبل کی مشہور آیت خود مولوی شبلی صاحب کی کتاب سوانح مولانا روم سے لکھ چکا ہوں۔ ("اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کی پھُلی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا")۔ اگر فوق عادت بشری نہ ہونے کا نام ہی شاعری ہے۔ تو یا تو ایسے تمام کلام کو خلاف بلاغت ماننا پڑیگا۔ یا کوئی صاحب (جو اس کے مدعی ہوں) کسی ہی آنکھ والے کی آنکھ میں شہتیر داخل کرکے مجھے آنکھوں سے دکھادیں۔ تو مَیں گویا ایمان لے آؤنگا۔ ایسے استعارات وتشبیہات زیور سخن نہیں۔ بلکہ حسن خداداد عروس سخن

عنوان ۵ استعارہ وصنائع وغیرہ

تشبیہات وغیرہ نیچرل

وجدان و تخئیل

صنائع و بدائع لباس سخن

نظیر اکبر آبادی

ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جو چیزیں (صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات) بلاغت
سے متعلق ہیں۔ وہ شعر سے کیوں متعلق نہیں ہیں۔ اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے۔
تو شعر خود ہی ایک صنعت ہے۔ اگر شعر بے بلاغت ہے۔ تو وہ **محض تک بندی**
ہے۔ **بلاغت اصل شئے ہے**۔ اُسی کا ایک جزو اعظم **تخئیل و وجدان**
ہے۔ جس کو مولوی صاحب نے **انسانی جذبات یا احساسات** کے لفظ سے یاد
کیا ہے * خیر اب یہ سمجھئے۔ کہ صنائع و بدائع وغیرہ عروس سخن کے لئے حسن خداداد
ہے۔ اگر اس سے تنزل کیا جائے۔ تو اس کو **عروس سخن کا نفیس لباس** کہنا
چاہئے۔ یہ تو ممکن ہے۔ کہ کوئی غریب اپنی دختر حسین کو اپنی مفلسی کی بدولت جہیز
میں زیور نہ دے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ **بغیر لباس** کے وہ لڑکی کو نکاح پڑھا کر
داماد کے حوالے کر دے۔ یہی مثال صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات کی سمجھئے۔
اگر کسی شاعر نے واقعات کی تصویر سادے الفاظ میں کھینچ دی ہے۔ تو اُس کی یہی مثال
ہے۔ کہ ایک حسین عورت ہے **مگر برہنہ**۔ جس سے اُس کا رنگ و حُسن سب خاک
میں مل گیا ہے۔ اور وہ آٹھ آٹھ آنسو رو کر زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے سہ بے زری
کرد بمن آنچہ بقارون زر کرد۔ اس موقع پر ایک نکتہ باریک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے
کہ **نظیر** مرحوم (اکبر آبادی) کو نئی روشنی کے بعض اہل علم بے مثل شاعر
مانتے ہیں۔ **مگر ایشیائی شعراء اُن کو شعراء کاملین** کے زُمرے سے خارج
جانتے ہیں۔ اس کی وجہ وجیہ یہی ہے۔ کہ اُن کے کلام میں صنائع و بدائع و حسن
تشبیہات و استعارات نہیں ہے۔ صرف نیچرل (قدرتی) رنگ کی تک بندی
ہے۔ اور کہیں کہیں ابتذال بھی بتایا جاتا ہے۔ ازبسکہ انگریز غیر ملک کے
رہنے والے ہیں۔ اس لئے ابتذال (زبان اردو) کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔
اُنہیں کی تقلید سے ہمارے ملک کے بعض اہل علم ہاں میں ہاں ملاتے

ہیں*۔ دیکھئے سید انشا بھی نظیر مرحوم کی طرح جابجا ایسے گُل کھِلاتے ہیں۔ اُن کی نسبت یہ تو بعض شعرائے کہدیا۔ کہ طریقہ راسخہ شعرا کے موافق اُن کا کلام نہیں ہوتا۔ مگر شعرا کاملین کے زُمرے سے اُن کو کسی نے خارج نہیں کیا۔ وجہ یہی ہے۔ کہ اُن کے یہاں یہ سب یا اکثر صنائع و بدائع وتشبیہات وُغیرہ موجود ہیں۔ اور ابتذال سے پرہیز کرتے ہیں بہرحال مولوی شبلی صاحب نے یہ تمام کوششیں اس غرض سے کی تھیں۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں جو صنائع و بدائع وتشبیہات واستعارات اعلےٰ درجہ پر ہیں۔ وہ اصل شاعری ہی سے خارج ہو جائیں۔ مگر الحمد للہ کہ اُن کی سعی مشکور نہیں ہُوئی۔ اور سخن شناسوں کے نزدیک یہ چیزیں شاعری سے خارج نہ ہوئیں۔ اور نہ انشاء اللہ اُس وقت تک خارج ہونگے۔ کہ جب تک یہ تمام کتابیں معانی و بیان کی دریا برد کردی جائیں۔ اور اگر یہ (معانی و بیان کی) کتابیں بھی بفرض محال نیست و نابود ہو جائیں۔ جب بھی وہ کتابیں نہ مٹینگی۔ جو الہامی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور اُن میں یہ صنائع و بدائع وتشبیہات واستعارات موجود ہیں۔ پس کلام دبیر مرحوم گویا زبان حال سے یہ مصرع (دبیر مرحوم کا) پڑھ رہا ہے۔ ع قرآں مٹے کسی کے مٹائے تو ہم مٹیں +

سید انشاء

* یہ تقریر عام شعرائے اردو کے مذاق کے موافق ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ابتذال میں بھی نظیر مرحوم ایک حد تک قابل معافی بلکہ لائق مدح ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ جب وہ ایک بازاری واقعہ یا بات لکھ رہے ہیں تو پھر بازاری محاورے لانا مقتضائے حال کے موافق ہے اور اس رائے پر ایک جز و بلاغت ہے مثلاً ع پھر ہم بھی چلے اور چلا ریچھ کا بچہ۔ اسمیں ریچھ کے بچے کے رکھنے والے اور بازاری آدمیوں کے محاورے جو اُن کے قول لانا ایک خوشنما ادا ہے بعض شعرا اعتراض فرماتے ہیں کہ نظیر نے باغ کو چھوڑ کر گویا گھورے کی (جہاں کوڑا پڑا رہتا ہے) تصویر اُتاری ہے بے سلیقہ بات ہے میں کہتا ہوں کہ جس طرح مصور کبوتر اور طاؤس کے ساتھ اُلّو اور چیل کی بھی تصویر اُتارتا ہے اور قابل مدح سمجھا جاتا ہے اُسی طرح اگر ایک شاعر نے نفیس مقدس مقامات و اشخاص کے واقعات کو چھوڑ کر خرابات اور خراب آدمیوں کے حالات بھی آئینہ کر کے دکھا دئے۔ تو کیا برائی ہے بلبل کے بچے کا تو تمام شعرا بہت نام لیتے ہیں کوئی بیچارہ ریچھ کے بچہ کا بھی ذکر کرے اور بازاری غریب آدمیوں کا مذاق بھی نظم کرے یا نہیں۔ گھورے کی تصویر اُتار نیوالا شاعر بھی شاعر ہی رہتا ہے جس طرح مصور باغ بھی مصور ہے اور مصور مزبلہ (گھورے) کا بھی مصور ہی کہلائیگا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۱ سخت کلامی اور چندرانے اور بنانے کا داغ

پانچواں داغ

یہ کیچڑ کا دھبہ نہیں ہے۔ بلکہ سخت کلامی اور بنانے اور چندرانے کا داغ ہے۔ بقول حضرت آتش مرحوم سے

نہ چھوٹیگا چھڑا اگر اس کو اے قاتل نہ بن لڑکا ۔۔۔ وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبہ ہے کیچڑ کا

اعتراض مولوی شبلی صاحب

(۱) صفحہ ۲۴۴ پر بند ذیل مرزا صاحب کا (موازنہ میں) مولوی شبلی صاحب تحریر فرماکر

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل ۔۔۔ لیکن سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل

رضواں کو جنت۔ یہ چمن ہے مرے قابل ۔۔۔ موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے ۔۔۔ مضمون مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے

فرماتے ہیں۔ (۱) سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے۔ (۲) رضواں کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل۔ ناموزوں ترکیب ہے۔ یا یوں ہونا چاہئے تھا۔ کہ رضواں کو جنت چاہئے اور مجھ کو یہ چمن۔ یا یوں کہ رضواں کے قابل جنت۔ میرے قابل یہ چمن ہے۔ (۳) چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے۔ (۴) بیت کے دونوں مصرع قریباً باہم تناقض ہیں۔ شہرہ بھی انتہا کا ہے۔ اور مضمون کو گھر تک پہنچنے کی بھی ضرورت ہے۔ (۵) شاید یہ مراد ہو۔ کہ صرف نام مشہور ہوچکا ہے۔ لیکن چونکہ مضامین کو مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی۔ اور آستانہ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔

جواب

مولوی صاحب کی عبارت پر مَیں نے ۵ نمبر لگا دئے ہیں۔ کہ مَیں جواب نمبروار عرض کروں۔ اور ناظرین کو جواب دیکھنے کے وقت آسانی ہو۔

سخن شہرہ فگن

(۱) "سخن شہرہ فگن"۔ اوّل تو یہ مرکب الفاظ ممکن ہے کہ مرزا مرحوم سے پہلے کسی کے کلام میں ڈھونڈھنے سے مل جائیں (جس کی مجھے فرصت نہیں)۔ بالفرض مرزا صاحب ہی نے پہلے پہل ان کو مرکب فرمایا۔ تو کون سا جرم کیا ہے۔ جتنے مرکب الفاظ آج کتابوں میں نظر آتے

ہیں۔ پہلے پہل کسی نہ کسی نے ترکیب نئے ہونگے۔ اگر جدّت ہے تو یہ قابل مدح ہے۔ علم معانی و بیان یا صرف و نحو کے اُصول کی رُو سے کوئی اعتراض ہوتا ہو۔ تو فرمائیے* +

حذف

(۲) رضواں کو جنّت الخ۔ اس میں "چاہئے" کی لفظ محذوف ہے۔ ہر شاعر (ذیعلم) کبھی کبھی بعض الفاظ شعر میں محذوف کر دیتا ہے۔ جس کو صحیح المذاق سامع قرینہ و عقل سے سمجھ لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو پھر نظم و نثر میں فرق ہی کیا رہے۔ میں اس موقع پر زیادہ نہیں دو شعر مثلاً جناب **غالب** مرحوم کے لکھتا ہوں۔ (۱) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے" ہزاروں خواہشیں ایسی" کے بعد یہ الفاظ "**دل میں تھیں**" محذوف ماننا پڑینگے۔ ورنہ دُوسرا مصرع سمجھ میں نہ آئیگا +

حضرت غالب

جناب حالی

دُوسری مثال حذف الفاظ کی مَیں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب **حالی** کی کتاب یادگار غالب صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳ سے لکھ دُوں۔ کہ اس زمانے میں **من قال** کے قدر شناس بہت کچھ ہیں۔ **ما قال** کے بہت کم۔ اور حق یہ ہے۔ کہ **خواجہ حالی** صاحب مولوی شبلی صاحب کی نسبت شعر کا مطلب اچھا سمجھتے ہیں +

عبارت خواجہ حالی صاحب۔ "مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دور جام۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ اِس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی"۔ اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو۔ اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں۔ وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں۔ محسّنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے" +

ناظرین انصاف پسند! انصاف سے فرمائیگا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مصرع میں

*علماء و شعرائے یورپ کے مذاق کے موافق خوش سلیقگی سے پہلے پہل کوئی لفظ مفرد یا مرکب کا استعمال کرنا بھی شاعر کے کمال کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہاں اور اُلٹا اعتراض کیا جاتا ہے ع لے کمال افسوس ہے۔ تجھ پر کمال افسوس ہوتا ہے ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

جو لفظ "چاہیئے" محذوف ہے۔ وہ سخن فہم سامع کی سمجھ میں آتا ہے؟ یا نہیں؟ ضرور سمجھ میں آتا ہے۔ لہذا یہ حذف بھی حُسنِ شعر سمجھا جاتا ہے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب شعر کی خوبی کو زشتی سمجھ رہے ہیں +

(۳) چوتھے مصرع کی ترکیب پر بھی مولوی شبلی صاحب کا یہی اعتراض ہے۔ اور اُس کا بھی یہی جواب باصواب ہے۔ **حقیقتِ حال** یہ ہے۔ کہ اوّل تو مرزا مرحوم نے یہی چاروں مصرع کہے تھے۔ مگر ازبسکہ وہ بڑے انجام بیں شاعر تھے۔ ہر پہلو سے اپنے کلام کو دیکھا کرتے تھے۔ اُن کو بھی یہ خیال پیدا ہُوا تھا۔ کہ **صحیح المذاق** سخن فہم تو اس **حذف** کو محسناتِ شعر سے سمجھیں گے۔ مگر **بلید الذہن** یا **کم فہم** شاید نہ سمجھیں۔ اس لئے پھر اُنھوں نے اوّل کے چاروں مصرعوں کو یوں بدلا:۔

مدّاحیِ سلطانِ زمن ہم کو مبارک	جبریل کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک
رضواں کو بہشت اور یہ چمن ہم کو مبارک	موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک
شہرہ ہے یہ تائیدِ شہِ جنّ و ملک سے	مضمون مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے

چنانچہ یہ مرثیہ شاید ۱۸۸۰ء کے قریب قریب جب میر عابد علی صاحب کے مطبع (حسینی اثنا عشری لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ تو اُس میں یہ بند آخر الذکر یوں ہی طبع ہُوا تھا۔ مجھے یہ واقعہ یوں یاد ہے۔ کہ وہ مرثیہ میر صاحب ممدوح کو چھاپنے کو میں نے ہی دیا تھا۔ اور میرے قلمی مرثیہ میں یہی آخر الذکر چاروں مصرع موجود ہیں۔ بعد کو دفترِ ماتم میں جب چھپا۔ تو وہ پہلے کے مصرع چھپ گئے (جن میں دو جگہ ایک لفظ "چاہیئے" محذوف ہے) + یہ واقعی حال تھا جو میں نے لکھ دیا +

(۴) ٹیپ کے دونوں مصرع باہم ہرگز متناقض نہیں ہیں۔ بیشک **شہرہ** انتہا درجہ کا ہے۔ جو کسی حاسد یا منکرِ کمال کے ٹالنے سے نہیں مٹ سکتا۔ اور پھر مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ جس کا شہرہ ہو۔ اُس کا گھر بھی

حقیقتِ حال ۱۴

۱۵

شہرہ ۱۵ اور گھر پوچھنا

ہر شخص جانتا ہو۔ مشہور شخص کا گھر پوچھتے ہوئے ہی نئے لوگ (شہروں اور ملکوں سے) آتے ہیں۔ یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور روزمرہ میں بولتے ہیں۔ کہ اُس شخص کا ایسا شہرہ ہے۔ کہ دُور دُور سے لوگ گھر پوچھتے ہوئے آتے ہیں۔ مثلاً مولوی شبلی صاحب ہی کو لیجئے۔ کہ اُن کا شہرہ ہے۔ اب جو کوئی اُن سے ملنے آئیگا۔ وہ اوّل یہ لوگوں سے پوچھیگا۔ کہ مولوی صاحب لکھنؤ میں ہیں یا حیدرآباد یا بھوپال میں یا اور کسی مقام مناسب گاؤں وغیرہ میں۔ پھر لکھنؤ وغیرہ میں پہنچ کر محلہ کا پتہ پوچھیگا۔ پھر محلہ میں جا کر گھر پوچھیگا۔ ایمان سے فرمایئے باوصف شہرت کے گھر پوچھنے کی اُس کو ضرورت ہوئی یا نہیں۔ اور شہرت اور گھر پوچھنے میں کونسا تناقض ہو گیا۔ پھر مولوی صاحب ہمارے مرزا مرحوم کی گویا رُوح سے مزاح کرتے ہیں۔ جو فرماتے ہیں۔ کہ "شاید مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے رُوشناسی نہیں ہوئی۔ اور آستانہ مبارک پر پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر پوچھنا پڑا۔"

ناظرین! اب تو مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں ایک شعر آتشیؔ پڑھ دُوں ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب! | زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

مولوی صاحب یہ تو فرمایئے۔ کہ اگر آستانہ مبارک تک مضمون کی رسائی پہلے ہو چکی ہوتی۔ تو پھر اُس کو نیا مضمون کون کہتا۔ ہائے متنبّی ہزار برس پہلے کیا اچھی بات کہ گیا ہے ؎

وَکَم مِن عَائِبٍ قَولاً صَحِیحاً | وَآفَتُہٗ مِنَ الفَہمِ السَّقِیمِ [۲]

اور دلگیرؔ مرحوم نے قریباً سو برس پہلے فرمایا ہے۔ ؎

---

[۱] مرزا صاحب کے معاصرین میں اُن سے بڑھ کر کوئی شاعر مضمون آفرین نظر نہیں آتا۔ ایسے خلاق معانی کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا مزاح سے بھی یہ کہنا کہ "مضامین کو مرزا صاحب سے رُوشناسی نہیں ہوئی" میرے نزدیک بڑی ناانصافی و گستاخی ہے۔ اسی لئے مجبور ہو کر میں نے آتشیؔ شعر لکھا ہے۔ ۱۲ ثابت ہیچمدان۔

[۲] یعنی کلام صحیح کے کس قدر عیب گیر ہیں کہ اُن کی ساری آفت اور خرابی اُن کے ناقص فہم کی بدولت ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

قبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر پر یہاں حسن شناسان سخن تھوڑے ہیں

ہمارے مولوی شبلی صاحب خاص کر مرزا مرحوم کے حسن سخن کو اکثر عیب کلام سمجھتے ہیں۔ افسوس ان کے

خدا معلوم سمجھ ہی ایسی ہے یا کوئی خاص سبب ہے +

تین باتیں

(۲) صفحہ ۳۳۲ تا ۳۴۰ موازنہ میں مولوی شبلی صاحب نے مرزا مرحوم کے کلام میں ثقیل و غریب الفاظ ہونے کا دعوے کر کے ثبوت دعوے میں حسب ذیل مصرع پیش کئے ہیں*۔

ناظرین! میں پہلے اس سے کہ جواب دوں تین باتیں کہدوں۔ جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ (۱) مرزا دبیر مرحوم آج کل کے شاعر نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری کی ابتدا کو آج ۱۳۳۰ھ میں پورے سو برس گذر گئے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ بالاتفاق بھاشا

* مولوی صاحب ان مصرعوں کو جو آئندہ متن میں ہیں نالہ کر لکھتے ہیں یہ سب الفاظ صحیح و عربی و فارسی میں مستعمل بھی ہیں لیکن اردو نظم کی سلاست و روانی انکی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آب حیات سے سُنئے۔ پروفیسر آزاد مرحوم اور بعض تذکرہ نویسوں نے بعض شعرا کی غزلوں لوگوں کا یہ اعتراض بیان کیا ہے۔ کہ اکثر شوکت و اردنی الفاظ لاتے ہیں جنکا تحمل غزل نہیں کر سکتی۔ غزل میں وہ شان رہنا چاہئے جو معشوقوں سے باتوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے مولوی شبلی صاحب از بسکہ ادب اردو سے ناواقف ہیں جیسا کہ میں نے اس کتاب میں ثابت کر دیا ہے انہوں نے یہی اعتراض مرزا مرحوم کے مرثیوں پر کر دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ ایسا اعتراض صرف غزل پر ہو سکتا ہے قصیدہ پر نہیں ہو سکتا! و جب قصیدہ پر نہیں ہو سکتا تو مرثیہ پر کیونکر ہو سکیگا کیونکہ فی زماننا مرثیہ تمام اصناف سخن غزل قصیدہ مثنوی ترجیع بند وغیرہ وغیرہ کا جامع ہے۔ مجھے اس موقع پر ایک نقل یاد آگئی۔ ایک صاحب معمولی پڑھے لکھے تھے۔ مگر بڑے بڑے لفظ بولنے کا شوق تھا۔ ہر مجلس و محفل میں سے دو چار لفظیں اُڑا لاتے تھے۔ ایک شخص کے (جس کا بیٹا مر چکا تھا) گھر پرسا دینے کو پہنچے۔ وہاں ایک اہل علم اس طرح پرسا دیتے دیکھا۔ کہ خدا آپ کو جوان بیٹے کے ماتم میں صبر دے۔ "اور نعم البدل عنایت فرمائے" یہ نعم البدل و الاجملہ وہاں سے اُڑا لائے۔ چند روز کے بعد ایک ایسے شخص کے پاس تعزیت کو گئے جس کا باپ مر گیا تھا۔ انہوں نے یہی جملہ وہاں جھونک دیا۔ کہ "خدا آپ کو صبر دے اور نعم البدل عنایت فرمائے"۔ وہ شخص بُرا بھلا کہنے لگا۔ اور اِن کے علم کی قلعی کھل گئی۔ ہمارے مولوی صاحب معاذ اللہ کم علم نہیں ہیں۔ عالم بلکہ شمس العلما ہیں۔ ان کے کمالات پر علم کلام وغیرہ کی بعض اُن کی کتابیں شاہد عدل ہیں۔ مگر اردو کے علم ادب سے عموماً اور فن مرثیہ گوئی سے خصوصاً وہ ایسے نابلد ہیں جیسے مُلّائے مکتبی کہ جن کی شان میں خاقانی یا کسی ایرانی شاعر کا یہ فقرہ مشہور ہے۔ کہ "یاران شعر مرا بمکتب رسانہ کہ بردند؟" ۱۲ مؤلف حقیر۔

حکایت لطیفہ

ہندی کے الفاظ نکال رہے تھے۔ فارسی وعربی کے الفاظ لا رہے تھے۔ کہ اس کو علمی زبان
بنانا چاہتے تھے۔ پس مرزا صاحب کے یہاں بھی اُن کے تمام معاصرین ذوق۔ غالب۔ مومن۔
ناسخ۔ آتش وغیرہ وغیرہ کی طرح فارسی وعربی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ اور یہ
الفاظ اُس زمانے میں زبان زد ہونے کے سبب سے غریب وثقیل نہیں ہیں۔ (۲)
ہر واقعہ نویس شاعر اور ہر مترجم کو فکر ہوتی ہے۔ اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر ایسے الفاظ
لاتا ہے۔ جو قلیل ہوں۔ اور معنی کثیر پر دلالت کریں۔ (۳) زیادہ تر مرزا مرحوم ایسے
الفاظ اُن مرثیوں میں لاتے ہیں۔ کہ جن میں اُنہوں نے روایتیں نظم کی ہیں۔ نظم روایات
میں اُن کے مرثیوں کی شان مؤرخانہ ہے۔ دیکھئے تاریخوں میں ایسے پھڑکتے ہوئے
الفاظ لانا معیوب ہے۔ جیسے قصہ اور ناول میں آتے ہیں۔ البتہ جو مرثئے مرزا مرحوم کے
قصہ وناول کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کہ یا واقعۂ خیالی ہے۔ یا بہت تھوڑی سی بات
اصل میں ہے۔ اور اُس کو خیالات کے زور سے بڑھایا ہے۔ اُن میں وہ بھی پھڑکتے
ہوئے لفظ لاتے ہیں۔ مثلاً یہ مرثیہ دیکھئے **یہ پرچم ہے کس علم کا شعاع**
آفتاب کی۔ اُس تمام مقام میں جہاں علم کی بابت حضرات عون ومحمدؑ سے شمر کی گفتگو
نظم کی ہے۔ پھڑکتے ہوئے سلیس عام فہم لفظ لائے ہیں۔ اسی طرح ہند وزندان شام کے
حال میں اُن کے جتنے مرثئے ہیں (جو پچاس مرثئے سے زیادہ ہونگے)۔ اور جناب
فاطمہ صغریٰ وشیریں کنیز جناب شہر بانوؑ کے احوال کے مرثیوں میں اور تمام مرثیوں میں،
رخصت وشہادت کے مقامات پر وہ زیادہ عربی وفارسی کے الفاظ نہیں لاتے
ہیں۔ واقعات تاریخی یا علمی باتیں جو شخص لاتا ہے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھتا ہے۔ کہ
آج بھی عربی وفارسی کے الفاظ لائے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ دیکھئے جناب سرسید
اور اُن کے رفیق جناب محسن الملک وغیرہ وغیرہ **تہذیب الاخلاق** کے پرچوں میں کس
کثرت سے فارسی وعربی الفاظ لاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب مضامین مرزا مرحوم کے

لکھے گئے ہیں۔ کہ جس زمانے میں عربی وفارسی کے الفاظ اردو میں کم لانے کا خیال عام طور پر ملک میں پھیل چکا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ کہ بغیر عربی وفارسی کے لفظوں کے مطلب ہی ادا نہیں ہو سکتا تھا +

اِس تمہید کے بعد مرزا مرحوم کے وہ الفاظ جن کو مولوی شبلی صاحب ثقیل وغریب بتاتے ہیں سُنئے :-

الفاظ عربی وفارسی

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱	مستدعیٔ شق القمر اکر ہوئی گمراہ	مستدعی۔ شق القمر۔ دونوں لفظ معمولی ہیں۔ ایک بھی ثقیل وغریب نہیں +
۲	ہر کوہ کی آواز انا الطّور انا الطّور	نہ انا غریب ہے نہ الطور ثقیل ہے۔ یہ تو سب پہاڑوں سے چھوٹا پہاڑ ہے۔ پھر ثقیل کیوں سمجھا جاتا ہے +
۳	النشر کا ہنگامہ ہے اس وقت حشر میں	حشر ونشر دونوں معمولی غیر ثقیل لفظ ہیں۔ حشر بفتحتین عام طور پر بولتے ہیں۔ لغۃً بھی جمع کے معنی پر صحیح ہے۔ وہی مصنّف نے باندھا ہے +
۴	لبیک وسعدیک تھا ورد ملک وحور	لبیک وسعدیک عربی الفاظ زبان ملک وحور سے ادا کئے ہیں۔ یہ کمال بلاغت ہے۔ کہ اہل جنّت کی زبان عربی ہے۔ وہی عربی الفاظ ملک وحور کی زبانی لائے ہیں۔ فردوسیؒ کے اس مصرع پر اعتراض ہوا تھا۔ کہ ع فلک گفت احسن ملک گفت زہ۔ کہ یہ عربی ہے۔ فردوسی نے جواب دیا تھا۔ کہ احسن مَیں نے نہیں کہا آسمان نے کہا۔ اُس کی زبان عربی ہے مَیں عربی لفظ لایا۔ فردوسیؒ نے عربی الفاظ نہ لانے کی شرط کی تھی پھر بھی وہ لائے۔ پھر فردوسیٔ ہند (دبیرؒ) عربی الفاظ کیوں نہ لائیں +
۵	المنتہیٰ یہ ربط یہ ضبط اس وغا میں تھے	الحاصل۔ المختصر۔ المنتہیٰ۔ القصہ یہ سب لفظ اس زمانے میں عام تھے۔ اس لئے المنتہیٰ نہ ثقیل ہے نہ غریب ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۶	خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال ہیں	منتخب آدمیوں میں سے منتخب" کے معنی پر یہ لفظ (خاص الخلاصہ) ہے کوئی سبب ثقالت و غرابت نہیں۔ ثقہ لوگ بولتے ہیں۔ بازاری نہیں ہے۔ اگر شرفا کے الفاظ بولنا جرم ہے۔ تو بیچارے مرزا بھی مجرم ہیں۔ یہ لفظ مرزا مرحوم کے علم و فضل کو ظاہر کر رہا ہے +
۷	یارو سنا مدائح نوشاہ کا بیان	مدائح۔ مناقب۔ اوصاف۔ فضائل یہ سب فصیح لفظ ہیں۔ نہ ثقل ہے نہ غرابت ہے۔ پھر فصیح کیوں نہیں ہیں +
۸	رُخ بیّنۂ صدق کرامات پیمبرؐ	لفظ تو لفظ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۹	مستجمع جمیع فضائل ملک سیر	دیکھیے کتنا بڑا مضمون ان الفاظ کی بدولت ایک مصرع میں آگیا ہے۔ معمولی الفاظ اہل علم کی زبان کے ہیں۔ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۱۰	مستغرقِ رُوحِ اُس نے کیا تب علی و شبیر	اُس زمانے میں ایسے الفاظ عام تھے۔ کوئی ثقیل نہیں ہے +
۱۱	لیکر رطب و لو دوم کہنے لگے شاہ	" " " " " " " " " " " "
۱۲	میدانی و نقیبؔ و عصادار و چوبدار	شاہی چوبداروں کے جتنے اقسام تھے۔ وہ سب ایک مصرع میں جمع کر دئے ہیں۔ اس کمال کی داد دینا تو درکنار اور اعتراض کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی لفظ ثقیل ہے۔ نہ غریب ہے +
۱۳	عرش فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے	نہایت سلاست ہے حضرت سلامت +
۱۴	اک شخص کمر شکی لگا باندھنے خورسند	یہ ناموزونی کی تحت میں مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ میں حیران ہوں۔ کہ اس میں کیا ناموزونی ہے۔ خوش۔ خورم۔ خورسند۔ خوشنود۔ شاد۔ شادماں۔ شاداں۔ یہ سب الفاظ اردو میں مستند و فصیح ہیں۔ بازاری نہیں ہیں +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱۵	اک ڈلو کو بھر دو پانی سے اور ایک رطب لو	"ڈلو" ڈول کے معنی پر ہے۔ اُس زمانے میں ہندی الفاظ لانا غیر فصیح سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اسی وزن پر ڈول بھی ہے وہ عمداً مصنف نہیں لائے۔ رطب لیا لفظ ہے جس کا بدل دُوسرا لفظ فصیح نہیں ہے۔ اگر ڈلو پانی سے بھرا ہو ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو ضعف کا علاج کرنا چاہیئے ✦
۱۶	نوبت زنِ نہ بامِ عروجِ فلکِ پیر	سب الفاظ سلیس و فصیح ہیں چار اضافتیں ایک مصرع میں لانا اُس زمانہ میں بالاتفاق جائز تھا۔ اب بعض شعرا نہیں لاتے بعض اب بھی اسکو جائز سمجھتے ہیں بہرحال مرزا مرحوم پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ✦
۱۷	ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پُرانا	یہ مصرع فہم عالی میں نہ آیا غلط لکھ دیا۔ صحیح یہ ہے ع ملبوس قلمکار نہ دوں۔ ہے یہ پُرانا۔ قلمکار لباس جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اُس کا حُسن بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی لفظ غیر مانوس نہیں ہے۔ سمجھ میں مصرع نہ آیا۔ اعتراض جڑ دیا ✦
۱۸	سر کو عوضِ پا رۂ مدحت میں دھرونگا شرعِ کہنِ ناطقہ منسوخ کرونگا	یہ مصرع بھی مولوی صاحب نہیں سمجھے۔ غلط لکھ دیا اور اعتراض جڑ دیا۔ صحیح یُوں ہے۔ تل کے اُوٹ پہاڑ دیکھئے ع سر کو عوضِ پا رہِ مدحت میں دھرونگا۔ پے الف زبر پَا (پاؤں کے معنے پر)۔ رے زبر رَ۔ ہ زیر ہِ۔ رَہِ۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس راہ مدحت کو میں ادباً بجائے پاؤں کے سر سے طے کرونگا۔ واہ مولوی صاحب آپ بے سر و پا اعتراض فرماتے ہیں۔ خود ٹھوکر کھاتے ہیں۔ دُوسرے پر غُصّہ کرتے ہیں۔ ع آپ ہی ظلم کریں۔ آپ ہی شکوہ اُلٹا کوئی لفظ نامانوس نہیں ہے ✦

مختصر رائے مؤلف حقیر	مصرع	نمبر
صورت - پیغمبر - قوسین - مکان - کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس نہیں ہے +	یہ صورت پیغمبر قوسین مکاں ہے	۱۹
اس شعر میں لف ونشر مرتب ہے - طلعت جلد کو برق شفق سے اور نفس سینہ کو پروانہ بفانوس سے تشبیہ دی ہے - مرزا غالب مرحوم زندہ ہوتے - تو داد دیتے - دقیق کلام کو جس میں اعلیٰ درجہ کی صنعت بھی ہے - مولوی صاحب ناموزون بتلاتے ہیں - جو اُن کی موزونی طبع کی دلیل ہے - یہ ترکیبیں اُس زمانہ میں عام تھیں - غالب - مومن کے دیوان ان ترکیبوں سے بھرے پڑے ہیں +	ہے طلعت جلد و نفس سینہ یہ محسوس وہ برق شفق میں تو یہ پروانہ بفانوس	۲۰
زدوکشت - یک دست - یک مشت - یہ سب الفاظ اردو کے خراد پر اُترے ہوئے ہیں - تیغ ہاتھ میں ہوتی ہے - گرز مٹھی میں پکڑا جاتا ہے - یہ الفاظ عین موقع پر لائے ہیں - بلاغت کی جان ہیں - مگر ع میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے - ایسے الفاظ و ترکیبیں تمام معاصرین دبیر کے یہاں بکثرت ہیں - میر انیس مرحوم بھی فرماتے ہیں - ؎ داغِ گل ریاضِ تمنا بدل قبول مگر مولوی صاحب سب غصہ مرزا صاحب ہی پر اتارتے ہیں - نجانے کیوں اس قدر بھرے ہوئے ہیں +	ناگاہ کھلا دشت میں بازار زدوکشت تیغیں کھچیں یکدست - تلے گرز بھی یکمشت	۲۱
چشم - جراحت - فوت - سب الفاظ بولتے ہیں - ترکیب بھی مانوس ہے +	نے چشم جراحت نہ رہ فوت کو دیکھا	۲۲

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۳	کہتے ہیں جسے عاشقِ شیدا ملک و ناس	یہ مصرع غلط لکھا ہے۔ عاشق و شیدا صحیح ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب واؤ حرف علت، آپ کھا گئے۔ کہیں سچ نقل معدہ کی شکایت نہ فرمائیگا۔ پورا بند پڑھئے۔ تو حسن کلام معلوم ہو۔ کہتے ہیں جسے عاشق و شیدا ملک و ناس + اللہ کے شیر ہیں شبیرؑ کے عباسؑ اُس حسن ارادت سے یہ حضرتؑ کے رہے پاس + جیسا تھا پیمبرؐ کا علیؑ کو ادب و پاس ایمان کو یہ جانتے تھے جان سے پیارا + اور حضرتِ شبیرؑ کو ایمان سے پیارا دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے۔ ایک محمدؐ و علیؑ۔ دوسرے حسینؑ و عباسؑ۔ اس رعایت سے عاشق و شیدا۔ ملک و ناس۔ جان و ایمان کے دوہرے دوہرے الفاظ لائے۔ اس کا نام شان بلاغت ہے۔ آپ کو یہ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو مجبوری ہے +
۲۴	خیّاطِ عہدِ طفلیِ شاہِ انام تھے	چار اضافتیں ہیں۔ جو اُس زمانے میں عام طور پر جائز تھیں کوئی لفظ ثقیل یا ترکیب نامانوس نہیں ہے +
۲۵	اس کی ثنا مشقّت مالایطاق ہے	مشقّت مالایطاق اہل علم کی زبان کے لفظ ہیں۔ علم خود آج کل غریب ہے۔ اِس راہ سے غریب اِس لفظ کو بھی کہئے۔ تو بجا ہے۔ بازاری لفظ نہیں ہے۔ یہ مجبوری ہے +
۲۶	ناناؐ نے تو قلم کئے جبریلؑ کے سر و پر	اُوپر کے مصرع سے ملا کر پڑھئے۔ جناب عونؑ اپنے بھائی جناب محمدؑ سے جنگ میں کہتے ہیں ؎ بھائی یہ ضرب کیا ہے کہ جس سے کٹی سپر + ناناؐ نے تو قلم کئے جبریلؑ کے سر و پر سپر اور سر و پر میں تجنیس لفظی ہے۔ آپ صنعت کو عیب سمجھتے ہیں۔ خدا کی شان ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۷	کفار بڑھے طیش میں ہونٹوں کو دبا کے دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے	دیکھئے۔ آپنے غلط شعر لکھ دیا۔ قافیہ کھا گئے صحیح یہ ہے۔ کُفّار بڑھے طیش میں ہونٹوں کو چبا کے۔ ہونٹوں کو غصّہ میں چبانے کا محاورہ ہے۔ پھر کہئیگا۔ کہ غلطی طبع کا عذر نہیں چل سکتا۔ کُفّار۔ بڑھے۔ طیش۔ ہونٹوں۔ چبا۔ دانتوں۔ تلے۔ بال محاسن۔ دبا۔ کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس یا ثقیل وغریب نہیں ہے۔ بھلانے مولوی صاحب کو کیوں طیش آگیا۔ جو ایسے عمدہ شعر کو بھی عیب کے نظائر میں پیش کر دیا۔ محاسن کو معائب جانتے ہیں + پھر اپنی رائے صائب جانتے ہیں
۲۸	آمد ہے امام سوم ہر دو سرا کی	یا اللہ اس مصرع میں کونسا حرف یا لفظ یا ترکیب ثقیل یا نامانوس ہے +
۲۹	اس سر پہ دھرے ہات بقسمیہ اجل ہے بس ہدیہ اللہ کے قابل یہی پھل ہے	بقسمیہ بائے موحدہ سے غلط لکھا ہے۔ یہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے چاہئے۔ اس میں کوئی سبب ثقالت وغرابت نہیں ہے +

مولوی صاحب عجب ظرافت فرماتے ہیں۔ عربی وفارسی اہل علم کی زبان کے الفاظ دیکھتے ہیں۔ تو اُن کو غریب وثقیل بتاتے ہیں۔ اگر عوام کی زبانی اردو وہندی کے الفاظ میر صاحب یا مرزا صاحب کے کلام میں پاتے ہیں۔ تو اُن کو بازاری زبان مبتذل محاورے کہتے ہیں۔ حالانکہ اُن مقامات خاص کی مناسبت سے وہی الفاظ مناسب ہیں۔ اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ بعض جگہ غور کرنے اور مضمون سمجھنے کی تکلیف نہیں گوارا فرماتے۔ اور جھٹ سے غلط مصرع لکھ کر اعتراض جما دیتے ہیں۔ مگر وہ خود اردو کے شاعر نہیں ہیں۔ ورنہ میں اُن کے کلام میں سے کچھ الفاظ دکھاتا۔ خیر اب اُن کی نثر سے پانچ سات الفاظ ضیافت ناظرین میں پیش کرتا ہوں۔ نظم میں تو وزن وقافیہ وردیف وغیرہ کی مجبوری سے بعض وقت شاعر خاص لفظ لانے پر مجبور ہوتا ہے۔ نثر میں یہ مجبوری بھی

نہیں ہے۔ پھر بھی مولوی صاحب کے الفاظ کی ثقالت و غرابت دیکھنے کے قابل ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں یہ مختصر فہرست پیش کروں۔ ایک لطیفہ ناظرین کو سُنادُوں۔ جو مناسب مقام ہے۔ ملک الشعرا مرزا رفیع سودا اکثر لوگوں کی ہجو فرمایا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک ایرانی (سپاہی مزاج) ان سے ملنے کو ہتیاروں سے اوپچی بنا ہُوا آیا۔ انہوں نے اُسکی ہجو فی البدیہہ فارسی میں نظم کر کے اُس کو سُنائی۔ اور طالب داد ہُوئے۔ ایرانی تحمل و وقار سے سُنتا اور داد دیتا رہا۔ جب مرزا سودا ہجو پڑھ چکے۔ ایرانی بولا۔ حالا کہ نظم خویش خواندی نثر ما ہم بشنو۔ مرزا بولے۔ بسم اللہ آغا بفرمائید۔ بس اُس نے جھپٹ کر ان کا ٹینٹوہ دبالیا۔ زمین پر پچھاڑ کر کمر سے خنجر نکال کر بولا۔ بگو ایں نثر بہتر ست یا نظم تو۔ ملک الشعرا نے ہاتھ باندھ کے عرض کی۔ نثر آغا از نظم بندہ بہتر ست بندہ را بجز ارید و معاف کنید۔ غلط کردم۔ حالا توبہ میکنم۔ جب خُدا خُدا کر کے اُس ایرانی کے پنجہ سے رہائی بلکہ عمر دوبارہ پائی[1] +

لطیفہ

آمدم بر سر مطلب :-

نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
صہ ۳۱ موازنہ	لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے۔	"چونکہ" غیر مانوس لفظ ہے۔ گو عام لوگ نثر میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ مگر اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ شعراء فصحا اس کو مطلق استعمال نہیں کرتے۔ مولوی صاحب الفاظ میں سُر بتاتے ہیں۔ پس وہ سوچیں۔ اس میں کیسا مبتذل سُر نکلتا ہے۔ ایک مجمع میں ایک صاحب کو بدہضمی کی شکایت تھی۔ چُوں کی آواز نکلی۔ تو ایک ظریف بولے۔ جناب اُردو میں باتیں کرتے کرتے آپ تو سُریانی بولنے لگے۔[2] دیکھئے دبیرؔ انیسؔ اور اُن کے معاصرین اس کی جگہ بر بسکہ لاتے ہیں۔ دبیرؔ: تھی بسکہ صبح قتل شہنشاہ نامدار

مولوی شبلی صاحب بعض الفاظ چونکہ

[1] جس طرح ایک معمر بزرگ سے لکھنؤ میں مَیں نے سُنا تھا۔ (یہ لطیفہ) لکھ دیا۔ حضرت پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی آب حیات میں اس کو لکھا ہے۔ مگر کچھ الفاظ کا فرق ہے + ۱۲ مُولف حقیر۔

[2] یہ اعتراض مولوی شبلی صاحب تک ہی محدود ہے۔ کہ وہ الفاظ میں سُر ہونیکے قائل ہیں۔ اور اس میں مذموم سُر ہے۔ اور نثار جو عام طور پر "چونکہ" لکھتے ہیں۔ اُن پر یہ اعتراض ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کوئی بھی لفظوں میں سُر نہیں بتاتا + ۱۲ ثابت۔

نام کتاب	جملہ	اعتراض
		انیس سے تھا بسکہ روزِ قتلِ شہ آسماں جناب۔ ان فصیح شعرا کے کلام میں دیکھ جائیے۔ یہ کہیں بھولے چوکے سے بھی "چونکہ" نہیں لاتے ہیں۔ مؤلف سے فصحا بسکہ ہر اک لفظ متیں کہتے ہیں + بھولے چوکے سے بھی چونکہ وہ نہیں کہتے ہیں۔
صہ ۱۵ موازنہ	واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے +	اس موقع پر مولوی صاحب نے اصول کو واحد لکھا ہے۔ دراصل یہ اصل کی جمع ہے۔ یوں لکھنا تھا۔ کہ اصل اصول بلاغت یہ[1] ہے۔ میں مانتا ہوں۔ کہ عام لوگ اصول (بجائے اصل) بولتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے انیسؒ و دبیرؒ پر اس قسم کا اعتراض کیا ہے۔ اس لئے مجھے بھی اس اعتراض کا حق پیدا ہوا۔ ملاحظہ ہو موازنہ کے صفحہ ۲۲۹ پر میر صاحب کا یہ مصرع سے گرتے تھے طیور ان ہوا کھولے ہوئے پر۔ اسکو لکھکر مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ طیور خود جمع ہے۔ اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہے نہ مستعمل۔ اسی طرح صفحہ ۲۴۳ پر مرزا صاحب کا یہ مصرع لکھ کر "القاب سخن سنج سخنور ہے ہمارا" لکھا ہے۔ کہ "لقب کی بجائے القاب باندھا ہے"۔ حالانکہ دہلی و لکھنؤ بلکہ ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہ القاب کو روزمرّہ میں بجائے واحد بولتے ہیں۔ اور مرزا مرحوم نے تو ایک اور کمال کیا ہے۔ کہ دو لقب سخن[1] سنج۔ سخنور[2] لکھ کر جمع کا حق بھی پیدا کر دیا ہے۔ اور حور خود جمع حوراء کی ہے۔ مگر بجائے واحد مستعمل ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ حور آں بہشتی را دوزخ بود اعراف۔ مولوی صاحب جس دن اصول کے واحد ہونیکی کلام شعرائے فصحا سے سند دینگے۔ اسی دن ہم سے

[1] جناب سر سید تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں جس کی سرخی (ہیڈنگ) یہ ہے۔
کہ "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہئے" تحریر فرماتے ہیں "تمام قوم کو یکسل اوقات منضبط کرنا
چاہئے۔ کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے"۔ ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق
مطبوعہ لاہور سنہ ۱۳۱۳ھ جلد دوم کا صفحہ ۵۳ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اصول

	نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
			طیوران کی (القاب کی طرح) سند لے لیں ۔ القاب کی سند حاشیہ پر ملاحظہ ہو[1] ۔
معذرت خواہی	صفحہ ۵۷ موازنہ	اس کے بعد حرکی معذرت خواہی	معذرت کافی ہے ۔ عذر خواہی تو بولتے ہیں ۔ معذرت خواہی کون بولتا ہے ۔ اگر دہلی و لکھنؤ کا محاورہ ہے ۔ تو سند دیجئے ۔
	صفحہ ۷۰ موازنہ	سریع الانتقال الی الذہن	ثقیل و غریب الفاظ کی تعریف میں یہ جملہ آتا ہے ۔ کیونکہ اردو کا ٹکسالی جملہ نہیں ہے ۔ ایسے ہی لفظ عربی کی نسبت کسی پُرانے شاعر کا شعر ہے ۔ ؎ حَبَّذَا میں نے کہا اُن سے تو ہنس کر بولے ۔ عربی بولو کسی اہل عرب کے آگے
لفظ اور بلیغ	صفحہ ۶۰ موازنہ	ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے ۔	مولوی صاحب! لفظ پر بلیغ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ تمام علمائے معانی و بیان کا اس پر اتفاق ہے ۔ کہ بلیغ کا اطلاق ہمیشہ جملہ پر ہوتا ہے ۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہہ سکتے جیسا کہ میں اُوپر مختصر المعانی وغیرہ سے ثابت کر چکا ہوں ۔ خطا معاف!! دراصل مولوی صاحب علم بلاغت کی ابتدائی باتوں سے بھی ناواقف ہیں ۔ جبھی تو فرماتے ہیں ۔ کہ بلاغت کلام دبیر میں نام کو نہیں ۔ اگر واقف ہوتے ۔ تو برخلاف تمام کاملین کی رائے کے وہ کلام دبیر کو بلاغت سے خالی اور لفظ کو بلیغ نہ فرماتے ۔ اور ملک کی بد مذاقی کی لے بڑھنے کا گیت شروع موازنہ ہی میں نہ گاتے ۔

مولوی شبلی صاحب کی نثر میں ایسی غلطیاں کثرت سے ہیں ۔ میں نے مشتے نمونہ از خروارے چند الفاظ یہاں لکھ دئے ۔ **ناظرین حق بیں** اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ

[1] ملاحظہ ہو **امیر اللغات** جلد اوّل (الف ممدودہ) کا صفحہ ۲۷ ۔ جناب **رشک** مرحوم ؎ لکھ کے اُس بُت کو خدا لکھتا ہوں اپنی بندگی ۔ اور کیا مکتوب میں **القاب** ہو آداب ہو ۔ دُوسری سند صفحہ ۲۷ پر **رشک مرحوم** ۔ اوّل تحریر وصف یار نے آخر کیا ۔ لکھ چکے مکتوب اس **القاب کو آداب** ہے ۔ میں مانتا ہوں ۔ کہ اصول بجائے اصل (واحد) کثرت سے بولا جاتا ہے ۔ مگر سند شعرائے فصحا کی دینا چاہئے ۔ اس کے قطع نظر جیسا مولوی شبلی صاحب نے دبیر و انیس پر اعتراض کیا تھا ۔ ویسا ہی میں نے بھی کیا ۔ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ ۔ مثل مشہور ہے جیسی لینی ویسی دینی ۔ ۱۲ مؤلف ہیچمدان ۔

جن کو ایسی معلومات فن شعر و ادب میں ہو۔ وہ بزرگوار کیا (دبیر و انیس کے) کلام کی خوبیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یا اُن میں (جج) حکم بن سکتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر مرحوم مشہور شاعر کامل اکبرآباد اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ دبیر و انیس میں وہ شخص حکم ہو سکتا ہے۔ جو ان دونوں سے بڑھ کر علم ادب و شعر کا عالم اور شاعر ہو۔ اور ایسا شخص روئے زمین پر کوئی نظر نہیں آتا۔ لہذا اس کا انصاف نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اُن مرحوم کا یہ عقیدہ و قول سچ ہے +

فصل ۸
چھٹا داغ
سرقہ

چھٹا داغ

سرقہ اور مولوی شبلی صاحب کا انیس دبیر کی طرف نسبت دینا +

مولوی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۲۳۳ پر سرقات کی سرخی (ہیڈنگ) لکھ کر میر انیس صاحب کے اور اُس کے ساتھ اساتذہ سلف کے چند اشعار لکھے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں یہ فرمایا ہے۔ کہ اکثر سرقے اس قسم کے ہیں۔ کہ شاعر سابق سے میر صاحب کا شعر حسن بندش وغیرہ کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر پھر تحت میں چند اشعار لکھ کر یہ بھی زیب رقم فرمایا ہے۔ کہ اِن اشعار میں اشعار سابق سے میر صاحب نے کسی قسم کی ترقی نہیں کی۔ اور یہ کہ حسن ظن ہو۔ تو اس کو توارد ورنہ سرقہ کہنا چاہئے۔ اس مقام پر مولوی صاحب نے چند سکندریاں (ٹھوکریں) کھائی ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱)
مرزا دبیر کا اشارہ

(۱) پہلا فقرہ یہ لکھا ہے۔ کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ میر انیس (اور مرزا دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے۔" اس فقرہ میں مولوی صاحب نے مرزا دبیر مرحوم کو بھی ملزم سرقہ بنا دیا۔ مگر پھر مرزا مرحوم کا ایک مصرع بھی ایسا نہ پیش کر سکے۔ جس پر گمان سرقہ کا ہو۔ اگر یہ کہئے۔ کہ میر انیس مرحوم کے سرقات کا دکھانا مقصود تھا۔ تو پھر مرزا مرحوم کا نام ہی کیوں لکھا۔ مگر ہمارے

مولوی صاحب اپنی اقتضائے طبیعت سے مجبور تھے ۔ مرزا مرحوم سے جو اُن کو خاص لاگ ہے ۔ غالباً اُس نے اُن کو خطوط وحدائق میں (اور مرزا دبیر) کے الفاظ لکھنے پر مجبور کر دیا[1] +

ضمیر و انیس

(۲) میر ضمیر مرحوم اور میر انیس مغفور کے یہ دو بند بھی اسی بحث سرقہ کی ذیل میں لکھے ہیں :—

میر ضمیر مرحوم

پہچانتے ہو ؟ کس کی ہرے سر پہ ہے دستار
دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار
میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے
کیا فاطمہؑ زہرا نے نہیں اس کو سیا ہے

میر انیس مرحوم

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ ؟ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے ؟ پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے ؟ یہ چار آئینہ جو ہر دار
کس کا رہوار یہ ہے ؟ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے ؟ یہ تیغ دوسر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

حالانکہ علم معانی وبیان کی جتنی کتابیں ہیں ۔ قریباً سب میں یہ لکھا ہے ۔ کہ اغراض ومطالب متحدہ کا بیان کرنا داخل سرقہ نہیں[2] ہے ۔ جیسے ایک شاعر نے مدح سخاوت وشجاعت وغیرہ نظم کی ۔ پھر دوسرے نے کی ۔ تو دوسرے کو سارق نہیں کہینگے ۔ یا ایک حکایت ایک شخص نے اور پھر وہی دوسرے نے لکھی جیسے یوسف زلیخا فردوسی نے اور پھر اُس کے کئی سو برس بعد جامی نے لکھی ۔ تو کوئی عقلمند جامی کو سارق یا اُن کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا ۔ یہاں بھی یہی بات ہے ۔ اکثر کتب سیر ومقاتل

وہی یوسف زلیخا جامی

[1] جبکہ مرزا مرحوم کو مولوی صاحب نے ملزم سرقہ کا لکھ دیا ۔ اور ثبوت کچھ بھی نہ دیا ۔ تو مولوی صاحب کے خلاف مرزا صاحب کی طرف دفعہ ۵۰۰ کا استغاثہ عدالت عالیہ حضور ادب میں (باجازت عدالت) ہو سکتا ہے ۔ مگر مرزا صاحب کا کمال ایسے استغاثہ کی ضرورت نہیں سمجھتا ہو

[2] ملاحظہ ہو حدائق البلاغہ میر شمس الدین فقیر مرحوم صفحہ ۲۰۰ ۔ اور اور کتابیں اس علم کی + ۱۲ مؤلف حقیر ۔

میں یہ روایت مرقوم ہے۔ کہ امام حسینؑ نے اپنے لباس و سلاح کو دکھا کر فوج یزید پر یہ حجت تمام کی تھی۔ کہ تم جن کا کلمہ پڑھتے ہو۔ اور جن کو اپنا پیشوا جانتے ہو۔ اُن محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ علیہم السلام کے یہ تبرکات ہیں۔ اور میں اُن کا یادگار و قائم مقام ہوں۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس کو اگر لاکھ آدمی بیان کریں۔ تو ۹۹۹۹۹ سارق نہ ہونگے۔ اسی روایت کو میر ضمیرؒ و میر انیسؒ نے نظم کیا ہے۔ یہ نہ سرقہ ہے نہ داخل توارد شعریہ ہے۔ اس موقع پر پہنچ کر یہ کہے بغیر رہنا حق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ کہ مرزا دبیرؒ نے اس بیان میں بھی ایک جدت پیدا کی ہے۔ یعنی اسی مضمون تاریخی کو نئے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ جو اُن کی قوت ایجاد پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل یہ عرض کر دوں۔ کہ اُنھوں نے ایک مشہور مسئلہ قانون شہادت کی اصل اصول پر نظر رکھی ہے۔ وہ یہ کہ شہادت تین قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) زبانی۔ جو زبان سے ادا کی جائے + (۲) تحریری۔ جو کسی دست آویز وغیرہ کو اپنے قول کی سند میں دکھایا جائے + (۳) مادّی۔ جو کسی مادّی چیز کو دکھا کر دعوے پر دلیل گردانا جائے۔ مثلاً قتل یا ضرب کے مقدمہ میں کسی ایسے پتھر یا لکڑی وغیرہ کو دکھایا جائے جس پر خون مقتول یا مضروب کا جما ہوا ہو۔ یا مضروب کا زخمی ہاتھ دکھایا جائے۔ پس یہ پتھر یا لکڑی یا ہاتھ گویا زبان حال سے شہادت واقعہ ضرب یا قتل کی دینگے۔ اسی کو زبان حال بھی کہتے ہیں + پس مرزا مرحوم اس واقعہ کو اس طرز پر بیان فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ ایک ایک چیز بزرگوں کے تبرکات میں سے دکھا کر فرماتے جاتے ہیں۔ کہ دیکھو یہ چیز کن بزرگوار کی ہے۔ اور وہ چیز خود زبان حال سے شہادت دے رہی ہے۔ اب وہ بند سُنئے۔ (امام حسینؑ لشکریان یزید سے فرماتے ہیں): —

جدت طرز بیان مرزا دبیرؒ در بیان شہادت

مصباح ہدایت مرے نانا کا لقب ہے
تم میری امامت کے ہو منکر۔ یہ عجب ہے
صد چاک یہ ملبوس مرے تن میں جو اَب ہے
موجود گواہی کو۔ بفرمودۂ رب ہے
گویا ہوا ملبوس بھی وہ خیر بشرؐ کا
حقّا تو ہے پیوند پیمبرؐ کے جگر کا

پھر شہ نے کہا باپ علیؑ ہے مرا کرار
دختر دی نبیؐ نے اُسے اللہ نے تلوار
دو تیغوں و دو نیزوں سے جو کرتا تھا پیکار
باور نہ ہو تو تیغ و سناں خود کرے اظہار
واں نیزۂ حیدرؑ نے زباں کھولی کہ حق ہے
یاں میاں سے تیغ دو زباں بولی کہ حق ہے

گو وضع جہاں سے تھی زرہ پیچ کے اندر
پر صاف گواہی کے دکھانے لگی جوہر
تھی پاس جو تیغ کمر حیدرؑ صفدر
انگشت قبول اُس نے دھری آنکھوں کے اُوپر
کھا کر سرِ اقدس کی قسم خود پکارا
یہ سر ہے نبیؐ کا اسے کاٹو نہ۔ خدارا

(۳) جن کتب معانی و بیان میں شعرا کے ہم مضمون اشعار لکھے ہیں، ہر ایک مصنّف نے صاف لکھ دیا ہے۔ کہ اگر شاعر مابعد کی نسبت یہ ثابت ہو جائے کہ اُس شعر کی تصنیف کے وقت اُس کو شاعر سابق کے شعر کا علم تھا۔ تو اُس پر حکم سرقہ کا جائز ہے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کو توارد کہینگے۔ کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی (ایک ایرانی مستند شاعر) فرماتے ہیں۔ ؎

مگر توارد خاطر کہ در مجارئے آں
نہ ممکن ست کہ کس معترض شود بروے
دو راہرو کہ براہے روند دریک سمت
عجب نباشد اگر او فتند پے در پے

مطلب ان بزرگوار کا یہ ہے۔ کہ جب ایک ہی سمت میں دو مسافر آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ اور پچھلے راہگیر کو خبر نہیں۔ کہ میرے آگے بھی کوئی جا رہا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ جہاں اگلے کا قدم پڑا ہے۔ وہیں پچھلے کا بھی پاؤں پڑ جائے۔" اس بات پر اعتراض کرنے کا کیا کام ہے۔ پس مضمون کا لڑ جانا ممکن ہے۔ اگر کوئی نافہم کہے۔ کہ شاعر مابعد کو تمام سابقین شعرا کے کلام سے خبردار ہونا چاہئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص تمام شاعروں کا کلام دیکھ جائے اور پھر یاد بھی رکھے (کہ جن کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے)۔ غالب مرحوم نے بھی اس بات کو ایک شوخی کے ساتھ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

توارد و سرقہ

شعرائے سلف کے کلام سے توارد

مبر گمان توارد۔ یقیں شناس کہ دُزد ۔۔۔ متاعِ من زِ نہاں خانۂ ازل بُرد ست

مطلب یہ ہے۔ کہ جس نے مجھ سے پہلے اس مضمون کو کہا۔ وُہی چور ہے۔ مَیں نہیں ہُوں۔ ازل کے نہاں خانہ مضامین سے میری اپنی چُرالی ہے۔" ادائے مطلب کی خوبی دیکھئے[1]

توارد

اب جبکہ **توارد** کی بحث آگئی ہے۔ تو شاید اس میں کچھ اور بھی لکھنا طالبانِ فن کے واسطے مفید ہوگا۔ واضح ہو۔ کہ ایک مضمون کو شاعرِ اوّل باندھتا ہے۔ شاعرِ ثانی بھی اُسی کو نظم کر جاتا ہے۔ اور اُس غریب کو خبر نہیں ہوتی۔ کہ مجھ سے پہلے بھی کوئی یہی مضمون کہہ گیا ہے۔ مَیں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہُوں۔ مَیں اپنے ایک مرثیہ میں دریائے **فرات** کی کیفیت ایک بند میں یُوں نظم کی تھی۔

نہ تھا فرات کی موجوں کو ایک سمت قرار ۔۔۔ سُوئے یمیں کبھی جاتی تھیں گاہ سُوئے یسار
کہ جیسے کروٹیں بستر پہ لے کوئی بیمار ۔۔۔ حباب کا تھا دَم آنکھوں میں نزع کے آثار
بھنور کو ہوگیا دورانِ سر سسکتا تھا ۔۔۔ **فرات**[2] خود لبِ ساحل سر پٹکتا تھا

پھر کئی برس کے بعد مجھے معلوم ہُوا۔ کہ جو مضمون مَیں نے اس بند کے چھٹے مصرع میں باندھا ہے۔ اُس کو جناب **میر انیس** مرحوم (کچھ فرق کے ساتھ) پہلے ہی نظم فرما چکے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ ؎

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ۔۔۔ ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

پس منصف مزاج **اس کو توارد** کہینگے۔ سرقہ وُہی ناتجربہ کار کہہ سکتا ہے۔ جس کو شعر

[1] لطیفہ۔ مَیں اگر حضرت غالب مرحوم کی حضوری میں باریاب ہوتا۔ تو اس شعر کو پڑھ کر عرض کرتا۔ کہ جناب! اگر یہی سرقہ مضمون ہے۔ تو پھر یہ مثل صادق آتی ہے۔ کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] واضح ہو۔ کہ فرات کو بعض آدمی مذکر بولتے بعض مؤنث بولتے ہیں۔ مگر کربلائے معلّےٰ میں جو ہندی آباد ہیں۔ وہ بالاتفاق مذکر بولتے ہیں۔ اور جناب مرزا مرحوم نے بھی مذکر نظم فرمایا ہے۔ مَیں نے بھی انہیں جناب کی تقلید کی ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ترجمہ

کہنے سے سروکار نہیں ہے۔ **علاوہ** توارد کے ایک قسم اور بھی ہے۔ جس کو ترجمہ کہتے ہیں۔ وہ یہ صورت ہے۔ کہ شاعر کو کوئی شعر عربی فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا۔ انگریزی وغیرہ کا پسند آیا۔ اُس نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔ اس ذریعہ سے اردو کی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ وسعت زبان اردو کے واسطے اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔ پس جب کہ کسی مترجم کو کوئی چور نہیں کہتا۔ تو ایسے شاعر مترجم کو سارق اور اُس کے شعر کو سرقہ (بھی) کہنا ظلم ہے۔ چنانچہ خود مجھے ایسا بھی اتفاق ہُوا ہے۔ حسان الہند مولوی سید غلام علی صاحب آزاد بلگرامی کی کسی کتاب (شاید خزانہ عامرہ) میں ایک شعر کسی ایرانی شاعر کا میری نظر سے گذرا۔ مجھے اُس کا مضمون بہت پسند آیا۔ وہ یہ ہے۔ ؎

ترجمہ مطلع کا مطلع میں

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش ۔۔۔ تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

یہ مطلع تھا میں نے اس کا ترجمہ بھی مطلع ہی میں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے ۔۔۔ کہ چھن کے نکہت گُل بھی دماغ میں آئے

پس اگر ہم مولوی **شبلی** صاحب کی **خاطر** سے مان بھی لیں۔ کہ میر صاحب کو اُن تمام فارسی کے اشعار کا علم تھا۔ تو بھی ہم اُن کو **ترجمہ** اور اچھا ترجمہ کہینگے۔ اور مولوی صاحب موصوف سے غرض ہے۔ کہ میر صاحب یا مرزا صاحب کی طرف **سرقہ** کی نسبت کرنا۔ گو وہ لاکھ ایچ پیچ کے ساتھ ہو۔ "**چھوٹا منہ اور بڑی بات** اور گستاخی معاف" گستاخی ہے۔

استنباط

علاوہ ترجمہ کے ایک اور قسم بھی ہے۔ جس کو کتابوں میں **سرقہ مستحسن** لکھا ہے۔ مگر اس کا (مستحسن) نام جو بعض شعرائے حال کی زبان پر جاری ہے **استنباط** ہے۔ کہ دُوسرے شاعر کے شعر سے تھوڑا سا مضمون لے کر زیادتی کرے۔ جیسے **میر تقی میر**ؒ کا یہ شعر ہے۔ ؎

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا ۔۔۔ آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

اس مضمون میں شیخ ذوق نے یہ اضافہ و تغیر کیا۔ ؎

لیتے ہی دل جو عاشق جاں سوز کا چلے	تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

جناب میر صاحب نے تو اتنا ہی کہا تھا۔ کہ گرم (غصہ میں) میرے پاس سے تم چلے گئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے۔ جناب ذوق نے اس میں یہ اضافہ کیا۔ کہ تم عاشق کا دل لیتے ہی چل دئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے۔ جب کوئی جلدی جانا چاہتا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ کہ کیا آگ لینے آئے تھے۔ ایک تو قلب عاشق آگ تھا۔ دوسرے جاں سوز کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ آگ لینے کو آنے کا پورا اطلاق ہو گیا۔ ناظرین! اچھا تو آپ نے جہاں یہ دو شعر سنے ہیں۔ پھڑکتا ہوا (قریب المضمون) ایک شعر سید انشا کی ریختی کا بھی اب سن لیجئے۔ ؎

آگ لینے کو جو آئیں تو گئیں لاگ لگا	بی بی ہمسائی نے دی دل میں مرے آگ لگا

ایسے استنباط مضامین کو بھی بعض نافہم سرقہ کہکر شاعر مابعد کے دامن کمال پر دھبہ لگانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہ سرقہ ہے نہ نقص۔ اگر اس کو نقص سمجھا جائے۔ تو زمانہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس باب میں مرزا دبیر مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

حاسد کا دل جلے نہ توارد کے داغ سے	روشن چراغ ہوتے ہیں سو اک چراغ سے

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح اپنے گھر سے تیل بتی لے جا کر ہر کوئی دوسرے کے چراغ سے چراغ جلا لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر مابعد اپنی قوت طبع (تیل) اور زور تخئیل (بتی) اور دماغ (چراغ) کے ذریعہ سے دوسرے کے مضمون سے اپنا مضمون استنباط کرتا ہے۔ اس میں حاسد کیوں اپنا دل جلاتا اور اس کو سرقہ بتاتا ہے۔

خیر اب ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ بعض موقع پر شاعر مابعد شاعر ماقبل کے مضمون پر کچھ اضافہ و ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے نزدیک وہ اضافہ کرتا ہے۔ اور ازبسکہ اپنا لڑکا اور اپنا کلام سب کو اچھا اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے

کہ میرا مضمون شاعر سابق سے بڑھ گیا۔ مگر درحقیقت نہیں بڑھتا۔ وہ ایک انسان ہے اس لئے اپنے خیال میں غلطی کرتا ہے۔ دوسری طبیعتیں اُس کو ترقی نہیں قبول کرتیں۔ تو اس صورت میں بھی وہ قابل معافی و آفرین ہے۔ کہ اُس نے اپنے ملک کی شاعری میں ایک قسم کی ترقی کرنا چاہی تھی۔ مگر ناکام رہا۔ اس کی کیفیت آپ کو ذیل کے دو نامور شاعروں کے دو مطلعوں سے روشن ہو جائیگی۔ جو میر شمس الدین فقیر مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب حدائق البلاغہ میں لکھے ہیں۔ (۱) ظہوری فرماتے ہیں۔ ؎

ظہوری و حزیں

برآں ناتواں صید بیداد رفت | کہ در دام از یادِ صیّاد رفت

شیخ علی حزینؒ جن کا ظہور ظہوریؒ کے بہت عرصہ کے بعد ہوا ہے ارشاد فرماتے ہیں ؎

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد | در دام ماندہ باشد صیّاد رفتہ باشد

اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ شیخ حزینؒ کو ملا ظہوریؒ کے مطلع کا علم تھا۔ تو یہ کہنا چاہئے کہ انھوں نے ترقی کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ ظہوریؒ کے مطلع میں ناتواں کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ اور مطلع حزینؒ سے وہ بہتر ہے۔ کہ مختصر لفظوں میں ہے۔ خیر الکلام ما قلّ ودلّ اصول بلاغت میں سے ایک مشہور اصل ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ خدا کسی کی محنت کو برباد نہیں کرتا۔ (با ایں ہمہ) حقیر کے نزدیک شیخ حزینؒ کے مطلع میں حزن کا اثر ظہوریؒ سے بڑھا ہوا ہے۔ شیخ حزین بھی قابل تحسین و آفرین ہیں ✣

اگر کتاب کے طولانی ہونے کا خیال مانع نہ ہوتا۔ تو میں اس بحث کو زیادہ طول دیکر عربی۔ فارسی۔ اردو وغیرہ کے بہت سے اشعار ہر زمانے کے قریب المضمون اس موقع پر لکھتا۔ مگر مجبور ہوں۔ اور خیال کرتا ہوں۔ کہ اب بھی بعض ناظرین فرمائینگے۔ کہ حیات دبیر میں اِدھر اُدھر کی باتیں درج کر کے فضول کتاب کا حجم بڑھایا ہے۔ حالانکہ اہل عقل جانتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں کے لکھنے سے ملک کے نومشق شاعروں کو کس قدر

فیض پہنچتا ہے۔ اور اہل کمال کی سوانح عمری لکھنے سے محض یہ غرض نہیں ہوتی۔ کہ بس اُن کے حالات تاریخی سے دُنیا واقف ہو جائے۔ بلکہ اُن کے بیان میں بہت سی علمی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ دبیر مرحوم کے نام قائم رہنے ہی کی غرض سے یہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اُن کا نام تو غم حسینؑ کے ساتھ انشاءاللہ قیامت تک قائم رہیگا۔ اور اُن کے کلام سے جو ہر رنگ میں ہے ہر طبیعت کا شاعر جدا جدا فائدہ اُٹھاتا رہیگا۔

ساتواں داغ

چھوٹے چھوٹے بہت سے دھبوں سے مل کر یہ ایک داغ بنا ہے۔ وہ دھبے یہ ہیں:۔

(۱) بادشاہ حلب کی بیٹی سے جو شاہزادہ علی اکبرؑ کی نسبت ٹھیری ہے۔ اور اس واقعہ کو مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے۔ اس کی نسبت مولوی شبلی صاحب صفحہ ۳۰۹ پر لکھتے ہیں۔ کہ "یہ قصّہ بالکل بلاغت و مقتضائے حال کے خلاف ہے۔ تمام باتوں سے قطع نظر ایک کنواری لڑکی کا بَین اور نوحہ جو ابھی عقد میں بھی نہیں آئی ہے۔ اور پھر دُولھا دُولھا پکارتی جاتی ہے۔ کس قدر لغو و بے معنی ہے"۔

اس کا جواب مفصّل مَیں نے جلد دویم میں (جہاں اِس مرثیہ کے تھوڑے سے بند لئے ہیں) لکھا ہے۔ یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔ کہ (اوّل تو) یہ واقعہ ملک عرب کا ہے۔ عرب کی عورتوں کے رواج پر خیال کرنے سے کچھ بھی خلاف مقتضائے حال نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے۔ کہ "قضیہ زمین برسر زمین"۔ عرب کی ناکتخدا لڑکیاں ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کی طرح شرم نہیں کرتیں۔ اور اس کو وہ مصنوعی شرم کہتی

فصل ۹ ساتواں داغ مجموعہ اعتراضات دختر شاہ حلب

رواج عرب

ہیں۔پس خیال کیجئے۔کہ جب ایک عرب کی ایماندار لڑکی کو یہ امید وخوشی ہو۔کہ میں خاندان رسالت میں بیاہی جاؤنگی۔اور اُس کی یہ برسوں کی امید یکایک اس طرح یاس سے بدل جائے۔کہ اُس کو اُس ہمشکل رسول خدا امام زادہ کی لاش ریتی پر نظر آئے۔تو وہ اسی طرح جگر خراش بَین کریگی۔جس طرح جناب مرزا صاحب نے (اُس کے بَین) لکھے ہیں۔اس موقع پر "بے معنی ولغو" الفاظ کلام مولوی صاحب میں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔کہ ایسے عالم اور ایسے کریہ الفاظ بولیں۔جو بد اخلاقی کی جڑ ہیں۔مگر مَیں مرزا مرحوم کی خوش اخلاقی کو پیش نظر رکھ کر جواب میں بھی کوئی سخت لفظ نہیں لکھتا اور مرزا صاحب مرحوم کا ایک مصرع مولوی صاحب کو مخاطب کر کے پڑھے دیتا ہوں ع

دیکھو ہمارے صبر کو اور اپنے جبر کو

(دُوسرے) اب ہندوستان کے شریف خاندان کو لیجئے۔یہاں جو شریف زادی کسی شریف سے منسوب ہوتی ہے۔(اور بعد نسبت کے) شوہر مر جاتا ہے۔اور اُس کو منظور یہ ہوتا ہے۔کہ اب مَیں اُسی کے نام پر بیٹھی رہُوں۔تو وہ اُس کو شوہر تسلیم کر کے بیوؤں کی طرح بَین کرتی ہے۔اس کی ایک دو نہیں ہزاروں نظیریں سیّدوں اور پٹھانوں اور شریف مسلمانوں کی بستیوں میں ملتی ہیں۔اور یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔البتّہ وہ فعل معیوب سمجھا جاتا ہے۔کہ جس میں کسی کنواری عورت کی رغبت کسی شخص سے اُس کے عالم حیات میں ظاہر ہو۔سو اس حکایت میں یہ صورت نہیں ہے *

(۲) مولوی صاحب کو موازنہ میں جابجا (صفحہ ۸۰ و ۱۶۵ و ۲۰۳ پر) مرزا صاحب کی یہ شکایت ہے۔کہ پہلوان کی لڑائی میں وہ زمین و آسمان کے قلابے

*: جن لوگوں نے نکاح ثانی بیوہ کے باب میں کوشش کی ہے اور شریف مسلمانوں کی بستیوں میں اس مقصد کے واسطے تشریف لیگئے۔اور فرماتے ہیں۔اُن سے پُوچھئے اس کی تصدیق فرمائینگے۔اور ایسے واقعات بیان کرینگے * ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

یاس

ہندوستان

اعتراض ۲۶ زمین و آسمان کے قلابے

ملا دیتے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ دونوں حریفوں میں سے کسی ایک نے دُوسرے پر وار بھی کیا یا نہیں۔ اگر کیا۔ تو کیا ہنر دکھائے ✦

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب خود زمین و آسمان کے گویا قلابے ملا رہے ہیں۔ زبان سے تو اس قدر (جا بجا) شکایتوں کے ڈھیر لگا دئے ہیں۔ مگر کسی ایک پہلوان کی لڑائی بھی اُن کے مرثیوں میں سے موازنہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ دکھائی۔ ع دعوے بے دلیل قبول خرد نہیں۔ مَیں نے اِس جلد اوّل میں کم اور جلد ثانی میں بہت سے پہلوانوں کی لڑائیاں کلام مرزا صاحب سے لکھ دی ہیں جن کو دیکھ کر ہر منصف مزاج یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے لڑائی کی تصویریں کھینچ کر دکھا دی ہیں۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ مولوی صاحب کو وہ کیوں نہیں نظر آتیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ اُن کی چشم دُور بین پر انصاف کی عینک نہیں لگی ہے۔ اس سبب سے وہ مرزا صاحب کے کمالات سے انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے قول و دعوے کے ثبوت میں کچھ بھی نہیں پیش کر سکتے ✦

یہ بھی لکھ دُوں۔ کہ میرا یہی کام نہیں ہے۔ کہ مولوی صاحب کے اعتراض کا جواب ہی دے دُوں۔ بلکہ یہ بھی میرا فرض ہے۔ کہ جو بات در اصل ہے۔ وہ لکھ کر ناواقفان حال کو واقف کر دُوں۔ یہ ایک بھید کی بات ہے۔ مرزا مرحوم کا خیال یہ تھا۔ کہ مرثیہ میں چہرہ۔ سراپا۔ لڑائی۔ رجز سب کچھ ہو۔ مگر اُس میں اس قدر زیادتی نہ ہو۔ کہ جو اصل مرثیت کو لے ڈُوبے۔ اگرچہ اُنھوں نے بعض مرثیوں میں پہلوان کی لڑائی شرح و بسط سے بھی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو اِس مرثیہ مشہور سے "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" میں مرحب بن عبد القمر کی حضرت عباسؑ سے لڑائی۔ یا اس مرثیہ (دست خدا کا قوت بازو حسینؑ ہے) میں امام حسینؑ سے ابولہب پہلوان کی لڑائی*۔ مگر یہ مشرح لڑائی پہلوان کی دو چار

مرثیوں میں اس خیال سے انہوں نے لکھ دی۔ کہ کوئی اُن کو اس امر میں بھی عاجز نہ سمجھے۔ باقی عام طور پر اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلوان کی لڑائی میں زیادہ طول نہ دیا جائے۔ ورنہ تجربہ اس بات کا شاہد ہے۔ کہ مجالس عزا میں پھر تحت لفظ خواں کے طولانی لڑائی پڑھنے پر رقت نہیں ہوتی۔ اور مرثیہ کی جو اصلی غرض مرثیت ہے۔ وہ فوت ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ ہر پہلوان کی لڑائی میں تمام حربوں نیزہ۔ تیر۔ تلوار۔ گرز وغیرہ کی مشرح لڑائی نہیں نظم فرماتے۔ مولوی صاحب ہر جگہ تو کتاب میں نیچر نیچر پکارتے رہے مگر اس موقع پر خدا جانے نیچر سے کیوں بیخبر ہو گئے۔ کیا واقعی تقاضائے عقل یہی ہے۔ کہ ہر پہلوان نے تمام فنون جنگ دکھائے ہوں۔ اور پھر امام حسینؑ یا اُن کے جاں نثار عزیز یا رفیق نے ایک ایک حربہ سے ٹھیر ٹھیر کے کام لیا ہو۔ ہرگز ممکن نہیں۔ صبح سے چار بجے شام تک کی لڑائی اور پھر اُس میں ایک ایک شیر خاندان رسالت نے سیکڑوں یا ہزاروں دشمن مارے (جیساکہ تاریخیں پکار رہی ہیں*)۔ ایک ایک دشمن کے مقابلہ پر فنون جنگ دکھاتے۔ تو مہینوں ہو جاتے۔ پس کسی پہلوان کی لڑائی میں مفصل تمام حربات کا نقشہ کھینچنا۔ اور کسی کی جنگ میں یہ مختصر طور پر کہدینا۔ کہ ع "اک ضرب میں وہ منکر توحید دو ہُوا" مقتضائے حال کے موافق ہے۔ اور انہیں باتوں پر خیال کر کے ہمارے ملک کے اکثر اہل عقل فیصلہ کر چکے ہیں۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہے۔ مولوی صاحب کے دماغ میں اب تک ان باریک خیالوں نے جگہ نہیں پائی ہے۔ جس دن بے جا طرفداری کی دھوآں دھار گھٹا ہٹیگی۔ مولوی صاحب بھی بلاغت دبیر کے قائل ہو جائینگے۔ جیساکہ خود مرزا مرحوم پیشینگوئی فرما گئے ہیں۔

*صرف امام حسینؑ نے دو ہزار کے قریب دشمنوں کو روز عاشور قتل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ اور اور تاریخیں۔ ہاں یہ قرین عقل ہے۔ کہ کسی ایک دو بڑے طاقتور پہلوان کو تمام حربات کی لڑائی میں عاجز کر کے قتل کیا ہو + ۱۲ مولف حقیر۔

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے — میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے
کیونکر دُرِ یکتا کے خریدار نہ ہونگے — کونین میں ایسے دُرِ شہوار نہ ہونگے

(۳) صفحہ ۸۲ پر تو مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ میر انیس صاحب کے یہاں بھی اس صنعت رعایت لفظی کی بہتات ہے۔ لیکن اتنی احتیاط ہے۔ کہ ابتذال نہیں آنے پاتا۔ جس سے ناظر کتاب مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ میر صاحب کے یہاں مبتذل رعایت لفظی (ضلع جگت) نہیں ہے۔ مگر آگے بڑھ کر مولوی صاحب رنگ بدلتے ہیں۔ اور صفحہ ۲۳۱ پر لکھتے ہیں۔ (چند اشعار میر صاحب کے لکھ کر) کہ ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے۔ یہ تناقص کہ رہا ہے۔ کہ میر و مرزا پر بے جا اعتراض کرتے کرتے مولوی صاحب کا حافظہ کچھ جواب دے گیا ہے۔ میرے نزدیک میر صاحب کا کلام بھی بیجا رعایت لفظی (ضلع جگت) سے پاک ہے۔ اور مولوی شبلی صاحب زبان اردو کی باریکیوں سے ناواقف ہیں ❖

(۴) صفحہ ۲۱۴ پر مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر تو اس عالم (مدح شمشیر) میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ سب کچھ کہتے ہیں۔ اور غور سے دیکھئے۔ تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے۔ اس کا مختصر و معقول لاجواب جواب یہ ہے۔ کہ اصول موضوعہ بلاغت (ایشیائی) کے موافق مرزا مرحوم کے مضامین عالیہ ہوتے ہیں۔ جو لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ کاملوں کے نزدیک وہ سب کچھ کہتے ہیں۔ ناقصوں کی رائے ناقص میں کچھ نہیں کہتے۔ (بقول میر مونس مرحوم سے)

ہمارا مول کیا ہے اک نظر لطف و عنایت کی — جو اعلےٰ ہو تو مہنگے ہیں جو بینا ہو تو سستے ہیں

(۵) اسی صفحہ ۲۱۴ پر چند دقیق اشعار٭ مرزا مرحوم کے لکھ کر مولوی صاحب لکھتے

٭ان اشعار کے لکھنے سے فضول طول ہو گا (بعض اشعار کی میں نے کہیں کہیں اس کتاب میں شرح بھی کردی ہے)۔ اس خیال سے نقل نہیں کئے گئے جو صاحب دیکھنا چاہیں موازنہ کو ملاحظہ فرمائیں یا اس کا جواب المیزان تالیف لطیف منشی چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق ملاحظہ فرمائیں جو چھپ رہا ہے ۱۲ مؤلف

ہیں۔ کہ "خود انصاف کرو۔ یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم"۔ مَیں کہتا ہُوں۔ مولوی شبلی صاحب کے سر کی قسم تلوار کی تعریف ہے۔ اور اُصول مقررہ بلاغت کے موافق شاعری کی معراج کمال ہے۔ اور جتنے کامل ہیں (جن میں سے ایک میر انیس صاحب بھی ہیں) اُن سب کے یہاں ایسی تعریف موجود ہے۔ اور سب کے نزدیک یہ اعلےٰ درجہ کی مدح ہے۔ اگر ایسے مضامین خیالی و عالی قابل ذم ہیں۔ تو ہندی اور عرب و عجم سب ملزم ہیں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں۔ ہوائی طلسم اس کو وہی شخص کہیگا۔ جس کو ہوا زوگی ہوگئی ہو۔

واقعیت معرکۂ کربلا

(۶) مولوی صاحب صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں۔ "کہ کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے۔ جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ نہایت مختصر ہیں"۔ پھر صفحہ ۲۱۹ پر (اور زیادہ نمک مرچ ملا کر بات کو چٹ پٹا بناتے ہیں) لکھتے ہیں "۔ اس موقع پر تمہیں شاید یہ خیال آئے۔ کہ میر انیس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں۔ لیکن اصلیت اور واقعیت سے بمراحل دور ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معرکہ آرائی کے لحاظ سے اس (واقعہ کربلا) کی صرف یہ حیثیت ہے۔ کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے۔ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا۔ جو دفعۃً ٹوٹ پڑا۔ اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ شاعری میں اصلیت و واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ فرض کرو۔ کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں۔ تو اس سے فردوسی کے کمال شاعری میں کیا فرق آئیگا"۔ آگے چل کر

موہوم خیال بندی و لفاظی

مولوی صاحب طرفداران دبیر مرحوم کے زخم دل پر یُوں نمک چھڑکتے ہیں۔ "کہ وہ واقعات بیان کرنے چاہئیں۔ جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو۔ صرف موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو۔ جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہے"۔ ناظرین! مَیں کہتا ہُوں۔ کہ موہوم خیال بندی و لفاظی ہو یا نہ ہو۔ مگر مولوی شبلی صاحب کی سی غلط بیانی اور اتہام و تناقض کلام میں نہ ہو۔*

* (جیسے نقص میں اوپر ثابت کر چکا ہوں اور آئندہ بھی انشاء اللہ پایۂ ثبوت کو پہنچاؤنگا) اللھم احفظنا منھا ۱۲ ہیجدان ...

ہمارے مولوی صاحب کی کچھ عادت ہی ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہمارے ملک کے اکثر اہل علم وکمال جس راہ راست پر جارہے ہوں۔ اُس پر وہ چلنا نہیں چاہتے۔ خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کسی نے اپنی لیاقت سے دُوسری سڑک تیار کرلی ہے۔ اور اپنی موٹر کو اُس پر لے جانا چاہتا ہے۔ تو لے جائے۔ مگر غضب یہ ہے۔ کہ اور سب جانے والوں کو جو صراط مستقیم پر جارہے ہیں۔ گمراہ بتانا بھی اُن کا شیوہ ہے۔ دبیر و انیس کو بالمقابل سمجھنے والوں میں (مولوی صاحب کو) خوب معلوم تھا۔ کہ کیسے کیسے علما، شعرا، ادبائے ملک کے تھے۔ مگر مولوی صاحب نے سب کو بد مذاق بنا ہی تو دیا۔ وہ تو ایک نئی اُپچ تھی۔

دوسرا مذاق

اب یہ **دُوسرا مذاق** سُنئے۔ معرکہ کربلا کی حیثیت یہ ارشاد ہوتی ہے۔ کہ "سو سوا سو پیاسے بے سروسامان لوگ تھے۔ اُن پر تین چار ہزار کا مجمع دفعۃً ٹوٹ پڑا۔ تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہوگیا۔" اور اس سادگی وصفائی سے فرماتے ہیں۔ کہ سُننے والے کو بالکل اطمینان ہوجائے۔ کہ بس اتنی سی بات ہے۔ جس کو تمام مرثیہ گویوں نے بڑھا بڑھا کر شاہنامہ کی طرح زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ مگر مرزا دبیر میں یہ لیاقت بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو محض موہوم خیال بندی ولفاظی فرماتے ہیں۔ اس مضمون مولوی شبلی صاحب پر میں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر کتب تواریخ ومقاتل یہاں گوڑہ میں نہ ملتی تھیں۔ اس لئے فکر میں تھا۔ کہ یکایک فروری ۱۹۱۲ء کے پرچہ ماہوار "شیعہ" میں جناب سیّد

پرچہ شیعہ میں مضمون ذوالفقار حسین خاں صاحب جونپوری

ذوالفقار حسین خاں صاحب جونپوری* کا مضمون (اسی مضمون مولوی شبلی صاحب کی تردید میں) نظر سے گذرا۔ اس مضمون کی سُرخی ذیعلم مضمون نویس نے "**ایک تیر و دو نشانہ**" لکھی ہے۔ جو موزون ومناسب معلوم ہوتی ہے۔ میں اب اِس مقام پر اسی مضمون سے کچھ اقتباس کرکے (ذی علم مضمون نویس کے شکریہ کے ساتھ) درج کئے دیتا ہوں۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ اگر اور مرثیہ گویوں یا میر انیس نے اس معرکہ کو بڑھایا ہے

* ان سیّد صاحب نے بھی موازنہ مولوی شبلی صاحب کا جواب لکھا ہے۔ خدا کرے وہ بھی بلد چھپے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

تو مولوی صاحب نے اُس سے زیادہ گھٹایا ہے۔ ایک پلّہ اگر زمین پر ہے تو دُوسرا آسمان پر۔ چنانچہ سیّد صاحب ممدوح لکھتے ہیں۔ کہ ناسخ التواریخ کا مصنّف (جو حال میں بہت تحقیق سے لکھی گئی ہے) تعداد فوج یزید کی نسبت لکھتا ہے۔ کہ بڑا اختلاف ہے۔ ابن طاؤس و فاضل مجلسی بیس[۲۰] ہزار۔ ابو مخنف پرچہ نویس فوج یزید اسّی[۸۰] ہزار۔ ابن شہر آشوب پینتیس[۳۵] ہزار۔ اعصم کوفی بیس[۲۰] ہزار۔ یافعی بائیس[۲۲] ہزار۔ شارح شافیہ پچاس[۵۰] ہزار صاحب مطالب السئول بیس[۲۰] ہزار اور دیگر مؤرخین اس سے بھی زیادہ آٹھ لاکھ تک تعداد فوج کی لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد مؤرخ موصوف نے اپنی رائے میں باون[۵۲] ہزار فوج لکھ کر اُس کی شرح مع افسروں کے نام کے لکھی ہے۔ تین[۳] چار ہزار کی تعداد ایک نے بھی نہ لکھی۔ مؤرخین یورپین بھی بیس[۲۰] ہزار سے کم تعداد نہیں لکھتے۔ پھر یہ معلوم مولوی صاحب نے یہ تعداد قلیل کہاں سے قائم کی۔ اب ایک بات اور سُنئے۔ کہ صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق جو لوگ لشکر یزید کے کربلا میں امام حسینؑ اور اُن کے بہادر ساتھیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں۔ اُن کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

مقتولین لشکر یزید

نام شہید راہ خدا	مقتولین لشکر یزید	کیفیت
علی ابن حر غازی	۷۰	
حر ابن یزید ریاحی	۸۲	تیسرے حملہ میں۔ قبل کے دو حملوں میں جو مارے۔ وہ نہیں معلوم ہوئے۔
ایضاً	۵	قبل حملوں کے۔
بریر ہمدانی	۳۱	

نام شہید راہ خدا	مقتولین لشکر یزید	کیفیت
وہب ابن عبداللہ کلبی	۱۰۲	حملہ دوم میں۔ حملہ اول کی تعداد نہ معلوم ہوئی۔ اس سے زیادہ ہوگی۔
مادر وہب	۳	
مسلم بن عوسجہ	۵۰	یہ صحابی رسول خدا ایک ضعیف العمر بزرگ ہیں۔
پسر مسلم بن عوسجہ	۳۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
ہلال بن نافع بجلی	۹۳	
زہیر ابن قین	۱۲۰	
حجاج ابن مسروق	۱۵۰	
یحییٰ بن کثیر	۵۰	
غلام ترکی	۷۰	
یزید بن زیاد	۵	فقط تیر سے۔ تلوار و نیزے سے اور مارے ہو نگے +
سیف ابن ابی الحارث	۵	
زیاد ابن مظاہر	۹	
ابراہیم ابن الحسین	۸۴	
علی ابن مظاہر	۷۰	
المعلےٰ ابن المعلی	۶۴	
طرماح ابن عدی	۷۰	
محمد بن مطاع	۳۰	
جابر بن عروہ	۸۰	
مالک ابن داؤد	۶۰	
انیس بن معقل	۱۰	
عبد اللہ بن مسلم	۹۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
جعفر بن عقیل	۱۵	
عبد الرحمن بن عقیل	۱۷	
موسےٰ بن عقیل	۷۰	
احمد بن محمد بن عقیل	۸۰	
محمد بن عبد اللہ بن جعفر طیارؑ	۱۰	
عون بن عبد اللہ	۱۲	
قاسم بن حسن	۷۰	
عبد اللہ اکبر ابن حسنؑ	۱۴	
احمد بن حسن	۱۹۰	
عبد اللہ صغر ابن علی	۲۱	
عباسؑ بن علیؑ	۸۰	صرف دریا جاتے وقت واپسی کے وقت اس سے زیادہ شدید لڑائی ہوئی ہے۔ اُس میں اس سے بہت زیادہ ناری مارے ہونگے +
علی اکبرؑ ابن الحسینؑ	۲۰۰	
امام حسینؑ	۱۹۵۰	صرف حملۂ اوّل میں یہ حملہ امام حسینؑ نے فرمائے۔ باقی حد حملوں کی تعداد نہیں معلوم ہوتی
میزان		۴۱۶۲ ✱

✱ علامہ ابو اسحاق اسفرائنی جو چوتھی صدی ہجری کے اہل سنت جماعت کے ایک مستند عالم ہیں۔ اور جن سے جناب شیخ مفید شیعیؒ سے مناظرہ بغداد میں ہوا تھا۔

اور شیخ کی کتاب اس کا خاصہ وقت جو تھا وہ دو جلدوں میں ... تھے۔ دو سبائس کے علاوہ ہے +

اور ان شہدا کے سوا باقی شہدا کی جنگ کی کیفیت لکھی ہے ۔ لیکن مقتولوں کی تعداد نہیں لکھی ۔ اور اُن باقی شہدا میں بڑے بڑے شجاع مثل حبیب ابن مظاہر اسدی و نافع ابن ہلال و پسران جناب امیرؑ و عقیل و جعفر طیار ہیں ۔ پس مولوی صاحب کا یہ تین چار ہزار لکھنا کس قدر خلاف عقل و نقل ہے ۔ چار ہزار سے زیادہ تو اسی حساب سے مر چکے ۔ اگر تین چار ہزار ہی تھے ۔ تو پھر امام حسینؑ کو کس نے قتل کیا +

فردوسی کے شاہنامہ کے واقعات کو کربلا کے واقعات سے کیا تعلق ہے ۔ ہر ایک واقعہ کربلا کا حیرت خیز ہے ۔ جس کی نظیر ہر حیثیت سے تاریخ عالم میں نظر نہیں آتی ۔ نہ ایسے بہادر رُوئے زمین پر گذرے ۔ نہ ایسے گھمسان کی لڑائی ہُوئی ۔ سویرے سے لڑائی شروع ہُوئی ۔ تین چار گھڑی دن رہے تک برابر نو دس گھنٹے تک تلوار برستی رہی* ۔ تلوار کی لڑائی گھنٹہ دو گھنٹہ ہر جگہ ہوتی ہے ۔ پھر کسی ایک گروہ کی شکست دُوسرے کی فتح ہو جاتی ہے ۔ مگر اُن بہادروں نے نو دس گھنٹے تک ہزاروں کا مقابلہ کیا ۔ یہ شجاعت عام لوگوں کے خیال میں خود فوق طاقت بشری ہے ۔ پھر اس میں میر انیس مرحوم یا اور کوئی شاعر کیا مبالغہ کر سکتا ہے +

اس کے بعد ذی علم مضمون نویس نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کی مفصل لڑائی لکھی ہے ۔ اور دکھلایا ہے ۔ کہ اُس شیر بیشہ ہاشم نے ہزاروں کا مقابلہ کر کے اُن سب کو بھگا دیا ۔ اور خُون کے دریا بہا دئے ۔ ایسے ہی اور بھی امام حسینؑ کے ساتھی تھے ۔ مگر اکثر راوی وہی یزید کے لشکری ہیں ۔ اس لئے صحیح تعداد مقتولوں کی ہم تک نہیں پہنچی ۔ اور اُحُد و خیبر و حُنین و یرموک وغیرہ کی لڑائیوں میں لشکر اسلام کی قلیل فوج اور لشکر مخالف کی کثیر تعداد ہونے پر بھی فتح اسلام ہُوئی ۔ یہ دکھا کر یہ نتیجہ نکالا ہے ۔ کہ یہ سو سوا سو امام حسینؑ کے ہمراہی شیر کوفیوں کی کثیر فوج سے لڑنے اور فتح حاصل کرنے کے لئے کم نہ تھی ۔ لیکن

*۔ ۱۲ گھنٹے کے قریب دن ہوگا ۔ اس لئے ۹ یا ۱۰ دس گھنٹے تک لڑائی ہُوئی کہ اکتوبر کا مہینہ تھا + ۱۲ مؤلف ۔

فتح ظاہری سے اتنا نفع اسلام کو نہیں پہنچا۔ جتنا ان خاصان خدا کی شہادت سے پہنچا۔ اس لئے فتح نہ ہوئی۔ (المولف)

باغ و بہار کر گئے ریتی کو د. بن کی * سینچا ہے اپنے خون سے کھیتی کو دین کی

پس مولوی صاحب کا تین چار ہزار آدمی لکھنا اور لڑائی کی حیثیت خفیف کر کے دکھلانا اس مثل کا مصداق ہے۔ کہ وہ علاوہ اور کمالات کے علم تاریخ میں بھی ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ مرزا دبیر صاحب پر جو مولوی صاحب نے عنایت فرمائی ہے اُس کا جواب مختصر یہ ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مرثیہ پر مجلسوں میں جو اثر ہوتا ہے۔ دُوسروں کے مرثیوں پر نہیں ہوتا۔ پس اس سے اُن کی مقبولیت و اثر ثابت ہوتا ہے۔ موہوم خیال بندی اور لفاظی ہرگز مرزا صاحب کے کلام میں نہیں ہے۔ مولوی شبلی صاحب نے شاہنامہ کے واقعات سے مرثیہ کے مضامین کو تشبیہ دی ہے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ مرزا مرحوم اس کی بھی تردید فرما گئے ہیں۔

شہنامہ نہیں مرثیہ سیف خدا ہے ** گر شاہ و گدا ہوں ہمہ تن گوش بجا ہے

مولوی صاحب کو یہ بھی خبر نہیں۔ کہ تاریخ و حدیث کے مضامین جس کثرت سے مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہیں۔ کسی مرثیہ گو شاعر کے کلام میں نہیں ہیں۔ اس کو مولوی صاحب موہوم خیال بندی و لفاظی سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مولوی صاحب تاریخ و حدیث میں بھی ایسے ہی ہیں۔ جیسے اردو کی شاعری میں +

(۷) صفحہ ۲۳۰ پر میر انیس مرحوم کی غلطیوں و کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ فردوسی و قاآنی جو قادر الکلام و پُرگو شعرا ہیں۔ اُن کے یہاں بھی اس قسم کی

لفاظی و موہوم خیال بندی

اغراض بیجا

قادر الکلام شعرا

*۔ ذیل علم مضمون تو یہ تھے یہ مضمون لکھ کر نتیجہ نکالا ہے۔ کہ مرزا دبیر کے الہامی مضمون اور بدعت پسند کارروائی (انکار شہادت امام حسینؑ) میں مولوی شبلی صاحب بھی کچھ شریک ہیں۔ یہ موازنہ انیس و دبیر لکھکر مولوی صاحب نے اِدھر دبیر پر حملہ کیا اُدھر واقعہ شہادت کو خفیف کرنا چاہا۔ اس لئے ایک تیر اور دو نشانہ کا مصداق ہوا۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اس لئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا چاہئے +

جناب شبلی صاحب کی عدالت عالیہ سے فردوسی۔ قاآنی۔ انیس تو قادر الکلامی کی بدولت بری ہوئے۔ مگر افسوس وہ شاعر اہلبیت بری نہیں ہوا۔ جس کا کلام فردوسی۔ قاآنی۔ انیس ہر ایک سے بہت زیادہ (شاید دس گنا) ہے۔ نہ معلوم اُس کا گناہ کیوں ایسا سنگین ہو گیا ہے۔ اور ایسی تجویز کا نام بے جا طرف داری۔ ناانصافی۔ یا اور کچھ ہے؟

اعتراض ۸

(۸) صفحہ ۲۴۲ پر جو کچھ زیب رقم ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مرزا دبیر کے یہاں الفاظ کا تناسب۔ ترکیب کی دلآویزی۔ برجستگی و سلاست بہت کم ہے۔ ایک لفظ بلند دُوسرا پست و مبتذل۔ کہیں صاف و سلیس۔ کہیں تعقید و بے ربطی۔ اکثر الفاظ دُھوم دھام کے ہیں۔ مگر حاصل کچھ نہیں + مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب تو کیا خاک انصاف فرمائینگے۔ کہ اُن کا دل ہی مرزا مرحوم کی طرف سے مکدر ہے۔ مگر **ناظرین باتمکین!** آپ میرے معروضہ پر غور و انصاف فرمائیے۔ جن شعرا کے دیوان یا کلیات چار چار چھ چھ جزو کے ہیں۔ اُن کے کلام میں چُست و سُست۔ بلند و پست۔ تعقید و تعقیب۔ بے ربطی و ربط۔ دھُوم دھام اور سادگی سب کچھ موجود ہے۔ پھر ایک ایسے شاعر اہلبیت (دبیر) کے کلام میں (جسکی ۲۰ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اور غالباً اتنا ہی کلام غیر مطبوعہ اور دُوسروں کے نام سے کہا ہُوا چھپنے سے باقی ہے) اگر سُست و چُست کلام ہے۔ اور کچھ کلام میں بالفرض برجستگی و دلآویزی بہت کم ہے۔ تو کیا ستم ہے۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ باوصفیکہ مرزا مرحوم اپنے تمام معاصرین سے زیادہ پُرگو ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا کلام اچھا زیادہ ہے مبتذل کلام مرزا مرحوم کا مجھے بالکل نہیں ملا۔ مولوی شبلی صاحب ناظرہ و دیلور وغیرہ کو مبتذل

انصاف طلب

بے ربطی

سمجھے ہُوئے ہیں۔ یہ اُن کی ناواقفی ہے۔ اب رہی کلام میں بے ربطی۔ یہ عام طور پر اُن کے مرثیوں میں ہرگز نہیں۔ نہ اُن کے مرثیوں میں مسلسل قصہ یا مثنوی کی شان ہے۔ نہ آج تک عام شعرائے مرثیہ گو (عرب و عجم و ہندی) کے کلام میں مَیں نے مرثیوں میں تسلسل کی شان دیکھی۔ سب سے زیادہ (رُوئے زمین کے مرثیوں میں) ملا محتشم علیہ الرحمہ کے ۱۴ بند مقبول ہیں۔ جن میں سے بعض بند مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ میں لکھ دئے ہیں۔ اُن میں بھی ایسا تسلسل نہیں ہے۔ جس تسلسل کو مولوی صاحب یا اُن کے ہم خیال مرثیہ اردو میں ڈھونڈھتے ہیں۔ مرزا صاحب کے مرثیوں میں ایک بیان واقعہ تک تسلسل قائم رہتا ہے۔ پھر وہ ایک واقعہ سے دُوسرے واقعہ کی طرف گریز فرماتے ہیں۔ اُس موقع پر تشبیب و تخلص قصیدہ کا لطف آتا ہے۔ کس عمدگی سے ایک واقعہ کا وصل دُوسرے واقعہ سے فرماتے ہیں۔ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ بعض مرثیوں میں پڑھنے والوں نے کمی بیشی کر کے کچھ بے ربط کر دیا ہے۔ اور اصل مرثئے غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا مرحوم کے گھر میں باقی نہیں رہے۔ جو جابجا سے دستیاب ہُوئے۔ وہی دفتر ماتم میں چھپے۔ سو ایسی بے ربطی جناب میر انیس مرحوم کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ باوصفیکہ وہ جناب تسلسل کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ مگر جب اصلی مرثئے نہ رہیں۔ تو کیا کیا جائے۔ ؎

باہمیں مردماں بباید ساخت　　چہ تواں کرد مردماں اینند

اور ایک لفظ یا مضمون شاندار و بلند اور دُوسرا پست اگر کہیں کہیں ہے۔ تو وہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ مرزا مرحوم ایک بشر تھے۔ معصوم نہ تھے۔ تعقید و تعقیب بھی ضرور کہیں کہیں ہے۔ کہ ہر شاعر بحر و قافیہ و ردیف کی پابندی سے بھی کبھی مجبور ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی خود اردو و نثر میں بھی الفاظ مقدم مؤخر بولے جاتے ہیں *

* جیسے اردو میں بولتے ہیں۔ ہم نے کہا کب تھا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

گو عام طور پر یہ رواج نہیں ہے۔ با ایں ہمہ اتنا کہونگا۔ کہ جس کثرت سے تعقیدات وغیرہ اُن کے معاصرین مضمون آفرین شعرا کے کلام میں ہیں۔ اُتنی مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہرگز نہیں ہیں۔ اگر میں تمام معاصرین دبیر کے کلام میں سے ایسے عیوب اور کمزوریاں دکھاؤں۔ تو میری کتاب تاریخ طبری سے بڑھ جائے۔ اور ہر خاندان کے شاعر ناراض ہوجائیں اسلئے اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے۔ اس کے بعد جو مولوی صاحب نے مرثیہ "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلائے" اور دو ایک اور مرثیوں کے چند بند لکھے ہیں۔ اور اکثر مصرعوں کو فرماتے گئے ہیں۔ کہ یہ بے ربط ہے۔ اِس لفظ کو اُس لفظ سے کیا تعلق ہے۔ یہ بھدی ترکیب ہے۔ وہ سب مولوی صاحب کی خوش فہمی ہے۔ جن میں سے بعض بندوں کو بندۂ نے شرح کرکے سمجھا دیا ہے۔ اِس سے زیادہ اِس کتاب میں لکھنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ سخن فہم ناظر کتاب خود انصاف کرلیگا۔ کہ مولوی صاحب جس لفظ کو غیر مربوط بتاتے ہیں۔ وہ مربوط ہے۔ علاوہ اس کے اسی زمانہ میں ایک کتاب لفظ بلفظ موازنہ مولوی شبلی صاحب کی تردید میں میرے دوست اور اُستاد بھائی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس مہابن نے لکھی ہے٭۔ اس لئے بھی میں نے اپنی کتاب میں بعض جزئی اعتراضات مولوی شبلی صاحب کا جواب نہیں دیا۔ اس کتاب کا نام "المیزان" ہے اور اس کا ذکر خیر میں ایک اور جگہ بھی کرچکا ہوں۔ اور یہاں بھی عمداً دوبارہ کیا۔ تاکہ ناظرین اُس کتاب کو بھی دیکھیں۔ اور ذیعلم مؤلف کی محنت و کمال کی داد دیں +

اعتراض ۹ خلاف عقل

(۹) صفحہ ۲۶۱ پر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ کہ جناب سکینہ کے کہنے سے قبل از وقت سکینہ کو بھی یتیم سمجھ کر اپنے فرزند کے ساتھ اُن کا بھی جناب عباسؑ نے گریبان چاک کردیا۔ خلاف عقل و عادت ہے۔ کیونکہ وہ اُس محبّت کے سبب سے جو اُن کو

٭ اس کتاب کی میں نے لکھنؤ میں شروع ۱۹۱۲ء میں مصنّف کے پاس زیارت کی تھی جو بہمہ وجوہ مکمل تھی۔ شاید میری کتاب سے پہلے یا اس کے بعد ہی وہ بھی چھپ جائے (انشاءاللہ) + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب امام حسینؑ سے بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بند جس پر یہ اعتراض مولوی صاحب کا ہے حسب ذیل ہے:۔

رُوئے شاداں کی تقریر پہ عباسؑ کمال
اور کہا دل سے کہ اس کا بھی کرو رنج سوال
بے پدر ہوگی کوئی آن میں یہ نیک خصال
چاک اُس کا بھی گریباں کیا با حزن و ملال
پیار جو آگیا بنت شہ دیں کے اوپر
بوسے دے دے کے ملی خاک جبیں کے اوپر

ناظرین! انصاف سے فرمائیگا۔ کیا ایسا خیال آنا بھی محبت کے خلاف ہے حضرت عباسؑ اپنے والد ماجد جناب امیرؑ سے سُن چکے ہیں۔ کہ روز عاشورا سنہ ۶۱ھ امام حسینؑ ضرور شہید ہونگے۔ اور قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب میرے بعد اُن جناب کی شہادت ہوگی۔ پھر ایسا خیال کب خلاف محبت ہے۔ مولوی صاحب تو ایسی وہم و وسواس کی باتیں کرتے ہیں۔ جو ہندوستان کے وہمی بھی شاید نہ کریں +

اعتراض ۱۰

(۱۰) صہ ۲۱ پر مولوی صاحب مرزا صاحب کی اس بیت پر (جو جناب زینبؑ حضرت بانوؑ مادر علی اکبرؑ سے خفا ہو کر فرما رہی ہیں:۔

سب جانتے ہیں بنت جناب امیرؑ ہوں
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس کے حقیر ہوں)

سفیہانہ عامیانہ

ان الفاظ سخت میں اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ یہ طریقہ اظہار مقصد کا سفیہانہ اور عامیانہ اور جناب زینبؑ کی متانت و وقار کے خلاف ہے +

مَیں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کو سفیہانہ و عامیانہ الفاظ لکھتے وقت کچھ شرم کرنا چاہئے تھی۔ اعتراض میں ایسی سختی مرزا صاحب تو مرزا صاحب مولوی صاحب کی شان کے بھی خلاف ہے۔ بقول حضرت غالب مرحوم:

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

مرزا صاحب کے کلام کا مفہوم یہ ہے۔ کہ دیکھنے والے شاید یہ سمجھتے ہیں۔ کہ مَیں تمہارے گھر میں رہتی ہوں۔ اس لئے اُن کی نظروں میں حقیر ہوں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔

چنانچہ اس کے بعد ہی کے بند میں تردیداً فرماتی ہیں۔ ع گھر آپ کا نہیں مرے بھائی کا گھر ہے یہ۔ اس عامیانہ وسفیہانہ خیال ہی کو تو مرزا صاحب نے جناب زینبؑ کی زبانی دفع فرمایا ہے۔ افسوس آپ نے یہی بیت لکھ کر اعتراض جڑ دیا۔ آگے کا بند یا کم سے کم ایک مصرع (مذکورہ) نہیں لکھا۔ جس سے یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ مَیں آپ کے اس طریقہ کو عامیانہ وسفیہانہ تو کیا بکار خویش ہشیار بھی نہ کہونگا۔

(۱۱) صہ ۲۶۲ پر یہ بیت لکھ کر کہ

محبوب ہُوں خدائے ذوی الاحترام کا   نانا ہُوں مَیں حسینؑ علیہ السلام کا

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ کیا جناب رسول خدا صلعم بھی امام حسینؑ کا نام علیہ السلام کہکر لیتے تھے؟

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ اگرچہ یہ بیت مرزا صاحب کی تصنیف نہیں ہے۔ کیونکہ جس مرثیہ میں یہ بیت ہے۔ وہ تمام مرثیہ اور کسی کا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس موقع پر علیہ السلام کی لفظ میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جناب رسولؐ خدا بلکہ خود خدا بھی آن پر درود بھیجتا ہے۔ اولئك عليهم صلوة من ربهم ورحمة آیۂ قرآنی شاہد ہے۔ کہ خدا اپنے مصیبت زدہ پیارے بندوں پر صلوات بھیجتا ہے۔ جس کا مرتبہ سلام سے بھی اعلےٰ ہے٭ اور اس آیہ کے مصداق امام حسینؑ کو سمجھنے میں غالبًا مولوی شبلی صاحب کو بھی عُذر نہ ہوگا۔ اور جناب رسول خدا صلعم نے اپنی اہلبیت اطہارؑ کی نسبت جن میں امام حسینؑ بھی ہیں فرمایا ہے۔ کہ صغیرنا وکبیرنا سواء ہمارے چھوٹے بڑے برابر ہیں۔ اور عام مُورخین اسلام وغیر اسلام لکھتے ہیں۔ کہ جناب

٭ خدا صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ تو رسول خدا کا سلام بھیجنا کیوں نامناسب ہوسکتا ہے۔ رسولؐ تو خدا کے تابع اور بندۂ مقبول ہیں۔ جن کے اخلاق میں خدا کے اخلاق کا پرتو ہے۔ خدا اپنے پیارے بندوں پر سلام بھی بھیجتا ہے۔ جن میں سے امام حسینؑ بھی ہیں۔ پس رسول خدا کا سلام بھیجنا عین بلاغت اور مقتضائے حال کے موافق ہے ۱۲ مؤلف۔

اعتراض تعظیم و درود علیہ السلام

رسول خدا صلعم اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ کی تعظیم کو سرو قد کھڑے ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب! خاص کسی فرقہ کے مذاق سے جب تک آپ آگاہ نہ ہوں۔ ہرگز اعتراض فرمائیے نہ خاندان خدا کی شان کو عوام کی شان سمجھ کر اعتراض کیجئے۔ یہ اخلاق محمدی کے بالکل مطابق ہے گو ... کے خلاف ہو۔ اور یہ مقولہ جناب رسول خدا صلعم اُن جناب کی زمانہ حیات کا بھی نہیں ہے۔ بلکہ لبعد شہادت امام حسینؑ وقت دفن حضور صلعم امام زین العابدینؑ سے فرمارہے ہیں۔ اور ایسا اعتراض کرنے سے پہلے آپ کو یہ ثابت کرنا لازم تھا کہ مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز ہے۔ حالانکہ ایسا فرض بھی کرلیا جائے جب بھی (بوجوہ مذکورہ) اعتراض نہیں ہو سکتا ہے۔

مرثیہ اور ڈرامہ

(۱۲) ص ۲۶۳ پر یہ دو بند مندرجہ ذیل لکھ کر

۱۲ اعتراض مستورات ہند

یہ بات سُن کے بنڑی نے گھونگھٹ اُلٹ لیا — عبّاسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا
صدقے مَیں تم پہ یاں سے سرک جاؤ اک ذرا — تم سب کے آگے روتے ہُوئے آگئی حیا
ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر — جی بھر کے رولے یہ بنی قاسم کی لاش پر[1]

ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا — کبرےٰ نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا
ہم کچھ کہیں جو مانیئے اے شاہ کربلاؑ — احسان ہو گا لاش کو رکھ دیجئے ذرا
بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں — ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں[2]

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ "مرزا صاحب اور دیگر تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم کی عادات و مراسم ہندوستان کی شرفا کے مستورات کے مطابق فرض کئے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت کبرےٰ کا اپنے چچا اور باپ اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے

---

[1] ایک بند اس موقع پر اور بھی لکھا ہے۔ مگر اعتراض اُس بند سے متعلق نہیں۔ اس لئے مَیں نے وہ بند نہیں لکھا + ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ بند مرزا صاحب کا نہیں ہے۔ کسی ذاکر نے آخر کے سات بند ملائے ہیں۔ جن میں سے پہلا یہ بند ہے۔ مگر مَیں نے اس سے بحث نہیں کی ہے کہ کس کی تصنیف ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ ع جس نے کہا درست کہا اور بجا کہا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں۔ کس قدر بے حجابی اور شرم ہے۔ طرہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں۔ کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئیگی۔ لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی"۔

جواب بے خوش فہمی

مَیں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی خوش فہمی کی یہ معراج کمال ہے۔ کہ وہ اس قول کا قائل "جی بھر کے رو لے یہ بنے قاسم کی لاش پر" جناب کُبرے کو سمجھ گئے ہیں۔ حالانکہ یہی مصرع اگر اُن کی زبانی ہوتا۔ تو یُوں ہوتا۔ ؎ جی بھر کے رولوں مَیں بنے قاسم کی لاش پر۔ مولوی صاحب خود ہی یُوں لکھ رہے ہیں ؎ جی بھر کے رو لے یہ بنے قاسم کی لاش پر۔ اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کا قائل کوئی دُوسرا ہے۔ وہ کون؟ اُوپر کے بند ملا کر پڑھنے سے ثابت ہوگا۔ کہ اس کی کہنے والی جناب بانوؑ مادر فاطمہ کُبریٰ ہیں۔ اُوپر کا بند مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی یا خدا معلوم کس خیال سے نہیں لکھا۔ وہ بند یہ ہے۔ ؎

ناگاہ کی یہ فاطمہ کُبریٰ نے گفتگو	لوگو کوئی ذرا مرے والی سے پُوچھ لو
گھونگھٹ میں اُلٹوں بال مَیں کھولُوں جو تم کہو	ماں بولی اب نہ شرم کرو سر کو کھول دو
سر ننگے تم کو جانا ہے انبوہ عام میں	چھپنے گا شمر اوڑھنے آکر خیام میں
یہ بات سُن کے بنڑی نے گھونگھٹ اُلٹ لیا	عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا

یعنی حضرت بانوؑ نے صدا دی۔ کیونکہ انہیں کا مقولہ اُوپر سے چلا آتا ہے۔ (اس موقع پر مَیں یہ نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب کے سامنے آتے ہوئے شاید خوش فہمی کو بھی شرم آتی ہے۔ ورنہ اُن کے ہواخواہ بگڑ جائینگے۔ کہ اُن کو ہماری سختی گو وہ جواب میں ہی ہو۔ نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب کی سخت کلامی نہیں دکھائی دیتی)۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ یہ جو کلیہ مولوی صاحب نے قائم کیا ہے۔ کہ تمام مرثیہ گویوں نے عادات و رواسم نسوانِ شرفائے ہند کے موافق عادات اہل حرم کو فرض کیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مرثیہ گویوں نے اور خصوصاً جناب مرزا صاحب نے کہیں رواسم ہند کے موافق اور کہیں رواج عرب کے

رواج عرب

مطابق تخئیل فرمائی ہے - اگر محض رد اسم اہل ہند کے مطابق ہر جگہ تخئیل ہوتی - تو ہودج کجاوہ محمل کی جگہ سب مرثیہ گو پینس - ڈولی - رتھ - گاڑی وغیرہ لاتے - کہ ہندوستان کی شریف زادیاں ان سواریوں میں سوار ہوتی ہیں - حالانکہ تمام مرثئے دیکھ جائیے - کہیں ڈولی - پینس - گاڑی وغیرہ کا نام نہیں ہے - اب یہ بھی سُن لیجئے - کہ عرب کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح شرم نہیں کرتیں - بلکہ اس کو وہ مصنوعی وریائی شرم سمجھتی ہیں - ہر ملکے و ہر رسمے مثل مشہور ہے - چنانچہ میں ۱۳۱۱ھ میں بمقام (بغداد) کاظمین شیخ علی و شیخ حسین صاحبان کے مکان میں مع مستورات کے ٹھیرا ہُوا تھا - ہمارے ساتھ اور بھی ہندوستان کے شرفاء کے چند خاندان مقیم تھے - شیخ حسین صاحب کی جوان ناکتخدا بیٹی کو ایک روز اُن کے چچازاد بھائی پسر شیخ علی نے ایک جوڑی جُوتی لاکر دی - وہ ہماری عورتوں کے پاس دکھانے کو لائیں - ہماری عورتوں نے پُوچھا - کس نے تم کو یہ جُوتی دی - اور تم اُن سے کیا باتیں کر رہی تھیں - تو اُنھوں نے جواب دیا - کہ یہ میرا دُولھا ہے ✻ عورتوں نے پُوچھا - تمہاری شادی ہو چکی ہے - کہا ابھی نہیں - صرف نسبت ہُوئی ہے - عورتوں نے کہا - تم دُولھا کہتی ہو - اور اُن سے باتیں کرتی ہو - تمکو شرم نہیں آتی - اُس لڑکی نے جواب دیا - کہ ایسی مصنوعی جھُوٹی شرم تم ہندیوں میں ہے - ہم میں یہ مکّاری سمجھی جاتی ہے + مولوی صاحب ایمان سے فرمائیگا - کتب احادیث صحاح ستّہ وغیرہ میں جو حدیثیں ازواج رسولؐ جناب امّ المومنین عائشہؓ وغیرہ سے مجامعت .. پیشاب وغیرہ وغیرہ کے متعلق منقول ہیں - کیا ایک ہندی عورت ایسی باتیں بالخصوص مردوں سے کہہ سکتی ہے - نہیں ہرگز نہیں - بلکہ رواج عرب کے موافق وہ سب باتیں کہی گئی

حکایت واقعی

✻ یہ شیخ حسین و شیخ علی حبیب ابن مظاہر اسدی کی نسل میں سے صحیح النسب عرب ہیں - ہندوستان کی مرد عورتیں آئے دن اُن کے یہاں اُترتی ہیں - اس لئے اُن کی عورتیں اردو بھی اسی طرح بولتی ہیں جیسی عربی و فارسی - ہندی عورتوں سے وہ سلیس اردو میں بات چیت کرتی ہیں + ۱۲ ثابت ہیچمدان -

ہیں۔ یہ تو مرزا صاحب کی کمال بلاغت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قضیہ زمین برسر زمین جس ملک عرب کی شاہزادیوں کا حال وہ لکھ رہے ہیں۔ وہیں کی شاہزادیوں اور شرفازادیوں کے رواج و عادات کو پیش نظر رکھ کر تخئیل فرما رہے ہیں۔ آپ تو ماشاءاللہ اکثر بلاد عرب مصر و شام وغیرہ کی سیر فرما چکے ہیں۔ مگر خدا معلوم وہ سب آپ کی معلومات مرزا مرحوم پر اعتراض کرتے وقت کہاں سفر کر جاتی ہے۔ یہ بھی سن لیجئے۔ کہ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا بالکل ابتدائی مشق زمانہ شیخ مصحفی کا ہے۔ جس پر بنڑی کی لفظ دلالت کر رہی ہے۔ یہ لفظ بعد کے مرثیوں میں مرزا صاحب نے ترک کر دی ہے۔ ابتدائی مرثیوں کے الفاظ جوں کے توں رہنے دئے۔ کہ زمانہ تصنیف کا پتہ ایسے ہی لفظ سے ملتا ہے۔ اور یہی جواب اُس اعتراض کا بھی ہے۔ کہ جو موازنہ کے صفحہ ۲۴۶ پر مولوی صاحب نے کیا ہے۔ کہ جب فاطمہ کبریٰ نے اپنے بھائی امام زین العابدینؑ سے شہدا کے دفن کے وقت کہا ہے۔ کہ ع بھائی صاحب مرے دُولھا کو بھی اب دفن کرو۔ یہ قول بھی رواج نسوان عرب کے مطابق ہے۔

اعتراض ۱۳۶ سوقیانہ جواب

(۱۳۶) صفحہ ۲۶۸ پر یہ اعتراض اس مصرع پر ہے ع اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار ہے بیمار۔ "اک بات پکڑلی" عامیانہ و سوقیانہ طرز کی گفتگو ہے۔ میں کہتا ہوں (اور زور دے کر اس لئے کہتا ہوں۔ کہ میری زبان ہے) کہ خاص محلات شاہی اور شرفازادیوں کی یہ زبان ہے۔ ماشاءاللہ اولاد نواب ممتازالدولہ مرحوم و اولاد شاہزادہ والاقدر مرحوم اور ارکان خاندان شاہان اودھ اور اور شرفا لکھنؤ میں موجود ہیں سب سے پوچھ لیجئے۔ مرزا مرحوم کے مرثیوں میں محلات شاہی و شرفائے لکھنؤ کی زبان سب بالاتفاق کہینگے۔ اور مرزا مرحوم کی زبان کی سند محلات شاہی میں لی جاتی تھی۔ بلکہ جناب میر انیس مرحوم تو کبھی کبھی کوئی محاورہ فیض آباد کا بھی نظم فرماتے تھے۔ اور کبھی کبھی خود برسر منبر کہہ بھی دیتے تھے۔ کہ صاحبو اہل لکھنؤ

یوں نہیں بولتے ۔ یہ خاص میری زبان ہے ۔ جس سے اُن کی مراد وہی فیض آبادی زبان ہوتی تھی*+ ناظرین ! ہمیں یہ بھی نہ کہونگا ۔ کہ مولوی صاحب نے (باوصفیکہ وہ زبان سے ناواقف ہیں ۔ مگر) یہ اعتراض عامیانہ کردیا +

(۱۴) صفحہ ۲۸۱ پر ایک شعر میر صاحب کا دوسرا مرزا صاحب کا حسب ذیل لکھا ہے :۔

۱۴ اعتراض مبالغہ موازنہ

میر انیسؒ	مرزا دبیرؒ
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی	مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی	ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

اور لکھا ہے ۔ کہ معنوی حیثیت سے بھی میر صاحب کا شعر بڑھا ہوا ہے ۔ میر صاحب کے

* اس موقع پر واقعات انیس مؤلفہ میر احسن صاحب کے صفحہ ۱۲ و ۱۳ کی تھوڑی سی عبارت نقل کردینا احسن معلوم ہوتا ہے ۔ اور وہ یہ ہے "میر انیس کی شاعری نے لکھنؤ پہنچ کر شہرت حاصل کی ۔ اس میں تو کسی کو کلام نہ ہوگا ۔ مگر اُن کی تربیت کیلئے لکھنؤ جولانگاہ نہ تھا ۔ معہ اب ہم سے سنئے میر انیس کے بزرگوں کا سلسلہ ملازمت خاندان بہو بیگم صاحبہ سے برسوں رہا ہے ۔ اور لکھنؤ میں یہی خاندان سالارجنگ کی زبان اردو کا معیار مانی جاتی تھی فیض آباد میں محاورہ زبان اصطلاحات ضرب المثل وغیرہ کا ایک دفتر تھا جس کے میر منشی میر انیس کے جدامجد اور اُن کے بعد والد ماجد رہے ہیں ۔ یعنی جب کوئی محاورہ اردو کا محلات سے نیا تراش کر نکالا جاتا تھا ۔ تو جس نصاب میں قلمبند ہوتا تھا کہ جس کی سردفتری کی خدمت خاندان میر انیس کے متعلق تھی ۔ اس وجہ سے اُن کی تربیت و تہذیب کا معیار فیض آباد ہی میں قائم ہو چکا تھا ۔ اہل لکھنؤ کو اُن کی زبان سے فیض پہنچا ہے ۔ ایک اور استدلال بھی قابل تحریر ہے یعنی میر انیس مرحوم کو مجمع عام میں ہر شخص نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا ۔ کہ یہ میری اپنی زبان ہے ۔ حضرات لکھنؤیوں نہیں تحریر فرماتے ۔ یہ فخر اُن کو اس دفتر کی بدولت حاصل ہوا تھا ۔ اہل دہلی میر انیس کے اس قول سے اُن کی زبان و محاورہ کا انتساب دہلی سے کرتے ہیں مگر فقط دل خوش کن باتیں ہیں ۔ واقفان راز اس کو خوب جانتے ہیں" یہ عبارت میں نے واقعات انیس کی اس لئے لکھ دی ہے ۔ کہ میرے قول کی تائید ہوتی ہے ۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ دفتر فیض آباد میں تھا یا نہیں اسکی مجھے تحقیق نہیں ہے ۔ بہرحال اہل لکھنؤ کی زبان سے بعض محاورے اُن کے خلاف ضرور تھے + ۱۲ مؤلف حقیر ۔

یہاں مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مچھلی سیخ موج تک آنے کے ساتھ فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا۔ اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا +

جواب میں کہتا ہوں۔ ماشاء اللہ چشم بد دور۔ مولوی صاحب جو بات فرماتے ہیں۔ وہ اُلٹی ہوتی ہے۔ معنوی و لفظی دونوں حیثیتوں سے مرزا مرحوم کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ اوّل تو ایک شعر میں اُن کے یہاں کئی باتیں ہیں۔ (۱) ہر حباب کو تنور سے تشبیہ دی۔ جو گولائی و گرمی کے سبب سے مناسب ہے۔ (۲) موج کو سیخ سے استعارہ کیا ہے۔ میر صاحب کے یہاں صرف ایک بات آخر الذکر ہے۔ دوم مرغابیاں پانی کے اُوپر رہتی ہیں۔ اور موج بھی سطح آب کے اُوپر آتی ہے۔ پس فوراً کباب ہونے کا خیال اس میں ظاہر ہے۔ اور اس راہ سے مبالغہ اس میں زیادہ ہے۔ جو بقول معترض صاحب شعر کی جان ہے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بات کہاں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ جب مچھلی اُبھر کر سیخ موج تک آتی تھی۔ جب کہیں کباب ہوتی تھی۔ مولوی صاحب کے فہم عالی کا پھیر ہے۔ خیال کی سیخ ٹھیری تھی۔ اس لئے کباب اعتراض کچّا رہ گیا +

اعتراض ۱۵ اور بیکسی صاحب (۱۵) صفحہ ۲۱۲ و ۲۱۵ پر فرماتے ہیں۔ کہ میر انیس بھی مذاق عام کی پیروی سے اکثر بھٹکے ہیں۔ اور بے راہ نکل جاتے ہیں + میں کہتا ہوں۔ کہ مبالغہ و حسن تعلیل وغیرہ جو چیزیں ایشیائی شاعری کی جان ہیں۔ اور مرزا مرحوم کے یہاں جس کی بہتات ہے۔ اور میر صاحب کے یہاں بھی کہیں کہیں ہیں۔ اُنہیں چیزوں کو مولوی صاحب بُرا سمجھتے ہیں۔ اور میر و مرزا کے ساتھ تمام ملک کو بد مذاق کہتے ہیں۔ خدا اُن کو راہ راست پر لائے۔ یہ بد مذاقی نہیں ہے۔ خوش مذاقی ہے۔ ؎

کہیں خضر بیابان بلاغت بھی بھٹکتے ہیں
وہ خود بھٹکا ہوا ہے جو اُنہیں بھٹکا ہوا سمجھے

اعتراض ۱۶ (۱۶) صفحہ ۲۵۴ پر مرزا صاحب کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ تشبیہات کہیں

پھبتیاں بن جاتی ہیں + مَیں کہتا ہُوں - یہ ادّعا بھی بالکل غلط ہے - مرزا صاحب ایک ذی علم ماہر فن شاعر ہیں - اُن کی تشبیہات اعلٰے درجہ کی ہوتی ہیں - کبھی پھبتیاں نہیں بنتیں - تشبیہیں اُن لوگوں کے کلام میں پھبتیاں بنتی ہیں - جو کم علم شاعر ہیں - معانی و بیان سے ناواقف ہیں +

مرزا صاحب کی تشبیہیں اور پھبتیاں

(۱۷) صفحہ ۲۶۹ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھ کر سے

مرزا دبیر کا لنگر ماتم

پھر ہاتھوں پہ اصغر کو رکھا کر کے یہ زاری — لٹکائے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آتے ہیں واری — اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری
پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلالوں — آ - چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں

لکھتے ہیں کہ صغرٰے کا رخصت کے وقت علی اصغر کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت دردانگیز سماں ہے - لیکن مرزا صاحب ایسے دردانگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے + مَیں کہتا ہُوں - کہ مرزا صاحب کا بند مذکورہ تاثیر درد سے بھرا ہُوا ہے - مگر افسوس مولوی صاحب کے دل پر اثر نہیں ہوتا - مَیں اپنا دل کیونکر مولوی صاحب کے دل میں رکھ دوں - کس غضب کا قدرتی نظارہ اس مصرع میں دکھایا ہے - کہ ع لٹکائے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری - بچہ جس سے ہلا ہوتا ہے - اُس کی طرف یونہیں ہمکتا ہے پھر اُس کے ساتھ ہی ماں کا یہ کہنا - کہ لو یہ خود گود میں آتے ہیں - پھر صغرٰے کا ہاتھ اُٹھا کر یہ حسرت آمیز الفاظ میں کہنا - کہ دیکھئے پھر مَیں جیتی ملوں یا نہ ملوں - اور اُس کے ساتھ ہی "بلالوں" کا لفظ جو عورتوں کا خاص محاورہ ہے - کس قدر حسرت سے بھرا ہُوا ہے - اور اُس کے بعد یہ کہنا - کہ "آ - چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں" کس قدر سلیس نظم ہے - جس کو نثر کیجے - تو ایک لفظ بھی نہیں بڑھ سکتا - اُس کی نسبت مولوی صاحب فرماتے ہیں - کہ تاثیر کا رنگ نہیں - اور کیسا رنگ ہوتا ہے - اس کے مقابلہ پر میر صاحب کا یہ بند لکھ کر سے

بندِ مقابل مرزا صاحب کا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری | اصغر مرا روتا ہے سدا اُس کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری | آ۔ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم | اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

لکھتے ہیں۔ کہ میر صاحب نے پُورا دردِ دل کس مُوثر طریقہ سے کہا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہکر رہ گئے۔ ع آ۔ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں۔ اور مرزا صاحب کا یہ مصرع اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری۔ میر صاحب کے اس مصرع کے جواب میں ہے۔ ع وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری۔ لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ میر صاحب کے یہاں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کردی ہے۔ اور ننھے سے مسافر اور چھوٹے مسافر والے دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے +

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ یہ تو خدا کو علم ہے۔ کہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا جواب لکھا ہے یا مرزا صاحب نے۔ یا دونوں نے بطورِ خود فکر فرمائی ہے۔ اور ہر ایک لاجواب ہے۔ مولوی صاحب کا جو دعوےٰ ہے۔ وہ بلا دلیل غیر مشتبہ ہے مصرع دونوں کاملوں کے اچھے ہیں۔ بیشک میر صاحب کے مصرع میں ہاتھوں کے ساتھ کانپتے کی قید اچھی اور مُوثر ہے۔ مگر اُس کے ساتھ مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ "لٹکائے ہاتھ اُس سے ہمک کر کئی باری" غضب کا مُوثر و درد انگیز قدرتی کنایہ ہے۔ اور دونوں مصرعوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ مولوی صاحب کے فہمِ عالی کا فرق ہے +

اعتراض ۱۸ "میں" کا لفظ

(۱۸) صفحہ ۴۲۴ و ۴۲۵ پر مرزا صاحب کی یہ ٹیپ لکھ کر سے

قطرے سے مگر بحث میں میں صرف نہیں ہُوں | دریا ہُوں سخن کا میں تنگ ظرف نہیں ہُوں

مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دُوسرے مصرع میں مَیں کا لفظ محض فضول ہے۔ پہلے مصرع میں مَیں کا لفظ آ چکا ہے + مَیں کہتا ہُوں۔ ہرگز محض فضول نہیں ہے۔ روزمرّہ کی خوبی یہی ہے۔ کہ انسان اگر دس فقرے بولتا ہے۔ اور ضرورت ہوتی ہے۔ تو ہر جگہ

جواب

مَیں کہتا جاتا ہے۔ پس یہ تو نظم کی خوبی ہے۔ کہ (بقول حقیر ثابت) ؎

تحریر میں تقریر کا عالم نظر آئے   تقریر میں تصویر کا عالم نظر آئے

اور اِس بات کا بیّن ثبوت کہ نثر میں ایسے قریب قریب "مَیں" بولتے ہیں۔ خود مولوی صاحب کی نثر مندرجۂ موازنہ صفحہ ۳ ہے۔ کہ مولوی صاحب دو متصل فقروں میں **دو جگہ "مَیں"** کا لفظ لائے ہیں۔ وہ دونوں فقرے یہ ہیں۔ (۱) **مَیں** اُن سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکا۔ (۲) شعر العجم میں **مَیں** اِس مضمون کو انشاء اللہ نہایت تفصیل سے لکھوں گا۔ دیکھئے پہلے فقرۂ متصل میں مَیں آچکا۔ اب پھر "مَیں" کیوں لائے۔ اِس کا جواب معقول یہی ہے۔ کہ روزمرّہ میں یُونہی بار بار "مَیں" کا لفظ بولا جاتا ہے **مولوی صاحب!** آنچہ بر خود نپسندی بر دیگرے مپسند۔ **آپ** مرزا مرحوم پر اعتراض کرتے وقت ایسے جوش میں بھر جاتے ہیں۔ کہ وہ جوش تمام تجربات کو دماغ سے نکال دیتا ہے۔ اور یہ بھی خیال نہیں رہتا۔ کہ ہم خود کیا لکھ چکے ہیں +

اعتراض ۱۹ بے تعلق

(۱۹) اسی طرح ص ۲۴۶ پر اِس مرثیہ ؎ **کس شبیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے**" کے چار بند لکھ کر اور لفظ **انا العبد** کو خلاف سلاست اور مصرع "جان غیر بدن غیر مکان غیر مکین غیر" کو بیگانہ بتا کر فرماتے ہیں۔ کہ "یہ بند چہارم ؎

بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار   خوابیدہ ہیں سب طالع عبّاس ہے بیدار

اُوپر کے بند سے دفعتًہ اس قدر بے تعلق ہو گیا ہے۔ کہ مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ "ان" کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت عباس کا ذکر صرف پہلے بندوں میں آیا تھا جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے۔ اِس لئے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہیں ہوتا" + مَیں کہتا ہُوں۔ کہ نہ **انا العبد** سلاست کے خلاف ہے۔ نہ **جان غیر** الخ والا مصرع بیگانہ ہے۔ نہ "ان" کے مشار الیہ حضرت عبّاسؑ کے سمجھنے میں کوئی ذہن کو دقّت و تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ معترض صاحب کی **اصول مرثیہ** سے **ناواقفی ہے**۔

جب اُوپر کے بندوں میں صاف معلوم ہوچکا کہ حضرت عبّاسؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔ تو اب جہاں کہیں اُن یا اِن کے ضمائر آئینگے (بشرطیکہ قرینہ سے اور کوئی مشار الیہ نہ ہو)۔ وہی حضرت عبّاسؑ مراد لئے جائینگے۔ اس کے علاوہ دُوسرے مصرع میں حضرت عبّاسؑ کا نام موجود ہے۔ اضمار قبل الذکر اردو و فارسی میں سلیس و فصیح ہے برخلاف عربی کے۔ پس یہاں بھی ان سے مراد وہی حضرت عبّاسؑ ہیں۔ جن کے حال میں تمام مرثیہ ہے۔ اور میرے پاس کے قلمی مرثیہ میں جو والد مرحوم کے ہاتھ کا (قلمی) تبرّک ہے۔ اور غالباً چالیس برس پہلے کا لکھا ہُوا ہے۔ یہ دونوں مصرع یُوں (مقدّم و مؤخّر) ہیں:۔

خوابیدہ ہیں سب طالع عبّاسؑ ہے بیدار بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار

اور غالباً مرزا مرحوم کے خاص لبستہ کے مرثیہ کی وہ نقل ہے۔ اِس لئے وہی زیادہ صحیح ہے۔ اس صورت میں اضمار قبل الذکر بھی نہیں آتی۔ اور اعتراض ہی نہیں ہوسکتا۔ باقی جو "خوابیدہ" و "بے ہوش" الفاظ پر مولوی صاحب نے بے ربطی کا ادّعا کیا ہے۔ اُس کا مَیں بجز اس کے کیا جواب دُوں۔ کہ فہم عالی کا قصور ہے صنعت طباق و تضاد کو جو شخص بے ربط کہے۔ اُس کا کیا علاج؟

حقیقت موازنہ

(۲۰) یہ بات بھی قابل تحریر ہے۔ کہ مولوی صاحب نے اپنی کتاب کا نام تو موازنۂ انیس و دبیر رکھا ہے۔ اور ۲۸۵ صفحے کی وہ کتاب ہے۔ پندرہ سولہ صفحے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھنے میں صرف فرمائے ہیں۔ باقی قریباً دو سو صفحہ پر کلام میر انیس مرحوم مع تنقید و مدح درج ہے۔ مرزا دبیر مغفور کے کلام کے واسطے فقط پندرہ سولہ ورق صرف کئے ہیں۔ اور اکثر وہ کلام لکھا ہے۔ جو اُن کے نزدیک قابل قدح ہے کیوں اے انصاف پسند ناظرین!! کیا موازنہ کی یہی شان ہے۔ اور اِس کتاب کو موازنہ کہ سکتے ہیں۔ مرزا دبیرؒ (جن کی مطبوعہ بیس جلدیں اور اسی قدر غیر مطبوعہ بتائی جاتی ہیں) کا کلام تو پندرہ سولہ ورق میں

لکھا جائے۔ اور میر انیس مرحوم کے واسطے دو سو صفحے وقف کئے جائیں (جنکی تصنیف مطبوعہ پانچ چھ جلدوں سے زیادہ نہیں ہے)۔ کیا یہی انصاف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ **بفرض محال** اگر کل کلام دبیر مندرجۂ موازنہ بھی سُست ہو۔ جب بھی تو کمالات دبیر میں فرق نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ کلام تو کل کلام کا ۱/۱۰۰ حصّہ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی شاعر کے ۹۹ شعر اچھّے ہیں اور ایک سُست ہے۔ تو کیا وہ شاعر قابل قدح ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ مولوی صاحب کا انصاف قابل غور و انصاف ہے۔

کتابت کی غلطی اور میر انیس؟

(۲۱) **ناظرین!** تمام اہل علم عموماً اور وہ لوگ جن کو اپنی تصانیف چھپوانے کا کام پڑتا ہے خصوصاً اِس بات کو خوب جانتے ہیں۔ کہ کاتب عموماً کم علم ہوتے تھے اور ہوتے ہیں۔ باوصفیکہ بڑے بڑے مطبعوں میں مصحح بھی نوکر ہوتے ہیں۔ اور عموماً کاپی و پروف کی صحّت و درستی کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چھاپہ میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کاپی نویس و مصلح سنگ اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ مگر ہمارے **مولوی شبلی صاحب** (باوصفیکہ تمام عمر گویا کتابیں چھپواتے رہے) ہم کو اس کی بھی عموماً اجازت نہیں دیتے۔ کہ جو مصرع غلط چھپا ہے۔ وہ ہم صحیح بتا دیں۔ اور معترض مان لے۔ صفحہ ۲۰۲ و ۲۲۷ و ۲۳۰ پر فرماتے ہیں۔ کہ گو اکثر مرثیئے غلط چھپے ہیں۔ مگر جو میر صاحب کی طرف سے میرزا محمد رضا صاحب معجز نے **نسّاخ** کے اعتراضوں کا جواب دے دیا ہے۔ کہ صحیح مصرع یوں ہے۔ اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ ہر جگہ غلط نویسی کا عذر نہیں کام آسکتا۔ اگر اس کو وسعت دی جائے۔ تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوے کیا جاسکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا"

ناظرین با تمکین! مجھے اوّل تو اس موقع کو دیکھ کر یہ حیرت ہوئی۔ کہ مولوی شبلی صاحب یہاں مرزا صاحب کو کیوں فراموش فرما گئے۔ جیسے **سرقات** کے ذکر میں خطوط وحدانی میں مرزا دبیر کو لکھا تھا۔ یہاں کیوں نہ لکھا۔* **غور کرنے سے اِس کی**

وجہ یہ معلوم ہوئی۔ کہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں جو دو جلدوں میں چند مرثئے اوّل مرزا مرحوم کے چھپے تھے۔ اور وہی مرثئے بعد کو دفتر ماتم کی جلدوں میں جا بجا چھپے۔ تو اُن اوّل کے مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند اور مصرع کے مصرع کچھ کے کچھ اور غلط سلط نظر آئے۔ اور ان مرثیوں (دفتر ماتم) میں اکثر صحیح ہیں۔ یہاں تک کہ کاتب نے دو دو بندوں کو (جلد ہائے نولکشوری میں) مختصر کر کے ایک بند میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً بند اوّل میں قافئے صابر شاکر وغیرہ (تھے) اور بند ثانی میں داور۔ لشکر وغیرہ تھے۔ تو آٹھ مصرع کے چار کر دئے۔ ایک ٹیپ اُڑا دی۔ دو بند کا جب ایک بند ہُوا۔ تو وہ بند بھی بے ربط نظر آیا۔ اور قافئے بھی صحیح نہ معلوم ہوئے۔ تو اب یقین ہو گیا۔ کہ وہ پہلے کی کتابت محض غلط تھی۔ اور ہرگز مرزا صاحب ایسے ذیعلم واقف رموز شاعری شاکر کا قافیہ لشکر نہیں لا سکتے تھے۔ اور مرزا صاحب کی انسبت اب ایسے اعتراضات کی گنجایش مولوی صاحب نے نہ دیکھی۔ کیونکہ نسّاخ کے اعتراضات اُنہیں مطبوعہ سابق مرثیوں کی بنا پر تھے۔ میرزا محمد رضا صاحب معجز۔ کے جوابات قلمی مرثیوں کے مطابق تھے۔ جو (مرزا صاحب کے) بعد کو دفتر ماتم میں چھپ بھی گئے۔ تو دیکھنے والے کو دونوں مرثئے مطبوعہ سابق و حال دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے۔ کہ واقعی معجز مرحوم نے جو جوابات دئے ہیں۔ اور جس طرح صحیح مصرع بتائے ہیں۔ اُسی طرح دفتر ماتم میں طبع ہوئے اور صحیح ہیں۔ افسوس کہ میر صاحب کے مرثئے پھر کسی نے اس قدر صحت کے ساتھ بھی نہ چھپوائے۔ جو مولوی صاحب کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اِس سے میری یہ مراد نہیں۔ کہ دفتر ماتم کے تمام مرثئے بالکل صحیح ہیں۔ اب بھی جا بجا غلطیاں ہیں۔ مگر بہ نسبت مطبوعہ مطبع اودھ اخبار کے بہت کم۔ اور بعض غلطی اُنے تامل و غور سے صحیح المذاق ناظر درست کر سکتا ہے۔ خیر اب میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ کہ ایسی تاویلات پر (کہ کاتب کی غلطی ہے۔ مصنّف نے یُوں نہیں۔ یُوں کہا تھا) ہر جگہ مرثیوں

جواب باصواب

(مطبوعۂ مصنفِ انیس) میں اعتبار کرنا لازم ہے۔ اور اس کا فیصلہ میر صاحب کی علمی
قابلیت پر ایک نظر کرنے سے آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کہ جو لفظ چھپ گیا ہے۔
وہ کاتب یا کاپی نویس وغیرہ کی اصلاح ہے۔ اور جو اُن کے ورثا یا تلامذہ کے پاس
قلمی مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ مثلاً میر صاحب کے ایک قلمی مرثیہ
میں ہے ؏ ناگاہ بجا فوج عدو میں دُہلِ جنگ۔ ڈہل کو چھاپہ کے مرثیہ میں طبل
لکھ دیا ہے۔ اور طَبَل بفتحتین لغت کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئے۔
کہ میر صاحب نے دہلِ جنگ اپنے مرثیوں میں کہیں اور بھی باندھا ہے یا نہیں۔
جب مرثئے دیکھے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ میر صاحب نے دہل جنگ جا بجا باندھا ہے۔
پس جب کہ اُن کی علمی قابلیت بھی مسلّم ہے۔ اور وہی لفظ دُوسری جگہ اُن کے
یہاں نظم بھی ہے۔ اور ایک قلمی مرثئے میں بھی تحریر ہے۔ تو ہم کو ضرور ماننا چاہئے۔
کہ میر صاحب نے صحیح نظم فرمایا۔ مولوی شبلی صاحب یا نسّاخ یا اُن کے
ہم خیال ہرگز ہم کو مجبور نہیں کر سکتے۔ کہ میر صاحب کو جاہل کہیں۔ اور اُن کی غلطی
کو ہم قبول کریں۔ اور اعتقاد رکھیں۔ کہ جو کچھ غلط سلط چھپ گیا۔ وہی نوشتہ
لوحِ محفوظ کی طرح صحیح ہے۔ اور ہر جگہ غلطی کتابت وطبع کے عُذر کو نہ مانیں +

اب مَیں اسی موازنہ میں جو مصرع مجھے غلط معلوم ہوئے۔ اُن کو ناظرینِ باتمکین
کو دکھانا چاہتا ہوں۔ اور اِس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں۔ کہ جب مولوی شبلی صاحب
ایسے ذی علم (شمس العلما) ہو کر اس کثرت سے غلطیاں کر رہے ہیں۔ تو اُن
کم مایہ کاتبوں کی غلطیوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جن میں سے اکثر دستور الصبیان
تک پڑھے ہوئے نکلتے یا ہیں۔ یہ بھی کہدوں۔ کہ مولوی صاحب کو اِس موازنہ
مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۰۷ء کی صحّت بھروسہ ہے۔ ورنہ وہ باصحّت نامہ
(غلط نامہ) اِس کے ساتھ لگاتے۔ یا معذرت فرماتے۔ کہ اِس میں جا بجا چھاپہ

کی غلطیاں ہیں - اور یہ مطبع صوفی صاحب کا خوش خطی و صحت میں مشہور بھی ہے۔ باایں ہمہ یہ غلطیوں کی کثرت ہے۔ تو دوسرے معمولی مطبعوں میں کس قدر زیادہ غلطیاں ہوتی ہونگی +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
۱۱۲	تھی جتنے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے	تھی جن سے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے مصرع مطبوعہ بےمعنی ہے +
۲۴۰	کہتے ہیں جسے عاشق شید الملک وناس	کہتے ہیں جسے عاشق وشید ملک وناس عاشق وشید اکے درمیان میں واؤ عاطفہ اڑ گئی اس کی شرح اُوپر میں لکھ چکا ہوں۔ اور یہ بھی بتا چکا ہوں۔ کہ دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے۔ اس لئے دو ہرے لفظ لاتے ہیں +
۲۴۰	کفار بڑے طیش سے ہونٹوں کو دبا کے	کفار بڑے طیش سے ہونٹوں کو چبا کے دوسرا مصرع یہ ہے۔ ع دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے چبا و دبا مقید قافئے ہیں۔ ورنہ پھر قافیہ کیا ہوگا۔ اور ہونٹوں کو غصہ میں چبانا محاورہ ہے ملنا نہیں ہے +
۲۴۰	اس سر پہ دھرے ہات بقسمیہ اجل ہے	اس سر پہ دھرے ہات یہ قسمیہ اجل ہے بہ بائے موحدہ سے غلط ہے۔ یہ یائے تحتانیہ سے چاہئے +
۲۴۰	منکر نکرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے	منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		مُنکر کی جگہ مُن کر لکھ دیا ہے۔ یہاں مُنکر سے مراد منکر کمالات دبیر سے ہے۔ جیسے مولوی شبلی صاحب +
۲۴۲	ملبوس قلم کار نہ دوں ہے نہ پُرانا۔	ملبوس قلم کار نہ دوں۔ ہے یہ پُرانا "یہ پرانا" کو "نہ پرانا" لکھ کر مصرع تو بےمعنی کر دیا +
۲۴۴	قطرے سے مگر بحث ہیں۔ میں صرف نہیں ہوں	قطرے سے مگر بحث ہیں۔ میں صرف نہیں ہوں یہ مولوی صاحب کی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ کسی کم علم کاتب کی غلطی ہے +
۲۴۵	بے مہری افلاک سے گو خاک بسر ہوں۔	بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں "کیوں" کو "گو" لکھ دیا۔ مصرع بےمعنی ہوگیا۔ اور پھر اعتراض جڑ دیا +
۲۴۸	اب رایت زباں سے علم کروں۔	اب رایت زباں سر منبر علم کردوں۔ "سر منبر" کی جگہ فقط "سے" لکھ دیا۔ نساخ کے بعد مولوی شبلی صاحب معترض ہوئے۔ اکثر انہیں اعتراضوں کو لباس نو میں جلوہ دیا۔ اب کل کو کوئی تیسرے صاحب پیدا ہو گئے کہینگے مرزا صاحب نے مصرع ناموزون کہا تھا +
۲۵۱	جوہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جھُکائے	جوہر نے کنوئیں قعر جہنّم کے جھَنکائے کنوئیں جھنکانا بالفتح جیم ایک روزمرہ خاص

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		ہے۔ جھُکانا بالضم لکھا ہے۔ پیش بھی لگا دیا ہے۔ جو بے معنی ہے +
۲۵۱	مانند سیم مرگ میانِ کمر گئی	مانند ہیم مرگ میان کمر گئی "ہیم مرگ" کی جگہ "سیم مرگ" لکھدیا۔ سیم سے اور مرگ سے کیا مناسبت ہے۔ مرگ میں میم سرے پر ہے۔ کمر میں بیچ میں ہے۔ میان کمر جانا صحیح ہوا +
۲۵۲	بینی جبین ولب سے حسینؑ وخلیل ہے سر پر ہے عرش زیر قدم سلسبیل ہے	بینی جبین ولب سے حسین وجمیل ہے حسین وجمیل مشہور لفظ ہیں۔ اُن کو حسینُ خلیل لکھ کر حسین پر علیہ السلام کا ع بھی لگا دیا۔ مصرع بلکہ تمام شعر مہمل ہوگیا۔ کیا عمدہ شعر ہے۔ ادر بینی کا حسین وجمیل ہونا کس خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ کہ جبین بسرا امامؑ بمنزلہ عرش اور لب گویا سلسبیل ہے +
۲۵۲	باروت تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا	ہاروت سمجھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا اُوپر اس کے یہ مصرع ہے۔ ؎ پر ذوالجناح صاف دھوئیں سے نکل گیا ہاروت وماروت دو مشہور فرشتے ہیں۔ ہاروت کا کنوئیں سے نکلنا ایک مشہور بات ہے۔ افسوس مولوی صاحب یا اُن کے طابعین (تابعین) اس کو بھی نہ سمجھے۔

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		اور پھر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب بلند پروازی میں نظر نہیں آتے میں عرض کرتا ہوں کہ آپنے اعتراضات بیجا کی بارود کا دھواں پھیلا دیا ہے۔ یہ ہٹے تو وہ نظر آئیں +
۲۵۳	کی خود نے خود نمائی سے زیب سر جفا یا دار قد پہ کفر کا بختِ سپر چڑھا	کی خودِ خود نمائی سے زیبِ سر جفا یا دار قد پہ کفر کا بختِ سیہ چڑھا خودِ خود نمائی کیا لطیف استعارہ ہے "نے" کا لفظ اسمیں زیادہ کرکے غلط و بےمعنی بنا دیا۔ اسی طرح بخت سیہ کو بخت سپر لکھا۔ اس فہم کا کیا ٹھکانہ ہے +
۲۵۵	مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی	مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی۔ سب سین غیر منقوط سے ہے جسکو شین منقوط سے لکھ دیا ہے۔ بےمعنی ہو گیا۔ اور شب قافیہ آ بھی چکا ہے۔ یہ بھی نہ سوچا۔ دن کو گویا رات کر دیا +
۲۵۶	ہر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔	پھر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔ ہر سجدہ گاہ کیا معنی۔ اگر ہر سجدہ گاہ کہتے تو بن گئی کہتے کہ سجدہ گاہ مونث ہے۔ مگر خدا جانے مولوی صاحب اس کو بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ سجدہ گاہ کا رواج صرف فرقہ شیعہ میں ہے۔ شیعوں کی اکثر باتوں سے وہ نابلد ہیں +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
۲۵۶	لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی	لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی "حسن کی دولت" کو "رات کو دولت" لکھ کر دن کو گویا شب تار بنا دیا +
۲۵۷	فرماں نور بدر کو پہنچا بدر بدر	فرماں نجوم و بدر کو پہنچا بدر بدر "نجوم و بدر" کی جگہ "نور بدر" لکھ دیا۔ نہ جانے نجوم نے کیا قصور کیا تھا جو اُن کو نکال دیا +
۲۷۵	پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے پیوں گا مولا	پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے میں لوں گا مولا اُوپر "پیونگا" نیچے "میں لونگا" باہم قافیہ ہیں مولوی صاحب نے دونوں جگہ "پیونگا" لکھ دیا۔ قافیہ شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے پھر کہینگے کثیر الکلام شعرا کو اس ایطا کے عیب سے معاف رکھا جائے۔ جیسا کہ میر صاحب کو کہہ چکے ہیں +
۲۸۰	گر میں بقول عمر و شمر ہوں گناہ گار	گر میں بقول شمر و عمر ہوں گناہ گار شمر و عمر کو عمرو شمر لکھ دیا۔ نہ سمجھے کہ شمر بین السکون ہے بفتحتین یا بالفتح ثانی غلط ہے۔ پہلے دہلی کے ایک مشہور شاعر نے یہی غلطی کی تھی۔ اور کہا تھا ع محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا۔ اس پر وہیں کے ایک مشہور شاعر نے کہا تھا ۔ ع

مصرع صحیح مع کیفیت	مصرع غلط	نمبر صفحہ
شمر کو باندھا شمرُ اس نسخے سے تو خوش ہوا اے طرف دار غلط یاں میم ساکن چاہئے مَیں کچھ کہوں۔ تو طرفداران مولوی صاحب بُرا مانینگے۔ اِس لئے خاموش ہُوں +		
روشن پدر کا زور ہے دُنیا پہ دین پر اس لئے کہ دنیا و دین میں عطف ہے۔ اور حالت عطف و اضافت میں اعلان نون اُس زمانہ میں ناجائز تھا جب مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا ہے +	روشن پدر کا زور ہے دنیاؤ دین پر	۲۸۵

واضح ہو۔ کہ موازنہ مطبوعہ میں (کلام انیسؒ و دبیرؒ میں) ایسی بہت سی غلطیاں ہیں۔ مَیں نے چند غلطیاں جو بادی النظر میں معلوم ہُوئیں۔ وہ لکھ دیں۔ کہ ان سے مولوی صاحب کی سخن فہمی کا بھی اندازہ ناظرین سخن سنج و سخن آفرین فرماسکتے ہیں۔ کہ صحیح المذاق سخن سنج چھوٹی غلطی پر غور کر کے اُس کو اکثر دُور کر کے صحیح لکھا کرتا ہے +

اب خاتمہ کا بند یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مَیں نے جو مولوی صاحب کی خوش فہمیوں یا غلطیوں کو نہایت واضح طور پر دکھایا ہے۔ اس کے بھی محرک خود مولوی صاحب ممدوح ہیں۔ کہ وہ موازنہ کے صفحہ ۲۲۶ پر اعتراضات میر صاحب کی سرخی (ہیڈنگ) کی تحت میں لکھتے ہیں (جس موقع پر اُنہوں نے میر صاحب کے کمالات کا اعتراف کر کے اعتراض صحیح کی ضرورت بتائی ہے) کہ "اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں۔ ان میں ہزاروں ایسے ہوتے

ہیں۔جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اور رسلسلہ در رسلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے"۔

مَیں کہتا ہوں۔ مولوی شبلی صاحب کا شمار بھی اکابر قوم میں ہے۔ کہ وہ شمس العلماء ہیں۔ مَیں نے بھی یہی خیال کیا۔ کہ مولوی صاحب کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا اثر زہر کی طرح قوم و ملک میں پھیل جائیگا۔ اور لوگ اُن کی غلطیوں کی تقلید کرنے لگینگے۔ اِس لئے اُن کی غلطیوں کو آفتاب کی طرح واضح کر کے دکھا دیا۔ اور آفتاب کے دھبے گویا اُن کو سمجھا۔ اب مولوی صاحب موصوف اور اُن کے ہواخواہ چاہے مجھے داد دیں چاہے نہ دیں۔ مَیں اپنا کام کر چکا۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست — وگر خاموش بنشینم گُناہ ست

جن ناظرین حق آئین کی آگاہی کے واسطے مَیں نے یہ محنت اِس عالم نا پُرسی میں کی ہے۔ اُن سے امید ہے۔ کہ مجھے بخیر یاد فرمائینگے۔ اور اگر واقعی مجھ سے کہیں غلطی ہُوئی ہے۔ تو مجھے مطلع فرما کر ممنون احسان فرمائینگے۔ (اگر واقعی) میری رائے غلطی پر ہوگی۔ یا واقعات میں کچھ فرق ہوگا۔ تو مَیں انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں بشرطِ حیات بہت خوشی سے شکریہ لکھ کر درست کر دُونگا۔ ورنہ جواب باصواب دُونگا۔

اچھا۔ ناظرین۔ خدا حافظ

اللہ بس۔ باقی ہوس

اب اَور باتیں سُنئے۔ جو حیاتِ دبیرؔ سے متعلق ہیں۔

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و ناثر کامل جناب منشی سید افضل علی صاحب **ضو** بدایونی مقیم لکھنؤ مصنف ردّ الموازنہ (شبلی صاحب) وارشد تلامذہ حضرت **اوج** مظلہ و سابق اڈیٹر ہر روزہ اخبار لکھنؤ:-

کیا بشر سے ہو وصف ذات دبیرؒ
منزحق ہے مکاشفات دبیرؒ
عرفی و انوری و خاقانی
جب کہ واقع ہوئی وفات دبیرؒ
ہیں جو بائیس (۲۲) جلدوں میں مطبوع
غیر مطبوعہ کلیات دبیرؒ
خلف الصدق انہیں خدا نے دیا
لکھے کیا خوب واقعات دبیرؒ

تھے صفات ملک۔ صفات دبیرؒ
عابد و زاہد و کریم و جواد
ہیں یہ سب شاہد نکات دبیرؒ
اُن کے بعد اہل نظم کی خاطر
مرثیے اور نوحہ جات دبیرؒ
ہوئیں پوری بفضلہ جو تھیں
حضرت اوج مثل ذات دبیرؒ
سال تالیف ضو کہو ہجری

جتنے ہیں اہل حق وہ قائل ہیں
حبّذا خوبیٔ صفات دبیرؒ
ساتھ اُن کے ہوا سخن بھی تمام
بس ہے دُنیا میں کائنات دبیرؒ
ہیں ورا۔ ان کے مرثیے اکثر
دین و دُنیا میں خواہشات دبیرؒ
میرے مشفق جناب ثابت نے
۳۰ ۵ ۱۳
زینت بارگہ حیات دبیرؒ

ایضاً

حیات انیسؒ اور اقوال شبلی
ہے تاریخ **ضو** بہر سال مسیحی

ہے رد کرتی ان سب کو تصنیف ثابت
۱۲ ۶ ۱۹
کہی میں نے۔ **ممتاز تالیف ثابت**

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیرؒ نتیجہ افکار شاعر ماہر و خوشنویس جناب منشی سید واجد حسین صاحب صغیر لکھنوی کاپی نویس و ارشد تلامذہ جناب **فصاحت** لکھنوی مدظلہ العالی:-

مجموعۂ مکرمی **افضل حسین** ہے
مضموں کی طرح حجم بھی اس کا کثیر ہے
شبلی کے اعتراض کا ایسا دیا جواب
چرخ سخنوری کا وہ ماہ منیر ہے

ظاہر وقار و شان کلام دبیرؒ ہے
بے عیب ہے اُسی طرح اُن کا کلام مدح
دیکھے جو معترض تو کہے بے نظیر ہے
اقلیم شاعری میں کیا اس سے روشنی

حالات ہیں **دبیرؒ** کے اس میں لکھے ہوئے
معصوم جیسے ذات جناب امیرؒ ہے
کیا ایسے مستند پہ کرے خاک اعتراض
عالم فروز اک یہ چراغ اے **صغیر** ہے

[illegible]

نتیجہ فکر شاعر کامل صاحب دیوان مطبوعہ (مسمی بہ پریخانۂ محبت) و غیر مطبوعہ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب فدا اکبر آبادی میر منشی محکمۂ پولیٹیکل ایجنسی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ ۔ ارشد تلامذہ حضرت منشی غلام محمد خاں صاحب رہا اکبر آبادی مرحوم :۔

قطعہ تاریخ تالیف

۳۰	ھ	۱۳	۲۲	ف النبی	۱۳
عجب عشرت افزائے صاحب دلاں			عجب شانِ و دراں حیاتِ دبیرؔ		
۱۲	ع	۱۹	۶۹	ب	۱۹
فدا ۔ فکر ثابت کی کیجے ثنا			ہے تالیف کیا صیقلِ بے نظیر		

ایضاً تاریخ طبع

۲۲	ف النبی	۱۳	۱۲	ع	۱۹	۲۰	ف	۱۳
زہے اندراج و زہے پُر ضیا			زہے جوشِ جود و خوشا دل پذیر			زہے فرحت افزا و بزم سرور		
۶۹	ب	۱۹		ب	۱۹	۳۱	ھ	۱۳
زہے زیبِ قصرِ صغیر و کبیر			چھپی خوب معقول و دلکش فدا			ہے اشعار موزوں حیاتِ دبیرؔ		

قطعہ تاریخ تالیف حیاتِ دبیر مصنفہ عالی جناب مولوی عبد اللطیف صاحب یکتا ٹیں تھا بھون و ناظم نظامت گلشن گنج ریاست کوٹہ راجپوتانہ :۔

۱۲	ع	۱۹	۱۲	ع	۱۹	۳۰	ھ	۱۳
ماشاء اللہ ثابت رنگیں نگار			ہے گلِ بے خار باغ اوج کا			طرفگی ہے سرسری لاالف رقم		
۷۶	ب	۱۹	۲۰	ب	۱۳	۶۹	ب	۱۹
جس کا ہر ہر لفظ ہے بینش فزا			ہسٹری میں جلوہ گر ہے بے حجاب			شکلِ حالات دبیر خوش نوا		
۱۲		۱۹	۱۲	ع	۱۹	۶۹	ب	۱۹
فکر نے چاہا جو سالِ اختتام			خلد سے آئی یہ رضواں کی صدا			عرض او یکتا مؤلف سے یہ کر		
			۳۰	ھ	۱۳			
			شور ہے مینو[2] میں اس تالیف کا					

[1] یہ تاریخ جناب یکتا کے مؤرخ یکتا ہونے پر دال ہے ۔ فکر کی یہ معراج کمال ہے ۔ کہ ہر مصرع میں عیسوی یا ہجری یا بکرمی سال ہے ۔ اور پھر اس قدر بے تکلف مصرع ۔ سبحان اللہ ۔ واضح رہے ۔ کہ ہمزہ کا عدد لینے کا قاعدہ نہیں ہے ۔ اسی خیال سے مؤرخ باخبر نے بھی "ماشاء اللہ" کے ہمزہ کا عدد نہیں لیا ہے ۔ ملاحظہ ہو عدد التاریخ و گلشن خیال وغیرہ ۱۲ مؤلف حقیر ۔

[2] "مینو" زبان فارسی میں بہشت کے معنی میں مستعمل ہے "منو" اس کا مخفف ہے ۔ مینو چہر اسی سے متعلق ہے ۔ اردو میں بھی کسی خوشنما آبادی کو مینو سواد کہتے ہیں ۔ مثلاً بلدۂ مینو سواد حیدر آباد بولا جاتا ہے ۱۲ مؤلف حقیر ۔

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجہ فکر عالی جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل۔ منصرم آب پاشی ریاست کوٹہ۔ ملک راجپوتانہ :۔

ثابت ہوا کمال مؤلف جہان پر || جب حضرت دبیر کی لائف لکھی گئی
آئی فلک سے کان میں آواز ہاتفی || اب چھوڑا انصرام کو بسمل یہ کہدے صاف
تاریخ کی تلاش تھی دل کو کہ دفعۃً || تالیف ہے یہ مولوی افضل حسین کی

۱۷۱۲-۳۸۲ باقی ۱۳۳۰ سنہ ہجری

رباعی تاریخ تالیف کتاب حیات دبیر مصنفہ شاعر نازک خیال باکمال نواب سید عسکری مرزا خاں صاحب بلیغ لکھنوی :۔

بے مثل قلم بند ہے۔ تقریر دبیر || ثابت کی عبارت ہے کہ تحریر دبیر
کیا خوب لکھی سوانح عمری۔ واہ || دیکھو۔ اک اک ورق ہے تصویر دبیر

قطعہ تاریخ تالیف کتاب حیات دبیر مصنفہ جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس زید پور ضلع بارہ بنکی۔ ملک اودھ۔ شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ :۔

نکتہ داں۔ ثابت تخلص۔ خوش بیاں۔ افضل حسین || شاعر سرکار محبوب خدا۔ مداح آل
کرد نذر ناظریں۔ مجموعۂ حال دبیر || تازہ شد گویا حیاتش در زمان انتقال
آفریں۔ صد آفریں۔ اے مدح خوان پنجتن || داشتی یکسو حواس خمسہ را تا پنج سال
سال تالیفش فراست۔ از سر انصاف گفت || روشنئ طبع ثابت۔ نیر اوج کمال

۱۹۱۱+۱ = ۱۹۱۲ ء

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجہ فکر عالی جناب مولوی سید یونس حسین صاحب یونس زید پوری شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ :۔

کرد تالیف کرد۔ ایں کتاب فرح سا || الا۔ ثابت سعت آں۔ کز ایں تمیز ہست
رقم کن۔ بے سال تالیف یونس || حیات دبیر م زجانم عزیز است

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و عالم کامل یادگار روز نہ رشید صاحب خوجم السماء

جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی دام فضلہ :۔

ضرورت آج زمانے کو جس کی تھی ثابت ۔۔۔ دِکھائی ہے وہی تصویرِ واقعاتِ دبیرؔ
لکھا عزیزؔ نے یہ مصرعِ سنِ تدوین ۔۔۔ ہے شمعِ بزمِ ادب۔ جوہرِ حیاتِ دبیرؔ

قطعۂ تاریخ تالیف نتیجۂ طبعِ عالی جناب مولوی سیّد محمد جعفر صاحب قدسیؔ جائسی۔ شاگردِ رشید جناب مولانا صفیؔ لکھنوی مدظلّہٗ :۔

سیّد افضل حسین۔ مہرِ ضیا بارِ علم ۔۔۔ ثابتِ گردوں مقام۔ اخترِ سیّارِ علم
جس نے حیاتِ دبیرؔ لکھ کے اک احسان کیا ۔۔۔ خلق پہ روشن کئے۔ جلوہ اسرارِ علم
قدر شناسانِ فن۔ قدر کریں گے ضرور ۔۔۔ تحفت ہے۔ گنجینۂ درہم و دینارِ علم
مُردہ دلوں کے لئے۔ مائۂ عیش و نشاط ۔۔۔ کرتی ہے دل باغ باغ۔ نزہتِ گلزارِ علم
مسطر زینت طراز۔ سلک دُرِ آبدار ۔۔۔ زیب فزائی بیاض۔ گوہرِ شہوارِ علم
رُوح نہ کیوں تازہ ہو۔ ایک نظر دیکھ کر ۔۔۔ صفحۂ قرطاس پر۔ جلوۂ انہارِ علم
شاہدِ معنی ہے ایک۔ یہ صحف ہر دلعزیز ۔۔۔ مصرِ جہاں میں ہُوئی۔ گرمیِ بازارِ علم
جرعہ کشِ انبساط ہر منظرِ اشتیاق ۔۔۔ ساقیِ ساغر بکف جلوۂ سرشارِ علم
قدسیؔ رنگیں بیاں۔ تو بھی ہے گل چیں فکر ۔۔۔ ہو گلِ تازہ کوئی۔ طرّۂ دستارِ علم
زیب نشاں بلند مصرعِ تاریخ ہو ۔۔۔ حصنِ حیاتِ دبیرؔ مطلعِ انوارِ علم

قطعۂ تاریخ تالیف حیاتِ دبیرؔ و نتیجۂ فکر جناب احسن مرزا صاحب شریرؔ لکھنوی۔ مؤلف کتاب فلسفۂ صرف و نحو۔ شاگردِ رشید حضرت نفیسؔ مرحوم :۔

اوجِ او منشئ فلک داند ۔۔۔ چو رقم میکنم صفاتِ دبیرؔ ۔۔۔ ہمہ گیرست طرزِ دلکشِ او
یادگارند واقعاتِ دبیرؔ ۔۔۔ شش جہت محرمِ مسدس او ۔۔۔ جدتِ فکر کائناتِ دبیرؔ
آشکارست قوتِ علمش ۔۔۔ وہ سخن مستترِ نکاتِ دبیرؔ ۔۔۔ چوں سر یاد برد۔ وشنہ موت

جامِ جمشید شد حیاتِ دبیرؔ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ عالی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب **فوق** رضوی رئیس مہابن ضلع متھرا و شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ و مصنف **المیزان** (جواب موازنہ شبلی صاحب):

خوب ثابت کی ہے۔ حیات دبیرؒ
ذکر مداح آلِ اطہرؑ ہے
یعنی مرزا دبیرؒ نیک سیر
جس کا انداز سب سے بہتر ہے
جس کے مصرع ہیں رشکِ دُرِّ عدن
اُس کی تیغ زباں کا جوہر ہے
ہے بیانِ مصائبِ شبیرؑ
جس کا ہر اک بشر ثناگر ہے

جس کا چرچا جہاں میں گھر گھر ہے
حال اُس ذی شرف کا لکھا ہے
ذکر جس کا ہر اک زباں پر ہے
جس کی ہر ایک نظم ہے پُر درد
جس کی ہر نظم سلکِ گوہر ہے
سر بسر پاک ہے کلام اُس کا
حالِ فرزندِ پیمبرؐ ہے
انتخاب کلام ہے اس میں

کیوں نہ دل سے اُسے پسند کریں
جو سخن سنج ہے سخنور ہے
سب سے اعلیٰ ہے جس کا طرزِ کلام
جس کا ہر لفظ تیر و نشتر ہے
جس کو کہتے ہیں لوگ حُسنِ کلام
مدح خاصانِ ربِّ اکبر ہے
کیا حیات دبیر کی ہو صفت
تحفۂ ذاکرانِ سرور ہے

سال تالیف ہے یہ مصرع فوق
بے بدل۔ بے مثال دفتر ہے
(۳۰ ... ۱۲)

قطعہ دیگر از جناب فوق رضوی موصوف:۔

خوب ہے حضرتِ ثابت کی یہ تصنیف لطیف
جس کے پڑھنے سے ہر اک شخص کا دل شاداں ہے
کون ثابت؟ جو ہے ذی منزلت و ذی رفعت
صاحب فضل ہے۔ ذی قدر ہے اور ذی شاں ہے
اُس کی تحریر مرصّع پہ ہیں لاکھوں شیدا
اُس کی تصنیف پہ ہر ایک کا دل قرباں ہے
ذکر مداح حسینؑ ابن علیؑ ہے اس میں
مومنوں کے لئے اس واسطے حرزِ جاں ہے
کر دیا۔ ایک جگہ جمع یہ بے مثل کلام
سچ یہ ہے شاعروں پر انکا عجب احساں ہے
طبع عالی نے بہت خوب کیا کارِ ثواب
یہ صحیفہ۔ سندِ مغفرتِ عصیاں ہے
جس قدر۔ اس کی ثنا ہو۔ وہ بجا ہے۔ بیشک
اس کی جو مدحت و توصیف ہو۔ سب شایاں ہے
اس کا ہر باب ہے خوبی و لطافت سے بھرا
بہتر و دلکش و بے مثل ہر اک عنواں ہے
نکہت افزا ہے ہر اک شعر مثالِ سنبل
ضو فشانی میں ہر اک لفظ۔ مہِ تاباں ہے

جس کے ہر صفحہ پہ ہے تختِ گلشن کا گماں — جس کے ہر لفظ میں بوئے گلِ تر پنہاں ہے
یا الٰہی رہے مقبول یہ تصنیف لطیف — جب تلک چرخ پہ خورشید مبیں تاباں ہے
اے خوب ہے نسخہ بے مثل۔ ہے سال تصنیف — کیوں نہ بے مثل ہو۔ فرحت کا عجب ساماں ہے
اور تاریخ جو چاہی تو یہ ہاتف نے کہا — لکھ دے اے **فوق سخنور۔ گہر غلطاں ہے**

قطعہ دیگر مشعر سال تالیف حیات دبیرؒ از جناب فوق موصوف :-

بذا۔ ثابت کی تصنیف لطیف و بے بہا — جس کی شہرۃ ہے ہر اک سو جس کی ہر جا دھاک ہے
اس میں حال اُس کا ہے۔ جو ہے شاعرِ شیریں بیاں — عالمِ دیں۔ ذاکرِ سبطِ شہ لولاک ہے
بے بہا و طرفہ زیبا نظم۔ لکھو اس کا سال — اور خواہش ہو تو لکھ دو۔ **ارمغان پاک ہے**

ایضاً

خوب لکھی حضرت ثابت نے یہ نادر کتاب — جس سے نگھتے ہو گئے شعر و سخن کے منچلی
جس کے نظارے سے ہوتا ہے معطر دماغ — جس سے جی ہوتا ہے خوش۔ اور کھلتی ہے دل کی کلی
ہے سنِ تصنیف کی خواہش تو لکھ اے طبعِ فوق — **بے بہا ہے ذکرِ مداحِ حسینؑ ابن العلیؑ**

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجۂ فکر صوفی صافی طینت صاحب ذوق سلیم مولانا سلیم الدین صاحب سلیم مقیم ریاست بھرت پور :-

نبے مولوی سید افضل حسین
ز مکنون خاطر بکاغذ فگند
بہیں نامۂ دل کشا دل پذیر
عبارت پہ تسخیرِ معنی۔ کمند
سلامت روی بعدہ اش خانہ خیز
وصلاحیت اندیشہ را شہر بند
بہ تحقیق چوں داد تحقیق داد

معانی پژوہ و حقیقت پسند
عبارات خوبش ہمہ دل نشیں
گزیں رشحہ خامۂ ارجمند
بر و خرمن خوش بیانی نثار
متانت رضا جوئے رائے بلند
ببند لخت از جبہ تیر جواب
بہ ہر سوز ہر سوئے تحسیں کنند

ہمہ راستی داستانِ دبیرؒ
خیالات پاکش سراپا بلند
معانی بر الفاظ۔ کرسی نشیں
از و مایۂ شاعری بہرہ مند
نکات پسندیدہ دلخراش را
مخالف ازاں گشت زار و نژند
بتاریخ ترتیب گفتم سلیم

حیات دبیر فصاحت پسند

قطعۂ تاریخ تالیف کتاب **حیات دبیرؒ** نتیجۂ افکار جناب شیخ قربان علی صاحب **قربان**۔
ساکن ڈبائی ضلع بلند شہر مقیم و مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ۔ شاگرد رشید مؤلف کتاب:۔

عجب دلکش و دلچسپ ہے **حیات دبیر** — دبیر کون؟ کہ مداح چاردہ **معصومؑ**
مؤلف اس کے ہیں اُستاد میرے ذی رفعت — کہ جن کے فضل کی ہے آج اہل علم میں **دھوم**
جناب سیدِ افضل حسین **ثابت** نام — جنہیں سمجھتے ہیں۔ ارباب علم و فن **مخدومؑ**
ہزاروں اہل کمال اور شاعروں کا حال — اسی کتاب کے پڑھنے سے ہوگیا **معلوم**
جو حال عیسوی کی فکر۔ میں نے کی **قربان** — کہا یہ دل نے کہ لکھ۔ **ذکر خیر اہل علوم**
(۱۲ ۶ ۱۹)

قطعۂ تاریخ تالیف نتیجۂ افکار سالک مسالک طریقت صوفی صافی طینت جناب
شاہ محمد عبدالحلیم صاحب **حلیم**۔ صاحب دیوان مطبوعہ:۔

شاعروں کی بزم کے صدر انجمن
جامع فن سخن۔ روشن ضمیر
نکتہ سنجاں جہاں کے پیشوا
مرثیہ گو۔ مرثیہ خواں بے نظیر
یہ ضرورت تھی کہ اردو نثر میں یا
کیوں نہ ہوں مشہور ہر برنا و پیر

زینت ایوان نظم دل پذیر
آسمان برتری کے ماہتاب
ملک معنی و بلاغت کے امیر
ہر طرح کی نکتہ چینی سے بری
آپ کے حالات ہوں زینت پذیر
اُن کی لائف جب مرتب ہوچکی

مطلع پُر نور خورشید کلام
اوج معنی کے لئے مہر منیر
منقبت گوئے امیر المومنینؑ
کون؟ یعنی حضرت مرزا دبیرؒ
حضرت **ثابت** نے یہ احساں کیا
بے مثال و بے عدیل و بے نظیر

غیب سے آئی ندا مجھ کو **حلیم** — ضبط **تحقیق** **حالات** **دبیرؒ**
(۱۳ ھ)

قطعۂ تاریخ ترتیب و تالیف حیات دبیر مصنفہ سالکۂ تسلیم و رضا و فا صاحبہ مریدہ حضرت
مذاق بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (مقیم کوٹہ):۔

مجسم روح دانش۔ جاں بینش
چراغ پر ضیائے بزم اسلام
نہ پوچھو کچھ عبارت کی لطافت

سراپا قابل تعظیم و اکرام
جناب ثابت عالی گہر نے
کہ ہیں مداح اُس کے خاص و عام

گل گلزار علم و حلم و تہذیب
لکھا حال دبیر نیک انجام
بتادو سالک حروارید خوش آب

کرچشمۂ معانی کا کہوں جام ۔ نہیں صحت میں جس کے شک و ابہام
جواب اچھے دئے ہیں معترض کو ۔ رفا کو تھی تلاشِ سالِ ترتیب
کہا دل نے ۔ چراغ بزم الہام

قطعہ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید محمود حسن صاحب ثاقب دہلوی شاگرد رشید مؤلف (و برادرزادہ و تعلیم یافتہ و شاگرد رشید جناب سید محمد زکریا خاں صاحب زکی ارشد تلامذہ حضرت غالب دہلوی مرحوم) وکیل درجہ اعلےٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :۔

جناب مولوی افضل حسین ثابت نے ۔ لکھے ہیں خوب ہی دلچسپ واقعات دبیر
مؤلف ان کے ہیں اُستاد محترم میرے ۔ جو فن شعر میں گویا ہیں آپ اپنی نظیر
یہ شرطہ تاج کمال ثابت ہے ۔ قلم کی تیغ سے ملک سخن کیا تسخیر
فصاحت اور بلاغت کے خوب لکھے نکات ۔ سند میں آیۂ قرآں بھی کردئے تحریر
دئے ہیں معترضوں کو جواب بھی معقول ۔ مثال آبِ رواں پاک صاف ہے تقریر
لکھوں وہ مصرع تاریخ عیسوی موزوں ۔ کہ جس کو پڑھ کے ہوں محظوظ سب صغیر و کبیر
صدائے ہاتف غیب آرہی ہے لکھ ثاقب ۔ انیس اہل سخن عنصر حیات دبیر

قطعہ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید ریاض الحسن صاحب ریاضؔ ساکن قصبہ اول ضلع متھرا وکیل درجہ اعلےٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :۔

ملک پر حضرت ثابت نے یہ احسان کیا ۔ لکھے تحقیق سے حالات دبیر مرحوم
ہجری و عیسوی سنہ کی ہے مجھے فکر ریاضؔ ۔ دل یہ کہتا ہے کہ تاریخیں ہوں دو مرقوم
شغل کا لفظ لکھو ۔ تو ہو عیاں ہجری سال ۔ شغل بے مثل لکھو ۔ عیسوی سنہ ہوں معلوم

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ مکرم و مخلص بے ریا عالی جناب بابو عبدالقادر صاحب ندرؔ اکبرآبادی ۔ اسسٹنٹ انجنیر ریاست کوٹہ ۔ راجپوتانہ :۔

حضرت ثابت !! بڑا احسان کیا ۔ لکھ کے سچے سچے حالات دبیرؔ ۔ دی عطارد کو ترقی ماہ پر
کردئے روشن کمالات دبیرؔ ۔ ناخنِ تحقیق سے حل کردئے ۔ عقدۂ نظمِ خیالات دبیرؔ

لائق تعریف ہے ساری کتاب
عام ہیں جود و نوالات دبیر

خاص کر چیدہ مقالات دبیر
اے ندا تم سال تدوین کتاب

کردیا ثابت کہ اردو نظم پر
لکھ دو۔ نو تحقیق حالات دبیر

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ جناب منشی فاضل مولوی عبد الستار صاحب مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ:۔

عیسوی
(ب) بسکہ تالیفات نظم شاعر عالی دبیر
(ی) یاد باد این نخل ثابت شد پسند اندر جہاں
(ظ) ظن من بہ زیں نما شد شان گلزار سخن
(غ) غنچہ نادر باوج است ہم ریاض نو بہار
حرف ہر مصرعہ بشد تاریخ سال حال نیز
عیتاریخ ہمالیوں غیرت گلزار جام

تاریخ بکری کردہ بافیض عروض اہل جہاں را کامگار
(ی) یاد کن تذکیر و قل تاریخ بہر نامدار
(ش) شاد عاشق زین عروس نو عذارش مشکبار
(غ) غیرت افکار شد اعجاز مرغوب آشکار
نظم موضوع و ریاض گلرخاں آمد بکار
بار شد تاریخ فن بس حمد باغ نو بہار

قطعہ تاریخ طبع مصنفہ شاعر کامل و طبیب حاذق عالم علوم معقول و منقول عالی جناب حکیم مولوی محمد مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ:۔

آں نغمہ نواز ساز تصنیف
زیبائش منزل تمناست
ہم پردہ کشائے حجلہ غیب
زیباست کہ اسم با مسمیٰ ست
داد ست دبیر را حیاتے
جدت بزبان خویش گویاست
ہم نثر و عبارتش دل آویز
کحل البصر جواہر آماست
از گوش ترنم سمعنا

کو شاعر و ناثر دل آرا است
ہم طوطی خوش نوائے گفتار
ہم جلوہ نمائے حسن معنیٰ ست
بنوشت حیات آں سخنور
ہم طرح بمعجز مسیحاست
اقوال لطیف تر از ارواح
چوں آب حیات ہم مصفاست
ز الفاظ مہذب و مرصع
آواز نیاں دل اطعناست

آرائش مسند محبت
ہم بلبل بوستان انشاست
نامش افضل حسین ثابت
مشہور جہاں دبیر یکتاست
ترتیب بطرز نو نمودہ
احوال صحیح تر ہمہ را است
بینش ز فروغ او منور
تہذیب مصنفش ہویداست
معنیست بہ یوسفی ہم آغوش

چشم ارباب دلی زلیخاست
لطفش ز وفور ناشکیبی
انداز ادا قبول دلہاست
تکرار تجلّی الٰہی
ہم تازی و پارسی مہیّاست
تا نور سخن جہاں فروزست
تاگوش بحسن صورت شیداست

حسنش زکمال دل فریبی
برہم زن رونق تماشاست
توضیح معانی و بیان ست
انوار تقدس و تعالے ست
تا اہل سخن کنند فیصل
تاگفت و شنود را ہیولاست
تشریف قبول خلعتش باد

چشمک زن حسن روئے لیلاست
اسلوب بیاں لطیف و دلکش
این وصف زہر بو ستی ہویداست
در بزم سخن زہند دانگلینڈ
بر صدر کدام جلوہ فرماست
تا حسن قبولِ فرع حسن ست
این ست دعا ہمیں تمنّاست

این ست سہیل سال طبعش
تقویم دبیر بے کم و کاست
۱۳۱۴ — ۱۳

قطعہ تاریخ طبع نتیجہ افکار گہر بار شاعر ذی وقار جناب سیّد نظیر الحسن صاحب **فوق**۔ ارشد تلامذہ حضرت **اوج** دامت برکاتہ۔ ورئیس دہابن ضلع متھرا و مصنّف **المیزان** (جواب موازنہ مولوی شبلی صاحب)؛۔

لکھا ہے ثابت نے حال اُس کا
کلام ہے ہر طرف کو مشہور

جو شاعروں میں ہے فرد و یکتا
یہ ہاتف غیب نے سنایا

ہر ایک جانب ہے جس کا شہرہ
اگر سن طبع کی ہے خواہش

تو جلد اے طبع **فوق** لکھ دے
حیات مرزا دبیر مبرور
۳۱ — ۱۳

قطعہ تاریخ طبع از نتائج افکار گہر بار شاعر قوم کامل فن جناب مولوی سیّد علی نقی صاحب المعروف بہ مولانا **صفی** لکھنوی دام اقبالہ سر رشتہ دار صاحب ایڈیشنل جج لکھنؤ:۔

ناب سیّد افضل حسین ثابت ما
بحسن سعی چہ کرد ایں جریدہ را تحریر

صفی رقم زدہ تاریخ طبع آں نسخہ
انیس خلوت اہل ہمم حیات دبیر
۱۳ — ۴ — ۱۹

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیرتبیحه فکر شاعر غرّا مجتبیٰ جناب سیّد یونس حسین صاحب **یونس** رضوی زیدپوری شاگرد رشید حضرت اوج مدظلّہ :۔

کہ تألیف کرد ابن کتاب معلّٰی
الا ثابت ست آں کہ اہل تمیز است

پئے سال طبعش رقم کرد یونس | حیاتِ دبیرم زجانم عزیز است*

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ افکار مدّاح آل محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔ ارشد تلامذۂ جناب عارف دامت برکاتہ:۔

مشفق من ثابت شیوا بیاں
ہے صدائے صور خامے کی صریر
ہیں یہ جس کے واقعاتِ زندگی
منقبت خوان امیر ابن امیر
کشتِ زارِ نظم دلکش کے لئے
والہ و شیدا۔ ہر اک برنا و پیر
نام زندہ کر دیا مدّاح کا

خوب لکھو یہ کتاب دل پذیر
واقعہ ہر ایک لکھا بے عدیل
تھا وہ مدّاح شہ گردوں سریر
مرثیہ گوئے حسینؑ تشنہ کام
طبع جس کی صورت ابر مطیر
جو ہے وہ۔ شانِ بلاغت پر نثار
دے صلہ ثابت کو اے ربّ قدیر

ہو گیا جس سے کہ احیائے کمال
معنی و مفہوم جس کے۔ بے نظیر
اکمل دوران دبیرؒ نکتہ سنج
دعبل و حسّان کا گویا ہم صفیر
وہ سخن دلکش کہ پڑھتے ہی جسے
جو ہے وہ طرزِ فصاحت کا اسیر
لکھ دو محشرؔ مصرع تاریخ طبع

۱۳ ۵ ۳۱
عزّتِ مجلس ہیں حالات دبیرؒ

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ فکر عالی جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس قصبہ حیدر پور ضلع بارہ بنکی۔ ارشد تلامذہ حضرت اوج مدظلّہ:۔

بفضل خدا سید افضل حسین
زہے دفتر وصف ذات دبیرؒ

چہ خوش کرد ثابت صفات دبیرؒ
پے سال طبعش فراست نوشت

دلی افروز و جاں پرور اہل دل
۱۳ ۵ ۳۱
بگو نعمت حق حیات دبیرؒ

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر مصنفۂ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل منصرم آب پاشی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ:۔

لکھی ہے جس کی حضرت ثابت نے ہسٹری
بسمل کو سال طبع کی ہاتف نے دی خبر

تلمیذ خاص تھا وہ جناب ضمیرؒ کا
۱۹ ۶ ۱۳
ہے شور مرثیوں میں حیات دبیر کا

* یہ بات میں جناب یونس کے ترجمہ میں بھی لکھ چکا۔ اب پھر لکھتا ہوں۔ کہ عزیز ست کو بعض بغیر الف است کے لکھتے ہیں بعض مع الف کے فلیعلم شاعر نے رسم الخط کے اختلاف سے یہ فائدہ اٹھایا کہ ایک ہی مصرع میں تاریخ تالیف و تاریخ طبع دونوں نکالدیں یہ بھی ان کے کمال کی دلیل ہے ۱۲ حقیر ثابت۔

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ فکر عالی شاعر غرا جناب مولوی عبد اللطیف صاحب المتخلص بیکتا دام مجدہ۔ رئیس تھانہ بھون و ناظم نظامت کشن گنج ریاست کوٹہ۔ وار شد تلامذہ جناب امراؤ مرزا صاحب انور مرحوم و جناب فصیح الملک داغ دہلوی:-

زندہ ہوا ہے نام حیات دبیر سے
مداح خاندان جناب امیرؑ کا

یکتا نے سال طبع بھی لکھا ہے بے بہا
ہے قدسیوں میں ذکر حیات دبیرؔ کا

(بعد تخرجہ ۸) ۱۹۱۳ سنہ عیسوی

ایضاً دلہ

شاہت کرینگے خوب کمال دبیرؔ کو
امید نہیں یہ شاہت عالی جناب سے

لاالفت ہیں واقعات عجیبہ کئے رقم
تصحیح کرکے بعض فضیلت مآب سے

دل چسپ اس قدر ہیں مضامین تو بنو
مشکل ہوا ہے آنکھ اٹھانا کتاب سے

جانکا ہنے جناب مصنف کو دیکھ کر
نکلا ہے مرحبا۔ دہن شیخ و شاب سے

چھپ کر اس آفتاب سے نکلی یہ ہسٹری
گویا کہ ماہ نو نکل آیا سحاب سے

یکتا نے جب سوال کیا سال طبع کا
تاریخ ملا یہ ہاتف حاضر جواب سے

کہدے کہ انطباع کی تاریخ ہے یہی
ظاہر ہوا ہے اوج دبیر اس کتاب سے

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مؤلفہ جناب سید علمدار حسین صاحب واسطی سررشتہ دار اسپیشل مجسٹریٹی (پٹیالہ) متوطن قصبہ بنوڑ ریاست پٹیالہ۔ ملک پنجاب:

میر افضل حسین ثابت نے
کی حیات دبیر جب تحریر
کھل گیا۔ گلشن معانی تو

بن گیا صفحہ صفحہ خلد نظیر
موشگافی سے کر دیا روشن
مطلب شعر۔ مثل مہر منیر

کیا بلاغت کی شرح فرمائی
اور معانی کی خوب کی تفسیر
ہے سراپا ثبوت ذوق سلیم

ہے ثابت کی با اثر تحریر
سال تاریخ پوچھا ہاتف سے
فکر تاریخ تھی جو دامن گیر

آواز آئی واسطی لکھ دو
خوب لکھی ثابت نے حیات دبیر

تقریظ جناب مسٹر ہیرالال سود - بی - اے - ایم - آر - اے - ایس - متخلص بہ شیدا - رئیس آگرہ (مائی تھان) و سب جج کوٹہ ملک راجپوتانہ - عالم علوم فارسی و انگریزی و سنسکرت و شاعر ہر سہ زبانِ اردو

انگلینڈ کے وسیع نظر فلاسفر اور پاکیزہ خیال عالم مسٹر تامس کارلائل کا قول ہے - کہ "دُنیا کے تمام سچے پیغمبر اور شاعر اور حکمراں ایک ہی مادّے کے بنے ہوتے ہیں" - ان سب کا نکاس علم و راستی کے ایک ہی لایزال منبع سے ہوتا ہے - جس طرح ایک ہی سوتے سے نکلنے والے چشموں کے پانی مختلف سرزمینوں پر بہنے کی وجہ سے جُدا جُدا تاثیریں حاصل کر لیتے ہیں - اسی طرح اہل عالم کے سچّے رہبر اور خاصان خُدا مختلف حالتوں میں پرورش پانے کی وجہ سے اور مختلف ضروریات دُنیا کو پُورا کرنے کی غرض سے علیحدہ علیحدہ صُورتیں اختیار کر لیتے ہیں +

دُنیا کے تمام جاندار چھوٹے اور بڑے تکلیف سے بچنے اور آرام حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں - یہ امر مسلّمہ ہے - کہ نیکی خوشی کا موجب اور بدی تکلیف کا سبب ہے - راستی اور ناراستی کی نہایت خوفناک جنگ ازل سے جاری ہے - اور ابد تک رہیگی - راستی وکیل خدا ہے - اور اُس کی امداد کے لئے سچّے اور قابل تکریم ہیرو وقتاً فوقتاً نمودار ہُوا کرتے ہیں - یہ زبردست لیڈر (راہ نما) حسب ضرورت مختلف قسم کی وردیوں اور بھیسوں میں ظاہر ہوتے ہیں +

جسمانی - دماغی - رُوحانی ترقی جماعت انسانی کی بہبودی کا سبب ہوتی ہے - اور انہیں تینوں حالتوں کا تنزل موجب زوال قرار دیا جاتا ہے - ان تینوں ضروری پہلوؤں میں سے ایک کا بھی گر جانا راستی کی فوج کو کمزور کر دیتا ہے - پس جس قوم کی کمزوری صورت پذیر ہوتی ہے - اُسی کی درستی کے قابل لیڈر بارگاہ الٰہی سے نامزد کیا جاتا ہے - اور وہ میدان کارزار میں آ کر ناراستی کو مغلوب کرتا ہُوا خدا کے

پاک کام کی تکمیل کرتا ہے۔ جب دُنیا میں ظلم و تشدّد کا بے انتہا زور ہو جاتا ہے۔ اور ایک بھائی دُوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بن کر اُس کی جان و مال کو پامال کرنے لگتا ہے۔ اور ہر طاقت ور آدمی کلاہ کج سر پر رکھ کر اپنے سے کمزور آدمیوں پر بیجا حکومت کرتا ہے۔ اور اُن کو اپنی نفس پرستی کا ذریعہ بناتا ہے۔ تو ایک سچا ظلّ اللہ درگاہ باری سے مامور کیا ہُوا بادشاہ عالم کی اسٹیج پر آتا ہے۔ اور تمام جھوٹے اور مصنوعی حکمرانوں کو نیست و نابود کر کے انسانی جماعت کے جسمانی پہلو کو مادّی تکالیف سے نجات دیتا ہے +

انسان ایک عجیب و غریب جانور ہے۔ جب اُس کی جان و مال کی حفاظت کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور وہ کچھ دنوں سُکھ کی نیند سو لیتا ہے۔ تو اُس کا سر پھرتا ہے۔ اور اُسے قسم قسم کے عیش و عشرت کی سُوجھنے لگتی ہے۔ اس عیش کے متوالے کی دُنیاوی لذّتوں سے تعلّق رکھنے والی خواہشیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں۔ کہ اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اپنی ناجائز ضروریات کی فراہمی میں معبود حقیقی کی جانب سے امداد نہ پاتا ہُوا بہت سے جھوٹے اور فرضی معبود گھڑ لیتا ہے۔ جو اُسے کبھی پُورا نہ ہونے والی خواہشوں کے سر سبز ہونے کے انتظار میں تھکا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح سچّے بادشاہوں کے زور بازو کی بدولت جسمانی موت سے بچا ہُوا آدمی رُوحانی موت کا شکار بن جاتا ہے۔ اس مرحلے پر جو نجات دلانیوالا لیڈر منجانب اللہ بھیجا جاتا ہے۔ اُسے پیغمبری کی وردی عطا ہوتی ہے۔ وہ جہالت کے تاریک غار میں پڑے ہُوئے انسان کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتا ہے۔ اور بے حقیقت معبودوں کی حقیقت سے ماہر کرتا ہُوا اُن کو اسرار حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اس طریق پر راستی کے سیدھے راستے پر لگ کر برسوں کے بچھڑے ہُوئے مسافر رُوحانیت کی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں + جس وقت انسان کی جسمانی اور رُوحانی حالت ترقی کر جاتی ہے۔ اُس کے اندر حصول علم اور تحقیقات کا مادّہ زور کرتا ہے۔ اُس کا دل اُمنگ پر آ کر باریک سے باریک جذبات کا لُطف اُٹھاتا ہے۔ اُس کی حس کی قوّت انتہا کی زوردار ہو کر اُس کو ہر چیز کی اصلیت کے جاننے کی کوشش میں سرگرم کرتی ہے انسان کی تنہا کوشش مشکل سے کامیاب ہوتی ہے۔ اور اس لئے اُس کے واسطے اس موقع پر

بھی غیب سے امداد پہنچتی ہے۔ اس مرحلے پر رہبری کا متبرک کام شاعر کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی طبع رسا دل کے سمندر میں جذبات کی گہرائیوں کی تہ کو پہنچ کر باریک سے باریک چیز کی اصلیت نکال لاتی ہے۔ اور اُس کی واقعی صورت اہلِ دُنیا کے روبرو پیش کر دیتی ہے۔ ہم سب جو عوام کے زمرے میں داخل ہیں۔ نیچر کا صرف سطحی نظارہ کرتے ہیں۔ اور شاعر کی نظر اُس کی اندرونی حالتوں کا بھی مشاہدہ کر لیتی ہے۔ شاعر کی وردی پہن کر عرصہ عالم میں نمودار ہونیوالے ہیرو کی مدد سے ہم دُنیا کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ماہیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اُس کا نفع اور نقصان اور نیک و بد ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔ ہم ہر شے کے واجبی استعمال کرنے کے لائق بن جاتے ہیں۔ پس ہر سچا شاعر ہماری دماغی ترقّی اور اخلاقی نجات کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی لئے علمائے عالم کی نظر میں شاعر پیغمبروں سے کم رتبہ نہیں رکھتا۔ اور سچ پوچھو۔ تو شاعر کا کام پیغمبروں کے کام کے مقابلہ میں کچھ کم بھی نہیں ہے۔ روحانیت کا تعلق خدا سے اور اخلاق کا اُس کے بندوں سے ہے۔ ہم ابو ابن ادھم کے قائل ہیں۔ جو بجائے خدا کے اُس کے بندوں سے محبّت کرتا تھا۔ بندوں سے محبّت کرنیوالا خدا اسے محبّت کرتا ہے۔ اور جس کے دل میں بندوں کے ساتھ پیار نہیں ہے۔ وہ خدا کو پیار نہیں کر سکتا۔ الغرض مخلوقِ عالم کے ساتھ اُنسیت ذات خدا کے ساتھ محبّت کرنے کے لئے لازمی ہے۔ اور اس لازمی جزو کی تکمیل شاعر کے سپرد کی گئی ہے۔ صورت مذکورہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے کوئی اہلِ دل نہیں کہ سکتا۔ کہ ہم نے شاعر کا رتبہ قائم کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے ؂

سچ اور جھوٹ کا ازل سے ساتھ ہے۔ مصنوعیت اصلیت کے ہمرکاب چلتی ہے۔ آفتابِ عالم تاب کی روشنی اصلی اور کٹسن لیمپ کی نقلی ہے۔ اصلی بادشاہوں (جن کو خدا نے بادشاہی کیلئے پیدا کیا ہے) کے تزک و احتشام کو دیکھ کر بہت سے نقلی اور مصنوعی بادشاہ بھی بن جاتے ہیں۔ گو اُن کا تاج اُن کے سر پر سوار ہو کر خنجرِ غنیم کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بہت سے خدائی بھر کے جھوٹے پیغمبری کا دعوئے کرتے ہیں۔ گو اصلیت کھُلنے پر بجائے مدحت کے لعنت اُن کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سے حریص اور سچّے شاعروں کی تعظیم و تکریم کو دیکھ کر للچا جانیوالے

آدمی بھی شاعر بن جاتے ہیں۔ اور دو چار ٹوٹے پھوٹے شعر گھڑ گھڑا کر دنیا کے مشاعرے میں صدر نشینی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ہم کو بھیڑئے کی کھال اوڑھ لینے والے گدھوں اور ہلدی کی گانٹھ پا کر پنساری بن جانے والے چوہوں سے غرض نہیں۔ اُن کی ناپاک ہستی کو خیال میں لانا ہے۔ اصلی شاعروں کی سراسر توہین ہے۔ جو بلند و برتر رتبہ ہم نے شاعروں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ وہ انہیں اہل کمال کو زیب دیتا ہے۔ جن کے دماغ علم کے بے بہا خزانے سے معمور اور دل محبت کی دولت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جو اپنے خدا کی بخشی ہوئی دولت سے ایک عالم کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جن کی پاک تعلیم کی بدولت دنیا میں محبت کا راج قائم ہوتا ہے۔ اور جن کے مبارک قدموں کے صدقے سے جماعت انسانی اخلاق کے ہمالہ کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ جن کا فرشتوں کے دماغ کو تر و تازہ کرنیوالا نفس انسان کی مردہ روح میں ایک زندگی پھونک دیتا ہے۔ اور جو اپنے ہم جنسوں کو اپنے الہام کے طفیل میں حیوانیت کی ذلت سے نکال کر فرشتگی کی عظمت کا حقدار بنا دیتے ہیں۔ ایک سچے خدا کی طرف سے شاعری کے لئے پیدا ہونے والے شاعر کا کام ہے۔ کہ (اوّل) وہ نظام عالم کے ہر پہلو سے آگاہ ہو کر بڑی اور چھوٹی تمام چیزوں کی اصلیت اور اُن کے مناسب استعمال سے ماہیت حاصل کرے۔ (دوم) اپنے ہم جنسوں کو بھی اپنی جانی ہوئی باتیں بتلائے۔ اور دیکھے۔ کہ وہ نیچر کے عطیوں کو جائز طریق پر کام میں لاتے ہیں یا نہیں۔ (سوم) اپنی معلومات کو جن کا حصول معمولی طبقے کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے۔ ایسے پیارے میٹھے اور نمکین اور انتہا کا تناسب رکھنے والے الفاظ میں ظاہر کرے۔ کہ وہ سُننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جائیں۔ اور اُن کا گہرا اثر اُن کے فائدے کا موجب ہو۔ (چہارم) بدی کی بُرائی اور نیکی کی بھلائی کے وہ دلکش ترانے سُنائے۔ کہ سامعین کو اوّل الذکر سے نفرت اور آخر الذکر سے رغبت پیدا ہو۔ (پنجم) اپنے ہمجنسوں میں باریک بینی کی عادت پیدا کرے۔ اور محبت کو جو نیچر کا اصلی سروپ ہے۔ اہل تماشا کے روبرو اس انداز سے پیش کرے۔ کہ وہ نفاق کی کریہہ صورت سے بیزار اور محبت کے عاشق زار بن جائیں۔ اُن کا ہر موئے تن زبان ہو کر محبت کے گیت گانے لگے۔ اور وہ محبت ہی کو اپنی زیست کا آغاز اور انجام سمجھ کر

اُس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں +

کوئی باپ اپنے بیٹے کی دولت وحشمت دیکھ کر نہیں جلتا۔ایک محبت ہی عداوت۔نفرت۔کدورت۔نخوت۔ظلم اور سیکڑوں بدعتوں کا علاج ہے۔محبت۔حرص وہوا کے بندھوں کو کاٹ کر اپنے بندوں کو آزاد کردیتی ہے۔صبر۔استقلال۔استغنا اُس کے غلاموں کو نصیب ہوتے ہیں۔اور وہ ہفت اقلیم کی بادشاہی کو بھی پیار کی ایک نگاہ کے بدلے خریدنا سخت گراں سمجھتے ہیں۔دُنیا کی اخلاقی اور جذبات سے تعلق رکھنے والی ہستی کے قیام کے لئے سچے اور اصلی شاعروں کی اشد ضرورت ہے۔اس ضرورت کو آسانی سے ظاہر کردینے کے لئے بھی ایک شاعر یا فلاسفر درکار ہے۔ہم نظیر اکبرآبادی کا ایک قطعہ اہل دل کی خدمت میں مثالاً پیش کرتے ہیں۔اس قطعہ کے سُننے سے طبیعت پر جو کیفیت طاری ہوگی اُس سے شاعروں کی ضرورت کا اندازہ کیا جانا ممکن ہے:۔

قطعہ

تن مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا	گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا	مشبّن بدن تھا۔ معطّر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا	نہ تار کفن تھا۔ نہ عضو بدن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی۔کفن کی	جو دیکھا۔تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

ہم امید کرتے ہیں۔کہ اس قطعہ کو بغور پڑھنے والے اصحاب شاعروں کی ضرورت کو محسوس کررہے ہیں۔اور دست بدعا ہیں۔کہ اے ناظم کون ومکان دس بیس اس قسم کے شاعر ہماری رہبری کے لئے اور بھیج دے!!

ہم نے اکثر احباب کو مختلف زبانوں۔مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب کے شاعروں کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔کوئی انگریزی کے شاعروں کو اردو شاعروں سے اچھا بتلاتا ہے۔اور کوئی اُس کے برعکس اردو شاعروں کو انگریزی سخنوروں پر ترجیح دیتا ہے۔ایک شخص ہندی والوں کی تعریف کرتا ہے۔دُوسرا فارسی والوں کی۔ہم اس معاملے میں اپنا خیال ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔کہ ہم اس قسم

کی تمام بحثوں کو کج بحثی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ تمام مناظرے بے معنی ہیں۔ خیال کو ادا کرنے کا زبان صرف ایک آلہ ہے۔ اور ہر زبان میں ایک عمدہ اور پاکیزہ خیال ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ایک اُونچے درجے کا دل کو اُبھارنے اور طبیعت میں جوش پیدا کرنے والا خیال ہر زبان میں اپنی پاکیزگی قائم رکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ زبان جاپانی ہو یا یونانی۔ عبرانی ہو یا ایرانی۔ انگریزی ہو یا ہندوستانی۔ مذہب کا اختلاف بھی کچھ فرق نہیں کر سکتا۔ مذاہب کے درمیان کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ محبت۔ ہمدردی اور اخلاق کی تعلیم ہر ایک میں موجود ہے۔ اور ہم کافی تفصیل کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ کہ ہر سچے اور نیچرل شاعر کا مشن دُنیا میں اخلاق اور محبت کو ترقی دینا ہے۔ بہت سے کج فہم اور چھوٹے دل والے لوگ شعرا کے خلاف لامذہبی کا فتوے صادر کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے فتوے دینے والے سخت غلطی پر ہیں۔ وہ شاعری کے فلسفے سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ ایک شاعر بحیثیت انسان کسی مُلک یا مذہب کا ہو لیکن بحیثیت شاعر اُس کا مذہب جُدا ہوتا ہے۔ اُس کا کام عام پنڈتوں۔ مولویوں۔ پادریوں کی طرح مختلف فرقوں میں نفاق کی آگ بھڑکانا نہیں ہے۔ اُس کو خداوند کریم نے بجائے بیگانگت کے یگانگت اور عداوت کو دُور کر کے محبت پیدا کرنیکے لئے بھیجا ہے۔ مولانا رُومؒ فرماتے ہیں ؎

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

تعصّب اخلاق کا دشمن ہے۔ اور اس لئے تعصّب شاعر کے مذہب میں روا نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی شاعر نے اپنی خداداد طاقت کو تعصّب کی ترقی اور مذہبی اختلاف کو مستحکم کرنے میں صرف کیا ہے۔ تو یہ اُس کے سچے شاعر نہ ہونے کی پہچان ہے۔ وہ شاعر نہیں۔ تُک بند ہے۔ نقّال ہے۔ ننگ شعرا ہے۔ اور شاعروں (محبت کے مشعلوں) کی پنچایت سے باہر کر دئے جانے کے قابل ہے +

شکسپیر۔ ورڈس ورتھ عیسائی تھے۔ لیکن شکسپیر کے ڈرامہ عیسائیوں۔ ہندوؤں۔ مسلمانوں کو ہیومن نیچر (فطرت انسانی) کے مطالعہ میں ایک سی مدد دیتے ہیں۔ ورڈس ورتھ کی دلکش نظمیں بنی نوع انسان کے لئے ہیومن افیکشنس (جذبات انسانی) کے راز کا انکشاف کرنیوالی ہیں۔

ہومر۔ ورجل۔ ڈینٹی کا باوجود اختلاف مذہب کے دُنیا کے ساتھ ایک سا سلوک ہے۔ میرزہ
غالب ہندوؤں کے ویسے ہی محسن تھے جیسے مسلمانوں کے۔ اور گوشائیں تلسی داس کے۔ اولاد
کی سعادت مندی۔ بیویوں کی پارسائی اور بھائیوں کی محبّت کے متعلق سبق ہندوؤں اور مسلمانوں
دونوں کے لئے بیحد فائدہ پہنچانے والے ہیں۔ شاعروں کے دُنیا میں بھیجے جانے کی ضرورت۔
اُن کا کام اور اُن کی ذمّہ واری کی بابت سطور بالا میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ
خداوند کریم شاعروں کو محبّت کی ترقّی اور اخلاق کی وسعت کے لئے پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر کے سچّے
یا جھوٹے اصلی یا نقلی ہونے کی آسان پہچان یہ ہے۔ کہ اُس نے محبّت کے بیت المال کو جو اہل اللہ
کا ورثہ ہے۔ کتنی ترقی دی۔ اور ممالک اتفاق و محبّت کی حدود میں کس قدر اضافہ کیا۔ آؤ۔ ہم اس
کسوٹی پر مرزا دبیر مرحوم کے کلام کو پرکھیں۔ اور دیکھیں۔ کہ مرحوم سچّے اور اصلی شاعروں کی فہرست
میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اردو شاعری سے تعلق رکھنے والوں میں ایک فرقہ ایسا ہے۔ جو
مرثیہ گویوں کو اچھی نگاہ سے دیکھنے کے لئے طیّار نہیں ہے۔ اُس کا خیال ہے۔ کہ "بگڑا ہوا شاعر
مرثیہ گو ہوا کرتا ہے"۔ ہم اس جماعت کا ممبر بننا نہیں چاہتے۔ بلکہ خواستگار معافی ہوتے
ہوئے عرض کرتے ہیں۔ کہ ہم اس تنگ خیال زمرہ کی ممبری کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھتے ہیں۔
ہم اس گروہ کے مخالفین کے دوست ہیں۔ اور ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ "اردو شاعری
میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ سب سے اعلےٰ ہے"۔ ہم غزلیں کہتے ہیں۔ اور سُنتے ہیں۔ اور تسلیم
کرتے ہیں۔ کہ غزل کے کسی کسی شعر میں بھی سچّی شاعری کی بُو آجاتی ہے۔ لیکن غزلوں کی بنا پر اصلی اور
نقلی شاعر کی تمیز کر لینا ناممکن ہے۔ غزل میں محبّت کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ معشوقوں کے
ساتھ عاشقانہ گفتگو۔ راز و نیاز کی باتیں۔ وفا و جفا کے شکوے اُس باطنی محبّت کی تصویر پیش نہیں کر سکتے۔
جس کو فلاسفروں نے نیچر کے ہارمنی* (نیچر کے اتّحاد) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ غزل گو کی محبّت

* نیچر بذات خود ایک نظم یا نغمہ ہے۔ جس کا ہر اصول (اصل) قوافی اور سُروں کی طرح ایک دُوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ اور
اردو زبان میں انگریزی کے بہت سے فلسفیانہ خیالات پُورے طور سے ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے مجبوراً جو لفظ زیادہ

خود غرضانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے معشوق پر اس لئے مرتا ہے۔ کہ اُس کے وصل سے بہرہ یاب ہو۔ وہ اپنے دلدار کی اس لئے شکایت کرتا ہے۔ کہ اُس جفاکیش کو دُوسرے لوگوں کے ساتھ بھی جنہیں غزل گو اپنا عدو یا رقیب سمجھتا ہے۔ محبت ہے۔ الغرض غزل گو اُس محبت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جو محض محبت کی غرض سے کی جاتی ہے۔ جس کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوتی ہے۔ کہ وہ انسان کا خمیر ہے۔ اور اُس کی زندگی کے لئے نمک کا کام دیتی ہے۔ غزل کے اخلاقی پہلو کی نسبت تو صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہے۔ کہ موجودہ سینکڑوں دیوانوں میں مشکل سے ایک غزل ایسی نکالی جاسکتی ہے۔ جو کوئی شریف باپ اپنی بالغہ بیٹی کو پڑھ کر سُنا سکے۔ یا وضعدار شوہر اپنی بیوی کو کسی دُوسرے مرد کو سُنانے کی اجازت دے۔ وجوہ مذکورہ کی بنا پر ہی کہا گیا ہے۔ کہ غزلیات کے ذریعہ سے سچی شاعری کا منشا مشکل سے پُورا ہوسکتا ہے۔ قصیدے غزلوں سے بہتر ہیں۔ مثنوی اور مرثئے قریب قریب ایک ہی قسم کی نظمیں ہیں۔ اور میرے خیال میں ہر مرثیہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مثنوی کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ مرثیہ ایک اعلےٰ درجہ کی نظم ہے۔ اور اُس کا کہنا بہت مشکل ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ سو[۱۰۰] شاعروں میں سے کم سے کم پچانوے[۹۵] غزل گو اور زیادہ سے زیادہ پانچ مرثیہ گو ہوتے ہیں۔ اور ان پانچ میں سے بھی ایک کو مشکل سے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے بہت بڑی علمیت اور وسعت معلومات کی ضرورت ہے۔ مرثیہ گو کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ہیومن نیچر کا نہایت باریک مطالعہ کرچکا ہو۔ ایک واقعہ کو نظم کرتے وقت ہزاروں قسم کے آدمی متعلقین واقعہ اُس کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ ان ہزاروں آدمیوں میں سے ایک کی طبیعت کو بھی پہچاننے میں قاصر رہا ہے۔ تو وہ اُس کی تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں۔ کہ ایک تصویر کا باریک سا گرا ہُوا پہلو بھی ساری تصویر کو بالکل خراب کردیتا ہے۔ اور مصوّر کی سخت محنت پر ایک خفیف سے غلط نقطے کی وجہ سے پانی پھر جاتا ہے +

مرثیہ گو کی محبت اُس کے ہیرو کے ساتھ وصل۔ بوسہ یا کم از کم ایک نگاہ لطف کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ اُس کے ساتھ اس لئے محبت کرتا ہے۔ کہ اُس کو صدق دل سے قابل محبت سمجھتا ہے۔

اور سچی اور بے غرضانہ محبت کی اس سے اچھی دوسری مثال نہیں ہو سکتی - مرثیہ گو کو اپنے پیارے ممدوح کے ساتھ روحانی لگاؤ ہوتا ہے - اور اس لئے اُس کے کلام میں جسمانی یا مادی خط کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا - اور جب لذائذ دنیویہ سے واسطہ ہی نہیں رکھا جاتا - تو اُس کے پاک اشعار میں بد اخلاقی کو داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ملتی - مرثیہ گو کا ممدوح وہ شخص ہوتا ہے - جو اُس کے ایمان کے مُطابق پکا راست باز اور ناراستی کا دشمن ہو - اور ایسے راست باز اور پاکیزہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ کا شاعرانہ بیان ناظرین کے دلوں پر قدرتاً ایک اعلےٰ درجہ کا اخلاق بڑھانیوالا اثر پیدا کرتا ہے - آپ کسی سچے شاعر کا مرثیہ پڑھیں - تو آپ کو معلوم ہو گا - کہ اُس کے مرثیہ کا صرف ایک بند کئی واعظوں کے گھنٹوں کی اسپیچوں سے زیادہ عالی جذبات کو اُبھارنے والا اور پُر تاثیر ہوتا ہے - اردو زبان میں مرثیہ گو زیادہ تر مسلمان اور شیعہ مذہب کے لوگ ہوئے ہیں - بعض ہندو ان کے مرثیوں کو اس لئے رغبت سے نہیں پڑھتے - کہ اُن میں مسلمان بزرگوں کی تعریف ہوتی ہے - اور بعض سُنّیوں کو اُن کے ساتھ اس لئے دلچسپی کم ہوتی ہے - کہ اُن کو ان مرثیوں میں شیعہ اسپرٹ کی جھلک معلوم ہوتی ہے - مَیں ایک ہندو بلکہ آریہ ہوں - لیکن مَیں ہر دو اصحاب مذکور کے طرز خیال کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتا - میرا خیال یہ ہے - کہ مرثیہ کہنے والا شاعر اپنے دماغ میں راستی اور ناراستی کی جنگ شروع کرتا ہے - جس میں اُس کی فکر رسا راستی کی طرفدار ہوتی ہے - اور ایک اچھے شاعر کا مرثیہ شروع سے اخیر تک پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے دل میں راستی سے رغبت اور ناراستی سے نفرت ضرور پیدا ہو جاتی ہے - ہم قسم مذکور کے اہل ہنود اور اہل سنت و جماعت سے درخواست کرتے ہیں - کہ وہ ایک شیعہ شاعر کا مرثیہ پڑھتے وقت کسی اپنے مذہب کے ایسے بزرگ کا تصوّر باندھ لیا کریں - جو چند ناپاک دل لوگوں کے ظلم سے سخت تکالیف میں مبتلا ہُوا ہو - تو اُس وقت اُن کو اس مرثیہ کی اصلی خوبی محسوس ہو سکیگی - اور وہ فوراً معلوم کر لینگے - کہ شاعر نے ایک خاص شخص یا خاص واقعہ کی آڑ میں تمام دُنیا پر حاوی ہونیوالی سچائیوں کا اعلان کیا ہے - ماں اور بہنوں کے سامنے اُن کے بچوں اور بھائیوں کو قتل کرنا اور

پیاسوں کو بوند بوند پانی کے لئے ترسا کر مارنا ایسے ناپاک فعل ہیں۔ کہ اُن سے انسان کو نفرت دلانیوالا شاعر بجائے ظلم و جفا کے نیکی اور محبّت کی سلطنت قائم کرنے والا ہیرو کہلانے کا مستحق ہے *

اس کل داستان کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اردو زبان میں مرثیہ ہی وہ اعلےٰ قسم کی نظم ہے۔ کہ جس کے ذریعے سے ہم اصلی اور نقلی شاعر کا امتحان کر سکتے ہیں۔ یہ مرثئے ہی ہیں۔ جن کی بدولت شاعری کی منشا پوری ہوتی ہے۔ اور جن کے طفیل میں اردو زبان بھی سنسکرت۔ بھاشا اور انگریزی کی طرح مصلح اخلاق اور پیغمبر محبت ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ ہر فاعل کی فعل سے اور فعل کی اُس کے نتیجے سے عزّت ہوتی ہے۔ مرثیوں سے شاعری کی اصلی غرض کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس لئے اُس کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا مناسب ہے۔ مرثیہ کی عزّت مرثیہ گو کی عزّت ہے۔ اور ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم مرثیہ کہنے والے شعرا کو سچّا شاعر سمجھیں۔ اور دُنیا کی نظر میں اُن کا وقار بڑھانے کے لئے جہاں تک ہو سکے کوشش کریں۔ اُن کا اردو اور اردو والوں پر بہت بڑا احسان ہے۔ اور ہم کو چاہئے۔ کہ احسان فراموش نہ ہو کر اُن کی تعظیم کریں۔ اور اُن کا نام روشن کرنے کے لئے دل و جان سے ساعی ہوں۔ یُوں تو ہر مرثیہ کہنے والا شاعر قابل عزّت ہے۔ لیکن جس قدر اچھے مرثئے کوئی شاعر کہتا ہو۔ اُسی قدر زیادہ تعظیم و تکریم کا وہ مستحق ہے۔ اردو میں مرثیہ کہنے والے پہلے بھی بہت ہُوئے ہیں۔ اور اب بھی بہت سے سخنور مرثئے کہتے ہیں۔ لیکن میرزا دبیر کو اس فن کا بادشاہ کہنا نامناسب نہیں ہے۔ اُن کو یکتائے دوران کہنا بھی نازیبا نہیں ہے۔ اگر کسی لڑائی جھگڑے کے خوف سے ایک دُوسرے بزرگ کو بھی ان کا ہمسر مان لیا جائے۔ تو اس میں تو کلام ہی نہیں۔ کہ تیسرا شخص اُن کے پلّہ کا پیدا نہیں ہُوا۔ اور گو آئندہ کیلئے پیشینگوئی کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم زمانے کی بدلتی ہُوئی ہوا کا رُخ دیکھتے ہُوئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ شائد آئندہ بھی اس قسم کے شاعر کا مُنہ دیکھنا اردو زبان کے نصیب میں نہیں ہے *

مرزا دبیر اور میر انیس کا مقابلہ ایک پُرانا جھگڑا ہے۔ اس سوال کو طے کرنے کے لئے

دبیریوں اور انیسیوں کی بڑی بڑی جنگ ہو چکی ہیں۔ کئی کتابیں لکھی گئیں۔ کئی مناظرے ہوئی
مولانا شبلی صاحب سے جید عالموں نے اس موازنہ کے مشکل کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور بہتوں کی
نگاہ میں پورا تولنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اعتدال پسندوں کی رائے یہ ہے۔ کہ
دونوں کا مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں فرد تھا۔ ہم بھی ان اعتدال پسندوں
کی رائے کو ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس پتھریلے میدان میں قدم نہ
بڑھائیں۔ مگر جی نہیں مانتا۔ دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے۔ طبیعت چاہتی ہے۔ کہ کسی کے
کہنے سننے کی پروا نہ کرتے ہوئے کچھ کر ڈالیں۔ ہم نے بھی فارسی اردو پڑھی ہے۔ اور خاندان
کے رواج کے مطابق ایسی بری بھی نہیں پڑھی بقول شخصے "کودوں دیکر نہیں پڑھا"۔ اور نہ مولویوں کو
صرف اچار یا جمعراتی دے کر ٹرکاتے رہے ہیں۔ دونوں کاملوں کے کلام کا بہت کچھ حصہ
دیکھا ہے۔ اُن کی بابت ہماری رائے بھی آپ سے آپ قائم ہو گئی ہے۔ خدا جانتا ہے۔
کہ ہم دبیرئے ہیں نہ انیسئے۔ اُردو کے پانچویں سواروں میں ہمارا شمار بھی نہیں ہے۔ ہماری
رائے ایک نوجوان ناتجربہ کار شخص کی رائے ہے۔ اس لئے اگر کسی کو ہم سے اختلاف ہو۔ تو معافی
چاہتے ہیں۔ ہم کو نہ لڑنے کی آرزو ہے نہ جھگڑنے کی فرصت +

ہماری رائے میں مرزا دبیر مرحوم کو فارسی و عربی کی لیاقت میر انیس مغفور سے زیادہ تھی۔
مرزا صاحب ان زبانوں کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس خوبی سے استعمال کرتے
ہیں۔ کہ خلاف فصاحت نہیں ہوتا۔ ہر لفظ کو نہایت موزون جگہ دی جاتی ہے۔ اور اہل مطالعہ کو نہایت
غور کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لفظ اپنی جگہ پر بالکل ضروری تھا۔ اور اُس سے بہتر لفظ کی تلاش
ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کے یہاں فارسی و عربی کی کمی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں الفاظ کا کافی
ذخیرہ موجود ہے۔ میر صاحب کے یہاں ان کی کمی کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ میر صاحب اکثر مقامات
پر نہایت معمولی الفاظ سے ہی کام نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ اُس سے بہتر لفظ مل جانا ماہر زبان کیلئے
مشکل نہیں کہا جا سکتا۔ معمولی الفاظ سے ہماری مراد سیدھے اور چھوٹے الفاظ سے نہیں ہے۔

سیدھے اور چھوٹے الفاظ کا استعمال کرنا ہمارے نزدیک داخل فصاحت ہے۔ معمولی الفاظ سے ہماری مُراد اُن الفاظ سے ہے۔ جو متکلّم کے مطلب کو پُورے طور سے ادا نہیں کر سکتے۔ اور جن کے مقابلے میں زبان میں اَور ایسے الفاظ موجود ہیں۔ جو مطلب مذکورہ کے ادا کرنے کی پُوری قدرت رکھتے ہیں +

مرزا صاحب کی معلومات اور علوم مختلفہ سے واقفیت میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مرزا صاحب کے کلام سے بہت سے تاریخی واقعات اور علوم کے اصول فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ جن کا میر صاحب کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے +

میر صاحب کا کلام صرف فصیح ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں فصاحت اور بلاغت دونوں کی کمی نہیں ہے۔ "بہت لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب ضرورت سے زیادہ بلیغ اور اس لئے ٹھس تھے۔ میر صاحب کے کلام کی سی روانی ان کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی۔" ان صحاب کی گفتگو سراسر غلط ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں سے بیسیوں مرثئے اور ہزاروں بند ایسے اخذ کی جا سکتے ہیں۔ کہ جن کا ثانی بلحاظ فصاحت بھی میر صاحب کے یہاں نکلنا مشکل ہے۔ افسوس کہ طوالت سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ہر دعوے کی تائید میں اس موقع پر (ثبوت کے) ڈھیر لگا دئے جاتے۔ حیات دبیرؔ میں ایسے بند ناظرین انصاف پسند خود مطالعہ فرما کر ہمارے کلام کی تصدیق کریں +

مرزا صاحب کے مزاج میں استقلال اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ اس لئے اُن کا کلام میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور گہرا ہے۔ اس سنجیدگی اور گہرائی میں اگر نقص ہے تو یہ ہے۔ کہ عوام کو مرزا صاحب کا بعض کلام بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مرزا صاحب کا قصور نہیں۔ اس کا الزام جہالت کی گردن پر ہے +

نارنگی اور انار دونوں ہی خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک بچّے کے سامنے ایک انار اور ایک نارنگی رکھ کر اُس کو مجبور کریں۔ کہ وہ دونوں میں سے صرف ایک کو لے لے۔ تو بچّہ دونوں کو

مزہ دار سمجھتا ہو تو دونوں کو ہی لینے کی آمادگی ظاہر کریگا۔ لیکن انتہائے مجبوری پر وہ دونوں میں سے اُس ایک کو لے لیگا۔ جسے وہ اپنے خیال میں زیادہ اچّھا سمجھتا ہے۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ہم میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام کو مزہ دار سمجھتے ہیں۔ لیکن بچّے مذکور کی طرح ایک کو ہی قبول کرنے کے لئے مجبور ہونے پر ہم مرزا صاحب کے کلام کو ہی گھول کر پی جائیں گے +

مرزا صاحب کا کلام ہماری مقرر کی ہوئی کسوٹی پر پرکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب واقعی سچّے شاعر تھے۔ وہ شاعری کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چونکہ ہر اصلی شاعر کا مشن یہی ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں اخلاق کو ترقّی دے۔ اس لئے وہ دُوسرے واقعات کے پیرایہ میں اپنے وقت کی بھلائیوں اور برائیوں کے نغمے سُنایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانے میں بھی آج کل کی طرح بیجی دینداری کی جگہ ریاکاری کا بہت زور تھا۔ اور وہ اُس سے متنفّر تھے۔ اور اُس کی مذمّت اس طرح فرماتے ہیں۔ ؎

(۱) نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں ‏ ‏ ‏ ‏ تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

مرزا صاحب چاہتے ہیں۔ کہ انسان اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر خدا سے معافی کا خواستگار ہو۔ (فرماتے ہیں):۔

(۲) رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں ‏ ‏ ‏ ‏ مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل ‏ ‏ ‏ ‏ تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

(۳) مرزا صاحب ایک مصلحِ اخلاق کی حیثیت میں اپنے ہم جنسوں میں صبر و قناعت اور وضعداری و بیکسوں اور مفلسوں سے ہمدردی کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جناب ممدوح حضرت امام حسین علیہ السلام کی زبان سے اُن کی چار برس کی بیٹی سکینہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ ؎

سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا ‏ ‏ ‏ ‏ آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا*

گو قہر ہے اِس سن میں جُدا باپ سے ہونا ‏ ‏ ‏ ‏ لاشا مرا تڑپیگا۔ بہت مجھ کو نہ رونا

گر چاہو مری رُوح ہو ناشاد سکینہ!! ‏ ‏ ‏ ‏ تو غم میں مرے۔ کیجیو فریاد۔ سکینہ!!

(۴) اسی طرح جب شمر ابن ذی الجوشن حضرت امام حسینؑ کے بھانجوں کو اپنی فوج کے علمدار بنانے کا لالچ دے کر اُن کو حضرت ممدوح کے خلاف باغی بنانا چاہتا ہے۔ تو وہ چھوٹے چھوٹے بچے کیا خوب جواب دیتے ہیں۔ جس سے انتہا کی قناعت اور دلیری و وضعداری ٹپکتی ہے۔ اِس موقع کے متعلق مرزا صاحب کے یہ بند ہیں:۔

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک — بس بس زیادہ مُنہ سے نہ اب واہیات بک
چُپ نابکار چُپ۔ سرک او بے ادب سرک — یہ شور و شر یہ بخدا۔ کانپ اُٹھے فلک
بہکا انہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں — یہ اُن سے کہ۔ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں

ہمدوش حمزہؑ۔ حیدرؑ کرار تھے؟ نہ تھے — روز احد نبیؐ کے علمدار تھے؟ نہ تھے
عباسؑ اس علم کے سزادار تھے؟ نہ تھے — شاہ نجفؑ کے یہ دُرِ شہوار تھے؟ نہ تھے
توبہ۔ جُدا۔ ہم اس پہ امام ہُدا سے ہوں — بیٹے کے ہوتے۔ نانا کے وارث نواسے ہوں

انبار۔ سیم و زر کے جو اہل درم لگائیں — بھولے سے ہم نہ ہات۔ خدا کی قسم۔ لگائیں
آنکھوں میں شہ کا سُرمہ خاک قدم لگائیں — پارس کے بھی پہاڑ کو ٹھوکر نہ ہم لگائیں
سب نے زباں سے آب و غذا کا مزا۔ لیا — ہم نے فقط زباں سے۔ نام خُدا۔ لیا

(۵) مرزا صاحب محبت کے دلدادہ تھے۔ وہ اہل محبت کی نہایت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عباسؑ علمدار کی اُلفت کی بابت فرماتے ہیں۔ ؎

جس دن تلک آباد یہ ویرانہ رہیگا — عباسؑ کی اُلفت کا بھی افسانہ رہیگا

مرزا صاحب کا کلام ایسے ایسے اخلاق کی درستی کرنے والے اور محبت کی ترقی کے موجب خیالات کا کبھی خالی نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ اگر مرحوم کا کلام بغور پڑھا جائے۔ تو یقینی طور پر معلوم ہوگا۔ کہ اُنہوں نے اہل عالم کے جذبات کو پاک بنانے کے لئے اپنی بیش قیمت زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ انسانی جماعت کو نیک اور پاکیزہ خیال بنانے کے لئے اس دُنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اور اس لئے سچے اور اصلی شاعر تھے مرزا صاحب کے **نیچرل شاعر** ہونے کا بڑا بھاری ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ اُن کے اور اُن کے ساتھی

میر انیس مرحوم کے بعد دُوسرے شاعروں کو مرثیہ کہنے کی کافی جرأت نہیں ہوتی۔ گویا مرثیہ گوئی بھی ان عالی دماغ بزرگوں کے ساتھ ہی عدم کو چلی گئی۔ ہمارا یہ خیال ایمان کے درجے تک پہنچا ہُوا ہے۔ کہ جب تک خدا کو منظور نہ ہوگا۔ کہ انسان کی بھلائی کے لئے اردو زبان کو بھی وسیلہ بنایا جائے۔ دبیر یا انیس ثانی پیدا نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہم کتنے بُرے آدمی ہیں۔ اردو بولنے والی قوم کس قدر محسن کُش ہے۔ کہ اُس کی زبان پر بلکہ اُس کی جان پر اس قدر احسانات کرنے والے اخلاق و محبّت کے پیغمبر کی **سوانح عمری** لکھنے کی کسی کو فکر نہ ہوئی۔ ہمارا ارادہ تھا۔ کہ دبیر سے کامل بزرگ کا نام تک دُنیا سے مٹ جائے۔ خدا عادل ہے۔ اُس کو ہمارے ناپاک ارادے کی تائید منظور نہ تھی۔ اور اُس نے ہمارے دوست صادق **مولانا سیّد افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی** کے دل میں جو ایک اعلےٰ درجہ کے عالم۔ شاعر اور مرثیہ گو ہونے کے علاوہ عالی جناب **مرزا اوج** صاحب خلف الصدق مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اس ضروری کام کی طرف شوق پیدا کیا۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے **حیات دبیر** تکمیل کو پہنچی۔ حیات دبیر اردو زبان میں لکھی ہوئی اردو شعرا کی سوانح عمریوں میں **یکتا** سمجھی جائیگی۔ کیونکہ اوّل تو یہ ایک لاثانی شاعر اور کامل پاک باطن کی زندگی کے حالات سے معمور ہے۔ دوئم اس کی تکمیل کے لئے ایک تعجب میں ڈالنے والا معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ یہ حیات (لائف) مرزا صاحب مرحوم کی ایک سچی تصویر ہے۔ اور اس میں اُن تمام بے جا اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو مرزا صاحب اور اُن کی شاعری پر **کم فہمی یا کسی اور سبب سے** اُٹھائے گئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ یہ **سوانح عمری** مصلح اخلاق حامی محبت **دبیر** کے نام سے دُنیا میں اخلاق اور محبّت کو ترقی دینے کی موجب ثابت ہوگی۔ اور اُس کے **نیک دل مصنف** کو دارین کا ثواب حاصل ہوگا۔

ہمارا بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ کہ **اردو شاعری** کے متعلق ایک فلسفیانہ رسالہ ترتیب دیں جس میں اردو شاعری کے باطنی پہلو کو دکھلاتے ہُوئے اُن تمام الزامات کا جواب دیں۔ جو شاعری کے فلسفہ سے ناواقف لوگوں نے اس کے ماتھے لگا رکھے ہیں۔ جن اصول پر کتاب مذکور لکھی جائیگی۔ اُس کی کچھ جھلک اس تقریظ میں دکھا دی گئی ہے۔ اگر **حیات دبیر** کی بدولت ہمارے خیالات پر رائے کی

خدمت میں حاضر ہو کر دل چسپی حاصل کرینگے - تو ہم کو کتاب مذکور کے لکھنے کے لئے دو چند بلکہ سہ چند حوصلہ حاصل ہوگا ۔ جناب مولوی افضل حسین صاحب ثابت رضوی نے یہ اعلےٰ درجہ کی کتاب لکھکر اپنا کام کر دیا ہے - ہمارا کام باقی ہے - اور وہ یہ ہے - کہ مولانا ممدوح کے کام کی قدر کریں - دیکھیں - ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہوتے ہیں یا نہیں - خداوندا ایسی اچھی کتاب مقبول عام و خاص ہو ۔

ہیرالال - سود - شیدا - اکبر آبادی

۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء - مقام کوٹہ - راجپوتانہ

تقریظ عالم علوم فارسی و انگریزی جناب مستطاب منشی ہیرالال صاحب بی - اے - ایل - ایل - بی - جوڈیشل سکرٹری محکمہ عالیہ خاص حضور دربار بہادر دام اقبالہ (ریاست کوٹہ - راجپوتانہ)

حکیموں کا قول ہے - کہ کائنات کا مشاہد ہر قسم کا کمال حاصل کر سکتا ہے - بشرطیکہ قدرت نے اسکو خاص آنکھ اور خاص دل و دماغ عطا کیا ہو - کہ جس سے وہ مشاہدات کے دیکھنے اور اُن کے سبب دریافت کرنے اور سمجھنے میں غلطی نہ کھانے - اس مقولہ کو مد نظر رکھتے ہوئے کارلائل نے جو انگلستان کا ایک مشہور فاضل ادیب (لٹریچر) ہے - اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (Heroes and Hero worship) میں ریفارمر جنگجو - نبی اللہ اور شاعر کو مشاہد (Seer) کا لقب دیا ہے - اور مشرح طور پر سمجھایا ہے - کہ اِن لوگوں میں اور عام لوگوں میں فرق یہ ہے - کہ یہ لوگ نیچر کی ماہیت کو سمجھنے والے اور جاننے والے ہوتے ہیں - اور عام لوگ اِس فیض سے بے بہرہ - پس اس میں شک نہیں ہے - کہ کائنات ایک ایسی کتاب ہے - کہ جس کا پڑھنے والا خواہ وہ کسی مذاق اور طبیعت کا ہو - اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق شے مطلوبہ کو پاتا

چلا جاتا ہے۔ اور جس قدر اس کتاب کے دیکھنے میں جانفشانی کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس پر اسرار ربانی ہویدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی ترقیاں سب اس کی شاہد ہیں۔ ہوائی جہاز مختلف قسم کے آلات حرب۔ نئے ستارے اور سیاروں کی معلومات۔ ایکس ریز (X. Rays - ایک قسم کی چمکدار شئے جس کے استعمال سے جذام تک اچھا ہو جاتا ہے۔ اور دیگر مختلف قسم کے امراض کا یقینی دفعیہ ہوتا ہے) وغیرہ وغیرہ سب اسی کتاب کے چھوٹے چھوٹے نسخے ہیں۔ کہ جن کو مشاہدان نے سرورق کتاب سے پڑھ کر عوام پر ظاہر کیا ہے۔ مگر جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر کس و ناکس اس کتاب نیچر کے پڑھنے اور سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور جو لوگ اس کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن کو قدرت خاص طور پر اور ایسی خاص خاص قوتوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔ کہ جو عام لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اور اس میں خلاق عالم کی عین مصلحت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گو ہمہ شب شب قدر بودے۔ شب قدر نیز بے قدر بودے۔ چنانچہ ہیروز (Heroes) کی تعظیم و تکریم اور اُن کی دعوت کرنا ہر قوم و ملت و ملک نے فرض عین قرار دیا ہے +

یوں تو ہر قسم کے مشاہد اور موجد کی تعظیم کرنا فرض انسانی ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں مختلف قسم کی روشنیاں اور ترقیاں اُن کے نفس نفیس اور ذات پاک کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہیں اور وہ بنی نوع انسان کے اعلےٰ درجہ کے محسن ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان بزرگان علم و فن میں سے وہ کونسے ہیں۔ کہ جن کا تعلق عظیم ذات انسان سے ہے۔ اور جو انسانی طرز معاشرت۔ تعلقات باہمی۔ علم و ادب۔ رسم و رواج۔ خیالات دینی و دنیوی کے بانی اور موجد و مصلح ہیں۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ انسان مثل حیوانات کے اُن طریقوں۔ جذبات اور حرکات کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ کہ جو قدرت نے وقت پیدائش اُس کو عطا کئے ہیں۔ بلکہ خلاف اُس کے اُس کی حرکات وغیرہ یک گونہ خود حاصل کردہ ہیں۔ یا اُن اثرات سے متاثر ہو کر پیدا ہوئے ہیں۔ جو اُس پر سوسائٹی۔ تمدن۔ ملکی و قومی تہذیب وغیرہ

نے ڈالی ہیں +

پس ان سب امور پر نظر کرتے ہوئے ماننا پڑیگا۔ کہ وہ ہیرو جس کا بڑا تعلق انسان سے ہے۔ ریفارمر یا نبی ہے۔ اور اس کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے مختلف طبقوں کے انسان (باستثناء اُن کے جو غیر مذہب ہیں۔ اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں) کسی نہ کسی ریفارمر کے اصول کے پابند ہیں۔ حالانکہ اُس ریفارمر کو مرے ہوئے صدہا بلکہ ہزارہا برس ہو چکے ہیں۔ مگر اُس کے قول اور فعل۔ وعظ اور الہام نے انسانوں کے دل پر ایسا سکہ بٹھایا ہے۔ کہ جس کو وہ پُشت ہا پُشت تک نہیں بھول سکتے۔ اور اپنے جملہ تعلقات زندگی میں اپنے منقبولہ ریفارمر کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں لیکن "ریفارمر" کی فضیلت۔ اُس کے احسانات۔ رہنمائی وغیرہ کا ذکر کرنا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ ایک وسیع مضمون ہے۔ کہ جس کے لئے فرصت اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ جو بدقسمتی سے راقم کے پاس دونوں نہیں ہیں +

ریفارمر کے بعد قابل قدر اور واجب التعظیم ہیرو شاعر قرار پاتا ہے۔ کیونکہ شاعر کا کلام انسان کی آئندہ تہذیب و لٹریچر و طریق معاشرت پر اثر ڈالنے والا اور زمانہ سابقہ کی لٹریچر۔ عادات۔ افعال۔ طبیعت اور مذاق کا چمکدار آئینہ ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہنا چاہئے۔ کہ ہر خطہ زمین و ہر زبان کے شاعر کے کلام کا اُس خطہ کے باشندگان اور زباندانوں پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے۔ کہ اُن کی نقل و حرکات اور لٹریچر اور مذاق طبیعت اُس کے جادو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح اگر زمانہ سابقہ کی کسی قوم کے حالات اُن کی تہذیب طریق عمل اور آپس کے برتاؤ کا پتہ لگانا ہو۔ تو اُس قوم کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ اِن سب امور پر ضرور روشنی ڈالیگا۔ اور مطالعہ کرنے والے کو اس ذریعہ سے وہ تحقیقات حاصل ہونگی۔ کہ جن کے اظہار کے لئے تواریخ بالکل قاصر ہیں۔ یہ بات کہ شاعر کے کلام کا انسان پر کیوں اس قدر اثر پڑتا ہے محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ شاعر مثل

مصوّروں کے ہر قسم کے سین ([illegible]) پیشکش (انسان) کرتا ہے - اور وہ بھی اس طریق سے کہ انسان کی آنکھ اُس کے دیکھنے سے کبھی سیر نہیں ہوتی - اور آنکھ کے ساتھ دل و دماغ انسان بھی دلکش نظارہ سے مزہ اُٹھاتے ہیں - شاعر کا کام مصوّر سے کہیں بڑھا چڑھا ہوتا ہے - اور گو اچھے مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر بھی دیکھنے والے کو محو نظّارہ کر لیتی ہے - مگر جوں ہی کہ دیکھنے والا تصویر کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے - تصویر کے نقش اُس کے دل و دماغ میں پھیکے ہوتے چلے جاتے ہیں - حتّے اکہ کچھ عرصہ بعد دل و دماغ پر کچھ اثر نہیں رہتا - اس کے سوا مصور کی کھینچی ہوئی تصویر صرف ظاہری مادی حالت کو ظاہر کرتی ہے - اور اندرونی حالات اُس سے سراسر پوشیدہ رہتے ہیں - برعکس اس کے شاعر کے کھینچے ہوئے فوٹو کا اثر گو آنکھ پر نہ ہو - مگر دل و دماغ انسان پر اُس کا ایسا عکس پڑتا ہے اور جاگزیں ہو جاتا ہے - کہ انسان کی کوشش سے بھی مٹایا نہیں جا سکتا - پھر مصوّر کی تصویر کی طرح کامل شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر ناقص نہیں ہوتی - کیونکہ اُس میں ظاہری اور اندرونی حالات دونوں فصاحت کے ساتھ دکھلائے جاتے ہیں - یعنی یہ کہ مصوّر اگر کسی انسان کی تصویر کھینچے - تو وہ اُس انسان کی جسمانی کیفیت اور پارچہ پوشیدنی کی رنگت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا - مگر شاعر اُس انسان کے حرکات - عادات - اخلاق - مذاق اور جذبات کا پورا چربہ اُتار لیتا ہے - شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر کے باا ثر ہونے کی ایک وجہ موجّہ یہ بھی ہے - کہ شاعر تصویر کے کھینچنے میں الفاظ استعمال کرتا ہے - اور چونکہ انسان حیوان سے "استعمال لفظ" کی وجہ سے ممتاز ہے - کہ تمام حیوانوں میں فقط انسان ہی ناطق ہے - اس لئے کلام شاعر کا اثر خصوصیت کے ساتھ قلب انسان پر پڑتا ہے - اور پشت ہا پشت بلکہ صدیوں اور ہزار ہا برس تک قائم رہتا ہے - چنانچہ بادشاہ ایران کو ایک نظم سُنا کر سفر سے واپس لے آنا - بخیل اور وعدہ شکن سلطان کو ایک ہجو لکھکر موعودہ انعام ادا کرنے پر آمادہ کر دینا - حکمرانان ہند کو چند اشعار سنا کر جنگ اور صلح پر مستعد کر لینا - سامعین کے دلوں میں ایک مجلس اور ایک وقت میں مرثیہ - سلام - قصیدہ - رباعیات وغیرہ پڑھ کر مختلف قسم کے اثر رنج اور خوشی کے

ڈالنا ایشیائی شاعروں کے ایسے کرشمے ہیں۔ جن کی صراحت کی ضرورت نہیں ہے +

یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے۔ کہ شاعر ہر ملک اور ہر قوم کے لٹریچر کی رُوح رواں ہوتے ہیں۔ اور ہر قوم کے لٹریچر کی افزایش اُس قوم کے شاعروں پر منحصر ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ اور تواریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ کہ ہر ترقی کرنے والی زبان میں اعلےٰ درجہ اور پایہ کے شاعر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جس وقت کسی زبان کی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ یا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ تو اُس وقت شاعروں کی کمی قدرتاً ہو جاتی ہے +

دیکھنا یہ ہے۔ کہ شاعر کون کہے جانے کے قابل ہے۔ اور شاعر میں کیا کیا صفات ہوتی چاہئیں۔ میرے خیال میں سب سے اوّل شاعر کو پورے طور پر زبان دان ہونا چاہئے۔ دویم جس ملک اور قوم میں وہ پیدا ہوا ہے۔ اور جس ملک اور قوم کے وہ حالات درج کرتا ہے۔ اُس کے مختلف رسم و رواج اور طرز و طریق سے واقف ہونا چاہیئے۔ سویم انسان کے جذبات خیالات۔ توہمات کا پورا ماہر ہونا چاہیئے۔ چہارم موزون طبع ہونا چاہیئے۔ پنجم صاحب علم ہونا چاہیئے۔ ششم قدرتاً شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ "شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جا سکتے" (Poets are born not made) +

پس ان چھ صفات مذکورہ بالا کی رو سے جو شاعر کے لئے ستہ ضروریہ ہیں آگے اس امر پر بحث کی جائیگی۔ کہ فاضل اجل عالم متبحر جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم و مغفور کس درجہ اور پایہ کے شاعر تھے۔ کیونکہ مخدومی جناب مولانا سید افضل حسین صاحب رضوی ثابت لکھنوی نے برسوں جانکاہ محنت کر کے حیات دبیر مرتب کی ہے۔ اور مجھ سے صاحب موصوف کی فرمایش ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم و مغفور کے متعلق ایک مضمون لکھا جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں (باوجودیکہ مجھ بے بضاعت کا ایسے معاملات میں لکھنے کو قلم اُٹھانا ایک ہنسی کی بات ہے) یہ مضمون لکھا گیا ہے +

(۱) مرزا صاحب کا زباندان ہونا مقبول عوام وخواص ہے - اور مرزا صاحب کی زباندانی کا پورا پتہ اُن کے کلام سے ملتا ہے - مرزا صاحب نے مرد - عورت - بادشاہ - فقیر - شہری دیہقانی - بوڑھے - بچے - فاضل - جاہل - خادم - بازاری وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کے حالات نظم فرمائے ہیں - اور خوبی یہ ہے - کہ ان لوگوں کی زبان کو سرِ مو ہاتھ سے نہیں جانے دیا - اگر کسی بچے کی گفتگو کا موقع ہے - تو بچے کی زبان کا پاس رکھا ہے - پیارے پیارے اور دلکش لفظوں کو استعمال کیا ہے - بہادر جوان کی گفتگو نقل کرتے وقت زبان پرجوش استعمال کی ہے - نوکروں - غلاموں - دہقانوں اور جاہل سپاہیوں کی زبان ہو بہو اُسی قدر شرفا کی زبان سے گری ہوئی کام میں لائی گئی ہے - جیسی کہ فی الواقع ہوتی ہے - غرضیکہ جس پایہ اور فن کے آدمی کا فوٹو اُتارا ہے - اُس کی زبان ویسی ہی باندھی ہے - مرزا صاحب کی نظم میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا - جس کو اردو سے گرا ہوا کہا جا سکے - بلکہ کہنا پڑیگا - کہ مرزا صاحب کی زبان ٹکسالی ہے - اور ہر طالب علم کو مرزا صاحب کی نظموں سے اردو زبان سیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے - یہ جو کہا جاتا ہے - کہ مرزا صاحب کی زبان عام فہم نہیں ہوتی - غلط ہے - مرزا صاحب نے ضرور کہیں کہیں فارسی اور عربی کے سخت لفظوں کا استعمال کیا ہے - مگر وہ استعمال ضرورت کے موافق اور ضروری ہے - یہ نہیں کہا جا سکتا - کہ مرزا صاحب کو اردو کے لفظ نہ ملے - تو عربی فارسی کے لفظ استعمال کرڈالے - کیونکہ بہت سا کلام مرزا صاحب کا (مندرجہ حیات دبیر و موجودہ دفتر ماتم) اس قدر سلیس ہے - کہ جو خود اپنی نظیر ہے - اور جس کی نقل کرنا اگر غیر ممکن نہیں - تو سخت مشکل ضرور ہے - یہ مرزا صاحب ہی کا حوصلہ اور کام ہے - کہ ہر قسم کا کلام سلیس سے سلیس اور دقیق سے دقیق اُنہوں نے بڑی خوبی سے کہا ہے - ورنہ ہر شاعر ایک نہ ایک ایسا پہلو اختیار کر لیتا ہے - کہ جس سے وہ مشکل سے ہٹ سکتا ہے - یعنی سہل گو شاعروں سے ادق الفاظ کا استعمال اگر وہ چاہیں - تو بھی نہیں ہو سکتا - اور ادق اور مشکل گو شاعروں سے سہل گوئی قریباً ناممکن ہوتی ہے - مگر مرزا صاحب کے پاس ہر قسم کے الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے - کہ ہر مذاق اور طبیعت کے آدمی کو اُس کی خواہش کے موافق بڑی بہتات کے ساتھ اُن کا کلام آسانی سے مل سکتا ہے - پس جو شاعر صرف [illegible]

کی کلام گوئی میں مشتاق ہیں۔ اُن کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ زبان پر تمام و کمال حاوی نہیں ہیں
مگر مرزا صاحب کے لئے ایسا کہنا محض اتہام لگانا ہے + نتیجہ یہ نکلا کہ زبان اردو پر جس قدر مرزا صاحب کو
قدرت ہے۔ دوسرے شاعر کو نہیں معلوم ہوتی +

(۲) مرزا صاحب کی ہندوستان اور عربستان کے طرز طریق اور رسم و رواج سے واقفیت
بھی مسلم امر ہے۔ اور یہ واقفیت اُن کی نکاح۔ پیدائش۔ موت و جنازہ۔ جنگ۔ دعوت۔
تعظیم بزرگان اور پردہ نشین خاتونوں کی سواری۔ سفر و حضر کے حالات سے جو اُنہوں نے درج فرمائی
ہیں۔ سراسر ظاہر ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے عرب کے سیدھے سادے نکاح۔ جنازہ کی خاموشی
اور صبر کے ساتھ طیاری۔ مبارزان جنگ کی رجز خوانی۔ خاتونوں کی سواری کے وقت پردہ داری کے
اہتمام کو اُن کے طریق اور رسم و رواج کے موافق قلمبند فرمایا ہے۔ جو بعد وفات بانی اسلام عربستان
یا ہندوستان میں جاری تھے۔ اور ایسا کرنے سے مرزا صاحب کے کلام کا اثر اور اُس کی خوبصورتی
دوبالا ہو گئی ہے۔ اور سامعین یا مطالعہ کنندہ کی نگاہ کے سامنے اِن واقعات کے سُننے یا پڑھنے
سے زمانہ سلف کے عربستان اور اُس کے باشندگان کا آنکھوں میں سچا فوٹو پھر جاتا ہے۔ اور کچھ
عرصہ کے لئے وہ اپنے آپ کو ناظرین معرکہ کربلا اور دیگر واقعات کا سمجھنے لگتے ہیں +

مرزا صاحب کے شاعر بے مثل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔ کہ اُنہوں نے کسی سانحہ یا حال کو اصلیت
اور سچائی سے گرا ہُوا نہیں باندھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کا کلام اس قدر مقبول اور دلکش ہے۔ کیونکہ ظاہر
ہے۔ کہ اگر کوئی شاعر کسی عرب کی شادی کا سماں باندھے۔ اور خلاف دستور عرب عیسائیوں کی شادی کا ڈھنگ
اُس شادی میں نمایاں کرے۔ تو اُس کی نظم گو بندش الفاظ اور دیگر شاعرانہ خوبیوں سے پُر ہو۔ مگر سچائی
سے گرے ہوئے ہونے کی وجہ سے سامعین کے دل پر کچھ اثر نہ کر سکیگی +

(۳) مرزا صاحب کا جذبات۔ خیالات۔ توہمات انسانی کا ماہر ہونا۔ مرزا صاحب
کے نیچر انسانی پر قادر ہونے کی مثالیں اُن کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے سفر عراق کے
وقت [illegible] کو گھر چھوڑ جانے پر اُس کے تنہا رہنے کے خیالات۔ باپ ماں اور بھائی بہن کے

اُس سے جُدا ہونے پر دلی صدمات۔ بیمار بہن کے اپنے ننھّے سفر میں جانے والے بھائی کے لئے اظہارِ محبّت و رنج۔ والدہ سے نوجوان بیٹے کے جنگ میں جانے کے لئے اجازت چاہنے پر مادری اندیشوں و دلی وسوسوں۔ زندان کی مصیبتوں میں کم سن بچّوں کی گھبراہٹ اور خواہشیں۔ اور بزرگوں کے تفکّرات وغیرہ وغیرہ انسانی نیچر کو اس متانت۔ آراستگی اور سچائی کے ساتھ دکھلایا ہے گویا انسانی دل کو ناظرین کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور یہ مرزا صاحب کی اعلےٰ درجہ کی فضیلت ہے جو دُوسرے ہندوستانی شاعروں کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے ◆

شعراءِ یورپ کو شعراءِ ایشیاء پر ترجیح اس وجہ سے دی جاتی ہے۔ کہ شعراءِ ایشیا عام طور پر مثل شعراءِ یورپ کے انسانی نیچر کو بیان نہیں کر سکتے۔ شعراءِ ایشیاء صرف بندشِ الفاظ۔ سلاست زبان حسنِ بیان اور دیگر مضامین وعظ و خدا پرستی پر اکثر اکتفا کرتے ہیں۔ اور گو وہ باغ۔ پہاڑ۔ میدان۔ جنگل۔ خلوت۔ جلوت۔ رزمگاہ وغیرہ کے سین بھی کامیابی کے ساتھ کھینچ لیں۔ مگر انسانی نیچر کا فوٹو اُتارنا اُن کی مقدرت سے بالکل باہر ہوتا ہے۔ مگر یہ اعتراض مرزا صاحب پر عائد نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے انصاف تو یوں ہے کہ اپنے کمال میں شعراءِ یورپ کو سراسر مات کر دیا ہے۔ مرزا صاحب نے ایشیائی طرزِ شاعری یعنی بندشِ الفاظ و خوبصورتی زبان و پابندی قواعد عروض کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیچر انسان کو اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ شعراءِ یورپ سے جس کا جواب ہونا مشکل ہے گویا مرزا صاحب کے کلام میں دونا لطف موجود ہے۔ ایک لطافت زبان اور دوسرے نزاکت مضامین۔ پھر مرزا صاحب کے کلام میں ہر قسم کے انسان کے نیچر کو پورے طور پر دکھلایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسانی نیچر کے اظہار پر مرزا صاحب پورے قادر ہیں۔ اور مثل اکثر شعراءِ یورپ کے مرزا صاحب کو عورت یا بچّے وغیرہ کے دل و دماغ کے خاکہ اُتارنے میں کوئی مجبوری عائد نہیں ہوتی۔ جہاں جس کی زبان سے وہ کوئی خیال ادا کرتے ہیں۔ اُسی کے مناسب حال ہوتا ہے ◆

(۴) موزونیت طبع مرزا صاحب پر ختم ہے۔ مرزا صاحب نے معمولی آدمیوں کی فرمائش پر گھنٹوں میں صدہا اشعار یک لخت لکھ کر اُن کے حوالہ کر دئے ہیں۔ مرزا صاحب کا مطبوعہ کلام دیگر ہم با د

ہمعصر شاعران ایشیا کے مقابلہ میں دو چند سہ چند بلکہ چہار چند ہے۔ اور بہت سا کلام ایسا ہے جو لوگوں کے گھروں میں پڑا ہوا ہے۔ اور جس کی اشاعت کی ابتک نوبت بھی نہیں پہنچی۔ چنانچہ کچھ ایسا کلام بھی حیات دبیر میں فاضل مؤلف نے درج کیا ہے۔ اور باقی ایسے کلام کا پتہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ مگر باوجود ایسے پرگو شاعر ہونے کے مرزا صاحب کا کلام کہیں ایسا دستیاب نہیں ہوتا جو موزونیت سے گرا ہوا ہو +

(۵) مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے میں شاید ہی کسی کو کلام ہو۔ مرزا صاحب نے جا بجا اپنے کلام میں اکثر معتبر حدیثوں اور روایتوں اور آیات قرآن شریف کے مضامین عالیہ کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے چُست بندش۔ بلند پروازیٔ خیال سے تلمیحات۔ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال۔ مختلف بحروں میں نظمیں۔ ردیف کی پیچیدگی اور قافیہ کا مناسب حال ہونا جملا ایسے امور ہیں جو اُن کے اعلےٰ درجہ کے صاحب علم اور باکمال ہونے پر دال ہیں۔ شاعر کے لئے صاحب علم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بلا صاحب علم ہُوئے شاعر سے اُس کے ملک کے لٹریچر اور باشندگان ملک کی زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور نہ اُس کی نصیحت اور پند سے عوام پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ شاعر کی نازک خیالیاں اُسی وقت قابل قدر ہوتی ہیں۔ جبکہ علم و ہنر کے زیوروں سے مرصع ہو کر پبلک میں جلوہ افروز ہوں۔ ورنہ اچھے سے اچھے اور اعلےٰ خیال کا بھدے یا بدنما طریقہ سے اظہار کرنے میں ستیاناس ہوجاتا ہے۔ اور وہ شرفاء اور مہذب لوگوں کی باریابی سے محروم رہتا ہے +

مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے کی وجہ سے اُن کی نازک خیالیوں نے اردو زبان پر بہت بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور اردو لٹریچر میں مرزا صاحب کے نفس نفیس سے وہ وہ ترقیاں نمودار ہُوئی ہیں۔ کہ جن کے نشانات کا قیامت تک مُنہدم ہونا دشوار ہے +

(۶) مرزا صاحب کے قدرتی شاعر ہونے کے بہت سے ثبوت خود اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ سب سے اوّل یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کا رنگ اس قدر انوکھا ہے۔ کہ اُس کی نقل

دوسروں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ مرزا صاحب کی طرح سے پیدائشی شاعر ہیں۔ اُن کو تو قدرت نے الگ ہی ڈھنگ اور طرزِ کلام عطا کیا ہے۔ جو مرزا صاحب سے کیوں ملنے لگا۔ اور جو لوگ پیدائشی شاعر نہیں ہیں۔ اُن کے بوتے سے یہ بات بالکل باہر ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کی رنگت حاصل کرنے کے لئے شاعری کے میدان میں ایک قدم بھی چل سکیں۔ کیونکہ مرزا صاحب کی جودتِ طبع۔ عالی مضامین کی آمد۔ زبان کی شستگی و بیساختگی قدرت نے اُن کو خاص طور پر عطا کی ہے۔ کہ جو اکتسابِ علم و ہنر اور حصولِ فضل و کمال کے احاطہ سے باہر ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مرزا صاحب کے کلام میں مضامین کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے۔ کہ تلاش کرنے والا مضامین کو دیکھتے دیکھتے ششدر رہ جاتا ہے۔ مگر جس قدر زیادہ تجسس کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس کی محنت کا صلہ اُسے ملتا جاتا ہے۔ بعض اوقات مرزا صاحب کے چند پُر زور بندوں کو سُن کر سامعین کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اب سب مضامین (متعلق اس حال کے) ختم ہو چکے ہیں۔ اور آئندہ مرزا صاحب کسی دیگر سلسلہ خیال کو شروع کرینگے۔ مگر یہ یقین سامعین کا فوراً ہی حیرت اور تعجب سے بدل جاتا ہے۔ جب وہ آگے کے بندوں میں نئی نئی اور نرالی نازک خیالیاں مرزا صاحب کی سُنتے ہیں۔ اور بالآخر مجبور ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ مرزا صاحب کو قدرت نے خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ اور مرزا صاحب کے پیدا کردہ مضامین اسی طرح پر خاص ہیں +

تحریر معروضہ بالا سے ناظرین پر ہویدا ہو گا کہ مرزا صاحب کس پایہ کے شاعر تھے۔ اور اس امر کے تصفیہ کو کہ مرزا صاحب سے بڑھا ہوا کوئی اور شاعر اردو لٹریچر میں ہوا ہے۔ یا یہ کہ مرزا صاحب ہی ملک الشعرا اور خاتم الشعرا ہیں۔ مَیں علم دوست اور قدر شناس پبلک کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ میرا مسلک صلحِ کل ہے۔ اور مَیں نہیں چاہتا۔ کہ مرزا صاحب کو اُن کے ہم عصر کسی شاعر پر فضیلت دے کر اُس شاعر کے حامیوں اور طرفداروں کے دل کو رنجیدہ کروں۔ اور ضد کی وجہ سے وہ فیضِ عام مرزا صاحب سے مستفید نہ ہوں۔ اور اُن کے کلام کا مطالعہ نہ کریں۔ ہاں اس قدر مَیں کہے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ مرزا صاحب کے احسانات کا جو اردو بولنے والی پبلک اور نوخیز اور بقول شاعر "ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے" جلد مرجانے والی اردو لٹریچر پر اُنہوں نے کئے ہیں۔ مُقر نہ ہو کر احسانمند نہ ہونا محسن کُشی سے کم نہیں ہے +

آخر میں مَیں اہل علم کی طرف سے فاضل مؤلف "حیاتِ دبیر" کا کہ جنہوں نے برسوں محنت شاقہ کر کے ایک بزرگ اور محسن ہند کے حالات علم اور فضل کی دُنیا کی پبلک کو پیشکش کئے ہیں۔ اور نوجوانان ہند کو بزرگوں کی عظمت کرنے اور اُن کے احسانات کے ممنون ہونے کا سبق سکھلایا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اپنے مضمون کو فاضل مؤلف کے لئے اِس دُعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ اُن کو دُنیا اور عاقبت میں اس کا اجر نیک عطا کرے۔ آمین ثم آمین +

خادم القوم ہیرالال اوصولیہ (بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ جوڈیشل سکرٹری محکمہ محتشمہ خاص دربار کوٹہ دام اقبالہ)

تقریظ عالی جناب عالم علوم معقول ومنقول مولوی حکیم محمد مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ

علوم قدیمہ کے محققین نے پرانے کتبوں۔ عمارتوں کے کھنڈروں۔ زمین دوز شہروں اور کُہنہ پتھروں کی امداد سے علوم و فنون کے بیش بہا جواہر اکٹھے کئے ہیں۔ تحقیقات کا سلسلہ روز بروز معلومات کے ذخیرہ میں ایسا معتدبہ اضافہ کر رہا ہے۔ کہ خدا جانے آگے چل کر کیسی کیسی کار آمد چیزیں ہاتھ آنے والی ہیں۔ مگر انسانی تفتیش نے ریاضی کے مسلمہ مسائل کے سوا اب تک کہیں حق الیقین کا درجہ نہیں حاصل کیا۔ کیسے ہی احتجاج و براہین کے پشتوں سے مستحکم دعوے پیش کئے جائیں۔ مگر تردیدی احتمالات اور نقض و منع کے حملے اُنہیں شکست دینے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اب اگر

دلائل مثبتہ کی قوت مدافعت کی پوری طاقت رکھتی ہے۔ ردّ وانکار کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ اور جد وجہد کے قلعہ پر کامیابی کا جھنڈا نصب ہو جاتا ہے۔ بادِ مُراد ناخدا بن کر جہاز کو ساحلِ مقصود پر جا لگاتی ہے۔ تحسین وآفرین کے نعروں سے عالمِ تحقیق گونج اُٹھتا ہے۔ واہ وا اور سبحان اللہ کی صدائیں زبانوں سے نکل کر دماغ میں پہنچتی ہیں۔ اور قوائے ذہنیہ میں تحریک۔ خیالات میں جوش اور ارادوں میں ایسی برانگیختگی پیدا کرتی ہیں۔ کہ وہ قدم تحقیق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ تجسس نگاہیں اپنی خواہشات اُن کے استقبال کے لئے بھیجتی ہیں۔ اور متلاشی دل آغوش شوق جدید معلومات کے لئے کشادہ اور ادراک وفہم پروانہ کے بازو کھول کر نئے علمی سرمایہ کی تحصیل شروع کرتے ہیں۔ فکر وخیال رسائی کے ذریعہ ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کامیابی ورجحان عام کے ہم نہیں دیکھتے۔ کہ دُنیا میں کوئی مسئلہ بے چون وچرا تسلیم کر لیا گیا۔ اور تمام عالم نے سرِ قبول جھکا لیا۔ ایسی حالت میں اگر اہلِ جرمن علوم وفنون کا موجد یونانیوں کو بتائیں۔ یا بعض انگلستانی محقق یہ سہرا ہندوستان کے سر باندھیں۔ یا علامہ زیلفن۔ شارلو۔ اور مورخ گبن وغیرہ کے نتیجہ تحقیقات سے ایشیائے کوچک کے باشندے ثابت ہوں۔ ہم کسی کے سر پر تاج ایجاد وابداع نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ سب اپنے اپنے دلائل وپیرایۂ استدلال میں اُنہیں پُرانے اعمال ناموں کی شہادت پر وثوق رکھتے ہیں۔

ممکن ہے۔ کہ عربی مورخین اور اہلِ سیر سے پہلے کی تصنیفات علم تاریخ وسیر میں موجود ہوں مگر بائبل کے سوا کوئی ایسا قدیم مجموعہ عالم میں موجود نہیں ہے۔ جس کے واقعات کی ترتیب وتدوین خود اس کی صداقت کی معیار ہو۔ پرانی رامائن اور گنہ مہابھارت وغیرہ جن کو مذہبی تقدس کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ اُن کے شاعرانہ مبالغے واقعات کو امکان عادی بلکہ امکان عقلی سے بھی اتنی دور پھینک رہے ہیں۔ جن کے واسطے غلو سے بھی زیادہ بلیغ لفظ وضع ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ عقیدتمند دل اپنے چشم دید حالات کی نسبت غلطی عبارت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ مگر اُن محالات کے وقوع میں اُمناوصدقنا سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔

بہرحال کل خرب بما لدیہم فرحون کے موافق ہر شخص کا اعتقادی قبلہ اُس کا ذاتی میلان ہوا کرتا ہے۔ لیکن مسٹر اسپرنگر مسٹر کارن ہل جیسے معزز محققوں کی شہادت اور بیشمار تصانیف کے انبار اور اُن تصنیفات میں بے انتہا ایسی کتابیں اور مصنّفوں کی فہرستوں کی زبردست گواہی (گو اب کتب خانوں میں اُن کا وجود بھی نہیں ہے) اس بات کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ کہ مسلمان مؤرخوں اور سوانح عمریوں کے مصنّفوں نے ان فنون لطیفہ کو کس تاریکی اور ظلمت سے نکال کر کس روشنی اور نورانیت تک پہنچایا۔ حضیض دروغ و ناراستی سے اوج صداقت پر چڑھایا۔ قعر ذلت و گم نامی سے تخت بلند نامی پر لا بٹھایا۔ گویا ایک مردہ لاش میں رُوح پھونک کر اعجاز مسیحائی دکھلایا۔ دربار تحقیق میں راست بیانی کے برقی لیمپ روشن کردئے۔ تمام حُسن و قبح۔ عیب و صواب۔ خوبیاں اور بُرائیاں دیکھنے والوں کو صاف نظر آرہی ہیں۔ صداقت کی اکسریز شعاعیں اندرونی حقیقت کو باہر ہی سے دکھلا رہی ہیں۔ اگر ایک مؤرخ کسی کی طرفداری میں سرشار ہوکر یا غلطی و ناواقفیت سے مسلسل واقعات لکھتے لکھتے غلط نتیجہ کی ٹیڑھی پگڈنڈی پر چل دیا ہے۔ تو ناظرین خود تسلسل حالات سے شاہ راہ حقیقت پر ہو لیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی دشمنی اور کسی قسم کی عداوت۔ کوئی مطلب اور کوئی نفرت اُنہیں کسی واقعہ کے نقل کرنے سے نہیں روکتی تھی۔ علم الرجال اور ترتیب اسناد کا کارآمد ایجاد صرف اُنہیں کو مدد نہیں دیتا تھا۔ بلکہ وہ آج بھی بارہ تیرہ صدی کے بعد اُسی طرح ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ اور ہم جب چاہیں۔ اور جس خبر کو چاہیں۔ مختلف بیانات میں سے چھانٹ کر صحیح و سقیم۔ درست و نادرست بتلا سکتے ہیں۔ آج کون شخص ہمارے مقابلہ میں یہ بتلا سکتا ہے۔ کہ فلاں واقعہ کا ماخذ کہاں ہے۔ اور اُس کے اخباری وسائط کی کیا شان ہے۔ سلسلہ اسناد میں سچا جھوٹا۔ قوی الحفظ اور ضعیف الحافظہ۔ معتبر و نامعتبر شخص ہے یا نہیں +

ابتدا میں فلسفہ تاریخ و سیر کی زبانی تعلیم ضمناً ہوا کرتی تھی۔ اور ذہنوں میں اُس کا ذخیرہ مجتمع رہا کرتا تھا۔ حسب ضرورت کام میں لاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس کی علمی بنیاد پڑ گئی۔ ابومسعود و سلیمان اعمش وغیرہ نے مختصر یادداشتیں لکھ کر تلامذہ کو دینی شروع کیں۔ جس قدر بُعد زمانی بڑھتا جاتا تھا۔

اس فن کی ضرورت بڑھتی جاتی تھی +

اس فلسفہ کی بنیاد قائم کر کے مسلمہ اور مثبت اصول کے وزن اور پیمانوں سے اس طرح موزوں کیا۔ کہ جب اُن قاعدوں کی میزان میں رکھ کر کسی واقعہ کو تولتے ہیں۔ کمی بیشی کا تفاوت جزو لایتجزے کی مقدار تک معلوم ہو جاتا ہے۔ آج لندن اور برلن کے کتب خانے جن تاریخوں کی بدولت درج جواہر و گنجینہ الماس پر ترجیح رکھتے ہیں۔ وہ عربی دماغوں کے پریس کے چھپے ہوئے ہیں۔ لائف وہسٹری کے ذخیرے جن پر یورپ کو ناز ہے وہ سب انہیں بادیہ گرد عربوں کا صدقہ ہے۔ بغداد و اندلس کے دار العلوم اور ان کے متعلقہ مکتبوں کے چشموں سے یورپ کے جن ہونہار طلبہ نے جدا جدا کیفیت اور الگ الگ مزہ کے گھونٹ پئے تھے۔ وہ اُن کے پیٹوں میں جا کر عجیب کار آمد تخم بن گئے۔ اور جب اُن کو اپنے ملک کے دل و دماغ کی زمینیں درست کر کے اعلےٰ پیمانہ پر کاشت کیا۔ تو وہ عجیب و غریب نظر فریب پھل لانے لگے۔ اب وہی عربی تخم یوروپین زمینوں میں ایسا پھلا پھولا۔ کہ اُس کی دلربا سرسبزی نے موجدوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ بیچارے ابن خلدون سے کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ تُو نے کس محنت و دلسوزی سے ان اصول کی تدوین کی تھی۔ اور کب کی تھی؟ جس زمانہ میں نہ کوئی شاہی کمیشن مقرر کئے جاتے تھے۔ نہ قوموں کے دست سخاوکرم جانگذاری و عرق ریزی کی کفالت کرتے تھے۔ نہ خود تدوین کرنے والے کو جانچ پڑتال کے ذریعے میسر تھے۔ نہ جہازوں اور ریلوں کے سیلوں اور فرسٹ کلاس گاڑیاں۔ اور نہ اسٹیشنوں کے ریفریشمنٹ روم سفر کو حضر سے بڑھ کر راحت کدہ بنانے والے تھے۔ نہ ترتیب واقعات اور تحقیق حالات کے لئے ڈاک خانے اور تار گھر صحیح اور جلد تر خبروں کے بہم پہنچانے کا وسیلہ تھے۔ سفر اہل ہمت کے نزدیک کتاہی وسیلہ ظفر سمجھا جاتا تھا۔ مگر مسافروں کے لئے نمونہ سقر ضرور تھا۔ بڑے بڑے محقق بھڑک پیاس کے صدموں سے کوہ و دشت میں مرکر رہ جاتے تھے۔ اور ہزاروں گوہر تحقیق کے ڈھونڈنے والے انسانی اور وحشی درندوں کا لقمہ ہو جاتے تھے۔ مگر تنہا شخص وہ حوصلے اور ہمت کر بیٹھتا تھا۔ جو آج منفرد اور متحدہ پارٹیوں سے اس آسائش اور راحت کے زمانہ میں نہیں ہو سکتے۔ ادنے ادنے واقعہ کی تحقیق میں اور ایک ایک مبحث کی تلاش میں دنیا

کے اِس سرے سے اُس سرے تک۔ بغداد سے چل کر اندلس اور مشرق سے مغرب تک کی خاک چھان ڈالتے تھے۔ تب کہیں تصنیف و تالیف پر قلم اُٹھاتے تھے +

زہری جیسے مشہور محدث کو مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات کی نسبت معلوم ہُوا۔ کہ حرث بن فہر سے چند ایسے الفاظ آخر حدیث میں روایت کئے گئے ہیں۔ جو اُن کی سند دن میں کسی میں نہ تھے۔ حرث بن فہر زندہ تھے۔ مگر بے پتہ تھے۔ انہیں خلجان پیدا ہُوا۔ اور آسائش و آرام پر خاک ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہُوئے۔ جویندہ یا بندہ۔ تین سال کی سرگردانی کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آیا +

ابن عیینہ کو ایک حدیث کی سند میں سہو کا گمان ہوگیا۔ درس و تدریس بند کر کے ایک مدت تک کاغذات کی جانچ پرتال میں مصروف رہے۔ عہد کر لیا۔ جب تک سند کی تصحیح اور اپنے حفظ کی تصدیق نہ ہو جائیگی۔ ہرگز حدیث بیان نہ کرونگا۔ انہیں خوف یہ تھا۔ کہ اگر سہو کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ بیان کرتے وقت کوئی لفظ غلط نکل جائے۔ پانچ سال تک پریشان پھرتے رہے۔ دو بار حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اسی لئے حاضر ہُوئے۔ جس قریہ اور قصبہ میں گذر ہوتا تھا۔ جس درس میں شریک ہوتے تھے۔ گوہر مدعا ڈھونڈتے تھے۔ لوگ ان کی آمد سُن کر بڑے شوق و عقیدت سے حدیث سُننے کے لئے آتے تھے۔ مگر یہ اپنی دردناک حالت پر خود بھی روتے اور دُوسروں کو بھی رُلاتے تھے۔ پانچویں سال حبیب بن عتبہ ان کے گھر مہمان ہُوئے اثنائے طعام میں اُنہوں نے ایک حدیث آداب طعام میں اُسی سند سے بیان کی۔ جس میں ابن عینیہ مشتبہ تھے۔ انہیں جو سند یاد تھی۔ اُسی کی تائید مہمان کی زبان سے ہُوئی۔ یہ سُنتے ہی اُچھل پڑے۔ اور گھنٹوں روتے رہے۔ جب گریہ و زاری سے افاقہ ہُوا۔ تو مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر وسیع پیمانہ پر تمام علما و محدثین شہر کی دعوت میں سب اثاث البیت بیچ کر لگا دیا۔ اُسی دن سے پھر دریائے افاضہ و استفاضہ زور شور سے بہنے لگا +

علامہ ابواسحٰق نیشاپوری مصنف سیرۃ الغزالی نے چونتیس سال کی جانکاہی کے بعد

اپنی بیش بہا تصنیف پبلک میں پیش کی۔ تو دیباچۂ کتاب سُنتے ہی اُن کی عالی ہمّتی اور تحقیق و تفتیش کی جانکاہیوں کا دلوں پر سکّہ بیٹھ گیا۔ یہ اولوالعزم سوانح نگار تمام اُن شہروں۔ قریوں۔ وادیوں اور صحراؤں میں خود سفر کرکے پہنچتا تھا۔ جہاں جہاں امام غزالی کے پہنچنے کی خبر سُنتا تھا۔ اگرچہ امام غزالی کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ مگر وہ جہاں اپنے علوم کی روشنی پھیلا آئے تھے۔ ابھی اُن تجلیوں میں کمی نہ آئی تھی۔ اس لئے مصنّف ممدوح کو نہایت عجیب و غریب اور سچّے حالات مسلسل واقعات ملتے چلے گئے۔ اس لئے یہ کتاب امام غزالی کے حالات کا ایک روزنامچہ بن گئی +

یہ دو تین قصّے بطور نمونہ اس اندازہ کے لئے لکھ دئے ہیں۔ کہ ذرا ذرا سی بات کی تحقیق میں کیسی سخت جسمانی محنتیں برداشت کی جاتی تھیں۔ اب اس تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھئے۔ کہ جب روایت ان استحکامات سے مکمّل پائی جاتی تھی۔ تب ہر واقعہ اور بیان کو درایت و فہم کی کسوٹی پر کستے تھے۔ منطقی میزان میں تولتے تھے۔ فلسفہ کے پیمانوں اور ذہن و ادراک کے قدموں سے ناپتے تھے۔ اسباب علل کی جستجو کرتے تھے۔ حالات گرد و پیش سے تطبیق دیتے تھے۔ رسوم و اوضاع و قواعد تمدن زمانی و مقتضیات احوال سے توفیق کرتے تھے آپ کی تصنیف اس قدر تراش خراش۔ ایسی دیکھ بھال اور صحت و سقم کی پرتال کے بعد جو مجموعہ شائع کیا جاتا تھا۔ اگرچہ حقائق و واقعات کا لب لباب۔ رائے صائب اور اصابت خیال کا نتیجہ ہوتا تھا۔ لیکن اس پر بھی دیکھنے والوں کو مذہبی طرفداری یا رسوخ عقیدتمندی یا نفسانی تنفر کا شبہ ہو جاتا۔ تو مقررہ قواعد کو پیش نظر رکھ کر خود اصلاح کر سکتے تھے۔ مگر سبحان اللہ کیا روشن دماغ کیسی منصف طبیعتیں پائی تھیں۔ کس قدر دل صاف تھے۔ کتنے بلند خیال تھے۔ کہ تعصّب کے الزام سے بری رہنے کے لئے کسی ماتو اور کسی کیفیت کو چھپاتے نہ تھے۔ خواہ اُس کی تردید میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیتے۔ مگر مداہنت کو ادائے فرض میں سنگ راہ تصور کرتے تھے +

اس انصاف پسندی کو دیکھئے۔ کہ میں نے آج تک عربی زبان میں چھوٹی بڑی سب ملا کر بارہ[۱۲] سوانح عمریاں جناب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اور دس بارہ کتابوں کے

نام ان موجودہ کتابوں میں اور نظر آئے۔ ان دیکھی ہوئی کتابوں میں سے آٹھ شافعیوں کی اور چار حنفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ شافعی مصنّفوں نے امام ابوحنیفہ کے زہد و تقدس۔ علم و فضل اور اُن کی اصلی صفت قوت اجتہاد و استنباط مسائل کی تشریح میں جس تقدم و کمال کو ثابت کیا ہے۔ حنفی مصنّفوں کی کتابوں میں وہ بات نہیں +

صاف ظاہر ہے۔ کہ تکمیل کا مرتبہ بغیر محنت و جانفشانی اور بلا استعداد زمانی کے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ وہی پھل جو درخت پر آفتاب کی شعاعوں سے تدریجی حرارت حاصل کر کے اور ہوا کے صدموں۔ پانی اور برف کے طمانچوں کو برداشت کر کے دو ہفتہ میں پختہ ہوتے ہیں۔ وہی توڑ کر جب پال میں دبا دئے جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ نہیں گذرنے پاتا۔ کہ نرم اور پلپلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا لطافت و نفاست میں۔ کیا مزہ اور خوشبو میں۔ کیا صورت اور رنگت میں کیا تازگی اور نظر فریبی میں دونوں برابر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ سال۔ ساگوان۔ آبنوس وغیرہ جن کی لکڑیاں صدیوں کام دیتی ہیں۔ برسوں میں جا کر اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ اُن کی لکڑی کام میں لائی جائے۔ اس لئے قدرت کا عام اصول یہی نظر آتا ہے "دیر آید درست آید و ہرچہ زود آید دیر نپاید" +

ایک بڑے قابل مصنّف پر لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ برسوں انتظار میں مبتلا رکھ کر تم ایک کتاب مرتب کرتے ہو۔ اور بیسیوں بار اُس پر نظر ثانی کرتے رہتے ہو۔ تب کہیں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ مَیں ایسی تصویر بناتا ہوں۔ جو ہمیشہ قائم رہے +

جلدی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ لفظوں کی رنگینی اور عبارت کی ظاہری خوبیوں کے سبب کچھ دنوں تصنیف کی قدر و منزلت ہو جاتی ہے۔ مگر جب گہری نظریں تنقیدی نگاہیں عمارت کی اندرونی خرابیوں تک پہنچتی ہیں۔ تو پلاسٹر کے نیچے کی تمام بدنمایاں عیب و صواب کھل جاتے ہیں۔ وہ بہار وہ رنگ روپ وہ چمک دمک سب کافور ہو جاتی ہے۔ وہ طلسمی لیپ چشم زدن میں گل ہو جاتے ہیں۔ وہ دھوکے کے پھول نکتہ چینی کے پہلے ہی تھپیڑے سے ہمیشہ کے لئے کمہلا کر رہ جاتے ہیں۔ پھر التفات کی نظریں تمنّا بھری نگاہیں اُنہیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔ کھوٹے مال کو دیکھ کر مشتاق دل

اور خریدار طبیعتیں بھر جاتی ہیں۔ اور تصنیف کے خوشنما پودے کو کس مپرسی کا پالہ مار جاتا ہے ٭

بالکل یہی حال ہمارے مخدوم و حبیب الاحترام شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مد ظلہ کی عجیب و غریب تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" کا ہے۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر شوق دیدار اور ولولہ خریداری پیدا ہوا۔ اوّل تو مثل مشہور "بڑے گھر کی بڑی بات"۔ آپ کی عربی و فارسی کی ادبی قابلیت۔ اسلوب بیان کی دلکشی۔ اُردو کی نامور تصنیفات جنہوں نے اُردو لائف سے پوری لائبریری کو مستغنی کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی تھیں۔ کہ عجب جامع اور لاجواب کتاب ہوگی۔ دوسری مسرت یہ تھی۔ کہ موازنہ میں جناب انیس و حضرت دبیر دونوں کے حالات صحیح ایک محقق کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہونگے۔ حضرت انیس کی بعض ادھوری سوانح عمریاں دیکھنے کا تو اتفاق بھی ہوا ہے۔ لیکن اردو کی کس قدر بدنصیبی ہے۔ کہ آج تک اپنے اس محسن و مربی کی سوانح عمری سے اُس کا دامن خالی ہے۔ گو مرزائے مرحوم کا فضل و کمال کسی روشناسی کا محتاج نہیں ہے۔ ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را

مگر کیا اُس جم غفیر کے لئے باعث ننگ و عار نہیں۔ جو آپ کی اصلاح سے مستفید ہو کر مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کیا اُن شعرائے نامور کو شرم نہیں آتی۔ جو شاعری کے ساتھ ناثر بے بدل ہیں۔ کہ نظیر اکبرآبادی کی بینظیر سوانح عمری حضرت شہباز کے ہاتھ سے شائع ہو جائے۔ ذوق و غالب و داغ وغیرہ اساتذہ کے کارنامے تازہ رکھنے کے لئے حضرت حالی و آزاد و احسن اپنے فرائض اخلاقی سے سبکدوشی حاصل کر چکیں۔ مگر مرزا دبیر جیسے کثیر التلامذہ اور عام فیض کے حالات مرتب ہونے کے لئے ایک ایک کا منہ تکیں۔ اس لئے جب معلوم ہوا۔ کہ علامہ شبلی نے لکھنؤ کے قیام کا شکریہ اس صورت میں ادا فرمایا ہے۔ خواہ مخواہ دل میں اُن کی شکرگذاری کا احساس ہوا۔ مگر آہ اُس ملال و افسوس کا اظہار کسی طرح ممکن نہیں۔ جو سرسری طور پر موازنہ کو پڑھ کر ہوا۔ اور جس قدر زیادہ غور کیا جاتا تھا رنج و ملال کا تھرمامیٹر ڈگریوں چڑھتا چلا جاتا تھا۔ اُمید یہ تھی۔ کہ علامہ شبلی کی تصنیف منصفانہ طور پر اُس جھگڑے کا قطعی فیصلہ کر دیگی۔ جو حضرت انیس و دبیر کے عقیدت مندوں میں عرصہ تک جاری رہا ہے۔

اُن کی جادو بیانی - اُن کی وسعت معلومات سے تاریخی - ادبی - معنوی - بیانی فوائد پہنچیں گے - مگر بجائے اُس کے معلوم ہُوا - کہ ہم جس قدر آگے بڑھ رہے ہیں - تاریکی و ظلمت بڑھتی جاتی ہے - جو کچھ اب تک پڑھا لکھا تھا سب غارت ہو کر لاعلمی اور حیرت کے پردہ معلومات پر پڑتے چلے جاتے ہیں - مختصر یہ ہے - کہ آپ نے جس بیدردی سے دبیر مرحوم کی خوبیوں پہ خاک ڈالنے کی عجیب و غریب سعی فرمائی ہے - ہم آپ کے ساتھ حسن عقیدت رکھتے ہوئے یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں - کہ عجلت اور بلد ہی میں آپ حضرت دبیر کے کمالات کا اندازہ نہیں فرما سکے - حُسن کو عیب اور خوبیوں کو بُرائیاں سمجھ گئے - آپ اپنی تصنیف کو پبلک سے انٹروڈوس کرانے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے - تو غالبًا خود آپ کی مشہور قابلیت اور بلند نظری ضرور تمام کتاب پر خط نسخ کھینچ دینے پر مجبور کر دیتی - کیونکہ جس کتاب کی بنا ہی غلطی پر ہے - اُس کے مسائل بناء الفاسد علے الفاسد کے مصداق ہیں - باوجود اس تمام قلق و افسوس کے ایک بڑی خوشی یہ ہے - کہ موازنہ کی تصنیف سے عالم تصنیف و تالیف میں ایک شورش برپا ہو گئی - طبیعتوں میں خلش اور خلش کے ساتھ تحریک بڑھنے لگی - سچ ہے - بعض المفاسد یورث المقاصد - مُلک میں ایک عام ضرورت محسوس ہونے لگی - کہ حضرت دبیر کے صحیح حالات اور ہر قسم کے کلام کا نمونہ پبلک میں پیش کر کے پید دکھلایا جائے - کہ جامع کمالات ہونے کے لحاظ سے یہ بینظیر شاعر کیا پایہ رکھتا ہے +

مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین شائع ہُوئے - موازنہ کے اوندھے سیدھے جواب بھی دیکھنے کا اتفاق ہُوا - مگر مَیں نے جس قدر دیکھے - وہ متانت و تہذیب سے ایسے گرے ہُوئے ہیں - کہ اُن کے وجود سے عدم اچّھا تھا +

مگر ماشاء بے نظیر خوش بیان و خوش گو جناب مولوی سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی ایک مدت مدید سے نہایت ثبات و استقلال کے ساتھ حالات شعرائے مرثیہ گو کی ترتیب میں مصروف تھے - حیات دبیر کا ذخیرہ بہت کچھ فراہم تھا - جس قدر اُس کی اشاعت میں دیر ہوتی تھی - شائقین کی تمناؤں کا خون ہوتا تھا - مگر آپ کے محققانہ ارادے کامل جانچ پڑتال کے

بغیر اُسے روشناس ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ کا یہ خیال تھا۔ اور بالکل درست تھا کہ انسان کوئی کام کیسی ہی نیک نیتی اور کتنی ہی کوشش کے ساتھ انجام دے۔ اُس میں اوّل تو نقص رہتا ہی ہے۔ مگر نہ ہونے پر بھی ملامت کرنے والے اُسے خلعت قبول نہیں پہناتے۔ لیکن انسان کو اپنی ممکن طاقت۔ واقعات کی تصدیق۔ حالات کی صحت۔ انتخاب کی وسعت اور ہر بحث کے متعلق رائے کی اصابت و استحکام کی تقویت میں ضرور مبذول کرنی چاہیئے۔ اور یہ باتیں مدت تک سلسلہ تفتیش کو جاری رکھنے کے بغیر نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے خدا جانے کب اور کیونکر حیات دبیر کی رُونمائی ہوتی۔ یہ صرف موازنہ کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔ کہ حضرت ثابت نے فراہم شدہ سرمایہ شبانہ روزی کوششوں اور بیحد جانفشانیوں سے اپنے خیال میں جلد سے جلد مرتب فرما کر چھپنے کو بھیج دیا۔ دلی جوش نے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں مکمل کرا دیا۔

حضرت ثابت بلند خیال۔ وسیع المعلومات۔ عربی و فارسی کے با استعداد صاحب علم ہیں۔ مذہبی پختگی کے باوجود صلح پسند اور عجب مرنجان مرنج بزرگ ہیں۔ اخلاق و انسانیت کا مجسمہ کہا جائے۔ تو زیبا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معارضانہ بحثوں سے احتراز کرنے والے اور دونوں جگہ کے کاملوں کی یکساں عظمت کرنے والے ہیں۔ شعر گوئی میں ان کا درجہ موجودہ زمانہ کے نامور اُستادوں میں ہونا چاہیئے۔ تمام عمر غزل کہتے رہے۔ اب کچھ احتراز سا ہے۔ کلام عیوب سے پاک۔ اُصول شاعرانہ کی بندشوں میں جکڑا ہوا بہت مضمون خیز ہوتا ہے۔ طبیعت میں ایجاد دلچسپ و اختراع دلکش بھی ہے۔ افسوس ملازمت کی پابندی کے سبب عمر کا بہترین حصہ ایسی جگہ گذارنا پڑا۔ جہاں کمال و اہل کمال کے قدر کرنے والے نہیں۔ لکھنؤ یا دہلی میں اگر فارغ البالی میں زندگی بسر کرنیکا موقع ملتا۔ تو آج اُستادی کا ہندوستان میں ڈنکہ بجا دیتے۔

کچھ تو آپ کے مذکورہ اوصاف سے اور کچھ آپ کی جانکاہیوں سے آپ کی تصنیف کا تمام خوبیوں کو جامع ہونا لازم قرار پاتا ہے۔ اس لئے حیات دبیر کو بغور دیکھنے کے بعد

میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اُسے مجمل طور پر بیان کرتا ہوں +

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ دبیر کے سچے شیدا کے قلم سے نکلی ہے۔ جو مرحوم کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر ادب و تہذیب یا سخن فہمی و تحقیق نے مرزا صاحب کے مقابل میر انیس کی حق تلفی نہیں کرنے دی۔ اور جس عقیدت یا انصاف کے ساتھ مرزا صاحب کے معترضین کو تحقیقی جواب دئے ہیں۔ حضرت انیس کو بھی اعتراضات سے بچانے کی ویسی ہی کوشش کی ہے +

زُبَانْ

کسی کی تعریف میں صرف یہ کہدینا کافی نہیں۔ کہ وہ اہل زبان ہے۔ کیونکہ تمام اہل زبان مضمون کے ادا کرنے پر یکساں قادر نہیں ہوتے۔ بلکہ اُنہیں میں سے بعض کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح مافی الضمیر کو سامع کے ذہن نشین کر ہی نہیں سکتے۔ بعض ایسے ثقیل اور فصاحت سے گرے ہوئے لفظوں کی بھرمار کرتے ہیں۔ کہ معمولی پڑھے لکھے آدمی اُن کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب میں جس زبان سے کام لیا گیا ہے۔ وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نہایت صاف روزمرّہ ہے۔ الفاظ اپنے معانی مطلوبہ کو نہایت وضاحت سے ادا کر رہے ہیں۔ ثقیل الفاظ۔ متنافر کلمات۔ متروکہ محاورات۔ وحشی و اجنبی کلمات۔ بازاری روزمرّہ سے پاک ہے۔ جن معانی کے ادا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ لفظوں نے دوش بدوش مساعدت کی ہے۔ سلاست عنان بعنان دوڑتی ہے۔ صفائی قدم بقدم چلتی ہے۔ چستی شانہ سے شانہ ملائے ہوئے ہے۔ عبارتوں کا ارتباط سلک مروارید بنا رہا ہے۔ بیکار اور بھرتی کی تفسیری عبارتیں نہیں۔ تطویل لاطائل و اختصار مخل سے گریز ہے۔ فقرہ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بڑے بڑے جملے نہیں ہیں۔ کہ کوسوں پر جا کر خبر نکلے۔ اور ذہن پراگندہ ہو کر جملے ٹکڑوں کو کھو بیٹھے۔ موقع بموقع لطائف۔ ظرائف دلچسپی کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں +

اسلوب بیان

بیان کا طرز بہت دلکش ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں۔ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ جہاں کسی بات پر زور دینا مدنظر ہے۔ اُس کے لئے ویسے ہی زوردار الفاظ اس ترتیب سے جمائے ہیں۔ کہ محض

اسلوب بیان ہزار شہادتوں کی قائم مقامی کر رہا ہے۔ جس مسئلہ کے اثبات کی ضرورت تھی۔ اُسے دلائل محکمہ سے ثابت کرنے میں کمی نہیں کی۔ اور اس سلسلہ اور ترتیب سے لائے ہیں۔ کہ قیاسات برہانی کا بدیہی نتیجہ اثبات مدعا ہو جاتا ہے +

جس واقعہ سے متاثر کرنا مدنظر ہے۔ اُس کے لئے سوز و گداز سے بھرے ہوئے لفظ دل کو نرم کرنے کا پورا کام دے رہے ہیں۔ جس بات کی تردید کرنی چاہی ہے۔ اُس کے اُکھاڑنے میں جس قدر پہلو نکل سکتے تھے۔ سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور ادائے مضمون کا سلیقہ موقع اور محل کی شناخت کا ملکہ مصنّف کو ایسا آتا ہے۔ کہ جہاں بالضرور رُکاوٹ ہونی چاہئے۔ کتاب کا دیکھنے والا سحر کلام سے مسحور ہو کر بے روک ٹوک سرپٹ گذر جائیگا +

ترتیب مضامین

چھاپہ خانوں کی کثرت اور اُن میں بیکاری کا مشغلہ یہ رہتا ہے۔ کہ کسی معمولی استعداد کے آدمی کو دس پانچ روپیہ دے کر کوئی ناول یا سوانح عمری لکھوالی۔ اور چھاپ کر بیچنے بیٹھ گئے۔ وہ طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ کہ پیسے پیسے خلفا و سلاطین اور اولیا و صلحا کی سوانح عمریاں بکتی پھرتی ہیں۔ اُنہیں دیکھنے کے بعد دماغ میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ انہیں کے مقابلہ میں حیات جاوید۔ حیات سعدی۔ سیرۃ النعمان۔ البرامکہ۔ حیات غالب وغیرہ بے شمار ایسی باوقعت تصنیفیں موجود ہیں۔ جو اپنی انشاپردازی۔ ترتیب مضامین و تحقیق واقعات میں اس فن کے اعلےٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں +

اگرچہ مصنف حیات دبیر نے اپنی تصنیف کو سلسلہ مضامین میں کسی کا تابع نہیں رکھا۔ اور جہاں جس مضمون کا ارتباط و ضرورت دیکھی۔ ایک کے بعد دوسرا مضمون شروع کر دیا۔ مثلاً مرزا صاحب کے اخلاق حمیدہ و عادات پسندیدہ کا بیان۔ ولادت۔ حلیہ۔ استعداد وغیرہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سے ہیڈنگ لکھ کر بظاہر طول دیا ہے۔ بہت سی باتیں جداگانہ عنوانوں کی محتاج نہ تھیں۔ شاید نئی روشن کے شیدا اسے پسند نہ کریں۔ لیکن بغور دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقامی تسلسل اسی کا مقتضی اور مقتضائے حال بھی تھا۔ واقعات کی کثرت اور ہر واقعہ کی نوعی خصوصیت نزاکت پسندی میں جداگانہ سُرخی چاہتی تھی۔ اور یہ جدت ایک خوشنما اختراع ہے +

بعض مطالب اور حالات مکرر بیان میں آئے ہیں۔ دیباچہ میں اس کا سبب خود یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ ناظرین دُور پہنچ کر گذشتہ بیانات کو شاید بھُول گئے ہوں۔ یہ سبب کچھ دلچسپ نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بعض حالات و مقاصد کی کیا خصوصیت ہے۔ اور عموماً ایسا کیا جائے۔ تو کتاب حشو و زوائد کا مخزن ہو جائے +

مرزا صاحب کے ابتدائی عمر کے حالات کی پرداز اس شان سے اُٹھائی ہے۔ کہ دیکھنے والے کو اُن کے ہونہار ہونیکا خود بخود یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پہلے ہی سے اُن کی آئندہ ترقیوں پر پیشین گوئی کرنے کا سامان ہو جاتا ہے +

یہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ کہ حالات کو مرتب ظاہر کرنے کے لئے قیاسات اور سطحی رایوں سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہی لکھا۔ جو معتبر ذریعہ سے معلوم ہؤا۔ جو بات ٹھیک طور پر معلوم نہ تھی۔ اُس پر قلم نہیں اُٹھایا۔ مرزا صاحب کے کلام کی تدریجی ترقی اور زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کی مثالیں۔ اُس زمانہ کی سوسائٹی کا پُورا نقشہ خوب کھینچا ہے +

مرزا صاحب کے شاگردوں کا اگر مجمل ذکر ہوتا۔ تو معمولی بات تھی۔ اور عربی و اردو کی بہت سی سوانح عمریوں میں ایسا کیا گیا ہے۔ حقیقت میں ایک فاضل کے کمال کا یہ بھی بیّن ثبوت ہے۔ کہ اُس کے تلامذہ میں بڑے بلند پایہ اور نامور لوگ دکھلائے جائیں۔ مگر مصنف حیات دبیر نے اسے ایک مستقل مضمون قرار دے کر شاگردوں کے حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ یہ حصہ مرزا صاحب کی لائف سے غیر متعلق سا اور مصنف کے ایک خاص خیال کی کچھ تکمیل ہے۔ کہ وہ شعرائے مرثیہ گو کا مستقل تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ ملک کو احسان ماننا چاہئے۔ کہ مرزا صاحب کی بدولت ان با دقعت شعرا کے حالات مفت میں معلوم ہو گئے +

حیات دبیر کا موضوع اگرچہ ایک محترم زندگی کے حالات ہیں۔ مگر جہاں اپنے ہیرو کے کلام کے محاسن و فضائل کا ذکر کیا ہے۔ وہاں علم معانی و بیان کے مسائل کی تشریح اور فصاحت و بلاغت کے نکات کا حل اس خوبی سے کیا ہے۔ کہ ان فنون ادبیہ پر کوئی ایسی جامع اور معمولی استعداد والوں کو آسانی سے فائدہ پہنچانے والی کتاب اُردو زبان میں موجود نہیں۔ غوامض علوم کو ایسے سہل پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ کہ اُسے پڑھ کر ایک بے استعداد آدمی اچھی لیاقت پیدا کر سکتا ہے +

صنعتوں کے بیان میں بڑا کمال ظاہر کیا ہے۔ لفظی اور معنوی صنائع کو دو جداگانہ فصلوں کے تحت میں ہر صنعت کا جداگانہ عنوان قرار دیا ہے۔ اُن کی تعریفیں بہت جامع و مانع اور سہل ترین الفاظ میں لکھی ہیں۔ اور بہتر سے بہتر مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے چھانٹ کر درج کی ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے۔ اوّل اُسی صنعت میں قرآنی آیت پیش کر کے یہ دکھلایا ہے۔ کہ آج جو کم فہم مسلمان صنائع اور بدائع کو فصاحت اور حسن کلام میں مخل بتاتے ہیں۔ وہ فصاحت کے معنی نہیں جانتے۔ وہ انگریزی کی تقلید میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں۔ کہ انہیں انگریزی بے رنگ تصویر نازک اور خوشنما نقش و نگار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی کیاری سے جس میں کہیں کہیں گلاب۔ موتیا وغیرہ کے پھول بھی زیبائش بڑھا رہے ہیں۔ وہ میدان اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں برساتی پانی کے اثر سے مختلف وضع اور الگ الگ قد و قامت کے پوٹے پھوٹ نکلے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ بالذات کلام کے حسن و قبح سے انہیں بحث نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ جانتے ہیں۔ کہ جو ترکیب شکسپیر۔ گولڈ اسمتھ۔ بائرن۔ ہومر۔ ڈینٹی نے نہیں برتی۔ وہ نامقبول اور ٹکسال باہر ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا۔ کہ اتفاقاً لف و نشر۔ تجنیس اور ایہام وغیرہ کسی انگریزی کے شاعر کے کلام میں مل گئے۔ تو یہ خانہ خراب بے تمیز تعریفوں کے طومار باندھ دیتے ہیں +

مصنف حیات دبیر نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بھی بتلایا ہے۔ کہ یہ صنعتیں کس جگہ کلام میں تاثیر۔ دلکشی۔ قوت۔ خوبی اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ اور کہاں اور کس طرح سخن کو اس کے پایہ سے گرا کر بے اثر

اور بدنما کر دیتی ہیں۔ اس موقع پر یہ افسوس کرنا پڑتا ہے۔ کہ جن صنعتوں کو معرض بیان سے نکال دیا گیا ہے۔ اُن کی مثالیں بھی مرزا صاحب کے کلام میں بافراط موجود ہیں۔ اگر تھوڑی سی تکلیف اور کی جاتی۔ تو اُمتنا حصہ ایک مستقل تصنیف علم بدیع کی ہو جاتا +

حیات دبیر ایک انسانی کارگذاری ہے۔ اس لئے بعض ایسی باتیں بھی اُس میں ضرور ہیں جن پر تنقیدی نگاہ اپنا عمل جاری کر سکتی ہے۔ مثلاً الفاظ کی تین قسمیں دل چسپ۔ دلگداز اور دلکش بیان فرما کر مسائل کی عمارت ان پر قائم کی ہے۔ حالانکہ ان اقسام میں باہمی نسبت تضاد نہیں ہے۔ اور جب تک من وجہ بھی تضاد نہ ہو۔ آپس میں تقسیم نہیں ہوسکتیں۔ وہی لفظ جو اپنی بیرونی خوشنمائی یا اندرونی اثر سے دل کو کھینچتا ہے۔ ممکن ہے ایسا پُرلطف اور شیریں ہو۔ کہ بار بار اُسے دُہرانے سے قند مکرر کا مزہ آئے۔ اور اس حیثیت سے دلکشی کے ساتھ اُس میں دلچسپی بھی پیدا ہو جائے۔ اور اُسی لفظ کے بار بار خیال میں لانے اور تصور کے بعد زبان سے ادا ہونے کا نتیجہ سوز و گداز ہو جائے۔ جیسا کہ ہم صوفیہ کرام کے یہاں سماع کی مجلسوں میں دیکھتے ہیں۔ کہ بعض اشعار دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کے بار بار پڑھنے سے کیفیت و وجد جو دلچسپی و دلکشی و دلگذاری کے انتہائی نتیجے ہیں۔ ہویدا ہوتے ہیں۔ اس صورت میں وہی لفظ تینوں اوصاف سے متصف ہو سکتا ہے۔ یہ یا اس قسم کی جزدی فروگذاشتیں ایسی ہیں۔ کہ جن سے کوئی کتاب بمشکل خالی ہو سکتی ہے۔ اور اُس کے حسن معنوی میں خلل انداز نہیں ہیں +

تصحیح حالات

مصنف ممدوح لکھنؤ کے رہنے والے اور حضرت اوج مدظلہ کے رشید شاگرد ہیں۔ اور چونکہ آپ کے نانا جناب سید محمد رضا ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے نامور شاگرد اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ خواں اور دربار دبیری کے دوامی حاضر باش تھے۔ اس لئے مصنف ممدوح نے مرثیہ خوانی کی گود میں پرورش پائی۔ اور منقبت کی آب و ہوا سے نشوونما ہوئی۔ ہوش بھی نہ سنبھالنے پائے تھے۔ کہ اس فن کی مشق میں لگا دئے گئے۔ گھر میں رات دن یہی چرچے رہا کرتے تھے۔ اور یہی مشغلے

ہُوا کرتے تھے۔ رات دن میر صاحب اور مرزا صاحب کے حالات گذشتہ و موجودہ کے سُننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مجلسوں میں ان بزرگوں کو پڑھتے سُنتے اور دیکھتے تھے۔ جس جلسہ میں گذر ہوتا تھا۔ یہی ذکر یہی فکر ہے چونکہ یہی مذاق فطرتی تھا۔ اور اسی کا عادی بنایا گیا تھا۔ اسی میں لطف آتا تھا۔ اور اسی میں وقت گذارنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح بھولے ہُوئے حالات تازہ ہوتے رہتے تھے۔ عنفوان شباب ضرور لکھنؤ کی دلچسپیوں میں بسر ہُوا۔ لیکن اس کے بعد لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ تاہم سال دو سال میں مہینے دو مہینے کو لکھنؤ کا پھیرا ہوتا رہا۔ وہاں پہنچ کر آئینہ حفظ کے زنگ پر جلا ہوتی رہتی تھی۔ مرزا صاحب کو اب تک کچھ ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ اُن کے صحیح حالات کا پتہ چلانا دشوار ہو۔ ہاں مخالفوں کی ہرزہ درائیوں اور محبین کی خوش اعتقادیوں نے اصلی حالات میں تحریف و تخلیط بہت کچھ کر رکھی تھی۔ تحقیق و تفتیش اور تنقید و انتخاب کی ضرورت تھی۔ تحقیق کرنے والے کے لئے یہ کام بہت آسان تھا۔ اوّل تو حالات کا بڑا ذخیرہ دماغ میں جمع تھا۔ دُوسرے برسوں سے ان حالات کو متفرق صفحات پر غیر مرتب جمع کر کے اُن کی تحقیق و تفتیش میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں جس مجمع میں کچھ سراغ ملتا تھا۔ اور جہاں ہم خیال ملتا تھا۔ یہ بندۂ خدا کچھ نہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے لاتا تھا۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ جن لوگوں سے حالات لئے گئے۔ اُن میں اکثر علما۔ علما مجتہدین بڑے باوقعت و حرمت لوگ ہیں۔ اور جن تحریرات سے امداد لی گئی ہے۔ وہ اکثر معتبر کتابیں ہیں۔ جن میں شاہی فرمانوں کی نقلیں اور عمائد سلطنت کے خطوط بڑی مستند شہادتیں ہیں۔ یہ ذرائع ہیں جن سے نہایت صحیح حالات دستیاب ہُوئے۔ اور جانچ پرتال سے اُن میں جو کوئی جزوی اختلاف تھا۔ اُسے تطبیق دی گئی۔ سچے حالات کے ملنے سے صحیح رایوں کے قائم کرنے میں کامیابی ہُوئی۔ غالباً ایک مورخ اور سوانح نگار کی اعلےٰ سے اعلےٰ کامیابی یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اُس کے مخزن میں صداقت و راست بیانی کا ذخیرہ بھرا ہُوا ہو۔ میں دوبارہ حضرت ثاقب کا شکریہ ادا کرتا ہُوا اُن کی جانفشانی کی کامیابی پر داد دیتا ہُوں۔ کہ اُن کی عنایت سے ناخدائے نظم اردو کے صحیح حالات کا مجموعہ ہماری آنکھوں کو ضیا و نور اور دل کو لطف و سرور بخش رہا ہے ؎

رَدُّ المعارضہ

ہر زمانہ میں اہل کمال کے دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں- ایک تو وہ کہ محض حسد و عداوت اور خود غرضی کے سبب کسی کے کمالات کو مٹا کر اپنا سکہ جمانا چاہتے ہیں- ان میں کچھ تو معاصرین ہوتے ہیں- ان کا ایسا کرنا پست فطرتی اور اخلاقی کمزوری سہی- لیکن چونکہ دُنیا میں خود غرضی عموماً چھائی ہُوئی ہے- اس لئے ذاتی فائدہ کی نظر سے معمولی بات ہو گئی ہے- کچھ لوگ اُن کاملین کے بعد بدنیتی سے یا مثل مشہور ہے ع

بد نام بھی گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

کسی بلند نام کی شہرت پر حملہ کر کے اپنا نام اُچھالنا چاہتے ہیں- دوسری قسم کے دشمن وہ ہیں- جن میں سخن فہمی کا مادہ نہیں ہوتا- اور نقص لیاقت کے پیمانہ میں کمال کو ناپتے ہیں- اور اپنے مفروضہ غلط معیار پر کستے ہیں +

مزہ یہ ہے کہ جو حال اعتراض کرنے والوں کا ہے- وہی حال دوستوں اور محبوں کا ہے- کہ یا تو جوش عقیدت و فرط محبت میں اُنہیں ہر عیب- حسن اور ہر بُرائی- بھلائی نظر آتی ہے- دوسروں کے کلام میں وہی عیب اُنہیں عیب معلوم ہوتا ہے- اور اپنے محب کے کلام میں وہی عیب صواب سمجھا جاتا ہے- نیز ایسا بھی ہوتا ہے- کہ فرط محبت میں اظہار عیب سے چشم پوشی کی جاتی ہے- اکثر پُرانے زمانے کے لائف لکھنے والے اس بلا میں زیادہ مبتلا نظر آتے ہیں- کیونکہ وہ گویا ان لوگوں کو جن کے حالات سُنا رہے ہیں- مافوق الانسانیت میں دکھلا کر اُنہیں معصوم قرار دے رہے ہیں- اور یہاں ہی سے اُن کی بیجا طرفداری کُھل کر سوء ارادت کا سبب ہو جاتی ہے- فرط محبت کی ایک مثال سُناتا ہُوں- لارڈ بائرن ایک نامور شاعر اور کریہ المنظر شخص تھا- پیشانی پر عجیب بدنما شکن پڑے رہتے تھے- نیچے کے ہونٹ کو ہر وقت دانتوں سے دبانے کا عادی تھا- انگلستان کی شدید سردی میں کبھی گلوبند نہیں باندھتا تھا- اُس کے

مقلدوں کو اُس کی یہ وضع ایسی محبوب تھی۔ کہ اُنھوں نے بہ تصنع یہ سب بہ نمائیاں بڑی کوشش سے پیدا کرلی تھیں +

یا یہ صورت ہوتی ہے۔ کہ ان محبین کی لیاقتیں حسن قبح کے پرکھنے سے عاری ہوتی ہیں۔ اُن کا ذہن اصلی نقص اور حقیقی خوبی تک نہیں پہنچتا۔ اور یہ اپنے خیالی ڈھکوسلوں کے چکر میں گھومتے رہتے ہیں +

گذشتہ معرکہ آرائیاں تقویم پارینہ ہوگئیں۔ میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کمالات تسلیم کر لئے گئے۔ مگر زمانہ حال کے معترضین میں سے شمس العلماء علامہ شبلی جیسے مشہور فاضل اور قابل مصنف اور شمس العلماء مسٹر امداد امام صاحب ایسے لائق اہل قلم کی نسبت سخت حیرت ہوتی ہے۔ کہ اُن کو کس قسم کے دشمنوں میں شمار کیا جائے۔ ہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت شبلی کا پایۂ عربیت گو کتنا ہی بلند ہو۔ اور جناب مسٹر امداد امام صاحب انگریزیت کے آسمان کے چاند ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر شاعری و فصاحت و بلاغت میں غالب کے پلّہ کے نہیں۔ پس اس نقاد سخن کی تحریری شہادت سے جناب مرزا صاحب کے فضل و کمال اور مرثیت کے میدان میں یکہ تاز ہونے کا ثبوت دیکھنے کے بعد ان بزرگ معترضین کی شان میں یہی کہنا پڑتا ہے ع

معذور دار مست کہ تو او را ندیدۂ

سوانح نگار کا فرض تھا۔ کہ غلط فہمی اور نالیاقتی کے سبب جن لوگوں نے غلط اعتراض کر کے آفتاب پر خاک ڈالنی چاہی ہے۔ اُس گرد کو صاف بیانی کے پانی سے بٹھائے۔ بلکہ بہتر ہو کہ وہ پانی اور گرد مل کر اُن خاک ڈالنے والوں کے دامن فہم و ادراک پر بدنما دھبے بن کر ہویدا ہوں۔ اسی واسطے حیات دبیر میں جوابات کے خوشنما عنوان "نافہمی کا داغ" "زبانداني کی غلطیوں کا داغ" "اتہام و سفید جھوٹ کا داغ" وغیرہ نظر آتے ہیں +

مَیں سچ کہتا ہُوں۔ منصف ناظرین کتاب ختم کرنے کے بعد قطعی اعتراف کرینگے۔ کہ تقریباً تمام جوابات نہایت شافی اور تحقیقی ہیں۔ اگرچہ الزامی جواب بھی بڑی آسانی سے ممکن تھے لیکن

حضرت معترض کے کلام نثر و نظم میں تمام وہ باتیں موجود ہیں۔ جن کو آپ کی عیب جو نظر حضرت مرزا صاحب کے لئے عیب و نقص قرار دیتی ہے)۔ مگر مصنّف حیات نے محققانہ پہلو زیادہ پسند کیا۔ جوابوں کی مقبولیت اور وقعت صرف اس بات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت مرزا کے جس کلام پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ اکثر جگہ اُس کی تائیدی نظیریں آیۂ قرآنی لکھ کر یہ بتلایا ہے۔ کہ اگر اس اعتراض کے مورد حضرت مرزا ہو سکتے ہیں۔ تو معاذ اللہ کلام الٰہی پر بھی یہ اعتراض وارد ہوگا + نہج البلاغہ کے بلیغ خطبوں اور ادب و معانی و بیان کی مسلمہ عبارتوں کو نقل کر کے غلط اعتراضوں کے استیصال میں بلیغ کوشش فرمائی ہے۔ اسی کے ساتھ تحریر کی متانت بیان کی سنجیدگی۔ الفاظ کی تہذیب اور اسلوب بیان کی شائستگی۔ مجیب کی عالی ظرفی۔ بلند خیالی کی شہادت دے رہی ہے۔ اور اس پیشینگوئی پر جرأت دلاتی ہے۔ کہ کتاب کی مقبولیت عام ہوگی۔ اور مقبولیت کا اعتراف کیا جائیگا۔ بلکہ مجھے تو مخدومنا علامہ شبلی کی صاف گوئی سے امید بندھتی ہے۔ کہ اس کا دلی خیر مقدم ادا فرما کر اپنے اعتراضات واپس لے لینگے +

یہ بھی بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مصنف نے مرزا صاحب کی کثیر الکلامی کو پیش کر کے اقرار کیا ہے۔ کہ جو شخص اس قدر نظم لکھنے والا ہو۔ اُس کے کلام میں کہیں تعقید وغیرہ خرابیوں کا آجانا کچھ بعید نہیں۔ لیکن اس پر بھی خواہ مخواہ اُن اشعار کو جن میں درحقیقت کچھ غرابت یا ثقل ذوق سلیم کو محسوس ہوتا ہے۔ معرض جواب میں نہیں لا بٹھایا ہے۔ اور اُن کی ثقالت و غرابت سے انکار کیا ہے۔ یا میر صاحب و مرزا صاحب کے وہ اشعار جن کی فصاحت کا مقابلہ علامہ شبلی نے کر کے میر صاحب کے اشعار کی فصاحت ظاہر کی ہے۔ آپ نے بھی انہیں بالمقابل نقل کر کے صرف یہ کہدیا ہے۔ کہ دونوں فصیح ہیں۔ یا دونوں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں
آیہ نہ آیا مثل علیؑ مدح جود میں	قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں

دونوں بزرگوں نے ایک ہی واقعہ کو انتہائے جود و سخاوت کی نظر میں پیش کیا ہے۔ گو مرزا صاحب کو مدحت زیادہ منظور ہے۔ لیکن فصاحت کلام کا بیّن فرق ہے۔ یہ کہنا کہ دونوں یکساں ہیں۔ یا تو خوش عقیدتی ہے یا اخفائے حق۔ بلکہ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے ایسے بیشمار ہم مضمون شعر موجود ہیں۔ جو فصاحت میں میر صاحب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ علےٰ ہذا میر صاحب کے بہت سے اشعار میں مرزا صاحب سے بہتر فصاحت ہے۔ اور اس کے ذیل میں چند مثالیں لکھ دینا کافی جواب تھا +

یا مثلاً مرزا صاحب کے حسب ذیل مصرعے ع

لے کر رطب دلو دم کہنے لگے شاہ

ع مستغرق رُوح اُس نے کیا تب عسل و شیر

ع اس سر پہ دھرے ہاتھ یہ قسمیہ اجل ہے

ان میں ثقیل الفاظ نہ بھی مانے جائیں۔ مگر ہیئت ترکیبی نے قطعی ثقالت پیدا کر دی ہے۔ اور اس سے انکار کرنا محض طوفان محبت ہے۔ ہاں ان کی ثقالت سے انکار کرنیکی بجائے اگر تسلیم کر کے یہ کہہ دیا جاتا۔ کہ ایسی ثقالتوں سے کوئی مبرا نہیں۔ اور مثلاً میر صاحب کے چند مصرعے لکھ دئے جاتے۔ تو زیادہ محققانہ اصول کی پابندی ہوتی +

انتخاب کلام حضرت دبیر

زمانۂ حال کے سوانح عمری لکھنے والے اس بات کا قطعی فیصلہ صادر کر چکے ہیں۔ کہ جس کا حال لکھا جائے۔ اُس کی خوبیوں کے ساتھ اصلی بُرائیاں ضرور دکھلائی جائیں۔ جس کتاب کو اس تکمیل سے خالی پاتے ہیں۔ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ثابت کو

زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری تھا۔ لیکن کم سے کم یہ ایڈیشن یا جلد اوّل اس کی کچھ تلافی نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ جلد میں اور خدا کرے اسی جلد کے دوبارہ شائع ہونے کا موقع آئے تو اسی جلد میں یہ کمی پوری کردی جائے +

یہ تو ہوسکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی پرہیزگاری اور وسعت اخلاق کے سبب اُن سے شرعی اور اخلاقی معصیت وجرم ایسے نہ سرزد ہوئے ہوں۔ کہ وہ روز روشن میں لائے جائیں۔ اور حضرت ثابت اُنہیں درج کتاب فرمائیں۔ لیکن عالم شاعری میں اُن سے ضرور لغزشیں ہوئیں۔ اور وہ نظر آ رہی ہیں۔ ان کو قلم کے دائرہ سے بالکل خارج کردینا یہ کھٹکنے کے قابل بات ہوتی۔ لیکن بعض اعتراضوں کی گرد سے دامن بچاکر گذر جانا اور کہیں کہیں دبی زبان سے بعض لغزشوں کو بشریت۔ کے حوالہ کردینا اور معاندانہ طریقہ پر خم ٹھونک کر لڑنے کو مستعد نہ ہونا یہ ایسی باتیں ہیں۔ کہ اس کی اشک شوئی کرکے شدید طرفداری کے الزام کو دفع کرتی ہیں۔ اور کتاب کو ہر طرح کی تکمیل کا پایہ بخشنے میں ساعی ہیں +

شاید بعض ناظرین انتخاب کی وسعت کو طوالت سمجھیں۔ مگر یہ بات نہیں۔ مرزا صاحب کے کلام کو بہتر اور برتر ثابت کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی نمبر لکھنے ضروری تھے۔ کیونکہ معترضین کی تردید کا یہ اچھا اور آسان طریقہ اور شائقین کے لئے منتخب مضمون کی افراط کا ذریعہ ہے۔ وہ کلام جو اب تک شائع ہونے سے محفوظ ہے۔ اُس میں سے بھی کلام منتخب بڑی کوشش سے حاصل کیا گیا ہے۔ حق یہ ہے۔ کہ کلام منتخب کے انتخاب کا حق ادا کیا ہے۔ چھانٹے ہوئے مضمون اپنی سرخیوں سے مربوط ہیں۔ کوئی قسم نظم انتخاب سے محروم نہیں رہی +

یُوں تو عام طور پر حضرت انہیں کے مرتبہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن بڑی ایمانداری یہ بھی ہے۔ کہ بالمقابل ہم مضمون پر کلام دونوں کا نقل کیا ہے۔ یکساں اور بہتر کلام چھانٹا ہے۔ یہ لغزش قدم کا موقع تھا۔ اور ایک طرف کا پلہ جُھکنے سے ہیرو کی منقصت اور دُوسری طرف کا

پڈ جھکانے سے انصاف کا خون اور ملک کے سادگی پسندوں سے لڑائی مول لینی تھی +

مقابلہ شعرائے عرب و عجم و انگلستان و ہند

اس مقابلہ سے یہ دکھلانا مقصود ہے۔ کہ جن شعرا سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے بلند پروازی و نازک خیالی و مضمون آفرینی کے میدان میں اُن سے کتنی دُور آگے بڑھ کر جھنڈا گاڑا ہے۔ اور متفقہ مضامین میں کیا کیا جدتیں پیدا کی ہیں۔ یا محض اسلوب بیان بدل کر کیسی کیسی دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں۔ مقابلہ اور اُس سے اس نتیجہ کے امیدوار ہونے پر میں اپنی رائے آئندہ ظاہر کرونگا۔ یہ مسلم ہے۔ کہ یہ شدید محنت اور عظیم الشان تلاش اس حد تک نہایت قابل قدر ہے۔ کہ ہم گویا ایک وقت گھر بیٹھے مختلف ولایتوں کے پھل پھول دیکھ سکتے ہیں۔ کھا سکتے ہیں۔ سونگھ سکتے ہیں۔ ایران و ہندوستان کے انار۔ طائف عرب کے رُمان اور انگلستان کے پومگرانیٹ ایک ہی ڈش میں ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ کسی کے دانے سُرخ کسی کے گلابی۔ کسی کے سفید ہیں۔ کوئی میٹھا ہے۔ کوئی کھٹا۔ کوئی کھٹ مٹھا۔ کوئی کسیلا۔ یہی حال مختلف مقامات کے شعرا کے مقابلہ کا ہے۔ اگر جی دیکھنا چاہے۔ کہ کسی مضمون خاص کو ایران والے کیونکر ادا کرتے ہیں۔ اور عرب کے بدوی اور عہد تمدن کے نازک خیال شعرا کے ادائے مضمون کا کیا ڈھنگ ہے۔ ہندوستانی کیا ملاحت پیدا کر رہے ہیں۔ انگلستانی کیسا بیرنگ سادہ نقشہ دکھلا رہے ہیں۔ تو مختلف دیوانوں کے اکٹھا کرنے اور اُن میں اُس مضمون خاص کی تلاش کی مصیبت اٹھانی پڑیگی۔ یہاں سب کے یکجائی نمونے موجود ہیں۔ ایک ایسا باغ لگایا ہے۔ جس میں مختلف ملکوں کے گلاب گلاب ایک جگہ۔ سیوتی سیوتی ایک جگہ۔ غرض جدا جدا قسم کے الگ الگ ممالک کے ایک ایک پھول کی خاص کیاری موجود ہے۔ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق جو پھول چاہے پسند کرلے۔ اور پھول بھی کیسے۔ جوہی کے پھول۔ طرہ تاج قبول۔ کسی کی سادگی ستم ڈھا رہی ہے۔ کسی کا بناؤ سنگار مارے ڈالتا ہے۔ کسی کی پھبن پر دل لوٹ پوٹ ہے۔ ان اعتبارات سے یہ مقابلہ ایک خوشگوار سامان تفریح ہے۔ اور مصنف کی محنت رائگاں نہیں جا سکتی +

اب رہا مقصود مقابلہ - اُس کی نسبت مجملاً میں عرض کئے دیتا ہُوں +

اردو میں متقدمین کے ساتھ متاخرین کے کلام کے مقابلہ کی بنیاد حضرت حالی مدظلہ العالی نے ڈالی - لیکن جناب ممدوح کا فیصلہ اس بارہ میں کلی طور پر ناطق نہیں ہے - بلکہ صرف فارسی کی محدود شاعری میں ایک زبان دان اور ایک اہل زبان کے برابر ہوسکنے اور اہل زبان سے گوے سبقت لے جاسکنے تک محدود ہے - اس لئے ہماری بحث سے خارج ہے +

سُنئے! ہر ملک کی مضمون نگاری اور سخن پردازی وہاں کے رسم و رواج اور اُس ملک کے رہنے والوں کی عادتوں اور طبعی کیفیتوں کا فوٹو ہوتی ہے - ملک کے نشیب و فراز خشکی و تری - آب و ہوا کا ضرور دخل ہوتا ہے - کہیں کے باشندے ذہین ذکی صحیح الحواس اور کہیں کے رہنیوالے غبی - کند ذہن اور مخبوط الحواس ہوتے ہیں - مقامی تمدن و معاشرت بھی شاعری پر بڑا اثر رکھتے [illegible] کے مُردہ کے جنازہ کے ساتھ باجے بجائے جاتے ہیں - گریہ و زاری تمسخر سمجھا جاتا ہے - کہیں سر پر خاک اُڑاتے اور بھُس اُڑاتے جاتے ہیں - اور جو کچھ شاعر کے سامنے اور گرد و پیش ہوتا ہے - وہی اُس کی تشبیہوں کا ذخیرہ - استعاروں کا خزانہ - کنایوں کا سرمایہ وسایط مجاز کے قرب و بعد کا باعث ہوتا ہے - اور انہیں چیزوں پر شاعری کا دار و مدار ہے - دیکھئے - یہاں کی بہار کا اور زمانہ ہے - اور ہی کیفیتیں ہیں - اور ہی طرح گذرتے ہیں - فارس کی بہار کا اور وقت اور اُس کی تفریحات و مشاغل کچھ اور ہی ہیں - کہیں بہار و خزاں دونوں ندارد - لامکان کا عالم - ہندوستان میں ریا و نمود کا یہ زور شور - کہ خیرات بھی نمود کا ذریعہ ہے - عرب میں فیاضی کی یہ صفت کہ اِس ہاتھ کی اُس ہاتھ کو خبر نہ ہو - ہندوستان کی عبادتوں میں کبھی ناچ رنگ جزو مذہب - عرب سے جن عبادتوں کی اشاعت ہُوئی - اُن میں سے نماز کی یہ کیفیت کہ آیۂ قرآنی موسیقی کی راگنی میں ادا ہو جائے - تو نماز ہی ساقط نہیں بلکہ گنہگاری نفع میں - قدیم ہندوستان میں پردہ نہیں - ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں عورت بناؤ سنگار کرکے آئے - اور جس بانکے ٹیڑھے جوان کو چاہے چھانٹ لے - اور یہ سب سے بہتر شادی قرار دی جائے - تو یہاں کا غریب شاعر

جہاں برستا ہی نہیں۔ وہاں چشم تر کو اُس کا مشبہ کون بنائیگا۔ صحرائے افریقہ کے رہنے والوں کے دماغ میں گنگا۔ جمنا۔ دجلہ اور فرات کی روانی کہاں سے آئیگی۔ یونان کا شاعر ہومر سر ٹیک کر مرجائے۔ مگر ان لفظوں میں گرمی کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔

وُہ دُھوپ کہ مُرغانِ ہوا کرتے ہیں نالہ	بس ہاتھ رکھا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہُوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا	اِس دُھوپ میں اِس میں کھڑے ہیں شہِ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر	پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر

اور کچھ شعر ہی پر منحصر نہیں ہے۔ نثر میں بھی وہی تشبیہیں وہی مجازات کام میں لائے جاتے ہیں مگر نثر کے مشرح فقرے وہ نزاکت نہیں پیدا ہونے دیتے۔ شعر میں یہ خوبی ہے۔ کہ جس مضمون کو نثر میں طوالت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اُسی کا دلچسپ اختصار لفظوں کو مقدم مؤخر کر کے موزوں پیرایہ میں لے آتے ہیں۔ اس تبدیلی سے وُہی بے اثر منتر کارگر ہوجاتا ہے۔ دلکشی و دلگذاری کی بجلی پیدا ہو کر سُننے والوں کو بیتاب کر دیتی ہے۔ وہی الفاظ جواب تک تاثیر سے مُعرا تھے۔ اب ہیئت ترکیبی کی بدولت مقناطیسی کشش بھی رکھتے ہیں۔ اور جذب کہربائی بھی موجود ہے۔ مگر نثر ہو یا نظم۔ انشا پرداز ہوں یا شعرا۔ سب اپنے ملکی خصوصیات۔ طبعی جذبات۔ مرتبہ عادات کے احاطہ میں گشت لگانے پر مجبور ہیں۔ تخئیل کا یہ کام ہے۔ کہ انہیں معانی میں جو خزانہ خیال میں مجتمع ہیں۔ کتر بیونت کر کے نئی نئی صورت میں جلوہ گر کردے۔ اور متخیلہ جو کچھ ایجاد و اختراع کر کے الفاظ کے جسم میں معانی کی رُوح پھونکتی ہے۔ وہ سب قوائے مخفیہ حسیہ و عقلیہ کی فیاضی ہے۔ اور سب مذکورہ خصوصیتوں کے دائرہ میں رہ کر رنگ روپ۔ قد و قامت۔ وضع اور ڈھنگ میں متمیز ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایرانی شعرا کا منظور نظر انسانی فطرت کے خلاف سہی۔ مگر ملکی عادت کے سبب امرد ہے۔ اور عربی شاعروں کی محبوب جان نواز عورت اور ہندی شعرا کے زنانے عشق کا مطلوب داڑھی مونچھ والا مچھندر ہے۔

خیالات و جذبات و رسوم و عادات میں اختلاف ہوتا چلا جائیگا۔ شاعر اُسی کا اتباع کرتا رہیگا۔ کیونکہ وہ سوسائٹی کی حالتوں کا آرگن ہے۔ جب ایک ہی ملک کے مختلف الاوقات شعرا میں باہم قدرتی طور پر امتیاز عظیم ہونا چاہئے۔ تو غیر ملک والے اور وہ بھی جن میں صدیوں کا بُعد ملحق ہو۔ ایک مرکز پر کیونکر گھوم سکتے ہیں۔ بلکہ تمام خصوصیات مذکورہ کے لحاظ سے اُس وقت میں اُسی زمانہ کے معمولی سے معمولی شاعر کا کلام اور اُس کے خیالات اِس زمانہ کے برتر سے برتر شاعر کے نازک خیالات سے زیادہ مقبول ہونے کے لائق تھے۔ اور اُس وقت کی سوسائٹی میں اس فیشن ایبل مال کا کوئی خریدار نہ ہوتا +

پس صاف نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ متنبیؔ جیسا اُس وقت کا نازک خیال اگر تیرھویں صدی ہجری میں یہاں پیدا ہوتا۔ اسی زمانہ کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا۔ تو قطعی دُوسرا دبیر ہوتا۔ اور حضرت دبیر اگر متنبیؔ کے زمانہ میں پیدا ہوتے۔ اور اسی سوسائٹی میں پرورش ہوتی۔ تو دُوسرے متنبیؔ ہوتے۔ نظر بہ معروضہ بالا میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے شعرا کے کلام کا مقابلہ ایک ایسا کام ہے۔ جس کے عدم و وجود میں اگر مساوات کی نسبت بھی ہو۔ تو بڑی کامیابی ہے +

اب مَیں مسح خراشی کو ختم کرتا ہُوا دُعا کرتا ہوں۔ کہ خدائے تعالےٰ حیات دبیر کو قبول عام کا خلعت مرحمت فرمائے۔ اور مصنّف علامہ کی سعی مشکور کرے۔ فقط +

محمد مظہر الہادی سُہیل عفی عنہ طبیب امروہوی۔ کوٹہ۔ ۳ فروری ۱۹۱۳ء

تقریظ عالم علوم مشرقی و مغربی جناب حکیم سید احمد حسین صاحب مدیر الشفا مقیم ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُنیا میں سچّی عزت کے مستحق اہل قلم ہیں - جن سے بہتر بنی نوع انسان کا اور کوئی خدمتگذار نہیں ہو سکتا - مصنفین کا قلم جس عظمت و شان سے عالم پر حکومت کر رہا ہے - بڑے بڑے حکمرانوں کو نصیب نہیں - بلکہ وہ بھی اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں - قلم کی یہ ادنےٰ قدرت ہے - کہ جس کو چاہے - بقائے دوام عطا کرے - اور جس کو چاہے - نیک نام اور بد نام کر دے +

جس شخص کا دل تعصب و طرفداری سے پاک اخلاقی فضائل خصوصاً صداقت و عدالت سے مزین اور عشق الٰہی اور ہمدردی و محبت مخلوق کے رنگ سے رنگین نہ ہو - وہ شخص قلم ہاتھ میں لینے کا کسی طرح مستحق نہیں +

دُنیا میں[1] صرف مسلمانوں کو ہی یہ فخر حاصل ہے - کہ جس قدر انہوں نے بارہ[۱۲۰۰] سو سال کے عرصہ میں لاکھوں علماء فصحاء و کاملین و فلاسفروں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں - اتنی کسی قوم نے نہیں لکھیں - اس

---

[1] ڈاکٹر سپرنگر لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو علم اسماء الرجال کی بدولت وہ عزت حاصل ہوئی - جو کسی قوم کو حاصل نہیں - نہ تو کوئی قوم ایسی گذری نہ اب موجود ہے - کہ جس نے مسلمانوں کی مانند بارہ[۱۲۰۰] سو سال کے عرصہ میں ہر ایک اہل علم کے حالات زندگی قلمبند کئے ہوں - اگر مسلمانوں کی کتب رجال جمع کی جائیں - تو غالباً ہم کو پانچ لاکھ حکما و علما و مشاہیر کا تذکرہ مل جائے - ان کی تاریخ میں کوئی قرن یا نامی جگہ ایسی نہیں جس کا کوئی مشہور آدمی سوانحات زندگی لکھنے سے بچا ہو +

۹۱۹ء میں بہت سے مؤرخ خصوصاً محمد الکلبی اور دسویں صدی میں طبری - مسعودی - اصفہانی اور حمزہ وغیرہ تھے - جنہوں نے تاریخ عالم اور کرہ ارض کے ہر زمانہ کی تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تھا - ابوالفداء - نویری اور ابوالقاسم قرطبی کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہیگا - جنہوں نے اقوام کی ترقی تہذیب - مذہبی و ملکی حالات - قوانین سیاست و تمدن اور قومی انقلابات پر روشنی ڈالی ہے - ابن سعد کی کتاب طبقات اور محمد بن اسمعیل بخاری - ابن ابی خثیمہ - ابن ابی حاتم - ابن شاہین - ابن حبان - ابن عدی - ابن حجر اور ابوالفضل ابن طاہر کی تصنیفات نہایت مشہور ہیں - ان میں بہت سی یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں - ان بزرگوں نے راویوں کے اخلاق و عادات کی تحقیقات اور ان کی روایات کی چھان بین کر کے بعض کو معتبر اور غیر معتبر قرار دیا - اور مجروح و ضعیف راویوں کو علیحدہ کیا +

اظہار کر کے سوائے تعریفوں کے ان کی کوئی بات بھی قابل تنقید نہ سمجھے۔ یا کسی کی توہین کر کے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ خطا و نسیان ہر آدمی کے خمیر میں داخل ہے۔ کسی شخص کی محض تعریفیں لکھ دینا گویا اُسکو انسانیت سے خارج کر دینا ہے۔ ہمیشہ وہی سوانح عمریاں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی جن میں انصاف سے رائے زنی کی گئی ہوگی۔ آج کل بعض سوانح عمریاں ملک کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے نہیں لکھی جاتیں۔ بلکہ کسی خاص شخص کو مشہور کرنے کی نیت سے لکھی جاتی ہیں۔ ایسے اہل قلم ملک کے خدمت گذار نہیں۔ بلکہ اس خاص شخص کے ہیں۔ جس کی تعریفوں کے وہ پل باندھتے ہیں۔ اہالیان یورپ نے فن بیوگرافی کو حیرت انگیز کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جس سے سبق لینا ضروری ہے منصفانہ تنقید کے پہلو بہ پہلو عیوب و نقائص بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کے اخلاق بھی درست ہو جائیں۔ میرا جناب ثاقب کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ میں ان کی جانکاہ محنت کا معترف ہوں اور ان کی یہ کتاب کئی وجوہ سے ملک کے لئے مفید جانتا ہوں۔ انھوں نے برسوں کی محنت اور تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے۔ مرزا دبیر مغفور فرشتہ خصلت بزرگ اور اپنی قوم میں مجتہد و عالم دیندار مانے جاتے تھے۔ پس جبکہ قابل تعریف حالات کے ملنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اور زندگی میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹۵ نمبر۱)

فرقہ امامیہ میں حسن بن علی بن فضال۔ عبد اللہ بن جبلا نے [illegible] ہجری میں اسماء الرجال کی کتابیں لکھیں۔ اور حمید بن زیاد نینوی نے [illegible] ہجری میں رجال کی دقیقہ سنجی سے تحقیقات کی۔ اور ان کی جرح و تعدیل میں کتاب لکھی۔ محمد بن عیسے بن یقطین شیخ محمد بن یعقوب کلینی۔ شیخ صدوق۔ محمد بن بابویہ قمی۔ نجاشی۔ کشی۔ شیخ ابو جعفر طوسی۔ [illegible] تقی الدین حسن بن داؤد۔ شیخ شہید ثانی [illegible] مرزا محمد استرآبادی اور میر شرف الدین نہایت مشہور و معروف شیعہ ہیں۔ جنہوں نے علم اسماء الرجال میں نہایت مفید کتابیں لکھی ہیں +

اہل سنت والجماعت کے یہاں استیعاب۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ کاشف۔ کتاب الضعفاء والمتروکین۔ تہذیب التہذیب۔ تقریب التہذیب۔ تہذیب الاسماء۔ لسان المیزان۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ۔ تدریب الراوی۔ شرح تقریب النووی۔

ہ عالم متبحر بھی حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔ سادہ کلام کے ٹکڑے بھی اپنی سادگی اور عام فہم ہونے میں مشہور اور دل میں گذر جانے والے ہیں۔ جناب دبیر خود عالم وفاضل تھے۔ ان کے شاگردوں میں عالم وفصیح بھی ہیں۔ مجتہد و محدث بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلمان بھی میرزا نوشہ غالب مرحوم سے اہل زبان اور مجتہد العصر عالی جناب مفتی میر محمد عباس صاحب سے عالم اجل اور فاضل بے بدل ان کی فصاحت کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر جناب میر انیس مرحوم ومغفور کی وہ ادا جس پر ایک عالم مفتون و شیدا ہے بیان کرنا ضروری ہے۔ جناب انیس مرحوم کیفیات نفسانی اور جذبات باطنی یعنی رنج والم۔ حسرت ویاس۔ تعجب وشرم۔ غصہ وجوش۔ شجاعت۔ خوف وجبن۔ اضطراب۔ مایوسی۔ بیچینی اور محبت وغیرہ کو بیان ہی نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں کے دل میں جس حد تک چاہتے ہیں۔ پیدا کر دیتے ہیں۔ قلوب خلائق کی باگ ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ واقعات کی ایسی سچی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کہ وہ ہوبہو ذہن کے سامنے متمثل ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو اس سلسلہ و ترتیب سے کھینچتے ہیں۔ کہ جب تک پوری شبیہ کسی حادثہ یا واقعہ کی نہیں اتر لیتی۔ یا واقعی نظارہ کسی موقع کا آئینہ ذہن میں منطبع نہیں ہو لیتا۔ اُس وقت تک آدمی تمام واقعات بلکہ اپنے آپ کو بھی بھولا رہتا ہے۔ اور ابتدا میں جس خوبی اور جن رنگوں اور دلکش طرز سے وہ تصویر یا نقشہ عالم خیال میں کھنچنا شروع ہوتا ہے۔ اسی خوبی اور انہیں رنگوں اور اسی طرز کو لئے ہوئے اختتام پا جاتا ہے۔ اور انسان اس کے خاتمہ تک اور تمام باتوں بلکہ اپنے آپ سے بھی غافل رہتا ہے۔ بیچ میں نہ کسی دوسرے واقعہ کا خیال آتا ہے۔ نہ مشکل یا مغلق و اجنبی الفاظ کے آجانے سے طبیعت الجھتی ہے۔ اور نہ لفظی ہیر پھیر میں پڑ کر اصل واقعہ سے دل کو دوسری جانب ہٹانا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے۔

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیس ✦ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

یہ نہایت مختصر بیان ان دونوں بزرگوں کے کمالات کا ہے۔ اگر ان کے کلام کا مقابلہ دنیا کے مشہور شعرا سے کیا جائے۔ تو بجا ہے۔ مگر ہم اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا معترف اور کم فرصتی

وکثیر الاشتغالی کا مفرہوں۔ مطلب کی اہم ذمہ داریوں اور طبی تحقیقات کے سبب سے ہر وقت دماغ تھکا ہوا رہتا ہے۔ مگر جب اپنے سچے مخلص کی تعمیل ارشاد اور بار بار کے سخت تقاضے کے سبب کچھ لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتا ہوں۔ تو دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اور اپنی کمزوری پر نظر کر کے کہنے لگتا ہوں۔ کہ میں کیا اور میری ہُلے نرکیا۔ ؎

گنجایش عداوت اغیار یک طرف + یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ان مجبوریوں کے علاوہ میرے سچے اور مخلص احباب میں عاشقانِ کلام جناب انیس مرحوم بھی ہیں۔ اور قدردانان جناب دبیر مرحوم بھی۔ بعض نازک دماغ سچے دوستوں کا یہ حال ہے کہ دونوں بزرگوں سے کسی ایک کے لئے کچھ لکھنے پر بھی اعتراض ہو جاتا ہے۔ پس میں اس کتاب کا ریویو جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں لکھ سکتا +

جناب ثابت زاداللہ شرفہ میرے سچے بے ریا احباب اور نہایت مخلص رفیقوں سے ہیں۔ ساری کتاب کو طبع ہونے سے پہلے میں نے پڑھا ہے۔ اور مولوی شبلی کے غلط اعتراضات کے جوابات لکھنے اور موازنہ دبیر و انیس پڑھنے کی ترغیب بھی اس کتاب کے دیکھنے سے ہوئی تھی[1]۔ اس کتاب میں زبان اُردو اور شاعری کے ایسے نکات بھی قلمبند ہوئے ہیں۔ جو شائع اُردو میں پہلے نہیں لکھے گئے۔ اور معانی بیان اور صنائع و بدائع کا اُردو میں استعمال دکھلانے سے زبان کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوگئی ہے۔ اور گوان باتوں کو سوانح عمری سے کچھ تعلق نہیں۔ مگر ادب اُردو کی اس خدمت نے اس سوانح عمری کو نہایت باوقعت اور مفید بنا دیا ہے۔ ایک اور مفید ایجاد جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ یہ ہے کہ جناب دبیر مرحوم کے فاضل اور لائق شاگردوں کے حالات بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ بلکہ شاگردوں کے شاگرد بھی شامل کر دئیے ہیں۔ ان کے حالات کا قلم بند ہونا مشکل تھا۔ جناب دبیر مرحوم کے حالات زندگی کے سبب سے ان کے شاگردوں کو

[1] روزانہ پیسہ اخبار مطبوعہ ۲۴ ؍ اگست ۱۹۰۲ء و ۲۶ ؍ اگست ۱۹۱۲ء میں میرے دو مضامین بر رد اعتراضات مولوی شبلی شائع ہو چکے ہیں۔ راقم عابد احمد حسین +

بھی بقائے دوام حاصل ہو گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ باکمال کی عظمت و فضیلت یا علمی خدمات کو فروغ و شہرت لائق اور فاضل شاگردوں کی حسن خدمات و سعی سے ہوا کرتا ہے۔ اور کسی کو ایسے شاگردوں کا ملنا جو عقیدت مندی ـــ اور اپنے اُستاد کی محبت و عشق میں سرشار ہوں۔ بلکہ اپنی عزیز سے عزیز شے کو بھی نثار کر دینا فخر جانتے ہوں۔ بڑی خوش قسمتی ہے + جناب دبیر۔ کہ کلام بلاغت نظام میں یعنی انکی شاعری میں ہر رنگ موجود ہے۔ کیونکہ مرثیہ گوئی میں ڈراما۔ ایپک۔ پاسٹورل اور لائرک (عشقیہ) اور ہر قسم کی شاعری جمع ہو سکتی ہے سلہ میں نے سُنا ہے۔ کہ جناب دبیر کا کلام سوز میں بیشتر پڑھا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات سوز خوانوں کی فرمائش پر بیٹھے بیٹھے مرزا صاحب نے بَین کے بند لکھ دئے ہیں۔ جس کے دماغ میں کچھ بھی عقل ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کے فہم کے مطابق اصلاح خیالات اور اصلاح زبان کرنا اپنا فرض خیال کریگا۔ اور مرزا صاحب مرحوم و میر انیس مرحوم سے کسی ایک کو دُوسرے پر ترجیح دینے سے احتراز کریگا۔ کیونکہ ملک کی صدہا ضرورتیں ہیں۔ محض ایک کو دُوسرے پر ترجیح دینے کے دلائل و براہین کی ایجاد و اختراع سوائے دل آزاری اور قلم گھسائی۔ اور سیاہی و کاغذ کے نقصان اور آپس کی منافرت بڑھنے کے ہرگز اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریگی۔ دونوں بزرگ اپنے اپنے رنگ میں کامل اور فرد ہیں۔ خدائے پاک وحدت کو دوست رکھتا ہے۔

سلہ گو میر انیس بھی اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی اور رثا گوئی میں کچھ کم عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ جیسا کہ ایک مشہور ذی علم تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "بلاشبہ جناب انیس کی شاعری ایسی قدرت رکھتی ہے۔ کہ جب تک اس کا موازنہ ہومر۔ ورجل۔ فردوسی۔ ملٹن۔ والمیک اور ویاس سے نہ کیا جائے۔ اُن کی خوبیوں کا پانا بیرون امکان ہے۔ جن لوگوں نے مختلف اقوام کی شاعری پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ میر صاحب کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے" خود جناب دبیر کے دل میں میر صاحب مرحوم کی بڑی عزت تھی۔ مگر اس جگہ میں نے صرف جناب کا اسم گرامی لکھا ہے۔ کیونکہ تقریظ حیات دبیر پر ہے + ۱۲

عاجز سید احمد حسین الراجی الے رحمۃ رب المشرقین

ہم نہ ہو دوا پنی قدر آپ ا

اس لئے دُنیا میں ہر چیز اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اور ہر شخص کا رنگ جُدا ہے۔ اپنے دستخط بھی تو بعینہٖ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی شخص بھی تو دو چیزوں کو ایک جیسی بنانے پر قادر نہیں +

مَیں خدائے کریم سے دُعا کرتا ہُوں۔ کہ یہ سوانح عمری ملک کو فائدہ پہنچائے۔ اور مصنّف ممدوح کو اپنی محنت و عقیدت کا صلہ دونوں جہاں میں مل جائے +

خاکسار سیّد احمد حسین مدبر الشفاء

مقیم کوٹہ (راجپوتانہ)

یکم فروری سنہ ۱۹۱۳ء

کتبہ احقر الافقر محمد اسمٰعیل کاتب و نقاش لاہوری عفی عنہ بقلم خود